تعـــــا
قال اللہ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا

وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ وَيَضَعُ بِهِ آخَرِينَ

قرآن کریم کے علوم اس کی حقیقی عظمتوں اعجاز وبلاغت اور مقاصد کے لیے رہنما کتاب

مَنَازِلُ الْعِرْفَان
فی
عُلُومِ الْقُرْآن

تالیف
حضرت مولانا الحاج محمد مالک مدظلہ العالی کاندھلوی
شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

ناشران قرآن لمیٹڈ
اردو بازار لاہور

کتاب : منازل العرفان

مصنف : مولانا محمد مالک کاندھلوی

طابع : شفیق پرنٹنگ پریس روڈ لاہور

ناشر : ناشران قرآن لمیٹڈ
اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست کتاب منازل العرفان فی علوم القرآن

toobaa-elibrary

حرفِ اوّل

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ
وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَ
مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنا کلام پاک قرآن کریم اپنے پیغمبر خاتم الانبیاء والمرسلین سیدنا مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین پر ایک کامل ومکمل اور جامع دستور اور دین و دُنیا کی سعادت و فلاح اور رُشد و ہدایت کا قانون بنا کر نازل فرمایا۔ جس طرح خداوندِ عالم نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تمام انبیاء کے علمی وعملی کمالات ان کے بلند پایہ فضائل کا مجموعہ بنانا اور جملہ کمالاتِ نبویہ کو آپؐ کی ذاتِ اقدس پر ختم فرما کر آپؐ کو خاتم الانبیا بنایا اسی طرح حق تعالیٰ نے آپؐ پر نازل فرمائے ہوئے اِس دستورِ ہدایت اور قانونِ فلاح و سعادت کو جملہ کتبِ سماویہ اور تمام علومِ الٰہیہ کا لباب اور جوہر بنایا۔ انبیاءِ سابقین میں سے ہر پیغمبر کو اللہ کی طرف سے صرف اپنی قوم کے واسطے مبعوث کیا گیا تھا تو اس لحاظ سے ان انبیاء کو عطا کردہ صحیفے اور کتابیں مخصوص اور محدود علوم کا حامل بنائی گئیں مگر جناب خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تمام عالم کے لیے اور قیامت تک کے لیے نبی و رسول بنا کر بھیجے گئے تو آپؐ کی کتاب کی بھی یہی شان رکھی گئی کہ اس میں تمام علومِ الٰہیہ کو سمیٹ کر ودیعت رکھ دیا گیا اور ایک جامع اور مکمل دستورِ دُنیا کو عطا فرما دیا گیا کہ وہ اس

ذریعہ ہر دور اور ہر قرن میں دینی اور دنیوی فلاح وسعادت کے منازل طے کرتے رہیں۔ انسانی عظمت و رفعت کے بلند مراتب حاصل کرسکیں۔ تزکیہ ظاہر و باطن کے ساتھ اعمال و اخلاق کی گرانقدر خوبیاں پیدا کریں۔ انفرادی اور اجتماعی قسم کی مجملہ مشکلات و مسائل کے حل کے ساتھ اس کامل دستور سے اقتصادی معاشی اور معاشرتی پریشانیوں کو حل کرکے اطمینان و راحت اور عزت وسکون کی زندگی حاصل کریں اور اسی دستور سے عدل و انصاف کے طریقے اور حکمرانی کے قانون بھی سیکھ لیں۔

دُنیا میں خواہ کتنے ہی انقلابات وتغیرات پیش آئیں حکومتیں بدلیں عادات و رواج اور مزاج بدل جائیں، نئے نئے تقاضے اور ضرورتیں پیش آتی رہیں کسی بھی مرحلہ پر انسان اس دستورِ الٰہی اور قیامت تک رہنمائی کرنے والے محکم قانون "قرآن کریم" میں کسی نوع کی کوئی کمی نہیں پائے گا۔ اور قرآن کریم کے جامع و محکم اصول ہر مسئلہ اور ضرورت کا حل انسانی حیات کو عطا کرتے ہوئے اس اعلانِ خداوندی کی تصدیق کرتے جائیں گے۔ مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتَابِ مِنْ شَیْءٍ کہ ہم نے اس کتاب میں کسی چیز کی کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے۔

اس دستورِ الٰہی اور کامل ترین کتابِ ہدایت کی شان خود پروردگارِ عالم نے نہایت ہی پُرعظمت انداز سے بیان کردی ہے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ	اللہ رب العزت ہی ہے جس نے
کِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ تَقْشَعِرُّ	نہایت ہی عمدہ کلام نازل فرمایا جو
مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ	ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیتیں
رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُهُمْ	(فصاحت و بلاغت اور اعجاز میں)
وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ ذٰلِكَ	ایک دوسرے سے مشابہ ہیں جس سے
هُدَی اللّٰهِ یَهْدِیْ بِهٖ مَنْ	بدن ان لوگوں کے کانپ اٹھتے ہیں جو
یَّشَآءُ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا	اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں۔ پھر

لَهٗ مِنْ هَادٍ۔

پھر ان کے بدن اور دل نرم ہوکر اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جانے والے ہوتے ہیں ۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے وہ جس کو چاہتا ہے اس کے ذریعہ ہدایت دیتا ہے اور جس کو وہ گمراہ کردے اس کے واسطے کوئی ہادی نہیں ۔

(سورۃ الزمر ۲۳)

کہیں ارشاد فرمایا :

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا۔

تمام خوبیاں ثابت ہیں اس پروردگار کے لیے جس نے اپنے بندہ (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم) پر کتاب نازل فرمائی جس میں ذرہ برابر بھی نہیں رکھی ۔ نہایت ہی استقامت کے ساتھ موصوف بنایا تاکہ وہ ایک ایسے سخت عذاب سے ڈرائے جو رب کی طرف سے ہوگا اور ان ایمان لانے والوں کو خوشخبری سنائے جو نیکی کے کام کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے واسطے (ان کے پروردگار کے یہاں) بہت ہی بہترین اجر ہے ۔

(سورۃ کہف پارہ ۱۵)

کسی موقعہ پر یہ ارشاد فرمایا :

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۔

اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلّم) یہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کو ہم نے تم پر اتارا بڑی ہی برکتوں والا ہے اس لیے کہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور عقل والے اس سے نصیحت و عبرت حاصل کریں ۔

سورۃ ص ۲۳ پ

کہیں تمام عالم کے انسانوں کو مخاطب بناتے ہوئے فرمایا :

یَا أَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَکُمْ	اے لوگو ! یقیناً آچکی تمہارے پاس
بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّکُمْ وَ	تمہارے رب کی طرف سے ایک
أَنْزَلْنَا إِلَیْکُمْ نُورًا	صاف اور واضح دلیل اور نازل کردیا
مُبِینًا ۔	ہے ہم نے تمہاری جانب ایک جگمگاتا
(سورۃ نساء پ)	ہوا نور ۔

کہیں اِنْ هُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعَالَمِیْنَ کہہ کر تمام جہانوں کے واسطے پیغام رشد وہدایت ہونے کی تصریح فرمادی گئی ۔ کسی جگہ هٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ فرماکر قیامت تک کے واسطے اس دستور الہٰی کی جامعیت اور دین و دُنیا کے فلاح ونجاح کا ضامن ہونا بیان کردیا ۔

قرآن کریم کی یہ شان جامعیت اور تمام عالم کے واسطے دستور ہدایت ہونا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بزبان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح بیان فرما رہے ہیں :

قَالَ کِتَابُ اللّٰهِ فِیْهِ نَبَأُ مَا	فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے
قَبْلَکُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَکُمْ	کہ اللہ کی کتاب (یہی کتاب ہدایت
وَحُکْمُ مَا بَیْنَکُمْ هُوَ الْفَصْلُ	ہے) جس میں خبریں ہیں تم سے
لَیْسَ بِالْهَزْلِ مَنْ تَرَکَهُ	پہلوں کی اور احوال و واقعات
مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللّٰهُ وَمَنِ	ہیں ان کے بھی جو تم سے بعد والے
ابْتَغَى الْهُدَى فِیْ غَیْرِهٖ	ہیں ۔ اور (یہ کتاب الہٰی) فیصلہ
أَضَلَّهُ اللّٰهُ وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ	ہے تمہارے درمیان ہر خصومت
الْمَتِیْنُ وَهُوَ الذِّکْرُ الْحَکِیْمُ	ومعاملہ کے لیے جو ایک قانون محکم
وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ ،	ہے ۔ یہ کتاب الہٰی کوئی لغو اور مذاق
هُوَ الَّذِیْ لَا تَزِیْغُ بِهٖ	جیسی چیز نہیں ہے ۔ جو شخص اس کو

الاھواءُ ولا تلتبس بہ الالسنۃُ ولا یشبع منہ العلماءُ ولا یخلق عن کثرۃ الرد ولا ینقضی عجائبہٗ ۔ ھو الذی لم تنتہ الجن اذ سمعتہ حتیٰ قالوا انا سمعنا قرآنا عجبا یھدی الی الرشد فآمنا بہ ۔

قساوت قلبی اور نخوت و تکبر کی وجہ سے چھوڑے گا ۔ حق تعالیٰ اس کو ٹکڑے کروائے گا ۔ حق تعالیٰ اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا اور جو شخص ہدایت اس کے سوا کسی اور چیز میں تلاش کرے گا اللہ اس کو گمراہ کر دے گا ۔ یہ کتاب اللہ کی مضبوط رسی ہے اور یہی اللہ کا محکم ذکر اور بیان ہے اور یہی سیدھا راستہ ہے ۔ یہ قرآن اللہ کی وہ ہدایت ہے کہ لوگوں کی خواہشات اس کو ٹیڑھا نہیں کر سکتیں (یا اس کی پیروی کرتے ہوئے لوگوں کی خواہشات و افکار ٹیڑھے راہ نہیں ہو سکتے ۔ اور نہ لوگوں کی زبانیں اس کو ملتبس کر سکتی ہیں ، کہ اس کے ذریعہ حق اور باطل میں کوئی امتیاز و فرق نہ کیا جا سکے یا یہ کہ زبانیں قرآن کریم کا تلفظ و تکلم کرنے میں ملتبس نہیں ہو سکتیں کہ یہ نہ معلوم ہو سکے کہ یہ زبان حق بول رہی ہے یا باطل کا تلفظ کر رہی ہے بلکہ جو زبان قرآن کی مطابقت کے ساتھ ناطق ہے وہ حق ہی ہے اور یہ قرآن ایسا کلام ہے کہ علماء

اس سے کبھی سیر نہیں ہو سکتے اور نہ وہ
بار بار پڑھنے سے پرانا و بوسیدہ ہو سکتا
ہے (بلکہ ہر بار جب بھی تلاوت کی جائے
اس کی حلاوت و لذت اسی طرح باقی رہیگی
بلکہ جس قدر کثرت سے پڑھا جائے گا ہر
مرتبہ ایک نیا لطف اور مزہ ارباب ذوق
کو محسوس ہوگا - اور نہ ہی اس کے عجائب
(معارف و حقائق) کبھی ختم ہوں گے ۔
یہ قرآن کریم تو اللہ کا وہ کلام ہے کہ
جنات صبر نہ کر سکے جب کہ انھوں نے یہ
کلام پاک سنا یہاں تک کہ بول اٹھے بیشک
سنا ہے ہم نے ایک عجیب و غریب کلام ،
(قرآن کریم) کہ جس کی فصاحت و بلاغت
خوبی مضامین اور بلندی حقائق دنیا کو
حیرت و تعجب میں ڈالنے والی ہے) جو
رہنمائی کرتا ہے حق اور سیدھے راستہ کی ۔
پس ہم تو اس کلام پر ایمان لے آئے ہیں ۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد
فرمایا جس شخص نے قرآن کریم کے ساتھ نطق
کیا اس نے سچ بولا اور جس نے اس پر عمل کیا
وہ اجر و ثواب کا مستحق ہوا اور جس نے
اس کے مطابق فیصلہ کیا اس نے عدل و
انصاف کیا اور جس نے اس کی طرف لوگوں کو

دعوت دی اس نے صراط مستقیم (سیدھے
راستہ) کی طرف بلایا

بے شک حقیقت یہی ہے کہ دین و دُنیا کے لیے کامل ترین ہدایت جامع دستور اور نور کامل قرآن کریم ہی ہے جب کہ تمام عالم کفر و ضلالت اور جہالت کی تاریکیوں میں گھرا ہوا تھا۔ یہ نور کامل فاران کی چوٹیوں سے آفتاب عالم تاب بن کر روشن ہوا جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں دنیا کو نور ہدایت سے منور کر دیا۔ مکہ کی خشک اور بے آب گیا پہاڑیوں سے ایسی بے پایاں رحمت کے چشمے پھوٹے کہ تمام عالم سرسبز و شاداب ہوگیا اس کتاب مبین نے انسان کے واسطے سعادت دارین کی تمام راہیں کھول کر اس کی قوتِ نظریہ اور قوتِ عملیہ کی تکمیل کردی۔ تہذیب اخلاق تدبیر منزل، اور سیاست مدن کے وہ علوم سکھائے کہ مسلمان دُنیا کی تمام اقوام سے سبقت و برتری حاصل کر گئے۔ وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ "کا نقشہ دُنیا کی نظروں کے سامنے آگیا۔ خطرات و مصائب کے گرداب میں پھنسے ہوئے حال میں وَلَا تَھِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کا اعلانِ بشارت کفر و باطل کی طاغوتی طاقتوں کو پاش پاش کر دینے والا ثابت ہوا۔ قیصر و کسریٰ کی وہ سلطنت جس کے جاہ و جلال اور عظمت و شوکت سے تمام دُنیا کو مغلوب کر رکھا تھا ذلیل و شرمندہ ہو کر مسلمانوں کے قدموں پر آگری۔

کتاب الٰہی کی اس عظمت و برتری سے امیرالمومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو بر سرِ منبر آگاہ فرما دیا تھا۔

یَآ اَیُّھَا النَّاسُ اَمَا اِنَّ نَبِیَّکُمْ	کہ اے لوگو! بے شک تمہارے پیغمبر
صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَدْ قَالَ	صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ	ہے کہ یقیناً حق تعالیٰ شانہٗ اس
اَقْوَامًا وَّیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ۔	کتاب کی بدولت بہت سی قوموں
(صحیح مسلم شریف)	کو سربلند فرماتا ہے اور دُوسری کو پستی

قوموں کو اسی کی وجہ سے (جب کہ وہ نہ
اس کو سیکھیں اور نہ اس پر عمل کریں)
ذلیل و خوار اور پست کر دیتا ہے۔

پیش نظر کتاب مَنَازِلُ الْعِرْفَان فِیْ عُلُوْمِ الْقُرْآن ایسے ہی چند مباحث پر مشتمل ہے جن کے مطالعہ سے انشاء اللہ تعالیٰ علوم قرآن کی حقیقی عظمتوں کو پہچانا جا سکے گا۔ اور یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ انسان کس طرح اپنے اعتقاد و عمل اخلاق و معاشرت اور معاملات کی اصلاح کر کے فوز و فلاح اور سعادتِ عظمیٰ کا مقام حاصل کر سکتا ہے۔

اس مقصد کے لیے یہ چند مباحث فہم قرآن کریم کے بنیادی اصول و قواعد کو مختصراً جمع کرتے ہوئے حضرات قارئین کرام کی خدمت میں "بضَاعَةً مُّزْجَاةً" کے درجہ میں پیش ہیں۔ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَ اِلَیْہِ اُنِیْبُ حق تعالیٰ شانہٗ محض اپنے فضل و کرم سے قبول فرمائے اور اس ناچیز نیز حضرات اہل علم اور تمام مسلمانوں کے لیے نافع بنائے اور اپنی رضا و خوشنودی کا ذریعہ بنائے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ، وَصَلَّی اللّٰہُ عَلَی النَّبِیِّ الْکَرِیْمِ۔

اَلْقُرْآنْ

اس جامع اور کامل دستور اور کتاب ہدایت کو جس خاص لقب اور نام سے تعبیر کیا گیا وہ لفظ "قرآن" ہے جیسا کہ ارشاد ہے اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (سورہ الزخرف) يٰسٓ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ (یٰس پارہ ۲۲) وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (سورۃ النحل پارہ ۱۴) اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (سورۃ الجن پ ۲۹) اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ (سورۃ واقعہ پارہ ۲۷) قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ (سورۃ اسرا پارہ ۱۵) بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ اسی طرح اور بہت سی آیات ہیں جن میں علوم الٰہیہ کی اس جامع اور آخری کتاب کو اسی مبارک لقب سے تعبیر فرمایا گیا۔

ائمہ لغت اور مفسرین کے اقوال اس بارہ میں مختلف ہیں کہ لفظ قرآن اسم علم غیر مشتق ہے یا اسم مشتق۔ امام شافعیؒ اور دوسرے بعض ائمہ لغت و تفسیر سے یہ منقول ہے کہ قرآن علم غیر مشتق ہے جس طرح کہ تورات و انجیل حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ پر نازل کی ہوئی کتابوں کا نام تھا۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے اس لفظ کو اس کلام کے لیے بطور نام مقرر فرمایا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا۔ اس تقدیر پر یہ لفظ غیر مہموز پڑھا جائے گا چنانچہ ابن کثیر کی قرأت غیر مہموز ہے اور بیہقی سے یہی نقل کیا گیا۔[1]

اس کے بالمقابل مفسرین و ائمہ لغت کی ایک دوسری جماعت اشتقاق کا قول اختیار کرتی ہے۔ اشتقاق کا قول اختیار کرنے کی صورت میں بعض کی رائے یہ ہے کہ یہ لفظ

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج ۱۔ روح المعانی ج ۱۔

toobaa-elibrary

قرن سے ماخوذ ہے جس کے معنی جمع کے آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے قرنت الشئ بالشئ کہ ایک چیز کو دوسری چیز کی ساتھ جمع کیا تو اس لحاظ سے قرآن کو قرآن اس لیے کہا جائے گا کہ اس میں آیات وسورتوں اور حروف وکلمات کا ایک خاص انداز کے ساتھ باہمی انضمام و اجتماع ہے۔ اس تحقیق کی بنا پر بھی لفظ قرآن غیر مہموز ہی پڑھا جائے گا۔

زجاج کا قول ہے کہ اس کا اشتقاق بجائے قرن کے لفظ قرء سے ہے اور قرء کے معنی بھی جمع کے آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ قرءت الماء فی الحوض کہ پانی حوض میں جمع کیا۔ اس لحاظ سے قرآن فعلان کے وزن پر صفت کا صیغہ ہوگا۔ ابوعبیدہ اس کی وجہ تسمیہ میں یہ کہتے ہیں کہ یہ کلام بہت سی سورتوں کو (ایک عجیب انداز سے) جمع کرنے والا ہے اس لیے اس کو قرآن کہا گیا۔ امام راغبؒ بیان فرماتے ہیں کہ کلام کے ہر مجموعہ کو یا ہر جمع کردہ شے کو قرآن نہیں کہا جاسکتا۔ قرآن صرف کلام الٰہی کا نام ہے اس وجہ سے کہ یہ تمام کتب سابقہ کا جو انبیا سابقین پر نازل کی گئیں ان کے علوم ومعارف کا مجموعہ اور لباب ہے۔

اللحیانی اور بعض دوسرے ائمہ لغت بیان کرتے ہیں کہ قرآن مصدر ہے غفران کی طرح جس کا مادہ قرأت ہے۔ کتاب مقروء تلاوت وقرأت کردہ پر اس کا اطلاق کیا گیا۔ علماء عربیہ کے نزدیک یہ بات متعارف ہے کہ مصدر کا اطلاق مفعول پر کیا جائے تو اس لحاظ سے کتاب اللہ کو قرآن کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اور اس صورت میں لفظ قرآن ہمزہ کے ساتھ تلفظ کیا جائے گا۔ اکثر ائمہ اور قراء کے نزدیک یہی اولیٰ ہے اور قرآن کریم نے لفظ قرآن قرأت کے معنی میں استعمال کیا ہے چنانچہ ارشاد ہے ... فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۔ کہ جب ہم (اپنے فرشتہ کے ذریعہ) اس کو پڑھیں تو اے پیغمبرؐ تم اس کی قرأت کی اتباع و پیروی کرو۔ غرض معنوی لحاظ سے بھی یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ لفظ قرآن قرءٗ بمعنی پڑھا اور تلاوت کیا" سے ماخوذ قرار دیا جائے تو کتاب اللہ کو قرآن کہنا بایں معنی ہوگا کہ درحقیقت پڑھنے کے لائق کتاب تو قرآن کریم ہی ہے اور یہ عنوان اسی تعبیر کے درجہ میں ہوجائے گا جو خود حق تعالیٰ شانہٗ نے کلام پاک کے تعارف کے لیے اختیار فرمائی اور ارشاد فرمایا " ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ

ے روح المعانی ج ۱ ص ۸ الاتقان فی علوم القرآن

قرآن کریم کا اصطلاحی مفہوم

گذشتہ سطور سے یہ بات واضح ہو چکی اور دنیا جانتی ہے کہ قرآن اللہ کا وہ کلام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا۔

امام بیہقیؒ کتاب الاعتقاد میں فرماتے ہیں :

اَلْقُرْآنُ کَلَامُ اللّٰہِ وَکَلَامُ اللّٰہِ صِفَۃٌ مِنْ صِفَاتِ ذَاتِہِ الخ	قرآن اللہ کا کلام ہے اور اللہ کا کلام حق تعالیٰ کی صفات ذاتیہ میں سے ایک اس کی صفت ہے۔

اور حق تعالیٰ شانہٗ کی صفات میں سے کوئی صفت نہ مخلوق ہے اور نہ حادث۔ بلکہ جس طرح اللہ رب العزت قدیم ہے اسی طرح اس کی صفت کلام بھی قدیم ہے۔ ارشاد مبارک ہے اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْنَاہُ اَنْ نَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ کہ ہم جب کسی چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو صرف ہمارا قول کُن ہی صادر ہوتا ہے اور وہ چیز موجود ہو جاتی ہے۔

لہ یہ مسئلہ متکلمین و محدثین کے نزدیک نہایت مہتم بالشان رہا ہے۔ یہ مباحث چونکہ فنی اور اصولی ہیں اس وجہ سے اس مختصر کتاب میں ان مباحث اور مسئلہ کے متعلقہ پہلوؤں سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ یہ چند کلمات صرف اس اجمالی تعارف کے لیے کہے گئے کہ قرآن اللہ کا کلام کوئی مخلوق و حادث شے نہیں بلکہ اس کی صفت ہے۔ اور جس طرح اس کی جمیع صفات قدیم ہیں ایسے ہی قرآن بھی اللہ کا کلام قدیم ہے۔ مخلوق و حادث نہیں ۱۲۔

جس جگہ بھی کلام خداوندی کا ذکر آیا ہے خدا تعالیٰ نے اپنی طرف نسبت کرتے ہوئے خود اپنے آپ کو متکلم فرمایا تاکہ یہ بات بخوبی واضح ہو جائے کہ جس طرح خداوند عالم صفت قدرت کے ساتھ متصف ہونے کی بنا پر قدیر ہے۔ صفت علم اور سمع و بصر کے ساتھ اتصاف کے باعث وہ علیم سمیع اور بصیر ہے۔ علیٰ ہذا القیاس وہ وصف کلام سے متصف ہونے کی بنا پر متکلم بھی ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ۔

(سورۃ الشوریٰ)

اور یہ ممکن نہیں ہے کسی بشر کے واسطے ... کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرمائے۔ مگر صرف بصورت وحی (اور القاء باطنی) یا ازپس پردہ یا یہ کہ وہ کسی قاصد (فرشتہ) کو بھیج دے اور پھر وہ قاصد اللہ کا پیغام اللہ کے حکم سے پہنچا دے، جو بھی پیغام اللہ بھیجنا چاہے۔

حق تعالیٰ کا فرمان ہے وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا۔ ابن حزم اپنی کتاب "الملل والنحل" میں بیان کرتے ہیں کہ تمام اہل اسلام کا اس پر اجماع و اتفاق ہے کہ خدا ہی نے موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور پر کلام فرمایا تھا۔ اور یہ کہ قرآن اللہ ہی کا کلام ہے۔

بیہقی نے نیار بن مکرم کی حدیث تخریج کی اس میں یہ مضمون ہے کہ ابوبکر صدیق نے ایک دفعہ مشرکین کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت کی تو وہ لوگ پوچھنے لگے کہ یہ تمہارا کلام ہے یا تمہارے صاحب (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کا۔ ابوبکرؓ نے جواب دیا:

لَيْسَ بِكَلَامِي وَلَا كَلَامِ صَاحِبِي وَلَكِنَّهُ كَلَامُ اللَّهِ

(اخرجہ الترمذی)

نہ تو یہ میرا کلام ہے اور نہ میرے صاحب کا کلام ہے۔ بلکہ یہ تو اللہ عزوجل کا کلام ہے۔

حضرات اصولیین نے کتاب اللہ کی تعریف اس طرح کی ہے:

أَمَّا الْكِتَابُ فَالْقُرْآنُ الْمُنَزَّلُ عَلَى الرَّسُوْلِ الْمَكْتُوْبُ فِي الْمَصَاحِفِ الْمَنْقُوْلُ عَنْهُ نَقْلاً مُتَوَاتِراً بِلاَ شُبْهَةٍ وَهُوَ النَّظْمُ وَالْمَعْنَى جَمِيْعاً فِي قَوْلِ عَامَّةِ الْعُلَمَاءِ وَهُوَ الصَّحِيْحُ مِنْ مَذْهَبِ أَبِي حَنِيْفَةَ رَحْمَةُ اللّٰهِ تَعَالٰى

قرآن کریم وہ کلام الٰہی ہے جو نازل کیا گیا رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو لکھا ہوا ہے مصاحف میں جو منقول ہے آنحضرت سے نقل متواتر کے ساتھ کہ جس میں کسی شبہ کا امکان نہیں اور وہ نام ہے نظم یعنی تعبیر اور معنی دونوں کا ۔ عام طور پر کل علماء اور فقہاء کے قول میں اور یہی صحیح ہے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کے مذہب میں ۔

تو لفظ المنزل علی الرسول سے وہ تمام کتب سماویہ خارج ہوگئیں جو انبیاء سابقین پر اتریں اور لفظ المکتوب فی المصاحف سے وہ چند آیات خارج ہوگئیں جو اگرچہ ابتدا میں نازل ہوئیں اور ان کو کچھ روز تلاوت بھی کیا گیا لیکن بعد میں وہ منسوخ التلاوۃ ہوگئیں ۔ اور نقل متواتر کی قید سے وہ بعض الفاظ اور کلمات خارج ہوگئے جو بعض قراء اور صحابہ سے بطور شاذ اور تفرد منقول ہیں تو قرآن کی تعریف ان کلمات پر صادق نہ آئے گی جو کلمات قرأت شاذہ کے طور پر پڑھے جاتے ہیں ۔

اسماء قرآن کریم

کلمات سابقہ سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ قرآن کریم حق تعالیٰ شانہٗ کا کلام ہے اور ایسی بلند پایہ کتاب عزیز ہے کہ لَا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (یعنی نہ باطل اس کے سامنے سے آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے ۔ یہ تو حکیم حمید کی بارگاہ سے نازل کردہ کتاب ہے) اور پروردگار عالم کی صفت ذاتیہ قدیمہ ہے ۔ اس وجہ سے یہ کلام پاک بھی اسی عظمت و برتری کا مستحق ہے جو حق تعالیٰ کی ذات کبریائی کے لائق ہو ۔ اس بناء پر

قرآن کریم کے متعدد نام آیات قرآنیہ میں ذکر کیے گئے کہ جس طرح حق تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ اس کی صفات و عظمتوں کا عنوان ہیں اسی طرح اس کے کلام کی خصوصیات اور خوبیوں پر دلالت کرنے والے متعدد القاب و اسماء تجویز کیے گئے۔ جاحظ کہتے ہیں[1]: " اللہ نے اپنی کتاب کا نام "قرآن" ایسا نرالا اور بے مثال نام رکھا کہ نہ عرب کے لوگ اپنے کلام کے مجموعوں کا یہ نام رکھتے تھے اور نہ ہی کبھی دنیا میں کسی کتاب کا یہ نام رکھا گیا ... تو جیسا نرالا اور بے مثال کلام تھا ایسا ہی نام بھی بے مثال مقرر فرمایا گیا۔

شیخ ابوالمعالی[2] عزیز بن عبدالملک بیان کرتے ہیں کہ قرآن کریم کے پچپن نام ایسے ہیں جو خود آیاتِ قرآنیہ سے ماخوذ ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر ان اسماء مبارکہ کی ایک مختصر فہرست حضرات قارئین کے سامنے پیش کردی جائے جس میں ہر نام کی وجہ تسمیہ کے ساتھ یہ بھی ظاہر کردیا جائے کہ یہ نام کن کن آیات قرآنیہ سے استنباط کیے گئے ہیں۔

اسماء قرآن کریم	وجہ تسمیہ	وہ آیات جن سے نام کا استنباط کیا گیا۔
اَلْقُرْآن	. . . .	اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ۔
۱۔ اَلْقُرْآنُ الْكَرِيْمُ	اس لیے کہ یہ کلام بڑی کرامت اور بزرگی والا ہے۔	اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِىْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ۔
۲۔ اَلْقُرْآنُ الْعَظِيْمُ	اس لیے کہ یہ کلام نہایت ہی عظمت اور بڑی بلند شان رکھنے والا ہے۔	
۳۔ اَلْقُرْآنُ الْحَكِيْمُ	اس لیے کہ بڑی بلند پایہ حکمتوں والا ہے۔	يٰسٓ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيْمِ۔

[1] - الاتقان سیوطی ج ۱ ص ۵۱ ۔ [2] کتاب البرہان - الاتقان ج اوّل -

اسماء قرآن کریم	وجہ تسمیہ	وہ آیات جن سے نام کا استنباط کیا گیا ۔
۴ ۔ اَلْفُرْقَانُ[له]	اس لیے کہ وہ حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے ۔ یا اس وجہ سے کہ اس کی آیات متفرق متفرق نازل کی گئیں ۔	تَبَارَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَی النَّاسِ عَلٰی مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا ۔
۵ ۔ اَلسَّبْعُ الْمَثَانِیْ	اس لیے کہ آیات قرآنیہ بار بار تلاوت کی جاتی ہیں ۔ بالخصوص سورۃ فاتحہ نماز کی ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہے	وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ مَثَانِیَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۔
۶ ۔ الکتاب المُبِیْن	اس لیے کہ وہ حق اور ہدایت کو واضح کرنے والی کتاب ہے ۔	حٰمٓ وَالْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ
۷ ۔ اَلْكَرِیْم	اس لیے کہ وہ سراپا کرامت ہے	اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ ۔

له امام رازی رحمۃ اللہ تفسیر کبیر جلد ۲ میں اسماء قرآن کی بحث کے دوران فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کا فرقان عنوان اس وجہ سے ہے کہ وہ حق و باطل اور حلال و حرام کے درمیان فرق کرنے والا ہے اور فرقان کے معنی نجات کے بھی ہیں ۔ عکرمہ اور سُدی سے یہی منقول ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم یقیناً سبب نجات ہے اس لیے وجہ تسمیہ محتاج بیان نہیں۔ نیز اس بنا پر بھی یہ نام ہے کہ تمام عالم اور مخلوق گمراہی کی تاریکیوں میں تھی ۔ قرآن کریم کی بدولت ہی عالم نے نور ہدایت اور نجات کا راستہ پایا ۔ چنانچہ مفسرین کی ایک جماعت نے اس لفظ کو اسی معنی پر محمول کیا ہے اور بطور قرینہ قرآن کریم کی یہ آیت پیش فرمائی وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (اور یاد کرو اس واقعہ کو جب کہ ہم نے موسیٰ کو (باقی اگلے صفحہ پر)

اسمائے قرآن	وجہ تسمیہ	وہ آیات جن سے استنباط کیا گیا۔
۸۔ کلام اللہ	. . . .	حَتّٰی یَسْمَعَ کَلَامَ اللّٰهِ
۹۔ نُور	اس لیے کہ وہ اللہ کا نور ہے۔	وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِیْنٌ۔ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗ
۱۰۔ ھُدًی و رَحْمَة	اس لیے کہ ہدایت و رحمت ہے۔	هُدًی وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ۔ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی
۱۲۔ شِفَاء	اس لیے کہ روحانی شفا اور پیغام صحت	قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ
۱۳۔ موعظة	ہے۔	رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ
۱۴۔ ذِکْر	اس لیے کہ بابرکت ہے اور ذکر ونصیحت ہے	وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ
۱۵۔ مبارک		
۱۶۔ علیّ	اس لیے کہ بڑی عظمت و برتری والا کلام ہے۔	وَاِنَّهٗ فِیْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَكِیْمٌ۔
۱۷۔ حِکمة	اس لیے کہ سراپا حکمت ہے	حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ
۱۸۔ حَکِیم	״ ״ ״	تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ۔
۱۹۔ مُھَیمِن	اس لیے کہ وہ نگہبان و گواہ ہے اور برکت ہے تمام عالم کے لیے۔	مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَیْمِنًا عَلَیْهِ

(بقیہ حاشیہ) کتاب دی اور فرقان نازل فرمایا شاید یہ کہ تم ہدایت حاصل کرو۔ تو ہدایت کے حصول کا مضمون اس معنی کے ساتھ مطابقت اور مناسبت رکھتا ہے۔ (تفسیر کبیر ج۱)

اسماء قرآن	وجہ تسمیہ	وہ آیات جن سے استنباط کیا گیا۔
۲۰۔ صِرَاطٌ مُسْتَقِيْمٌ	اس لیے کہ وہ تمام عالم کے واسطے سیدھا راستہ ہے۔	اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا
۲۱۔ قَيِّمٌ	اس لیے کہ اس کی ہر ہدایت وتعلیم عالم کے واسطے نگران و محافظ ہے۔	وَلَمْ يَجْعَلْ لَهٗ عِوَجًا قَيِّمًا لِيُنْذِرَ۔
۲۲۔ قَوْلٌ فَصْلٌ	اس لیے کہ اس کی ہر بات قول محکم اور فیصل ہے۔	اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ۔
۲۳۔ نَبَاءٌ عَظِيْمٌ	اس لیے کہ اس کی ہر خبر نہایت عظیم ہے۔	قُلْ هُوَ نَبَاٌ عَظِيْمٌ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ الَّذِيْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ۔
۲۴۔ اَحْسَنُ الْحَدِيْثِ	اس لیے کہ اس کی ہر بات نہایت بہترین	اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ
۲۵۔ مُتَشَابِهٌ	ہے اور عبرت کے لیے بار بار اس کو دہرایا گیا۔	كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا۔
۲۶۔ تَنْزِيْلٌ	اس لیے کہ اس کو آسمان سے اتارا گیا	وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ
۲۷۔ رُوْحٌ	اس لیے کہ انسانوں کے قلوب کے لیے حیات ہے۔	وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا۔
۲۸۔ وَحْيٌ	اس لیے کہ وحی الہٰی ہے۔	قُلْ اِنَّمَا اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ
۲۹۔ عَرَبِيٌّ	اس لیے زبان عربی ہے۔	اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا
۳۰۔ بَصَائِرُ	اس لیے وہ بصائر اور عبرتوں کا مجموعہ	هٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ۔
۳۱۔ بَيَانٌ	اس لیے کہ اس کی ہر تعلیم واضح اور ظاہر ہے۔	هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ۔
۳۲۔ العلم	اس لیے کہ وہ سراپا علم و معرفت ہے۔	مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ

اسماء قرآن کریم	وجہ تسمیہ	وہ آیات جن سے استنباط کیا گیا ۔
۳۳ ۔ اَلْحَقُّ	اس لیے کہ وہ سراپا حق ہے	اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْحَقُّ الْمُبِیْن
۳۴ ۔ ھادی	اس لیے کہ وہ تمام عالم کے لیے رہنما ہے ۔	اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ ۔
۳۵ ۔ عَجَب	اس لیے کہ وہ اپنے حقائق و معارف سے دُنیا کو حیرت و تعجب میں ڈالنے والا ہے ۔	اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۔
۳۶ ۔ تَبْصِرَة ۳۷ ۔ ذِکْرٰی	اس لیے کہ وہ عبرت و نصیحت کا سامان ہے ۔	تَبْصِرَةً وَّ ذِکْرٰی لِکُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ ۔
۳۸ ۔ اَلْعُرْوَةُ الْوُثْقٰی	اس لیے کہ وہ ہدایت و عمل کے لیے ایک مضبوط حلقہ ہے ۔	فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَهَا ۔
۳۹ ۔ صِدْق	اس لیے کہ وہ سراپا صداقت ہے ۔	وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ ۔
۴۰ ۔ عَدْل	اس لیے کہ وہ سراپا عدل و انصاف ہے	وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ۔
۴۱ ۔ اَمْر	اس لیے کہ وہ اللہ کا حکم ہے ۔	ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗ اِلَیْكُمْ ۔
۴۲ ۔ مُنَادِی	اس لیے کہ وہ حق کی طرف لوگوں کو پکارنے والا ہے ۔	رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ ۔
۴۳ ۔ هُدًی وَّبُشْرٰی	اس لیے کہ ہدایت ہے اور اہل ایمان کے واسطے بشارت ہے ۔	هُدًی وَّ بُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ
۴۵ ۔ مَجِیْد	اس لیے کہ مجد و بزرگی والا ہے ۔	بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ

اسماء قرآن مجید	وجہ تسمیہ	وہ آیات جن سے استنباط کیا گیا۔
۴۶ ۔ اَلزَّبُوْرُ[له]	اس لیے علوم ہدایت اس میں جمع کر دیئے گئے ہیں ۔	وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۔
۴۷ ۔ بَشِيْر	اس لیے کہ مومنین کو اجر و ثواب کی بشارت سنانے والا ہے اور کافروں	قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ بَشِيْرًا ۔
۴۸ ۔ نَذِيْر	کو عذاب خداوندی سے ڈرانے والا ہے ۔	وَنَذِيْرًا ۔
۴۹ ۔ عَزِيْز	اس لیے کہ وہ عزت والا کلام ہے	وَاِنَّهٗ لَكِتَابٌ عَزِيْزٌ لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ هٰذَا
۵۰ ۔ بلاغ	اس لیے کہ یہ ایک ایسا پیغام ہے جو ہر ایک تک پہنچا دیا گیا ۔	بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ ۔
۵۱ ۔ قَصَص	اس لیے امم سابقہ کے واقعات اس میں مذکور ہیں ۔	اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۔
۵۲ ۔ صُحُفٌ مُّكَرَّمَة	اس لیے کہ کلام پاک جن اوراق پر	فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ
۵۳ ۔ مَرْفُوْعَة	مکتوب ہے وہ اوراق بھی ۔ بڑی عزت والے ہیں اور عزت و	مَّرْفُوْعَةٍ
۵۴ ۔ مُطَهَّرَة	عظمت کے ساتھ انہیں سروں پہ اٹھایا جاتا ہے ۔	مُّطَهَّرَةٍ
۵۵ ۔ اَلْكِتَابُ	اس لیے کہ دنیا کی کتابوں میں کتاب کہلانے کا مستحق قرآن ہی ہے	ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

له ۔ قرآن کریم کے اسماء میں بعض مفسرین نے زبور نام بھی ذکر کیا ہے اور انہوں نے اس آیت میں زبور سے داؤد علیہ السلام کی کتاب زبور مراد نہیں لی بلکہ قرآن کریم مراد لیا ہے ۱۲۰ (البرہان ۔ الاتقان)

امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں اسماء قرآن کے ذیل میں ایک نام حَبْلُ اللّٰہ بھی بیان کیا ہے اور فرمایا وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہ کی تفسیر بعض مفسرین کے نزدیک یہی ہے کہ قرآن کریم پر مضبوطی اور پختگی سے عمل کرتے رہو کیونکہ جو شخص قرآن کریم پر مضبوطی سے عمل کرنے والا ہوگا وہ عذاب آخرت اور دنیوی مصائب سے اسی طرح نجات و خلاصی حاصل کرنے والا ہوگا جس طرح کہ کوئی شخص مضبوطی سے کسی رسی کو پکڑ لینے کی وجہ سے غرق ہونے یا ہلاک ہونے سے بچ جاتا ہے۔ اسی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کو عصمت کے عنوان سے تعبیر فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا "اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ عِصْمَۃٌ لِّمَنِ اعْتَصَمَ" کہ یہ قرآن کریم عصمت و حفاظت ہے۔ ہر اس شخص کے لیے جو اس کے ذریعے حفاظت و عافیت حاصل کرنا چاہے۔[1]

حدیث کے ان الفاظ سے مزید ایک نام عِصْمَۃ بھی معلوم ہوگیا جس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ قرآن لوگوں کو معاصی سے بچانے والا ہے۔ نیز ایک اور نام نِعْمَۃ بھی بعض مفسرین کی رائے کے مطابق مفہوم ہوتا ہے۔ انھوں نے آیت "وَاَمَّا بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ" کی تفسیر میں نعمت سے قرآن کریم مراد لیا ہے بعض حضرات مفسرین نے فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ (واقعۃ) کی تفسیر میں مواقع نجوم سے ستاروں کے ٹوٹنے کی تفسیر کے علاوہ آیات قرآنیہ کا نزول بھی بیان کیا ہے۔ اس لحاظ سے کہ قرآن کریم نجماً نجماً یعنی ٹکڑے ٹکڑے ہوکر متفرق اوقات اور زمانوں میں نازل ہوا تو گویا حق تعالیٰ نے اس مقام پر آیات قرآنیہ کے نزول اور ان کے مواقع نزول کی قسم کھائی ہے۔

اس طرح فہرست میں مرتب کردہ ناموں سے مزید چار اور نام قرآن کریم کے معلوم ہوئے۔ حَبْلُ اللّٰہ۔ عِصْمَۃ۔ نِعْمَۃ۔ نَجْمٌ یا نُجُوْم۔ فہرست میں جو نام ذکر کیے گئے وہ چونکہ صراحۃً آیات قرآنیہ سے بحیثیت اسماء قرآن مستنبط ہیں

---

[1] تفسیر کبیر ج ۲ ص ۱۵ - ۱۶۔

اوران کے اسماء قرآن ہونے پہ تمام مفسرین کو اتفاق ہے اس وجہ سے اصل فہرست میں ان کو ذکر کیا گیا۔ اور یہ چار نام صرف بعض مفسرین کی تفسیر کے لحاظ سے مستفاد تھے اس وجہ سے ان کو الحاقی طور پہ بعد میں بیان کیا گیا۔

اسماء قرآن پہ نظر کرتے ہوئے ایک خاص اور لطیف امر کا احساس ہوتا ہے، وہ یہ کہ جس طرح قرآن خداوند عالم اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان باہمی ارتباط و تعلق ہے۔ اللہ کا کلام تو اللہ کی صفت ہی ہے اور اس کلام الٰہی کا نزول خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہ ہوا تو اللہ، اللہ کا کلام، اور اللہ کے پیغمبر کے باہمی ربط کی طرح اسماء میں بھی باہمی ربط و تعلق کی یہ شان عجیب و غریب طرح نمایاں ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ اسماء حسنیٰ ... اسماء قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء مبارکہ ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے موتی ہیں۔

مثلاً الحکیم قرآن کریم کے اسماء میں سے ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا: تِلْكَ آيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ اور يٰسٓ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ۔ دوسری طرف یہی لقب حق تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں ہے۔ چنانچہ آیات اسماء حسنیٰ کے آخر میں ہے۔ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اور تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ اور حضور اقدس وہ صاحب حکمت اور معلّم حکمت دانا و حکیم ہیں کہ اس معلّم الحکمت کی بعثت کے لیے سیدنا ابراہیم خلیل اللہ اور سیدنا اسمٰعیل علیہما السلام تعمیر بیت اللہ کے وقت دعائیں مانگ رہے تھے۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ آپ دنیا کو حکمت و دانائی کا سبق دینے والے ایسے حکیم تھے کہ آپ کا گھر ہی قرآن کریم کی زبان میں دار الحکمۃ قرار پایا۔ فرمایا گیا ... وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ جس کا حاصل یہ ہے کہ ربّ عزیز و حکیم نے کتاب حکیم اس دانا و حکیم رسول پہ نازل فرمائی جس نے تمام عالم کو درس حکمت دیا۔

اسی طرح نور قرآن کریم کے اسماء میں سے ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا :
"وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا" اور وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْ اُنْزِلَ مَعَهٗ" اور جس ذات رب العزت کا یہ کلام سراپا نور و ہدایت نازل ہوا وہ تمام کائنات آسمانوں اور زمین کا نور ہے ۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور جس پیغمبر خاتم الانبیاء والرسل پر یہ کلام نازل کیا گیا وہ تمام عالم کو اس نور ہدایت سے منور و روشن کر دینے والا سراج منیر ہے یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا (الاحزاب)
علیٰ ہذا القیاس العزیز حق تعالیٰ شانہٗ کا نام ہے ۔ ارشاد خداوندی ہے :
اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ یہی لقب القاب قرآنی میں بھی بیان فرمایا گیا وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِیْزٌ ۔ اُدھر پیغمبر خدا کی شان میں یہ کلمہ وارد ہو گیا لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ اس طرح سمجھ میں آیا کہ رب عزیز نے کتاب عزیز عزت و کرامت والے پیغمبر عزیز پر نازل فرمائی ۔ ظاہر ہے کہ تمام عزتوں کا مالک خدا تعالیٰ ہے ۔ اس نے عزتوں کے خزانے اپنے پیغمبر کو عطا کیے تاکہ ان کے ذریعے تمام عالم کو عزت و برتری تقسیم کی جائے وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ اور آپؐ پر ایمان لانے والی اُمت بھی اس ارتباط و انتساب سے وصف عزت میں شریک ہو کر اُمتِ عزیز ہو جائے ۔

عزت کا مفہوم اہل لغت نے غلبہ اور قہر بھی بیان کیا ہے تو رب العالمین کا بایں معنی عزیز ہونا ظاہر ہے ۔ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ کہ خداوند عالم تمام کائنات پر غالب ہے ۔ اور قرآن اس لحاظ سے اس طرح عزیز و غالب ہے کہ دنیا اس کے مقابلہ سے عاجز آئی ۔ اس کی فصاحت و بلاغت علوم و معارف اور حقائق کی بلندیوں کے سامنے تمام عالم کے حکماء و فلاسفہ مغلوب و مقہور ہو گئے ۔ دلائل کی قوت نے تمام طاغوتی طاقتوں کو پاش پاش کر ڈالا ۔

نبی عزیز بھی وہ نبی غالب و عزیز ہے جس نے قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج

اپنے قدموں میں رگڑ ڈالے۔ اور اُمت بھی سبحان اللہ وہ عزیز و غالب اُمت ہوئی کہ عرب و عجم اور مشرق و مغرب فتح کر کے دُنیا کے بڑے نامور اور عزت والے سلاطین کے محلوں اور قلعوں پر اسلام کے پرچم لہرائیے اور اپنے غلبہ و شوکت سے دُنیا کی نظروں کے سامنے یہ حقیقت آشکارا کر دی جس کو نبی عزیز نے لبطور بشارت پہلے ہی فرما دیا تھا لَا یَبْقیٰ عَلیٰ ظَهْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ کَلِمَةَ الْاِسْلَامِ اِمَّا بِعِزِّ عَزِیْزٍ وَ ذُلِّ ذَلِیْلٍ[1] الخ۔ کہ روئے زمین پر کوئی مکان خواہ اینٹ پتھر کا ہو یا کوئی خیمہ باقی نہ رہے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس میں اسلام کا کلمہ پہنچا دے گا۔ عزیز کی عزت کے ساتھ، یا ذلیل و شرمسار کی ذلت کے ساتھ۔

الغرض رب عزیز نے کتاب عزیز نبی عزیز پر اُمت عزیز کے لیے نازل کی اسی طرح لفظ کریم قرآن کریم کے اسماء میں ہے، اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ، تو قرآن کریم ہے رب بھی کریم ہے جیسا کہ ارشاد ہے مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ اور لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِیْمِ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی کریم وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ کَرِیْمٌ اور حتیٰ کہ جو قاصد اس کتاب کریم کو لانے والا وہ بھی کریم جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ ذِیْ قُوَّةٍ تمام مفسرین نے یہی بیان کیا ہے اس جگہ رسول کریم سے قاصد کریم یعنی جبرئیل امین مراد ہیں۔ اور جو اُمت اس کتاب کریم کو حاصل کرے گی وہ بھی کریم اور جب اُمتی اس پر عمل کریں گے تو مقام کریم کے مستحق ہوں گے۔

رب بھی کریم۔ رسول بھی کریم۔ کتاب بھی کریم اور جو قاصد لے کر آیا وہ بھی کریم۔ اُمت بھی کریم اور اس پر عمل کے ذریعے جو مقام حاصل ہو گا وہ بھی مقام کریم اس طرح کرم کا مادہ رب العالمین سے لے کر اجر و ثواب اور مقام و مرتبہ کی کرامت تک مسلسل قائم و باقی رہا۔

---

[1] مسند احمد بن حنبل۔ مشکوٰۃ المصابیح۔

یہی حال قرآن کریم کے ناموں میں "عظیم" کا ہے کہ قرآن کتاب عظیم ہے۔
وَلَقَدْ آتَیْنَاکَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْآنَ الْعَظِیْمَ۔ اس کو نازل
فرمانے والا رب بھی الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ہے اور جس پیغمبر پر یہ کتاب نازل کی گئی
اس کا خلق بھی عظیم ہے جیسا کہ فرمایا گیا وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔ اور جو
لوگ اس کتاب پر عمل کریں گے ان کے واسطے جس بدلہ کا وعدہ فرمایا گیا وہ بھی
اجر عظیم ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا
الصّٰلِحَاتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِیْمٌ

فضائلِ قرآن

فضائل قرآن کا موضوع متقدمین علماء کے درمیان اہم موضوع رہا ہے۔
اس پر محدثین اور امت کے علما مستقل کتابیں تالیف کرتے رہے اور اس
قرن تک بھی یہ سلسلہ برابر جاری ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ رہے گا۔ قرآن کریم
کی عظمت و منزلت اور فضیلت سمجھنے کے لیے یہ آیت مبارکہ ہی بہت
کافی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَ هُدًی وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ

اے انسانو! یقیناً آچکا تمہارے پاس ایک خاص پیغام نصیحت تمہارے پروردگار کی طرف سے اور شفا و عافیت کا سامان ان تمام بیماریوں کے لیے جو سینوں میں ہوں اور ہدایت و رحمت۔

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ

اور نازل کرتے ہیں ہم قرآن سے ایسی چیز جو شفا ہے اور رحمت ہے اہل ایمان کے واسطے

تو ظاہر ہے کہ جو کلام الٰہی پیغام نصیحت ہو باطنی اور ظاہری امراض و عیوب کے لیے شفا و عافیت کا سامان ہو اور ہدایت و رحمت کا خزانہ ہو اس سے بڑھ کر کونسی نعمت ہو سکتی ہے۔

اسی وجہ سے عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے قرآن عظمت سے لوگوں کو روشناس کرانے کے لیے برسر منبر اس فرمان نبوی کو نقل فرمایا۔ اما ان نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواما و یضع بہ اخرین۔ آگاہ ہو جاؤ اے لوگو! تمہارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ بے شک خدا وند عالم اس کتاب الٰہی کے ذریعے بہت سی قوموں کو عزت و سربلندی عطا کرتا ہے اور بہت سوں کو (اس پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے) ذلیل و رسوا کرتا ہے۔

مسند دارمی میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ قرء طٰہٰ و یٰس قبل ان یخلق السمٰوٰت والارض بالف عام۔ فلما سمعت الملائکۃ القرآن قالت طوبیٰ لامۃ ینزل ھذا علیھا وطوبیٰ لاجواف تحمل ھذا وطوبیٰ لالسنۃ تتکلم بھذا۔[1]	کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ رب العزت نے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے سے ایک ہزار سال قبل (فرشتوں کے سامنے) سورۃ طٰہٰ اور سورۃ یٰس تلاوت فرمائی (جس طرح اور جس کیفیت سے بھی اس کی شان کے لائق ہو) جب فرشتوں نے اس کلام الٰہی کو سنا تو کہنے لگے مبارک ہے وہ امت

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح باب فضائل القرآن۔ ابتدائی سطور میں حضرت علی بن ابی طالب کی حدیث میں بیان کردہ قرآنی خصائص اسی فضیلت و برتری کی شرح و تفصیل ہیں۔ حضرات ناظرین اس جگہ پھر اس حدیث کی مراجعت فرمالیں۔ ۱۲

جب فرشتوں نے اس کلام الٰہی کو
سنا تو کہنے لگے مبارک ہے وہ امت
جس پر یہ قرآن نازل کیا جائے گا۔
اور مبارک ہیں وہ سینے جو اس کو
اٹھائیں گے (یاد کریں گے) اور مبارک
ہیں وہ زبانیں جو اس کو پڑھیں گی۔

قرآن کریم اللہ کا کلام ہے اور ہر متکلم کی عظمت و برتری اور خصوصیات اس کے کلام میں جلوہ گر ہوا کرتی ہیں جس طرح پھول کی مہک اور خوشبو اس کی پتیوں میں ہوتی ہے اس لیے ظاہر ہے کہ کلام الٰہی بھی خداوند عالم کی عظمتوں اور اس کے جلال و جمال کا مظہر و پیکر ہوگا، اسی کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ کلمات مبارکہ ہیں:

وَفَضْلُ كَلَامِ اللّٰهِ عَلٰى سَائِرِ الْكَلَامِ كَفَضْلِ اللّٰهِ عَلٰى خَلْقِهٖ[1]

اور اللہ کے کلام کی فضیلت و برتری ہر کلام پر ایسی ہی ہے جیسے اللہ کی عظمت و برتری اس کی تمام مخلوق پر۔

کلام اللہ کی عظمت و برتری تو اس قدر عظیم تھی کہ انسانوں کے قلوب تو درکنار، پہاڑوں کی قوت پر بھی اس کو تحمل و برداشت نہیں کر سکتی جیسا کہ خود ارشاد خداوندی ہے۔ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ۔ (الحشر)

اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو اے مخاطب تو دیکھتا اس پہاڑ کو خداوند عالم کی ہیبت اور خشیت کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے والا۔

لیکن یہ حق تعالیٰ کی طرف سے اہل ایمان کے قلوب کو قوت و ہمت عطا فرمائی، کہ قرآن کریم کا تحمل کر سکے۔

---

[1] جامع ترمذی۔

میرے استاد محترم شیخ الاسلام حضرت العلامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس آیۃ پر تشریحی فائدہ تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

" مقام حسرت وافسوس ہے کہ آدمی کے دل پر قرآن کا اثر کچھ نہ ہو حالانکہ قرآن کی تاثیر اس قدر زبردست اور قوی ہے کہ اگر وہ پہاڑ جیسی سخت چیز پر بھی اتارا جاتا اور اس میں سمجھ کا مادہ موجود ہوتا تو وہ بھی متکلم کی عظمت کے سامنے دب جاتا اور مارے خوف کے پھٹ کر پارہ پارہ ہوجاتا "۔[1] میرے والد مرحوم نے ایک طویل نظم کے ضمن میں یہ تین شعر لکھے تھے ؎

سُنتے سُنتے نغمہ ہائے محفلِ بدعات کو — کان بہرے ہوگئے دل بدمزہ ہونے کو ہے
آؤ سنواؤں تمہیں وہ نغمۂ مشرد ح بھی — پارہ جس کے لحن سے طورِ بَدی ہونے کو ہے
حیف گر تاثیر اس کی تیرے دل پر کچھ نہ ہو — کوہ جس سے "خاشعًا متصدّعًا" ہونے کو ہے

امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر الجامع الاحکام القرآن میں امام ابو محمد الدارمی سمرقندی کی عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ قول نقل کیا ہے فرمایا " قرآن کریم کی سات ابتدائی سورتیں (سبع طول) توراۃ کے مانند ہیں اور مئین سورتیں گویا انجیل ہیں اور مثانی زبور ہیں اور باقی حصہ قرآن زائد ہے "[2]۔ (یعنی ان کتب سماویہ کی فضیلت سے بڑھ کر ہی مقام اور مرتبہ رکھتا ہے ۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت میں یہ کلمات بھی ہیں :

وما اجتمع قوم فی بیت من	اور جب بھی کوئی جمع ہو اللہ کے گھروں
بیوت اللّٰہ یتلون کتاب اللّٰہ	میں کسی بھی گھر میں درانحالیکہ وہ کتاب اللہ
یتدارسونہ بینھم الا نزلت علیھم	کی تلاوت اور اس کے درس و تدریس

---

[1] از فوائد قرآن کریم ۔ شیخ الاسلام حضرت عثمانیؒ ۔ ص ۲۷ ، مطبوعہ تاج کمپنی پاکستان

[2] احکام القرآن للقرطبی ج ۱ صـ۔

السکینۃ وغشیتھم الرحمۃ وحفتھم الملائکۃ وذکرھم اللہ فیمن عندہ[1]	ہیں باہم مصروف ہوں تو سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ان پر (اللہ کی طرف سے) ایک خاص سکینت نازل ہوگی اور ان کو رحمت خداوندی ڈھانک لے گی اور فرشتے ان کا گھیرا کرلیں گے۔ اور اللہ رب العالمین ان کا تذکرہ فرمائیگا ان فرشتوں کے درمیان جو اس کے پاس یعنی ملاءِ اعلیٰ میں ہیں۔

صحیح مسلم میں اسید بن حضیر کا واقعہ مذکور ہے کہ ایک رات تہجد میں سورۃ بقرہ کی تلاوت کر رہے تھے کہ ناگہاں ان کا گھوڑا جو قریب بندھا ہوا تھا بدکنے لگا، وہ خاموش ہوئے تو گھوڑا ٹھہر گیا۔ پھر تلاوت شروع کی تو اسی طرح پھر جھکنے لگا۔ نماز سے لوٹے اور سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو ایک سائبان نظر آرہا تھا جس میں بہت سی شمعیں روشن ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی تو آپ نے فرمایا:

تِلْكَ الْمَلَائِكَةُ دَنَتْ لِصَوْتِكَ	یہ فرشتے تھے جو تمہاری تلاوت کی آواز سننے کے لیے قریب ہوگئے تھے۔

اور ایک روایت میں یہ ہے "تلک السکینۃ تنزلت بالقرآن" آنحضرت[2] نے اس مکان کو جس میں قرآن کریم کی تلاوت نہ کی جائے قبر کے درجہ میں شمار فرمایا اور جس میں قرآن کی تلاوت کی جائے وہ گویا آباد گھر ہے۔ اسی طرح اس سینہ کو بھی جس میں قرآن کا کوئی حصہ محفوظ نہ ہو ارشاد فرمایا کہ وہ شخص میت کی طرح ہے۔ حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا[2]: بے شک انسانوں کے قلوب بھی زنگ آلود ہو جاتے ہیں جس طرح کہ لوہا زنگ آلود ہوتا ہے

---

[1] بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح و احکام القرآن قرطبی ج ۱۔ [2] بیہقی نے شعب الایمان میں اس روایت کو تخریج کیا ہے۔ مشکوٰۃ المصابیح۔ ۱۲۔

جیسے کہ اس پر پانی پڑ جائے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ قلوب کو صیقل کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا موت کی یاد اور تلاوتِ قرآن کی کثرت۔

ایک دفعہ مسجد نبویؐ میں ایک جماعت ضعفاء اور فقراء مہاجرین کی قرآن کریم کی تلاوت اور درس و تدریس میں مشغول تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سامنے جاکر کھڑے ہو گئے۔ تلاوت کرنے والے شخص آنحضرت کو دیکھ کر خاموش ہو گئے آپؐ نے ان کو سلام کیا اور فرمایا "تم لوگ کیا کر رہے تھے؟" عرض کیا گیا یا رسول اللہ ہم کتاب اللہ کے سننے میں مصروف تھے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا، خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری امت میں ایسے افراد بنائے کہ مجھے یہ حکم دیا گیا کہ میں اپنے آپ کو انہی کے درمیان رکھوں۔ اور یہ فرما کر آپ ہمارے درمیان تشریف فرما ہو گئے۔ اور پھر آپؐ نے جنت کی نعمتوں کی اور یوم قیامت کامل و مکمل نور کی بشارت سنائی۔[1]

قرآن کریم کا ایک ایک حرف دس دس نیکیوں اور اجر و ثواب کا ذریعہ ہے۔ اور آپؐ نے ارشاد فرمایا" میں یہ نہیں کہتا (مثلاً) الٓمٓ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔

متعدد احادیث میں یہ مضمون آتا ہے کہ قرآن کریم اور اس کی سورتیں حق تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے تلاوت کرنے والے کے واسطے محاجہ کریں گی اور اس کی نجات و مغفرت پر اس قدر اصرار کریں گی، کہیں گی" اے پروردگار اگر میں کوئی ایک سورت تیری کتاب میں سے ہوں تو پھر میری تلاوت کرنے والے کے حق میں میری شفاعت قبول فرما ورنہ پھر مجھ کو کتاب اللہ سے مٹا دے۔ چنانچہ بارگاہ خداوندی سے پروانۂ رحمت و مغفرت جاری ہو جائے گا۔ اور بعض سورتیں اپنے تلاوت کرنے والے پر عذاب سے بچانے کی خاطر اس طرح بچھ جائیں گی جیسے کوئی پرندہ اپنے چوزہ کی اپنے پروں کو اس پر بچھا کر حفاظت کرتا ہو۔

---

[1] از حدیث ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ۔ سنن ابی داؤد ۱۲

معاذ جہنی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے قرآن پڑھا اور اس پر عمل کیا تو اس کے والدین کو قیامت کے روز ایک ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سورج کی روشنی سے بھی بہتر ہوگی۔ ایسی حالت میں کہ سورج (مثلاً) تمہارے گھروں کے اندر ہو۔ آپ نے فرمایا بھلا بتاؤ تمہارا کیا گمان ہے اس شخص کے متعلق جو خود (اس کو پڑھنے اور) عمل کرنے والا ہے۔[1]

کتاب الدعوات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں یہ کلمہ، "اللّٰھُمّ اجعل القرآن ربیع قلبی وجلاء ھمومی واحزانی" "اے اللہ قرآن کو میرے قلب کی شادابی اور چین۔ اور میری پریشانیوں اور غموں کے زائل کرنے کا ذریعہ بنا دے۔" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن کریم دلوں کی شادابی چین، اور سکون و راحت ہے اور انسان کے افکار و ہموم اور غموں کی تاریکیاں دور کر دینے کا بہترین سامان ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے آیۃ " فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ کی تفسیر میں فرمایا، هُدَايَ کتاب الٰہی ہے۔ سو جو شخص اس کی تلاوت کرے اور اس پر عمل کرے تو وہ نہ دنیا میں گمراہ ہوگا اور نہ آخرت میں محروم ہوگا۔[2]

حافظ قرآن کو کہا جائے گا تو قرآن کی تلاوت کرتا جا اور جنت کے درجات و منزلوں پر چڑھتا جا۔ تیری آخری منزل وہی ہوگی جہاں تو تلاوت ختم کرے گا[3]

غرض فضائل قرآن کریم کا باب بہت وسیع ہے جس کی تفصیل کے لیے ایک مستقل کتاب چاہیے۔ یہ چند کلمات۔ اور احادیث مبارکہ کے اشارات، قرآن کریم کی عظمت و برتری اور اس کے پڑھنے اور اس پر عمل کرنے والے کی فضیلت و مرتبہ کو معلوم کرنے کے لیے کافی ہیں۔

---

[1] ۔ مشکوٰۃ المصابیح ۔ ۱۲ ۔ [2] احکام القرآن ۔ تفسیر ابن کثیر۔
[3] ۔ جامع ترمذی ۔ مشکوٰۃ المصابیح۔

نزول قرآن کریم

نزول قرآن کریم کا مفہوم اس لحاظ سے نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ قرآن کریم پر ایمان لانے اور اس بات پر یقین و اعتقاد کی بنیاد ہے کہ وہ کلام الٰہی ہے جو لوح محفوظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتارا گیا۔ گویا نزول قرآن کا علم حق تعالیٰ کی الوہیت اور قرآن کریم کے کلام الٰہی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی برحق ہونے پر ایمان و یقین کو متضمن ہے' اور بلکہ اس سے کلام الٰہی کا کلام قدیم ہونا بھی سمجھا جاتا ہے۔

نزول کے معنی لغتاً اُترنے کے ہیں۔ اور انزل سے لفظ انزال کا ترجمہ اُتارنا ہے اور نزول چونکہ صعود بمعنی چڑھنے کی ضد ہے اس بنا پر نزول کا مفہوم کسی چیز کے اُوپر سے نیچے کی طرف اُترنے پر دلالت کرے گا۔

سورۂ اسراء میں حق تعالیٰ نے دونوں لغت جمع فرما دیئے ہیں۔ ارشاد فرمایا وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ کہ حق ہی کے ساتھ ہم نے قرآن کو اتارا وہ حق ہی کے ساتھ اُترا۔

قبل از نزول قرآن اللہ کا کلام لوح محفوظ میں تھا، جیسے کہ فرمایا گیا بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ۔

کلام اللہ کا لوح محفوظ میں ہونا اور یہ کہ کب اور کس طرح قرآن کریم لوح محفوظ میں محفوظ کیا گیا؟ یہ سب باتیں ان امور میں سے ہیں کہ جن کی کُنہ اور حقیقت صرف اللہ رب العزت ہی جانتا ہے ہم تو صرف اسی قدر جان سکتے ہیں کہ لوح محفوظ تمام علوم الہیہ تقدیری و تکوینی امور ہر ایک کی موت و حیات اور

بقاء و فنا غرض قیامت تک پیش آنے والے جملہ احوال کا خزانہ اور سرچشمہ ہے۔ جیسے یہ ارشاد خداوندی اس معنی کی رہنمائی کر رہا ہے :

وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُسْتَطَرٌ (ہر چھوٹی اور بڑی چیز لکھی ہوئی ہے) (اور اسی طرح ارشاد ہے) مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا (الحدید) نہیں پہنچتی کوئی بھی مصیبت زمین میں اور نہ ہی تمہاری جانوں میں مگر یہ کہ وہ کتاب (الٰہی) میں (لکھی ہوئی) ہوتی ہے اس سے قبل کہ ہم اس کو پیدا کریں۔

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے لوح محفوظ میں حق تعالیٰ نے سب سے پہلے جو چیز لکھی وہ یہ ہے اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰـہَ اِلَّا اَنَا اور اسی کے ساتھ ہی لکھا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلِیْ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے رسول ہیں۔ لوح محفوظ سے قرآن کریم پہلے آسمان دنیا پر اُتارا گیا۔ یہ نزول لیلۃ القدر میں ہوا جیسے کہ ارشاد ہے " اِنَّا اَنْزَلْنٰـهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ اور اسی طرح فرمایا گیا اِنَّا اَنْزَلْنٰـهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اور مفسرین یہی فرماتے ہیں کہ لیلۃ مبارکہ سے لیلۃ القدر ہی ہے جس میں تمام قرآن کریم یک وقت آسمان دنیا پر اُتارا گیا ہے۔ اور لیلۃ القدر میں جس جگہ نازل فرمایا گیا وہ بیت العزۃ کے عنوان سے تعبیر کی گئی ہے۔ شعبی سے یہی منقول ہے کہ سب سے پہلے آسمان دنیا میں بیت العزہ کی طرف لے کر جبرئیل آئے اور اللہ کے ان تمام فرشتوں کو املا کرایا، جو سفرہ اور کراماً کاتبین جو خدا کے احکام و امور کے قاصد و پیغامبر اور امور الٰہی کی کتابت کرنے والے فرشتے تھے۔ پھر اس کے بعد آسمان دنیا سے زمین پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تھوڑا تھوڑا تئیس برس کی مدت میں نازل ہوا۔ کبھی دو چار آیات کبھی ایک ایک دو دو رکوع اور کبھی پوری پوری سورتیں حسب ضرورت اللہ رب العزت کی حکمت و مصلحت کے مطابق نازل ہوتا رہا۔

لہ تفسیر قرطبی ج ۱۹، و جلد ۲۰۔

حاکم نے سعید بن جبیر کی سند سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی فرمایا :

فُصِلَ الْقُرْآنُ مِنَ الذِّكْرِ فَوُضِعَ فِي بَيْتِ الْعِزَّةِ مِنَ السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَجَعَلَ جِبْرِيلُ يَنْزِلُ بِهِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	کہ قرآن کریم منفصل اور جدا ہُوا ذکر یعنی لوح محفوظ سے پھر اس کو آسمان دُنیا سے بیت العزۃ میں رکھ دیا اور اس کے بعد جبریل امین علیہ السلام اس کو لے کر اُترتے رہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ۔

عکرمہ بھی ابن عباسؓ سے یہی بیان کرتے ہیں کہ قرآن کریم پہلے پُورا یک وقت آسمان دنیا پر لیلۃ القدر میں نازل کر دیا گیا اور پھر بیس سال (یعنی علاوہ مدت فترت کی جو پونے تین سال ہے) میں متفرق متفرق ہو کر اترتا رہا اور یہ آیت تلاوت فرمائی ۔

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ۔ (فرقان)	اور جب بھی یہ لوگ اے ہمارے پیغمبر آپ کے پاس کوئی سوال یا اعتراض لے کر آئیں گے تو ہم آپ کے پاس حق لے کر آئیں گے اور بہتر سے بہتر وضاحت و جواب (اس سوال یا اعتراض کا جو وہ کریں)

اور پھر یہ ایک آیت تلاوت کی :

لہ : شیخ سیوطیؒ نے اسی قول کو ترجیح دی کہ لوح محفوظ سے نزول قرآن کی یہ دو نوعیتیں اور صُورتیں ہیں - ایک بار لیلۃ القدر میں آسمان دُنیا پر نزول اور پھر وہاں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر بتدریج متفرق متفرق مدت نبوت میں تیئیس سال تک اترتا رہا ۔ باقی دُوسرے اقوال علماء محققین کے نزدیک صحیح اور قوی نہیں ہیں ۔ ان میں سے ایک قرطبی نے مقاتل بن حیان سے نقل کیا ہے کہ قرآن کریم آسمان دُنیا کی طرف بیس سال کی بیس لیلۃ القدر یا تیئیس سال کی تیئیس لیلۃ القدر میں نازل کیا گیا - اس طرح کہ ہر سال کی لیلۃ القدر اس قدر حصہ قرآن نازل کر دیا گیا جتنا کہ اس سال میں آنحضرتؐ پر نازل کیا جانا مقصود ہے ۔ [illegible]

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا

اور نازل کیا ہم نے قرآن جس کو متفرق اور ٹکڑے ٹکڑے (کرکے نازل) کیا تاکہ آپ اس کی تلاوت کریں لوگوں پر بتدریج اور ٹھیر ٹھیر کر اور بیشک آتارا ہے ہم نے اس کو تھوڑا تھوڑا آتارنا ۔

(سورۃ بنی اسرائیل) (متعدد بار)

اسی وجہ سے جہاں نزول قرآن کی پہلی صورت ملحوظ رکھی گئی وہاں لفظ اَنْزَلَ جس کے معنی بیک وقت آتارا ہیں ذکر فرمایا گیا ۔ اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ۔ اور جس جگہ عالم دُنیا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر متفرق اوقات میں آتارا جانا پیش نظر ہوا وہاں لفظ نَزَّلَ استعمال فرمایا گیا ۔ مثلاً حٰمٓ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ اور قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ حق تعالیٰ شانہٗ کا اپنے کلام اور قرآن کریم کو پہلے لوح محفوظ میں ودیعت فرمانا ۔ اس کے بعد لوح محفوظ سے بیت العزۃ کی طرف نازل فرمانا اور پھر جبریل امین کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آتارا جانا قرآن کریم کی عظمت و برتری کی وجہ سے ہے تاکہ آسمانوں میں رہنے والے ملائکہ جان لیں کہ اللہ کا یہ کلام افضل الانبیاء اور خاتم المرسلین پر نازل کیا جا رہا ہے اور زمین پر بسنے والی مخلوق جن وانس بھی عظمت قرآن کریم کا مشاہدہ کرلے ۔ کیونکہ کوئی اہم ہی چیز بار بار مختلف دستاویزوں اور دفاتر میں منتقل کی جاتی ہے اور متعدد دفاتر میں اس کو سر بمہر کرنے کے بعد جاری کیا جاتا ہے شاہی فرامین میں جو اہم ترین فرمان ہوتے ہیں ان کا نفاذ بیک وقت ناگہاں نہیں ہوتا بلکہ اسی طرح بتدریج اور متعدد دفتروں میں اس کو نقل کرنے اور سر بمہر کرنے کے بعد جاری کیا جاتا ہے ۔

اسی بنا پر کتب سابقہ پہلے انبیاء پر بیک وقت نازل کی گئیں ۔ اس کے برخلاف قرآن کریم کا نزول متفرق متفرق اوقات میں تئیس سال میں پورا فرمایا گیا ۔ علامہ ابوشامہ

نے المرشد الوجیز میں بیان کرتے ہیں کہ اس صورت میں قرآن کریم کا حفظ بھی آسان ہوگا اور حسب ضرورت مضامین کا نزول اور اس ضمن میں مشرکین و کفار کی طرف سے پیدا ہونے والے اعتراضات واشکالات کا جواب اور حل اس کے کلام الٰہی ہونے کا کامل ترین ثبوت ہوگا۔ چنانچہ مشرکین کے ایک اعتراض کے جواب میں قرآن کریم نے یہ حکمت بیان فرمادی۔ حق تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے :

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۔

اور کہا کافروں نے کیوں نہ نازل کر دیا گیا آپ پر یہ قرآن یک وقت ہی تمام کا تمام (فرمایا، ہماری طرف سے) بس اسی طرح ہے ہوا (کہ ہم تھوڑا تھوڑا کرکے آتاریں) تاکہ اس قرآن کے ساتھ آپ کے قلب کو ثابت رکھیں اور ترتیل وخوبی کے ساتھ ہم اس کی تلاوت کریں یعنی بتدریج تھوڑا تھوڑا کرکے آتاریں تاکہ اس کا یاد کرنا بھی آسان ہو اور اس کی تلاوت بھی سہولت وخوبی سے ہو۔

(فرقان)

اس میں یہ بھی حکمت تھی کہ لبا اوقات مشرکین وکفار کوئی طعن واعتراض کرتے تو اس کا جواب نازل ہوجاتا۔ اور لبا اوقات آنے والے واقعات کی خبر سے ان پر حجت قائم کی جاتی۔ الغرض اس قدر طویل مدت میں قرآن کریم کا نازل فرمانا اس کی عظمت اور ان بلند پایہ حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے کہ ہر واقعہ میں تازہ بتازہ ہدایت نازل ہوکر اور جو بھی مشکل درپیش ہو اس کے حل سے اور صبر وتسلی کے پیغامات سے قرآن کریم ہر ہر مرحلہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل اور حجت ثابت ہوتا تھا۔ مثلاً جب کفار کی طرف سے ایذائیں اور تکالیف حد سے بڑھنے لگیں تو قرآن کریم نے آیت نازل فرمائی :

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ — اور صبر کیجیے اے ہمارے پیغمبر آپ کا صبر کرنا

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ	اللہ ہی کی توفیق و عنایت سے ہے اور ان مشرکین پر غم بھی نہ کیجیے اور نہ ان کی سازشوں سے جو یہ کر رہے ہیں۔ تنگدلی اور اضطراب میں پڑیئے۔

اور علیٰ ہذا القیاس جب مشرکین عناد و شقاوت ناقابل برداشت حد تک پہنچ گئی، تو قرآن نے تسلی دی اور ساتھ ہی ساتھ ان بدبختوں کو عذاب خداوندی کی وعید سنائی گئی فرمایا:

فَإِنْ أَعْرَضُوْا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ	پس اگر وہ اعراض کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں تو تم کو ڈرا چکا ہوں عذاب الٰہی کی کڑک سے جیسے کہ عاد و ثمود پر یہ کڑک اور چیخ مسلط ہوئی۔

اور اس قہر خداوندی نے ان کو تباہ و برباد کیا۔ اس طرح ہر آیت ایک مستقل دلیل ہو کر اُترتی۔ اور یہ بات اسی صورت میں ممکن تھی کہ قرآن ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُتارا جاتا۔

کیفیت نزول قرآن

متقدمین اور علماء مفسرین کے درمیان یہ بات زیر بحث رہی کہ نزول قرآن کی کیفیت کیا ہے۔ جبریل امین بارگاہ الوہیت اور لوح محفوظ سے یہ کلام کس طرح لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اترتے تھے۔ باطنی یا غیبی طریق پر یہ کلام تلقی اور یاد کر لیتے تھے یا کسی چیز پر یہ کلام منعکس ہوتا جیسے کسی کاغذ اور تختے پر لکھے کلمات سامنے روشن ہوں۔ اور اس کو دیکھ کر اخذ کر لیتے ہوں۔ علامہ طیبیؒ نے بیان فرمایا، بہت ممکن ہے کہ قرآن کریم کا نزول بایں طور ہو کہ فرشتہ اس کلام کو حق تعالیٰ سے رُوحانی و باطنی طور پر اخذ و تلقی کر لیتا ہو اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر لے کر اُترتے ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے جبریلؑ کی نظروں کے سامنے کلام الٰہی منعکس کر دیا جاتا ہو اور وہ اس سے یاد کر لیتے ہوں۔

پہلی صورت کا حاصل یہ ہے کہ بلا کسی توسط کے حق تعالیٰ کی طرف سے یہ کلام جبرئیلؑ اخذ کرلیں۔ اور پھر جو کلام ان میں ثبت ہوچکا وہ اللہ کی مشیّت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کردیا جائے۔ جیسے آج کل سائنسی مصنوعات میں تقاریر کی ٹیپ کرنے کی یہی صورت ہوتی ہے کہ بلا کسی صوت و آواز کے ایک جگہ کا خطاب دوسرے ٹیپ میں منتقل ہوجاتا ہے۔ بعض ائمہ سلف نے اس بارے میں سکوت و توقف اختیار کیا ہے۔ لیکن محققین کی رائے یہی ہے کہ قول اول راجح ہے کیونکہ روایات سے وحی خداوندی کی نوعیت کچھ اسی طرح بیان کی گئی ہے کہ جس وقت حق تعالیٰ کسی امر (وحی) کا تکلّم فرماتا ہے تو آسمانوں پر عظمت و ہیبت طاری ہوجاتی ہے اور ایک زلزلہ جیسی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس لرزہ کی کیفیت سے ملائکہ مدہوش ہوکر گر پڑتے ہیں۔ پھر جب اس حالت سے افاقہ و سکون ہوتا ہے تو ایک دوسرے سے دریافت کرتا ہے مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ "کیا کہا ہے تمہارے پروردگار نے" جواب میں بتایا جاتا ہے کہ فرمانِ خداوندی حق ہے۔ طبرانی نواس بن سمعان سے مرفوعاً روایت کی ہے:

اذا تکلم اللہ تعالیٰ بالوحی	جب اللہ تعالیٰ وحی کے ساتھ تکلّم
اخذت السماء رجفۃ شدیدۃ	فرماتا ہے تو آسمان پر ایک شدید زلزلہ
من خوف اللہ تعالیٰ - فاذا	حق تعالیٰ کے خوف و ہیبت کی وجہ سے
سمع بذالک اھل السماء	طاری ہوجاتا ہے۔ پھر جب اس کو
صعقوا وَخَرُّوا سُجَّدًا	آسمان والے (ملائکہ) سنتے ہیں تو
فیکون اولھم یرفع رأسہ	مدہوش ہوکر سجدہ میں گر پڑتے ہیں.
جبریل علیہ السلام فیکلمہ	تو ان میں سب سے پہلے اپنا سر اٹھانے
اللہ بوحیہ مما اراد فینتھی	والے جبریل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ
بہ علی الملئکۃ . فکلما مرّ	اپنی وحی کا ان سے تکلّم فرماتا ہے جس کا
بسماء سألہ اھلھا ماذا	بھی خدا تعالیٰ ارادہ فرماتے۔ پھر

قَالَ رَبُّنَا قَالَ الْحَقَّ۔ فَيَنْتَهِي بِهِ حَيْثُ اُمِرَ۔

جبریل امین اس وحی الٰہی کو لے کر فرشتوں کے سامنے پہنچتے ہیں تو جس کسی آسمان سے بھی گزر ہوتا ہے وہاں والے دریافت کرتے ہیں کیا فرمایا ہے ہمارے رب نے۔ جبریل کہہ دیتے ہیں اللہ حق نے فرمایا یہاں تک کہ اس وحی کو لے کر وہاں پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کو حکم دیا گیا ہے (لے جانے کا)۔

صحیح بخاری باب بدء الوحی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حارث بن ہشام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے؟ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا، کبھی کبھی تو وحی مجھ پر اس طرح نازل ہوتی ہے جیسے کسی گھنٹہ کی جھنکار ہو اور یہ صورت وحی مجھ پر بہت شدید ہوتی ہے اور یہ کیفیت مجھ سے جدا ہوتی ہے۔ اس حالت میں کہ میں محفوظ کیے ہوئے ہوتا ہوں وہ کلام جو نازل کیا گیا اور جو کچھ اس نے کہا اور کبھی وہ فرشتہ ظاہر ہوتا ہے کسی مرد کی صورت میں۔ پھر وہ مجھ سے بات کرتا ہے تو میں یاد کر لیتا ہوں جو کچھ وہ مجھ سے کہتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ پر نہایت شدید سردی کے زمانہ میں وحی اترتی اور پھر وہ آپؐ سے جدا ہوتی اور حال یہ ہوتا تھا شدید سردی کے باوجود آپ کی پیشانی پسینہ سے تر ہوتی۔

جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وحی کی تلقی اور اخذ کی اس حدیث اور طبرانی کی روایت میں کیفیت بیان کی گئی گویا اسی طرح کی کیفیت سے جبریل امین بارگاہ الوہیت سے وحی الٰہی اور کلام اللہ کا اخذ کر لیتے ہوں گے جو علامہ طیبی کے کلام میں پہلی شکل بیان کی گئی اور یہ صورت وحی کا ہے جو کہ

لہ التبیان فی علوم القرآن للجزائری ص ۲۸ ۔ فتح الباری ج ۹ ۔

قرآن کریم نے اس آیت میں ارشاد فرمائی :

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ ۔	رُوح الامین اس کلام اللہ کو لے کر اُترے ہیں آپ کے قلب پر اللہ کے حکم سے ۔

شیخ سیوطیؒ نے جوینی رحمۃ اللہ سے نقل کیا ہے کہ وحی الٰہی کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول دو طرح سے ہوتا تھا ۔ ایک قسم تو یہ تھی کہ حق تعالیٰ اپنے احکام واوامر جبریلؑ کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارتے کہ آپ یہ کیجیے ، یہ حکم دے دیجیے ۔ لوگوں کو اس کام پر مامور فرما دیجیے ۔ غرض اس طرح کے اوامر الٰہیہ آپ پر نازل ہوتے اس میں کوئی تعبیر وعبارت نہ ہوتی تھی ۔ دوسری صورت یہ تھی کہ حق تعالیٰ جبریلؑ کو حکم دے دیتے کہ تم یہ کلام ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جا کر پڑھ دو تو جبریلؑ وہ کلام لے کر اُترتے اور اس کی آپؐ پر تلاوت کر دیتے ۔ آپ اس کو سن کر یاد کر لیتے ۔ سیوطیؒ اس کو نقل کر کے فرماتے ہیں ۔ وحی کی یہ دوسری قسم ہی کلام اللہ اور قرآن کریم ہے اور اوّل قسم سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابتداء میں نزول قرآن کے ساتھ خود بھی زبان مبارک سے ان ہی کلمات کو پڑھنے لگتے جو آپؐ پر نازل کیے جا رہے ہیں ۔ اس اندیشہ سے کہ کوئی لفظ رہ نہ جائے اور ذہن سے نہ نکل جائے جس پر قرآن کریم میں آیت نازل فرمائی گئی :

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ	(اے ہمارے پیغمبر) آپ اپنی زبان کو حرکت نہ دیجیے اس کلام کے یاد کرنے کی جلدی کی وجہ سے ۔ بے شک ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع و محفوظ کرنا (آپ کے قلب میں) اور اس کا تلاوت کرنا (بذریعہ آپ کی زبان کے) تو جب

ہم اس کی (بواسطہ جبریل) تلاوت کریں
تو آپ اس کی قرأت کی اتباع و پیروی
کریں۔ (یعنی خاموش رہ کر سنیں۔ اور پھر
بعد میں اس کی تلاوت کریں۔

بہرکیف جبریل اللہ کا ایک ایسا مرتب اور محفوظ کلام لے کر اترتے تھے جو تلاوت کیا جاتا تھا اور سنا جاتا تھا۔ پھر اس کا اعادہ کیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ صرف معانی و احکام اور اوامر کی یہ نوعیت نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے علماء متکلمین نے قرآن کریم کے بارہ میں یہ فرمایا ہے کہ وہ نظم و معنی یعنی الفاظ و کلمات اور معانی مرتبہ اور معانی دونوں کا مجموعہ ہے۔ چنانچہ خود قرآن کریم کی یہ تصریح اسی پر دلالت کرتی ہے۔ نزل بہ الروح الامین علیٰ قلبك لتكون من المنذرین بلسان عربی مبین واضح طریقہ سے قرآن کریم کو فرما دیا گیا کہ وہ بلسان عربی مبین ہے یعنی عبارت اور نظم کلام عربی کلمات و الفاظ ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جبریل امین حق تعالیٰ کے کلام کی وحی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حکایت اور نقل کلام کے درجہ میں فرماتے تھے جیسا کہ اللہ کا کلام ہوتا بعینہ وہی کلام آنحضرت پر لے کر اترتے تھے، وہ تعبیر و کلمات نہ جبریل کے ہوتے تھے اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ بلکہ جیسا کلام اور جو تعبیر و کلمات بارگاہ رب العزت سے جبریل لے کر آتے وہی قرآن ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ تلاوت ہمارا فعل ہے لیکن متلو کلام الٰہی ہے جیسا کہ خود قرآن کریم نے فرمایا:

وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ — اور بے شک آپ کو قرآن کریم دیا جا رہا ہے ایک حکیم علیم (رب) کی طرف سے۔

اور آیت حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ بھی اسی کی دلیل ہے۔

نیز ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا گیا:

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ — اور جب ان پر ہماری آیتیں تلاوت کی

قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاۗئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ

(سورۃ یونس)

جاتی ہیں جو نہایت واضح اور روشن ہیں تو وہ لوگ کہتے ہیں جو ہماری ملاقات کی اُمید نہیں رکھتے یعنی وہ آخرت اور بعث بعدالموت کے منکر ہیں کہ لے آؤ کوئی اور قرآن اس کے علاوہ یا اس میں کچھ تبدیلی کردو۔ کہہ دیجیے (اے ہمارے نبی) میرے واسطے ممکن نہیں ہے یہ کہ میں اپنی طرف سے اس کو بدل دوں۔ میں صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جس کی وحی مجھے کی گئی بے شک میں تو ڈرتا ہوں اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں عظیم الشان دن کے عذاب سے۔

حاصل یہ کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ جو اپنے الفاظ اور معنی، دونوں لحاظ سے اللہ کا کلام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ و کلمات قرآن کے مقابلہ سے دُنیا عاجز رہی۔

اعجاز قرآن کی بحث میں انشاء اللہ تعالیٰ اس کی تفصیلات حضرات قارئین ملاحظہ فرمائیں گے۔

قرآن کریم کب نازل ہُوا؟

ائمہ محدثین و مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وحی کی ابتداء اور نزول قرآن کا سلسلہ اسی روز اور وقت سے شروع ہُوا جس وقت کہ آپؐ کو خلعت نبوت و رسالت عطا کیا گیا۔ وہ ربیع الاوّل کا مہینہ اور دوشنبہ کا روز تھا۔

حافظ ابوعمر ابن عبدالبر نے ۸ ربیع الاوّل کے قول کو ترجیح دی ہے اور یہ نزول کی ابتداء وہ ہے جو آسمان دنیا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہُوا۔

در بلوح محفوظ سے آسمان دنیا پر تو لیلۃ القدر رمضان المبارک میں ہوا جیسا کہ بیان کیا گیا۔ اور خود قرآن کریم نے اس کی تصریح کی ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ	رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن
فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ	نازل کیا گیا جو لوگوں کے واسطے ہدایت
وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ	ہے اور رہنمائی کی کھلی نشانیاں اور حق و
الْفُرْقَانِ ۔	باطل کے درمیان فرق اور فیصلہ کرنے والا ہے۔

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء سابقین پر جو کتابیں نازل کی گئیں وہ بھی رمضان المبارک میں نازل ہوئیں۔ امام احمد بن حنبلؒ اور بیہقیؒ نے واثلۃ بن الاسقع سے روایت کیا ہے:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تورات
قال انزلت التوراۃ لست مضین	نازل کی گئی جب کہ رمضان کی چھ تاریخ
من رمضان والانجیل لثلاث	گذر چکی تھی اور انجیل تیرہ تاریخ گذرنے
عشرۃ خلت منہ والزبور	پر اور زبور اٹھارہ تاریخ گذرنے پر اور
لثمان عشرۃ خلت منہ والقرآن	قرآن نازل کیا گیا جب کہ رمضان المبارک
لاربع وعشرین خلت من	کے چوبیس روز گذر چکے تھے (اور شب
رمضان[1]	پچیسویں تھی)

رمضان المبارک کا مہینہ قرآن کریم نازل فرمانے کے لیے اس کے لیے مخصوص کیا گیا کہ یہ مہینہ نہایت مبارک مہینہ اور شہر عظیم کا مصداق ہے جس میں حق تعالیٰ شانہ کے خاص انوار وتجلیات ملاء اعلیٰ سے عالم دنیا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اللہ کا کلام خیرات وبرکات اور انوار وتجلیات کا خزانہ ہے۔ اللہ رب العزت کے جلال وجمال کا پیکر ہے۔ اس مناسبت سے قرآن کریم کا نزول ان مبارک ایام میں مخصوص کیا گیا، جب کہ صائمین اور روزہ داروں کی روزہ جیسی عظیم عبادت

[1] فتح الباری جلد ۹ باب فضائل القرآن۔

سے نفس کی ظلمتیں اور کدورتیں دُور ہو کر رُوحانی انوار اور باطنی تجلیات ان کے قلوب کو روشن کر رہے ہوں اور حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے انوار و برکات کا فیضان عالمِ دُنیا پر ہو رہا ہو تو محبّین و عاشقین کو دیدارِ خداوندی کا اشتیاق یقیناً اس تمنا پر آمادہ کرے گا رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ ۔ مگر دُنیا میں اللہ کا دیدار ممکن نہیں اس وجہ سے حق تعالیٰ نے اس مبارک زمانہ میں اپنا کلام نازل فرمایا تاکہ محبّین و عاشقین اس کلام سراپا جمال و جلال کے پردہ میں اس کے جلوہ سے اپنے قلب و باطن کو منوّر کر لیں کیونکہ ہر کلام میں متکلّم کے اوصاف و کمالات کی جھلک ہوتی ہے ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگِ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

اس مناسبت سے رمضان المبارک میں کلامِ الٰہی نازل کیا گیا اور رمضان میں تراویح مقرر کی گئی تاکہ اس کلام پاک کی تلاوت کرنے والے ان مبارک راتوں میں حق تعالیٰ کے ساتھ مناجات کی لذّت و حلاوت بھی حاصل کرتے رہیں اور اس کے کلام پاک کی تلاوت کرتے ہُوئے اس کے جمال اور انوار سے لطف اندوز ہوں۔

قرآن کریم، حدیث قدسی اور حدیث نبوی کے درمیان فرق

گذشتہ کلمات سے یہ بات واضح ہو چکی کہ قرآن کریم نظم یعنی الفاظ اور معنی دونوں کا نام ہے۔ اور اصولیین قرآن کریم کی تعریف جیسے کہ پہلے بیان کیا گیا یہی کرتے ہیں ،

ھو المنزل علی الرّسول صلّی اللہ علیہ وسلّم المکتوب فی المصاحف المنقول عنہ نقلاً متواتراً بلا شبھۃ و ھو النظم والمعنی جمیعاً کہ قرآن اللہ کا وہ کلام ہے جو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نازل کیا گیا جو صحیفوں (اوراق قرآنیہ) میں مکتوب ہے اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے منقول بہ نقل متواتر کے ساتھ بلا کسی شبہ اور تردّد کے اور نظم اور معنی دونوں کا مجموعہ ہے۔

نظم قرآنی چونکہ اللہ رب العزت ہی کی طرف سے ہے اس بناء پر تمام عالم کو مقابلہ کی دعوت دی گئی اور پوری قوت و وضاحت کے ساتھ اعلان بھی کر دیا گیا

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا

کہہ دیجیے کہ اگر انسان اور جن سب کے سب جمع ہو جائیں اس بات پر اس قرآن جیسا کلام بنا کر لے آئیں تو وہ کبھی اس کے مثل کوئی کلام نہ لا سکیں گے اگرچہ ان میں بعض دوسرے بعض کے مددگار و معین ہو جائیں۔

اور ظاہر ہے کہ یہ تحدی اور اعلان الفاظ و آیات قرآن ہی پر تھا۔ اور یہ دیکھ لیا گیا کہ تمام عالم اور عرب کے تمام فصحاء و بلغاء الفاظ قرآن کی مشابہت و مماثلت سے عاجز رہے جس سے ثابت ہو گیا کہ الفاظ بھی منزل من اللہ تھے۔ اگر یہ الفاظ کسی بشر کے ہوتے تو کسی نہ کسی وقت کسی نہ کسی بشر کے کلام میں اس کی مشابہت و مماثلت پائی جا سکتی تھی[1]۔ نفس معنی تو احادیث نبویہ کے بھی اللہ ہی کی طرف سے تھے اور آپؐ کا ارشاد وحی الٰہی تھا۔ جیسے کہ ارشاد مبارک ہے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی[2] آپ کوئی بات بھی اپنی خواہش سے نہیں فرماتے بلکہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ اللہ کی وحی ہی ہوتی ہے جو آپؐ کی طرف بھیجی جاتی ہے۔

---

[1] وحی منزل من اللہ تو کتب سابقہ تورات و انجیل اور صحف ابراہیم علیہم السلام بھی تھے لیکن وہ وحی متلو نہ تھیں۔ وہ کتابیں علوم اور معانی میں اللہ کی طرف سے تھیں مگر الفاظ و تعبیرات اللہ کے کلمات نہ تھے اسی وجہ سے لفظ قرآن انبیاء سابقین کی کتابوں پر نہیں اطلاق کیا گیا۔

[2] سورۃ والنجم

کتب حدیث میں بعض احادیث قال اللہ تعالیٰ کے عنوان سے بیان کی جاتی ہیں جن کو احادیث قدسیہ کہا جاتا ہے، اس مرحلہ پر طبعاً یہ سوال وارد ہوتا ہے احادیث قدسیہ بھی قال اللہ تعالیٰ ہیں اور آیات قرآنیہ بھی قال اللہ تعالیٰ ہی کے عنوان سے معنون ہیں تو ان دونوں میں کیا فرق ہے ؟ اس فرق کی وضاحت کے لیے علامہ ابوالبقاء "کلیات" میں فرماتے ہیں۔ قرآن وہ ہے جس کے لفظ اور معنی دونوں اللہ کی طرف سے ہوں وحی جلی کے ساتھ۔ اور حدیث قدسی وہ ہے جس کے الفاظ وتعبیر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اور مضمون ومعنی من جانب اللہ ہو، خواہ بذریعہ الہام ہو یا بصورت خواب۔ اور بعض ائمہ سے یہ منقول ہے کہ قرآن نظم معجز اور وہ کلام الٰہی ہے جو بواسطہ جبریلؑ کے نازل کیا گیا۔ اور حدیث قدسی بھی کلام الٰہی ہے لیکن نہ تو وہ نظم معجز ہے قرآن کی طرح اور نہ بواسطہ جبریلؑ نازل ہوا بلکہ وہ کلام ربانی ہے جو بلا واسطہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر وارد ہوا۔ اور آپؐ نے اس کو پیغام خداوندی کے طور پر نقل فرما دیا۔ اسی کلام ربانی کو حدیث قدسی اور الٰہی اور حدیث ربانی کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علامہ طیبیؒ کا کلام بھی قرآن اور حدیث قدسی میں اسی نوع کے فرق کو ظاہر کر رہا ہے۔ فرماتے ہیں قرآن وہ الفاظ منزلہ ہیں جو جبریلؑ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر لے کر اترتے اور حدیث قدسی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو کسی معنی اور مضمون پر بذریعہ الہام مطلع کر دیا جاتا۔ اور آپؐ اس مضمون کو اپنی تعبیر میں امت کو بیان فرما دیتے۔

علامہ سید احمد بن المبارکؒ اپنی کتاب "الابریز" میں اپنے شیخ نجم العرفان العارف باللہ سید عبدالعزیز الدباغ قدس اللہ سرہ کی کرامات کا تذکرہ فرماتے ہوئے

۱ے مثلاً حدیث قال اللہ تعالیٰ کذبنی ابن آدم ولم یکن لہ ذالک۔ الخ

۲ے کلیات ابوالبقاء ص ۲۲۲ ۳ے قواعد التحدیث ص ۶۷

بیان کرتے ہیں کہ شیخ کی کرامات لَا تعدّ وَلَا تحصٰی ہیں۔ ہم اس فصل کو شیخ رح کی ایک کرامت عظیمہ کے بیان پہ ختم کرتے ہیں جو ان کی باطنی نورانیت کمال عرفان اور علوم لدنیہ کی کھلی نشانی ہے۔ شیخ رح کی باطنی معرفت اور ان کے معارف واسرار کی پرواز معلوم کرنے کے لیے میں نے ایک روز شیخ سے حدیث صحیح، اور غیر صحیح حدیث نبویؐ و حدیث قدسی اور قرآن کریم میں فرق دریافت کیا۔ میرے پاس شیخ جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب" الدرر المنتثرۃ فی الاحادیث المشتھرۃ" موجود تھی جس میں شیخ سیوطیؒ نے ان احادیث کو جمع کیا ہے جو عام طور پہ لوگوں کی زبانوں پہ مروج اور مشہور ہیں لیکن سند کے اعتبار سے ان کی کوئی اصل اور ثبوت نہیں... تو میں نے شیخ عبدالعزیز دباغ رح سے سوالات شروع کیے حالانکہ شیخ ظاہری علوم سے ناواقف اور امّی تھے، کسی درسگاہ سے فارغ التحصیل اور کسی استاذ سے پڑھے ہوئے نہ تھے مگر مقام حیرت ہے کہ ہر ایسے علمی سوال کا جواب اس طرح دیا جیسے کوئی ماہر فن کا امام اور ایک بلند پایہ محدث دیتا ہو۔ میں نے دریافت کیا بتائیے حدیث اُمِرْتُ اَنْ اَحْکُمَ بالظاھر واللہ یتولی السرائر اور حدیث کُنْتُ کَنْزاً لَا اُعْرَفُ یہ کیسا کلام ہے؟ فرمایا یہ کلام رسولؐ نہیں ہے چنانچہ اسی طرح جلال الدین سیوطیؒ نے ان کو بے اصل اور غیر معتبر روایات میں شمار کیا ہے۔ پھر میں نے اسی طرح ایک اور حدیث دریافت کی کہ اوّل ما خلق اللہ العقل کیسی حدیث ہے فرمایا یہ بھی نبی کریم نے نہیں فرمایا۔ چنانچہ احمدؒ بن حنبل اور ابن الجوزی نے بھی اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے۔ میں نے اعتراف کرتے ہوئے عرض کیا بے شک اے شیخ ان روایات کو بیشتر محدثین بھی بے اصل اور موضوع کہتے ہیں۔ غرض جب میں اس طرح متعدد روایات دریافت کر چکا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب کہ شیخ نے یہاں تک بھی بتانا شروع کر دیا کہ یہ حدیث بخاری کی ہے یہ حدیث مسلم کی ہے۔ یا فلاں امام نے اس کو تخریج کیا ہے۔ میں نے عرض کیا اے شیخ! آپ اس فرق پر کس طرح مطلع ہو جاتے ہیں؟

فرمایا تم دیکھتے ہو مثلاً جب کوئی شخص شدید سردی کے زمانہ میں بات کرتا ہے تو اس کے منہ سے ایک بھاپ اور دھواں سا نکلتا ہے اور جب موسم گرما میں ہوتا ہے تو ایسی بھاپ اس کے منہ سے نہیں نکلتی اسی طرح جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمات کا تلفظ کرتا ہے تو اس کے منہ سے الفاظ کے ساتھ ایک نور نکلتا ہے اور جب کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے علاوہ اور کوئی کلام اپنی زبان سے ادا کرتا ہے تو اس کا کلام بے نور ہو کر اس کے منہ سے نکلتا ہے۔ پھر یہ فرمایا عارفین جب کلام نبوی سنتے ہیں تو عارفین کے قلبی انوار و معارف کی زیادتی و قوت پیدا ہوجاتی ہے جیسے کہ سمندر میں موجوں کی شدت پیدا ہوجائے۔ اس سے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہمارے کان نبی علیہ السلام کا کلام سن رہے ہیں۔ اور جب پیغمبر کے کلام کے علاوہ اور کوئی کلام سنتے ہیں تو وہ سابق کیفیت ہی باقی رہتی ہے گویا بحرِ معرفت موجوں کا تلاطم محسوس نہیں ہوتا جو پیغمبر کا کلام سن کر ہوتا ہے۔ فرماتے کہ جب میں نے شیخ کو یہ سمجھ لیا کہ وہ اسرار ربانی اور باطنی معرفت کے ایک عظیم پہاڑ ہیں اور ان حقائق و معارف میں ان کے قدم ایسے راسخ و مضبوط ہیں کہ کسی بھی مرحلہ پر قطعاً نہیں ڈگمگاتے تو میرے دل میں یہ خیال آیا کہ میں شیخ سے ایک اور سوال کروں کہ قرآن کریم اور حدیث قدسی میں کیا فرق ہے؟ اور شیخ حافظ قرآن بھی نہ تھے میں کوئی آیت تلاوت کرکے پوچھتا کہ یہ حدیث ہے یا قرآن؟ فرماتے یہ قرآن ہے۔ پھر میں ایک حدیث پڑھتا اور دریافت کرتا کہ یہ قرآن ہے یا حدیث فرماتے یہ قرآن نہیں بلکہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اسی طرح متعدد آیات و احادیث دریافت کرتا رہا اور ہر ایک کا جواب شیخ اپنے باطنی انوار و بصیرت سے صحیح دیتے رہے یہاں تک کہ میں نے قرآن کریم کی ایک آیت میں نے حدیث کا ایک تفسیری کلمہ درمیان میں ملاکر دریافت کیا کہ حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَهِيَ الْعَصْرُ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ یہ آیت قرآنی ہے یا حدیث؟

اور اس میں لفظ وھی العصا حدیث میں وارد شدہ تفسیر ہے تو فرمایا فیہ قرآن وفیہ حدیث کہ اس کلام میں قرآن بھی ہے اور حدیث بھی اور بتا دیا کہ لفظ وھی العصا زبان نبوت سے صادر شدہ کلمہ ہے اور باقی قرآن ہے۔

احمد بن المبارک بیان کرتے ہیں کہ مجلس میں میرے ساتھ فقہا اور محدثین کی جماعت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے اس علمی تبحر اور باطنی اسرار و علوم پر انتہائی متعجب ہے اس کے بعد میں نے ارادہ کیا کہ قرآن کریم اور حدیث قدسی میں فرق معلوم کروں۔ میرا خیال تھا کہ یہ فرق علوم رسمیہ اور حفظ قرآن کے بغیر مشکل ہوگا۔ کیونکہ دونوں کا عنوان قال اللہ تبارک وتعالیٰ ہی ہوتا ہے خواہ کسی آیت کو تلاوت کرنا ہو یا حدیث قدسی کو بیان کرنا۔ تو میں اسی عنوان سے احادیث قدسیہ پڑھتا رہا اور دریافت کرتا رہا کیا یہ قرآن ہے ؟ شیخ فرماتے رہے یہ کلام نہ تو قرآن ہے اور نہ اس طرح کی حدیث ہے جیسی حدیثیں پہلے تم دریافت کر رہے تھے بلکہ یہ تو حدیث کی اور کوئی قسم ہے جس کو حدیث ربانی کہنا درست ہے۔ فرماتے ہیں میں نے بے اختیار ہو کر شیخ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور کہا خدا کے واسطے مجھے ان تینوں میں فرق سمجھا دیجیے۔ اس طرح کہ گویا اپنی باطنی نگاہوں سے میں اس کو محسوس کر لوں۔ جواب میں یہ کلمات فرمائے فرمایا اگرچہ ان میں سے ہر ایک کلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لب مبارک سے سنا گیا ہے اور ہر کلام کے ساتھ نور موجود ہے لیکن تینوں میں بڑا فرق ہے۔ وہ نور جو قرآن میں ہے وہ حق تعالیٰ شانہ کا نور ذاتی اور قدیم ہے اور وہ نور جو حدیث قدسی، وہ نور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور روح ہے اور یہ نور روح قرآن کریم جیسا نور قدیم نہیں ہے۔ اور وہ نور جو احادیث قدسیہ کے علاوہ مطلق احادیث میں ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور ذات یعنی نور وجود ہے تو قرآن حق تعالیٰ کا نور قدیم اور حدیث قدسی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور روح۔ اور احادیث نبویہ آنحضرت کا نور ذات اور وجود ہے۔

بیان کرتے ہیں کہ میں شیخ رح کی اس عارفانہ تقریر پہ متحیر ہوگیا۔ اور عرض کیا، اے شیخ! یہ فرمائیے کہ نورِ ذات اور نورِ روح کا کیا مطلب ہے؟ اور ان میں باہم کیا فرق ہے؟ فرمایا ذات نبیؐ مٹی سے پیدا کی گئی اور مٹی ہی سے آدم اور تمام اولاد آدم کو پیدا کیا گیا ہے اور روح ملاءِ اعلیٰ کی طرف سے ہے جیسے ارشاد ہے "قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي" اس وجہ سے نورِ روح کا تعلق ذاتِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ سے ہوگا۔ اور نورِ ذات کا تعلق خلق سے۔ اس وجہ سے احادیثِ نبویہؐ میں نورِ ذات ہوتا ہے اور احادیثِ قدسیہ کا مضمون چونکہ ملاءِ اعلیٰ سے ہوتا ہے اور وہ پیغام ربانی ہوتی ہیں لہٰذا ان میں نورِ روح ہوتا ہے اور قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اس وجہ سے قرآن میں اللہ رب العزت کا نور ذاتی اور قدیم ہوتا ہے۔

یہی وہ معیار ہے جس کے باعث بالعموم احادیث قدسیہ کا مضمون حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات وصفات اور شئونِ الٰہیہ اس کی وسعت رحمت ومغفرت انعام وکرم اور بے پایاں قدرت اور عظمت وکبریائی کا بیان ہوتا ہے اس لیے کہ یہ جملہ مضامین ملاءِ اعلیٰ اور شئون ربانیہ سے متعلق ہیں اس کے بالمقابل مطابق احادیث نبویہؐ میں عام طور پہ حلال وحرام فرض وواجب وعدہ وعید ثواب وعقاب اعمال وعبادات کی صحت وفساد اور عالم دنیا کی صلاح و عافیت اور بندوں کی فلاح وسعادت کے مضامین ہوتے ہیں۔

مثلاً حدیث ابی ذرؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى	اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے لے
يَا عِبَادِي إِنِّي حَرَّمْتُ	میرے بندو! میں نے اپنے اوپر
الظُّلْمَ عَلٰى نَفْسِي وَجَعَلْتُهٗ	ظلم کو حرام کرلیا ہے اور تمہارے
بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا فَلَا تَظَالَمُوْا	درمیان بھی ظلم کو حرام کردیا ہے۔

يَا عِبَادِيْ كُلُّكُمْ ضَالٌّ اِلَّا مَنْ
هَدَيْتُهٗ فَاسْتَهْدُوْنِيْ اَهْدِكُمْ
يَا عِبَادِيْ كُلُّكُمْ جَائِعٌ اِلَّا مَنْ
اَطْعَمْتُهٗ فَاسْتَطْعِمُوْنِيْ اُطْعِمْكُمْ
يَا عِبَادِيْ كُلُّكُمْ عَارٍ اِلَّا مَنْ
كَسَوْتُهٗ فَاسْتَكْسُوْنِيْ اَكْسُكُمْ
يَا عِبَادِيْ اِنَّكُمْ تُخْطِئُوْنَ
بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَاَنَا اَغْفِرُ
الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا فَاسْتَغْفِرُوْنِيْ
اَغْفِرْ لَكُمْ يَا عِبَادِيْ اِنَّكُمْ
لَنْ تَبْلُغُوْا ضَرِّيْ فَتَضُرُّوْنِيْ
وَلَنْ تَبْلُغُوْا نَفْعِيْ فَتَنْفَعُوْنِيْ
يَا عِبَادِيْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ
وَاٰخِرَكُمْ وَاِنْسَكُمْ وَ
وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلٰى اَتْقٰى
قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِّنْكُمْ
مَا زَادَ ذٰلِكَ فِيْ مُلْكِيْ جَنَاحَ
بَعُوْضَةٍ وَفِيْ رِوَايَةٍ شَيْئًا
يَا عِبَادِيْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَ
اٰخِرَكُمْ وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ
كَانُوْا عَلٰى اَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ
وَاحِدٍ مِّنْكُمْ مَا نَقَصَ ذٰلِكَ
فِيْ مُلْكِيْ شَيْئًا يَا عِبَادِيْ لَوْ

اے میرے بندو! تم سب کے سب
گمراہ ہو بجز اس کے کہ میں جس کو ہدایت
دوں لہٰذا تم مجھ ہی سے ہدایت مانگو
میں تم کو ہدایت دوں گا۔ اے میرے
بندو! تم سب کے سب بھوکے ہو
سوائے اس کے کہ میں اس کو رزق دوں۔
مجھ ہی سے تم رزق مانگو میں تم کو رزق
دوں گا۔ اے میرے بندو! تم سب کے سب
ننگے ہو بجز اس کے کہ میں اس کو کپڑا دوں
تم مجھ ہی سے کپڑا مانگو میں تم کو کپڑا پہناؤں گا
اے میرے بندو! تم خطائیں کرتے
رہتے ہو رات دن اور میں سب گناہوں
کی مغفرت کرتا ہوں اس لیے تم مجھ ہی سے
مغفرت طلب کرو میں تمہاری مغفرت
کروں گا۔ اے میرے بندو! تمہارے
میں قدرت نہیں مجھ کو کوئی نقصان پہنچانے
کی کہ تم مجھ کو کوئی نقصان پہنچا سکو اور نہ
تم میں مجھے نفع پہنچانے کی طاقت ہے کہ
مجھے نفع پہنچا سکو۔ اے میرے بندو!
اگر تم میں کے پہلے اور پچھلے انسان اور جن
سب کے سب ایک متقی ترین انسان کے
قلب پر مجتمع ہو جائیں (اور سراپا تقویٰ
بن جائیں) تو یہ چیز میرے ملک میں

ان اولکم و اخرکم و انسکم وجنکم قاموا فی صعید واحد فسألونی فاعطیت کل انسان مألته ما نقص ذالک مما عندی الا کما ینقص المخیط اذا ادخل البحر۔ یا عبادی انما ھی اعمالکم احصیھا علیکم ثم اوفیکم ایاھا فمن وجد خیرا فلیحمد اللہ ومن وجد غیر ذالک فلا یلومن الا نفسہ[1]

(رواہ مسلم)

ایک مچھر کے پر کے برابر بھی اضافہ نہ کرسکے گی اور اگر تم میں کے اولین و آخرین اور جن وانس سب کے سب ایک ناچیز ترین انسان کے قلب پر متفق ہوجائیں اور سب سراپا فسق و فجور ہوجائیں تو یہ چیز میرے ملک میں کوئی کمی نہ کرسکے گی اے میرے بندو اگر تم میں کے اولین و آخرین اور انسان و جن سب کے سب جمع ہوکر کھڑے ہو ایک میدان میں پھر وہ مجھ سے مانگیں اور میں ان میں ہر ایک کو اس کے سوال کے مطابق دے دوں تو یہ بات میرے ملک اور خزانوں میں سے کوئی کوئی کمی نہیں کرے گی مگر ایسی ہی جیسے کہ کوئی سوئی جب کہ سمندر میں اس کو داخل کیا جائے، تو جس طرح سوئی کی نوک پر لگا ہوا پانی سمندر کے پانی سے کمی نہیں کرسکتا ایسے ہی ہر ایک کی دعا اور سوال کو پورا کرنا اللہ کے خزائن رحمت میں سے کوئی کمی نہیں کرسکتا۔

اے میرے بندو! بس حقیقت حال یہ ہے کہ یہ تمہارے اعمال ہیں جن کا

---

[1] صحیح مسلم۔

میں احاطہ کر رہا ہوں اور پھر ان کا پورا پورا
بدلہ تم کو دوں گا ۔ لہٰذا جو شخص تم میں سے
خیر کا عمل (اپنی زندگی میں) پائے اسے
اللہ کا شکر کرنا چاہیے اور جو شخص اس کے
علاوہ کچھ پائے تو اس کو کسی پر ملامت
نہ کرنی چاہیے بجز اپنے نفس کے ۔
(صحیح مسلم)

علیٰ ہذا القیاس حدیث اَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَالَا عَيْنٌ رَأَتْ الخ[1] اور حدیث اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنَامُ وَلَا يَنْبَغِيْ لَهٗ ، ان ینام الخ[2] اور حدیث یَدُ اللّٰہ ملاٰی الخ[3] ایسے ہی مضامین پر مشتمل ہیں جو ملأ اعلیٰ اور حق تعالیٰ کی ذات وصفات اور شئون رحمت وکرم سے تعلق رکھتی ہیں ۔ گویا احادیث قدسیہ ملاء اعلیٰ اور صفاتِ حق کے مضامین پر مشتمل ہوتی ہیں اور احادیث نبویّہ احکام خلق پر۔

علامہ احمد بن المبارک نے اس مسئلہ کے ماتحت شیخ رحمۃ اللہ کے جو حقائق و معارف بیان کیے ہیں دل تو چاہتا تھا کہ ان کو تمام وکمال نقل کر دیا جائے لیکن کتاب کے یہ محدود اوراق اس وسعت کے متحمل نہیں ہوسکتے اس لیے صرف یہی حصّہ کلام نقل کر دیا۔

اس کلام میں چونکہ ایک خاص حلاوت اور باطنی اسرار و رموز تھے اس لیے علامہ احمد بن المبارک ہی کی تعبیر میں اس مضمون کو پیش کر دیا گیا ۔ حضرات اہل علم اصل کی مراجعت فرمائیں[4] ۔

---

[1] جامع الترمذی ۔ [2] صحیح مسلم ۔

[3] متفق علیہ ۔ [4] الابریز صفحہ ۲۳

ابتداءِ نزولِ قرآن مجید

قرآن کریم کی آیات میں سب سے اوّل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کونسی آیات نازل ہوئیں ؟ اس بارہ میں اگرچہ متعدد اقوال نقل کیے گئے ہیں لیکن علماءِ مفسّرین اور محققین کے نزدیک صحیح اور مشہور قول یہی ہے کہ سب سے پہلے جو کلمات آپؐ پر نازل ہوئے وہ اِقْرَءْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ سے وَعَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ تک ہیں چنانچہ امام بخاری اور امام مسلم رحمۃ اللہ نے حضرت عائشہؓ کی یہ روایت ذکر فرمائی :

عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ اِنَّ اَوَّلَ مَا بُدِیَٔ بِهٖ مِنَ الْوَحْیِ الرُّؤْیَا الصَّالِحَةُ فِی النَّوْمِ فَكَانَ لَا یَرٰی رُؤْیَا اِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ ۔ ثُمَّ حُبِّبَ اِلَیْهِ الْخَلَاءُ وَكَانَ یَخْلُوْ بِغَارِ حِرَاءٍ فَیَتَحَنَّثُ فِیْهِ وَهُوَ التَّعَبُّدُ اللَّیَالِیَ ذَوَاتِ الْعَدَدِ قَبْلَ اَنْ یَّنْزِعَ اِلٰی اَهْلِهٖ وَیَتَزَوَّدُ لِذٰلِكَ ثُمَّ یَرْجِعُ اِلٰی خَدِیْجَةَ فَیَتَزَوَّدُ لِمِثْلِهَا حَتّٰی جَاءَهُ الْحَقُّ وَهُوَ فِیْ غَارِ حِرَاءٍ فَجَاءَهُ الْمَلَكُ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ سب سے پہلے وحی کی ابتدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے مبارک اور سچے خوابوں سے ہوئی تو آپ جو بھی کوئی خواب دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح روشن ہو کر آپ کے سامنے ظاہر ہوتا ۔ پھر آپ کو خلوت و تنہائی محبوب ہوگئی تو آپ غارِ حراؔ میں خلوت اختیار فرمانے لگے ۔ آپ وہاں خلوت نشین اور گویا معتکف ہو کر متعدد راتوں (اور دنوں) تک کے لیے عبادت فرمایا کرتے قبل اس کے کہ آپ اپنے گھر کی طرف لوٹیں اور اس مدت کے لیے

فَقَالَ إِقْرَءْ قُلْتُ مَا أَنَا بِقَارِئٍ قَالَ فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدُ ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ إِقْرَءْ قُلْتُ مَا أَنَا بِقَارِئٍ فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّانِيَةَ حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدُ ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ اقْرَءْ قُلْتُ مَا أَنَا بِقَارِئٍ قَالَ فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّالِثَةَ حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدُ ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ اقْرَءْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ، خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ إِقْرَءْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ فَرَجَعَ بِهَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلٰى خَدِيْجَةَ تَرْجُفُ بَوَادِرُهُ ۔۔۔۔۔ اِلٰی آخر الحدیث ۔

آپ توشہ لے جایا کرتے پھر خدیجہ رضؓ کی طرف لوٹتے اور اتنے ہی دنوں کے لیے پھر توشہ لے جاتے ۔ یہاں تک کہ ناگہاں آپ پر حق آگیا (اور نبوّت و رسالت سے آپ سرفراز فرما دیئے گئے) جب کہ آپ غارِ حراء میں تھے (جس کی صورت یہ ہوئی کہ) اللہ کا فرشتہ آپ کے پاس آیا اور اس نے آپ سے کہا پڑھیے ۔ آپ نے جواب دیا میں تو پڑھا ہُوا نہیں ہوں ۔ بیان فرمایا کہ اس فرشتہ نے مجھ کو پکڑا اور پھر دبایا اور خوب دبایا حتیٰ کہ مشقت و تکلیف انتہا کو پہنچ گئی ۔ اور پھر مجھ کو چھوڑا اور کہا پڑھیے میں نے کہا میں تو پڑھا ہُوا نہیں ہوں تو اس فرشتہ نے مجھ کو دوبارہ پکڑا ، اور پھر دبا دیا حتّٰی کہ مشقت و تکلیف انتہا کو پہنچ گئی ۔ پھر مجھ کو چھوڑا اور کہا پڑھیے ۔ میں نے کہا میں تو پڑھا ہُوا نہیں ہوں تو مجھ کو اس فرشتہ نے پھر تیسری بار پکڑا اور مجھ کو بھینچا حتیٰ کہ مشقت و تکلیف انتہا کو پہنچ گئی اور پھر مجھ کو چھوڑا اور کہا اقرء باسم ربک الذی خلق الانسان من علق ۔ اقراء و ربک الاکرم الذی

علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم۔

آپ ان آیات کو لے کر حضرت خدیجہؓ کی طرف لوٹے اور حال یہ تھا کہ آپؐ کا قلب (وحی کی عظمت وہیبت کی وجہ سے) کانپ رہا تھا۔

الغرض صحیح بخاری ومسلم کی اس مشہور ومعروف حدیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت پر فائز ہونے کے بعد سب سے پہلے یہی آیات اقراء نازل ہوئیں۔

حاکم نے مستدرک میں اور بیہقیؒ نے دلائل النبوۃ میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ اَوَّلُ سُوْرَۃٍ نَزَلَتْ فِی الْقُرْآنِ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ سب سے پہلی سورت قرآن میں نازل ہونے والی اقرء ہے۔

شیخ جلال الدین سیوطی نے الاتقان میں طبرانی کی ایک روایت نقل کی ہے:

عَنْ اَبِیْ رَجَاءِ الْعُطَارِدِیْ قَالَ كَانَ اَبُوْمُوْسٰی يُقْرِءُنَا وَيُجْلِسُنَا حَلَقًا وَعَلَيْهِ ثَوْبَانِ اَبْيَضَانِ فَاِذَا تَلَا هٰذِهِ السُّوْرَةَ اِقْرَءْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ قَالَ هٰذِهٖ اَوَّلُ سُوْرَةٍ اُنْزِلَتْ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

ابو رجاء العطاردی بیان کرتے ہیں کہ ابوموسیٰ اشعریؓ ہم کو قرآن کریم پڑھایا کرتے اور ہم کو بٹھا دیتے تھے حلقہ بنا کر اور ان پر دو سفید کپڑے ہوتے، تو جب اس سورت اقرا باسم ربک الذی پر پہنچتے فرماتے یہی سب سے پہلی وہ سورت ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ پر نازل کی گئی۔

اسی طرح دیگر صحابہ اور تابعین سے یہی منقول ہے کہ سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات اقرء باسم ربك الذی خلق ہیں۔ اور مجموعی طور پر آثار وروایات اس

---

[1] یعنی پڑھیے اپنے رب کے نام۔ اس رب کے نام جس نے انسان کو نطفہ اور بستہ خون سے پیدا کیا۔ پڑھیے اور آپ کا رب تو وہ رب اکرم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سکھایا۔ سکھایا ہے انسان کو جو وہ نہیں جانتا تھا۔ ۱۲۔

باب میں شہرت کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں۔ سفیان ثوری ابن شہاب زہری اکثر محدثین اسی کے قائل ہیں۔

بعض حضرات نے یہ قول اختیار کیا کہ قرآن میں سب سے اوّل نازل ہونے والی آیات یَاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ ہیں اور اس کی نسبت حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طرف کی ہے۔

کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کے بعض الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید وہ اس بات کے قائل ہیں جیسے کہ ابوسلمہ کی روایت میں ہے کہ میں نے جابر بن عبداللہ سے دریافت کیا کہ سب سے پہلے قرآن کا کونسا حصّہ نازل ہوا؟ جواب دیا یَاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ۔ میں نے کہا یاایھا المدثر یا اقرء باسم ربک؟ اس پر فرمانے لگے کہ میں تو تم سے وہی بات بیان کرتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بیان فرمائی:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جَاوَرْتُ بِحِرَاءٍ فَلَمَّا قَضَیْتُ جِوَارِیْ نَزَلْتُ فَاسْتَبْطَنْتُ الْوَادِیَ فَنُوْدِیْتُ فَنَظَرْتُ اَمَامِیْ وَخَلْفِیْ وَعَنْ یَمِیْنِیْ وَشِمَالِیْ وَنَظَرْتُ اِلَی السَّمَاءِ فَاِذَا ھُوَ یَعْنِیْ جِبْرِیْلَ فَاَخَذَتْنِیْ رَجْفَۃٌ فَاَتَیْتُ خَدِیْجَۃَ فَقُلْتُ دَثِّرُوْنِیْ فَدَثَّرُوْنِیْ۔ فَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ یَاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ میں نے مجاورت وخلوت نشینی اختیار کی غار حراء میں۔ جب میں اپنی یہ مدت خلوت واعتکاف پوری کرچکا تو میں پہاڑ سے اترا اور بطن وادی (نشیب وادی) میں پہنچا تو مجھے پکارا گیا۔ میں نے اپنے سامنے دیکھا اور اپنے پیچھے اور دائیں طرف اور بائیں طرف اور آسمان کی طرف دیکھا تو ناگہاں جبریلؑ پہ نظر پڑی (ان کو دیکھ کر مجھ پہ ہیبت ورعب طاری ہوا حتیٰ کہ مجھ پہ کپکپی طاری ہوگئی۔ میں خدیجہؓ کے پاس آیا اور کہا مجھ کو چادر (کمبل) اڑھادو

تو انہوں نے مجھے چادر اڑھا دی۔ اس پر
اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ یا ایّھا المدثر
قُمْ فَاَنْذِرْ۔

علماء مفسرین نے جابرؓ کی اس روایت کے مختلف جوابات دیئے ہیں کسی نے بیان کیا کہ یہ سوال مطلق اوّلیت کے بارہ میں نہ تھا بلکہ اس لحاظ سے کہ سُورتوں میں سب سے پہلے پوری سُورت کونسی نازل ہُوئی تو اسی حیثیت سے جواب دیا کہ کامل سُورت یاایّھا المدثر سب سے پہلے نازل ہُوئی ہے اور اقرء باسمِ ربک اگرچہ سب سے پہلے نازل ہُوئی لیکن وہ صرف اوّل کی پانچ آیات عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ تک ہیں۔ پوری سُورت پہلے نہیں نازل ہُوئی تھی۔

امام بخاریؒ نے نہایت لطیف انداز میں اس اشکال کو حل فرمایا۔ ابن شہاب زہری کی تعلیق نقل کرتے ہُوئے ان کی سند سے یہ لفظ ظاہر کردیا وَھُوَ یُحَدِّثُ عَنْ فَتْرَۃِ الْوَحْیِ جابر اس قصہ میں فترت وحی یعنی وحی کی ابتداء کے بعد کچھ عرصہ تک سلسلہ وحی کے رُک جانے کا قصہ بیان کررہے تھے۔ یعنی حضرت جابرؓ یہ بیان فرمارہے تھے کہ وحی کی ابتدا ہوچکنے کے بعد پونے تین سال جو مدّت فترۃ الوحی (یعنی انقطاع سلسلۂ وحی) کی گذری اس کے بعد سب سے پہلے آیات یاایّھا المدثر قُمْ فَاَنْذِرْ نازل ہوئیں تو معلوم ہُوا کہ ان آیات کی اوّلیت مطلقہ مقصود بیان نہیں بلکہ بعد فترت وحی سب سے پہلے نازل ہونے کی حیثیت بیان کی ہے۔

بلکہ یہ تصریح صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں مرفوعاً بھی موجود ہے۔ بخاری کی کتاب الادب میں ہے قَالَ جَابِرٌ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثُمَّ فَتَرَ الْوَحْیُ فَبَیْنَا اَنَا اَمْشِیْ الخ جابرؓ بیان کرتے ہیں میں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سُنا آپؐ نے فرمایا یعنی ابتداء وحی اور اقرء باسم آیات کے نازل ہونے کا واقعہ بیان فرمانے کے بعد پھر وحی کا سلسلہ رُک گیا تو ایک دفعہ جب کہ میں وادی میں چل رہا تھا تو مجھ کو آواز دی گئی اور پھریا ...

آیات نازل ہونے کا ذکر فرمایا۔

غرض معلوم ہوگیا کہ درحقیقت جابرؓ اس امر کے قائل نہیں جو ان کی طرف ان آیات کی اولیت نزول کے بارہ میں منسوب کیا گیا بلکہ وہ یا ایہا المدثر کا اوّل نازل ہونا اسی لحاظ سے بیان کر رہے ہیں کہ انقطاع وحی کے بعد ۔۔۔۔ اور ان کا قول حقیقۃً اقرء باسم ربک کی اوّلیت کے منافی نہیں ہے ۔ بعض مفسرین اور مورخین کا قول یہ ہے کہ سب سے اوّل نازل ہونے والی سورت سورۃ الفاتحہ ہے اور اسی بناء پر فاتحۃ الکتاب اس سورہ کا نام ہے اگر یہ قرآن کریم کی ابتداء ہے ۔ یہ حضرات بیہقی کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو انہوں نے دلائل النبوۃ میں عمرو بن شرجبیل کی سند سے بیان کی ہے جس میں قبل از وحی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عزلت و خلوت نشینی کا ذکر اور حضرت خدیجہؓ کی تسلی کا مضمون بیان کرتے ہوئے کہا گیا ۔ آپؐ نے فرمایا مجھ کو ندا کی گئی اور کہا گیا" یا محمد قل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الحمد للہ رب العالمین حتی بلغ ولا الضالین[1] "

لیکن یہ روایت سند کے لحاظ سے صحیح اور معتبر نہیں ۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ جمہور علماء اور مفسرین نے قول اوّل ہی اختیار کیا ہے[2] ۔ اسی طرح وہ قول بھی صحیح اور قابل اعتبار نہیں ہے جس میں بسم اللہ الرحمٰن کی اوّلیت بیان کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ مضامین مرسل اور غیر متصل اور غیر صحیح روایات سے ثابت ہیں اور اصولاً ان روایات کو صحیحین اور متفق علیہ روایات کے مقابلہ میں ترجیح نہیں دی جاسکتی ۔ البتہ بعض مرسل روایتوں میں یہ مضمون جو بیان کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے جس چیز کے پڑھنے کا حکم دیا وہ بسم اللہ الرحمٰن الحمد للہ رب العالمین تھی"

---

[1] الاتقان للسیوطیؒ ج ۱ ۔ [2] صاحب کشاف نے اس قول کی نسبت بہت سے مفسرین کی طرف کی ہے لیکن ابن حجر کی رائے کے مطابق یہ صحیح نہیں ۔ ان کا خیال ہے اس قول کے قائل شاذ و نادر دو چار ہی لوگ ہوں گے ۔ ۱۲ ۔

اس کی تطبیق کی صورت اختیار کی جاسکتی ہے کہ دیا جائے کہ اقرء باسم ربک الذی خلق آیات سے سلسلۂ وحی کا آغاز ہوا اور ان الفاظ سے انشا قرأت کا آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ پڑھیے اپنے اس رب کے نام سے الخ تو آپ نے جب تیسری مرتبہ جبریلؑ کے دبانے کے بعد یہ کلمات پڑھ لیے تو پھر آپ نے اسی مجلس میں یہ دریافت کیا ماذا اقرء کہ میں کیا پڑھوں یعنی انشا اور ایجاد قرأت کے حکم کی تعمیل ہوگئی اب دریافت طلب امر باقی رہ گیا کہ مضمون (یعنی جس چیز کو پڑھا جائے) وہ کیا ہے اس پر جواب دیا گیا ہوگا اقرء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الحمد للہ رب العالمین الخ الغرض اس تاویل سے یہ سمجھا جاسکتا ہے سورۂ فاتحہ کی اولیت سے مراد یہ ہے کہ سلسلہ وحی و نبوت کے بعد اسی مجلس میں سب سے پہلے یہ سورت نازل کی گئی۔ سیرت کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز ہر دور اور زمانہ میں مقرر و ثابت رہی۔ معراج میں اگرچہ صلوات خمس کی فرضیت ہوئی لیکن یہ بھی ثابت ہے کہ قبل از معراج صبح و شام کی دو نمازیں مقرر تھیں اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی نماز بغیر فاتحہ کے نہیں ہوتی۔ نیز یہ کہ فاتحہ ام القرآن ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ سورۂ فاتحہ تمام قرآن کریم کے لیے اساس اور بنیاد ہے جس طرح تخم اپنے درخت کے لیے ایک اجمالی وجود رکھتا ہے اور اس کو وجود شجرہ پر تقدم حاصل ہے اسی طرح ترتیب طبعی کا تقاضہ یہ ہوسکتا ہے کہ ام القرآن کو بحیثیت نزول بھی مجموعہ قرآن پر تقدم ہو تو اس طرح ان وجوہ سے یہ تاویل اقرب الی القبول ہوسکتی ہے۔ اور اس کے بعد اقرء باسم ربک کی اولیت کے یہ قول منافی بھی نہ رہے گا۔

یہ تفصیل اور بحث تو مطلق اولیت کے بارہ میں تھی۔ ائمہ مفسرین اور علماء نے قرآن کریم کے مضامین میں سے ہر مضمون اور موضوع سے متعلق اوائل آیات کا تتبع کیا۔ اور تحقیق کی کہ کس مضمون اور مسئلہ میں سب سے پہلی کون سی

بعض خصوصی مضامین و مسائل میں اوّل نازل ہونے والی آیات

شیخ جلال الدین سیوطیؒ "الاتقان فی علوم القرآن" میں بعض خصوصی مضامین اور مسائل میں سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات کی بحث میں فرماتے ہیں کہ:

مسئلہ جہاد و قتال میں سب سے پہلے نازل ہونے والی یہ آیت ہے:

اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّہُمۡ ظُلِمُوۡا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصۡرِہِمۡ لَقَدِیۡرُۨ ﴿ۙ﴾ الَّذِیۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِہِمۡ بِغَیۡرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ؕ

اجازت دے دی گئی ہے جہاد ان لوگوں کو جن سے لڑا جا رہا ہے اور ان کو قتل کیا جا رہا ہے اس بنا پر اجازت دی گئی کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر بہت بڑی قدرت رکھنے والا ہے جن کو نکال دیا گیا ہے ان کے گھروں سے ناحق۔ محض اس جرم میں کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب تو اللہ ہے۔

حاکم نے مستدرک میں ابن عباسؓ سے یہی روایت نقل کی ہے:

ابن جریر نے ابوالعالیہ سے یہ نقل کیا ہے کہ مدینہ منورہ میں مسئلہ جہاد و قتال میں سب سے اوّل نازل ہونے والی آیت "وَقَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ وَلَا تَعۡتَدُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ"[1] اور بعض کا خیال ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ[2] "ترغیب جہاد میں اوّلین آیت ہے۔

قتل و خونریزی کے بارہ میں نازل ہونے والی پہلی آیت وَمَنۡ قُتِلَ مَظۡلُوۡمًا[3] فَقَدۡ جَعَلۡنَا لِوَلِیِّہٖ سُلۡطٰنًا فَلَا یُسۡرِفۡ فِّی الۡقَتۡلِ ؕ اِنَّہٗ کَانَ مَنۡصُوۡرًا[4]

---

[1] سورۃ البقرہ ⁂ [2] سورۃ التوبہ ⁂ [3] سورۃ بنی اسرائیل

[4] ابن جریر نے ضحاک سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

مسئلہ خمر اور شراب کی حرمت کے بارہ میں نازل ہونے والی پہلی آیت یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَا اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ہے:[1]

ان الفاظ کی سطحی گنجائش سے بعض لوگ خیال کرنے لگے کہ شاید شراب قطعاً حرام نہیں ہے تو پھر یہ دوسری آیت نازل لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی[2]۔ اس پر کچھ بعضوں کو یہ تصور ہوا کہ حرمت بوقت صلوۃ ہے اور شاید اوقات صلوۃ کے علاوہ دیگر اوقات میں استعمال کی گنجائش ہو تو تیسری دفعہ یہ آیت نازل ہوئی۔ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ[3]۔ اس ترتیب کے ساتھ تحریم خمر کے بارہ میں یہ آیات نازل کی گئیں۔

ماکولات و مطعومات کے مسئلہ میں سب سے پہلے مکہ مکرمہ نازل ہونے والی آیت قُلْ لَّا اَجِدُ فِیْمَا اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗ اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اس کے بعد پھر آیت سورۂ نحل فَکُلُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَیِّبًا اور مدینہ منورہ میں آیت اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ[4] الآیہ

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے آیات سجدہ تلاوت میں سب سے پہلے سورۃ والنجم کی آیت سجدہ[5] ہے۔ مسئلہ طہارت میں سب سے پہلی نازل ہونے والی آیت وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ (مدثر)

قیامت اور نفخ صور کا مضمون سب سے پہلے آیت فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ فَذٰلِکَ یَوْمَئِذٍ یَّوْمٌ عَسِیْرٌ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ غَیْرُ یَسِیْرٍ (مدثر) میں ذکر فرمایا گیا۔

سورہ براۃ میں سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت لَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ کَثِیْرَةٍ[6]

---

[1] سورۃ بقرہ ۔ [2] سورۃ نساء ۔ [3] سورۃ مائدہ ۔
[4] سورۃ الانعام یہ سورۃ مائدہ ۔ [5] روی البخاری ۔ [6] ذکر الفریابی عن ابن ابی نجیح عن مجاہد

اور مسروق ابوالضحیٰ سے نقل کرتے ہیں کہ سورۃ براۃ میں پہلی آیت اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا یہ الفاظ غزوہ تبوک میں نازل ہوئے اور غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد سورۃ براۃ کی وہ آیات نازل کی گئیں جو ابتدا سورت میں ہیں۔

سورۃ آل عمران میں سب سے اوّل نازل ہونے والی آیت هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ اس کے بعد بقیہ حصہ غزوہ احد کے زمانہ میں نازل ہوا[1]۔

اولیات قرآن کی تفصیل کے لیے کتب اصول کی مراجعت فرمائی جائے۔

قرآن کریم میں نازل ہونے والی آخری آیات اور سورتیں

اس مسئلہ میں کہ سب سے آخری آیات کونسی ہیں متعدد روایات کتب احادیث و تفسیر میں علماء نے ذکر کی ہیں۔ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے آخری آیت يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ہے۔ اور سورتوں میں سب سے آخری سورت سورۃ براۃ ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں نازل ہونے والی آخری آیت آیہ ربوا یعنی يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا ہے۔

ابوسعید خدری رضی اللہ نے نقل کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ ہمیں ایک روز عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اور فرمایا قرآن کریم میں سب سے آخری آیت ربوا نازل ہوئی ہے۔ اور بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری آیت "وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ" اور اس آیت کے نازل ہونے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رحلت فرمانے کے درمیان صرف اکیاسی دن کا فصل ہے اور بعض

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج ۱۔

[2] الاتقان ج ا ۔

نزول میں یہ بتایا گیا کہ صرف نو راتوں کا فصل ہے۔ اور یہ آیت ربیع الاول کی ابتدائی تاریخوں میں نازل ہوئی۔

ابی بن کعبؓ سے نقل ہے کہ آخری آیات لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ. فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ جن دو آیتوں پر سورۃ توبہ ختم ہوتی ہے۔

امام مسلمؒ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی روایت کیا کہ آخری سورت جو نازل ہوئی وہ اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں یہ ہے کہ آخری آیت وَمن يقتل مومنا متعمدا فجزائه جهنم خالدا فيها ہے اور اس آیت کو کسی اور آیت نے منسوخ نہیں کیا۔ بعض روایات میں ہے کہ آخری آیت فاستجاب لهم ربهم انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثی ہے۔

اور عبداللہ بن عمر کی صحیح الاسناد روایت میں یہ ہے کہ سب سے آخری آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتممت علیكم نعمتی ورضیت لكم الاسلام دینا (مائدہ) ہے۔ جو حجۃ الوداع مقام عرفہ میں ذالحجہ کی نویں تاریخ کو شام کے وقت نازل ہوئی جب کہ آپؐ عرفات سے مزدلفہ کی طرف کوچ فرمانے والے تھے۔
ان نقول اور حوالوں میں باہم اگرچہ اختلاف معلوم ہوتا ہے لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ آخر آیت کا بیان مختلف حیثیتوں سے فرمایا گیا ہے۔

مسائل میراث میں آخری آیت يَسْتَفْتُوْنَكَ ہے اور احکام بیع و شرا میں آخری آیت آیۃ الربوا یعنی یاایھا الذین امنوا اتقوا اللہ الخ ہے۔ حدود و تعزیرات میں آیت ومن یقتل مومنا متعمدا ہے اور عمل عبد وجہد اور اعمال کا عنداللہ باعث اجر و ثواب ہونے کے موضوع میں آخری آیت فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ ہے۔ طول سورتوں میں وہ آخری سورت جس میں آنحضرت

کے عالمِ دنیا سے رحلت فرمانے کی خبر ہے وہ اذاجاء نصراللہ ہے جیسے کہ ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ سورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر وفات ہے۔ بیہقی نے بیان کیا کہ یہ سورت ایام تشریق میں نازل ہوئی اور آپ اس وقت ناقہ قصواء پر سوار تھے۔ تمام احکام دین فرائض اسلام اور مسائل حلال وحرام کی تکمیل آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ نازل کر کے فرمائی گئی۔ جیسا کہ خود آیت کا مضمون اس پر دلالت کر رہا ہے اور مفسرین کی ایک جماعت مثلاً سدی اور قتادہ اور ابن کثیر نے اس کی تصریح کی کہ یہ آیت یوم عرفہ میں نازل ہوئی اور پھر اس کے بعد آنحضرتؐ پر کوئی حلال وحرام کا مسئلہ نہیں نازل کیا گیا۔

الغرض ان نقول میں یہ تطبیق کی صورت معلوم ہوتی ہے اور قرائن وروایات اس کے واسطے مؤید ہیں۔

شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے واحدی کی سند سے علی بن الحسین کا ایک اثر نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے مکہ مکرمہ میں جو سورت نازل ہوئی وہ اقرء باسم ربک ہے (جیسا کہ تفصیل سے بیان کر دیا گیا) اور مکہ مکرمہ میں آخری نازل ہونے والی سورت اَلْمُؤْمِنُوْنَ ہے اور مدینہ منورہ میں نازل ہونے والی پہلی سورت وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ہے، اور سب سے آخری سورت براءۃ ہے[1] لیکن حافظ ابن حجر کا خیال ہے کہ مدینہ میں نازل ہونے والی پہلی سورت بقرہ ہے اور مفسرین کا اس پر اتفاق بیان کیا۔[2]

مکی اور مدنی آیات اور سورتیں

آیات قرآنیہ کے مکی اور مدنی ہونے کی بحث علماء مفسرین کے نزدیک ایک اہم موضوع ہے۔ متقدمین علماء نے اس پر مستقل کتابیں تالیف کیں اور اس میں شبہ نہیں کہ اس بحث کی تفصیلات اور متعلقات کا ضمناً کسی ایک عنوان کے تحت احاطہ

---

[1] الاتقان جلد اول ۱۲۔
[2] فتح الباری کتاب التفسیر

مشکل ہے۔ اجمالی طور پر بعض بنیادی باتیں ذکر کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔

علامہ ابن النقیب نے بیان فرمایا، قرآن کریم میں نازل کردہ آیات چار صورتوں پر مشتمل ہیں۔ مکی۔ مدنی۔ بعض حصہ مکی اور بعض مدنی۔ اور وہ کہ جو نہ مکی ہے اور نہ مدنی ہے۔ آئمہ تفسیر نے اس بارہ میں جو اقوال بیان فرمائے ان کا حاصل یہ ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ "مکی آیت وہ ہے جو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی اگرچہ ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہو۔ اور مدنی آیت وہ ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی" اس تحقیق پر یہ بات لازم آتی ہے کہ جو آیات دوران سفر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے علاوہ کسی اور سرزمین میں نازل ہوئیں وہ نہ مکیہ ہوں اور نہ مدنیہ بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک واسطہ رہے گا۔ طبرانی نے ابوامامہ سے روایت نقل کی ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ	قرآن کریم تین جگہوں میں نازل فرمایا
فِيْ ثَلٰثَةِ اَمْكِنَةٍ مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةِ	گیا مکہ مدینہ اور شام میں۔
وَالشَّامِ۔	

حافظ ابن کثیر بیان کرتے ہیں کہ شام سے مراد تبوک ہے اور غزوہ تبوک میں دوران سفر بہت سی آیات نازل ہوئی تھیں اور مکہ کے ساتھ مکہ مکرمہ کے اطراف و نواحی کے علاقہ اور مضافات شامل ہیں جیسے منیٰ عرفات اور حدیبیہ تو ان جگہوں میں نازل ہونے والی آیات مکیہ ہی شمار کی جائیں گی۔ اور علیٰ ہذا مدینہ کے ساتھ مدینہ منورہ کے مضافات اور عوالی شامل ہوں گے جیسے بدر، احد، قبا اور سلع وغیرہ

دوسرا قول یہ ہے کہ مکی آیات ان کو کہا جائے گا جو اہل مکہ کو خطاب ہیں۔ اور مدنی آیات وہ ہیں جو اہل مدینہ کو خطاب ہیں۔ یہ قول علماء کے نزدیک غیر معروف ہے۔ تیسرا قول جو اکثر ائمہ مفسرین کے نزدیک پسندیدہ اور مشہور و راجح ہے وہ یہ ہے کہ مکی آیات ہجرت سے قبل نازل ہونے والی آیات کو کہا جائے گا۔ خواہ وہ مکہ کے علاوہ کسی اور جگہ نازل ہوئی ہوں۔ اور مدنی آیات وہ ہیں جو ہجرت

کے بعد نازل ہوئیں۔ خواہ بعد الہجرت کوئی آیت مکہ یا مکہ مکرمہ کے مضافات میں نازل ہوئی ہو۔ تو اس تحقیق پر وہ آیات جو حدیبیہ سے واپسی پر سرزمین مکہ سے قریب کسی جگہ نازل ہوئیں۔ یا فتح مکہ کے سال ۸ھ ہجری میں یا حجۃ الوداع میں مقام عرفات اور منیٰ میں جو آیات نازل ہوئیں وہ سب مدنیہ آیات ہوں گی۔ کیونکہ ان کا نزول ہجرت کے بعد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی آیات کو تمام مفسرین مدنیہ آیات میں شمار کرتے ہیں۔

مکی اور مدنی آیات و سورتوں میں فرق

مکی اور مدنی آیات اور سورتوں کے درمیان مفسرین نے طرز بیان، معانی اور مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے بھی فرق کیا ہے اور اس کی متعدد وجوہ بیان کی ہیں۔ مثلاً مکہ مکرمہ میں جو آیات نازل ہوئیں ان میں بیشتر اصول اور کلیات دین کی تفصیل ہے۔ توحید، نبوت، حشر و نشر، جزاء و سزا، انذار و تبشیر اور تذکیر و تحذیر سے متعلق مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ جگہ جگہ حق تعالیٰ کی عظمت و ہیبت اور اس کے قہر و عذاب کی اہمیت بیان کی گئی۔ اہل جہنم کے احوال سنائے گئے۔ بار بار عبرت و نصیحت کے انداز میں خدا اور خدا کے پیغمبروں اور آخرت پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا اور قدم قدم پر غور و فکر کی دعوت دی گئی اور اس پر آمادہ کیا گیا کہ لوگ خود اپنی عقل اور بصیرت سے حق کو پہچانیں اور اس کو قبول کریں۔ بت پرستی کی مذمت اور اس کے خلاف عقل ہونا اور توحید خداوندی کے دلائل ایسے عبرت آموز طریقہ سے بیان کیے گئے کہ ادنیٰ عقل رکھنے والا انسان یہ بات بخوبی سمجھ جاتے کہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کو معبود بنانا بلاشبہ انسان کی سب سے بڑی حماقت ہے۔ حقائق معنویہ کو کثرت سے امثال و تشبیہات کے رنگ اس طرح بیان فرمایا گیا کہ معنوی حقائق اور باطنی احوال و امور محسوسات کی طرح نظروں کے سامنے مشاہد اور محسوس نظر آنے لگے

پھر ان تمام امور کے لیے تعبیر بھی ایسی اختیار کی گئی کہ ہر ایک کلمہ اور ترکیب اپنے انداز بیان سے دنیا کے فصحاء اور مایہ ناز بلغاء اور خطباء وشعراء کو مقابلہ سے عاجز کر رہی تھی اس لیے کہ ان آیات میں بالخصوص خطاب اہل مکہ کو تھا اور وہ اپنی شاعری اور فصاحت و بلاغت پر اس قدر نازاں تھے کہ بیت اللہ کی دیوار وں پر اپنے قصائد اس اعلان "ھل من مبارزنا" (ہے کوئی مقابلہ کرنے والا) کے ساتھ لٹکایا کرتے تھے۔ اس کے بالمقابل مدنی آیات میں مضامین کا انداز تعبیر نہایت سہل اور واضح اختیار کیا گیا اور تعبیر نہایت سادہ مگر دلائل کی قوت اور حقائق عظمت سے لبریز۔ کیونکہ آیات مدنیہ کے اصل مخاطب اہل کتاب تھے اور وہ علمی صلاحیتوں کے پیش نظر اس کے اہل تھے کہ حقائق و دلائل کو سمجھیں اور ان کو قبول کریں۔ اس وجہ سے ایسے مضامین نہایت واضح دلائل کے ساتھ پیش کیے گئے اور بہت سی آیات میں ان کو مناظرہ اور محاجہ کی دعوت بھی دی گئی۔ ان میں جو عیب اور بیماریاں یعنی حسد و عناد، غرور و تکبر تلبیس بین الحق و الباطل، کتمان حق اور تحریف آیات اللہ جیسی تمام باتوں کو قرآن نے نمایاں طور پر بیان کیا۔ نیز مدنی آیات میں متعدد بار تورات و انجیل کی ان بشارتوں کو بھی ذکر کیا گیا جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور آپؐ کی نشانیوں کا بیان تھا اور اہل کتاب کو حکم تھا کہ وہ ان نبی آخر الزمان پر ایمان لائیں تاکہ ایک طرف ان مضامین سے قرآن کریم کی حقانیت ثابت ہو جائے اور دوسری طرف اہل کتاب پر حجت بھی قائم ہو جائے۔ آیات مدنیہ کے خصوصی مضامین میں سے یہ بھی ہے کہ بار بار تورات و انجیل کا آسمانی کتاب اور حق ہونا۔ نیز یہ کہ قرآن ان کی تائید کرتا ہے" بیان کیا گیا اور یہ کہ تمام کتب سماویہ اصول دین اور توحید کے معاملہ میں متفق ہیں پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اہل کتاب قرآن پر ایمان نہ لائیں۔ ان آیات میں اہل کتاب کو ایمان باللہ اور ایمان بالرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت دی گئی، اور دلائل سے یہ بتایا کہ تورات و انجیل پر ایمان رکھنے کا مقتضیٰ یہی ہے کہ ہر کتابی

شخص قرآن کو تسلیم کرے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔

علاوہ ازیں آیات مدنیہ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ ان میں اکثر بیشتر عبادات ومعاملات سے تعلق رکھنے والے احکام حلال وحرام فرائض وواجبات، اور ممنوعات ومنہیات بیان کیے گئے۔ غزوات وجہاد مال غنیمت خراج اور جزیہ نیز حدود وقصاص کے مسائل بیان کیے گئے جب کہ آیات مکیہ میں عموماً اعتقادی مسائل توحید ورسالت، آخرت، جزا وسزا اور جنت وجہنم کے مضامین ہوتے ہیں۔ علماء مفسرین نے یہ بھی بیان کیا ہے[1] کہ یا ایھا الناس کا خطاب مکی آیات کی علامت ہے اور یا ایھا الذین کا عنوان مدنی آیات کے لیے۔ لیکن یہ بات قانون کے درجہ میں نہیں ہے کیونکہ بعض مواقع میں مدنی آیات میں بھی یا ایھا الناس کا عنوان اختیار فرمایا گیا ہے۔ مثلاً یا ایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم سورۃ بقرہ میں اور یا ایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ سورۃ نساء میں بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ لفظ کلا صرف مکی سورتوں میں ہے۔ لہذا جو آیت یا سورۃ اس لفظ کے ساتھ ہے وہ مکیہ ہے۔

یہ بھی بیان کیا گیا کہ اکثر انبیاء سابقین اور امم سابقہ کے واقعات وقصص مکی سورتوں میں ہیں۔ سوائے سورۃ بقرہ کے جہاں بھی آدم وابلیس کا قصہ ہے وہ سورت مکیہ ہے۔

---

[1] یہ قول علقمہ اور مجاہد سے منقول ہے۔ قرطبی ج ۱۔

مکّی اور مدنی سورتیں اور ان کی تعداد

قاضی ابوبکرؒ نے "الانتصار" میں یہ فرمایا کہ آیات وسورتوں کے مکّی اور مدنی ہونے کا علم حضرات صحابہؓ کے اقوال اور ان کی تصریحات ہی سے ہوسکتا ہے، کیونکہ یہی حضرات امّت کے سب سے پہلے وہ افراد ہیں جنھوں نے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے قرآن پڑھا اور سیکھا اور اس کی تفصیلات معلوم کیں اس وجہ سے ایسے امر میں کسی حدیث مرفوع کا ہونا ضروری نہیں بلکہ اس باب میں حدیث مرفوع کی تصریح شاذ و نادر ہی ملتی ہے ۔ عام طور پر اقوال اور آثار صحابہ ہی ہوتے ہیں جن سے اس کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے ۔

ابن مسعود[1] رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کتاب اللہ کی جو بھی آیت نازل ہوئی میں اس کے بارہ میں یہ جانتا ہوں کہ وہ آیت کسی شخص کے حق میں نازل ہوئی کہاں نازل ہوئی، اور کب نازل ہوئی ۔ ایوب بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عکرمہ سے کسی آیت کے متعلق دریافت کیا کہ کہاں نازل ہوئی ۔ فرمانے لگے جبل سلع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ اس پہاڑ کی گھاٹی میں نازل ہوئی ہے[2] ۔

شیخ سیوطیؒ فرماتے ہیں ابن سعد نے "طبقات" بروایت واقدی حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بیان کیا کہ :

قال سألت ابیّ بن کعبؓ عمّا نزل القرآن بالمدینة فقال نزل بها سبع وعشرون سورة وسائرها بمکة ۔	فرمایا میں نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ قرآن کریم کا کونسا حصہ مدینہ منورہ میں نازل ہوا؟ فرمایا ستائیس سورتیں مدینہ منورہ میں نازل

---

[1] صحیح بخاری کتاب التفسیر باب فضائل القرآن - ابواب المناقب ۔

[2] الاتقان للشیخ سیوطیؒ ج ۱ ۔

ہوئی ہیں باقی تمام قرآن کریم مکہ مکرمہ
میں نازل ہوا۔

ائمہ مفسرین کی ایک جماعت نے سورۃ فاتحہ کو اس سورتوں میں شمار کیا ہے جن کے
مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ گزشتہ اوراق میں یہ بات قارئین کی نظر
سے گزر چکی کہ بعض مرسل روایتوں میں یہ تصریح ہے کہ جس مجلس میں یعنی آغاز سلسلۂ وحی
پہ اقرء باسم ربک الذی خلق نازل ہوئی اسی مجلس میں سورۂ فاتحہ بھی نازل ہوئی
اس رائے کی تائید آیت وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ
سے ہوتی ہے کیونکہ جمہور مفسرین کے نزدیک سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي سے مراد سورۂ فاتحہ
ہے اور یہ سورۂ حجر کی آیت ہے جو مکہ مکرمہ میں نازل ہونے والی سورت ہے تو مکی
سورت میں صیغۂ ماضی کے عنوان سے سورۂ فاتحہ کے عطا کیے جانے کا انعام بیان
فرمانا اس کا قرینہ ہے کہ سورۂ فاتحہ مکی زندگی میں سورۂ حجر سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔
حضرت علی بن ابی طالب کی ایک روایت ہے فرمایا:

نَزَلَتْ فَاتِحَةُ بِمَكَّةَ مِنْ كَنْزٍ تَحْتَ الْعَرْشِ[1]	سورہ فاتحہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ایک ایسے خزانہ سے جو عرش الٰہی کے نیچے ہے۔

اس کے بالمقابل مجاہد سے یہ نقل کیا گیا کہ وہ سورۂ فاتحہ کے مدنیہ ہونے کے
قائل ہیں اور بعض حضرات نے تکرار نزول کا قول اختیار کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ
سورۂ فاتحہ ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی اور پھر دوبارہ اس لحاظ سے کہ یہ
ام الکتاب ہے اور شرف و فضیلت میں بلند پایہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ مدینہ منورہ میں
بھی نازل کی گئی۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ نصف حصہ سورۃ فاتحہ کا مدینہ منورہ میں

---

[1] الاتقان للسیوطی ج ۱ ۔ [2] علامہ سید محمود آلوسی (صاحب روح المعانی) اس
قول کی تردید کرتے ہیں اور فرمایا کہ جمہور صحابہ مکی ہونے ہی کے قائل ہیں اور ابن عباسؓ کا بھی
یہی مسلک ہے۔ (روح المعانی صد ۳۱ ج ۱)

نازل ہوا اور وہ نصف آخر ہے لیکن اس قول کی صحت کی کوئی دلیل اور سند نہیں۔
الحاصل مکی سورتوں کی کل تعداد ۸۷ ہے۔ اور مدنی سورتوں کی کل تعداد ۲۷ ہے
اس طرح مجموعی تعداد قرآن کریم کی سورتوں کی ۱۱۴ ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعود
عبداللہ بن عباسؓ۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علی بن ابی طالبؓ سے یہی منقول
ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کی سورتوں کی مجموعی تعداد ایک سو چودہ بیان فرمائی ہے

سورتوں کی ترتیب نزولی

ابن الضریس نے فضائل قرآن میں عبداللہ بن عباسؓ سے روایت تخریج کی ہے جس میں انہوں نے سورتوں کی نزول کے اعتبار سے ترتیب حسب ذیل بیان کی:

اقرا باسم ربك[1] - ن[2] - یاایها المزمل[3] - یاایها المدثر[4] -
تبت ید ابی لهب[5] - اذا الشمس کورت[6] - سبح اسم ربك[7] -
واللیل اذا یغشی[8] - والفجر[9] - والضحی[10] - الم نشرح[11] - والعصر[12] -
والعدیات[13] - انا اعطینك[14] - الهكم التكاثر[15] - ارءیت[16] - قل
یاایها الكفرون[17] - الم تر كیف فعل[18] - قل اعوذ برب الفلق[19] -
قل اعوذ برب الناس[20] - قل هو الله احد[21] - والنجم[22] - عبس[23] -
انا انزلنا[24] - والشمس وضحها[25] - والسماء ذات البروج[26] - والتین[27] -
لایلف قریش[28] - القارعه[29] - لا اقسم بیوم القیمة[30] - ویل لكل
همزة[31] - والمرسلات[32] - ق[33] - لا اقسم بهذا البلد[34] - والسماء و
الطارق[35] - اقتربت الساعة[36] - ص[37] - الاعراف[38] - قل اوحی[39] -
یس[40] - والفرقان[41] - سورة الملائكة[42] - كهیعص[43] - طه[44] - الواقعه[45]
الشعراء[46] - طس[47] - سلیمان (النمل)[48] - طسم[49] - القصص[50] - بنی اسرائیل[51]
یونس[52] - هود[53] - یوسف[54] - الحجر[55] - الانعام[56] - الصافات -

لقمان[58] ۔ سبا[59] ۔ الزمر ۔ حٰمٓ المؤمن[61] ۔ حٰمٓ السجدۃ[62] ۔ حٰمٓ عسق[63]
حٰمٓ الزخرف[64] ۔ الدخان[65] ۔ الجاثیہ[66] ۔ الذاریات[67] ۔ الغاشیہ[68]
الکہف ۔ النحل[69] ۔ انا ارسلنا نوحا ۔ سورۃ ابراہیم[72] ۔ الانبیا[73] ۔
المؤمنون ۔ الٓمٓ تنزیل السجدۃ[75] ۔ والطور ۔ تبارک الذی بیدہ
الملک ۔ الحاقۃ ۔ سأل سائل[79] ۔ عم یتساءلون[80] ۔ والنازعات[81]
اذا السماء انفطرت[82] ۔ اذا السماء انشقت[83] ۔ الروم[84] ۔ العنکبوت[85] ۔
ویل للمطففین[86] ۔[1]

یہ کل ۸۶ سورتیں ہوئیں اور جمہور کے قول کے مطابق سورۃ فاتحہ بھی مکیہ ہے تو اس کو ملا کر کل ۸۷ کا عدد ہو گیا ۔

مدنی سورتوں کی ترتیب نزولی امام ابوعبید و دیگر ائمہ نے اس طرح بیان کی
سورۃ البقرہ[1] ۔ الانفال ۔ آل عمران ۔ الاحزاب[4] ۔ ممتحنہ ۔ النساء[6]
اذا زلزلت ۔ حدید ۔ القتال ۔ الرعد ۔ الرحمٰن ۔ الانسان[12] ۔
الطلاق[13] ۔ لم یکن[14] ۔ الحشر[15] ۔ اذا جاء نصر اللہ[16] ۔ الحج[17] ۔ المنافقون[18]
المجادلہ[19] ۔ الحجرات ۔ التحریم[21] ۔ الجمعۃ[22] ۔ التغابن[23] ۔ الصف[24] ۔
الفتح[25] ۔ المائدۃ[26] ۔ براءۃ[28] ۔

سورتوں کے مکی اور مدنی ہونے کی حیثیت سے یہ ترتیب نزولی ابن الفریس نے بہ روایت عبداللہ ابن عباس بیان کی ہے ۔ عکرمہ نے اقرء باسم ربک الذی کے بعد بجائے سورۃ نٓ کے سورہ مزمل کو بیان کیا ہے ۔

ان دونوں روایتوں میں سورۃ مدثر کا نزول بعد سورۃ مزمل کے بیان کیا گیا ہے لیکن روایات سے یہ ثابت ہے کہ اقرء باسم ربک کے بعد سب سے پہلے نازل ہونے والی سورۃ مدثر ہے اور یہ صحیحین کی روایات سے ثابت ہے اس لیے اسی کو راجح سمجھا جا سکتا ہے ۔

---

[1] کذا فی الاتقان ۔ ج ۱ ۔

وہ مکی اور مدنی سورتیں جن میں چند آیات مستثنیٰ ہیں

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں قرآن کریم میں متعدد ایسی سورتیں ہیں، جو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں اور مکیہ ہونے کے باوجود ان میں چند آیات مدنیہ ہیں گویا ان چند آیات کے نزول کو حق تعالیٰ نے موخر فرما دیا، حتیٰ کہ جب آپ ہجرت فرماکر مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو مدنی زندگی میں ان چند آیات کو نازل کر کے ان سورتوں کی تکمیل کر دی گئی۔ علیٰ ہذا القیاس یہ بھی ہوا کہ چند آیات مکہ میں نازل کر کے ان سورتوں کے باقی تمام حصہ کو موخر کر دیا گیا۔ اور بعد الہجرت مدینہ منورہ میں ان سورتوں کو نازل کیا گیا۔

حافظ ابن حجر نے بیان کیا کہ ائمہ مفسرین نے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ مکی سورتوں کے درمیان مدنی آیات کو متعین کریں لیکن مدنی سورتوں میں آیات مکیہ کی تحقیق و تفتیش کی طرف توجہ بہت کم کی گئی[1]

شیخ سیوطیؒ نے ابن الحصارؒ کی تحقیق کی بنا کرتے ہوئے آیات کے استثناء کی دونوں نوعیتوں پر کلام فرمایا اور مکی و مدنی سورتوں میں مستثنیٰ آیات کو تفصیل سے واضح کیا۔ مثلاً:

(۱) سورۃ البقرۃ مدنیہ ہے لیکن یہ دو آیتیں فاعفوا واصفحوا حتّٰی یاتی اللہ بامرہ اور لیس علیک ھداھم مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں۔

(۲) سورۃ انعام مکیہ ہے۔ مشہور یہی ہے یہ سورت تمام کی تمام ایک ہی دفعہ نازل ہوئی۔ لیکن ابن عباسؓ کی ایک روایت سے ثابت ہے کہ قل تعالوا اتل ما حرم ربکم

---

[1] الاتقان ج ۱ ۔ [2] الاتقان ۔ ج ۱ ۔ یہ سب تفصیل الاتقان میں شیخ سیوطیؒ نے بیان فرمائی ہے۔

سے تین آیتیں مدنیہ ہیں۔ بعض دوسری روایات سے چند اور آیات کا استثنا معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ سورۃ الاعراف مکیہ ہے۔ لیکن آیت واسئلهم عن القریة التی کانت حاضرة البحر مدنیہ ہے۔

۴۔ سورۃ الانفال مدنیہ ہے۔ لیکن واذ یمکر بك الذین کفروا مکۂ مکرمہ میں بوقت ہجرت نازل ہوئی۔ مگر ابن عباس کی صحیح روایت سے معلوم ہوتا ہے یہ پوری سورت مدینہ منورہ میں ہی نازل ہوئی۔

۵۔ سورۃ برآۃ مدنیہ ہے لیکن لقد جاءکم رسول سے ختم سورت تک دونوں آیتیں مکیہ ہیں۔

۶۔ سورۃ یونس مکیہ ہے۔ لیکن فان کنت فی شك سے دو آیتیں اور آیت ومنهم من یومن به و منهم من لا یومن به مدنیہ ہیں۔

۷۔ سورۃ هود مکیہ ہے۔ بجز ان تین آیات کے فلعلك تارك بعض ما یوحیٰ الیك افمن کان علیٰ بینة من ربه واقم الصلوٰة طرفی النهار۔

۸۔ سورۃ یوسف مکیہ ہے۔ بجز اوّل کی تین آیات کے۔ لیکن یہ روایت قابلِ اعتماد نہیں ہے۔

۹۔ سورۃ الرعد مدنیہ ہے۔ بجز آیت ولا یزال الذین کفروا کے۔

۱۰۔ سورۃ ابراهیم مکیہ ہے۔ لیکن یہ دو آیتیں الم تر الی الذین بدلوا نعمة الله مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں۔

۱۱۔ سورۃ الحجر مکیہ ہے بجز آیت ولقد آتینٰك سبعاً من المثانی کیونکہ یہ مدنیہ ہے۔

۱۲ ۔ سورۃ نحل مکیہ ہے ۔ لیکن آخری تین آیتیں مدنیہ ہیں ۔

۱۳ ۔ سورۃ اسرا یعنی سورۃ بنی اسرائیل مکیہ ہے ۔ لیکن وان کادوا لیستفزونک و ولیسئلونک عن الروح اور قل لئن اجتمعت الانس والجن آیات مدنیہ ہیں

۱۴ ۔ سورۃ کہف مکیہ ہے ۔ لیکن اوّل کی آٹھ آیات اور آیت واصبر نفسک اور ان الذین امنوا وعملوا الصلحت مدنیہ ہیں

۱۵ ۔ سورۃ مریم مکیہ ہے ۔ بجز آیت وان منکم الا واردھا ۔

۱۶ ۔ سورۃ طٰہٰ مکیہ ہے ۔ بجز آیت فاصبر علی ما یقولون [1]

۱۷ ۔ سورۃ الانبیاء مکیہ ہے ۔ بجز آیت افلا یرون انا ناتی الارض ۔

۱۸ ۔ سورۃ الحج مدنیہ ہے ۔ لیکن آیت ولیعلم الذین اور اس کے بعد کی تین آیات مکہ اور مدینہ کے درمیان راستہ میں نازل ہوئیں ۔

۱۹ ۔ سورۃ مومنون مکیہ ہے ۔ بجز آیت حتی اذا اخذنا مترفیھم کے

---

[1] بزار اور ابو یعلیٰ نے ابو رافعؓ سے روایت تخریج کی ہے بیان کیا کہ ایک دفعہ کوئی مہمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں آیا اور اس وقت آپ کے یہاں کوئی چیز کھلانے کے لیے نہ تھی تو ایک یہودی تاجر کے پاس سے آپؐ نے کچھ آٹا خریدنے کے لیے کسی کو بھیجا کہ اس کی قیمت پھر کسی وقت بھیج دی جائے گی ۔ اس یہودی نے انکار کیا اور کہا کہ جب تک کوئی چیز رہن نہ رکھی جائے میں آٹا نہ دوں گا ۔ آنحضرتؐ کو یہودی کی یہ بات معلوم ہوئی تو آپؐ نے فرمایا خدا کی قسم اس یہودی کو خوب معلوم ہے کہ میں آسمان میں امین ہوں اور زمین پر سب سے زیادہ امین ہوں ۔ اسی اثنا میں یہ آیتیں نازل ہوئیں لا تمدن عینیک

۲۰ ۔ سُورۃ الفرقان مکیہ ہے ۔ بجز آیت والذین لا یدعون مع اللہ اور اس کے بعد کی دو آیتیں مدنیہ ہیں ۔

۲۱ ۔ سُورۃ الشعراء مکیہ ہے ۔ لیکن والشعراء یتبعھم الغاوون سے ختم سورۃ تک آیات مدنیہ ہیں ۔

۲۲ ۔ سُورۃ القصص مکیہ ہے ۔ لیکن آیت الذین اتیناھم الکتاب اور اس کے بعد کی دو آیتیں مدنیہ ہیں ۔

۲۳ ۔ سُورۃ عنکبوت مکیہ ہے ۔ لیکن آیت ولقد فتنا الذین اور اس کے بعد کی نو آیات مدنیہ ہیں ۔

۲۴ ۔ سُورۃ الروم مکیہ ہے ۔ بجز آیت فسبحان اللہ الخ ۔

۲۵ ۔ سُورۃ لقمان مکیہ ہے ۔ لیکن ولو ان ما فی الارض سے تین آیات مدنیہ ہیں ۔

۲۶ ۔ سُورۃ السجدہ مکیہ ہے ، بجز افمن کان مؤمنًا سے تیسری آیت تک کہ یہ مدنیہ ہیں ۔

۲۷ ۔ سُورۃ سباء مکیہ ہے ۔ بجز آیت ویری الذین اوتوا العلم کے

۲۸ ۔ سُورہ یٰسٓ مکیہ ہے ۔ بجز آیت انا نحن نحیی الموتیٰ الخ

۲۹ ۔ سُورۃ الزمر مکیہ ہے ۔ بجز آیات قل یا عبادی الذین اسرفوا وانیبوا الی ربکم اور واتبعوا احسن ما انزل الیکم من ربکم کے یہ مدنیہ ہیں

۳۰ ۔ سُورۃ غافر مکیہ ہے ۔ لیکن ان الذین یجادلون سے لا یعلمون تک آیات مدنیہ ہیں ۔

۳۱ ۔ سُورۃ الشوریٰ مکیہ ہے ۔ بجز آیت ام یقولون افتریٰ ۔

۳۲ ۔ سُورۃ الزخرف مکیہ ہے ۔ بجز آیت واسأل من ارسلنا ۔

۳۳ ۔ سورۃ الجاثیہ مکیہ ہے ۔ بجز آیت قل للذین آمنوا الخ

۳۴ ۔ سورۃ الاحقاف مکیہ ہے ۔ لیکن آیت قل آرأیتم مدنیہ ہے جو عبداللہ بن سلام کے واقعہ میں نازل ہوئی اور بعض ائمہ کے نزدیک آیات ووصینا الانسان بھی مدنیہ ہیں ۔

۳۵ ۔ سورۃ قٓ مکیہ ہے ۔ بجز آیت ولقد خلقنا السمٰوات والارض

۳۶ ۔ سورۃ النجم مکیہ ہے ۔ بجز آیت اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کبائر الاثم

۳۷ ۔ سورۃ القمر مکیہ ہے ۔ بجز آیت سیھزم الجمع و یولون الدبر

۳۸ سورۃ الرحمٰن مدنیہ ہے ۔ بجز آیت یسئلہ من فی السمٰوات والارض

۳۹ سورۃ الواقعہ مکیہ ہے ۔ بجز آیت ثلۃ من الاولین و ثلۃ من الاخرین اور آیت فلا اقسم بمواقع النجوم ۔ یہ آیت مقام حدیبیہ میں بعد الہجرت نازل ہوئی ۔

۴۰ ۔ سورۃ الحدید مدنیہ ہے ۔ بعض اقوال کے مطابق اس سورت کی چند آیات مکیہ ہیں ۔

۴۱ ۔ سورۃ المجادلۃ مدنیہ ہے ۔ بجز آیت ما یکون من نجوی ثلثۃ کہ یہ مکہ میں نازل ہوئی ۔

۴۲ ۔ سورۃ التغابن مدنیہ ہے ۔ بعض اقوال میں اس کے آخری حصہ کو مکیہ کہا گیا

۴۳ ۔ سورۃ النون مکیہ ہے ۔ لیکن آیات انا بلوناھم اور فاصبر لحکم ربک مدنیہ ہیں ۔

۴۴ ۔ سورۃ مزمل مکیہ ہے ۔ بجز آیت واصبر علی ما یقولون ۔

۴۵ ۔ سورۃ والمرسلات مکیہ ہے ۔ بجز آیت واذا قیل لھم ارکعوا ۔

۴۶ ۔ سورۃ ویل للمطففین مکیہ ہے لیکن بیان کیا گیا کہ اول کی چھ آیات مدنیہ ہیں مگر یہ قول ضعیف ہے ۔

۴۷ - سورۃ ارآیت مکیہ ہے۔ اوّل کی تین آیات مکیہ ہیں اور باقی آیات مدینہ میں نازل ہوئیں۔

شیخ سیوطی اور علامہ صالح احمد الجزائری و دیگر ائمہ مفسرین کی تحقیق کی بنا پر مکی اور مدنی سورتوں میں جو مستثنیٰ آیات ہیں - ان کو قدیم مصری مصاحف قرآنیہ سے مراجعت کے بعد نقل کیا گیا۔ بعض بعض مواقع پر جزوی اختلاف اور فرق بعض کتب تفسیر میں پایا جاتا ہے۔ وہ بعض روایات کے مضامین کے تفاوت پر مبنی ہے۔

قرآن کریم کی سورتیں بلحاظ ترتیب تلاوت اور ترتیب نزولی مع تعداد آیات

اسماء سورة	مکیہ یا مدنیہ	تعداد آیات	ترتیب نزول
۱۔ سورۃ الفاتحہ	مکیہ	۷	نزول بعد سورۃ مدثر
۲۔ سورۃ بقرہ	مدنیہ	۲۸۶	مقام منیٰ میں حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی۔
۳۔ سورۃ آل عمران	مدنیہ	۲۰۰	بعد سورۃ انفال نازل ہوئی۔
۴۔ سورۃ النساء	مدنیہ	۱۷۶	بعد سورۃ ممتحنہ نازل ہوئی
۵۔ سورۃ مائدہ	مدنیہ	۱۲۰	بعد سورۃ فتح کے نازل ہوئی۔ آیت حرمت علیکم المیتۃ مقام عرفات میں نازل ہوئی۔
۶۔ سورۃ الانعام	مکیہ	۱۶۵	بعد سورۃ حجر نازل ہوئی۔
۷۔ سورۃ الاعراف	مکیہ	۲۰۶	بعد سورۃ صٓ نازل ہوئی
۸۔ سورۃ الانفال	مدنیہ	۷۵	بعد سورۃ بقرہ نازل ہوئی۔
۹۔ سورۃ التوبہ	مدنیہ	۱۲۹	بعد سورۃ مائدہ نازل ہوئی۔
۱۰۔ سورۃ یونس	مکیہ	۱۰۹	بعد سورۃ اسراء نازل ہوئی۔
۱۱۔ سورۃ ہود	مکیہ	۱۲۳	بعد سورۃ یونس نازل ہوئی۔

اسماء سورۃ	مکیہ یا مدنیہ	تعداد آیات	ترتیب نزول
۱۲۔ سورۃ یوسف	مکیہ	۱۱۱	بعد سورۃ ہود نازل ہوئی۔
۱۳۔ سورۃ الرعد	مدنیہ	۴۳	بعد سورۃ محمد نازل ہوئی۔
۱۴۔ سورۃ ابراہیم	مکیہ	۵۲	بعد سورۃ نوح نازل ہوئی۔
۱۵۔ سورۃ الحجر	مکیہ	۹۹	بعد سورۃ یوسف نازل ہوئی
۱۶۔ سورۃ النحل	مکیہ	۱۲۸	بعد سورۃ کہف نازل ہوئی
۱۷۔ سورۃ اسراء	مکیہ	۱۱۱	بعد سورۃ قصص نازل ہوئی
۱۸۔ سورۃ الکہف	مکیہ	۱۱۰	بعد سورۃ غاشیہ نازل ہوئی
۱۹۔ سورۃ مریم	مکیہ	۹۸	بعد سورۃ فاطر نازل ہوئی۔
۲۰۔ سورۃ طٰہٰ	مکیہ	۱۳۵	بعد سورۃ مریم نازل ہوئی
۲۱۔ سورۃ الانبیاء	مکیہ	۱۱۲	بعد سورۃ ابراہیم نازل ہوئی
۲۲۔ سورۃ الحج	مدنیہ	۷۸	بعد سورۃ نور نازل ہوئی۔
۲۳۔ سورۃ مؤمنون	مکیہ	۱۱۸	بعد سورۃ انبیاء نازل ہوئی۔
۲۴۔ سورۃ نور	مدنیہ	۶۴	بعد سورۃ حشر نازل ہوئی۔
۲۵۔ سورۃ فرقان	مکیہ	۷۷	بعد سورۃ یٰس نازل ہوئی
۲۶۔ سورۃ الشعراء	مکیہ	۲۲۷	بعد سورۃ واقعہ نازل ہوئی
۲۷۔ سورۃ النمل	مکیہ	۹۳	بعد سورۃ الشعراء نازل ہوئی
۲۸۔ سورۃ القصص	مکیہ	۸۸	بعد سورۃ نمل نازل ہوئی۔
۲۹۔ سورۃ عنکبوت	مکیہ	۶۹	بعد سورۃ الروم نازل ہوئی۔
۳۰۔ سورۃ الروم	مکیہ	۶۰	بعد سورۃ انشقاق نازل ہوئی
۳۱۔ سورۃ لقمان	مکیہ	۳۴	بعد سورۃ صافات نازل ہوئی
۳۲۔ سورۃ السجدہ	مکیہ	۳۰	بعد سورۃ المؤمنون نازل ہوئی۔
۳۳۔ سورۃ احزاب	مدنیہ	۷۳	بعد آل عمران نازل ہوئی۔

اسماء سورۃ	مکیہ یا مدنیہ	تعداد آیات	ترتیب نزول
۳۴ ۔ سورۃ سباء	مکیہ	۵۴	بعد سورۃ لقمان نازل ہوئی
۳۵ ۔ سورۃ فاطر	مکیہ	۴۵	بعد سورۃ فرقان نازل ہوئی
۳۶ ۔ سورۃ یٰس	مکیہ	۸۳	بعد سورۃ جن نازل ہوئی ۔
۳۷ ۔ سورۃ صافات	مکیہ	۱۸۲	بعد سورۃ الانعام نازل ہوئی
۳۸ ۔ سورۃ صٓ	مکیہ	۸۸	بعد سورۃ قمر نازل ہوئی ۔
۳۹ ۔ سورۃ زمر	مکیہ	۷۵	بعد سورۃ سباء نازل ہوئی
۴۰ ۔ سورۃ غافر	مکیہ	۸۰	بعد زمر نازل ہوئی ۔
۴۱ ۔ سورۃ فصلت حٰم سجدہ	مکیہ	۵۴	بعد غافر نازل ہوئی ۔
۴۲ ۔ سورۃ شوریٰ	مکیہ	۵۳	بعد فصلت نازل ہوئی ۔
۴۳ ۔ سورۃ زخرف	مکیہ	۸۹	بعد سورۃ شوریٰ نازل ہوئی ۔
۴۴ ۔ سورۃ دخان	مکیہ	۵۹	بعد سورۃ زخرف نازل ہوئی
۴۵ ۔ سورۃ جاثیہ	مکیہ	۳۷	بعد سورۃ دخان نازل ہوئی
۴۶ ۔ احقاف	مکیہ	۳۵	بعد سورۃ جاثیہ نازل ہوئی ۔
۴۷ ۔ سورۃ محمدؐ	مدنیہ	۳۸	بعد سورۃ حدید نازل ہوئی ۔
۴۸ ۔ سورۃ الفتح	مدنیہ	۲۹	بعد سورۃ جمعہ نازل ہوئی ۔
۴۹ ۔ سورۃ حجرات	مدنیہ	۱۸	بعد سورۃ مجادلہ نازل ہوئی
۵۰ ۔ سورۃ قٓ	مکیہ	۴۵	بعد سورۃ والمرسلات نازل ہوئی
۵۱ ۔ سورۃ ذاریات	مکیہ	۶۰	بعد سورۃ احقاف نازل ہوئی
۵۲ ۔ سورۃ طور	مکیہ	۴۹	بعد سورۃ سجدہ نازل ہوئی
۵۳ ۔ سورۃ نجم	مکیہ	۶۲	بعد سورۃ اخلاص نازل ہوئی
۵۴ ۔ سورۃ القمر	مکیہ	۵۵	بعد سورۃ الطارق نازل ہوئی ۔

اسماء سورۃ	مکیہ یا مدنیہ	تعداد آیات	ترتیب نزول
۵۵۔ سورۃ الرحمٰن	مدنیہ	۷۸	بعد سورۃ رعد نازل ہوئی۔
۵۶۔ سورۃ الواقعہ	مکیہ	۹۶	بعد سورۃ طٰہٰ نازل ہوئی۔
۵۷۔ سورۃ الحدید	مدنیہ	۲۹	بعد سورۃ زلزلت نازل ہوئی۔
۵۸۔ سورۃ المجادلہ	مدنیہ	۲۲	بعد سورۃ المنافقون نازل ہوئی
۵۹۔ سورۃ الحشر	مدنیہ	۲۴	بعد سورۃ بینہ نازل ہوئی
۶۰۔ سورۃ الممتحنہ	مدنیہ	۱۳	بعد سورۃ الاحزاب نازل ہوئی
۶۱۔ سورۃ الصف	مدنیہ	۱۴	بعد سورۃ التغابن نازل ہوئی۔
۶۲۔ سورۃ الجمعہ	مدنیہ	۱۱	بعد سورۃ الصف نازل ہوئی۔
۶۳۔ سورۃ منافقون	مدنیہ	۱۱	بعد سورۃ الحج نازل ہوئی۔
۶۴۔ سورۃ التغابن	مدنیہ	۱۸	بعد سورۃ التحریم نازل ہوئی۔
۶۵۔ سورۃ الطلاق	مدنیہ	۱۲۔	بعد سورۃ دہر نازل ہوئی۔
۶۶۔ سورۃ التحریم	مدنیہ	۱۲	بعد سورۃ حجرات نازل ہوئی
۶۷۔ سورۃ الملک	مکیہ	۳۰	بعد سورۃ الطور نازل ہوئی
۶۸۔ سورۃ نٓ والقلم	مکیہ	۵۲	بعد سورۃ علق نازل ہوئی۔
۶۹۔ سورۃ الحاقہ	مکیہ	۵۲	بعد سورۃ ملک نازل ہوئی۔
۷۰۔ سورۃ معارج	مکیہ	۴۴	بعد سورۃ الحاقہ نازل ہوئی
۷۱۔ سورۃ نوح	مکیہ	۲۸	بعد سورۃ النحل نازل ہوئی
۷۲۔ سورۃ الجن	مکیہ	۲۸	بعد سورۃ اعراف نازل ہوئی
۷۳۔ سورۃ مزمل	مکیہ	۲۰	بعد سورۃ قلم نازل ہوئی
۷۴۔ سورۃ مدثر	مکیہ	۵۶	بعد سورۃ مزمل نازل ہوئی
۷۵۔ سورۃ قیامہ	مکیہ	۴۰	بعد سورۃ القارعہ نازل ہوئی
۷۶۔ سورۃ الانسان	مدنیہ	۳۱	بعد سورۃ رحمٰن نازل ہوئی

اسماء سورۃ	مکیہ یا مدنیہ	تعداد آیات	ترتیب نزول
۷۷۔ سورۃ مرسلات	مکیہ	۵۰	بعد سورۃ الہمزہ نازل ہوئی
۷۸۔ سورۃ النباء	مکیہ	۴۰	بعد سورۃ المعارج نازل ہوئی
۷۹۔ سورۃ النازعات	مکیہ	۴۶	بعد سورۃ النباء نازل ہوئی
۸۰۔ سورۃ عبس	مکیہ	۴۲	بعد سورۃ النجم نازل ہوئی
۸۱۔ سورۃ التکویر	مکیہ	۲۹	بعد سورۃ المسد نازل ہوئی
۸۲۔ سورۃ الانفطار	مکیہ	۱۹	بعد سورۃ والنازعات نازل ہوئی
۸۳۔ سورۃ المطففین	مکیہ	۳۶	بعد سورۃ عنکبوت نازل ہوئی
۸۴۔ سورۃ الانشقاق	مکیہ	۲۵	بعد سورۃ الانفطار نازل ہوئی
۸۵۔ سورۃ بروج	مکیہ	۲۲	بعد سورۃ والشمس نازل ہوئی
۸۶۔ سورۃ الطارق	مکیہ	۱۷	بعد سورۃ البلد نازل ہوئی
۸۷۔ سورۃ الاعلیٰ	مکیہ	۱۹	بعد سورۃ التکویر نازل ہوئی
۸۸۔ سورۃ غاشیہ	مکیہ	۲۶	بعد سورۃ الذاریات نازل ہوئی
۸۹۔ سورۃ الفجر	مکیہ	۳۰	بعد سورۃ واللیل نازل ہوئی
۹۰۔ سورۃ البلد	مکیہ	۲۰	بعد سورۃ ق نازل ہوئی
۹۱۔ سورۃ الشمس	مکیہ	۱۵	بعد سورۃ القدر نازل ہوئی
۹۲۔ سورۃ واللیل	مکیہ	۲۱	بعد سورۃ الاعلیٰ نازل ہوئی
۹۳۔ سورۃ والضحیٰ	مکیہ	۱۱	بعد سورۃ الفجر نازل ہوئی
۹۴۔ سورۃ الشرح یعنی الم نشرح	مکیہ	۸	بعد سورۃ والضحیٰ نازل ہوئی
۹۵ سورۃ والتین	مکیہ	۸	بعد سورۃ البروج نازل ہوئی
۹۶ سورۃ العلق	مکیہ	۱۹	قرآن میں سب سے اوّل نازل ہونے والی سورت۔

اسماء سورة	مکیہ یا مدنیہ	تعداد آیات	ترتیب نزول
۹۷۔ سورة القدر	مکیہ	۵	بعد سورة عبس نازل ہوئی۔
۹۸۔ سورة البیّنہ	مدنیہ	۸	بعد سورة الطارق نازل ہوئی
۹۹۔ سورة زلزلة	مدنیہ	۸	بعد سورة النساء نازل ہوئی۔
۱۰۰۔ سورة العادیات	مکیہ	۱۱	بعد سورة والعصر نازل ہوئی۔
۱۰۱۔ سورة القارعہ	مکیہ	۱۱	بعد سورة القریش نازل ہوئی۔
۱۰۲۔ سورة التکاثر	مکیہ	۸	بعد سورة الکوثر نازل ہوئی۔
۱۰۳۔ سورة العصر	مکیہ	۳	بعد سورة الم نشرح نازل ہوئی۔
۱۰۴۔ سورة الہمزہ	مکیہ	۹	بعد سورة القیمتہ نازل ہوئی
۱۰۵۔ سورة الفیل	مکیہ	۵	بعد سورة الکافرون نازل ہوئی
۱۰۶۔ القریش	مکیہ	۴	بعد سورة والتین نازل ہوئی۔
۱۰۷۔ سورة ماعون	نصف مکیہ و نصف مدنیہ	۷	بعد سورة التکاثر نازل ہوئی۔
۱۰۸۔ سورة کوثر	مکیہ	۳	بعد سورة العادیات نازل ہوئی۔
۱۰۹۔ سورة الکافرون	مکیہ	۶	بعد سورة الماعون نازل ہوئی۔
۱۱۰۔ سورة النصر	مدنیہ	۳	بعد سورة توبہ نازل ہوئی۔ حجۃ الوداع میں مقام منیٰ میں نازل ہوئی اور سورتوں میں یہ سب سے آخر نازل ہونے والی سورت ہے۔
۱۱۱۔ سورة مسد یعنی تبت	مکیہ	۵	سورة فاتحہ کے بعد نازل ہوئی۔
۱۱۲۔ سورة اخلاص	مکیہ	۴	سورة ناس کے بعد نازل ہوئی۔
۱۱۳۔ سورة الفلق	مکیہ	۵	سورة فیل کے بعد نازل ہوئی۔

اسماء سورۃ	مکیہ یا مدنیہ	تعداد آیات	ترتیب نزول
۱۱۴۔ سورۃ الناس	مکیہ	۶	سورۃ فلق کے بعد نازل ہوئی

جیسا کہ بیان کیا گیا قرآن کریم نازل ہونے سے قبل لوح محفوظ میں تھا وہاں سے آسمانِ دُنیا پر اُتارا گیا۔ پھر وہاں سے حسب ضرورت بتدریج آیات، قرآنیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی رہیں۔ تو یہ آیات مختلف سورتوں اور قرآن کریم کے حصوں کی آپ پر اُترتیں اور آپ بذریعہ وحی ان آیات کو اس ترتیب کے ساتھ مرتب کرتے اور صحابہؓ کو حفظ کرنے کے لیے فرمادیتے، جو کلام اللہ کی ترتیب لوح محفوظ میں تھی اور خود بھی آپ اسی ترتیب، پر مرتب آیات کی تلاوت فرماتے۔ اسی کے مطابق نمازوں میں ان سورتوں کی تلاوت ہوتی، اور اسی طرح ہر سال رمضان المبارک میں جبرئیل امین آکر آپ سے دورہ کیا کرتے۔[1]

---

[1] جمع وتدوین قرآن کی بحث ایک مستقل عنوان کے تحت آئندہ اوراق میں حضرات قارئین ملاحظہ فرمائیں گے انشاءاللہ تعالیٰ ۱۲۔

دورانِ سفر نازل ہونے والی آیات

مکی اور مدنی آیات کے بارہ میں جمہور کی رائے اور قول راجح معلوم ہو چکا کہ جو آیات اور سورتیں قبل از ہجرت نازل ہوئیں وہ مکیہ ہیں اور بعد از ہجرت نازل ہوئیں ان کو مدنیہ کہا جاتا ہے۔ قرآن کا اکثر بیشتر حصہ دوران اقامت ہی نازل ہوا، خواہ آپ کا قیام مکہ مکرمہ میں رہا ہو یا ہجرت کے بعد مدینہ منورہ۔ لیکن بعض آیات ایسی ہیں جو دورانِ سفر نازل ہوئیں۔ مفسرین اور محققین نے ان کی تحقیق کی اور روایات و احادیث سے یہ معلوم کیا کہ کون کون سی آیات کس سفر اور کس جگہ نازل ہوئیں۔ شیخ سیوطیؒ نے الاتقان میں سفری آیات کی تفصیل اور ان کی مثالیں بیان کیں ہیں، مثلاً آیت:

۱۔ وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى۔ (بقرہ) — دورانِ سفر حجۃ الوداع نازل ہوئی جب کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس بات کی تمنا کی کہ کاش ہم مقام ابراہیم کو مصلیٰ بنالیں۔

۲۔ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ۔ (بقرہ) — یہ آیات حدیبیہ[1] مقام میں نازل ہوئی۔ سفر عمرہ حدیبیہ میں۔

۳۔ آیت تیمم[2] (سورہ نساء) — یہ آیت اس سفر میں نازل ہوئی جس میں حضرت

---

[1] امام احمد بن حنبلؒ نے کعب بن عجرہ کا واقعہ نقل کیا کہ انہی کے قصہ میں یہ آیات نازل ہوئیں جن میں بیماری اور دشمن سے احصار و رکاوٹ واقع ہونے پر احرام کھول دینے اور قربانی ذبح کرنے کا حکم مقرر فرمایا گیا۔ ۱۲

[2] فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ۔ یہ سفر غزوۂ بنی المصطلق تھا جس کو مریسیع بھی کہا گیا ہے۔ ۱۲

عائشہؓ کا ہار گم ہو گیا تھا اور قافلہ کو اس کی وجہ سے رُکنا پڑا اور پانی نہ ہونے کی وجہ سے سب لوگ سخت پریشان تھے تو تیمم کا حکم نازل کیا گیا اور مقام بیداء یا مقام ذات الجیش میں یہ آیت نازل ہوئی۔

۴۔ یَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ۔ (نساء) — مسند بزار میں روایت کیا کہ یہ آیت دوران سفر نازل ہوئی۔

۵۔ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَهْلِهَا۔ (نساء) — یہ آیت خانہ کعبہ کے درمیان نازل ہوئی جب کہ فتح مکہ کے بعد آپؐ بیت اللہ میں داخل ہوئے تھے۔

۶۔ سورۂ مائدہ کی پہلی چند آیات۔ — اونٹنی پر آپؐ سفر کر رہے تھے کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان یہ آیات نازل ہوئیں۔

۷۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ۔ (مائدہ) — مقام بطن نخل میں ایک غزوہ کے دوران نازل ہوئی۔

۸۔ وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ — غزوہ ذات الرقاع میں اس جگہ نازل ہوئی جہاں آپؐ کا خیمہ نصب تھا اور لوگ پہرہ دے رہے تھے۔ یہ آیت نازل ہوتے ہی آپؐ نے خیمہ سے سر نکال کر فرمایا، اے لوگو! بس اب تم چلے جاؤ پہرہ دینے کی اب کوئی ضرورت نہیں۔

۹۔ آیت لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِیْبًا وَّ سَفَرًا قَاصِدًا۔ (توبہ) — غزوۂ تبوک میں دوران سفر نازل ہوئی۔

۱۰۔ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ — یہ آیات غزوۂ احد میں نازل ہوئیں جب کہ

۱۔ ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس مضمون کو تفصیل سے روایت کیا۔ کتب حدیث کی مراجعت فرمائی جائے

ما عوقبتم به ۔ تا ختم نحل	آپ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے شہید کیے جانے کے بعد ان کی لاش پر کھڑے ہوئے تھے۔
۱۱۔ آیت ، هٰذان خصمان اختصموا فی ربهم ۔ (الحج)	یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کہ میدان بدر میں مسلمانوں کی فوج اور کافروں کا لشکر ایک دوسرے کے مدمقابل تھا۔
۱۲۔ آیت ، ان الذی فرض علیك القرآن لرادك الی معاد (القصص)	مقام جحفہ میں نازل ہوئی جب کہ آپ مکہ مکرمہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے جارہے تھے
۱۳۔ سورۃ روم کی ابتدائی آیات ۔	غزوہ بدر میں مسلمانوں کی فتح کے ساتھ روم کا اہل فارس پر غلبہ مسلمانوں کے واسطے باعث مسرت تھا۔ تو یہ آیات اس سلسلہ میں نازل ہوئیں
۱۴۔ آیت ۔ واسئل من ارسلنا من قبلك من رسلنا اجعلنا من دون الرحمٰن الهة یعبدون (زخرف)	یہ آیت بیت المقدس میں سفر معراج کے دوران نازل ہوئی جب مسجد اقصیٰ تمام انبیاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جمع تھے۔
۱۵۔ سورۃ الفتح	حدیبیہ سے واپسی پر دوران سفر نازل ہوئی۔
۱۶۔ آیت یاایها الناس انا خلقناکم من ذکر وانثیٰ وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا۔ (الحجرات)	فتح مکہ کے بعد یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی جب کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ آنحضرت کے حکم سے خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھے کر اذان دے کر اللہ کی عظمت و برتری کا بام بیت اللہ سے سرزمین مکہ میں اعلان کریں تو بعض لوگ

لہ ابن ابی حاتم نے ضحاک سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ ۱۲۔ الاتقان۔

لہ تفصیل قصے کے لیے کتب حدیث کی مراجعت فرمائی جائے۔ ۱۲

	کہنے لگے کہ کیا یہ حبشی غلام بیت اللہ کی چھت پر سے اذان دیں گے تو حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔
۱۷۔ آیۃ۔ وتجعلون رزقکم انکم تکذبون۔ (واقعہ)	مقام حدیبیہ میں یہ آیات نازل ہوئیں، جب کہ آپ صبح کی نماز سے فارغ ہوئے اور اس رات بارش ہوئی تھی۔
۱۸۔ آیۃ۔ یاایھا النبی اذا جاءکم المؤمنات مھاجرات فامتحنوھن (ممتحنہ)	نشیب حدیبیہ میں یہ آیات نازل ہوئیں جب کہ مکہ مکرمہ سے کچھ مسلمان عورتیں کسی طرح اہل مکہ کی قید سے خلاصی حاصل کر کے آپؐ کے پاس پہنچیں اور آپؐ اس وقت صلح حدیبیہ کی تکمیل فرما چکے تھے۔
۱۹۔ سورۃ المنافقین۔	زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ غزوۂ تبوک میں رات کے وقت یہ سورت نازل ہوئی
۲۰۔ سورۃ والمرسلات۔	ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مقام منیٰ کے قریب ایک پہاڑ میں چھپے ہوئے تھے اسی کے ایک غار میں یہ سورت نازل ہوئی۔ یہ پہاڑ آج تک جبل والمرسلات کے نام سے مشہور ہے۔
۲۱۔ اذا جاء نصر اللہ والفتح	یہ سورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سفر حج میں ایام تشریق کے درمیان نازل ہوئی۔ جس سے آپؐ نے سمجھ لیا کہ یہ سورت دنیا سے رحلت کی اطلاع دے رہی ہے۔

آپؐ نے ناقہ قصواء پر کجاوہ کسنے کا حکم دیا، اور اس پر سوار ہو کر وہ مشہور خطبہ دیا جو کتب احادیث و سیرت میں مذکور ہے۔

دورانِ شب نازل ہونے والی آیات

قرآن کریم کا اکثر حصہ دن کے اوقات میں نازل ہوا لیکن چند آیات رات کے حصوں میں بھی نازل ہوئیں تاکہ کلام الٰہی کے نزول کا شرف اور سعادت جیسے دن کے لمحات حاصل کرنے والے ہوئے اسی طرح رات کی ساعتیں بھی کلام اللہ کے نزول کے انوار و برکات سے منور ہوں۔ چنانچہ ائمہ مفسرین اور محدثین نے تحقیق فرما کر ایسی آیات کی نشان دہی فرمائی ہے۔ مثلاً:

آیت	تفصیل
۱۔ آیت قد نری تقلب وجهك فی السماء فلنولينك قبلة ترضها فول وجهك شطر المسجد الحرام۔ (البقرہ)	صحیح مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے یہ آیات شب میں نازل ہوئیں لیکن صحیح بخاری اور مسلم کی بعض دیگر روایات سے دن کے وقت نازل ہونا مفہوم ہوتا ہے۔
۲۔ إن فی خلق السموات والارض واختلاف الليل والنهار الى لاولى الالباب۔ (البقرہ)	یہ آیات ایک رات میں نازل ہوئیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دن صبح کی نماز کے وقت بلالؓ حاضر ہوئے تو آپؐ کو روتا ہوا پایا۔ سبب دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا، آج رات مجھ پر یہ آیات نازل ہوئیں اور فرمایا افسوس اس شخص پر جو ان کو پڑھے اور ان پر غور و فکر نہ کرے۔
۳۔ واللہ يعصمك من الناس	[illegible]ت میں نازل ہوئی جب کہ دورانِ جہاد [illegible] ایک خیمہ میں تھے۔

۴۔ سورۃ الانعام	مکہ مکرمہ میں رات کے وقت یہ سورت نازل ہوئی، اس شان کے ساتھ کہ اس کے گرد ستر ہزار فرشتوں کا ہجوم تھا، جو سبحان اللہ والحمد للہ تضرع و زاری کے ساتھ پڑھتے ہوئے آسمان سے زمین پر اترا[1] (طبرانی)
۵۔ وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ۔ (توبہ)	جس میں غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے تین صحابہؓ کی توبہ کی قبولیت کا اعلان فرمایا گیا۔ اور یہ بشارت عطا کی گئی۔ یہ آیت رات کے آخری حصہ میں نازل ہوئی اور صبح کی اذانوں پر منادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یہ بشارت لے کر کعبؓ بن مالک اور ان کے ساتھیوں کی طرف پہنچا۔
۶۔ آیۃ۔ یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ (احزاب)	اس رات میں نازل ہوئی جب کہ حضرت سودہؓ کسی کام سے باہر نکلی تھیں۔
۷۔ آیۃ واسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَا۔ (زخرف)	رات میں نازل ہوئی، جب کہ آپ شب معراج میں مسجد اقصیٰ میں تشریف فرما تھے۔
۸۔ سورۃ المنافقین۔	غزوۂ تبوک کے سفر میں کسی رات میں یہ سورت نازل ہوئی۔
۹۔ معوذتین	عقبہؓ بن عامر فرماتے ہیں کہ یہ دونوں سورتیں رات میں نازل ہوئیں اور صبح کی نماز پڑھ کر آپؐ نے ان کی فضیلت بیان فرمائی۔

[1] طبرانی نے اس کو عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کیا۔ ۱۲۔ الاتقان

صبح صادق کے بعد نازل ہونے والی آیات

۱۔ یا ایھا الذین آمنوا اذا قمتم الی الصلوٰۃ تا لعلکم تشکرون — یہ آیات صبح کے بعد نازل ہوئیں۔

۲۔ لیس لک من الامر شیئی او یتوب علیھم او یعذبھم فانھم ظالمون۔ — یہ آیت صبح کی نماز کی دوسری رکعت میں نازل ہوئی جب کہ آپؐ دوسری رکعت کے رکوع میں تھے جس کے بعد آپؐ نے قنوت نازلہ کا ذ قبیلوں کا نام لے کر دعا فرمائی بند کر دی۔

بحالت نوم اور بستر پر نازل ہونے والی آیات

۱۔ واللہ یعصمک من الناس — اس وقت نازل ہوئی جب کہ آپ رات میں اپنے خیمہ میں استراحت فرما رہے تھے

۲۔ وعلی الثلاثۃ الذین خلفوا (توبہ) — رات کے آخری حصہ میں نازل ہوئی جیسا کہ بیان کیا گیا۔

۳۔ سورۃ انا اعطینٰک الکوثر — بحالت نوم نازل ہوئی۔ انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر تھے کہ اچانک آپ پر ایک طرح کی اونگھ طاری ہوئی اور خواب جیسی کیفیت ہو گئی۔ اس کے بعد آپؐ نے جیسے نیند کے جھونکے کے بعد کوئی اپنا سر اٹھاتا ہو آپ تبسم فرماتے ہوئے اپنا سر اٹھایا اور فرمایا

مجھ پر یہ سورت نازل کی گئی اور آپؐ نے سورۃ
انا اعطینک الکوثر تلاوت فرمائی۔
علامہ رافعی اسی کے قائل ہیں کہ یہ سورت
بحالت منام ہی نازل ہوئی ہے۔

قرآن کریم کا تمام حصہ بجز ان آیات کے بیداری ہی کی حالت میں نازل ہوئی۔ یہ چند آیات لبستر استراحت یا بحالت نوم نازل ہونا قرآن کریم کی عظمت، یا وحی الٰہی کی حجیت کے منافی نہیں کیونکہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ انبیاء علیہم کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب ہی میں تو اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرتے ہوئے دیکھا تھا جس پر اسماعیل علیہ السلام نے یہ عنوان اختیار فرمایا یا ابت افعل ما تؤمر کہ" اے محترم باپ کر گذریئے وہ چیز جس کا آپ کو حکم کیا جا رہا ہے تو جب خواب حجت اور وحی کا درجہ ہے تو لامحالہ بحالت خواب نازل ہونے والی آیت بھی وحی الٰہی ہی کے درجہ میں ہوگی اور اس کی حجیت و عظمت میں کوئی تردد نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر جب کہ یہ بھی ثابت ہو چکا کہ آپؐ نے اپنی معجزانہ خصوصیات میں یہ ارشاد فرمایا تنام عینای ولا ینام قلبی کہ میری دونوں آنکھیں سوتی ہیں لیکن میرا قلب بیدار رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نوم ناقض وضو نہ تھا، تو ان وجوہ کے پیش نظر کسی ایسی آیت پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا جو بحالت خواب آپؐ پر نازل ہوئی۔

آسمان وزمین کے درمیان فضا میں اور ملاءِ اعلیٰ پر نازل ہونے والی آیات

قرآن کریم کی تمام آیات تقریباً ایسی ہی ہیں ان کو جبریلؑ آسمان دُنیا سے لے کر زمین پر نازل ہوئے۔ اور اسی وجہ سے قرآن کریم کی وحی کا عنوان وانزلنا الیک الذکر اور تنزیل الکتاب من اللہ العزیز الحکیم ہی اختیار فرمایا گیا جس کے معنی اُوپر سے کسی چیز کا نیچے اتارنا ہے۔ لیکن بعض آیات ایسی بھی ہیں کہ جو زمین سے اُوپر فضا میں آسمان وزمین کے درمیان اُتاری گئیں۔ ابن العربی فرماتے ہیں قرآن کا کچھ حصّہ زمین پر نازل ہونے والا ہے اور کچھ آسمان پر۔ اور کچھ حصّہ وہ ہے جو آسمان وزمین کے درمیان اُترا اور کچھ وہ ہے جو زمین کے نیچے کسی غار میں نازل ہُوا۔

شیخ ابوبکر فہریؓ نے بروایت عبداللہ بن عباس بیان فرمایا — کل قرآن کریم مکہ مکرمہ میں نازل ہُوا یا مدینہ منورہ میں کیونکہ مکی اور مدنی عنوان ہی سے جملہ آیات قرآنیہ موسوم ہیں۔ لیکن چھ آیات ایسی ہیں جو نہ زمین میں نازل ہوئیں اور نہ آسمان میں تین آیتیں سورۂ والصافات کی

۱ وما منا الا لہ مقام معلوم وانا لنحن الصافون وانا لنحن المسبحون۔ جو آسمان وزمین کے درمیان فضا میں نازل ہوئیں۔

اور ایک آیت لیلۃ الاسراء میں، وَاسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا

لہ الاتقان فی علوم القرآن ۔ ج ۱

اور دو آیتیں سورۃ بقرہ کی آخر کی ۔ یعنی آمن الرسول سے ختم سورۃ تک۔ روایت سے ثابت ہے کہ :

آمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمؤمنون ۔ تا ختم سورۃ بقرہ	سدرۃ المنتہیٰ سے بھی زائد بلندیوں پر پہنچنے پر یہ آیات آپ پر نازل کی گئیں جہاں کہ حق تعالیٰ کی خصوصی تجلیات کا ورود اور نزول ہو رہا تھا ۔ جس کا سورۃ والنجم میں ذکر ہے ۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے آپؐ نے فرمایا جب مجھ کو معراج کرائی گئی تو مجھے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچایا گیا اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خصوصی عطائیں دی گئیں ان میں سورۃ بقرہ کی یہ دو آخری آیتیں بھی تھیں ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے جس طرح اصل قرآن کریم ہے ۔ اسی طرح خدمت قرآن کریم بھی درحقیقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی معجزہ ہے ۔ کوئی امت دنیا میں ایسی نہیں کہ اس نے اپنے پیغمبر کی کتاب کی ایسی خدمت کی ہو جیسی امت محمدیہ علی صاحبہا الف الف تحیۃ نے کی ، کہ آیات قرآنیہ اور ان کے الفاظ کی یہاں تک تحقیق کر لی کہ کون کونسی دن میں نازل ہوئیں اور کونسی رات میں۔ کونسی سفر میں اور کونسی حضر میں اور کونسی بحالت بیداری نازل ہوئیں اور کونسی بستر استراحت پر اور کونسی زمین میں اتریں اور کونسی آسمان پر اور کونسی آسمانوں کے اوپر سدرۃ المنتہیٰ کی بلندیوں پر ۔ اور کونسی زمین کے نیچے غار اور پہاڑ کی گھاٹی میں ۔ حتیٰ کہ یہ بھی تحقیق کر لی کونسی آیات موسم گرما میں اتریں اور کونسی موسم سرما میں ۔ مثلاً : آیۃ کلالہ سورۃ نساء جو پہلے نازل ہوئی وہ موسم گرما میں نازل ہوئی اور آیۃ کلالہ ثانیہ سورۃ نساء موسم سرما میں نازل ہوئی[1] ۔

---

[1] اسی وجہ سے احادیث میں پہلی آیت کو آیۃ الصیف یعنی موسم گرما کہا گیا ، اور دوسری آیت کلالہ کو آیۃ الشتاء یعنی موسم سرما کی آیت کے عنوان سے تعبیر کیا ۔

قرآن کریم کی یہ خدمت اور اس شان کے ساتھ اس کی حفاظت قیامت تک باقی رہنے والا معجزہ ہے جب کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے پیغمبروں کی اصل کتابیں ضائع اور برباد کر ڈالی اور ان میں تحریفات کا ایک انبار داخل ہوگیا کہ اس کے بعد ان باتوں کو جو ان میں آج لکھی ہوئی ہیں اللہ کی وحی اور آسمانی کتاب منسوب کرنا بھی عقلاً ممکن نہیں رہا۔

اسی حد تک نہیں بلکہ علماء امت نے قرآن کریم کے علوم اور معارف میں سے کوئی شعبہ اور پہلو ایسا باقی نہیں چھوڑا جس پر مستقل تصانیف نہ فرمائی ہوں، حتیٰ کہ قرآنی رسم خط اور سورتوں آیات اور کلمات و حروف کی تعداد بھی منضبط کی اور اس موضوع پر کئی کتابیں لکھیں اور متقدمین و متاخرین مختلف زمانوں میں تصانیف فرماتے رہے۔

تعداد آیات وکلمات اور حروف اور حرکات و سکنات قرآن مجید

علمائے امت نے جس طرح قرآن کریم کے علوم و معارف میں سے کوئی شعبہ ایسا باقی نہیں چھوڑا کہ اس پر تصانیف نہ کی ہوں۔ اسی طرح آیات[1] وکلمات اور حروف و حرکات کی تعداد پر بھی تحقیق و بحث فرمائی اور قرآنی رسم الخط پر بھی متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ حافظ ابن کثیرؒ اور شیخ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ ابوعمر الدانی نے "البیان" اور ابوالعباس راکشی نے "الدلیل فی موسوم خط التنزیل" لکھی جس میں قرآن مجید کی سورتیں آیات کلمات حروف اور اعراب اور لفظوں کو بھی شمار کیا ہے۔

شیخ ابوعمرو الدانیؒ فرماتے ہیں کہ ائمہ کا اس بات پر تو اتفاق ہے کہ قرآن کریم کی کل آیات چھ ہزار سے کم نہیں ہے اور آیات قرآنیہ کے چھ ہزار ہونے پر تو اجماع ہے لیکن اس میں اقوال مختلف ہیں کہ چھ ہزار سے کتنی زائد ہیں بعض حضرات کا قول ہے کہ چھ ہزار سے دوسو چار آیتیں زائد ہیں اور بعض کہتے ہیں، دوسو انیس اور کسی نے دوسو پچیس اور کسی نے دوسو چھتیس بیان کیں۔

امام ابوعبداللہ الموصلی فرماتے ہیں آیات کی تعداد میں یہ اقوال مختلف اہل مکہ اہل شام اہل بصرہ اور اہل کوفہ کا آیات کی تحقیق و شمار کے فرق پر مبنی ہے۔

اہل مدینہ کا ایک عدد اور شمار ابوجعفر یزید بن القعقاع اور شیبہ بن نصاح[2]

---

[1] ـــــ

[2] الاتقان۔

مروی ہے اور دوسرا شمار اسمٰعیل بن جعفر انصاری کا ہے۔

اہل مکہ کا عدد عبداللہ بن کثیر کی سند سے ابن عباسؓ سے منقول ہے جس کو وہ ابی بن کعب سے بیان کرتے ہیں۔ اور اہل شام کا عدد بروایت اخفش بعض کبار صحابہؓ سے نقل کیا گیا۔

اہل بصرہ کا عدد عاصم کی روایت سے منقول ہے اور اہل کوفہ کا عدد حمزہ کی طرف منسوب ہے۔ قرطبیؒ نے بیان کیا کہ اہل مدینہ کی اوّل شمار کی رُو سے کل تعداد آیات چھ ہزار ہے اور دوسرے شمار کے لحاظ سے چھ ہزار دو سو چار۔ اہل مکہ کی تحقیق وشمار کے لحاظ سے چھ ہزار دو سو انیس اور اہل کوفہ کی تحقیق میں چھ ہزار دو سو چھتیس۔ اور یہ تعداد وہ ہے جس کو سلیم اور کسائی حمزہ سے نقل کرتے ہیں اور حضرت علیؓ کی جانب اسی کو منسوب کیا گیا۔ اہل شام کی تحقیق میں چھ ہزار دو سو چھبیس اور ایک روایت سے پچیس ہے۔ ابن ذکوان کا خیال ہے کہ بظاہر یحییٰ بن الحارث الذماری جو اس عدد کے راوی ہیں انہوں نے بسم اللہ کو ایک مستقل آیت شمار نہ کیا ہوگا۔

اہل بصرہ کی تحقیق اہل مدینہ کے دوسرے شمار کے مطابق ہے

ان اقوال کو نقل کرکے شیخ ابوعمر الدانی نے اہل کوفہ کی تحقیق وشمار کو ترجیح دی ہے جو حضرت علیؓ بن ابی طالب کی جانب منسوب ہے اور فرمایا اسی شمار پر قدیم زمانہ سے مصاحف قرآنیہ کی تالیف وترتیب ہوئی۔

قرآن کریم کی سورتوں، رکوع وآیات کی تعداد نقل کردہ اقوال کے لحاظ سے حسب ذیل ہے:

سورتوں کی تعداد - ایک سو چودہ ——— ۱۱۴

تعداد رکوعات - پانچ سو چالیس ——— ۵۴۰

تعداد آیات اہل مدینہ کی پہلی تحقیق کے لحاظ سے - چھ ہزار ——— ۶۰۰۰

لے الاتقان ج ۱۔ سے احکام القرآن قرطبی ج ۱ ص ۱۵۔
تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص

تعداد آیات اہل مدینہ کی دوسری تحقیق کے لحاظ سے ۔ چھ ہزار دوسو چار ۶۲۰۴

تعداد آیات اہل شام کی دوسری تحقیق کے لحاظ سے ۔ چھ ہزار دوسو چھبیس ۶۲۲۶

تعداد آیات اہل مکہ کی دوسری تحقیق کے لحاظ سے ۔ چھ ہزار دوسو انیس ۶۲۱۹

تعداد آیات اہل بصرہ کی دوسری " " چھ ہزار دوسو انیس ۶۲۱۹

تعداد آیات اہل کوفہ کی دوسری تحقیق کے لحاظ سے ۔ چھ ہزار دوسو چھتیس ۶۲۳۶

ابو محمد الحمانی نے بیان فرمایا حجاج بن یوسف نے تمام قراء و حفاظ کو جمع کرکے حکم دیا کہ قرآن کریم کے کل کلمات و حروف شمار کرکے مجھے بتاؤ ۔ فرماتے ہیں میں بھی اس جماعت میں شریک تھا اور ہم نے چار ماہ کی مدت میں اس کام کو انجام دیا ، تو کلمات قرآن کی تعداد ستتر ہزار چار سو انتالیس ۷۷۴۳۹ معلوم ہوئی ۔ کلمات قرآن کی یہ تعداد فضل بن شاذان نے عطاء بن یسار سے نقل کی ہے ۔

کل تعداد حروف قرآن بروایۃ عبداللہ بن کثیر عن مجاہد ۔ ۳۲۱۱۸۰

کل تعداد حروف قرآن بروایۃ فضل بن عطاء ۔ ۳۲۳۰۱۵

کل تعداد حروف قرآن بروایۃ ابو محمد الحمانی ۔ ۳۴۰۷۴۰

تعداد حرکات وسکنات

قرآن کریم میں کل تعداد فتحات ——— ۵۳۲۴۲

قرآن کریم میں کل تعداد کسرات ——— ۳۹۵۸۲

قرآن کریم میں کل تعداد ضمات ——— ۸۸۰۴

قرآن کریم میں کل تعداد مدات ——— ۱۷۷۱

قرآن کریم میں کل تعداد تشدیدات ——— ۱۲۷۴

قرآن کریم میں کل تعداد نقاط ——— ۱۰۵۶۸۴

[1] بعض ائمہ مفسرین نے بیان کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی قرآن کریم کے حروف شمار کیے تھے ۔ الاتقان ج ۱ ۔ طبرانی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر بن الخطاب نے بھی سند ضعیف سے حروف قرآن کی تعداد ایک حدیث مرفوع کے ضمن میں بیان کی ہے ۔ الاتقان ج ۱ ص

حدیث عبداللہ بن مسعود میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص قرآن کریم کا ایک حرف پڑھے اس نے ایک حسنہ نیکی کا کام کیا اور ہر نیکی کا بدلہ دس گونہ ہوتا ہے لہٰذا قرآن کریم کے ہر حرف پر دس گونہ ثواب حاصل ہوگا۔ ارشاد مبارک ہے لا اقول الٓمٓ حرف بل الف حرف و لام حرف و میم حرف کہ میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے اور لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے اس طرح یہ تین حرف ہوئے اور اتنے ہی تلفظ پر تلاوت کرنے والا تیس نیکیوں کا مستحق ہوگا تو کل تعداد حروف قرآن کریم —— ۳۲۳۶۷۰ ہے لہٰذا اس کا اجروثواب حق تعالیٰ کے فضل سے دس گونہ ہونے کے بعد —— ۳۲۳۶۷۰۰ ہوگا۔"

شیخ ابومحمد الحمانی بیان کرتے ہیں کہ ہم نے تحقیق کی۔ نصف قرآن کس حرف پر ہوتا ہے تو حروف کے شمار میں سورۃ کہف کے لفظ "وَلْيَتَلَطَّفْ" کی تا نصف قرآن ہے۔ بعض محققین نے سورہ کہف کی آیۃ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نکرا کے نون پر نصف قرآن کہا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے بعض مشائخ سے نصف قرآن کی تعیین مختلف لحاظ سے کی اور فرمایا باعتبار تعداد حروف نصف اول قرآن کریم آیۃ کہف" لقد جئت شیئا نکرا کا نون ہے اور نصف ثانی نکرا کے کاف سے شروع ہوتا ہے۔

باعتبار کلمات نصف قرآن آیۃ سورۃ حج "يُصْهَرُ بِهِ مَا فِي بُطُونِهِمْ وَالْجُلُودُ" کی دال ہے اور نصف ثانی آیۃ ولهم مقامع من حديد ہے۔ باعتبار آیات سورۃ شعراء کی آیت فاذا هي تلقف ما يافكون میں لفظ یافکون ہے۔ اور نصف ثانی آیۃ فالقی السحرۃ ہے۔

اور سورتوں کے لحاظ سے نصف سورتیں سورۃ حدید پر ہوتی ہیں اور نصف ثانی سورۃ مجادلہ سے شروع ہے۔[1]

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج ۱۔

حفاظ قرآن اور ائمہ مفسرین میں بلحاظ حروف نصف قرآن کے بارہ میں یہی قول مشہور ہے جو ابو محمد الحمانی سے نقل کیا گیا۔

اجزاء اور حصص قرآن کریم

احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرات صحابہؓ نے حفظ اور تلاوت و ورد کے لیے اسی طرح تہجد میں پڑھنے کے لیے قرآن کریم کے اجزاء اور حصے متعین کردیئے تھے۔ مسند احمدؒ بن حنبل میں سنن ابی داؤد اور سنن ابن ماجہ میں اوس بن حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے حضرات صحابہؓ سے دریافت کیا کہ آپ حضرات قرآن کریم کے حصے کس طرح کرتے ہیں فرمایا۔ ثلث، خمس، سُبع، تسع، واحد عشر کا یعنی تین پانچ سات نو اور گیارہ حصوں پر منقسم کرکے تلاوت و حفظ کا معمول بناتے ہیں

حضرات صحابہؓ کے بعد قرون تابعین میں حفاظ کی سہولت کے لیے مدارس و مکاتیب میں تعلیم و حفظ کے سلسلے میں تیس اجزاء اور پاروں پر قرآن کریم کی تقسیم متعارف ہوئی اور پھر مدارس و حفاظ میں یہی دستور جاری رہا۔ گویا مہینے کے دنوں کے لحاظ سے تیس اجزاء پر منقسم کیا گیا اور ہر حصہ کو جُز یا پارہ کے عنوان سے تعبیر کیا گیا۔ اسی وجہ سے ہر پارہ پر الجزء الاوّل یا الجزء الثانی کلمات لکھ دیئے جاتے ہیں، اور ہر پارہ کو چار حصوں پر تقسیم کردیا اور ان حصوں پر ربع، نصف، ثلث لکھا جانے لگا۔ اور آیات کے مخصوص حصوں کو رکوعات کے عنوان سے موسوم کیا جس کے لیے ع رمز متعین کیا گیا۔

قرآن کریم کی تین حصوں پر تقسیم

ثلث اوّل یعنی پہلا تہائی حصہ قرآن — سورۃ براۃ کی آیۃ عدد ۱۰۰ پر ہے۔
ثلث ثانی —— تہائی حصہ قرآن — سورۃ شعراء کی آیۃ عدد ۱۰۰ پر ہے۔
ثلث ثالث —— تہائی حصہ قرآن — ختم قرآن کریم۔

بحوالہ تفسیر ابن کثیر ج ۱۔

سات حصّوں پر تقسیم

سبع اوّل یعنی پہلا ساتواں حصّہ ۱ آیۃ وَمِنْهُمْ مَنْ صَدَّ کی دال پر ۔ سورۃ نسآء

سبع ثانی ۲ ساتواں حصّہ آیۃ اُولٰئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ کی ت پر سورۃ اعراف

سبع ثالث ۳ ساتواں حصّہ آیۃ اُكُلُهَا دَائِمٌ کے دوسرے الف پر سورۃ رعد

سبع رابع ۴ ساتواں حصّہ آیۃ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا میں جعلنا کے الف پر ۔ سورہ حج

سبع خامس ۵ ساتواں حصّہ آیۃ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ کی ۃ پر ۔ سورۃ احزاب

سبع سادس ۶ ساتواں حصّہ آیۃ اَلظَّانِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ کے واؤ پر ۔ سورۃ الفتح

سبع سابع ۷ ساتواں حصّہ آیۃ قرآن کریم کا آخری حرف[1] ۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ۔

قرآن کریم میں تعداد مقامات حروفِ ہجائیہ

حضرات علماء اور حفاظ امت نے یہ بھی تحقیق کی کہ ہر حرف قرآن کریم میں کتنی بار اور کتنے مواقع میں ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ بروایۃ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ صاحب لبنان نے حسب ذیل تفصیل نقل کی ہے۔

حرف	تعداد مقام	حرف	تعداد مقام
الف	۴۸۸۷۲	ط	۱۲۷۴
ب	۱۱۲۲۸	ظ	۸۴۲
ت	۱۱۹۹	ع	۹۲۲۰۰
ث	۱۲۷۶	غ	۲۲۰۸
ج	۳۲۷۳	ف	۸۴۹۹
ح	۹۷۳	ق	۶۸۱۳
خ	۲۴۱۶	ک	۹۵۲۲
د	۵۶۴۲	ل	۳۴۳۲
ذ	۴۶۹۷	م	۲۶۵۳۵
ر	۱۱۷۹۳	ن	۲۶۵۶۰
ز	۱۵۹۰	و	۲۵۵۳۶
س	۵۸۹۱	ہ	۱۹۰۷۰
ش	۲۲۵۳	لا	۳۷۲۰
ص	۲۰۱۳	ء	۴۱۱۵
ض	۱۶۰۷	ی	۲۵۹۱۹

علماء اور قرأ قرآن کریم کے نزدیک قرآن کریم کے حصوں کے عنوان اور نام

متعارف ہیں جن سے ان کو تعبیر کیا جاتا ہے۔

۱۔ **سبع طوال**۔ یعنی سات طویل سورتیں۔ یہ سورتیں حسب ذیل ہیں:
سورۃ البقرۃ۔ آل عمرانؑ۔ سورۃ نساء۔ سورۃ مائدہ۔ انعام
سورۃ اعراف اور سورۃ انفال مع براۃ۔

۲۔ **مئین**۔ وہ سورتیں جن میں کم و بیش سو آیات ہیں۔ سورۃ یونس سے
سورۃ فاطر تک۔

۳۔ **مثانی**۔ وہ سورتیں جن میں انبیاء سابقین اور ان کی اُمتوں کے احوال و قصص
خاص طور پر ذکر کیے گئے اور عبرت و نصائح کے امور بار بار بیان فرمائے گئے
مثانی سورۃ یٰسٓ سے سورۃ قٓ تک ہے۔

۴۔ **مفصل**۔ جُدا جُدا اور علیحدہ مضمون والی سورتوں کو کہا جاتا ہے جو سورۃ
قٓ سے ختم قرآن تک ہیں۔ مفصلات کی تین قسمیں ہیں (الف) طوال مفصل
سورۃ قٓ سے سورۃ بروج تک۔
(ب) اوساط مفصل۔ سورۃ بروج سے سورۃ لم یکن الذین کفروا تک
(ج) قصار مفصل۔ سورۃ اذا زلزلت یا لم یکن الذین کفروا سے ختم قرآن تک[1]
شیخ سیوطیؒ نے ابن معین کا قول نقل کیا ہے۔ طوال مفصل عم یتساءلون
تک ہے اور اوساط مفصل سورۃ والضحیٰ تک اور قصار مفصل الم نشرح
سے ختم قرآن کریم تک۔ امام احمد بن حنبلؒ نے واثلہ بن الاسقع کی روایت سے
نقل کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھے تورات کی جگہ قرآن کریم
اور قرآن کریم میں سبع طوال دی گئیں۔ اور زبور کی جگہ مئین اور انجیل کی جگہ
مثانی اور اس سے زائد برتری و فضیلت سے مجھ کو مفصلات عطا فرما کر
نوازا گیا۔[2]

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج ۔ احکام القرآن قرطبی ۔ [2] الاتقان۔ ج ۱۔

فائدہ

اصل تدوین قرآن کریم اور آیات کی تقسیم کے لحاظ سے تو آیات مکیہ اور مدنیہ ہی ہیں لیکن مصاحف قرآن میں بعض آیات پر لفظ کوفی یا بعض پر شامی لکھا ہوا ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ آیت کوفہ یا شام میں نازل ہوئی تھی بلکہ یہ متاخرین کے نزدیک ایک اصطلاح ہے کہ یہ آیت اس جگہ پوری ہے، علماء کوفہ کے نزدیک۔ اور جس پر لفظ شامی لکھا تو مراد یہ ہے کہ یہ آیت علماء شام کے نزدیک اس جگہ پر پوری ہے۔

مصاحف قرآن میں آیات پر کچھ نشانات اور علامتیں بھی متاخرین ائمہ نے مقرر کیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :

ھ ۔ خمسہ کی طرف اشارہ ہے جس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ کوفیوں اور بصریوں یا صرف اہل کوفہ کے نزدیک پانچ آیات کا مجموعہ ہے۔

ع ۔ عشرہ کا ابتدائی حرف ہے۔ دس آیات کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

عب ۔ اشارہ ہے کہ اہل بصرہ کے یہاں دس آیات پوری ہوچکیں۔ ع سے عشرہ اور ب سے بصری کا رمز اختیار کیا گیا۔

خب ۔ اشارہ ہے کہ اہل بصرہ کے نزدیک پانچ آیات ہوگئیں۔ خ سے خمسہ اور ب سے بصری مراد ہے۔

تب ۔ اشارہ ہے کہ اہل بصرہ کے نزدیک پوری آیت ہے۔ ت تام اور ب بصری مراد ہے۔

لب ۔ اشارہ ہے کہ یہاں اہل بصرہ کے نزدیک آیت پوری نہیں ہے ل لیس کا۔ اور ب بصری کا رمز ہے۔

وقف

لغت عربیہ میں وقف ٹھہرنے کو کہا جاتا ہے۔ آیات قرآنیہ میں جس جگہ وقف کا

علامت لکھی گئی، اس سے اشارہ ہوتا ہے کہ یہاں ٹھہرنا (وقف کرنا) چاہیے۔
ہر زبان میں کم و بیش یہ بات ملحوظ ہوتی ہے کیونکہ اگر کسی ایسے جملہ کو جہاں وقف
کرنا چاہیے اگر وقف نہ کیا جائے اور اس کو آئندہ جملہ کے ساتھ ملا دیا جائے، تو
بسا اوقات معنی مختل ہو جاتے ہیں۔ یہی حال آیات قرآنیہ میں بھی وقف کا ہے
مثلاً آیہ فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ وقف۔ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا میں لفظ قولهم
پر وقف ہے۔ مراد یہ ہے کہ اے پیغمبر آپ کو ان کی باتیں اور قول غمگین نہ کرے یعنی
آپ مشرکین کی لغو باتوں اور ان کے شرک و انکار آخرت سے رنجیدہ نہ ہوں۔ کیونکہ
ہر قسم کی عزت اللہ ہی کے لیے ہے تو اگر قولهم پر وقف نہ کیا جائے تو معنی یہ
ہو جائیں گے (العیاذ باللہ) کہ آپ کو ان کا یہ کہنا کہ ہر طرح کی عزت اللہ ہی کے
واسطے غمگین و رنجیدہ نہ کرے تو اس طرح معنی بالکل برعکس ہو جائیں گے۔ اسی وجہ سے
قرا کے نزدیک وقف کا اہتمام کیا جاتا ہے اور امام نافع تو اس بات کے قائل تھے
کہ وقف صرف معنی ہی کے لحاظ سے ہوتا ہے۔

ابوعمر کا قول ہے کہ جہاں آیت تام ہو وہاں وقف کرنا چاہیے اور اسی کا نام وقف النبی
صلی اللہ علیہ وسلم ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جملہ انتہاء آیات پر وقف فرمایا کرتے
تھے (لیکن متاخرین علماء نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ جن مواقع میں وصل آیات
سے معنی میں کسی قسم کا تغیر نہ ہوتا ہو وہاں وصل کیا جا سکتا ہے)

ابن الانباری فرماتے ہیں کہ وقف کی تین قسم ہیں۔ وقف تام۔ وقف حسن
اور وقف قبیح۔ جہاں جملہ پورا ہوتا ہو اور معنوی لحاظ سے وہاں ٹھہرنا ضروری ہے
اس کو وقف تام کہا جائے گا اور جس جگہ جملہ پورا ہو جاتا ہو لیکن معنوی طور پر
سلسلہ الفاظ آئندہ کے ساتھ مربوط ہو جیسے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں لفظ
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ پر وقف حسن کے درجہ میں ہوگا اگر سانس لینے کی ضرورت سے وقف
کیا جائے۔ اور اگر کسی ایسے موقعہ پر وقف کیا جائے کہ مرکب اضافی کلمہ میں سے
مضاف پر وقف کر کے مضاف الیہ کو علیحدہ کر دیں تو یہ وقف قبیح ہوگا۔ مثلاً

مثلاً ربّ العالمین میں لفظ ربّ پر رک جائے ۔ تفصیل کے لیے کتب فن قرأت وتجوید کی مراجعت فرمائی جائے ۔

قراء اور حفاظ نے وقف و وصل کی جو علامات مقرر کی ہیں وہ حسب ذیل ہیں

○ یہ گول دائرہ پوری آیت کی علامت ہے جہاں اس پر لآ نہ ہو وہاں وقف کرنا چاہیے۔

مـ وقف لازم کی طرف اشارہ ہے ۔

ط وقف مطلق کی علامت ہے ۔ یہاں بھی وقف ہے مگر لازم نہیں ۔

ج ۔ وقف جائز کی علامت ہے ۔

ص ۔ اشارہ ہے کہ بضرورت اگر وقف کرلیا جائے تو مضائقہ نہیں ۔ لیکن بلاضرورت وقف نہ کرنا چاہیے ۔

ز ۔ اشارہ ہے کہ وقف نہ کرنا علی الاطلاق بہتر ہے ۔

صلی ۔ اشارہ ہے کہ وصل اور ملا کر پڑھنا اولیٰ ہے ۔

ق ۔ اشارہ ہے کہ بعض نے وقف کو کہا ہے ۔ لیکن بہتر ہے کہ وقف نہ کرے ۔

صل ۔ اشارہ ہے کہ ملا کر پڑھا گیا مگر وقف اولیٰ ہے ۔

قف ۔ اشارہ ہے کہ وقف کرو ۔

س ۔ سکتہ کی علامت ہے ۔ لیکن مصاحف قرآن میں بالعموم لفظ سکتہ لکھ دیا جاتا ہے ۔

لا ۔ اشارہ ہے یہاں ٹھیرنا جائز نہیں ہے ۔ البتہ آیت کی علامت پر اگر لا لکھا ہو تو قرأسے وہاں جواز وقف منقول ہے

قلا ۔ اشارہ ہے کہ بعض کے نزدیک یہاں نہ ٹھیرنا چاہیے ۔

مع ۔ معانقہ کی علامت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ درمیانی لفظ اوّل اور مابعد لفظ کے ساتھ مربوط ہے اور دونوں کے ساتھ ملا کر پڑھا جاسکتا ہے ۔ جیسے لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ میں لفظ فیہ پر معانقہ ہے

کہ فیہ کو لفظ لاریب سے بھی ربط ہے۔ اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ اس کتاب میں کسی نوع کا شبہ نہیں۔ اور لفظ فیہ کو جب ھدی کے ساتھ مربوط کرکے پڑھا جائیگا تو معنی یہ ہوں گے کہ اس کتاب میں ہدایت ہے تقویٰ والوں کے لیے۔ ایسے مواقع پر اس طرح ∴ تین نقطے بھی ملا کر لکھ دیئے جاتے ہیں۔

جمع و تدوین اور کتابت قرآن کریم

جیسا کہ سطور سابقہ میں بیان کیا گیا قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یک وقت اور ایک بار اس ترتیب سے نہیں نازل ہوا جس پر اس کی تلاوت کی جاتی ہے بلکہ متفرق اوقات میں تھوڑا تھوڑا تئیس سال کی مدت میں نازل ہوا اور جس قدر حصہ نازل ہوتا۔ آپ اس کے لکھنے کا حکم فرما دیتے۔ کاتبین اور حفاظ کی جماعت جو آپ کی مجلس میں حاضر ہوتی وہ ان آیات کی کتابت کر لیتی۔ لیکن کتابت مروجہ طریقہ سے بالترتیب کسی ایک مجموعہ یا صحیفہ میں نہیں ہوتی بلکہ متفرق اوراق، کھجور کی چھالیں، چمڑے کے ٹکڑوں اور بکری کے شانوں اور ہڈیوں پر لکھ لیا جاتا تھا اور حضرات صحابہ اسی ترتیب کے ساتھ یاد کر لیتے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی ہو اور یاد کرایا ہو۔ اور اپنے الواح قلوب پر کلام اللہ کو محفوظ اور نقش کر لیتے

جمع قرآن زمانۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں

حفظ قرآن کی یہ شان خود قرآن کریم نے بیان کر دی ہے بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ (بلکہ وہ آیات بینات ہیں جو اہل علم (یعنی حفاظ کلام اللہ) کے سینوں میں محفوظ ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ بیان فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نسخ احکام

لہ فتح الباری باب فضائل القرآن۔

ہوتا رہتا تھا۔ ایسی صورت میں اگر قرآن کریم بالترتیب کسی ایک مرتب مجموعہ میں مرتب کر دیا جاتا جس کے بعد اس کا مختلف بلاد اور علاقوں میں پہنچنا لازمی امر تھا۔ پھر اگر کوئی آیت منسوخ ہوتی تو مصاحف قرآنیہ سے اس کے نکالنے میں بڑی دشواری ہوتی اور ایسی صورت میں بہت اختلاف بھی رونما ہوتا۔ اس وجہ سے آیات قرآنیہ کی کتابت تو کرادی جاتی تھی لیکن منتشر اوراق کھجور کی چھالوں اور پتھر کے ٹکڑوں اور ہڈیوں وغیرہ پر اور حضرات صحابہؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت کی تعلیم و تلقین اسی ترتیب کے ساتھ فرماتے جو ترتیب تلاوت ہے۔

زید بن ثابت[1] رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رحلت فرما گئے اور حال یہ تھا کہ قرآن کریم کسی مجموعہ میں مرتب نہیں تھا۔

حارث محاسبی[2] نے کتاب فہم السنن میں فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آیات قرآنیہ کی کتابت کا حکم فرما دیتے تھے مختلف ٹکڑوں اور ہڈیوں، کھجور کی چھال اور پٹھوں وغیرہ پر اور یہ سب اوراق مکتوبہ کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ میں محفوظ پائے گئے تو گویا کسی جامع نے پھر ان سب کو ایک سلسلہ میں مربوط و جمع اور اوراق منتشرہ کو ایک تاگہ اور ڈوری میں سی دیا۔ اور یہ جامع آپ کی وفات کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ زید[3] بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں جس وقت آیت "لا یستوی القاعدون من المؤمنین والمجاھدون فی سبیل اللہ" نازل ہوئی اور آپ اس آیت کا مجھ سے املاء کرا ہی رہے تھے، تو ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ جو نابینا صحابی تھے۔ مجاہدین فی سبیل کی فضیلت کو سن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ میں تو نابینا شخص ہوں۔ اگر مجھ میں استطاعت ہوتی تو میں جہاد کرتا۔

مقصد جہاد فی سبیل اللہ سے اپنی محرومی پر اظہار افسوس تھا۔

زید بن ثابت بیان کرتے ہیں کہ اسی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آثار وحی

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج ۱ [2] الاتقان جلد ۱ [3] جامع ترمذی کتاب التفسیر تفسیر [illegible]

ظاہر ہوتے اور جب وحی نازل ہو چکی تو آپ نے فرمایا، اس آیت کے درمیان غیر اولی الضرر لکھ لو۔ جو القاعدون من المؤمنین اور والمجاھدین کے کے درمیان لکھوا دیا گیا اور پہلے آیۃ کا نزول بغیر لفظ غیر اولی الضرر ہوا تھا۔ زید بن ثابت فرماتے ہیں میں نے وہی شانہ کی ہڈی جس پر پہلے یہ آیت لکھی تھی لے کر اسی میں لفظ غیر اولی الضرر بھی لکھ دیا۔ اور فرمایا گویا آج میری نظروں کے سامنے اس ہڈی کا وہ شگاف اور پھٹن موجود ہے جو من المؤمنین اور لفظ غیر اولی الضرر کے درمیان واقع تھی۔

علامہ ذہبی نے طبقات القرا میں فرمایا، حضرات صحابہؓ کی ایک مخصوص جماعت کتابت پر مامور و مقرر تھی۔ اسی جماعت کے ایک فرد زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ حاکم بیان کرتے ہیں قرآن کریم تین مرتبہ جمع ہوا۔ ایک بار تو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کہ جس وقت جو آیتہ نازل ہوتی آپ اپنے حکم سے اس کو کتابت کرا دیتے۔ اور فرما دیتے کہ اس آیت کو فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد لکھ دو۔ جیسا کہ زید بن ثابت و دیگر حضرات صحابہؓ کی روایات سے ظاہر ہے۔

کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم نؤلف القرآن فی الرقاع والاکتاف الخ

کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی آیات قرآنیہ کپڑے کے ٹکڑوں، کھجور کی چھالوں اور بکری کے دست اور شانوں وغیرہ پر لکھ لیا کرتے تھے۔

اس طرح کل مدت نزول قرآن میں آیات قرآنیہ منتشر و متفرق جگہوں پر کتابت کی گئیں

جمع قرآن صدیق اکبرؓ کے دورِ خلافت میں

دوسری مرتبہ جمع قرآن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ہوا۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دل میں ابتداءً اس امر کا داعیہ پیدا ہوا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ اب مصلحت اور ضرورت کا تقاضہ ہے کہ جمع و ترتیب قرآن کریم کا حکم آپ دے دیں۔ گو فاروق اعظم کی اس رائے پر ابوبکر صدیقؓ کو پہلے کچھ تردد اور تامل ہوا لیکن مراجعت و گفتگو کے بعد اس پر ان کا بھی دل منشرح ہو گیا۔ اور زیدؓ بن ثابت کو اس کے لیے مامور فرما دیا۔

تیسری مرتبہ جمع قرآن حضرت عثمانؓ غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہوا۔ؒ

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں زید بن ثابتؓ کی حدیث میں یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور عثمان غنی رضی اللہ کے زمانہ میں جمع و تدوین قرآن کریم کا حال حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں متعدد احادیث و روایات سے بیان کیا ہے۔

چنانچہ صحیح بخاری میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے:

قَالَ اَرْسَلَ اِلَیَّ اَبُوْبَکْرٍ مَقْتَلَ اَھْلِ الْیَمَامَۃِ فَاِذَا ھُوَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عِنْدَہٗ ۔ قَالَ اَبُوْبَکْرٍ اِنَّ عُمَرَ اَتَانِیْ فَقَالَ اِنَّ الْقَتْلَ قَدِ اسْتَحَرَّ یَوْمَ الْیَمَامَۃِ بِقُرَّاءِ الْقُرْاٰنِ وَاِنِّیْ اَخْشٰی اَنْ یَسْتَحِرَّ	بیان کرتے ہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے میری طرف ۔۔۔ پیغام بھیجا (حاضری کے لیے) اہل یمامہ کے ساتھ قتال و معرکہ کے زمانہ میں (جب کہ مسیلمہ کذاب مدعی نبوت کے ساتھ قبیلہ بنو حنیفہ ہو گیا تھا اور بھی کچھ لوگ اس کی پیروی کرنے لگے تھے

ؒ ابن کثیر ج ۱

القتل بالقراء في المواطن
فيذهب كثير من القرآن
وإني أرى أن تأمر بجمع القرآن
قلت لعمر كيف تفعل شيئا
لم يفعله رسول الله صلى الله
عليه وسلم. قال عمر هذا
والله خير، فلم يزل عمر
يراجعني حتى شرح الله
صدري لذلك ورأيت في
ذلك الذي رأى عمر قال
زيد قال أبو بكر إنك رجل
شاب عاقل لا نتهمك في دينك
وقد كنت تكتب الوحي لرسول
الله صلى الله عليه وسلم فتتبع
القرآن فاجمعه. قال فوالله
لو كلفوني نقل جبل من الجبال
ما كان أثقل علي مما أمرني
به من جمع القرآن قال
قلت كيف تفعلون شيئا لم
يفعله رسول الله صلى الله
عليه وسلم. قال هو خير
فلم يزل أبو بكر يراجعني حتى
شرح الله صدري للذي

تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کے
ساتھ جہاد کے واسطے لشکر روانہ فرمایا۔
اور اس معرکہ میں تقریباً سات سو
قراء وحفاظ قرآن شہید ہوگئے تھے۔
بیان کرتے ہیں) تو میں نے وہاں دیکھا
کہ اس وقت عمر بن الخطاب ابوبکر کے
پاس موجود ہیں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے
فرمایا کہ عمرؓ میرے پاس آئے اور انہوں
نے کہا کہ بے شک معرکہ یمامہ میں قتل و
خونریزی بہت شدید ہوچکی قراء اور حفاظ
قرآن کے لیے اور مجھے اندیشہ ہے کہ اگر
قتل وخونریزی اسی طرح شدید رہی مختلف
جگہوں میں تو بہت سا حصہ قرآن کریم کا
ضائع ہوجائے گا (حفاظ و قراء کے
شہید ہوجانے کی وجہ سے) اس لیے
میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ قرآن کریم
کے جمع کرنے کا حکم فرمادیں۔ اس پر
میں نے عمرؓ سے کہا ہم کیسے اس چیز کو
کریں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے نہیں کیا ہو۔ عمرؓ بولے خدا کی قسم یہ چیز
خیر و بہتر ہی ہے۔ تو عمرؓ بار بار مجھ سے
یہی کہتے رہے (اور اس نوع کی گفتگو
کرتے رہے) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے

صَدْرَ اَبِیْ بَکْرٍ وَعُمَرَ رضی اللّٰہ عنہما فَتَتَبَّعْتُ الْقُرْاٰنَ اَجْمَعُہٗ مِنَ الْعُسُبِ وَاللِّخَافِ وَ صُدُوْرِ الرِّجَالِ حَتّٰی وَجَدْتُّ اٰخِرَ سُوْرَۃِ التَّوْبَۃِ مَعَ اَبِیْ خُزَیْمَۃَ الْاَنْصَارِیْ لَمْ اَجِدْھَا مَعَ اَحَدٍ غَیْرِہٖ۔ لَقَدْ جَاءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُوْفٌ رَّحِیْمٌ حَتّٰی خَاتِمَۃِ بَرَاءَۃَ فَکَانَتِ الصُّحُفُ عِنْدَ اَبِیْ بَکْرٍ رضی اللّٰہ عنہ حَتّٰی تَوَفَّاہُ اللّٰہُ تَعَالٰی ۔ ثُمَّ عِنْدَ عُمَرَ رضی اللّٰہ عنہ حَیَاتَہٗ ثُمَّ عِنْدَ حَفْصَۃَ رضی اللّٰہ عنہا۔	میرا سینہ اس چیز کے لیے کھول دیا۔ اور میں نے اس بارہ میں اسی چیز کو بہتر سمجھا جس کو عمرؓ بہتر سمجھ رہے تھے۔ زیدؓ بن ثابت بیان کرتے ہیں۔ ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا (اے زید) بے شک تم ایک نوجوان اور سمجھ دار شخص ہو ہم تمہارے دین وتقویٰ کو کسی بھی تہمت سے متہم نہیں کرسکتے اور تم نبی کریمؐ کے زمانہ میں وحی (قرآن) کی کتابت بھی کرتے تھے اس لیے تم قرآن کریم کی آیات تلاش کرو اور اس کو جمع کرو۔ (جہاں جہاں بھی آیات قرآنیہ لکھی ہوئی ملیں ان کو جمع و مرتب کرو۔ اسی ترتیب کے ساتھ جس پر ان کی تلاوت کی جاتی ہے) بیان کرتے ہیں خدا کی قسم اگر یہ حضرات مجھ کو پہاڑوں میں سے کسی پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم دیتے تو وہ مجھ پر اس سے زیادہ گراں نہ ہوتا جس کا ان حضرات نے مجھ کو مامور فرمایا۔ میں نے عرض کیا آپ حضرات کیونکر وہ چیز کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کی ہے۔ فرمایا (نہیں) یہ چیز خیر ہی ہے تو ابوبکرؓ اس بارہ میں مجھ سے بار بار فرماتے رہے

یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا دل بھی اسی چیز کے لیے کھول دیا جس کے واسطے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا قلب منشرح کیا تھا۔

بہرکیف میں نے قرآن کریم کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ درآنحالیکہ میں آیات قرآنیہ جمع کر رہا تھا۔ کھجور کی چھالوں اور سفید پتھر کے ٹکڑوں (جن پر وہ آیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لکھ لی جاتی تھیں) اور لوگوں یعنی حفاظ صحابہؓ کے سینوں سے۔ یہاں تک کہ سورۂ توبہ کی آخری آیت مجید کو ابوخزیمۃ الانصاری کے پاس ملی جو ان کے سوا اور کسی کے پاس (لکھی ہوئی) نہیں تھی۔ آیتہ: لقد جاءکم رسول من انفسکم ختم سورہ براۃ تک

تو یہ لکھے ہوئے صحیفے (اوراق) ابوبکرؓ کے پاس ان کے زمانہ حیات میں رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس عالم سے اٹھا لیا۔ پھر عمر فاروقؓ کے پاس ان کی زندگی میں رہے اس کے بعد عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ رضی اللہ عنہا کے پاس رہے۔

ابن ابی داؤد نے باسناد ہشام بن عروۃ، عروۃ بن الزبیر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت تخریج کی ہے۔ عروۃ بن زبیر بیان کرتے ہیں کہ میرے والد نے بتایا کہ ابوبکرؓ نے عمر فاروقؓ اور زیدؓ بن ثابت کو فرمایا کہ تم دونوں مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ۔ جو شخص قرآن کریم کی کسی آیت پر دو شاہد (گواہ) پیش کرے اس کی کتابت کرو یعنی مصحف میں کسی تلاوت کی جانے والی آیت کو لکھنے کے واسطے یہ ضابطہ اور معیار مقرر کیا تاکہ ہر آیت پورے وثوق و اعتماد کے ساتھ مصحف قرآن میں لکھی جائے۔

علامہ سخاوی نے جمال القرآء میں دو شاہدوں کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ جو دو گواہ اس بات کی گواہی دینے والے ہوں کہ یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپؐ کے حکم سے لکھی گئی تھی[1] جس سے مقصد یہ تھا کہ مصحف قرآن میں بجنسہ وہی لکھا جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو کاتبین وحی نے لکھ لیا تھا۔ زبانی طور پر جو آیات حفاظ صحابہؓ کو یاد ہیں اور ان کی تلاوت کی جاتی ہے۔ محض اس بنیاد پر ان کو جمع نہ کیا جائے۔ اسی وجہ سے زید بن ثابت یہ کہتے ہیں کہ میں نے سورۃ توبہ کی آخری آیت کسی کے پاس نہ پائی۔ اس کو صرف ابو خزیمہ انصاری کے پاس پایا۔ مراد یہ ہے کہ یہ آیت صرف ان ہی کے پاس لکھی ہوئی تھی اور کسی کے پاس یہ آیت لکھی ہوئی نہیں تھی۔ ورنہ تلاوت تو تمام حضرات صحابہؓ ہی کرتے تھے اور سب یہ جانتے تھے کہ سورۃ توبہ آیت لقد جاءکم رسول من انفسکم پر ختم ہوتی ہے۔ اصل تلاش یہ تھی کہ لکھی ہوئی ہے تاکہ طے کردہ معیار پر صحیفہ کلام اللہ میں اس کو درج کیا جا سکے۔

علامہ آلوسیؒ[2] فرماتے ہیں حافظ ابن حجر نے دو شاہدوں کی مراد یہ بیان کی ہے کہ ایک حافظ اور دوسرا شاہد کتابت ہے کہ وہ آیت بالعموم حفاظ صحابہ کو یاد ہو اور کتابت کا ثبوت بھی اس کے واسطے موجود ہو۔

---

[1] الاتقان ج ۱ [2] تفسیر روح المعانی

غرض یہ جمع و تدوین قرآن کی دوسری مرتبہ تھی جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہوئی اور معلوم ہوا کہ اس جمع و تدوین کی حقیقت یہ تھی کہ آیاتِ قرآنیہ جو متفرق طور پر کھجور کی چھالوں اور ہڈیوں یا کپڑوں کے ٹکڑوں وغیرہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپؐ کے حکم سے آپ کے روبرو کتابت کرلی گئی تھیں ان کو بالترتیب ایک مجموعہ میں مرتب کرلیا جائے اسی ترتیب کے ساتھ جس پر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت فرماتے تھے اور صحابہؓ کو پڑھاتے اور پھر افراد و حفاظ صحابہ اسی کے مطابق اس کو پڑھتے تھے۔

قرآن کریم کا یہ صحیفہ (نسخہ) ابوبکرؓ کے پاس ان کے زمانہ حیات میں رہا۔ اس کے بعد یہی نسخہ عمر فاروق رضؓ کے پاس رہا۔ پھر ان کی شہادت کے بعد ان کی صاحبزادی، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہا۔

عہد صدیقی میں جمع قرآن سے غرض یہ تھی کہ قرآن محفوظ ہو جائے اور کسی آیت یا لفظ کے کلام اللہ کے ضائع ہونے کا اندیشہ باقی نہ رہے۔

جمع قرآن عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت میں

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں کثرت فتوحات کی وجہ سے اسلام دوسرے بلاد و ممالک اور دور و دراز علاقوں میں پہنچ چکا تھا۔ عراق و ایران فتح ہو گیا تھا اور یہاں کے لوگ کثرت سے مسلمان ہوئے اور حفاظ و قراء کی آمد و رفت سے قرآن کریم کی تعلیم اور حفظ و قرأت کا سلسلہ پھیلتا گیا۔ ابتداءِ اسلام میں قرآن کریم ایک ہی لغت (یعنی لغت قریش) پر نازل ہوا تھا۔ تمام قبائل اور مختلف اقوام کو جو لغت قریش سے مانوس تھیں ایک ہی لغت پر قرآن کا تلاوت کرنا موجب صعوبت اور دشواری تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حق تعالیٰ کی طرف سے یہ اجازت دی گئی کہ ایسے لوگوں کو جو بعض آیات یا کسی لفظ کو لغت قریش پر تلاوت کرنے سے معذور ہیں۔ دوسرے لغات پر ان کو وہ آیات یا الفاظ پڑھا دیں۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض آیات متعدد صحا[...] دیگر لغات پر پڑھا دی تھیں

ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے [...] نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریلؑ امین سے ملاقات کی تو فرمایا "[...] میں ایک ایسی امت کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں کہ جو امی (ان پڑھ) ہیں [...] میاں اور بڑی عمر والے بوڑھے بچے اور بچیاں اور ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے [...] کچھ نہ لکھا اور نہ پڑھا۔ مقصد یہ تھا کہ ایک لغت پر ان سب کو قرآن پڑھنا دشوار ہوگا۔ جبریل امین نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن سات حرفوں پر نازل کیا گیا یعنی ان حرفوں پر اس کی تلاوت کی اجازت و رخصت دے دی گئی ہے[1]۔

---

[1] جامع ترمذی باب فضائل القرآن ج۲۔

اسی وجہ سے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بعض صحابہ دوسرے بعض صحابہ کو مختلف طور پہ تلاوت کرتا دیکھ کر تعجب کرتے اور نوبت یہاں تک آتی کہ آپ کی خدمت میں معاملہ پیش کیا جاتا۔ جس پہ آپ ہر دو صورتوں کی تصدیق فرما دیتے۔ ہٰکذا اُنزِلَت ہٰکذا اُنزِلَت کہ یہ آیت اس طرح ہی نازل ہوئی اور اس طرح بھی نازل کی گئی۔

چنانچہ امام مسلمؒ نے صحیح مسلم میں عمرؓ بن الخطاب کا واقعہ ذکر کیا ہے:

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ هِشَامَ بْنَ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ يَقْرَأُ سُورَةَ الْفُرْقَانِ عَلٰى غَيْرِ مَا أَقْرَأُهَا وَكَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَقْرَأَنِيهَا فَكِدْتُ أَنْ أَعْجَلَ عَلَيْهِ ثُمَّ أَمْهَلْتُهُ حَتّٰى انْصَرَفَ ثُمَّ لَبَّبْتُهُ بِرِدَائِهِ فَجِئْتُ بِهِ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنِّي سَمِعْتُ هٰذَا يَقْرَأُ سُورَةَ الْفُرْقَانِ عَلٰى غَيْرِ مَا أَقْرَأْتَنِيهَا فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَرْسِلْهُ، اقْرَأْ فَقَرَأَ الْقِرَاءَةَ الَّتِي سَمِعْتُهُ يَقْرَأُ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰكَذَا أُنْزِلَتْ ثُمَّ قَالَ لِي اقْرَأْ فَقَرَأْتُ فَقَالَ هٰكَذَا أُنْزِلَتْ

عمر بن الخطابؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ہشام بن حکیم بن حزام کو سورۃ فرقان پڑھتے ہوئے سنا اس طریقہ کے خلاف کہ جس پر میں اس کی تلاوت کرتا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی خود مجھ کو یہ سورت پڑھائی تھی تو قریب تھا کہ میں ان پہ لپک پڑوں، مگر پھر میں نے ان کو مہلت دی یہاں تک کہ وہ (نماز یا تلاوت سے) فارغ ہو گئے۔ میں فوراً ان کی چادر کا گردن میں پیچ دے کر ان کو گھسیٹتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ میں نے ان کو سورۃ فرقان پڑھتے ہوئے سنا ہے اس کے برخلاف کہ جس پر آپ نے مجھ کو یہ سورت پڑھائی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کو چھوڑ دو (اور ان کی طرف رخ کرتے ہوئے فرمایا) پڑھو تو انہوں نے اسی طرح پہ

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۔ ؎

پڑھا جس طرح میں نے ان کو تلاوت کرتے ہوئے سنا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس طرح بھی یہ سورت نازل کی گئی ہے۔ پھر مجھ سے فرمایا پڑھو۔ میں نے پڑھا تو آپ نے فرمایا۔ اس طرح بھی نازل کی گئی ہے اور بے شک یہ قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا ہے۔ تو تم ان حرفوں میں سے جو آسان معلوم ہو اس پر پڑھ لیا کرو۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں بروایت ابو شامہ بعض مشائخ سے نقل کیا ہے۔

قال انزل القرآن اولا بلسان قریش و من جاورھم من العرب الفصحاء ثم ابیح للعرب ان یقرءوا بلغاتھم التی جرت عادتھم باستعمالھا علی اختلافھم فی الالفاظ و الاعراب ولم یکلف احد منھم الانتقال من لغتہ الی لغتہ للمشقۃ ۔

فرمایا قرآن کریم پہلے لغت قریش پر نازل کیا تھا اور پھر ان قبائل عرب کے لغات پر جو فصحائے عرب میں سے ان کے پڑوسی تھے مگر بعد میں ان کو اس بات کی اجازت دے دی گئی کہ وہ ان لغات پر بھی تلاوت کر لیا کریں جن کا استعمال ان میں جاری اور معتاد ہے۔ الفاظ و اعراب میں اختلاف اور فرق کے ساتھ۔ اور ان میں سے کسی ایک کو مجبور نہیں کیا گیا کہ ایک دوسرے کے لغت کی طرف منتقل ہو مشقت کے خیال سے۔

بہرکیف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس طرح کی اجازت و رخصت

؎ صحیح بخاری و صحیح مسلم۔

حاصل ہو جانے کی وجہ سے بہت سی آیات متعدد لغات اور مختلف قراتوں کے ساتھ تلاوت کی جانے لگیں۔ جب اس اختلاف قرأت کی کیفیت کے ساتھ قرآن مختلف بلاد اور علاقوں میں پہنچا تو یہ چیز باہمی اختلاف کا سبب بن گئی اور حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ اس صورت اختلاف کو دیکھ کر گھبرا گئے اور ان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ اختلاف آئندہ چل کر تورات و انجیل میں یہود و نصاریٰ جیسے اختلاف کی صورت نہ اختیار کر جائے اور کوئی تعجب نہیں اس طرح گروہ بندیاں اور امت میں تفرق واقع ہو جائے اور ایک گروہ دوسرے کی تردید و تضلیل پہ آمادہ ہو جائے جو یقیناً ایک عظیم فتنہ اور امت مسلمہ پہ حادثہ ہوگا۔ اس وجہ سے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر صورت حال عرض کی اس پر انہوں نے زید بن ثابت کے زیر اہتمام ایک جماعت کو مامور فرمایا کہ قرآن کو لغت قریش پر جمع کیا جائے کیونکہ قرآن دراصل لغت قریش ہی پر نازل ہوا ہے۔

صحیح بخاری میں انس رضؓ بن مالک سے روایت ہے:

ان حذیفۃ بن الیمان رضؓ قدم علی عثمان و کان یغازی[2]	کہ حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس واپس پہنچے

---

[1] صحیح البخاری باب فضائل القرآن۔

[2] علامہ کرمانی شارح صحیح بخاری، یغازی کا فاعل عثمان رضی اللہ عنہ کو قرار دیتے ہیں تو اس صورت میں لفظ یغازی یُغزّی کے معنی میں ہوگا۔ مراد یہ کہ جہاد کی تیاری کر رہے تھے۔ دوسرے بعض شارحین حدیث یغازی کا فاعل حذیفہ کو بیان کرتے ہیں تو اس تقدیر پہ مراد یہ ہوگی کہ اس غزوہ کی شرکت کے بعد حذیفہ جب حضرت عثمان کی خدمت میں واپس پہنچے تو انہوں نے یہ صورت حال جو اختلاف قرأت کی دیکھی تھی۔ اپنی اس پریشانی اور اندیشہ کے ساتھ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کی اور عرض کیا اے امیر المومنین اس امت کی خبرگیری فرمایئے ایسا نہ ہو کہ یہ بھی یہود و نصاریٰ کی طرح اپنی کتاب میں اختلاف کرنے لگیں۔ ۱۲

اهل الشام فی فتح آرمینیة وآذربیجان مع اهل العراق فافزع حذیفة اختلافهم فی القراٰۃ فقال حذیفة لعثمانؓ یا امیرالمؤمنین ادرك هذه الامة قبل ان یختلفوا فی الکتاب اختلاف الیهود والنصاریٰ فارسل عثمانؓ الیٰ حفصة ان ارسل الینا بالصحف[1] ننسخها بالمصاحف

جس زمانہ میں کہ وہ غزوہ کر رہے تھے۔ اہل شام اور اہل عراق کے ساتھ فتح آرمینیہ و آذربیجان کے معرکہ میں تو حذیفہ کو بے چین و مضطرب کیا تھا، قرأت قرآن میں ان کے باہمی اختلاف نے۔ حذیفہ نے حضرت عثمانؓ سے عرض کیا اے امیر المومنین خبر لیجیے، اس امت کی قبل اس کے کہ وہ اپنی کتاب میں اختلاف کرنے لگیں یہود و نصاریٰ کے اختلاف کی طرح تو حضرت عثمانؓ نے

---

[1] مصحف اور صحیفہ: یہ الفاظ جب مفسرین کے یہاں استعمال کیے جاتے ہیں تو ان کا ایک اصطلاحی مفہوم معتبر ہوتا ہے۔ لفظ مصحف کی جمع مصاحف ہے اور صحیفہ کی جمع صحف اور صحائف آتی ہے۔ مصحف وہ کتاب یا مجموعہ ہے جس میں متعدد رسائل اور اوراق (صحیفے) جمع ہوں۔ جیسے کہ قرآن کریم کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ "فی صحف مکرمة مرفوعة" اور ارشاد ہے "ان هذا لفی الصحف الاولیٰ صحف ابراهیم وموسیٰ" مفسرین کی اصطلاح میں لفظ "مصحف" کا اطلاق قرآن کریم کے واسطے مخصوص ہے۔

شیخ سیوطیؒ بحوالہ کتاب "المصاحف" فرماتے ہیں کہ ابوبکرؓ کے زمانہ میں قرآن کریم جب جمع کیا گیا تو اس کے نام کی تجویز و تعیین میں اختلاف ہوا۔ کسی نے کہا سِفر (کتاب) نام مناسب ہے لیکن یہ نام چونکہ یہودی کتاب توراۃ کے حصّوں کے لیے مستعمل تھا۔ اس وجہ سے پسند نہ کیا گیا۔ پھر عبداللہ بن مسعودؓ یا سالم مولیٰ ابی حذیفہ نے بتایا کہ میں نے حبشہ میں اہل حبشہ کو اس طرح کی کتاب کو مصحف کہتے ہوئے سنا ہے۔ حضرات صحابہؓ کو یہ عنوان پسند آیا اور اسی کو باتفاق رائے قرآن کریم کا نام مقرر کیا گیا لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وجہ تسمیہ کے لیے اہل لغت عرب ہی سے اس کا اشتقاق قرار دیتے ہوئے کہا جائے کہ یہ لفظ [باقی اگلے صفحہ]

ثم نردها إليك فأرسلت	حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس پیغام
بها حفصة إلى عثمان. فأمر	بھیجا کہ آپ ہمارے پاس قرآن کریم کے
زيد بن ثابت وعبد الله	نوشتہ صحیفے اور اجزاء بھیج دیں ہم ان کو
بن الزبير وسعيد بن	نقل کرلیں گے۔ مصاحف میں اور پھر
العاص وعبد الرحمن بن	ان اجزاء اور اوراق کو (جو صدیق اکبر رضی
الحارث بن هشام فنسخوها	کے زمانہ میں لکھے گئے تھے) آپ کی
في المصاحف وقال عثمان	طرف لوٹا دیں گے۔ حضرت حفصہؓ نے
للهط القرشيين الثلثة	وہ صحیفے عثمان غنیؓ کے پاس بھیج دیئے
إذا اختلفتم أنتم وزيد	تو عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مامور فرما دیا
بن ثابت في شيئ من القرآن	زید بن ثابت عبداللہ بن زبیر سعید بن العاص
فاكتبوه بلسان قريش فإنما	اور عبدالرحمن بن الحارث بن ہشام کو (کہ
انزل بلسانهم ففعلوا حتى	وہ ان صحیفوں کو نقل کریں جو ابوبکر صدیقؓ
إذا نسخوا الصحف في المصاحف	کے زمانہ میں کتابت کیے گئے تھے) تو ان حضرات
رد عثمان الصحف إلى حفصة	نے ان صحیفوں کو دوسرے مصاحف میں نقل کیا
وارسل إلى كل افق بمصحف	اور حضرت عثمانؓ نے جماعت قریش کے تینوں
مما نسخوا وامر بما سواه	افراد (یعنی عبداللہ بن الزبیرؓ سعید بن العاصؓ
من القرآن في كل صحيفة	اور عبدالرحمنؓ بن الحارث کو یہ فرمایا کہ جب تم

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) اصحاف کا صیغہ اسم مفعول ہے، جس کا مادہ صحف اور اسکی جمع صحیفہ ہے اور صحیفہ کے معنی چونکہ ورق کے ہیں تو اصحاف اوراق منتشرہ جمع کرنے کو کہا جائے گا تو قرآن کریم کا نام مصحف اسی لحاظ سے ہوا کہ وہ تمام سورتوں اور ان اوراق منتشرہ کو جامع ہے جن پر آیات قرآنیہ کتابت کی گئی تھیں۔ چنانچہ لغویین کا مقولہ ہے اور صاحب لسان العرب کہتے ہیں۔ المصحف الجامع للصحف المكتوبة۔ ۱۲۔

او مصحف ان یحرق قال ابن شہاب فاخبرنی خارجة بن زید بن ثابت انه سمع زید بن ثابت قال فقدت آیته من الاحزاب حین نسخنا المصحف وقد کنت اسمع رسول الله صلی الله علیه وسلم یقرء بها فالتمسناها فوجدناها مع خزیمة بن ثابت الانصاری۔

من المؤمنین رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه فالحقنا فی سورتها فی المصحف۔

اور زید بن ثابت قرآن کریم کی کسی آیت میں اختلاف کرو (یعنی اس کے تلفظ میں) تو پھر اس کو لغت قریش پر لکھنا کیونکہ قرآن لغت قریش ہی پر نازل ہوا ہے۔ چنانچہ ان حضرات نے اسی پر عمل کیا۔[1] یہاں تک کہ جب یہ حضرات ان صحیفوں کو نقل کر چکے (جو ابوبکر رضہ کے زمانہ میں لکھے گئے تھے) تو حضرت عثمان نے ان (اصل) صحیفوں کو حضرت حفصہ کی طرف واپس لوٹا دیا۔ اور ہر علاقہ میں ایک ایک مصحف (نسخہ قرآن کریم) روانہ فرمایا۔ ان نسخوں میں جو ان حضرات نے نقل کیے تھے۔ اور یہ حکم فرما دیا کہ ان کے علاوہ جو مجموعے اور صحیفے (لوگوں کے پاس قرآن کریم کے مکتوب) ہیں،

---

[1] امام بخاری اور ترمذی نے ابن شہاب زہری کا یہ قول نقل کیا کہ اس زمانہ میں یعنی جب کہ جمع قرآن میں مصروف تھے۔ آیت "ان یاتیکم التابوت" (البقرہ) میں اختلاف ہوا کہ لفظ تابوت تائے مستطیل کے ساتھ کتابت کیا جائے یا تائے مدور کی شکل میں جو حالت وقف میں ھا پڑھی جائے یعنی التابوة لکھا جائے تو یہ اختلاف حضرت عثمان رضہ کی خدمت میں پیش کیا گیا فرمایا گیا اس کو تائے مستطیل کے ساتھ لکھو یعنی التابوت کیونکہ لغت قریش میں یہ لفظ اسی طرح ہے۔ اور قرآن قریش ہی کی لغت پر نازل ہوا ہے۔ (قرطبی ج ۱۔ ص ۵۱)

ان کو جلا دیا جائے کیونکہ ان مجموعوں میں حضرت صحابہؓ نے اکثر و بیشتر وہ سورتیں لکھی تھیں جو ان کو یاد تھیں یا بطور ورد وہ ان کی تلاوت کرتے تھے۔ جن میں اصل مصحف قرآنی کی ترتیب کا بھی التزام ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔ تو ان کو جلا دینے کا حکم دے دیا تاکہ کوئی اختلاف پیدا نہ ہو سکے۔

ابن شہاب بیان کرتے ہیں مجھے خارجہ بن زید بن ثابت نے بتایا کہ انہوں نے زید بن ثابت سے سنا فرماتے تھے کہ جس وقت ہم مصاحف قرآنیہ نقل کر رہے تھے تو سورۃ احزاب کی ایک آیۃ ہم کو نہ ملی جس کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تلاوت کرتے ہوئے سنا کرتا تھا تو اس کو ہم نے تلاش کیا۔

تلاش کرنے پر وہ آیت ہمیں خزیمۃ بن ثابت انصاریؓ کے پاس سے ملی وہ آیت،

"من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ" تھی تو ہم نے یہ آیت مصحف قرآنی میں اسی سورۂ احزاب کے ساتھ لاحق کر دی۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں قرآن کریم کی جمع و تدوین کا یہ تیسرا دور تھا۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا یہ جمع ۲۴ھ کے اواخر اور ۲۵ھ کے اوائل میں تھا اور یہی وہ وقت تھا جب کہ آرمینیہ فتح ہوا۔

نقل مصاحف کے بعد حضرت عثمانؓ نے قرآن کریم کے نسخے بلاد مفتوحہ کے مختلف اور اہم علاقوں میں بھیج دیئے۔ مشہور یہ ہے کہ پانچ نسخے نقل کرائے گئے تھے۔ ابن ابی الدنیا ابوحاتم السجستانی سے یہ روایت کرتے ہیں کہ سات نسخے نقل کرائے گئے اور ان بلاد میں ان کو بھجوایا۔ مکہ مکرمہ۔ شام۔ یمن۔ بحرین۔ بصرہ۔ کوفہ اور ساتواں نسخہ مدینہ منورہ میں محفوظ رکھا۔[۱]

صدیق اکبر اور عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت میں جمع و تدوین کا فرق

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمع قرآن کی نوعیت تو واضح ہے اور فرق ظاہر ہے وہ یہ کہ متفرق اور منتشر جگہوں پر لکھی ہوئی آیات کو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت و تعلیم کی ترتیب کے مطابق جمع کیا۔ جن آیات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کاتبین وحی سے کتابت کرا چکے تھے۔ اب اس کے بعد ابوبکر صدیق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہما کے جمع میں کیا فرق ہے؟ علامہ ابن التین اور اکثر ائمہ مفسرین بیان کرتے ہیں کہ ابوبکرؓ نے تو قرآن جمع فرمایا تھا اس اندیشہ سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قرآن کا کچھ حصہ قراء و حفاظ کے اس عالم سے گذر جانے کی وجہ سے ضائع نہ ہو جائے لیکن عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جب بعض آیات کی تلاوت میں اختلاف دیکھا اور یہ محسوس کیا کہ کہیں یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے باہمی نزاع اور امت میں تفرقہ کا سبب نہ بن جائے اور یہ سمجھا کہ ابتداء اسلام میں مجبوری کے باعث جو لغات کا توسع کیا گیا تھا وہ عارضی رخصت و اجازت تھی اب اس کی ضرورت نہیں رہی اور یہ اختلاف کتاب اللہ میں امت کے حق میں یقیناً ایک عظیم فتنہ ہے اس لیے ان تمام لغات کو جو بطریق

---

[۱] فتح الباری ج ۹ ص ۱۸ الاتقان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۶۰

رخصت و اجازت بعض آیات میں پڑھا دیئے گئے تھے، منسوخ کرکے صرف لغت قریش پر جمع فرمایا کیونکہ اصل قرآن اسی لغت پر نازل ہوا تھا۔[۱]

ابن ابی الدنیا نے بروایت سوید بن غفلہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا فرمایا کرتے تھے، اے لوگو! تم عثمانؓ کے بارہ میں خیر کے سوا اور کچھ مت کہو (مسئلہ جمع قرآن میں) خدا کی قسم انہوں نے جو کچھ کیا وہ ہم سب کے مشورہ اور اتفاق رائے سے کیا ہے کہ زائد لغات کو منسوخ کرکے صرف اصل لغت قریش پر قرآن کو جمع فرما دیا کیونکہ مجھے خوب معلوم ہے کہ اس اختلاف قرات کی صورت میں ایک دوسرے کو یہ کہنے لگا ہے کہ میری قرأت تیری قرأت سے بہتر ہے، اور میں جو کچھ پڑھتا ہوں وہی صحیح ہے۔ دوسرا یہ کہتا ہے کہ نہیں۔ میں جو کچھ پڑھتا ہوں وہی صحیح ہے اور اس طرح ایک دوسرے کی تردید پر آمادہ ہے تو یہ فتنہ قریب تھا کہ ہمیں کفر تک پہنچا دے تو اس چیز کے پیش نظر ہم نے خود حضرت عثمانؓ سے عرض کیا تھا جس پر انہوں نے فرمایا تھا کہ اگر لوگوں کو ایک ہی مصحف یعنی ایک قرأت پر جمع کر دیا جائے تو پھر کوئی اختلاف باقی نہ رہے گا۔ یہ سن کر ہم سب نے کہا بس یہی بہتر خیال ہے جو آپ نے قائم فرمایا۔[۲]

حافظ بدرالدین عینیؒ نے شرح بخاریؒ باب جمع القرآن میں بروایت عمارۃ بن غزیہ بیان کیا ہے:

ان حذیفۃ قدم من غزوۃ	کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ایک غزوہ
فلم یدخل بیتہ حتی اتیٰ	سے واپسی ہوئی تو وہ واپس آتے ہی
عثمان فقال یا امیرالمؤمنین	اپنے گھر نہیں داخل ہوئے تا آنکہ حضرت
ادرک الناس قال و ما ذاک	عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے،
قال غزوت آرمینیۃ فاذا	اور عرض کیا اے امیرالمؤمنین لوگوں کی

---

[۱] الاتقان ج ۱ ۔ [۲] الاتقان ج ۱۔

[۳] عمدۃ القاری ج ۹ باب جمع القرآن ص ۲۰

اهل الشام یقرءون بقراءۃ ابی بن کعب فیاتون بما لم یسمع اهل العراق واذا اهل العراق یقرءون بقراءۃ عبد اللہ بن مسعود فیاتون بما لم یسمع اهل الشام فیکفر بعضهم بعضا ۔ (انتہی)	ترجمہ:۔ عثمان غنیؓ نے فرمایا اور کیا بات ہے یہ ؟ تو کہا میں نے فتح آرمینیہ کے لیے غزوہ کیا تو (لوگوں کے حالات دیکھنے پر) یہ معلوم ہوا کہ اہل شام ابی بن کعب کی قرأت پر پڑھتے ہیں تو ایسی تلاوت کرتے ہیں جو اہل عراق نے نہیں سنی اور دیکھتا ہوں کہ اہل عراق ابن مسعودؓ کی قرأت پر پڑھتے ہیں تو اس طرح پڑھتے ہیں کہ اس کو اہل شام نے نہیں سنا ہے تو (اس اختلاف کی وجہ سے) ایک دوسرے کی تکفیر کرتا ہے ۔

حافظ عینی اس روایت کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جمع عثمانی کا یہی سبب تھا۔ اور یہی فرق ان کے اور صدیق اکبر کے زمانہ میں جمع کا تھا۔ کیونکہ جو صحیفے اور اوراق منتشرہ ابوبکر کے زمانہ میں لکھے گئے تھے عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بالترتیب تمام قرآن ایک مصحف (مجلد و مجموعہ) میں جمع کیا اور لغت قریش کے علاوہ دوسرے تمام لغات منسوخ کر دیئے۔

نیز عمارۃ بن غزیہ کی روایت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ابوبکر صدیقؓ کے قرآن کریم کی جمع و تدوین میں ان تمام حروف اور وجوہ کو جن پر قرآن نازل ہوا اور ان لغات کو بھی جمع کر دیا گیا تھا جن کی رخصت و اجازت دی گئی تھی جمع کر دیا گیا تھا جس کے باعث باہمی اختلاف کی صورت پیدا ہونی شروع ہوگئی اور کبار صحابہ اس کو دیکھ کر گھبرا گئے تو عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ارادہ کیا کہ ان زائد لغات اور وجوہ کو اصل لغت سے جدا کر کے صرف لغت قریش پر ہی قرآن کو جمع کیا جائے، اور مصحف صدیقی سے ان زائد لغات کو جدا کر دیا جائے ۔ چنانچہ حافظ بدرالدین عینی نے

شرح بخاری ج ۸ ص ۶۵۵ میں فرمایا :

وَانّما فعل عثمان هٰذا ولم يفعله الصّديق لان غرض ابي بكر كان جمع القرآن بجميع حروفه ووجوهه التي نزل بها وهي لغة قريش وغيرها. وكان غرض عثمان تجريد لغة قريش من تلك القراءات وقد جاء ذٰلك مصرحاً في قول عثمان لهٰؤلاء الكتّاب فجمع ابوبكر غير جمع عثمان [1]

"یعنی یہ جو کچھ عثمان غنیؓ نے کیا کہ لغت قریش کے علاوہ دیگر لغات قرآن سے حذف کر دیئے۔ یہ عثمانؓ کے زمانہ کا جمع تھا۔ یہ صورت ابوبکرؓ نے نہیں کی تھی کیونکہ ابوبکرؓ کی غرض تو قرآن کریم کا جمع کرنا تھا۔ ان تمام وجوہ اور لغات کے ساتھ جن پر قرآن نازل ہوا (اور اس کی تلاوت کی اجازت دی گئی) اور وہ لغت قریش اور اس کے علاوہ دوسرے لغات بھی تھے۔ اور حضرت عثمانؓ کی غرض یہ تھی کہ لغت قریش بقیہ لغات سے جدا کر دیا جائے چنانچہ خود اس بات کی تصریح حضرت عثمانؓ کے قول میں موجود ہے جو انہوں نے کاتبین وحی کو فرمایا تھا۔ تو ابوبکرؓ کا جمع کرنا اور تھا اور عثمانؓ غنی کا جمع کرنا اور تھا۔"

حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ نے ازالۃ الخفا میں خلفائے راشدین کی خلافت راشدہ کے وجوہ و دلائل کے ذیل میں فرمایا۔

قرآن کریم کی جمع و ترتیب اور حفاظت کا حق تعالیٰ نے ذمہ خود لیا تھا اور وعدہ فرمایا تھا اِنّ علینا جمعه وقرآنه اور انّا نحن نزلنا الذکر و انّا له لحافظون کہ ہم نے ہی اس قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں لیکن اس وعدہ الٰہیہ کا ظہور اور حفاظت الٰہیہ کا طریق اس طرح منظور نہ تھا کہ جس طرح انسان (مادی حفاظتوں کے اسباب و وسائل سے) اپنے سامان اور متاع کی حفاظت کرتا ہے اور نہ یہ وعدہ اس طرح ظہور پذیر ہوا کہ قرآن کسی پتھر پر

---

[1] عمدۃ القاری ج ۸ صفحہ ۶۵۵ ۔ [2] ازالۃ الخفاء جلد اول ۔

گندہ ہوجاتا جو مٹانے سے نہ مٹ سکے بلکہ مشاہدہ سے معلوم ہوا کہ حفاظت خداوندی کا ظہور اس طرح ہوا کہ چند بندگان صالحین کے قلوب میں ڈالا گیا کہ وہ اس کی جمع وتدوین کی خدمت انجام دیں اور تمام دنیا کے مسلمان ایک نسخہ قرانی پر متفق ہوجائیں اور جماعات عظیم اس کی تلاوت وتعلیم میں مشغول رہیں تاکہ سلسلۂ تواتر نہ ٹوٹ جائے اور تکمیل اس کی اس طرح ظہور میں آئی کہ عہد عثمانی میں بمشورہ و اجماع صحابہ تمام مصاحف میں سے ایک مصحف پر اتفاق کیا گیا۔ جس میں قرأۃ شاذہ نہیں لی گئی بلکہ قرأۃ متواترہ لی گئی اور قبائل عرب کی سات زبانوں (یعنی سبع لغات) میں سے جن پر قرآن نازل ہوا (اور اس کے پڑھنے کی اجازت دے دی گئی تھی ان لوگوں کو جو لغت قریش کے پڑھنے سے عاجز ہوں) ایک لغت قریش کا لے لیا گیا اور باقی لغات کے مصاحف متروک کردیئے گئے۔

(ازالۃ الخفاء ج ۱)

الغرض یہ تیسری مرتبہ قرآن کریم کے جمع و تدوین کی تفصیل ہے جس میں انہوں نے لغت قریش کے علاوہ جو لغات عارضی اور وقتی طور پر تلاوت کرادیئے گئے تھے ان کو منسوخ کرکے کاتبین وحی کی جماعت کی نگرانی و انتظام میں قرآن کریم جمع کرایا اور متعدد نسخے نقل کراکر مختلف علاقوں اور مراکز کی طرف بھیجے پھر انہی بھیجے ہوئے چھ نسخوں سے تمام بلاد میں ہزارہا نسخے پھیل گئے۔ اور اشاعت قرآن کا یہ سلسلہ اس قدر وسیع ہوا کہ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں رہا کہ وہاں قرآن کریم کے نسخے نہ پہنچے ہوں۔ اسی اہتمام و اشاعت کی بنا پر جو دور عثمانی میں ہوئی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جامع القرآن کے لقب سے معروف ہوئے ورنہ نفس جمع تو صدیق اکبر کے زمانہ میں ہوچکا تھا اور وہ اصل نسخہ جو انہوں نے مرتب کرایا تھا اس اُمّ (یعنی مصاحف قرآنیہ کی اصل و بنیاد) کہا گیا اور اسی مصحف کو امام قلبی کہا جاتا ہے تو نزول قرآن کے وقت سے لے کر امت کے درمیان نشر و اشاعت کے دور تک کی یہ جمع و تدوین کی تفصیل ہے جس سے ظاہر ہے کہ ہر مرحلہ پر ایسے

اعتماد و وثوق کے ساتھ قرآن کریم کی کتابت اور جمع و تدوین ہوئی کہ ان تاریخی تفاصیل کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کا امکان نہیں رہتا کہ یہ تصور کیا جاسکے کہ شاید کوئی حرف قرآن کریم کا ضائع ہوگیا ہوگا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اس مصحف کو جس کو امام کہا جاتا ہے، کی پشت پر یہ عبارت لکھی تھی ھذا ما اجمع علیہ جماعۃ من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ یہ وہ نسخہ قرآن ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی جماعت نے اجماع و اتفاق کیا ہے۔ اور تاریخی نقول سے ثابت ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اسی نسخہ سے نقلیں کیں۔ اور اپنے خدام کے ذریعے بکثرت نقول کتابت کرائیں تو گویا وہ تمام نسخے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت اور نقل سے مسلمانوں کے پاس پہنچے۔ مصحف عثمانی کا جو نسخہ مدینہ منورہ میں رکھا گیا تھا ظاہر یہی ہے کہ حضرت عثمان اسی نسخہ میں تلاوت فرما رہے تھے جب باغیوں نے آپ پہ حملہ کیا اور آپ کے سینہ مبارک سے خون کا قطرہ سورۂ بقرہ پ الم کی آیت فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰه پر پڑا۔ شاہ عبدالعزیز نے تفسیر عزیزی میں اس واقعہ کے متعلق بیان کیا کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک پیشگوئی کے عین مطابق پیش آیا۔ یہ نسخہ عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد مدینہ منورہ میں بھی محفوظ رہا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں اس خون آلود نسخہ کی زیارت مدینہ منورہ میں نافع ابن ابی نعیم متوفی ۱۶۹ھ نے کی ہے۔

حافظ ابوعمرو نے مقنع میں بسند لکھا ہے کہ ابوعبیدہ قاسم بن سلام متوفی ۲۲۴ھ نے غلفار کے خزانوں میں سے حضرت عثمانؓ کا یہ نسخہ جس پر خون کا قطرہ تھا نکالا۔ اور میں نے اس کی زیارت کی۔ مورخ علامہ احمد مقری کا بیان ہے کہ میں نے یہ نسخہ ۱۰۲۵ھ میں مدینہ منورہ میں دیکھا تھا۔ پھر اندلس میں جس نسخہ کی زیارت کی اس میں اور مدینہ منورہ میں دیکھے ہوئے نسخہ میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا دونوں ایک قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس کی پشت پہ بھی کبار صحابہؓ کے نام اور یہ کہ یہ وہ

نسخہ ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے صحابہ نے اجماع اور اتفاق کیا ہے۔

سنہ ۶۵۴ھ میں مسجدِ نبوی میں رمضان کے پہلے جمعہ کی شب میں اتفاقاً جب آگ لگی تو مسجد میں رکھا ہُوا سب سامان جل گیا لیکن وہ قبہ صحن مسجد میں جو مصحف شریف کے لیے بنایا گیا تھا بالکل محفوظ رہا۔ اسی طرح سنہ ۸۸۶ھ میں بجلی گرنے کی وجہ سے مسجدِ نبوی کا اکثر حصہ جل گیا تھا لیکن حق تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ یہ نسخہ محفوظ رہا۔[1]

اہلِ مدینہ کا یہ معمول رہا کہ جب بھی کسی قحط یا بلاد وتکلیف پیش آتی اس مصحف شریف کو نکال کر پڑھتے تو اس تکلیف اور وبا سے نجات حاصل ہوجاتی۔

بعض مورخین کا بیان کچھ اس سے مختلف ہے۔ اور اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ نسخہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد وراثتاً بنو امیہ کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ اور مدینہ منورہ سے اس کو شام منتقل کردیا گیا اور پھر ان کی خلافت کے ساتھ دمشق سے منتقل ہوکر اندلس میں پہنچا۔ ایک یورپین مورخ سرولیم نے لکھا ہے کہ وہ نسخہ جامعہ قرطبہ میں موجود تھا جب اسلامی سلطنت کا وہاں سے زوال ہوا تو وہاں سے مراکش کے دارالخلافہ منتقل کردیا گیا۔ ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں جس نے ان بلاد کی سنہ ۷۲۷ھ میں سیاحت کی لکھا ہے کہ یہ مصحف شریف جامع بصرہ میں موجود ہے[2] اور اس پر خلیفہ کے خون کے دھبے اب تک موجود ہیں۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ روس کے قدیم دارالسلطنت ماسکو میں مسلمانوں نے ۱۹۲۰ء میں جب ایک کتب خانہ قائم کیا اور اس کے واسطے بخارا سے کتابیں لائی گئیں تو ان میں یہ مصحف امام موجود تھا۔ لیکن اس بیان کی کسی معتبر سند سے تصدیق نہیں ہوسکی اور یہ بھی پتہ چلا کہ یہ نسخہ دمشق اور قرطبہ کے بعد منتقل ہوکر ترکستان پہنچ گیا اور وہاں کے دارالسلطنت میں محفوظ ہے بعض مورخین نے لکھا ہے معلوم نہیں یہ قرآن کس زمانہ میں قرطبہ پہنچا۔ پھر خلیفہ عبدالمؤمن اس کو قرطبہ سے اپنے دارالسلطنت میں بڑے تزک و احتشام سے لے کر آیا۔

---

[1] بحوالہ تاریخ المصاحف ۔ [2] بحوالہ تاریخ المصاحف ص ۱۲

قرآن کریم سات حرفوں پر نازل کیے جانے کا مفہوم

انزل القرآن علی سبعۃ احرف کہ قرآن سات حرفوں پر نازل کیا گیا کا مفہوم کیا ہے؟ شارحین حدیث کے یہاں یہ بحث معرکۃ الآراء واقع ہوئی ہے۔ ابن حبان نے بیان کیا کہ ائمہ اور شارحین علماء نے تقریباً ۳۵ اقوال نقل کیے ہیں۔ خلیل ابن احمد سے منقول ہے کہ سات حرفوں سے قراء سبعہ کی سات قرائتیں مراد ہیں، لیکن دوسرے ائمہ اس مراد سے اختلاف کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ قول ضعیف ہے۔ یہ ایک تفصیلی بحث ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ جمہور کے نزدیک سبعۃ احرف سے قبائل مختلفہ کے وہ سات لغات مراد ہیں جو متقارب المعنی ہوں جیسے اَقْبِلْ تَعَالَ اور هَلُمَّ وغیرہ۔

حافظ فضل اللہ تورپشتی نے بیان فرمایا کہ حرف کے معنی لغت میں طرف کے آتے ہیں تو سبعۃ احرف کا مفہوم اطراف اللغۃ العربیہ ہوا تو آپ کے ارشاد مبارک کے معنی یہ ہیں کہ لغات عرب میں سے سات لغات پر قرآن نازل کیا گیا۔ اور یہ سات لغات یہ ہیں قریش۔ ثقیف۔ طی۔ ہوازن و بکر۔ تمیم۔ ازد و ربیعہ اور لغت اہل یمن۔[1] کہ ان سات لغات پر قرآن کی تلاوت کی اجازت دی گئی۔ جب کہ الفاظ مترادف ہوں۔ اور بلا کسی تفاوت ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی امت کی طرف مبعوث فرمائے گئے تھے جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھی اور ایسی صورت میں یہ بات بہت متوقع تھی کہ مثلاً کسی ایسے شخص کو جو ہوازن یا قبیلہ ثقیف کا ہو اس کو کوئی لغت قریش پڑھنا ممکن نہ ہو جیسے بعض صحابہ جو قریش کے بعض لغات کا تلفظ نہ کر سکتے تھے ان کو جب

---

[1] التعلیق الصبیح ج ۱۔

آپ نے سورۃ القارعہ میں یوم یکون الناس کالفراش المبثوث و تکون الجبال کالعھن المنفوش پڑھایا تو ان سے لفظ عھن جس کے معنی صوف اور اون ہیں اور لفظ منفوش جس کے معنی بکھیرے ہوئے ہیں ادا نہ ہوسکا تو آپ نے اس کے مترادف لفظ الصوف اور المندوف کے ساتھ یہ آیت اس طرح پڑھائی وتکون الجبال کالصوف المندوف۔

سفیان بن عیینہ عبداللہ بن وہب طبری اور امام [illegible] سے بھی منقول ہے۔ امام ابوعبید اور ثعلب اسی کے قائل ہیں اور ابن درید نے ابوحاتم سے اسی کو نقل کیا۔ اور امام بیہقی نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ اس بارہ میں سب سے زائد واضح اور صریح چیز وہ ہے جو حدیث ابوبکرہ سے ثابت ہے:

قال جاء جبریل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال اقرء علی حرف. قال میکائیل استزدہ فقال اقرء علی حرفین فقال میکائیل استزدہ حتی بلغ سبعۃ احرف فقال اقرء فکل شاف وکاف. الا ان تخلط آیۃ رحمۃ بآیۃ عذاب او آیۃ عذاب بآیۃ رحمۃ علی نحو ھلم و تعال واقبل واذھب واسرع وعجل. و کذا رواہ عن ابی جحیم	کہ جبرئیل امین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا پڑھیے ایک حرف پر۔ میکائیل نے کہا ان کے لیے اضافہ کرو تو کہا پڑھیے دو حرفوں پر میکائیل نے پھر کہا ان کے واسطے اضافہ کرو تو اضافہ کیا یہاں تک کہ سات حرفوں کے اضافہ تک پہنچ گئے اور کہا کہ ان پر پڑھیے (یعنی امت کو ان حروف پر پڑھایئے جو ایک حرف اور لغت قریش پر پڑھنے سے عاجز ہوں) ہر ایک حرف ان میں کافی اور شافی ہے۔ بجز اس کے کہ کوئی آیت رحمت کسی آیت عذاب سے مخلوط ہو جائے یا آیت عذاب آیت رحمت سے[1]

[1] التعلیق الصبیح ج ۱۔

عن مجاھد عن ابن عباس عن ابی بن کعب انہ کان یقرء للذین آمنوا انظرونا للذین آمنوا امھلونا للذین آمنوا اخرونا ۔ للذین آمنوا ارقبونا ۔

مخلوط ہو جائے ۔ مثلاً تعالیٰ ھَلُمَّ اور اَقْبِل (کہ یہ الفاظ متعدد ہیں لیکن معنی سب کے ایک ہی ہیں) اور مثل اِذْھَبْ اَسْرِعْ اور عَجِّل (کہ ان سب کے معنی عجلت کرو کے ہیں) ورقا بن ابی نجیح ابن عباس سے بیان کرتے ہیں کہ ابی بن کعبؓ (سید القرأ) آیت للذین آمنوا انظرونا کو امھلونا اور اخرونا جیسے لفظوں سے پڑھنے کی اجازت دے دیتے تھے اور ان تینوں کے معنی یہی ہیں کہ ہمیں مہلت دو اس خیال پر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس رخصت و اجازت کے درجہ کو معلوم کیا ہوگا کہ اگر کوئی قبیلہ لغت انظرونا نہ پڑھ سکے تو اس کو اس کلمہ کے بجائے "امھلونا اور اخرونا" پڑھا دیا۔

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ ان مختلف لغات پر پڑھنے کی اجازت صرف ابتداً بعض ایسے لوگوں کو اس وجہ سے دی گئی تھی جن کو لغت قریش کا تلفظ ممکن نہ تھا ۔ مثلاً ہذیل کو یمن کا لغت دشوار تھا مگر الفاظ کی یہ وسعت صرف اسی حد تک تھی معنی متحد اور یکساں رہیں ۔ اس رخصت و اجازت کا سلسلہ جاری رہا تا آنکہ لوگوں کے باہمی میل جول اور تعلقات و روابط کے زائد ہو جانے کی وجہ سے ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کے لغات پر قادر ہو گیا اور حتیٰ کہ تمام لغات کا مرجع اور مدار نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لغت بن گیا اور اسی پر اصل قرآن کا نزول ہوا تھا تو باقی لغات کو

کو منسوخ کر دیا گیا، کیونکہ اب ان کی حاجت نہ رہی تھی اور ابتداء میں جن عاجز افراد کو دوسرے لغات کی اجازت دی گئی تھی، عذر و مجبوری ختم ہو جانے کی وجہ سے ان کے واسطے بھی گنجائش نہ رہی کہ وہ ان دیگر لغات پر تلاوت کر سکیں[2]۔ یہی وہ تدوین و جمع قرآن تھا جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوا، کہ جن لغات متعددہ کی بعض آیات میں اجازت تھی ان سے مصحف قرآنی کو مجرد کر کے صرف اصل لغت قریش ہی پر جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عموماً حضرات صحابہؓ تلاوت کرتے تھے، قرآن جمع فرمایا ہے[1]۔

جزاہ اللہ تعالیٰ عنا وعن سائر المسلمین خیر الجزاء

---

[1] احکام القرآن للقرطبی ج ۱ ص ۴۳

[2] حافظ ابو عمرو ابن عبدالبر نے فرمایا، بہرحال یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ سات حرفوں کی اجازت ایک مخصوص اور محدود وقت اور خاص ضرورت و مجبوری کے باعث تھی تو جب وہ ضرورت و مجبوری ختم ہو گئی تو ظاہر ہے کہ اس وسعت و گنجائش کو بھی ختم ہو جانا چاہیے تھا چنانچہ عثمان غنیؓ نے اسی پر عمل کیا۔ (قرطبی)

کتابت قرآن اور کاتبین وحی

یہ بات تو ظاہر ہے کہ قوم عرب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل اُمّت امیہ تھی۔ علوم و فنون درس و تدریس اور کتابت سے بالعموم بے تعلق اور ناواقف تھے۔ قرآن کریم میں خود اس کی وضاحت ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ	وہ خداوندعالم ہے جس نے اُمیّوں میں
رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ	اپنا رسول مبعوث فرمایا جو ان پر اللہ
آيَاتِهِ الآية	کی آیتیں تلاوت کرتا ہے۔

لیکن قضا و قدر سے یہ طے تھا کہ اللہ رب العزت قرآن کریم کو کتابت و جمع و تدوین کی صورت سے محفوظ فرمائے گا اس وجہ سے قریش میں چیدہ چیدہ کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے فن کتابت سیکھا تھا اور اس میں خاصی مہارت حاصل کیے ہوئے تھے۔

بعض مورخین کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش مکہ نے کتابت حرب بن امیہ عبد شمس سے سیکھی تھی۔ ابن عباسؓ کی بعض روایتوں سے ایسا ہی ثابت ہوتا ہے۔ ان سے جب یہ دریافت کیا گیا تو انہوں نے یہی بتایا اور جب پوچھا گیا کہ حرب بن امیہ نے کس سے سیکھا فرمایا عبداللہ بن جدعان سے اور عبداللہ بن جدعان نے اہل انبار سے اور اہل انبار نے اہل یمن سے اور اہل یمن نے بعض واسطوں کے ذریعہ خلجان بن الموہم سے جو حضرت ہود علیہ السلام کے کاتب تھے[1]

کلبی کی روایت کا مضمون بھی اسی کے قریب ہے اور حرب بن امیہ کی چونکہ عراق میں تجارت کی غرض سے آمد و رفت تھی تو اس طرح عراق کی سرزمین سے یہ فن

---

[1] بحوالہ مناہل العرفان ج ۱ صفحہ ۳۵۵

اہلِ مکہ اور قریش میں پہنچا اور اہلِ مدینہ نے اہلِ کتاب اور یہود سے کتابت سیکھی۔
چنانچہ بعض روایات میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں ایک یہودی کو دیکھا کہ وہ بچوں کو کتابت اور لکھنا پڑھنا سکھاتا ہے۔ اور اہلِ مدینہ میں اس وقت دس حضرات سے زائد ایسے تھے جو فن کتابت میں پوری مہارت رکھتے تھے جن میں منذر بن عمرو۔ ابی بن وہب عمرو بن سعید اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم نمایاں تھے، اور زید بن ثابتؓ نے آنحضرت کے فرمان سے اہلِ کتاب اور یہود کی عبری زبان اور اس کی کتابت سیکھ لی تھی۔
بہرکیف اہلِ عرب میں کتابت کا فن اس طرح سے آچکا تھا اور اس کے کچھ ماہرین اہلِ مکہ اور قریش میں قرآن کریم کے نزول کے وقت موجود تھے۔

ابتداء وحی میں آیۃ اقرأ و ربک الاکرم الذی بالقلم علم الانسان مالم یعلم کا نازل ہونا اسی بات کی علامت ہے کہ قلم اور قلم کے ذریعے علوم کے انعامات کو اہلِ عرب پہچانتے تھے جس کو حق تعالیٰ شانہٗ کے دلائل قدرت کے سلسلہ میں بیان فرمایا گیا۔ نیز اسی طرح۔

"نٓ والقلم وما یسطرون" بھی اسی کی طرف مشیر ہے کہ عرب کے کچھ لوگ فن کتابت سے تعلق رکھتے تھے اور وہ لکھا کرتے تھے۔

انہی کاتبین میں سے ایک جماعت قرآن کریم کی کتابت کے لیے منتخب اور مخصوص کی گئی جو خاص اہتمام کے ساتھ وحی کی کتابت کرتی تھی۔ حضرات صحابہؓ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آیات قرآنیہ کی کتابت کا پورا پورا اہتمام فرماتے تھے۔ کاتبین وحی میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمانؓ غنی اور علیؓ بن ابی طالب کے علاوہ ابیؓ بن کعب معاذؓ بن جبل، ابوالدرداءؓ، ابوزیدؓ۔ زیدؓ بن ثابت۔ ثابتؓ بن قیس حنظلہؓ بن الربیع معاویہؓ بن ابی سفیان اور ابانؓ بن سعید بھی خاص طور پر کتابت پر مامور تھے۔

بعض مورخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ چالیس سے زائد صحابہؓ کی جماعت[1]

---

[1] الاتقان ج ۱ - مناہل العرفان ج ۱

کتابت پر مامور تھی۔

امام بخاریؒ نے بروایت قتادہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں (خاص طور پر) ان چار حضرات نے قرآن کریم جمع کیا جو سب کے سب انصار میں سے تھے۔ ابی بن کعبؓ، معاذ بن جبلؓ زید بن ثابتؓ اور ابو زیدؓ، غرض کاتبین وحی کی یہ جماعت جو کتابت میں مہارت رکھتی تھی۔ ہر وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ان میں سے کوئی نہ کوئی حاضر رہتا اور جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی حتیٰ کہ اگر صرف ایک ہی کلمہ نازل ہوتا تو آپ طلب فرما کر کتابت کرا دیتے تھے جیسے آیت لا یستوی القاعدون من المؤمنین میں لفظ غیر اولی الضرر بعد میں علیحدہ نازل ہوا تو اسی وقت آپ نے ایتونی بالکتف والدواۃ، کہ میرے پاس بکری کے شانہ کی چوڑی ہڈی اور دوات لے کر آؤ۔ اور زیدؓ بن ثابت کو طلب فرما کر فرمایا کہ لکھو من المؤمنین کے بعد لفظ غیر اولی الضرر تو اس ہڈی پر یہ لفظ لکھا۔ زیدؓ بن ثابت فرماتے تھے اس ہڈی پر ایک شگاف اور پھٹن تھی جس کے بعد یہ لفظ لکھنا پڑا تو وہ شگاف گویا میری نظروں کے سامنے ہے جو لفظ من المؤمنین اور غیر اولی الضرر کے درمیان واقع ہو گیا تھا۔[1]

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب بھی کوئی سورت نازل ہوتی تو آپ کاتبین وحی میں سے کسی کو فرما دیتے کہ اس کو فلاں جگہ پر رکھو (یعنی لکھ لو) جہاں یہ یہ مضامین و آیات ہیں۔ گویا مبدأ و منتہا بھی متعین فرما دیتے تھے۔[2]

انس بن مالک رضی اللہ عنہ[3] کی امام بخاریؒ نے یہ روایت نقل کی ہے:

قال مات النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ، و لم یجمع القرآن غیر اربعۃ ابوالدرداء ... — بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رحلت فرما گئے اور قرآن کریم چار آدمیوں کے

---

[1] صحیح بخاری باب جمع القرآن ۔ [2] مناہل العرفان ج ۔ الاتقان ۔ ۱۲
[3] صحیح بخاری ۔ ۱۲ ۔ [4] صحیح بخاری ج ۲ ۔ باب جمع القرآن ۔

ومعاذ بن جبل و زید بن ثابت وابوزید ونحن ورثناہ ۔	علاوہ کسی اور نے نہیں جمع کیا وہ ابوالدرداءؓ معاذ بن جبلؓ زید بن ثابت اور ابوزید ہیں جن کے (یعنی ابوزید) ہم وارث ہوئے ہیں ۔

یہ حدیث اپنے ظاہر الفاظ سے اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جمع قرآن صرف انہی صحابہؓ نے کیا ان کے علاوہ اور کسی نے جمع وکتابت نہیں کیا حالانکہ حضرات صحابہؓ کی ایک بڑی جماعت جو چالیس سے زائد نفوس پر مشتمل تھی وہ تو جمع وکتابت کی خدمت میں خاص طور پر مصروف رہتے تھے ۔ ان کے علاوہ بھی بکثرت ایسے صحابہؓ تھے جو جمع اور حفظ میں مشغول تھے ۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں احادیث صحیحہ سے یہ ثابت ہے کہ معرکہ یمامہ میں ستر حفاظ اور جامعین قرآن شہید کیے گئے ۔ اور یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے قریب ہی زمانہ میں پیش آیا تو یہ تعداد تو شہید ہونے والے حضرات کی ہے ۔ ظاہر ہے کہ جو حضرات باقی رہے ہوں گے وہ ان سے تعداد میں کہیں زائد ہوں گے ۔ نیز یہ کہ انس بن مالکؓ کی اس حدیث میں خلفاء اربعہ کا نام نہیں ہے حالانکہ یہ حضرات جامعین قرآن میں ہیں اور ان جیسے اکابر صحابہؓ سے یہ چیز مستبعد ہے کہ وہ اس فضیلت وخیر میں سبقت نہ کریں ۔

شیخ سیوطیؒ نے الاتقان میں اس حدیث کی متعدد توجیہیں قاضی ابوبکر الباقلانی سے نقل کی ہیں[1] جن کے بارہ میں حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں ۔ یہ احتمالات وتوجیہات تکلف سے خالی نہیں ۔ اصل مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ جمع قرآن کے سلسلہ میں ان چار حضرات کا حصر قبیلۂ خزرج کے لحاظ سے ہے کیونکہ انس بن مالک نے یہ بات اس وقت فرمائی جب کہ اوس اور خزرج میں باہم کچھ مفاخرت کی گفتگو چل رہی تھی جیسا کہ ابن جریر نے باسناد قتادہ انس بن مالکؓ سے روایت کیا ہے کہ اوس و خزرج باہم مفاخرت کرنے لگے ۔ قبیلہ اوس کہنے لگا ہمارا قبیلہ ایسا ہے کہ اس میں

[1] الاتقان ج ۱ ۔ ص ۷۴ ۔

چار آدمی ایسے ہوئے ہیں کہ ان میں سے ایک کے لیے تو اللہ کا عرش بھی متزلزل ہوگیا۔ وہ سعد بن معاذ ہیں۔ کسی کی شہادت دو کے برابر کردی گئی وہ خزیمہ بن ثابت ہیں۔ کسی کو ملائکہ نے غسل دیا وہ حنظلہ بن ابی عامر ہیں۔ اور کسی کو بعد شہادت ملائکہ آسمان پر لے گئے اور وہ عاصم بن ثابت ہیں۔ اس پر خزرج کے لوگ کہنے لگے ہم میں چار ایسے ہیں جنہوں نے قرآن کریم جمع کیا اور یہ نام بیان کیے۔ تو مراد یہ تھی کہ یہ فضیلت وسعادت ہمارے قبیلہ کو حاصل ہوئی نہ کہ قبیلۂ اوس کو لہٰذا اس تعبیر سے دیگر اکابر صحابہ مہاجرین سے جمع قرآن کی نفی اور انکار نہیں لازم آتا۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا" خدا کی قسم نبی کریمؐ کے صحابہؓ اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ میں ان سب میں کتاب اللہ کا سب سے زائد اعلم ہوں"۔ اور ان ہی سے حدیث میں یہ بھی روایت کیا گیا، قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کتاب اللہ کی جو بھی سورت نازل ہوئی میں جانتا ہوں کہ وہ کس جگہ اور مقام پر نازل ہوئی۔ اور جو بھی آیت نازل ہوئی اس کے متعلق بھی یہ علم ہے کہ وہ کہاں اور کس شخص کے بارہ میں اُتری۔ اور اگر میں کسی شخص کے بارہ میں یہ معلوم کروں کہ وہ مجھ سے زائد کتاب اللہ کا علم رکھتا ہے اس شخص تک اگر مجھ کو سواریاں پہنچا سکیں تو ضرور اس تک پہنچوں گا۔[1]

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں[2]، میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سُنا، آپؐ فرماتے تھے کہ قرآن کریم چار آدمیوں سے سیکھو، ان میں سب سے اوّل عبداللہ بن مسعودؓ کا نام ذکر کیا۔ پھر سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ۔ معاذ بن جبلؓ اور ابی بن کعب کے نام ذکر فرماتے۔ عبداللہ بن عمرو[3] فرماتے ہیں کہ میں نے قرآن کریم جمع کیا اور ساری رات پورے قرآن کی تلاوت کرتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپؐ نے فرمایا ہر مہینہ میں ایک ختم کر لیا کرو۔

---

[1] صحیح بخاری ابواب المناقب ۔ [2] سنن نسائی ۔ ۱۲ ۔

[3] صحیح بخاری ج ۲ ۔

روضۃ الاحباب میں ہے کہ چالیس صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے کتابت وحی پر مامور اور مقرر تھے۔ ان میں مشہور حضرات یہ ہیں:

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔ زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ۔ خالد بن سعید رضی اللہ عنہ۔ حنظلہ بن الربیع رضی اللہ عنہ۔ علاء رضی اللہ عنہ۔ خالد بن الولید رضی اللہ عنہ۔ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ۔ عبداللہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ۔ مغیرۃ بن شعبہ رضی اللہ عنہ۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔ معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ۔ جہم بن الصلت رضی اللہ عنہ۔ معیقیب رضی اللہ عنہ۔ عبداللہ بن ارقم الزہری رضی اللہ عنہ۔ ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ۔ حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ۔ عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ۔ عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ۔ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ۔ ابان بن سعید رضی اللہ عنہ وغیرہ من سائر اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم[1]

حافظ ابن حجر بروایۃ ابن ابی داؤد جامعین قرآن میں قیس بن ابی صعصعہ کا نام بھی ذکر کیا ہے جو خزرجی ہیں۔

شیخ سیوطیؒ نے الاتقان میں بیان کیا کہ جامعین قرآن میں ایک خاتون صحابیہ کا نام بھی معلوم ہوا ہے جس کو بالعموم محدثین نے نہیں بیان کیا۔ ابن سعد طبقات میں باسناد فضل بن دکین بیان کرتے ہیں کہ ولید بن عبداللہ بن جمیع نے بتایا کہ میری دادی ام ورقہ بنت عبداللہ بن الحارث جن کے یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گاہ بگاہ تشریف لے جایا کرتے اور ان کو شہیدہ کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ انہوں نے قرآن کریم جمع کیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت غزوہ بدر کے لیے تشریف لے جا رہے تھے تو انہوں نے عرض کیا تھا یا رسول اللہ کیا آپ مجھ کو

---

[1] تاریخ طبری۔ طبقات ابن سعد۔

اجازت دیں گے کہ میں آپ کے ساتھ بدر میں شریک ہوں اور میدان جہاد میں حاضر ہوں تاکہ زخمیوں کی مرہم پٹی اور بیماروں کی تیمارداری کروں۔ شاید اللہ تعالیٰ مجاہدین کی اس خدمت کی بدولت مجھے بھی شہادت کی نعمت عطا فرما دے۔ آنحضرت نے یہ سن کر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے تیرے واسطے شہادت کی نعمت طے کر دی۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اپنے گھر اور قبیلہ کی عورتوں کی امامت کرتی تھیں۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ان کے مدبر غلام اور جاریہ نے ان کو شہید کر ڈالا تھا۔ اس پر عمر فاروقؓ نے فرمایا صدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کو شہیدہ کا لقب عطا فرمانا پورا ہوگیا۔

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا یہ معمول تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب ان کو نازل شدہ آیات لکھواتے تو یہ دوسرے صحابہؓ کے پاس بھی لے جاتے اور ان کو بھی لکھوا دیتے تو اس طرح اصل کتابت شدہ ذخیرہ بہت سے حضرات صحابہؓ کے پاس جمع ہوگیا تھا۔ اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ اس کے بعد اسی سلسلہ سے حضرات صحابہ کثرت کے ساتھ مصاحف کی کتابت کر کے قرآن کریم کے نسخے اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے۔ روایات صحیحہ جن حضرات صحابہؓ کے لکھے ہوئے مصاحف معلوم ہوئے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

بروایت امام بخاریؒ مصحف ابوالدرداءؓ۔ معاذ بن جبلؓ۔ زید بن ثابتؓ ابوزیدؓ اور ابی بن کعبؓ۔

بروایت امام نسائی مصحف عبداللہ بن عمرؓ۔

بروایت دانی مصحف ابوموسیٰ اشعریؓ۔ عمرو بن العاصؓ سعد بن عبادہؓ[3]

بروایت صاحب التہذیب مصحف عبادۃ بن الصامتؓ

شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے حضرت عثمان کے مصحف کے ساتھ علیؓ بن ابی طالب

---

[1] الاتقان ج ۱ ص۔ [2] مجمع الزوائد ج۔ [3] بحوالہ خلاصۃ البیان۔

عبداللہ بن مسعود اور سالم مولی ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے مصاحف کا بھی تذکرہ کیا ہے۔(۱)

- صاحب کنزالعمال نے ابوایوب انصاری کے مصحف کا بھی ذکر کیا ہے۔ بعض مورخین کے بیان سے تمیم داری کے مصحف کا علم ہوتا ہے۔
- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک مصحف قرآن کامل موجود تھا۔(۲)
- ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھی ایک مصحف موجود تھا جو انہوں نے صرف اپنے واسطے کتابت کرایا تھا۔

کنزالعمال کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عقبہ بن عامر نے بھی پورے قرآن کی کتابت کی تھی۔

علامہ ابن حزم کا بیان ہے کہ خلیفۂ اوّل کے زمانہ میں کوئی شہر ایسا نہ تھا کہ جہاں لوگوں کے پاس قرآن کریم کے نسخے بکثرت موجود نہ ہوں۔(۳)

زید بن ثابت نے ایک نسخۂ قرآن خاص طور پر عمر فاروق کی تلاوت کے لیے لکھ کر ان کو دیا تھا۔ نیز عبداللہ بن عمر اور حضرت حفصہ کے پاس بھی قرآن کریم کے کامل نسخے لکھے ہوئے موجود تھے۔(۴)

علامہ ابن حزم نے بیان کیا ہے کہ خلافت فاروقی میں مسلمانوں یعنی صحابہؓ کے پاس لکھے ہوئے نسخے ایک لاکھ سے کم نہ ہوں گے (کتاب الفصل ج ۲[لے])

بعض تاریخی نقول سے معلوم ہوتا ہے کہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کم از کم پانچ مرتبہ قرآن کریم کی کتابت کی۔ اوّل عہد رسالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے املا سے کہ آپؐ ان کو آیات نازل ہونے کے بعد لکھواتے اور وہ لکھتے۔ پھر آنحضرت خود سن لیتے کہ کیا لکھا۔ دوم خود اپنے واسطے۔ جس کو لکھنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تھا۔ سوم بعد وفات رسول صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) ازالۃ الخفاء ج ۲۔ (۲) صحیح بخاری ج ۱۔
(۳) کتاب الفصل فی الملل والنحل (۴) طبقات ابن سعد بحوالہ تاریخ المصاحف
لے۔ بحوالہ تاریخ المصاحف۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں۔ چہارم عمر فاروق کے لیے۔ پنجم عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ان کے حکم سے کاتبین وحی کی ایک جماعت کے ساتھ جس کی تفصیل گذر چکی۔

الغرض ان اجمالی نقول سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی کتابت عہد صحابہ اور قرن اول ہی میں بہت زیادہ عام ہو چکی تھی۔ اس بناء پر قرآن کریم کی حفاظت پر کسی نوع کا شبہ کیا جانا ممکن نہیں ہے۔

حضرت علیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خود ایک مصحف لکھا تھا۔ پھر حضرت عثمان غنیؓ کے مصحف کی متعدد نقلیں کی تھیں اور ایک خادم خاص نہایت خوش خط تھا جو اسی کام پر مامور تھا۔

حفاظ صحابہؓ اور ان کے شاگرد

قرآن کریم جس طرح حق تعالیٰ شانہ نے ازل سے لوح محفوظ میں محفوظ رکھا تھا اسی طرح اس کی حکمت و مشیت یہ طے کر چکی تھی کہ وہ ابد تک اہل ایمان کے سینوں میں محفوظ رہے گا۔ اور گویا اس طور سے امت محمدیہ کے سینے عالم دنیا میں لوح محفوظ کے نمونے ہوں گے۔ انجیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی علامات اور نشانیوں میں یہ خاص لفظ ذکر کیا گیا۔ صدورھم اناجیلھم کہ ان کے سینے ان کی انجیلیں ہوں گی۔ خداوند عالم نے حفظ کی اس نعمت کا ذکر اس آیۃ مبارکہ میں فرمایا:

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (العنکبوت)

بلکہ وہ آیات بینات اور کھلی کھلی نشانیاں ہیں (جو حق اور باطل میں فرق کرنے والی ہیں) علم والوں کے سینوں میں۔

مراد یہ کہ ان آیات کو اہل علم یاد کریں گے حفظ تلاوت کرتے ہوں گے اور یہ قدرتِ خداوندی کا معجزہ ہوگا کہ اس کتاب الٰہی کا حفظ ان کے لیے آسان کر دیا جائے گا چنانچہ ارشاد مبارک ہے وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۔ عیاض بن حمار کی حدیث میں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، خدا تعالیٰ نے فرمایا (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بے شک میں تم کو آزمانے والا ہوں اور تمہارے ذریعے (امت کو بھی) آزماؤں گا اور تم پر ایک کتاب اتارنے والا ہوں جس کو پانی نہیں دھو سکے گا۔ اس کو پڑھے گا سوتا ہوا آدمی بھی اور جاگتا ہوا بھی۔ (صحیح مسلم)

ایک حدیث میں فرمایا گیا، اگر قرآن کریم کسی چمڑے میں رکھ کر آگ میں

ڈال دیا جائے تو آگ اس کو نہیں جلا سکے گی۔ یہ اسی بناء پر فرمایا گیا ہے کہ پانی صرف ان حروف کو مٹا سکتا ہے جو اوراق پر مکتوب ہیں لیکن جو کلمات سینوں پر نقش ہیں ان کو نہ پانی مٹا سکتا ہے اور نہ ہی آگ جلا سکتی ہے۔

حسن بصریؒ سے منقول ہے فرمایا اُمت محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے کہ اس کو حفظ کی نعمت عطا کی گئی ہے۔ پہلی اُمتوں میں سے کسی کو اس نعمت سے نہیں نوازا گیا۔ وہ اپنی کتابیں صرف دیکھ کر ہی پڑھ سکتے تھے۔ چنانچہ آج بھی اس کا ثبوت موجود ہے۔ تمام عالم میں ایک پادری بھی ایسا نہیں ہے کہ جو پوری انجیل مقدس حفظ پڑھ کر سنا دے۔ پوری انجیل تو درکنار انشاء اللہ تعالیٰ دس پانچ ورق بھی اس کو حفظ نہیں ہوں گے۔ اس کے برخلاف مسلمانوں کی کوئی بستی بہ مشکل حفاظ و قراء سے خالی ملے گی۔ ایک ایک شہر اور قریہ میں ہزاروں حفاظ ملیں گے۔

تو حفظ قرآن کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے شروع ہو چکا تھا اور عہد رسالت میں ہی قرآن کریم کے حفاظ کی تعداد اس قدر کثیر ہو چکی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک بستی میں ستر ستر اور چالیس چالیس حفاظ و قراء تعلیم قرآن کے واسطے بھیجا کرتے تھے۔ چنانچہ بیر معونہ کا واقعہ جو ۴ھ میں پیش آیا وہاں آپ نے ستر حفاظ اور قراء صحابہؓ روانہ فرمائے تھے جن کو ان منافقین نے بڑی ہی سنگدلی اور بے دردی کے ساتھ شہید کر ڈالا تھا جن کی شہادت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ہی رنج و صدمہ ہُوا تھا۔

علامہ ذہبیؒ نے طبقات القراء میں بیان کیا کہ عہد نبوت ہی میں صحابہؓ کی ایک کثیر جماعت نے پورا قرآن حفظ کیا تھا۔ حضرات صحابہؓ میں سات حفاظ و قراء ایسے ہیں جن کی سند تمام عالم میں مسلّم ہے اور سلسلہ حفظ قرآن کی

---

[۱] الجامع الاحکام القرآن ج ۱۳ ۔ (للقرطبی) [۲] الاتقان فی علوم القرآن ۱۵ مناھل العرفان ۱۵۰۔

انہی سے اشاعت ہوئی گویا ان حضرات کی زندگیوں کا نمایاں رنگ اور امتیازی شان یہی تھی کہ قرآن کریم کے حفظ اس کی اشاعت اور تعلیم میں مصروف رہے۔ وہ سات حضرات یہ ہیں ۔ عثمانؓ بن عفان ۔ علیؓ بن ابی طالبؓ ۔ ابیؓ بن کعبؓ ۔ زیدؓ بن ثابت ۔ عبداللہؓ بن مسعود ۔ ابوالدرداءؓ ۔ ابوموسیٰ اشعریؓ ۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے قرآن کریم حفظ کرنے والے صحابہ میں بھی بکثرت حضرات ہیں ۔ چنانچہ ان صحابہؓ میں ابوہریرہؓ ۔ عبداللہؓ بن عباس اور عبداللہ بن السائب کے نام خاص طور پر نمایاں مقام رکھتے ہیں ۔ ابی بن کعبؓ سید القرا اور اقرأ الصحابہ ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اقرأہم لکتاب اللہ فرمایا ۔ ابی بن کعبؓ نے از اول تا آخر قرآن کریم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تھا ۔ اسی طرح ابوموسیٰ اشعری اور ابوبکر صدیق رضؓ بھی آپ کو پورا قرآن سنانے والوں میں شمار کیے گئے ہیں[1] ۔ ابن عباس نے زید بن ثابت رضؓ سے ہی قرآن کریم پڑھا ہے ۔ علوم قرآن اور تفسیر میں عبداللہؓ بن عباس کو خصوصی تلمذ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے تھا ۔ مجموعی طور پر تتبع و تلاش سے معلوم ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ حیات اور اس سے متصل زمانہ میں حفاظ صحابہ کی تعداد دس ہزار تھی جن میں ۲۷ کو خصوصی امتیاز حاصل تھا ۔ پھر ان حضرات سے تابعین کی بہت بڑی جماعت نے قرآن پڑھا اور سیکھا اور تعلیم و اشاعت قرآن میں اپنی زندگیاں صرف کیں ۔

مثلاً مدینہ منورہ میں سعیدؒ بن المسیب ۔ عروہؒ بن الزبیر ۔ عمر بن عبدالعزیز سلیمان عطاء بن یسار ۔ معاذ بن الحارث ۔ عبدالرحمٰن بن ہرمز الاعرج اور ابن شہاب زہری اور ان کے علاوہ دیگر ائمہ تابعین ۔

مکہ مکرمہ میں عبید بن عمیر ۔ عطاء بن ابی رباح طاؤس مجاہد عکرمہ اور ابن ملیکہ و دیگر حضرات ۔

کوفہ میں علقمہ ۔ اسود ۔ مسروق ۔ عبیدہ ۔ عمرو بن شرجیل ۔ حارث بن قیس ۔ ربیع بن خثیم ۔ عمرو بن میمون ۔ ابوعبدالرحمٰن سلمی ۔ زر بن حبیش ۔ سعید بن جبیر

[1] صرح بہ الشیخ ابوالحسن الاشعری ۔ مفتاح السعادہ ۔

نخعی اور شعبی وغیرہم۔

بصرہ میں ابوالعالیہ - ابورجاء نصر بن عاصم - یحیٰی بن یعمر - حسن بصری - قتادہ اور محمد بن سیرین وغیرہم۔

شام میں مغیرۃ بن ابی شہاب المخزومی جو حضرت عثمان کے خاص اصحاب میں سے تھے - اور خلیفہ بن سعد جو ابوالدرداء کے اصحاب میں سے تھے -

الغرض یہ حضرات اور ان کے علاوہ ان بلاد اسلامیہ اور مراکز میں بہت سے حضرات قرآ اور حفاظ تعلیم و اشاعت قرآن میں مشغول ہوئے۔

اس طبقہ کے بعد انہی مقامات میں جو حضرات اس فن کے امام و مقتدیٰ کی حیثیت سے مشہور ہوئے وہ حسب ذیل ہیں :

مدینہ منورہ میں ابوجعفر اور نافع مکہ مکرمہ میں عبداللہ بن کثیر - کوفہ میں عاصم بن ابی النجود - سلیمان اعمش حمزہ اور کسائی - بصرہ میں عبداللہ بن ابی اسحٰق عیسیٰ بن عمرو اور عاصم - شام میں عبداللہ بن عامر - یحییٰ بن الحارث اور شریح بن یزید الحضرمی جو امام القراٴ کے لقب سے معروف تھے۔

ان ہی حضرات میں سے سات حضرات وہ ہیں ، جو دنیا میں سبعہ قرأ اور سبعہ ائمہ کے نام سے مشہور ہوئے - جو تمام عالم میں فن قرأت و تجوید اور تلاوت قرآن کے لیے اساس اور بنیاد ہیں - اور انہی کی طرف سبع قرأت منسوب ہیں اور اس فن کا انہی کو امام تسلیم کیا گیا۔

۱- نافع مدنی - جنہوں نے ستر تابعین سے علم حاصل کیا - یہ وہ نافع نہیں ہیں۔ جو امام مالک کے استاذ اور عبداللہ بن عمرؓ کے شاگرد ہیں۔

۲- ابن کثیر - امام القرأت اور عبداللہ بن سائبؓ صحابی کے شاگرد۔

۳- عاصم - اہل کوفہ میں امام کے لقب سے معروف تھے اور کبار تابعین کے شاگردوں سے تھے۔

۴- حمزہ - جو عاصم کے شاگرد تھے۔

۵۔ کسائی۔ جو حمزہ کے شاگرد تھے۔
۶۔ ابو عمرو، جو اہل بصرہ کے امام اور اجلائے تابعین کے شاگرد تھے۔
۷۔ عبد اللہ بن عامر، جو اہل شام کے امام تھے انہوں نے حضرت عثمانؓ اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے شاگردوں سے علم حاصل کیا۔

عہد نبوّت میں قرآن کریم حفظ کرنے والی عورتیں

حفظ قرآن کریم کی نعمت جس طرح اُمّت محمدیہ کے رجال (مردوں) کو حاصل ہوئی اسی طرح اس امت کی عورتوں کو حق تعالیٰ کے فضل سے یہ سعادت عظمیٰ نصیب ہوئی۔ چنانچہ صحابہؓ کے طبقہ میں جن متعدد صحابیاتؓ نے پورا قرآن کریم حفظ کیا ان کے اسماء حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔
۲۔ اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا۔
۳۔ اُمّ المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا۔
۴۔ حضرت اُمّ ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہا۔

جمع و تدوین قرآن پر معترضین کے بعض اوہام و شبہات اور ان کا ردّ

اسلام اور قرآن ہمیشہ سے باطل پرستوں کے اوہام و مطاعن کا نشانہ بنا رہا ہے۔ معترضین اور اہلِ عناد کا یہ مزاج ہوتا ہے کہ جس طرح بھی ہوسکے بعید سے بعید راہ سے بھی حق پر کوئی نہ کوئی اعتراض اور شبہ وارد کرکے لوگوں کے ذہنوں میں شکوک پیدا کیے جائیں۔ جمع و تدوین قرآن کے سلسلہ میں بھی ایسے ہی چند بعید از قیاس اوہام و شکوک معاندین کی طرف سے کیے گئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان چند شکوک و اوہام کا اجمالاً ذکر کرکے ان کے جواب کی طرف مختصر اشارات کردیئے جائیں۔

اعتراض اول: قرآن کریم بتدریج ۲۳ سال کی مدت میں نازل ہوا۔ اور وقتاً فوقتاً چند آیات نازل ہوتیں تو ان کو چمڑوں کے ٹکڑوں یا سنگریزوں، یا ہڈیوں وغیرہ پر لکھوا لیا جاتا تھا اور بظاہر یہ چیزیں منتشر و متفرق رہتی ہوں گی اور ابوبکر صدیق کے زمانہ میں بالترتیب قرآن لکھا گیا وہ انہی منتشر ٹکڑوں وغیرہ سے لکھا گیا تو کیا تعجب ہے کہ بہت سی آیات ضائع ہوگئی ہوں۔

جواب

یہ احتمال اوّل تو اس وقت ممکن ہے جب یہ فرض کیا جائے ان چمڑے کے ٹکڑوں اور شانے کی ہڈیوں یا سنگریزوں جن پر آیات کی کتابت کرائی جاتی تھی ان کی حفاظت کا کوئی اہتمام نہیں تھا بلکہ ان کو محض ہڈی یا چمڑے کے ٹکڑے ہی کی

حیثیت سے سمجھا جاتا تھا حالانکہ یہ تصور عقل و فہم سے بعید ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہایت اہتمام اور باقاعدگی سے ایک مخصوص جماعت کی نگرانی میں ان چیزوں پر آیات قرآنیہ کندہ کرائی جاتی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی حفاظت کا حکم دیا کرتے تھے اور ان کو پورے اہتمام و احتیاط سے محفوظ رکھا جاتا تھا۔ حضرات صحابہ کی نظروں میں یہ چیزیں محض چمڑے اور پتھر کے ٹکڑے نہیں بلکہ ہیرے جواہرات سے بھی زائد قیمتی تھے۔ تو جیسے کوئی عاقل یہ وہم نہیں کر سکتا کہ کسی جماعت کے پاس قیمتی ہیرے اور جواہرات کچھ دن گذرنے پر ضائع ہو سکتے ہیں۔ اس سے زائد یہ تصور ان آیات قرآنیہ کے بارے میں باطل ہے جو ان پر لکھی گئی تھیں۔

دوسرے یہ کہ جو آیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نازل ہونے پر ان چیزوں پر کتابت کرائی جاتی تھیں محض اسی پر اکتفاء نہیں کیا جاتا تھا کہ وہ لکھ لی گئیں بلکہ اوّل تو بوعدۂ الٰہی[1] جبریل امین سے سنتے ہی وہ آیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حفظ ہو جاتی تھیں۔ پھر آپ صحابہ کو پڑھاتے یاد کراتے اور ان سے سنتے۔ وہ سب حضرات نمازوں میں اور نمازوں کے علاوہ دیگر احوال میں تلاوت کرتے رہتے ایک دوسرے کو سناتے رہتے اور یہ کہ یہ معاملہ کوئی دس پانچ آدمیوں تک محدود نہ تھا بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں صحابہ کی جماعت اس میں مشغول و منہمک رہتی۔ اصحاب صفہ جو ایسے غرباء و فقراء صحابہ کی جماعت تھی جن کو زندگی کا کوئی مشغلہ تجارت کاروبار اور ملازمت وغیرہ کا تھا ہی نہیں۔ دن رات مسجد نبوی میں رہتے اور صرف یہی کام تھا کہ قرآن پڑھیں

---

[1] یہ وعدہ الٰہی وہ ہے جس کا ذکر سورۃ قیامہ میں فرمایا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جبریل امین کے وحی لانے اور القاء کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ہونٹوں کو حرکت دیتے اور ساتھ ساتھ پڑھتے اس اندیشہ سے کہ کوئی حرف چوک نہ جائے۔ اس پر حکم نازل ہوا لاتحرک بہ لسانک لتعجل بہ ان علینا جمعہ وقرآنہ کہ آپ اپنی زبان کو حرکت نہ دیجیے جلدی ہی یاد کر لینے کے خیال سے۔ بیشک ہمارے ذمہ ہے اس قرآن کا آپ کے سینہ میں محفوظ کر دینا اور پھر اس کی تلاوت کرانا

یاد کریں اور سیکھیں ۔ ایک باقاعدہ نظام کے طور پر حضرات صحابہؓ میں سے حفاظ و قراء کی جماعت مقرر تھی جو مختلف علاقوں میں اور بستیوں میں جاکر لوگوں کو تعلیم قرآن دیتے تھے ۔ جیسے بیر معونہ کے واقعہ سے ظاہر ہے جس میں آپؐ نے ستر حفاظ و قراء کو بھیجا تھا اور ایسے حضرات کے پاس خود اپنے لکھے ہوئے صحیفے بھی ہوتے تھے ۔ اور یہ سب کچھ اسی زمانہ میں ہوتا تھا جس میں سلسلہ نزول وحی کا جاری ہے ۔ اور ہر سال رمضان میں خود جبرئیل امین آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دورہ کرتے ۔

اس تمام صورت حال کو پیش نظر رکھنے کے بعد ظاہر ہے کہ اس وہم کی عقلاً کوئی گنجائش نہیں معلوم ہوتی ۔ اور قرآن کریم کے کسی بھی حرف کے ضائع ہوجانے کا وہم بعید از قیاس ہے ۔

اعتراض دوم : جب زمانۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نازل ہونے والی آیات مختلف جگہوں پہ لکھی جاتی تھیں تو ایسی صورت میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ موجودہ ترتیب اصل کے مطابق محفوظ ہے ۔ ہوسکتا ہے کہ خلل اور فرق ہوگیا ہو ۔

جواب

جب کہ یہ معلوم ہوچکا کہ ان آیات کو خود آنحضرتؐ تلاوت فرماتے اور صحابہؓ کو پڑھاتے تھے اور حضرات صحابہؓ اسی کے مطابق تلاوت کرتے تھے اور دوسروں کو تعلیم دیتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ ترتیب اسی وقت سے متعین اور طے کردی جاتی تھی جس وقت بھی کوئی آیت نازل ہوتی اور آپؐ کاتبان وحی سے اس کی کتابت کراتے ہی فرمادیتے تھے کہ اس آیت کو فلاں جگہ فلاں سورت میں جہاں یہ مضمون بیان کیا جارہا ہے رکھو ۔ فلاں آیت کو فلاں سورت میں رکھو ۔ غرض متعدد سورتوں کی آیات بیک وقت بھی نازل ہوتیں تو آپؐ ہر آیت کو ایک مخصوص و معین ترتیب سے مرتب کردینے کے لیے فرمادیتے تھے ۔ پھر وہ آیات اسی ترتیب کے ساتھ تلاوت کی جاتیں اور ان کو حفظ کیا جاتا تو جب قرآن کریم

ترتیب وار لکھا گیا تو اسی ترتیب کے مطابق کاتبین وحی کی جماعت نے اس کو لکھا جس پر اس کی عام طور پر صحابہؓ تلاوت کیا کرتے تھے۔ اس بنا پر یہ وہم بھی باطل ہے کہ ممکن ہے کہ مصاحف قرآن کی موجودہ ترتیب میں کوئی خلل یا نقص واقع ہو گیا ہو:

الغرض خواہ قرآن ابتداءً مختلف جگہوں پر لکھا گیا مگر وہ ہمیشہ ایک ایسی مرتب ترتیب سے تلاوت کیا جاتا رہا کہ ایک حرف کی بھی تقدیم و تاخیر کا امکان نہ تھا۔ تو جب قرآن کو ایک جگہ لکھا گیا تو اسی ترتیب سے لکھا گیا جس پر ایک ایک حافظ ہر ہر جگہ اس کی تلاوت کرتا تھا۔

اعتراض سوم : زیدؓ بن ثابت جو جامع قرآن ہیں اور انہوں نے ابوبکرؓ کے زمانہ میں اور پھر عثمان غنیؓ کے زمانہ میں قرآن کی کتابت کی ان کا بیان ہے کہ جس وقت ہم صدیق اکبرؓ کے زمانہ میں قرآن کی کتابت کر رہے تھے تو ہم کو ایک آیت سورۂ توبہ کی نہیں ملی۔ تلاش کرنے کے بعد ابی خزیمہؓ انصاری کے پاس سے ملی اور ان کے سوا وہ کسی کے پاس نہ تھی، وہ آیت **لقد جاءکم رسول من انفسکم** ہے۔ نیز ایک اور آیت سورۂ احزاب کی بھی کسی کے پاس نہیں ملی تھی، تلاش و تتبع کے بعد کے بعد ہم نے وہ آیت خزیمہ بن ثابت کے پاس پائی، تو ہوسکتا ہے اسی طرح کچھ اور آیات ایسی ہوں کہ جو کسی کے پاس سے بھی نہ مل سکی ہوں اور وہ ضائع ہو گئی ہوں۔

جواب

سابق تحقیق کے بعد اوّل تو اس احتمال کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ پھر یہ کہ معترض نے دراصل جمع قرآن کے واقعہ میں یہ بات جو ذکر کی گئی ہے اس کا مطلب ہی نہیں سمجھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ آیت کسی کو معلوم نہیں تھی بس صرف ایک صحابی سے ملی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے جیسا خود اس حدیث میں صاف اور واضح طور پر بیان کیا گیا کہ یہ آیت جس کو ہم سب لوگ پڑھتے تھے اور جانتے تھے وہ لکھی ہوئی اصلی دستاویز کے طور پر کسی کے پاس نہیں مل رہی تھی کیونکہ جمع قرآن میں صرف

اس پر کفایت نہیں کی گئی جتنا قرآن حضرات صحابہ اور حفاظ کو یاد سے لکھ لیا جائے بلکہ یہ محفوظ اور متلو (یعنی جس کی تلاوت کی جاتی ہے) کو جب تک کسی اس چمڑے اور پتھر وغیرہ کے ٹکڑے پر نہ دیکھ لیتے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سامنے کاتبین وحی کو اس کی کتابت کرائی۔ پھر اس کو کتابت کے بعد سن کر تصدیق بھی فرمائی بلکہ مزید برآں اس کے ساتھ ایک گواہ بھی ہوتا تھا جو گواہی دیتا تھا کہ میرے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت لکھوائی تھی اور سن کر اس کی تصدیق فرمادی تھی، تو جب اس آیت کو یہ حضرات قرآن میں لکھتے تھے۔

ابوبکرؓ نے عمر فاروقؓ اور زیدؓ بن ثابت کو مسجد نبوی کے دروازہ پر بٹھا دیا تھا اور حکم دیا تھا جب تک کسی آیت پر دو گواہ نہ پیش کیے جائیں جو اس بات پر گواہی دیں کہ آنحضرت نے وہ ان کے سامنے لکھوائی تھی تو بغیر ایسی گواہی کے ایسی کوئی آیت مصحف میں نہ لکھی جائے، تو ان دو آیتوں کا سوائے ایک ایک صحابی کے اور کسی کے پاس نہ پانے کا مطلب یہ ہے کہ اس نوعیت کے ساتھ لکھی ہوئی کہ اس پر یہ شہادت موجود ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سامنے یہ آیت لکھوائی تھی اور پھر اس کو سن کر تصدیق فرمادی تھی سوائے خزیمہ بن ثابت اور ابوخزیمہ کے اور کسی کے پاس نہیں ملیں۔ اور یہ دونوں آیتیں سب کو حفظ تھیں۔ ہر ایک جانتا تھا کہ اس جگہ یہ آیت ہے۔ لہٰذا اس واقعہ سے قرآن کریم کی حفاظت میں شبہ کرنا بعید از قیاس ہے۔

بر سلسلۂ اعتراضات ایک مضحکہ خیز اعتراض یہ بھی کیا گیا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک آیت لکھی ہوئی ہمارے پلنگ کے نیچے پڑی تھی جس کو ہماری بکری کھا گئی تو ممکن ہے کہ اسی طرح اور بھی کچھ آیات ضائع ہوگئی ہوں۔

اس اعتراض کا لغو اور مہمل ہونا ظاہر ہے۔ اوّل تو اس قائل کو بتانا چاہیے، وہ کونسی حدیث و روایت ہے جس میں یہ بات حضرت عائشہؓ سے نقل کی گئی۔ اور وہ کون راوی ہے جس نے روایت بیان کی اور کس سند سے یہ روایت ان معترضین کو

پہنچی۔ جب کہ حدیث میں ہر بات سند کے ساتھ ذکر کی جاتی ہے خواہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و عمل ہو یا حضرات صحابہؓ کے آثار ہر ایک کی سند موجود ہوتی ہے تو ان لوگوں کو چاہیے کہ اس قول کی بھی سند پیش کریں۔ اس بارہ میں نہایت صاف لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ معترضین ہزار جدوجہد سے بھی اس کی کوئی سند نہیں پیش کرسکیں گے، حتّی کہ حارث اعور اور ابوداؤد اعمیٰ جیسوں کی بھی سند نہ مل سکے گی۔ دوسرے یہ کہ اگر بالفرض والتقدیر یہ نقل معتبر مان لی جائے تو بھی ایسے کسی ایک واقعہ سے قرآن کریم کے محفوظ رہنے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہم تو کہتے ہیں کہ ایک آیت نہیں اگر وہ بکری سارا قرآن بھی کھاجاتی تب بھی قرآن کا ایک حرف بھی ضائع نہیں ہوسکتا تھا۔ ہزاروں صحابہؓ کے سینوں میں قرآن محفوظ تھا۔ ایک نسخہ قرآن نہیں اگر شہر کے سارے نسخے بھی وہ بکریاں کھاجاتیں تب بھی حفاظ صحابہؓ کے سینوں سے پھر قرآن کریم اوراق اور صحیفوں پر لکھا جاسکتا تھا۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے اپنا یہ کلام ایسی جگہوں پر محفوظ فرمایا تھا کہ اس کے بعد اس کلام کو نہ پانی دھوسکتا ہے اور نہ دنیا کی آگ جلاسکتی ہے تو بھلا ایک بیچاری بکری اگر ایک آیت چبالے گی تو کیا ہوجائے گا۔

انگریز حکومت نے ہندوستان میں قدم جمانے کے بعد سرتوڑ کوشش کی کہ کسی طرح قرآن میں کچھ ردو بدل کردیں۔ اس مقصد کے لیے منظم اور وسیع پیمانے پر مشن کے پادری اور کارندے ایک ایک گاؤں اور گھر گھر قرآن کے نسخے خریدتے پھرے، تاکہ اس طرح ہندوستان سے کل نسخے سمیٹ کرلے جائیں اور پھر یورپ میں قرآن کو ردو بدل کرکے طبع کرکے ہندوستان پہنچائیں۔ لیکن ان کی یہ کوشش رائیگاں گئی جب کہ انہوں نے

لے ابوداؤد اعمیٰ جو ایک نابینا شخص تھا، موضوع روایات بیان کرتا تھا۔ حارث اعور ایک کانا شخص تھا جس کی روایات بھی محدثین نے ضعیف قرار دی ہیں۔ شیعوں کے یہاں جو کتابیں مستعمل اور معتمد ہیں ان کی روایات کے راوی اکثر و بیشتر یہی اندھے اور کانے دو راوی پائے جاتے ہیں اور انہی کی روایات پر ان کا مذہب مبنی ہے۔

یہ دیکھا کہ ہر ہر شہر بستی اور قریہ قریہ قرآن کے بے شمار حفاظ موجود ہیں۔ اگر ہم ہندوستان کی ایک ایک گلی کوچہ پھر کر بھی کل نسخے لے جائیں تب بھی قرآن اسی طرح محفوظ رہے گا اور اسی لمحہ حفاظ قرآن اسی قرآن کو پھر لکھوا کر دنیا کے سامنے پیش کردیں گے اور سمجھا کہ ہماری یہ تدبیر محض ایک حماقت ہے۔ اور ہم قرآن میں تحریف تو درکنار ایک حرف اور زیر زبر کا بھی فرق نہیں کرسکتے تو سوچیے ایک بکری نے اگر ایک آیت کھالی تو اس سے قرآن کریم کی حفاظت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔

اعتراض چہارم ۔ روافض و شیعہ بڑے شدو مد سے کہتے ہیں حضرت عثمانؓ نے اور اسی طرح ابوبکرؓ و عمرؓ نے قرآن میں تحریف کردی۔ العیاذ باللہ اور بہت سی آیات اور طویل طویل سورتیں قرآن میں سے حذف کردیں اور دعویٰ کیا کہ وہ قرآن جو جبریل نبی کریمؐ پر لے کر اترے اس کی سترہ ہزار آیات تھیں۔ گویا انہوں نے گیارہ ہزار کے قریب آیات قرآن سے نکال دیں اور یہ بھی دعویٰ کیا کہ سورہ **لم یکن الذین کفروا** میں قریش کے ستر آدمیوں کے نام مع ولدیت کے نازل ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے وہ سب نام نکال دیئے۔ اور دعویٰ کیا کہ قرآن میں ایک سورت تھی جس کا نام سورۃ الولایۃ تھا اس کو بھی قرآن سے نکال دیا گیا۔ سورۃ احزاب بھی بہت طویل سورت تھی۔ سورۃ انعام کے بقدر اس میں سے بھی نصف سے زائد سورت حذف کردی، اس حصہ میں اہل بیت کے فضائل تھے اور حضرت علیؓ کی خلافت کے مضامین تھے اور بہت سی آیتوں میں ان لوگوں نے ردو بدل اور کمی زیادتی کردی اور کہا کہ آیۃ "وقفوھم انھم مسئولون" سے آگے لفظ لعلی بن ابی طالب تھا تو ان لوگوں نے یہاں سے یہ لفظ نکال دیا۔
اور یہ بھی دعویٰ کیا کہ بہت سی جگہوں پر قرآن میں ان حضرات نے اپنی طرف سے اضافہ کردیا اور آیت مبارکہ "**وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل**" تا **واللہ یحب الصابرین**" ابوبکرؓ کا کلام ہے۔ اس لیے جو قرآن مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ کا جمع کیا ہوا ہے وہ تحریف شدہ ہے۔

اور قابلِ حجت نہیں۔ یہ فرقہ اس نوع کے اعتراض کو قدیم تاریخ سے آج تک دہراتا رہتا ہے۔ اور یورپ کے طاعنین اور ان کے رنگ میں رنگے ہوئے ملحدین و معاندین بھی اس قسم کے اوہام و اعتراضات سے مسلمانوں کے عقائد کو متزلزل بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

جواب

یہ ہے کہ یہ اعتراضات محض الزامات و اتہامات ہیں۔ ان کو عقلاً شبہ و اعتراض کہنا بھی صحیح نہیں ہوسکتا۔ اور یہ ایسے الزامات ہیں جن کی کوئی سند نہیں۔ عقلاً تو یہ الزامات اس قابل نہیں کہ ان کا ذکر بھی کیا جائے، کیونکہ ایسی بے بنیاد اور لغو باتیں صرف ایسا ہی شخص کرسکتا ہے جو جمع قرآن کی تاریخ سے نا واقف ہو اور قرآن کے ساتھ صحابہؓ اور امت کا کس طرح شغف اور کیسی وابستگی رہی اس سے بھی اس کو کوئی واقفیت نہ ہو اور اس کے ساتھ وہ فہم اور شعور سے بھی محروم ہو۔ ایسے شخص کے سوا کوئی انسان ان باتوں کو زبان پہ نہیں لاسکتا۔

کیونکہ یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ جمع قرآن کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ دو تین آدمیوں نے انفرادی طور پر اس کو لکھ لیا ہو اور خفیہ طور پہ کسی جگہ بیٹھ کر جمع و تدوین کرلی ہو، بلکہ وہ باقاعدہ مرتب کی ہوئی جماعت اور مجلس منتظمہ تھی جو اس زمانہ کے منتخب اور مختلف قبائل کے سربرآوردہ افراد پہ مشتمل تھی جو علم تقویٰ اور رسولِ خدا کی محبت و تعلق اور سفر و حضر کی مرافقت میں ممتاز و نمایاں تھے۔ ان کی نگرانی اور اہتمام میں آیات قرآنیہ کی کتابت اور مصحف قرآن میں مرتب کرنا شروع کیا گیا کہ زمانۂ رسالت میں کتابت شدہ آیات لانے والے لوگ اس کے ساتھ شہادت بھی پیش کر رہے ہیں۔ کاتبین قرآن مسجد نبویؐ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور ہر شخص ان کے سامنے حاضر ہو رہا ہے۔ شہادتوں کے بعد آیات قرآنیہ لکھی جارہی ہیں اور جو آیات لکھی جارہی ہیں وہ حفاظ صحابہ کے سینوں میں محفوظ ہیں۔ ایک ایک صحابیؓ ان کی تلاوت کر رہا ہے۔ نمازوں میں پڑھا جارہا ہے۔ دوسروں کی

تعلیم دی جاری ہے ۔ جب اس شان کے ساتھ قرآن کریم کی کتابت ایک مجلس شوریٰ کی نگرانی میں کی گئی ہو کیونکر ممکن ہے کہ ایک لفظ بھی کم رہ جائے ۔ چہ جائیکہ پوری پوری سورتیں اور تقریباً گیارہ ہزار آیات ہی حذف کر دی جائیں ۔ عقلاً یہ ممکن نہیں کہ جس قرآن کے جمع و تدوین کے وقت دس ہزار سے زائد حفاظ صحابہؓ موجود ہوں ۔ اس میں ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ یہ طرز اختیار کر لیتے ۔ بالفرض اگر ایک آیت بھی کم رہ جاتی تو مدینہ کے ایک ایک گلی کوچہ سے صحابہؓ قطار در قطار مسجد نبویؐ کے سامنے آکر لوگوں کو بتاتے کہ اے مسلمانو! دیکھو یہ آیت قرآن میں نہیں لکھی گئی حالانکہ تاریخ گواہ ہے کہ اہل بیت میں سے بھی کسی کی بھی زبان سے یہ لفظ نہیں سنا گیا کہ فلاں لفظ کلام اللہ میں لکھنے سے رہ گیا۔ حضرت علیؓ ۔ ابوبکرؓ و عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خود موجود تھے ۔ انہوں نے کوئی ایک حرف بھی ایسا نہیں کہا بلکہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے تو سند صحیح سے یہ منقول ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عثمانؓ غنی رضی اللہ عنہما کی اس خدمت کو سراہا اور امت پر اس کو ایک احسان عظیم قرار دیا ۔ فرمایا :

اعظم النّاس اجراً فی المصاحف ابوبکر رحمۃ اللہ علی ابی بکر ھو اوّل من جمع کتاب اللہ ۔	مصاحف قرآن کے معاملہ میں دنیا میں سب سے زیادہ اجرو ثواب کے مستحق ابوبکر ہیں ۔ خدا کی رحمتیں ہوں ابوبکرؓ پر ، وہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے کتاب اللہ کو جمع فرمایا ۔

اسی طرح عثمان غنیؓ کے بارہ میں بھی فرمایا :

یا معشر النّاس اتقوا اللہ وایّاکم والغلو فی عثمان وقولکم حرّاق المصاحف	اے لوگو ! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ڈرو حضرت عثمانؓ کے بارہ میں غلو کرنے سے اور اس کہنے سے کہ وہ حراق المصاحف یعنی اوراق قرآن جلانے والے ہیں ۔

فواللہ ما احرقها الاعن ملاء منا اصحاب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ولو کنت الوالی وقت عثمان لفعلت فی المصاحف مثل الّذی فعل۔[۱]

خدا کی قسم اُنہوں نے ان اوراق کو نہیں جلایا مگر ہم سب اصحابِ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مجمع میں اور ہم سب کی موجودگی میں اور اگر اس وقت میں خلیفہ ہوتا تو یقیناً ان مصاحف میں وہی طریقہ اختیار کرتا جو عثمان رضی اللہ نے کیا کیونکہ وہ اوراق جو جلائے گئے تھے وہ صرف ایسی چند سورتوں کے مجموعے تھے جو بعض حضرات نے صرف اپنی تلاوت اور معمولات اور تہجد کے لیئے غیر مرتب طور پہ لکھ رکھے تھے۔

بھلا یہ کیونکر قابلِ تصوّر ہوسکتا ہے کہ یہ حضرات قرآن کا ایک بہت بڑا حصّہ قرآن سے نکال دیں اور کوئی ایک شخص بھی کوئی آواز نہ اُٹھائے حالانکہ وہ حضرات اسلام اور دین کے شیدائی تھے۔ رسولِ خدا اور قرآن ان کو اپنی جان و مال اور اہل وعیال سے زیادہ محبوب تھا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ان کی موجودگی میں دو تین آدمی کتاب اللہ میں من مانی تحریف اور ردّ و بدل کر دیتے جس کے واسطے اُنہوں نے اپنی ہر عزیز و محبوب چیز قربان کی۔ جہاد کے لیے محنتیں اُٹھائی، فقر و فاقہ کی مشقتیں برداشت کیں۔ خاندان قوم اور وطن کو چھوڑا۔

قرآن کریم کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو صرف کسی کتب خانہ کی الماری میں ہی

---

[۱] ابن ابی داؤد نے اس کی روایت کو عبد خیر سے نقل کیا۔ اُنہوں نے فرمایا میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ سُنا تھا۔ شیخ سیوطیؒ اور ابن ابی داؤد نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔

toobaa-elibra

رکھی جانے والی ہو بلکہ اس کا ایک ایک لفظ تلاوت کیا جاتا تھا اور ہر آیت و کلمہ نقل متواترہ کے ساتھ منقول تھا۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں رمضان مبارک میں امام ہوتے اور تمام اکابر صحابہؓ ان کے پیچھے تراویح میں کلام اللہ سنا کرتے۔ آخر وہ کونسا قرآن سنتے تھے اور لامحالہ اس جماعت میں حضرت علیؓ بن ابی طالب بھی شریک ہوتے تھے۔ ابی بن کعبؓ وہی قرآن پڑھتے تھے جس کو ابوبکرؓ و عمرؓ نے جمع کیا تھا۔ اگر اس قرآن میں سے بہت سی آیات ان لوگوں نے نکال دی تھیں وہ حفاظ صحابہؓ جو ان کے پیچھے نماز میں ہوتے تھے ضرور ٹوکتے اور بتاتے۔ لیکن ایسی کوئی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آج اگر کوئی حافظ دوران تلاوت ایک لفظ بھی چھوڑ دے تو تراویح میں شریک ہونے والے حافظ فوراً امام کو لقمہ دیتے ہیں، حتٰی کہ اگر کوئی بڑا شیخ و عالم اور بزرگ بھی ہو تو دوران تلاوت غلطی آجانے پر درجہ حفظ کا ایک لڑکا بھی فوراً بتاتا ہے۔ اس لیے یہ بات عقلاً قابل تصور نہیں ہو سکتی کہ جس قرآن کو حضرات صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سنا ہو اور اس کو حفظ کیا ہو کوئی شخص بعد میں اس سے ایک لفظ بھی کم کر دے۔ حاشا وکلا ثم حاشا وکلا۔

یہ تصور صرف وہی کر سکتا ہے جو عقل و خرد سے قطعاً محروم ہو۔ پھر یہ امر بھی تو قابل غور ہے، حضرت عثمانؓ کے بعد تو حضرت علیؓ بن ابی طالب کا دور خلافت آیا۔ اگر وہ حضرت عثمانؓ یا ابوبکرؓ و عمرؓ کے سامنے کچھ نہیں کر سکے تھے اول تو یہ تصور ہی باطل ہے کیونکہ حضرت علیؓ دنیا میں بہادر ترین انسان تھے، ان کے متعلق یہ خیال کرنا کہ کتاب الٰہی کے معاملہ میں انہوں نے خاموشی اختیار کر لی ہوگی، علیؓ بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شان میں بدترین قسم کی توہین ہے۔ بہرحال جو بھی کچھ ہو، جب ان کا خلافت کا زمانہ آیا تو چاہیے تھا کہ وہ مسلمانوں کو بتا دیتے کہ اے مسلمانو! یہ سورتیں اور آیات قرآن کریم اور ہیں جن کو ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ نے قرآن سے خارج کر دیا تھا۔ اگر بقول شیعہ ان حضرات نے قرآن کا

حقیقہ نکال دیا تھا تو حضرت علیؓ کے لیے کیا مانع تھا کہ انہوں نے اس امر کا کبھی اظہار بھی نہیں کیا۔ کیا شیعہ حضرات اس بات کو گوارا کرلیں گے کہ حضرت علی کے بارہ میں یہ رائے قائم کرلی جائے کہ وہ دین اسلام اور قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری سے اس قدر قاصر و عاجز اور دُور رہے کہ کبھی اظہار حق کی نہ جرأت کی اور نہ اس کے لیے کوئی عملی قدم اُٹھا سکے۔ شیعہ اگر یہ گستاخی اور توہین شیر خدا علی ابن ابی طالب کی کرنا چاہتے ہیں وہ اس کے ذمہ دار ہیں۔ یہ بات انہی کو زیب دیتی ہے۔

اہل سنت والجماعت کا تو یہ اعتقاد و ایمان ہے کہ ناموس رسول صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن اور دین کے سچے محافظ ہیں اوران لوگوں میں سے ہیں جن کی شان میں قرآن کریم یہ گواہی دیتا ہے یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم۔

رہا قرآن میں اضافہ کردینے کا الزام؟ تو یہ ان الزامات و اتہامات سے بھی زائد لغو اور باطل ہے۔ اگر کوئی جملہ ابوبکرؓ اضافہ کرسکتے تھے تو اہل عرب میں ابوبکرؓ سے زیادہ عربیت میں فصیح و بلیغ اور مایہ ناز شعراء و ادباء بھی قرآن جیسا کلام پیش کرکے قرآن کریم کے اس اعلان کو رد کرنے کی کوشش کرتے جو کلام الٰہی کی حقانیت کے سلسلہ میں کیا گیا۔ اے لوگو! اگر تم اس قرآن کے کلام الٰہی میں شک کرتے ہو تو تم بھی اس جیسی ایک سورت یا آیت بنالاؤ۔ کہیں فرمایا گیا کہ اگر جن و انس بھی جمع ہوکر اور ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہوکر قرآن جیسا کلام پیش کرنا چاہیں تو بھی قرآن جیسا کلام نہیں پیش کرسکیں گے تو اگر ابوبکرؓ قرآن جیسا کلام بناکر قرآن میں اضافہ کرسکتے تو قرآن کا یہ دعویٰ ہر ایک کو توڑنے کا امکان ہوسکتا تھا لیکن تاریخ عالم گواہ ہے کہ کسی شخص نے یہ جرأت نہ کی وہ یہی کہہ سکے میں نے بھی یہ کلام قرآن کے مشابہ بنایا ہے۔

الغرض کلام اللہ لوح محفوظ سے پوری حفاظت کے ساتھ اللہ نے اپنے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتارا اور اُمت محمدیہ کے سینوں میں اس کو محفوظ کرکے اپنے اس وعدہ کو پُورا کردکھایا انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحٰفظون اس میں آج تک نہ کسی حرف اور زیر و زبر کا ردّ و بدل ہوا اور نہ ہی قیامت تک کوئی کرسکے گا۔

قرآن کریم کا رسم الخط

قرآن کریم کا رسم الخط ایک امتیازی مقام رکھتا ہے ۔ علماء متقدمین و متاخرین اس موضوع پہ کتابیں تالیف فرماتے رہے ۔ شیخ ابوعمر الدانی نے ایک مستقل کتاب قرآنی رسم خط پہ لکھی ۔ اسی طرح ابوالعباس مراکشی نے بھی ایک تصنیف فرمائی جس کا نام "الدلیل فی مرسوم خط التنزیل" رکھا ۔ اس میں شیخ نے قرآنی رسم خط کی خصوصیات کو بیان فرمایا ہے۔[1]

یہ بات ظاہر ہے کہ حروفِ ہجا کی ہیئتِ ترکیبی ہی الفاظ و کلمات کی خاص خاص صورتیں بلکہ نفس حقیقت ہے ۔ اسی ترکیب اور انہی کیفیات کا نام رسم الخط ہے ۔ اور اسی کی معرفت کو علم رسم الخط کہا جاتا ہے ۔ قرآن کریم کی اس آیۂ مبارکہ "اقرء و ربك الاكرم الذي علم بالقلم اور آیۂ ن والقلم وما يسطرون" سے معلوم ہوتا ہے ۔ تخلیق عالم کے وقت ہی سے قدرت خداوندی نے علوم کی نشر و اشاعت اور ایک نسل سے دوسری نسلوں تک علوم کے منتقل ہونے کا ذریعہ قلم جیسی ناتواں اور معمولی سی چیز کو بنایا ہے ۔

شیخ سیوطی رحمۃ اللہ نے کتاب المصاحف کے حوالہ سے کعب احبار رضہ کی ایک حدیث نقل کی ہے ، جس میں بیان کیا کہ تمام انواع کی زبانیں رسم خط اور لغات بالخصوص عربی اور سریانی زبان کا رسم خط کے اصل موجد حضرت آدم علیہ السلام ہیں ۔ آدم علیہ السلام نے کچھ اصول لغات مٹی کی تختیوں پر لکھ کر اپنے پاس رکھ لیے تھے ۔ طوفان نوح میں وہ تمام تختیاں بھی غرق آب ہوگئیں ، اور پھر بعد کو کوئی تختی کسی قوم میں نمودار ہوئی اور کوئی تختی کسی قوم میں اور

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ ۔

اس طرح وہی زبان اور رسم خط اس قوم کا ہوگیا۔

حضرت اسمٰعیل کو وہ تختی ملی جس پر عربی رسم خط اور لغات عرب کے اصول لکھے ہوئے تھے تو اس طرح اہل عرب کی زبان عربی ہوئی۔ اور یہ رسم خط ان میں جاری ہوا۔ عربی رسم خط کی ایجاد بعض مورخین نے اگرچہ حضرت شیث علیہ السلام اور بعض نے حضرت ادریس علیہ السلام کی طرف بھی کی ہے لیکن کتاب "نفائس الفنون" کے مؤلف[۱] نے عروہ بن الزبیر اور عبداللہ بن عمرؓ کی سند سے اسی مضمون کو نقل کیا ہے کہ حضرت آدمؑ نے اپنے فرزندوں کے لیے مختلف تختیاں بنائی تھیں جن پر مختلف لغات کے لیے کچھ خاص خاص خطوط و نقوش اور حروف تجویز و مقرر کیے ہوئے لکھے تھے۔ طوفان نوحؑ میں جب وہ تختیاں ضائع ہوگئیں تو مدتوں کے بعد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ وہ تختی کوہ ابوقبیس کے ایک مدفون خزانہ میں محفوظ ہے۔ محنت و تلاش کے بعد وہ تختی مل گئی مگر اس کے نقوش و خطوط سمجھنے میں بڑی دقت ہوئی۔ حق تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور دعا کی کہ اے اللہ اس حقیقت کو منکشف فرما دے۔ جبرئیل امین آئے اور اس نقش کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا اور لغات عرب کے اصول بتائے۔ اسی مؤلف نے ایک اور روایت بھی بیان کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف کی صورتیں مرامر بن مرہ نے ایجاد کی اور وصل و فصل کا ضابطہ اسلم بن سدرہ نے ایجاد کیا۔ اور نقطوں کی صنعت عامر بن جدرہ۔ بعض نقول سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل مدین عربی رسم خط کے موجد ہیں۔ ابجد ہوز حطی وغیرہ ان کے سرداروں کے نام تھے۔ بہرکیف ان نقول اور دھندلی سی روشنی کے ذریعہ عربی رسم کی ابتدائی تاریخ کا کچھ خاکہ نظروں کے سامنے آتا ہے بظاہر ان نقول میں قدرے فرق معلوم ہوتا ہے لیکن غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ کہہ دیا جائے کہ اصل ایجاد حضرت آدمؑ سے

[۱] نفائس الفنون بحوالہ حدائق البیان

کیونکہ حق تعالیٰ نے ان کو تمام اسماء کا علم عطا فرما دیا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے :-
وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا کہ حق تعالیٰ نے آدم کو تمام اسماء سکھا دیئے
(البقرہ ۵)

ان کے بعد ان مختلف ادوار اور زمانوں میں جو نام تاریخی نقول میں بیان کیے گئے، ان لغات کی تحقیق و تفصیل اور اشاعت ہوتی رہی ہوگی۔ اس وجہ سے ان نقول میں عربی رسم خط کی ابتدا و ایجاد حضرت شیث و ادریس علیہما السلام یا اہل مدین کی طرف منسوب کر دی گئی۔

اہل عرب زمانہ جاہلیت میں کسی نہ کسی حد تک کتابت کا سلیقہ رکھتے تھے، اور اس وقت ان میں جو رسم خط مروج تھا اس کو خط معقل کہا جاتا تھا۔ پھر خطۂ عرب میں خط کوفی کا رواج ہوا۔ اور آج کل جو رسم خط رواج ہے وہ ابن مقلہ کا ایجاد کردہ ہے۔ بعد کے زمانوں میں اسی کی تزئین اور تنوع ہوتی رہی، اور دوسرے فنون کی طرح مسلمانوں نے اس فن کو مرتبۂ کمال تک پہنچایا۔

قرآن کریم جب نازل ہوا اور اس کے الفاظ و کلمات کو کتابت کا لباس پہنایا گیا تو بالعموم اسی طرز اور رسم خط پر کتابت کیا گیا جو اس وقت عرب میں رواج تھا البتہ بہت سے الفاظ و حروف کی کتابت میں بعض مواقع میں عام رسم خط کی اور قواعد مروجہ کی پابندی اور ان کی مطابقت کا لحاظ نہیں کیا گیا بلکہ قرآنی رسم خط ایک امتیازی نوعیت کے ساتھ مقرر و متعین ہوا جو رسم خط مصحف عثمانی کا ہے۔ تقریباً چودہ صدی کی مدت گذر گئی لیکن قرآنی رسم خط اسی طرح محفوظ ہے جس طرح جامع قرآن حضرت عثمانؓ نے اس مصحف میں کتابت فرما دیا تھا۔ ان مختصر کلمات میں اس بات کی تو گنجائش نہیں ہے کہ بالاستیعاب قرآنی رسم خط کی خصوصیات بیان کی جائیں البتہ بطور مثال چند خصوصیات درج ذیل ہیں۔

قرآنی رسم خط کی خصوصیات

عربی رسم خط کے عام قواعد میں سے یہ ہے کہ اسم منادی جب یاءِ متکلم کی طرف مضاف ہو تو یاءِ متکلم کتابت کی جاتی ہے مثلاً یا عبادی لکھا جاتا ہے لیکن قرآن کا رسم خط اس طرح واقع ہے کہ ایسے اکثر مواقع میں یاء کو کتابت سے حذف کرکے اس طرح لکھا جاتا ہے یا عباد فاتقون - اسی طرح اکثر مواقع میں یاءِ متکلم کتابت سے ترک کر دی گئی جب کہ وہ فواصل آیات پر واقع ہو. مثلاً فلا تفضحون اور وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ حالانکہ عام قاعدہ کے مطابق یہ ہے کہ ایسے کلمات یاء کے ساتھ کتابت کیے جائیں۔

اسم منقوص سے بھی حذف کثرت کے ساتھ ہے. جیسے عَادٍ باغٍ. قاضٍ

(۲) لفظ صلوٰۃ، زکوٰۃ، ربوا اور حیوٰۃ ہمیشہ واو کے ساتھ لکھے جاتے ہیں. حالانکہ یہ بھی عربی رسم خط کا عام ضابطہ نہیں ہے۔

(۳) یا حرف ندا کا الف اور اس کے بعد الف اکثر حذف ہو جاتا ہے. جیسے یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ. یٰآدم. یٰعبادی اور یٰموسٰی اسی طرح ضمیر جمع متکلم کے الف جو نا میں ہے نہیں لکھا جاتا مثلاً انجینٰکم، خلقنٰهم اور انزلنٰه

ائمہ مفسرین نے بیان کیا کہ کتابت قرآن میں اس خصوصی رسم خط کا تحفظ ضروری ہے اور عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مصحف الامام میں جو کلمات جس ہیئت کے ساتھ لکھے گئے ہیں ان کے خلاف رسم الخط کا اختیار کرنا درست نہیں ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ سے مصحف عثمانی سے بعض مواقع میں اس رسم الخط کے

بارہ میں دریافت کیا گیا جو بظاہر قواعد عربیہ اور اصول لغت اور علماء نحو کے مقرر کردہ طریقہ کے خلاف ہیں۔ یا وہ الفاظ عام قواعد کے مطابق کتابت کیے جائیں۔ یا مصحف الامام کی اتباع کی جائے۔ فرمایا ہرگز نہیں بلکہ یہ چاہیے کہ مصحف عثمانی کے رسم خط کی پیروی کرے۔ امام احمد بن حنبل رحؒ سے منقول ہے کہ واو الف اور یی وغیرہ کی کتابت میں مصحف عثمانی کی رسم خط کی مخالفت حرام ہے۔

بیہقی شعب الایمان میں بیان کرتے ہیں جو شخص مصحف لکھے اس کے واسطے ضروری ہے کہ وہ انہی حروف تہجی کے جن کے ساتھ صحابہؓ نے ان مصاحف کو لکھا اور ان کی لکھی ہوئی چیز میں سے کسی شے کو متغیر نہ کرے۔ اس لیے کہ وہ لوگ بہ نسبت ہمارے بہت زیادہ علم رکھتے تھے۔ ان کے قلب پاک اور زبانیں صادق تھیں وہ امانت میں ہم سے بدرجہا بڑھے ہوئے تھے اس لیے یہ بات ممکن نہیں کہ ہم اپنے آپ کو ان کی کسی کمی کا پورا کرنے والا گمان کریں۔[1]

الغرض رسم خط عثمانی کی اتباع لازم ہے۔ اس کے سوا کسی اور رسم خط میں لکھنا اگرچہ وہ عربی ہی ہو جائز نہیں ہے۔ مثلاً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو سورتوں کے شروع میں مصاحف عثمانیہ میں بحذف الف لکھا گیا ہے۔ اور اقرء باسم ربک میں الف کے ساتھ کتابت ہے۔ اگرچہ تلفظ میں دونوں جگہ یکساں ہی تلفظ ہے لیکن کتابت میں فرق کیا گیا ہے۔ اب یہ جائز نہیں ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الف کے ساتھ لکھا جائے یا اقرء باسم ربک کو بسم ربک کی حیثیت میں لکھا جائے۔

بعض احادیث سے ثابت ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ زیدؓ بن ثابت کو بسم اللہ کی کتابت اسی طرح کرنے کے لیے فرمایا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو بسم اللہ کے سین کو طویل اور ظاہر و نمایاں طور پر نہ لکھنے پر ایک درہ کی سزا دی۔

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج ۲۔

کوئی تعجب نہیں کہ قدرت الٰہیہ نے قرآنی رسم خط کا یہ امتیاز اس وجہ سے مقدر فرمایا ہو کہ مصحف قرآنی میں آیات قرآنیہ اور الفاظ کلام اللہ بعینہٖ اسی شکل اور کیفیت کے ساتھ محفوظ رہیں جس طرح کہ وہ لوح محفوظ میں ہیں۔ اسی لیے حضرات صحابہؓ اور ائمہ نے اس کے تحفظ کا اہتمام فرمایا اور بظاہر یہی وہ حکمت اور راز ہے کہ بعض مواقع میں یہ بھی دیکھا گیا کہ ایک ہی لفظ دو مختلف صورتوں میں لکھا ہوا ہے مثلاً وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ[1] لفظ الشجرة اس ہیئت کے ساتھ لکھا ہے تا مدورہ ہے اور یہ آیت جن جن جگہوں پہ ہے اور لفظ شجرہ دیگر آیات میں بھی اسی طرح لکھا ہوا ہے جیسے کلمہ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اور کلمۃ خبیثۃ کشجرۃ خبیثۃ[2] مگر یہی لفظ شجرۃ آیۃ اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ[3] میں ت مستطیل کے ساتھ مکتوب ہے یہی حال لفظ ومعصیت الرسول کا سورۃ مجادلہ میں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس لفظ فی ما کے ساتھ جب آتا ہے تو عربی رسم خط کا قاعدہ ہے ملا کر فیما کی صورت میں لکھا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں یہ لفظ آیا اسی طرح اس کی کتابت ہے لیکن قرآن کریم میں گیارہ جگہوں پہ یہ رسم خط نہیں اختیار کیا گیا بلکہ اس طرح دونوں لفظوں کو علیحدہ لکھا گیا "فی ما" مثلاً فی ما فعلن انفسهن من معروف (بقرہ) اور لیبلوکم فی ما آتاکم (مائدہ) اور قل لا اجد فی ما اوحی الی (انعام) فی ما اشتهت انفسهم (انبیاء) فی ما افضتم شعراء وغیرہ ذالک[4] حالانکہ سورۃ بقرہ ہی میں یہ لفظ جہاں آیا اسی معروف طریقہ پر لکھا ہے مثلاً وَلَا جناح علیکم فیما عرضتم به (بقرہ) اور فیما افتدت به حتیٰ کہ خود آیت فیما فعلن پہلی جگہ آئی تو اسی طرح کتابت ہے۔

اسی طرح لفظ اِنَّمَا عام عربی رسم خط میں اسی طرح ملا کر لکھا جاتا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں بھی یہ لفظ ہر جگہ اسی طرح لکھا گیا لیکن آیت اِنَّ ما توعدون

---

[1] بقرہ۔ [2] سورۃ ابراہیم۔ [3] سورۃ الدخان۔

[4] ان گیارہ مواضع کی تفصیلات کے لیے الاتقان ج ۲ کی مراجعت فرمائی جائے۔

آیات" سورۂ انعام میں لفظ اِن اور ما علیحدہ کرکے مصحف عثمانی میں لکھا گیا اسی طرح عمن اور عمّا ملاکر لکھا جاتا ہے لیکن مصحف عثمانی میں بعض جگہ مثلاً فلمّا عتوا عَن مّا نُهُوا عنه (سورۂ اعراف) اور آیۃ ویصرفه عن من یشاء سورۂ نور میں عَن اور مَن وما کو ملاکر نہیں لکھا گیا تو اسی طرح آج تک ہر مصحف میں اسی رسم خط کی پیروی کی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی رسم خط میں یہ خصوصیات وحی الٰہی اور بذریعہ الہام ملحوظ رکھی گئیں اور مشرق و مغرب اور دُنیا کے ہر گوشہ میں جو بھی مصحف قرآنی ہے وہ اسی رسم خط کی ساتھ محفوظ ہے۔ کسی بھی جگہ اس رسم خط سے اختلاف جائز نہیں۔

شیخ جلال الدین سیوطی نے قرانی رسم خط چھ اصول میں منحصر فرمایا ہے حذف زیادۃ۔ ھمزہ بدل۔ وصل فصل یعنی کسی جگہ حرف کا حذف ہے حالانکہ عام رسم خط کی رو سے وہ حذف نہیں ہوتا جیسے یا حرف ندا کا الف اور ضمیر متکلم کی یا اور کسی موقعہ پر کسی حرف کا اضافہ جب کہ عمومی ضابطہ سے وہ اضافہ لغت عرب میں متعارف نہیں ہے اور بدل کہ کسی ایک حرف کو دُوسرے حرف سے بدل دیا جانا یا مرکب لفظ کو فصل اور مفصول کو ملاکر پڑھانا۔ الغرض قرآنی رسم خط کی خصوصیات ان چھ صورتوں میں منحصر ہیں۔ تفصیل کے لیے حضرات اہل علم الاتقان فی علوم القرآن جلد ۲ کی مراجعت فرمائیں۔

شیخ سیوطی نے قرآنی رسم خط اور کتابت قرآن کے آداب پر ایک مفصل بحث کے دوران فرمایا:

وھل یجوز کتابته بقلم غیر	اور کیا قرآن کریم کی کتابت غیر عربی رسم الخط
العربی قال الزرکشی لم	میں جائز ہے؟ تو علامہ زرکشی بیان کرتے
ارفیه کلاما لاحد من العلماء	ہیں کہ میں نے اس بارہ میں علماء میں سے کسی کا
قال ویحتمل الجواز لانه قد	کوئی قول نہیں دیکھا (یعنی جواز یا عدم جواز
یحسنه من یقرء بالعربیة	کی تصریح نہیں دیکھی) اور یہ فرمایا الخ

الاتقان للسیوطی ج ۲

والا فیرب المنع کما تحرم قرأۃ القرآن بغیر لسان العرب ولقولہم ان القلم احد اللسانین والعرب لا تعرف قلماً غیر العربی وقد قال اللہ تعالیٰ بلسانٍ عربیٍ مبین[1]

امکان ہے کہ جائز ہو کیونکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے جو شخص عربی میں پڑھ سکتا ہے وہ بہتر کتابت کر لیتا ہے غیر عربی میں یعنی عربی رسم خط صرف پڑھ سکتا ہے لیکن لکھنے پر قدرت نہیں ہوتی مگر اقرب الی الحق یہی بات ہے کہ غیر عربی رسم خط ممنوع ہے جیسا کہ قرأت قرآن غیر عربی زبان میں حرام و ممنوع ہے اور نیز اس وجہ سے کہ یہ مشہور ہے کہ قلم یعنی تحریر بھی ایک قسم کی زبان ہے اور اہل عرب تو سوائے عربی رسم خط کسی اور تحریر کو جانتے ہی نہ تھے۔ اور حال یہ ہے کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے۔ "ہم نے اتارا ہے قرآن فصیح اور واضح عربی زبان میں۔

تو معلوم ہوا کہ جس طرح قرآن کریم لفظاً و قرأۃً عربی ہے اسی طرح کتابۃً بھی عربی ہی ہے۔ لہٰذا پھر کیسے درست ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کسی دوسرے رسم خط میں لکھا جائے۔ علامہ شرنبلالی صاحب نورالایضاح جو دسویں صدی کے مشہور فقیہ و محقق اور فقہ حنفی کے مفتی ہیں ان کا اسی موضوع پر ایک مستقل رسالہ "النفحۃ القدسیہ فی احکام قراءۃ القرآن وکتابتہ بالفارسیہ" ہے۔ اس رسالہ میں علامہ نے ائمہ اربعہ کا اس بات پر اجماع و اتفاق نقل کیا ہے کہ کتابت قرآن میں مصحف امام یعنی مصحف عثمانی کے رسم خط کا اتباع ضروری ہے اور غیر عربی رسم الخط میں لکھنا ممنوع ہے۔ اسی رسالہ میں علامہ نے شیخ الاسلام حافظ ابن حجرؒ سے

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ صلہ

نقل کیا ہے :

وقد افاد شیخ الاسلام العلامہ ابن حجر العسقلانی فی فتاواہ تحریم الکتابۃ (بغیر العربیۃ) ونکہ سئل ھل تحرم کتابۃ القرآن الکریم بالعجمیۃ کقراءتہ فاجاب بقولہ قضیۃ ما فی المجموع الاجماع علی التحریم۔

کہ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنے فتاویٰ میں غیر عربی رسم الخط میں قرآن کریم کی کتابت کو حرام فرمایا ہے۔ جب کہ ان سے سوال کیا گیا تھا کہ کیا قرآن کریم کی کتابت بھی عجمی رسم خط میں حرام ہے جس طرح کہ اس کی قرأت عجمی زبان میں حرام ہے تو اس طرح جواب دیا جس کا حاصل یہ ہے کہ غیر عربی رسم خط میں کتابت قرآن کی حرمت پر اجماع ہے۔

حنابلہ کے ایک مشہور و معروف محقق اور امام ابن قدامہؒ کی کتاب "المغنی"[۱] کے حواشی میں اس کو اور بھی زائد واضح کردیا گیا ہے کہ قرآن کریم جب سے دنیا میں نازل ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دعوت عرب و عجم اور تمام عالم کو پیش کی تو کہیں بھی کوئی ایسا واقعہ ثابت نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عجمیوں کی رعایت سے اس کا ترجمہ کرکے بھیجا ہو یا عجمی رسم خط میں اس کے لکھنے کی اجازت دی ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مکاتیب اور نامہائے مبارک شاہان عجم قیصر و کسریٰ اور مقوقس کے نام روانہ فرمائے ان سب کے عکس دنیا کے سامنے آج بھی موجود ہیں کہ نہ ان میں عجمی زبان استعمال کی گئی اور نہ ہی عجمی رسم خط اختیار کیا گیا بلکہ خط کوفی ہی میں لکھے گئے جو عربی رسم خط کی ایک شکل ہے۔

نیز یہ کہ قرآن کریم احکم الحاکمین اور خالق کونین کا کلام ہے اور شہنشاہانہ عظمت کا تقاضہ بھی ہے کہ اسی زبان کی عظمت و برتری ملحوظ رکھی جائے جس زبان میں اللہ نے اس کو نازل کیا ہے۔

---

[۱] مغنی مع الشرح الکبیر ج ۱ صفحہ ۵۲۶ بحوالہ تحذیر الانام عن تغییر رسم الخط عن مصحف الامام۔

اعرابِ قرآن

اہلِ عرب اپنی مادری زبان عربی ہونے کی وجہ سے اس بات کے محتاج نہ تھے کہ قرآن کریم پر اعراب لگائے جائیں اور بغیر اعراب وہ نہ پڑھ سکیں۔ اسی وجہ سے وہ مصحف جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے کتابت کیا گیا اس میں اعراب کا التزام نہیں کیا گیا تھا لیکن کثرت فتوحات کے بعد جب اسلام دور و دراز علاقوں اور عجم میں پہنچا اور لوگ تلاوت قرآن میں اعراب زیر زبر کی غلطیاں کرنے لگے تو اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ صورت بڑھتے بڑھتے قرآن کریم کی تلاوت میں اغلاط اور اختلاف کو نہ پیدا کر دے تو زیاد بن اُمیہ (جو والیٔ عراق تھے) نے ابوالاسود الدؤلی کو پیغام بھیجا کہ اعراب وضع کریں تاکہ اس کے مطابق لوگ قرآن کریم کی تلاوت کیا کریں، تو ابوالاسودؒ[1] نے فتح کی علامت کے لیے حرف کے اُوپر ایک نقطہ تجویز کیا اور کسرہ کے لیے حرف کے نیچے ایک نقطہ اور ضمہ کے لیے حرف کی جانب اور تنوین کے واسطے دو نقطے تجویز کیے۔ شیخ سیوطیؒ فرماتے

---

[1] ابوالاسود الدؤلی کبار تابعین میں سے ہیں۔ حافظ نے تقریب التہذیب میں ان کو مخضرمین یعنی ان حضرات میں شمار کیا ہے جن کا زندگی کا ایک حصہ جاہلیت میں گذرا اور پھر وہ اسلام لے آئے لیکن اسلام لانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف نہ ہو سکے۔ تاریخی روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو اعراب اور قواعد نحویہ کے مرتب کرنے پر مامور فرمایا تھا اور نحو کے بنیادی اصول ان کو املا کرا دیئے تھے جن اصول پر سارا فن نحو مبنی اور موقوف ہے بہرکیف اکثر محققین کی یہی رائے ہے کہ ابوالاسود اعراب کے موجد اول ہیں۔

بعض حسن بصری اور بعض نصر بن عاصم اللیثی اور بعض یحییٰ بن یعمر کو بیان کرتے ہیں۔ ۱۲

ہیں کہ اعراب کی یہ علامات ابوالاسود نے عبدالملک بن مروان کے حکم سے لگائی تھی۔

اعراب قرآن کریم کی تلاوت اور معانی و مضامین کے فہم کے لیے ایک اہم ترین بنیاد تھی۔ اللہ رب العزت نے امت کے برگزیدہ افراد کو خدمت قرآن کی توفیق کے ساتھ اس کی بھی توفیق عطا فرمائی کہ وہ امر عظیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ ابن ابی ملیکہ بیان کرتے ہیں ایک اعرابی (دیہاتی) عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں آیا اور کہا " کوئی شخص ہے ایسا جو مجھے قرآن پڑھا دے" ایک شخص نے اس کو سورۂ براۃ پڑھائی تو اس آیت اِنَّ اللّٰہَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلُہٗ میں لفظ رسولہ کو جر (یعنی زیر) کے ساتھ پڑھایا یعنی وَرَسُوْلِہٖ۔ اس تغیر سے معنی قطعاً فاسد ہوگئے۔ کیونکہ ایسی صورت میں ترجمہ یہ کیا جائے گا" بیشک اللہ بیزار و بری ہے مشرکین سے اور (العیاذ باللہ) اپنے رسول سے۔ اس اعرابی نے جب اس طرح اس کو تلفظ کرتے سنا تو کہنے لگا جب اللہ اپنے رسول سے بری ہے تو پھر میں بھی بری ہوں اور عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ بیان کیا۔ عمر فاروقؓ نے اس کو سمجھایا اور بتایا کہ قرآن میں یہ بات اس طرح نہیں ہے بلکہ دراصل یہ ہے اِنَّ اللّٰہَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلُہٗ کہ اللہ اور اس کا رسول دونوں بری ہیں مشرکین سے۔ اس کے بعد عمر فاروقؓ نے حکم دیا سوائے عالم عربیہ لغت کے کوئی شخص بھی کسی کو قرآن شریف نہ پڑھائے اور ابوالاسود کو علم نحو وضع کرنے کا حکم دیا۔

قرآن کریم کو اعراب سے مزین کرنا خود منشاء نبوت کے مطابق ہے۔ سلفی نے عبداللہ بن عمرؓ سے مرفوعاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے فرمایا: اَعْرِبُوا الْقُرْاٰنَ یَدُلُّکُمْ عَلٰی تَاوِیْلِہٖ۔ کہ قرآن کریم پر اعراب لگاؤ کیونکہ اعراب قرآن کریم کے معانی اور مراد کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

ابوبکرؓ اور عمرؓ فاروق رضی اللہ عنہما سے منقول ہے فرمایا کرتے تھے کہ اعراب سے ہم کو

لہ الاتقان فی علوم القرآن۔ الجامع الاحکام القرآن للقرطبی۔

اس کے حروف کی حفاظت زائد محبوب ہے۔

ابن خلکان بیان کرتے ہیں کہ ابوالاسود نے جب ایک شخص کو آیتہ اَنَّ اللّٰہَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلُہٗ غلط پڑھتے ہوئے سنا کہ وہ بجائے وَرَسُوْلُہٗ کے وَرَسُوْلِہٖ پڑھ رہا ہے جس سے فساد معنی ظاہر ہے تو ابوالاسود کو یہ چیز بہت ہی گراں گذری اور اسی وقت عزم کیا کہ قرآن کریم پر اعراب لگاؤں۔ چنانچہ ابوالاسود نے دس اشخاص کو منتخب کر کے آیاتِ قرآنیہ پر اعراب لگانے کا کام شروع کردیا۔ ابتدائی مرحلہ میں اعراب کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ آیات قرآنیہ کی کتابت جس رنگ سے ہوتی ہے اس کے علاوہ دوسرے رنگ کے حروف پر نقطے لگائے گئے فتح کے لیے حرف پر ایک نقطہ ضمہ کے لیے حرف کے کنارہ پر ایک نقطہ اور کسرہ کے لیے حرف کے نیچے اور تنوین کے لیے دو نقطے مقرر کیے۔ اس شکل قرآن کریم کو از اول تا آخر مُشکّل اور مُعَرّب کردیا گیا۔ کچھ عرصہ تک یہ اصطلاح اسی طرح مروج رہی بعد میں علم نحو کے ایک مشہور امام ابوعبدالرحمٰن الخلیل کے زمانہ میں اس صنعت کو ترقی ہوئی اور فتح کے لیے حرف کے اوپر والے نقطہ کو ایک مستطیل شکل دے دی گئی اور اسی طرح کسرہ والے نقطہ کو حرف کے نیچے مستطیل شکل میں لکھا جانے لگا۔ اور ضمہ کے لیے چھوٹے سے واؤ کی صورت تجویز کرلی گئی اور پھر اسی کے مطابق اعراب (زبر زیر اور پیش) لکھے جانے لگے۔ اور اعراب کی وہ سابق علامات کالعدم ہوگئیں۔

قرآن کریم کے اجزاء و رکوع اور اعشار کی تقسیم

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ مصحف قرآنی پر اعراب اور نقطوں کی تعیین عبدالملک بن مروان کے حکم سے ہوئی۔ اور اس کام کے لیے حجاج بن یوسف مقام واسط میں یکسو اور فارغ ہو کر بیٹھا اور اس عظیم مقصد کے لیے بڑی جدوجہد کی۔ اعراب و نقط کی مہم کے ساتھ حجاج نے قرآن کریم کے اجزا کا تجزیہ اور تیس پاروں پر تقسیم کی۔[۱]

[۱] احکام القرآن قرطبی ج ۱

تاریخی روایات و نقول سے معلوم ہوتا ہے کہ حجاج ہی کے زمانہ میں اعشار اور رکوع مقرر کیے گئے۔

عبدالملک بن مروان نے اسی خدمت کے لیے حسن بصری اور یحییٰ بن یعمر کو بھی مقرر کیا۔ زبیدی نے کتاب الطبقات میں بیان کیا ہے کہ سب سے پہلے مصحف پہ نقطے ابوالاسود دئلی نے قائم کیے۔ یحییٰ بن ابی کثیر بیان کرتے ہیں کہ ابتداء قرآن میں مصحف قرآن کریم نقطوں اور اعراب سے خالی تھا۔ سب سے اوّل علماء امت نے ب ت ث پر نقطے قائم کیے۔ جمہور علماء نے جب اس چیز کو دیکھا تو سب کی بالاتفاق یہی رائے ہوئی کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور فرمایا بلکہ یہ تو نور علیٰ نور ہے[1]۔ پھر ختم آیات پر بھی علامت کے طور پر نقطے لگائے گئے جس کو بعد میں گول دائرہ کی صورت میں اختیار کر لیا گیا۔

بہرحال اس طرح امت نے کتاب الہٰی کی حفاظت کی اور اس کی خدمت کا اہتمام کیا کہ تاریخ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔ روئے زمین کے مسلمانوں نے مصاحف قرآنیہ کے لیے اسی طرز کو پسند کیا اور مشرق و مغرب کے تمام بلاد میں مصاحف قرآن اسی طرح اجزاء و اعشار کی رعایت کے ساتھ طبع ہونے لگے۔ حق تعالیٰ شانہ نے اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ میں کتاب الہٰی کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ بحمداللہ پورا ہو کر رہا اور انشاءاللہ العزیز قرآن کریم اسی طرح قیامت تک محفوظ رہے گا اس کے کسی زیر زبر اور نقطہ تشدید میں بھی تغیر و تبدیلی پر کوئی قادر نہ ہو سکے گا۔

فَسُبۡحٰنَ الَّذِیۡ مَنۡ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَلَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا۔

[1] احکام القرآن للقرطبی ج ۱۔

آیات اور سورتوں کی ترتیب

آیات قرآنیہ کی ترتیب جس پر قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے بلا شبہ توقیفی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے متعین اور طے کردہ ہے۔ جس میں کسی کے اجتہاد و قیاس کو ادنیٰ بھی دخل نہیں۔ جس طرح آنحضرت نے آیات کلام اللہ کی ترتیب بتا دی اسی پر اس کی تلاوت کی جانے لگی اور اسی کے مطابق جمع و تدوین آیات کو جمع و مرتب کیا گیا جیسا کہ مباحث سابقہ میں یہ چیز ذکر کی گئی۔ اسی پر اجماع ہے۔ کثرت و تواتر سے نصوص اور روایات اسی امر پر دلالت کر رہی ہیں کہ آیات قرآنیہ کی ترتیب توقیفی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر کردہ ہے۔ علامہ زرکشی نے "برھان" اور جعفر بن الزبیر نے اس پر امت کا اجماع نقل کیا ہے[1]۔

علامہ سید محمود آلوسی فرماتے ہیں جن بعض آثار اور اقوال ترتیب کے اجتہادی ہونے کا گمان کیا جاتا ہے وہ اقوال و آثار درجہ اعتبار سے ساقط ہیں اور سند کی حیثیت سے اس قابل نہیں کہ ان کو معتبر شمار کیا جائے[2]۔

ابن الحصار[3] کا قول ہے کہ سورتوں اور آیات کی ترتیب اور وضع اپنے اپنے مواقع میں وحی خداوندی ہی سے ہوتی تھی چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر آیت کے نازل ہونے کے بعد فرما دیتے تھے اس آیت کو فلاں سورت میں فلاں جگہ اور فلاں آیت کے بعد رکھو۔ یعنی یہ آیت اس آیت کے بعد اس سورت میں تلاوت کی جائے گی۔

عثمان بن ابی العاص سے روایت ہے:

---

[1] الاتقان ج ۱ ۔ [2] روح المعانی ج ۱ صـ ۳۵

[3] الاتقان فی علوم القرآن ج ۱

قال کنت جالساً عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذ شخص ببصرہ ثم صوّبہ ثم قال اتانی جبریل علیہ السلام اتانی فامرنی ان اضع ھذہ الایۃ ھذا الموضع من ھذہ السورۃ ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربٰی[1]

بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ناگہاں آپ نے اپنی نظر آسمان کی جانب اٹھائی اور پھر آپ نے نگاہ کو نیچے فرما لیا اور اس کے بعد فرمایا کہ میرے پاس جبریلؑ آئے اور انہوں نے کہا کہ میں اس آیت کو فلاں سورت میں اس موقعہ پر رکھوں ، آیت ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربٰی ۔ الخ

مسند احمد بن حنبلؒ کی ایک اور روایت میں یہ مضمون بھی ہے جبرئیل امین وحی الٰہی پہنچا دینے کے بعد بیٹھے رہتے تھے یہاں تک ان آیات کی جب کاتبین وحی سے کتابت کرادی جاتی تو پھر آپؐ جبریل امینؑ کو وہ آیات سُنا دیتے تاکہ کتابت میں کسی نوع کی فروگذاشت نہ رہے ۔ اس کے بعد جبرئیل امین آپؐ کی مجلس سے واپس جاتے ۔

امام بغویؒ شرح السنہ میں فرماتے ہیں کہ حضرات صحابہ نے مجموعۂ اوراق میں یکجا اسی قرآن کو جمع کیا تھا جو اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پہ نازل کیا بغیر اس کے کہ اس میں کوئی کمی یا زیادتی اور تغیر کریں ۔ اس کو اسی ترتیب سے مرتب و جمع کیا جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا کرتے تھے ۔ ہرگز ایسا نہیں کیا کہ اس میں سے کسی چیز کو مقدم کردیں یا مؤخر کردیں یا ایسی کسی ترتیب سے مرتب کریں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین نہ فرمائی ہو ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو قرآن کریم کی تعلیم اسی ترتیب سے دیتے تھے ۔ جو ترتیب آج ہمارے سامنے مصاحف قرآن میں موجود ہے ۔ صحابہؓ نے اپنی تمام تر کوشش اور جدوجہد سے

---

[1] مسند احمد بن حنبل ۔ ۱۲

قرآن کو اسی ترتیب کے ساتھ جمع اور مرتب کیا جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھی تھی[1] قرآن لوح محفوظ میں بھی اسی ترتیب کے ساتھ مرتب تھا جو آج ترتیب تلاوت ہے جس میں حسب ضرورت و مصلحت مختلف اوقات میں متفرق اور متعدد جگہوں اور سورتوں کی آیات نازل ہوتی رہیں اور جب بھی جبریل کوئی آیت لے کر آتے اس کی ترتیب متعین کر دیتے جو لوح محفوظ میں ترتیب آیات کے مطابق ہوتی جس پر آنحضرت صحابہ کو مطلع فرما دیتے اور اسی کے مطابق حفظ اور تلاوت کی ہدایت و تاکید فرما دیتے۔

جمہور علماء کے نزدیک سورتوں کی ترتیب کا بھی یہی حال ہے کہ سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے۔ شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے ایک قول یہ نقل کیا کہ سورتوں کی ترتیب اجتہادی ہے۔ اور بعض مشائخ کا خیال یہ ہے کہ قرآن کریم کی اکثر سورتوں کی ترتیب تو توقیفی ہے لیکن بعض کی ترتیب اجتہادی ہے جیسا کہ بعض آثار اور اقوال سے ایسا ظاہر ہوتا ہے۔ روایات صحیحہ اور مرفوعہ نیز دلائل سے یہی ظاہر ہے کہ قول اول ہی راجح اور قوی بلکہ صحیح ہے[2]۔

ابوبکر الانباریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام قرآن کریم آسمان دنیا پر یک وقت نازل فرما دیا تھا پھر متفرق طور پر بیس سال (یعنی تئیس سال، کسر کو حذف کرتے ہوئے) کی مدت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اترتا رہا۔ بعض سورتیں نازل ہوتیں۔ بعض پیش آنے والے واقعات پر اور بعض آیات کسی سوال کے جواب میں اترتیں اور جبریل امینؑ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کرتے رہتے کونسی سورت کس جگہ اور کونسی آیت کس موقعہ کے ساتھ مربوط ہے تو آیات اور سورتوں غرض جملہ کلمات کا تسلسل اور ان کی ترتیب سب کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء والمرسلین کی طرف سے ہے۔ اس لیے اب اگر کوئی شخص کسی مقدم سورت کو مؤخر یا مؤخر کو مقدم کرے گا تو ایسا ہی ہوگا جیسا کہ کوئی آیات کی ترتیب بگاڑ دے یا

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ؛ [2] الاتقان فی علوم القرآن

حروف وکلمات میں تغیر و تبدل کر دے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ترتیب (بذریعہ وحی) رب العالمین سے حاصل کی وہ خود ہی فرما دیا کرتے فلاں سورت فلاں جگہ پر رکھو اور یہ آیت فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب توقیفی ہونے کی دلیل احمد بن حنبلؒ اور ابوداؤد کی وہ حدیث بھی ہے جس میں وفد ثقیف کے اسلام لانے کے بعد حاضری کا قصہ بیان کیا گیا۔ اس میں یہ ہے:

فقال لنا رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم طرأ على حزبي من القرآن فاردت ان لا اخرج حتى اقضيه قال فسألنا اصحاب رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قلنا كيف تحزبون القرآن قالوا نحزبه ثلث سور و خمس سور وسبع سور وتسع سور واحدى عشرة سورة وثلاث عشرة سورة وحزب المفصل من ق حتى نختم القرآن [2]	کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا مجھ پر طاری تھا (یعنی مشغول تھا) تلاوت قرآن کا میرا معین کردہ حصہ تو میں نے ارادہ کیا کہ میں اس کو پورا کیے بغیر باہر نہ نکلوں۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ سے دریافت کیا کہ آپ لوگ قرآن کریم کے حصے کس طرح مقرر کرتے ہیں؟ کہنے لگے ہم اس کے حصے کر لیتے ہیں تلاوت کے لیے تین سورتیں، پانچ سورتیں، سات سورتیں، نو سورتیں، گیارہ سورتیں، تیرہ سورتیں، (گویا اس طرح بطور ورد اور وظیفہ ہم اس قدر حصہ کی تلاوت کا معمول بنا لیتے ہیں) اور مفصلات کا حصہ سورۃ قٓ سے ختم قرآن تک کر لیتے ہیں۔

---

[1] الجامع الاحکام القرآن قرطبی ج ۱ صفحہ
[2] فتح الباری بحوالہ الاتقان ج ۱

بہرکیف اس نقل سے یہ بات ظاہر ہوگئی حضرات صحابہؓ آیات کلام اللہ اور سورتوں کی ایک طے اور متعین کردہ ترتیب ہی کے لحاظ سے تلاوت کیا کرتے تھے اور یہ امر یقینی ہے وہ ترتیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی طے کردہ تھی جس پر آج بھی کلام اللہ کی تلاوت کی جاتی ہے۔

علامہ آلوسیؒ مقدمہ تفسیر[1] روح المعانی میں اس بحث کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ طیبیؒ نے بھی اسی کو بیان کیا ہے اور کہا کہ یہی قول جمہور علماء اور ائمہ تفسیر کا مسلک ہے۔ البتہ صرف اس روایت[2] کے پیش نظر قدرے اشکال واقع ہوتا ہے جس میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے سورۃ انفال و سورۃ براۃ کی ترتیب کے بارے میں سوال کیا کہ ان دو سورتوں کو اس طرح کہ انفال مقدم ہے اور سورۃ براۃ بعد میں ہے دونوں کو ملا کر مصحف میں مرتب کیا گیا اور بسم اللہ کی سطر درمیان میں نہیں لکھی گئی جیسا کہ ہر سورت کے ختم اور دوسری سورت کے شروع پر لکھی جاتی ہے تو حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ سورۃ انفال مدینہ منورہ کی ابتدائی زندگی میں نازل ہونے والی آیات ہیں اور سورۃ براۃ مدنی زندگی کے آخر میں نازل ہونے والی سورت ہے۔ دونوں سورتوں کا مضمون باہم مشابہ اور مماثل تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رحلت فرما گئے اور ہمارے سامنے آنحضرت نے یہ واضح نہیں فرمایا کہ سورۃ براۃ انفال کا حصہ ہے یا نہیں (یعنی یا مستقل سورت ہے) تو اس وجہ سے میں نے دونوں سورتوں کو مصحف میں متصل رکھا اور بسم اللہ کی سطر درمیان میں نہیں لکھی (کیونکہ بسم اللہ تو ان دو سورتوں کے درمیان مصحف میں لکھی جاتی ہے جن کا مستقل سورت ہونا متعین اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریح سے ثابت ہو) اور ان دونوں کو اسی وجہ سے سبع طول یعنی ان سات لمبی سورتوں میں رکھا جو قرآن کریم کے ابتداء میں مرتب ہیں۔

---

[1] تفسیر روح المعانی ج ۱ ص ۲۶ ۔ [2] مسند احمد بن حنبلؒ ۔ سنن ابی داؤد ۔ مشکوٰۃ المصابیح فضائل القرآن ۔

تو صرف اس ایک حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں کی ترتیب وضع میں اجتہاد کو دخل رہا ہے اسی بناء پر امام بیہقی اس جانب مائل ہوگئے کہ قرآن کی تمام سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے بجز ان دو سورتوں کے کہ انفال و براۃ کی ترتیب اجتہادی ہے۔ شیخ سیوطی رحمۃ اللہ کا رجحان بھی کچھ اسی طرف معلوم ہوتا ہے[1]۔ لیکن بیان کردہ نقول و روایات کے پیش نظر اس ناچیز کا میلان اور قلبی انشراح اس امر پر ہے کہ مصحف کلام اللہ از اول تا آخر اپنی ترتیب و تالیف کے اعتبار سے اسی ترتیب پر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرما دی تھی نیز یہ بات بھی قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم میں کوئی چیز بلا وضاحت و تصریح کیے ہوئے مخفی اور مبہم رہنے دیں۔ بہرکیف صحابہؓ قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ یہ امر پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا کہ وہ حضرات انفال و براۃ کس ترتیب سے مصحف میں پڑھتے ہیں۔ اس بناء پر یہی مسلک اور قول اولیٰ و انسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی تمام سورتوں کی ترتیب بھی آیات کی طرح علی الاطلاق توقیفی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معین فرمودہ ترتیب کے عین مطابق ہے اور ان دو سورتوں کی ترتیب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ترتیب تلاوت کے مطابق ہے۔ غایۃ ما فی الباب اس موقعہ پر اجتہاد کو صرف اس حد تک دخل ہے کہ انفال و براۃ دو علیحدہ اور مستقل سورتیں ہیں یا یہ ایک ہی سورت ہے۔

اصل الفاظ حدیث اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ابن عباس کے سوال کے جواب میں جو کلمات کہے ان سے یہی مفہوم مترشح ہوتا ہے واللہ اعلم بالصواب۔

٭

[1] تفسیر روح المعانی ج ۱۔

مقطعات قرآنیہ

قرآن کریم میں متعدد سورتوں کی ابتدا الٓمٓ الٓمٓرا اور حٰمٓ جیسے حروف سے کی گئی۔ ان حروف کو جو حروف تہجی کے طور پر تلاوت کیے جاتے ہیں مقطعات قرآنیہ کہا جاتا ہے۔ خلفاء راشدین جمہور صحابہ و تابعین اور اکثر ائمہ تفسیر کے نزدیک یہ منجملہ متشابہات ہیں جن کی تاویل و حقیقت اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ "کہ خداوند عالم ہی نے آپ پر کتاب کو (قرآن) نازل کیا ہے جس میں سے آیات محکمات ہیں جو ام الکتاب ہیں اور کچھ آیات متشابہات ہیں۔ متشابہات کے بارہ میں فرمادیا گیا:

لَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؔ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا (آل عمران)	کہ ان کی تاویل و حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے ہر چیز ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہر کتاب میں ایک سر (یعنی راز) ہوتا ہے اور قرآن کا سر اوائل سور یعنی سورتوں کے ابتدا یہ کلمات ہیں[1]۔

حضرت علی رضی اللہ سے بھی ایسا ہی نقل کیا گیا فرمایا ہر کتاب میں ایک خاص بات ہوتی ہے اور قرآن میں خاص بات یہ حروف تہجی ہیں[2]۔

بعض سلف نیز متکلمین کی ایک جماعت اور ائمہ نحو و عربیہ میں سے سیبویہ اور خلیل یہ کہتے ہیں کہ یہ ان سورتوں کے اسماء اور نام ہیں جن کے شروع میں ان کو

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ٭ [2] تفسیر کبیر ج ۲

لایا جاتا، گویا جو مضامین ان سورتوں میں ذکر کیے جائیں گے یہ حروف ان مضامین کے لیے عنوان اجمالی کا درجہ رکھتے ہیں اور جس طرح عنوان مضامین کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اسی طرح مقطعات قرآنیہ بھی اس نوع کا ایک باطنی رمز اور اشارہ ہوتے ہیں۔

مثلاً صحیح بخاری کا نام "الجامع الصحیح المسند من احادیث الرسول صلی اللہ علیہ وسلم من سننہ وایامہ" کتاب بخاری کے جملہ مفصل مضامین کا اجمالی عنوان ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے کہ مقطعات قرآنیہ اسرار و رموز ہیں جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ فرماتے ہیں[1] جس طرح مرکبات کلامیہ کا مفید معنی ہونا اجزاء ترکیبیہ یعنی اس کے مفردات کے مفید معنی ہونے پر موقوف ہے اسی طرح کلمات مفردہ کا بھی مفید معنی ہونا اس کے اجزاء ترکیبیہ کے (جو کہ حروف ہجائیہ ہیں) مفید معنی ہونے پر موقوف ہوگا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کلام میں جس درجہ ترکیب ہوگی معنی میں بھی اسی درجہ ترکیب ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ مرکبات اضافیہ اور توصیفیہ میں جس درجہ مرکبات کلامیہ اور جملہ تامہ سے ترکیب کم ہوتی ہے۔ اسی درجہ میں ان کے معانی میں بھی کمی اور قصور رہتا ہے۔ مرکبات اضافیہ اگرچہ فی حد ذاتہ مرکب ہیں مگر مرکبات تامہ خبریہ کے لحاظ سے فی الجملہ بسیط ہیں تو اسی نسبت سے ان کے معنی میں بھی بساطت اور اجمال ہے۔ تو علیٰ ہٰذا القیاس حروف ہجائیہ کلمات کا مادہ ہونے کی وجہ سے مرکبات اضافیہ بلکہ الفاظ مفردہ سے بھی زائد بسیط ہوئے تو اسی نسبت سے ان کے معنی میں بھی انتہا درجہ کا بساطت اور غایۃ اجمال ہوگا، جس کا سمجھنا بغیر تفہیم الٰہی اور تائید غیبی ممکن نہ ہوگا۔

---

[1] الفوز الکبیر۔

علامہ زمخشریؒ اور قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ یہ حروف مقطعات حروف تہجی کے اسماء ہیں اس لیے کہ یہ بات ظاہر ہے کہ کلام کا مادہ اور عنصر یہی حروف تہجی ہیں اور ان ہی سے مل کر کلام بنتا ہے تو قرآن کریم کی بعض سورتوں کو ان حروف سے شروع کرنا اعجازِ قرآن کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ قرآن کریم انہی حروف و کلمات کا مجموعہ جن کو یہ لوگ اپنی زبان میں استعمال کرتے ہیں، تو اے منکرو اور کلام الٰہی کے بارے میں شک و شبہ کرنے والو اگر تم اس قرآن کو کلام الٰہی نہیں مانتے بلکہ یہ دعوی ہے کہ یہ کسی بشر کا کلام ہے تو تم ایسا کلام پیش کر کے دکھا دو کیونکہ اس کلام کا مادہ وہی حروفِ تہجی ہیں جو تمہارے کلام کا عنصر اور مادہ ہے۔ پھر آخر تم کیوں ایسا کلام پیش کرنے سے عاجز ہو؟ اس وجہ سے یہ ظاہر ہوا کہ یہ قرآن اللہ ہی کا کلام ہے۔ بالخصوص جب کہ ان مقطعات کو پیش کرنے والا شخص محض اُمّی ہے جس نے نہ کبھی کسی مکتب کا دروازہ جھانکا اور نہ کسی معلم و استاد کے سامنے زانوے اَدب تہ کیا اور تم فصحا و بلغاء اور مایۂ ناز شعراء اس کے باوجود بتاؤ کیوں عاجز ہو؟

اور پھر جن دقائق اور نکات کی رعایت رکھتے ہوئے ان حروف کو سُورتوں کی ابتدا میں جمع کیا، ان کو سن کر بڑے سے بڑا ادیب اور فصیح و بلیغ شخص بھی مبہوت و حیران ہے۔

قاضی بیضاوی نے سُورتوں کی ابتداء میں ان حروف کو جمع کرنے کے لطائف اور نکات پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔ اہلِ علم تفسیر کشاف اور بیضاویؒ کی مراجعت فرمائیں۔

علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں حروفِ مقطعات حق تعالیٰ کی طرف سے اسرار و رموز کا درجہ رکھتے ہیں اور ان اسرار کو اللہ اور اس کا رسُول صلی اللہ علیہ وسلم ہی جانتا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ رموز ان حضرات پر بھی منکشف ہوتے ہیں جو من جانب اللہ علوم نبوت کے وارث اور اسرار شریعت سے باخبر،

بن گئے۔ اور علمناہ من لدنا علما کا مقام ان کو حاصل ہے۔ بلکہ بعض اوقات یہ حروف اپنے میں ودیعت رکھے ہوئے اسرار ایسے عارفین اور علوم نبوت کے وارثین کے سامنے خود بخود اس طرح بولنے لگتے ہیں جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں سنگریزے تسبیح پڑھتے اور صحابہؓ اس تسبیح کو سنا کرتے۔

اصل یہی ہے کہ باطنی حقائق و معارف اور اسرار و رموز کا وہی ادراک کر سکتے ہیں جو ارباب باطن ہوں، جو باطنی صفائی اور قلبی نورانیت میں اس مقام پہ نہ پہنچے ہوں۔ ان کا عدم ادراک حجت نہیں[1]

علامہ آلوسیؒ کے اس مضمون کی تائید میں یہ حدیث بیان کی جاسکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لِکُلِّ آیۃٍ ظھرٌ و بطن	ہر آیت کے لیے ایک ظاہری مدلول و مفہوم ہوتا ہے اور ایک باطنی مفہوم یعنی اسرار و رموز جو لفظ کی گہرائیوں میں چھپے ہوتے ہیں۔

---

[1] تفسیر روح المعانی۔

محکمات و متشابہات کی بحث

قرآن کریم کی آیات میں ایک حصّہ محکمات کا ہے اور دُوسرا متشابہات کا۔ اکثر آیات تو محکمات ہیں اور چند آیات کو علماء مفسرین نے متشابہات کے درجہ میں فرمایا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہے۔

هُوَ الَّذِی اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ (آل عمران)	وہی پروردگار عالم ہے جس نے آپ پر کتاب نازل کی جس میں کچھ آیات محکمات ہیں جو ام الکتاب (اور مدار احکام شرعیہ) ہیں اور دُوسری بعض آیات متشابہات ہیں۔

محکم اور متشابہ کے مفہوم کی وضاحت مختلف عنوانات و تعبیرات کے ساتھ کی گئی ہے۔ شیخ سیوطیؒ فرماتے ہیں بعض ائمہ کے نزدیک محکم اس کو کہا جاتا ہے جس کی مراد معلوم اور متعیّن ہو۔ خواہ اس وجہ سے کہ الفاظ کی دلالت اپنے اُس مفہوم پر واضح ہے یا اس وجہ سے اس کی تفسیر و تشریح آثار و روایات سے اسی طرح کی گئی۔ اور متشابہ وہ ہے جس کا علم خدا تعالیٰ نے اپنے واسطے مخصوص کر لیا ہے اور اپنے بندوں میں سے کسی کو قطعی اور یقینی طور پر اس کی مراد پر مطلع نہیں کیا جیسے حق تعالیٰ کی صفات متشابہات مثلاً استواء علی العرش اور کشف ساق وغیرہ اور اسی طرح مقطعات قرآنیہ الٓر الٓمٓ اور حٰمٓ وغیرہ۔

بعض علماء سے یہ نقل کیا گیا کہ محکم وہ ہے جس کے ایک معنی متعیّن ہوں اور کسی تاویل و توجیہ کے ذریعے دُوسرے کسی مفہوم کا امکان نہ ہو۔ مثلاً اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ اور متشابہ اس کو کہا جائے گا جس میں مختلف معانی اور

متعدد احتمالات کا امکان ہو۔[1]

جمہور علماء نے قول اوّل ہی پسند اور اختیار کیا ہے جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا

فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ	بہرحال وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی (ٹیڑھاپن) ہے وہ درپے ہوتے ہیں کلام اللہ میں سے ان چیزوں کے جو متشابہ ہیں محض فتنہ تلاش کرنے کے لیے اور غلط معنی کی طرف پھیرنے کے لیے اور حالانکہ متشابہ کی تاویل سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں رسوخ و پختگی رکھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اس پر کہ ہر ایک ان محکم و متشابہ میں سے ہمارے رب ہی کی طرف سے ہے۔ اور ان چیزوں سے سوائے عقل والوں اور کوئی نصیحت نہیں قبول کرتے ۔

تو اس آیت نے واضح کر دیا کہ متشابہات کی کھوج اور تحقیق میں پڑنا زائغین اور کج فہم و کج روش لوگوں کا کام ہے ۔ علماء ربانیین اور راسخین فی العلم کا شعار یہی ہے کہ وہ اللہ کے حوالہ کرتے ہیں اور اسی کو اپنی سعادت تصور کرتے ہیں ۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو تلاوت کر کے فرمایا اے عائشہ جب تم اس قسم کے لوگوں کو دیکھو تو ان سے پرہیز کرنا ۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا نام اللہ تعالیٰ نے زائغین میں سے ہونے کی حیثیت سے متعین کر دیا ہے[2]۔

ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے ۔ فرمایا :

نؤمن بالمحکم و ندین بہ — کہ ہم محکم پر ایمان لاتے ہیں اور اس پر

---

[1] الاتقان ۔ علم الکلام ۔ [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم ۔

ونؤمن بالمتشابه ولا نذہب بہ شبہ — عمل بھی کرتے ہیں اور متشابہ پر ایمان لاتے ہیں۔ لیکن اس پر عمل نہیں (کیونکہ ہم اس کے مکلف نہیں ہیں۔

مسند دارمی میں سلیمان بن لیسار سے منقول ہے کہ ایک شخص جس کو صُبَیغ کہا جاتا تھا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مدینہ منورہ حاضر ہوا اور لوگوں سے متشابہات قرآن کے بارہ میں تحقیق و تفتیش کرتا تھا۔ فاروق اعظم نے اس کو طلب فرمایا اور اس شخص کے آنے سے پہلے ہی کچھ کھجور کی چھڑیاں منگا کر رکھ لیں۔ جب یہ شخص آیا تو دریافت کیا تو کون ہے۔ اس نے بتایا کہ میں عبداللہ بن صبیغ ہوں۔ حضرت عمرؓ نے اس کو چھڑیوں سے مارنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ خون آلود ہو گیا اور ابو موسیٰ اشعریؓ کے پاس فرمان بھیجا کہ مسلمانوں میں سے کوئی شخص ہرگز اس کے پاس بھی نہ بیٹھے۔

طبرانی نے ایک روایت کبیر میں تخریج کی فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے تھے کہ میں اپنی امت پر سب سے زیادہ جن چیزوں کا اندیشہ اور خوف کرتا ہوں ان میں سے ایک یہ بھی ہے لوگ کتاب اللہ کی ایسی آیات میں تاویلات کا دروازہ کھول لیں۔ حالانکہ ان کی تاویل و حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

متشابہات قرآن کی دو قسمیں ہیں۔ ایک نوع یہ ہے کہ ان کے معنی ہی دلالت لغت اور وضع عربیہ کے اعتبار سے معلوم اور متعین نہیں۔ مثلاً مقطعات قرآنیہ اگرچہ ان مقطعات کے بعض حضرات مفسرین اور صوفیاء و عارفین نے کچھ معانی اور مفاہیم بیان کیے ہیں لیکن وہ صرف وجدانی اور ذوقی چیزیں ہیں اور ارباب باطن کے الہام کی حیثیت رکھتی ہیں قطع و یقین سے ان معارف و لطائف کو مراد کلام اللہ اور تفسیر قرآن نہیں کہا جا سکتا تو ان حضرات کے ایسے بیان کردہ لطائف محض ظنی امور ہیں۔ جمہور کا مسلک یہی ہے جیسا کہ ان مقطعات پر لکھ دیا جاتا ہے۔ اللہ اعلم بمرادہ بذٰلک یعنی اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ ان حروف سے اس کی کیا

لہ الاتقان۔

مراد ہے۔

متشابہات کی دوسری نوع وہ آیات ہیں جن کے معنی وضع عربیہ اور قواعد کی رُو سے تو معلوم اور مفہوم ہیں لیکن اس کی حقیقی مراد اللہ کے نزدیک کیا ہے؟ اس تک عقول و افکار کی رسائی اور پرواز نہیں۔ وہ حق تعالیٰ کی صفات متشابہات ہیں؎۔ مثلاً اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى۔ رحمٰن عرش پر مستوی ہوا۔ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اُوپر ہے) هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ (نہیں انتظار کر رہے ہیں وہ کسی چیز کا بجز اس کے کہ اللہ ان کے پاس آجائے بادلوں کے سائبانوں میں) اور یوم یکشف عن ساق (وہ دن کہ جس دن پنڈلی سے حجاب کو کھولا جائے گا) غرض ایسے ہی وہ تمام آیات جن میں اللہ رب العزت کی صفات اور شئون کا ذکر ہے تو اہل حق کا مسلک اس بارے میں بھی یہی ہے کہ ظاہر پر ایمان لایا جائے بغیر اس تحقیق کے کہ اللہ کا ہاتھ اور استواء کی کیا کیفیت ہے۔

امام مالکؒ سے دریافت کیا گیا کہ اللہ عرش پر کس طرح مستوی ہے تو جواب میں فرمایا اَلْاِسْتِوَاءُ مَعْلُوْمٌ وَالْكَيْفُ مَجْهُوْلٌ وَالْاِيْمَانُ بِهٖ وَاجِبٌ وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ۔ "کہ استواء تو معلوم ہے لیکن اس کی کیفیت مجہول ہے اور اس پر ایمان واجب ہے اور سوال و تحقیق بدعت ہے۔"

؎ قرآن کریم میں بیان کردہ صفات دو قسموں پر مشتمل ہیں ایک قسم وہ کہ جن کے معنی واضح اور ظاہر ہیں۔ مثلاً علم قدرت ارادہ اور کلام وغیرہ۔ ایسی صفات کو صفات محکمات کہا جاتا ہے۔ ان صفات پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اور اس پر اجماع ہے کہ ان میں کسی نوع کی تاویل جائز نہیں۔ دوسری قسم صفات کی وہ ہے کہ معنی میں ابہام اور خفا ہے۔ محض مدلولِ لفظی اور وضعی سے کوئی مراد علم یقینی اور قطعی کے درجہ میں نہیں حاصل ہوتی۔ رائے اور قیاس کا وہاں کوئی دخل نہیں۔ کشف و الہام کی کوئی رسائی نہیں جیسے وجہ ید اللہ استواء علی العرش اور کشف ساق وغیرہ۔ ان صفات کو صفات متشابہات کہا جاتا ہے۔ ۱۲

کیونکہ نہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مراد متعین فرمائی اور نہ صحابہؓ نے اس کو دریافت کیا۔ تو جو چیز نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہو اور نہ حضرات صحابہ اس کی تحقیق و تفتیش میں پڑے ہوں تو لامحالہ اس کا سوال اور تحقیق کے درپے ہونا اصولِ شریعت کی رو سے بدعت ہی ہوگا۔ حضرات صحابہؓ تو ایک ایک آیت کی تفسیر و تشریح کے لیے برسوں جستجو اور تلاش میں رہتے تھے۔ جیسا کہ ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ میں آیت اِنْ تَتُوْبَا اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا کی حضرت عمرؓ سے تفسیر معلوم کرنے کی فکر میں عرصہ دراز تک رہا اور موقعہ کا متلاشی رہا۔ معلوم کروں کہ یہ دو عورتیں کون ہیں جن کو حق تعالیٰ نے توبہ کی طرف توجہ دلائی اور یہ فرمایا ہے کہ تمہارے دل مائل اور ٹیڑھے ہوگئے تھے تو اگر آیات متشابہات میں غور و فکر اور تحقیق و تفتیش ممنوع نہ ہوتی تو حضرات صحابہؓ سے یہ بات کسی طرح متوقع نہ تھی کہ وہ ان آیات کی مراد معلوم کیے بغیر بیٹھے رہتے۔ امام ترمذیؒ نے حق تعالیٰ شانہ کے آسمانِ دنیا پر نزول کی روایت پر کلام کرتے ہوئے فرمایا۔ اہلِ حق کے نزدیک مختار اور پسندیدہ مذہب اس نوع کی روایات پر بلا کسی تحقیق و جستجو کے ایمان لایا جائے۔ اور یہ نہ بحث کی جائے کہ اس کی کیفیت کیا ہے اور نہ اس میں ذات خداوندی کی مخلوق اور اجسام کے ساتھ مشابہت کا کوئی تصور کیا جائے، بلکہ یہی کہہ دیا جائے کہ یہ تمام صفات اللہ کے لیے ثابت ہیں جیسا بھی اس کی شان کے لائق ہو۔

سفیان ثوریؒ امام مالکؒ۔ عبداللہ بن مبارکؒ۔ سفیان بن عیینہ اور وکیع بن الجراح سے بھی یہی منقول ہے۔ تمام اہل سنت والجماعۃ اسی کے قائل ہیں۔

فقہ اکبر میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے نقل کیا گیا فرمایا:

فی ذکر اللّٰہ فی القرآن من ذکر	پس جو کچھ اللہ رب العزت نے قرآن کریم
الوجہ والید والنفس و	میں وجہ ید نفس اور عین کا ذکر فرمایا۔ یہ
العین فہولہ صفات ولا	سب اس کی صفات ہیں اور یہ نہ کہا جائے

يقال ان يده قدرته ونعمته لان فيه ابطال الصفة و هو قول اهل القدر و الاعتزال ولكن يده صفة بلا كيف له	کہ ید سے مراد اللہ کی قدرت اور نعمت ہے کیونکہ اس صورت میں اللہ کی صفت کا باطل کرنا لازم آتا ہے جو کہ قدریہ اور معتزلہ کا قول ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے حق تعالیٰ کا ید اس کی ایک صفت ہے بلا کسی کیفیت اور مثال کے۔

حق تعالیٰ کی شان تو یہ ہے کہ لا تدرکہ الابصار (نگاہیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں) اور لیس کمثلہ شیئ اس لیے انسان کے قوائے فکریہ وعقلیہ، صفاتِ خداوندی کی تہہ تک پہنچنے اور اس کی پوری پوری حقیقت کے معلوم کرنے سے قاصر ہیں۔ اس وجہ سے جو صفات بھی قرآن وحدیث میں ذکر کی گئیں ان پر بغیر کسی کیفیت اور مثال کے فرض کیے ہوئے ایمان لانا ضروری ہے۔ یہی اہل حق کا مسلک ہے مثلاً اللہ سمیع ہے اور بصیر ہے۔ اس کا سمیع وبصیر ہونا حقیقۃً ہے۔ لیکن وہ انسانوں اور مخلوق کی طرح سننے اور دیکھنے والا نہیں ہے۔ وہ سنتا ہے، بغیر اس کے کہ اس کے واسطے کان جیسے اعضاء ہوں اور وہ دیکھتا ہے بغیر اس کے کہ وہ آنکھ کا محتاج ہو۔ بس اسی طرح اس کا قدم، ہاتھ اور نزول وغیرہ بھی ہے۔

مسئلہ صفات میں دو گروہ افراط وتفریط میں مبتلا ہو کر حق کے راستہ سے منحرف ہوئے اور حق تعالیٰ شانہ کی تقدیس وتنزیہ کے خلاف اعتقاد اختیار کیا۔

فرقہ مشبّہ جس کو مجسّمہ بھی کہا جاتا ہے اس نے ایسی تمام آیات و روایات کو ظاہری معنی پر محمول کرتے، تشبیہ وتمثیل کا قائل ہوا اور اس بارے میں اس قدر غلو کیا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اعضاء وجوارح بھی مان لیے اور انسانوں کے ہاتھ پاؤں کے ساتھ اللہ رب العزت کے ید اور قدم کو تشبیہ دی اور ذات خداوندی کو مجسّم شئی قرار دیا اور یہ بھول گئے کہ قرآن کریم کا یہ صاف اعلان ہے کہ لیس کمثلہ شیئ اور ولم یکن لہ کفواً احد ۔ کہ اس کی کوئی مثال ونظیر نہیں۔ اس

گروہ کے بالمقابل فرقۂ معتزلہ نے ظاہری معنی کی نفی کرنے اور حقیقت سے مجاز کی طرف پھیرنے میں اس قدر غلو کیا کہ حد تعطیل تک پہنچا دیا اور ان جملہ صفات کا انکار کرتے ہوئے ایسی تمام آیات و روایات کی تاویلات کرنے لگے[1]۔

غرض ایک گروہ افراط میں اور دوسرا تفریط میں مبتلا ہوا۔ اہل حق نے افراط وتفریط کے درمیان ایک معتدل قول اور مسلک اختیار کیا۔ کہ ان سب صفات پر حقیقۃً ایمان لایا جائے اور اس کے باوجود ذات خداوندی کو مخلوق کے ساتھ مشابہت و مماثلت سے منزہ اور بالا و برتر کہا جائے

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم — وز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم

جمہور اہل سنت اور تمام متقدمین اور علماء اُمت قرناً بعد قرنٍ اسی پر متفق رہے۔ لیکن متاخرین متکلمین نے جب یہ دیکھا کہ مجسمہ جیسے قاصر الفہم اور ناقص العلم اپنے قصور فہم یا زیغ طبع سے یہ بات سمجھنے سے عاجز رہیں گے کہ اللہ کے لیے ید (ہاتھ) حقیقۃً ثابت ہے اور اس کے باوجود وہ مخلوق کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتا اور خیال کیا یہ صورت ممکن ہے کہ ان کے اعتقاد تجسیم کے لیے معاون ہو تو محض اس اعتقادی فتنہ اور گمراہی کا دروازہ بند کرنے کے لیے بعض ایسی صفات میں کچھ تاویلات کیں جیسے کہ حدیث من غشنا فلیس منا ایسی دیگر روایات میں محدثین یہ تاویل کر لیتے ہیں کہ مقصود بیان اسلام سے خارج ہونا نہیں ہے بلکہ کمال ایمان اور کمال اتباع کی نفی ہے۔ برخلاف اس کے کہ معتزلہ اصل ایمان سے خارج ہونا مراد لیتے ہوئے مرتکب کبیرہ کو خارج از ایمان قرار دیتے ہیں۔ شیخ تقی الدین ابن دقیق العید فرماتے ہیں کہ اگر ایسی تاویل اہل لسان کے عرف اور محاورات کے قریب ہو (اور اس سے کسی اصل شرعی کا انکار بھی صراحۃً یا دلالۃً لازم نہ آتا ہو تو یہ تاویل قبول کر لی جائے گی ورنہ نہیں۔

مثلاً آیت "یاحسرتیٰ علیٰ ما فرطت فی جنب اللہ" کی مراد اللہ کے حق میں کوتاہی کرنا بیان کی جائے حالانکہ لفظ جنب لغوی معنی کے لحاظ سے پہلو کو کہا جاتا ہے اور اسی طرح ویحذرکم اللہ نفسہ اور کل شیئٍ ھالک الا وجھہ میں ذات خداوندی مراد لی جائے[2]۔

[1] مسئلہ کی تفصیل کے لیے علم الکلام و عقائد اسلام کی مراجعت فرمائی جائے۔ [2] الاتقان فی علوم القرآن۔

کُتب سماویہ یا بائیبل

قرآن کریم میں حق تعالیٰ شانہٗ نے متعدد مواقع اور بکثرت آیات میں اس بات کا ذکر فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بہت سی اُمتوں میں اللہ نے اپنے رسول بھیجے اور ان پر کتابیں اور صحیفے بھی اُتارتے رہے۔ ارشاد فرمایا:

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ ۚ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا ۔

(نساء)

بیشک ہم نے وحی کی ہے آپ کی طرف جیسے کہ وحی کی نوحؑ اور ان کے بعد دوسرے اور انبیاء کی طرف۔ اور وحی بھیجی ہم نے ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اور اسحٰقؑ و یعقوبؑ اور ان کے خاندان کی طرف اور عیسیٰؑ و ایوبؑ ہارونؑ و سلیمانؑ کی طرف بھی اور داؤدؑ کو ہم نے دی ہے کتاب زبور۔

تورات و انجیل اور صحف ابراہیمؑ کا بھی قرآن نے بار بار ذکر کیا، فرمایا:

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنْزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِلنَّاسِ وَأَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۔

(آل عمران)

آپ پر نازل کی ہے یہ کتاب (قرآن) حق کے ساتھ در آنحالیکہ یہ کتاب تصدیق کرنے والی ہے اس سے پہلی کتابوں کی اور نازل کیا اللہ نے تورات اور انجیل کو بھی قرآن سے پہلے ہدایت بنا کر لوگوں کے واسطے اور نازل کیا فرقان یعنی ایسا کلام جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔

تورات کو کتاب منیر امام فرقان کے عنوان سے تعبیر کیا۔ اور حضرت عیسیٰؑ پر نازل کردہ کتاب کا نام انجیل مقرر کیا اور حضرت داؤدؑ کی کتاب کو زبور کہا گیا۔ یہ تو وہ عظیم المرتبہ کتابیں ہیں جو ان انبیاء پر اتاری گئیں جن کو مستقل شریعت اور احکام دیئے گئے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے صحیفے حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے ان انبیاء کو بھی دیئے گئے جن کا قرآن نے نام نہیں بتایا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت جس طرح تمام انبیاء سابقین کے کمالات کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح آپ کی کتاب (قرآن کریم) بھی تمام کتب سماویہ کی تعلیمات اور حقائق و معارف کا مجموعہ ہے۔ اور تمام علوم سماویہ کو قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے مزید بے شمار خصوصیات کے ساتھ جمع کر دیا گیا۔ اسی وجہ سے قرآن کو تمام کتب سماویہ کا مصدق و مؤید فرمایا اور یہی وجہ ہے کہ ہر کتابی شخص پر خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری ہے۔ آپؐ پر ایمان لائے بغیر وہ نجات کا ہرگز مستحق نہیں ہوسکتا۔ آنحضرتؐ کا ارشاد مبارک ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام آج زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری پیروی کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوتا۔

نزول قرآن کے بعد جب کہ تمام کتب سابقہ کے علوم قرآن میں جمع تھے۔ عقلاً اس بات کا امکان نہیں رہتا کہ کوئی یہودی یا نصرانی اپنے مذہب پر رہتے ہوئے نجات کا تصور کرے کیونکہ ایسی صورت میں وہ خود اپنی کتاب تورات و انجیل کا بھی منکر اور کافر ہو جاتا ہے بلکہ ہر اس شخص کے لیے جو تورات و انجیل کی ادنیٰ درجہ میں بھی اپنے قلب میں عظمت رکھتا ہو، یہ عظمت و محبت کا جذبہ قرآن پر ایمان لانے کے لیے مجبور کرنے والا ہوگا۔ اس صورت میں قرآن پر ایمان نہ لانا گویا تورات و انجیل کا ٹھکرا دینا ہی ہوگا۔ اور ان کا یہ دعویٰ باطل ہوگا کہ ہمارا بائبل پر ایمان ہے۔ بالخصوص جب کہ ان کتابوں کی حفاظت کا ثبوت تو درکنار صدہا دلائل سے ان میں تحریفات ثابت ہیں۔ اصل تورات و انجیل نا کو

جس طرح مسخ اور ردّ و بدل کیا گیا۔ اس کے بعد اس کا کوئی امکان نہیں کہ ان میں جو کچھ ہے اس کو آسمانی ہدایت اور خدا کے پیغمبروں کی تعلیمات کہا جا سکے۔

اہل کتاب کتب سماویہ کے مجموعہ کو بائیبل کہتے ہیں۔ جس کے دو حصے ہیں ایک عہد عتیق یعنی پرانی کتابیں اور دوسرا عہد جدید۔ پچھلے حصے میں متعدد کتابیں ہیں، جن کو سفر کہا جاتا ہے جیسے سفر خلیقہ جس کو کتاب پیدائش بھی کہتے ہیں۔ سفر عدد، سفر خروج، سفر احبار، سفر استثناء ان پانچوں کا مجموعہ تورات ہے۔ عہد جدید میں انجیل متی، انجیل مرقس۔ انجیل لوقا اور انجیل یوحنا ہیں[1]۔

جس مجموعہ کا نام تورات ہے وہ تمام تر بجز چند مضامین کے حضرت موسیٰؑ کے بعد تصنیف کی گئی ہے۔ اس بنا پر یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ تورات وہ نہیں ہے جس کی قرآن تائید و تصدیق کرتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس انجیل کے یہ مجموعے بھی اکثر و بیشتر ان حواریوں کے مرتب کردہ ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ کے بعد کے ہیں، حتیٰ کے بعض تو ان میں ایک صدی بعد کے ہیں۔ اس لیے یہ انجیل بھی وہ نہیں جس کا قرآن ذکر کر رہا ہے۔ قرآن کریم نے اہل کتاب کی ان تحریفات کو نہایت واضح عنوان سے بیان فرمادیا:

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ

کہ یہ لوگ اللہ کی کتاب کلمات اپنے مواقع سے ہٹاتے ہیں اور ان میں تحریف کرتے ہیں۔ اور فرمایا،

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۔

پس افسوس اور ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو کتاب لکھتے ہیں اپنے ہاتھوں سے اور پھر یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے البیان فی علوم القرآن اور علم الکلام کا ملاحظہ فرمائیں۔ ان دونوں کتابوں میں توریت، انجیل میں اہل کتاب کی تحریفات تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ ۱۲

الغرض ایسی صورت میں عقلاً اس بات کا کوئی جواز نہیں سمجھا جاسکتا کہ ایسی محرف کتابوں پہ اعتقاد و ایمان رکھا جائے بلکہ یہی ضروری ہے کہ خود ان کتابوں کے ماننے والے اگر درحقیقت ان کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ تو وہ قرآن پر ایمان لائیں کیونکہ قرآن ان کتابوں کا مصدق ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر اہل کتاب ہی مسلمانوں کو بائیبل اور انجیل مقدس کی دعوت دیں جن کی کتاب کا ایک ایک حرف اور زیر زبر آج تک اسی طرح محفوظ ہے جس طرح کہ اس کو اللہ نے نازل کیا تھا، چودہ سو سال گزر گئے بحمد اللہ ایک شوشہ کا بھی فرق نہیں آیا اور نہ قیامت تک آسکے گا تو ایسی محفوظ اور جامع ہدایت عظیم تر کتاب الٰہی کے ماننے والوں کو ایک بے سند محرف و مصحف مجموعہ پر جو از اول تا آخر ان کی تحریفات کی وجہ سے لغویات کا مجموعہ بنا ہوا ہے۔ ایمان لانے کی دعوت دینا صرف یہی نہیں یہ ایک ظلم وستم ہے بلکہ ایک نہایت ہی مضحکہ خیز حرکت بھی ہے۔

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ، تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِيْنَ۔

آمِیْنَ یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ

تفسیر اور تاویل

لفظ تفسیر وضع عربیہ کی روسے فسر سے مشتق ہے، جس کے معنی کشف اور بیان کے ہیں۔ محاورات عرب میں بولا جاتا ہے۔ "اسفرالصبح" کہ صبح روشن ہوگئی قرآن کریم نے آیت وَالصُّبْحِ اِذَا اَسْفَرَ" میں اس محاورہ کو استعمال کیا ہے تو تفسیر کے معنی واضح کردینے اور بیان کردینے کے ہوئے جیسے کہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا

وَلَا يَأْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا۔

علم تفسیر کو تفسیر اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اس میں مراد کلام اللہ کی توضیح و تشریح ہوتی ہے اور ان معارف و لطائف اور حقائق کو واضح کیا جاتا ہے، جو الفاظ کی سطح میں مخفی ہوتے ہیں اور لفظ تاویل اَول سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی رجوع کے آئے ہیں۔

تاویل میں بھی چونکہ متعدد معانی اور مختلف وجوہ میں سے کسی ایک کو ترجیح یا اس کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے اس وجہ سے اس کو تاویل کہا جاتا ہے۔

شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی کتاب الاتقان میں تفسیر اور تاویل کے معنی اور ان کے درمیان فرق واضح کرنے کے لیے ائمہ مفسرین کے کچھ اقوال نقل کیے ہیں امام راغبؒ کا قول ہے کہ تفسیر تاویل کی بہ نسبت عام ہے۔ تفسیر کا اکثر استعمال الفاظ اور مفردات میں ہوتا ہے اور تاویل کا غالب استعمال معانی اور جملوں میں ہوتا ہے لیکن جمہور مفسرین کے نزدیک یہ قول اس طرح علی الاطلاق راجح نہیں ہے۔[1]

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن

علامہ اصبہانی نے فرمایا تفسیر اصطلاح علماء میں قرآن کریم کے معانی اور اس کی مُراد واضح اور بیان کر دینے کو کہتے ہیں، خواہ یہ وضاحت و بیان الفاظ مشکلہ کی صُورت سے ہو یا غیر مشکلہ الفاظ کا حل ہو معنوی لحاظ سے خواہ ظاہر ہو یا خفی۔ اور تاویل کا تعلق کلام تام سے ہے اور جملوں کے مفہوم کو متعین کرنے کو کہتے ہیں۔

بعض ائمہ کا خیال ہے کہ تفسیر کا تعلق روایت سے ہے اور تاویل کا تعلق درایت سے چنانچہ امام ابونصر قشیری بیان کرتے ہیں کہ تفسیر سماع اور روایت نیز اتباع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ اور تاویل اجتہاد و استنباط کا نام ہے۔ لہٰذا کتاب اللہ کا جو مفہوم سنت رسول اللہ اور احادیث صحیح سے ثابت ہوگا اس کو تفسیر کہیں گے اور اس معین و واضح مفہوم کو برقرار رکھتے ہوئے اسی کے مطابق اور موافق جو لطائف و معارف ایسے حضرات مستنبط کریں جن کو علوم الٰہیہ میں مہارت ہے اس کا نام تاویل ہوگا۔[1]

تفسیر شریعت کا ایک اصطلاحی عنوان ہے۔ لغت عربیہ اور قواعد صرف و نحو کی رو سے محض ترجمہ کر دینے یا اجمالی مفہوم بیان کر دینے کو تفسیر نہیں کہا جاتا۔ بلکہ تفسیر کا مفہوم یہ ہے کہ مدلول و مفہوم کلام اللہ کے ساتھ یہ بھی بیان کرنا کہ نزول آیات کا سبب کیا ہے اور احوال نزول زمان نزول اور واقعات متعلقہ کیا ہیں اور یہ کہ آیات مکیہ ہیں یا مدنیہ محکم ہیں یا متشابہ ناسخ ہیں یا منسوخ خاص ہیں یا عام، مطلق ہیں یا مقید۔ مجمل ہیں یا مفصل اور احکام حلال و حرام کس طرح مستنبط ہو رہے ہیں یا فرض و واجب اور مستحب۔ آیات کی دلالت حلت پر ہے یا حرمت پر یا کراہت و استحباب پر مضامین وعد پر مشتمل ہے یا وعید پر۔ امثال و عبر کا مضمون ہے یا واقعات و قصص غرض ان تمام پہلوؤں کو واضح کر دینے کو تفسیر کہا جاتا ہے۔ ان

---

[1] الاتقان۔ البیان فی علوم القرآن

تمام امور کی رعایت کے ساتھ جو چیز اصول و قواعد کی روشنی میں بیان کی جائے اس کو تو تفسیر کہیں گے۔ ورنہ تو محض جس طرح کسی کے ذہن میں کوئی بات آئے اور وہ اس کو آیات قرآن پر چسپاں کرنے لگے یا ان کے تحت داخل کرے تو اس کو قیاس آرائی اور تفسیر بالرائے کہا جائے گا جو درحقیقت تحریف کلام اللہ ہے نہ کہ تفسیر۔ اسی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وعید فرمائی ہے ،
من فسر القرآن برأیہ فقد کفر " کہ جس شخص نے اپنی رائے سے قرآن کریم کی تفسیر کی اس نے کفر کا ارتکاب کیا اور اس کو جہنم میں اپنا ٹھکانا بنا لینا چاہیے۔

امام ماتریدیؒ فرماتے ہیں، تفسیر کے معنی یہ ہیں کہ ایک معنی پر یقین کر لینا کہ اللہ کی مراد بس یہی ہے اور تاویل چند احتمالات میں سے کسی ایک کو اختیار کر لینا اس طرح کہ شاید اس کے علاوہ دوسرے کا بھی احتمال یہی ہو[1]۔

الغرض اصول شریعت کے مطابق جو بیان ظاہر کے مطابق اور قطعی ہو وہ تفسیر ہے خواہ وہ معصوم کی طرف سے ہو مثلاً حدیث مرفوع اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا عمل یا غیر معصوم کی طرف سے۔ اور جو بیان ظاہر کے خلاف ہو مگر قواعد کے مطابق اور قرائن سیاق وسباق کے مطابق ہو، وہ تاویل ہے۔ اگر یہ تاویل معصوم یعنی پیغمبر خدا کی طرف سے ہے تو قطعی ہے اور اگر پیغمبر کی طرف سے نہیں تو ظنی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بارہ میں قرآن نے فرمایا وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ تو جو تاویل اللہ رب العزت کی طرف یوسف علیہ السلام کو سکھائی جائے گی اور دل کا القاء من جانب اللہ ہوگا تو لامحالہ وہ قطعی ہوگی۔ اس میں ظنی ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کا سکھانے والا اللہ ہے اور جس کو وہ تاویل سکھائی گئی وہ اللہ کا پیغمبر ہے۔ اسی طرح حضرت

---

[1] تفسیر روح المعانی ج ۱ ص ۵، الاتقان ج ۲ ص ۱۷۳

خضر علیہ السلام اللہ رب العزت کی طرف سے بتاتے ہوئے امور تکوینیہ کے راز اسی عنوان سے بیان فرماتے ہیں۔ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا تو اس جگہ بھی یہ تاویل قطعی ہی ہے۔ خود پروردگار عالم نے متشابہات کے علم کو اپنی طرف نسبت کرتے ہوئے فرمایا ہے وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ۔ تو اس سے یہ ظاہر ہوا کہ تاویل کا عنوان درحقیقت ظن اور احتمال کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ تاویل کی اضافت و نسبت سے یہ فیصلہ ہوگا کہ یہ ظنی ہے یا قطعی۔ اگر تاویل کی اضافت و نسبت اللہ کی طرف یا اس کے نبی کی طرف ہے تو قطعی ہے اور وہ تاویل دراصل تفسیر اور تحقیق ہی ہے اور قطعی و یقینی ہے۔ اور اگر وہ تاویل حدیث مرفوع یا صحابہ کی تفسیر نہیں بلکہ اصول مقررہ کے ماتحت کسی معنی کا استنباط ہے تو پھر اس کو تاویل کہا جائے گا جو تفسیر کے بالمقابل ایک ایسا ہی عنوان ہوگا جیسے کلام کی ایک قسم نص کے مقابلہ میں دوسری قسم ظاہر ہے اور یہ تاویل ظنی ہوگی۔ جیسے ائمہ مجتہدین اور فقہاء کتاب و سنت کے مقرر کردہ اصول کے ماتحت فقہی احکام و جزئیات مستنبط کرتے ہیں تو ان جزئیات کو ظنی کہنا بایں معنی ہے کہ یہ اس طرح کتاب اللہ اور الفاظ قرآن سے منصوص و مصرح نہیں جیسے اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ حکم قطعی ہیں۔

تاویل صحیح اور تاویل فاسد

اصولی لحاظ سے لفظ تاویل کی تشریح و تحقیق کے ساتھ علماء مفسرین نے یہ بھی فرمایا ہے کہ تاویل کی دو قسمیں ہیں ایک تاویل صحیح اور دوسری قسم تاویل فاسد تاویل صحیح اس تشریح کو کہا جائے گا جو الفاظ کی دلالت سے تعلق رکھتی ہو اور وہ کلام اس بیان کردہ معنی کا احتمال بھی رکھتا ہو۔ اور نہ وہ اصول شریعت کے خلاف ہو اور نہ ہی سلف صالحین اور علماء امت کے خلاف ہو۔

اس نوع کی تاویل گویا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان "یحمل

آیَۃٍ مِنْھَا ظَھْرٌ وَبَطْنٌ کہ آیات کلام اللہ میں سے ہر آیت کے لیے ایک مدلول ظاہری ہے اور ایک باطنی" کے مطابق لبطن کلام اللہ کا مصداق ہوسکتی ہے۔
تاویل کی دوسری قسم تاویل باطل ہے۔ یہ توجیہ و تشریح ہوگی جو نہ تو قرآن کریم کے ظاہر الفاظ سے مفہوم ہو نہ اصول عربیہ اور قواعد شرعیہ کے مطابق ہو اور نہ کسی حدیث اور صحابہؓ کے اقوال سے اس کی کوئی اصل ملتی ہو اور اس کو معتبر ماننے میں بہت سے اصول شریعت اور احادیث کی صریح مخالفت لازم آتی ہو تو اس تاویل فاسد کا اصل نام تحریف ہے۔ یہ حرام ہے اور کتاب اللہ میں الحاد ہے۔ اگر ایسی کوئی توجیہ کسی بزرگ سے بھی منسوب ہو تو بھی اس کا اعتبار کرنا درست نہ ہوگا۔ ایسی صورت میں یہی سمجھنا چاہیے کہ کسی بھی شیخ اور بزرگ سے اس طرح کا قول ممکن نہیں۔ لہٰذا یقیناً یہ افترا و بہتان ہی ہوگا۔ اس قسم کی تاویلات کا منشا اسلام اور کتاب اللہ کو مسخ کرنے کے ناپاک عزائم اور اسلام دشمنی کے جذبات ہوسکتے ہیں یا پھر وہ لوگ ایسی تاویلات کرتے ہیں جو یورپ کے فلسفہ سے مرعوب ذہنیت رکھنے کی وجہ سے بیجا کرتے ہیں۔ قرآنی تعلیمات کو جس طرح بھی ہوسکے یورپ کے مزاج پر منطبق کیا جاتے۔ حتیٰ کہ اس قسم کے لوگ اپنے اس طرز کو قرآن کی ایک بڑی خدمت تصور کرتے ہیں۔ تاریخ میں سب سے پہلے معتزلہ نے یہ روش اختیار کی۔ اس بحث کی قدرے وضاحت تفسیر بالرائے کے عنوان کے تحت انشاء اللہ ہدیۂ قارئین کریں گے۔

تفسیر کا اصطلاحی مفہوم

علماء مفسرین نے علم تفسیر کی کتابوں میں تفسیر کا اصطلاحی مفہوم اس طرح بیان کیا ہے:

علم التفسیر علم یبحث فیہ عن معنی نظم القرآن	علم تفسیر اس علم کو کہا جاتا ہے جس میں نظم قرآنی یعنی عبارت کلام اللہ کے

بحسب القوانين العربية	معنی سے بحث کی جائے۔ قوانین عربیہ
والقواعد الشرعية بقدر	اور قواعد شرعیہ کے مطابق بقدر طاقت
الطاقة البشرية۔	بشریہ۔

امام ابوحیان نے تفسیر کے اصطلاحی مفہوم بیان کرنے میں کچھ کلمات و الفاظ زائد ذکر کیے ہیں۔ فرمایا:

التفسير علم يبحث فيه عن	تفسیر ایک ایسا علم ہے جس میں الفاظ
كيفية النطق بالفاظ القرآن	قرآن کی کیفیت نطق (تلفظ) اور معانی
ومدلولاتها واحكامها الافرادية	الفاظ اور ان کے افرادی و ترکیبی
والتركيبية ومعانيها التي	احوال کی بحث کی جائے۔ اور ان کے
تحمل عليها حالة التركيب	تتمات کا بیان کیا جائے۔
وتتمات لذالك	

علم کا لفظ تو بمنزلہ جنس ہے جس میں جملہ علوم داخل ہو سکتے ہیں۔ کیفیت نطق کی قید سے علم القرآۃ اور معانی الفاظ کی قید سے علم لغت اور الفاظ افرادی و ترکیبی حالات کی قید سے صرف و نحو اور علم بیان و بدیع اور مدلولات حقیقیہ و مجازیہ اور تتموں کی قید سے معرفت ناسخ و منسوخ ظاہر نص مفسر و محکم اور قصص و احکام کی توضیح کی طرف اشارہ ہے۔ گویا ان تمام پہلوؤں پر مشتمل جو بحث اور توضیح و تشریح ہو وہ علم تفسیر ہے۔ اور اس ضمن میں جن علوم کی احتیاج و ضرورت ہے، ان کو تفسیر کے لیے علوم مبادی کہا جائے گا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ[۲] سورۂ قیامہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں، کہ تفسیر میں تین چیزوں کی رعایت شرط اور ضروری ہے۔

۱۔ ہر کلمہ کو معنی حقیقی یا مجاز متعارف پر محمول کرنا۔

۲۔ سیاق و سباق کو ملحوظ رکھنا تاکہ کلام بے ربط نہ ہو۔

لہ بحوالہ الاتقان ج ۲ صفحہ ۱۷۴ ۔ ۲ تفسیر عزیزی پارہ تبارک الذی ۱۲

۳۔ شاہدانِ نزولِ وحی یعنی پیغمبر علیہ السلام اور صحابہ کی تفسیر کے خلاف نہ ہو۔
اگر شرط اوّل فوت ہو جائے تو تاویل قریب کہا جائے گا اور اگر دوسری شرط فوت ہو تو تاویل بعید ہے۔ اور اگر تینوں شرطیں فوت ہو جائیں تو پھر تحریف ہے۔

بہرکیف ان اصول و تفصیلات کو مدنظر رکھتے ہوئے کلام اللہ کی ایسی ہی تشریح کو تفسیر کے عنوان سے تعبیر کیا جائے گا جو بیان کردہ تمام شرائط و اصول کے مطابق ہو۔ ورنہ پھر اس کو تفسیر نہیں بلکہ تحریف کہیں گے۔

ضرورت تفسیر

حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ علیہما الصلوٰۃ والسلام نے بیت اللہ کی تعمیر کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لیے جو دُعا فرمائی تھی وہ یہ ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ (البقرہ ۲)

اے ہمارے پروردگار! اور بھیج دے ان میں ایک رسول جو انہی میں سے ہو جو ان پر تیری آیات کی تلاوت کرے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے۔ اور ان کو (ہر عیب وگندگی سے) پاک کرے۔ بے شک تو ہی غالب اور بڑی حکمت والا ہے۔

ان کلمات نے یہ واضح کر دیا کہ قرآن کریم کا ہر مخاطب از خود مضامین قرآن سمجھنے پر قادر نہیں بلکہ اللہ کا نبی ہی ان کو کتاب کے معانی و احکام سکھائے گا اور حکمت کی چیزیں بتائے گا۔ احکام شریعت پیغمبر ہی کے بیان سے معلوم ہوسکیں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ تلاوت آیات بھی وہی معتبر اور صحیح ہوگی جس طرح پیغمبر تلاوت کرائیں اور پڑھائیں۔

اہل عرب بیشک عربی زبان جاننے والے تھے اور قرآن کریم عربی زبان ہی میں نازل ہوا لیکن ایسا ممکن نہ ہوا کہ ہر شخص محض اہل لسان اور لغت عربیہ کے جان لینے کی وجہ سے کلام اللہ کے معنی اور مضامین بھی سمجھ لے اور ان کے حقائق و معارف تک رسائی ہوجائے بلکہ کلام اللہ کی مراد سمجھنے میں ہر شخص اگرچہ

toobaa-elibrar

وہ عربی ہی کیوں نہ ہو اس بات کا محتاج ہے کہ وحی خداوندی اور بیان پیغمبر اس کی رہنمائی کرے۔ کلام الہٰی کے حقائق و معارف اور اس کے حقیقی مفہوم اور صحیح مراد پر مطلع ہونے کا ذریعہ وحی خداوندی اور تشریح رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے۔

صحیح مسلم میں روایت ہے کہ قرآن کریم میں جب آیت:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ۔ (انعام)

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو مخلوط و ملتبس نہیں کیا ظلم کے ساتھ تو ان کے واسطے امن ہے اور یہی لوگ ہدایت پر ہیں۔

نازل ہوئی تو حضرات صحابہؓ اس ظاہر عنوان کو دیکھ کر بہت زائد پریشان ہوئے اور گھبرائے اور کہنے لگے ہم میں کون ایسا شخص ہے جس نے کوئی ظلم (کوتاہی اور خطا) نہ کیا ہو۔ ہر شخص یقیناً اپنے اوپر کسی نہ کسی ظلم کا ضرور مرتکب ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی اس پریشانی کا ذکر کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا، یہ ظلم ایسا نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو کہ ہر غلطی اور قصور ظلم سے تعبیر کیا گیا ہو بلکہ یہ ظلم تو ظلم عظیم ہے جیسے کہ حضرت لقمان علیہ السلام کے قول میں مذکور ہے، یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ. تو آپ نے اس توضیح و تفسیر سے حضرت صحابہ کو آیت کے حقیقی مفہوم سے آگاہ فرمایا۔ یہ حضرات صحابہ افصح العرب تھے۔ عربی زبان ان کی مادری زبان تھی اور عقل و فہم میں بھی ایسے کامل کہ تاریخ عالم میں ان کی مثال مشکل ہے۔ پھر انوار نبوت سے ان کے قلوب منور ہی تھے۔ لیکن مراد کلام اللہ کے سمجھنے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح و بیان کے محتاج ہوئے۔

اسی وجہ سے خود قرآن کریم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کتاب الہٰی کا شارح و مفسر ہونے کی حیثیت سے بیان فرما دیا۔ فرمایا:

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ، (سورۃ النحل)

اور نازل کیا ہم نے آپ کی طرف ذکر یعنی کلام الٰہی تاکہ آپ واضح کریں اور کھول کھول کر بیان کریں ، اس وحی کو ، جو ان کی طرف بھیجی گئی ہے ۔

تو اس طرح واضح اور صاف عنوان سے تبیین و تشریح کا منصب صرف رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ہی کو دیا گیا کہ آپؐ اپنے اقوال و افعال اور جملہ احوال سے قرآن کریم کی شرح فرمائیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے متعلق فرمایا کرتی تھیں کَانَ خلقہ القرآن کہ آپؐ کی سیرت اور عادت مبارکہ عین قرآن تھی ۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ آپ کے اقوال و ارشادات بھی قرآن کی طرح وحی الٰہی ہی ہیں ۔ فرمایا گیا :

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى ۔ (والنجم)

آپؐ اپنی خواہش سے کوئی بات زبان سے نہیں نکالتے بلکہ وہ تو صرف ایک وحی ہوتی ہے جو اللہ کی طرف سے آپ کی طرف وحی کی جاتی ہے ۔

قرآن کریم اللہ کا کلام ہے اور ہر کلام متکلّم کی عظمتوں خصوصیات وکمالات کا حامل و مظہر ہوتا ہے ۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم بھی حق تعالیٰ شانہٗ کی بے پناہ اور بے حد و غایت عظمتوں ، خوبیوں اور کمالات کا پیکر ہوگا ایسی صورت میں یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ ہر کس و ناکس محض زبان دانی کے باعث کلام الٰہی کی ان عظمتوں اور حقائق و معارف اور اغراض و مقاصد کو سمجھ سکے جن پر وہ کلام مشتمل ہے اور بلا معلّم و مفسّر حق تعالیٰ کی مراد پر مطلع ہو جائے ۔ لہٰذا یہ تصوّر اور دعویٰ سراسر عقل و شعور کے خلاف ہوگا کہ علوم قرآنی براہ راست سمجھے جا سکتے ہیں اور ان علوم کو سمجھنے کے لیے شارح وحی پیغمبر علیہ السلام کے واسطہ کی ضرورت نہیں ۔ جب حضرات صحابہؓ بھی قدم قدم پر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تشریح کے

محتاج ہوتے تھے تو اس کے بعد پھر کسی کو کیا حق رہتا ہے وہ ایسا تصور کر سکے شرح و تفسیر ہر مخاطب کے لیے نور شمس کی طرح ہے اور نور شمس سے منتفع ہونے کے لیے انسان قوت بینائی کا بھی محتاج ہوتا ہے۔ کسی چیز کو دیکھنے کے لیے نہ صرف سورج کی روشنی کافی ہے اور نہ فقط بینائی اس مقصد کو حل کر سکتی ہے۔

رات کی تاریکی میں نگاہیں خواہ کتنی ہی کوشش کریں لیکن دیکھنے سے عاجز ہیں اور دن کی روشنی میں نابینا شخص خواہ کتنا ہی چاہے لیکن وہ بھی دیکھنے سے محروم ہے اسی طرح سمجھ لیجیے کہ قرآن کریم کے مطالب اور مضامین سمجھنے کے لیے فکر انسانی اور اس کی علمی صلاحیتوں کے ساتھ آفتاب نبوت کی شعاعیں بھی ضروری ہیں۔

غرض نہ محض اپنی بصیرت اور علمی و فکری صلاحیتوں کو کافی سمجھنا چاہیے اور نہ ہی یہ تصور کرنا چاہیے کہ قرآنی حقائق و معارف کے سمجھنے میں تدبّر اور غور و فکر کی ضرورت نہیں بلکہ انسان کو چاہیے کہ آفتاب نبوت کی روشنی میں رہتے ہوئے اپنی فکر و نظر اور غور و تدبّر کی نگاہوں سے قرآنی حقائق اور معارف تلاش کرے۔ اسی غرض کے لیے ارشاد خداوندی ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (سورۃ محمد)	یہ لوگ کیوں نہیں غور و فکر اور تدبّر کرتے قرآن میں۔ یا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں۔

یہ بات دنیا میں جب مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت ہے کہ لبا اوقات کسی حکیم اور فلسفی یا بلند پایہ شاعر اور فصیح و بلیغ انسان کا کلام عامۃ الناس سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس کلام کی شرح و تفسیر کی جاتی ہے حتیٰ کہ ایک ایک شعر کی شرح مفصل بیان کے ذریعہ کی جاتی ہے تب اس کا مطلب عام اہل علم کے سمجھ میں آتا ہے تو حق تعالیٰ کا کلام تو خداوند عالم کی عظمتوں اور کمالات و خوبیوں کا حامل ہے پھر کیونکر ممکن ہے کہ ہر شخص بغیر شارح و مفسر کے اس کے مطالب و معانی تک پہنچ جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کلام الٰہی کی عظمت و بلندی تک عامۃ الناس کے اذہان و افکار کی رسائی

ممکن نہیں ۔ پھر یہ کہ جو کلام جس درجہ جامع ہوتا ہے اس کی جامعیت ہزار ہا اصول وقواعد اور بے شمار فروع وجزئیات اور بے پایاں معارف ولطائف اپنے اندر لیے ہوتی ہے تو یقیناً ان اصول وقواعد کی تشریح اور فروع وجزئیات کی تفصیل وتحقیق بغیر شارح ومفسر کیونکر ممکن ہو سکتی ہے ۔ قرآن کریم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت میں یہ تین بنیادی اصول متعین کر دیئے ۔ تلاوت آیات تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفوس ۔ جیسے کہ ارشاد فرمایا گیا ،

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ

ابن جریرؒ نے اپنی تفسیر میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا فرمایا:

کان الرجل منا یتعلم عشر آیات لم یجاوزھن حتی یعرف معانیھن والعمل بھن	ہم میں سے جب کوئی شخص دس آیتیں یاد کر لیتا تو وہ آگے بڑھتا یہاں تک کہ وہ ان کے معانی جان لیتا اور ان پر عمل بھی کرنے لگتا ۔

حضرت مسروقؒ بھی اسی طرح عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں ۔ فرمایا :

وَالَّذِيْ لَا اِلٰهَ غَيْرُهٗ مَا نَزَلَتْ اٰيَةٌ مِّنْ كِتَابِ اللّٰهِ اِلَّا وَاَنَا اَعْلَمُ فِيْمَ نَزَلَتْ وَاَيْنَ نَزَلَتْ وَلَوْ اَعْلَمُ اَحَدًا اَعْلَمَ بِكِتَابِ اللّٰهِ مِنِّيْ تَنَالُهُ الْمَطَايَا لَاَتَيْتُهٗ	قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کوئی بھی آیت کتاب اللہ میں ایسی نہیں نازل ہوئی کہ میں یہ نہ جانتا ہوں کہ وہ کس کے بارہ میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی اور اگر میں کسی شخص کے متعلق یہ معلوم کروں کہ وہ مجھ سے زائد کتاب اللہ کا جاننے والا ہے تو ضرور اس تک پہنچوں گا اگر اس کی جگہ تک اونٹنیاں پہنچا سکتی ہوں ۔

سلہ ملخص من کلام القرطبی ج ۱ صـ ۲۶

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس قول کے راوی مسروق نے ایسا ہی کر دکھایا۔ شعبی بیان کرتے ہیں مسروق نے صرف ایک آیت کی تفسیر معلوم کرنے کے لیے بصرہ کا سفر کیا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ شخص جن کی غرض سے یہ سفر کیا تھا شام چلے گئے تو وہاں سے پھر شام روانہ ہوگئے اور وہاں جاکر ان سے ملاقات کرکے اس آیت کی تفسیر معلوم کی۔[1]

فنِ تفسیر کی عظمت و برتری

کلام اللہ کی عظمت و برتری اور شرف اس علم کی برتری اور شرف کے سمجھنے کے واسطے کافی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اَشْرَافُ اُمَّتِیْ حَمَلَةُ الْقُرْآنِ کہ میری امت کے سربرآوردہ اور معزز ترین افراد حملۃ القرآن یعنی قرآن کے حفاظ اور علما و مفسرین ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا۔ — اور جس شخص کو حکمت عطا کی گئی، تو پس اس کو یقیناً ایک بہت بڑی خیر دے دی گئی۔

ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اس کی مراد یہ بیان کی کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو قرآن کریم کی نعمت، اس کے ناسخ و منسوخ کی معرفت محکم و متشابہ کی پہچان حلال و حرام اور امثال و عِبَر کے علم سے نوازا گیا ہے۔

قتادہ اور ابوالعالیہ سے بھی یہی منقول ہے کہ حکمت سے مراد فہم قرآن اور احکام قرآن کا جاننا ہے۔[2]

ایاس بن معاویہ سے مروی ہے کہ ان لوگوں کی مثال جو قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں لیکن اس کی تفسیر نہیں جانتے ایسی ہے کہ کسی قوم کے پاس ان کے بادشاہ کی طرف سے کوئی پیغام رات کی تاریکی میں پہنچا اور ان کے پاس کوئی چراغ اور روشنی بھی نہیں ہے کہ وہ اس روشنی میں پیغام شاہی پڑھ لیں۔ ان کے

---

[1] احکام القرآن قرطبی۔ [2] الاتقان فی علوم القرآن، ج ۲۔

ذہنوں میں اضطراب و بے چینی تھی کہ نہ معلوم اس پیغام میں کیا ہے تو اس اضطراب و پریشانی کے عالم میں اچانک ایک شخص ان کے پاس ایک روشن چراغ لے کر پہنچ گیا جس کی روشنی میں انہوں نے وہ پیغام شاہی پڑھ لیا اور سمجھ لیا[1] تو فرمایا یہ روشن چراغ لانے والا عالم اور قرآن کریم کے حقائق و معارف کا جاننے والا شخص ہے۔ جس کے علم و ہدایت کے منور چراغ سے اس قوم کی حیرت و پریشانی دُور ہو گی، جو جہل و ناواقفیت کی ظلمتوں میں حیران اور متحیر تھے کہ نہ معلوم ہمارے رب نے ہم سے کیا خطاب فرمایا ہے

انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جو شخص ہم میں سے سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران پڑھ لیتا تھا تو ہماری نظروں میں بہت معزز شمار ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ قرآن کریم اور علوم قرآن سے بڑھ کر عزت اور شرافت کی کیا چیز ہو سکتی ہے۔ اس لیے اسی معیار پر ان حضرات کے نزدیک عزت و برتری کا استحقاق سمجھا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کو عزت و سربلندی کا معیار قرار دیا۔ فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ وَيَضَعُ بِهِ آخَرِينَ ۔	کہ بے شک پروردگار عالم اسی قرآن کی بدولت بہت سی قوموں کو سربلند اور معزز بناتا ہے اور بہت سی قوموں کو اس پر عمل نہ کرنے کی بدولت ذلیل و خوار کرتا ہے۔

علامہ اصبہانیؒ نے فرمایا انسان کا سب سے بہترین پیشہ اور مشغلہ تفسیر قرآن کریم ہے کیونکہ ہر پیشہ اور مشغلہ اسی حیثیت کا سمجھا جاتا ہے۔ شرف اور خست میں جو حیثیت اس شے کی ہے جس میں انسان مشغول ہے۔ مثلاً کھالوں کی دباغت کے پیشہ سے افضل اور بہتر طبابت کا پیشہ سمجھا جائے گا۔ اور جاروب کشی سے افضل کتابت

[1] قرطبی ج ۱

اور صنعت و حرفت ہوگی۔ قرآن کریم اس وجہ سے کہ وہ دین و دنیا کی فلاح وسعادت کا ذخیرہ اور تمام علوم و فضائل اور کمالات کا سرچشمہ ہے، یقیناً کائنات میں سب سے بڑھ کر اور افضل ہے لہٰذا مضامین قرآن کریم میں شرح وتفصیل اور بیان و تفہیم میں مشغول ہونا جو تفسیر کا موضوع ہے۔ عالم دنیا میں افضل ترین مشغلہ ہوگا۔ اور اس لحاظ سے کہ مفسر اور معلم قرآن دنیا کو ان گرانقدر سعادتوں اور علوم الٰہیہ سے نواز رہا ہے، مخلوق خدا کے لیے ایک بہترین محسن بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے، حضرات صحابہؓ سے خطاب کرتے ہوئے، اے لوگو! تم جانتے بھی ہو کہ سب سے زیادہ کریم و سخی اور مہربان کون ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا "اللہ و رسولہٗ اعلم"، آپؐ نے فرمایا سب سے زیادہ کریم و سخی اللہ رب العزت ہے۔ پھر میں تمام اولاد آدم میں سب سے زیادہ کریم و سخی اور مہربان ہوں اور میرے بعد وہ شخص ہے جو علم دین سیکھے اور اس کی نشر و اشاعت کرے۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

موضوع تفسیر

ہر علم اور فن کا امتیاز اس کے موضوع سے ہوا کرتا ہے۔ علم طب کا موضوع بدن انسانی اور اس پر پیش آنے والے احوال صحت و مرض وغیرہ ہیں تو اسی موضوع سے وہ دیگر علوم سے ممتاز ہے۔ علم صرف و نحو کا موضوع۔ کلمہ و کلام اور اس کے اشتقاق و تصریف اور اعراب و بناء کے احوال ہیں تو وہ اس طرح دیگر علوم سے ممتاز ہے اور ہر فن میں اسی موضوع کے احوال سے بحث ہوتی ہے جو اس فن کا موضوع ہے۔ اس لیے مثلاً طب میں بدن انسانی کے احوال مرض و صحت ہی کی بحث ہوتی ہے اور فن صرف و نحو میں کلمہ و کلام کے انہی احوال سے بحث ہوتی ہے جو فن نحو و صرف کا موضوع ہے تو علم تفسیر کا موضوع قرآن کریم ہے۔ اس لحاظ سے قرآن کے مطالب و اغراض اور مقاصد بیان کیے جائیں اس لیے فن تفسیر میں صرف ایسے ہی امور زیر بحث آسکتے ہیں جن کا تعلق وحی الٰہی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت و فرمانبرداری، ایمان و کفر، سعادت و شقاوت اور ثواب و عقاب سے ہو۔ جس چیز کا قرآنی علوم و مقاصد سے تعلق نہ ہو اس کی تحقیق و تفصیل کا نام تفسیر نہ ہوگا۔ مثلاً کوئی شخص آیت یَاهَامَانُ ابْنِ لِي صَرْحًا[1] کی تفسیر و تشریح میں فن تعمیرات کے اصول و تفصیلات کی بحث شروع کر دے کہ تعمیر کس رُخ پر اور کس طرح ہونی چاہیے اور کتنے منزلہ تعمیر کے لیے بنیادوں کو کس استحکام و مضبوطی سے بلند کیا جائے وغیرہ وغیرہ تو اس طرح کے مباحث

---

[1] یہ فرعون کا مقولہ ہے جس کو قرآن کریم نے ذکر فرمایا کہ وہ اپنے وزیر ہامان کو کہنے لگا کہ اے ہامان تو میرے واسطے ایک بہت بلند محل بنا دے۔ ۱۲

اور انجینئرنگ کے مسائل تفسیر کے ماتحت بیان کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی موچی کسی قانون و دستور کی کتاب کی شرح میں جوتا گانٹھنے کے مسائل بیان کرنا شروع کر دے، چمڑے کی صفائی اور رنگائی کے اصول سے بحث کرنے لگے۔ یہ درست ہے کہ جوتا بنانا ایک مفید صنعت ہے اور انسانی زندگی کے متعلقات میں سے ہے۔ لیکن ہر عاقل اور سمجھ دار شخص دستور و آئین کے ساتھ ایسے مسائل بیان کرنا ایک کھلی حماقت تصور کرے گا۔ اس لیے کہ ہر شئے کا ذکر موضوع کے ساتھ ربط اور تعلق رہنے کی صورت میں مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا مضامین تفسیر وہی ہوں گے جو موضوع قرآن روحانی علوم اور مقصد ہدایت سے تعلق رکھتے ہوں۔ سائنسی مسائل و تجربات اور صنعتی ایجادات اور ان سے متعلقہ مباحث کو قرآنی مضامین میں زیر بحث لانا اور ایسی ہی چیزوں کو منتہائے فکر اور مبلغ علم قرار دینا نہ صرف یہ کہ قرآن کریم کے اعلیٰ و اکمل اصول ہدایت اور فوز و فلاح کے بہترین مقاصد سے اعراض کرنا بلکہ کتاب الٰہی کی ایک کھلی توہین و بے حرمتی کا بھی ارتکاب ہے۔

توحید و رسالت اصلاح عقائد اور اعمال و اخلاق تحفظ حقوق نظام مملکت کی درستگی اعلاء کلمۃ اللہ تذکیر آخرت زہد و قناعت اور تقویٰ، صبر و شکر کی تعلیم اخلاقی اور عملی گندگیوں سے طہارت فساد فی الارض سے اجتناب، مجرمین کی سرکوبی، جان و مال اور عزت و ناموس پامال کرنے والے مفاسد سے معاشرہ کی تطہیر و پاکی اور ایسے ہی پاکیزہ مقاصد قرآن کا موضوع ہیں۔ قرآن کریم میں انہی مقاصد سے بحث کی جا سکتی ہے۔

قرآن ہوائی جہاز اور راکٹوں کی صنعت سکھانے کے واسطے نازل نہیں ہوا اور نہ ان چیزوں کی تعلیم مقصد رسالت ہے۔ وحی اور غرض رسالت تو تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفوس ہے۔ یہ صنعتی ایجادات و ترقیات ہمارے دنیوی امور ہیں جن کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُورِ دُنْيَاكُمْ کہ تم اپنے دنیوی معاملات کے زیادہ جاننے والے ہو" فرما کر ان مسائل کو

تمہارے ذہنی اور فکری صلاحیتوں کے حوالہ کردیا ہے کہ تم ان چیزوں میں جس طرح چاہو تصرّف کرتے رہو ہمیں اس سے کوئی تعرض نہ غرض نہیں - خداوندعالم نے زمین و آسمان اور ان کے درمیان جملہ مخلوقات پیدا فرما کر انسانوں کو ان میں تصرف وحکمرانی کی صلاحیتیں عطا فرما کر یہ فرما دیا اے انسانو! یہ سب کائنات تمہارے واسطے مسخر وتابع کردی ہے۔ اب جس طرح چاہو ان میں تصرف کرو۔ پانی پر سفر کرو۔ ہوا پر اُڑو۔ معدنیات سے زمین کے خزائن حاصل کرو۔ غرض یہ سب کچھ اللہ نے انسانوں ہی کے نفع کے لیے بنایا ہے۔ لیکن ہر مقام پر ان انعامات کے ذکر کے ساتھ انسانی افکار کو حق تعالیٰ کی معرفت اور اس کی اطاعت وبندگی کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دی گئی۔ اور یہ کہ ان بے شمار نعمتوں اور دلائل قدرت کو دیکھ کر انسان کو چاہیے کہ اپنے رب کو پہچانے اور اس کی اطاعت وفرمانبرداری میں مشغول ہو۔ ایسے محسن ومنعم رب کی نافرمانی ظلم عظیم ہے، اور اس کے احسانات کو نہ سمجھنا قلوب کی موت ہے۔

غرض یہ کہ حق تعالیٰ نے جہاں تکوینیات اور برّ وبحر کے عجائب کا ذکر کیا ہے وہاں مقصد ان انعامات اور دلائل قدرت سے حق تعالیٰ کی معرفت اور بندگی پر آمادہ کرنا مقصد قرآن ہے تو ایسی آیات کی تشریح اسی معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے تفسیر کہلائے گی اور اگر اس سے ہٹ کر ان کی تشریحات میں صنعتی اور مادی وسائل کو بروئے کار لانے کے طور وطریق کی بحث کی جائے گی تو یہ تفسیر نہیں بلکہ تحریف قرآن ہوگی۔

مثلاً قرآن کریم نے انعامات خداوندی کے سلسلہ بیان میں اس انعام کو بھی بیان فرمایا وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهٖ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نفع کے واسطے جہاز، کشتیوں کو تمہارا تابع ومسخر کردیا تاکہ وہ بحکم خداوندی سمندر میں چلیں اور سفر کریں تو کوئی شخص اس قسم کی آیات پر جہازوں اور کشتیوں کی صنعت، ان کے چلانے اور اس سے متعلق تعلیم ونصاب تعلیم اور سائنسی اصول

دتجربات پر بحث کرنے لگے جو قرآنی مقاصد سے کسی درجہ کا بھی تعلق نہیں رکھتے، تو کہا جائے گا کہ یہ شخص ایسی کتاب الہٰی کو جو تمام انبیاء علیہم السلام اور کل آسمانی کتابوں کے علوم کی جامع کتاب ہدایت ہے۔ محض ایک کتاب تجارت بنانا چاہتا ہے۔

قرآن کریم نے دنیوی زندگی میں انہماک اور مادی منفعتوں میں سرگرداں و حیران ہونے کے بجائے انسانوں کے رخ اُخروی زندگی کی طرف پھیرے تھے، اور وَ اَنِیْبُوْا اِلٰی رَبِّکُمْ وَ اَنِیْبُوْا اِلٰی رَبِّکُمْ کی صداؤں سے انسانی زندگی کا رخ صحیح منزل کی جانب کر دیا تھا۔ اب اگر ایسی جدید تحقیقات کو قرآنی حقائق سمجھا جانے لگا تو اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ انسان کے ذہن و فکر کو روحانیت سے ہٹا کر مادیت اور دور جاہلیت کی طرف پھیر دینا ہوگا۔

اگر سرسری نظر ہی سے دیکھا جائے تو اس میں سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہؓ کی زندگیاں ہی سب سے زیادہ قرآنی مضامین وحقائق سے بے تعلق نظر آئیں گی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کسی مجلس میں ان صنعتی ترقیات کا نہ ذکر فرمایا اور نہ ہی حضرات صحابہؓ نے کبھی یہ چیزیں دریافت کیں اور نہ کسی کو بتائیں۔ نہ ایسی تحقیقات عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابہ سے نقل کی گئیں تو سوچیے اگر ان مضامین کا نام علوم قرآن قرار دیا جائے تو کیا یہ لازم نہ آئے گا کہ علوم قرآن میں یہی حضرات امت میں سب سے زیادہ ناواقف تھے (العیاذ باللہ) نہ ان مضامین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سمجھا نہ صحابہؓ و تابعین اور نہ غزالی و رازی نے اور نہ ان علماء ربانیین نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے اب تک علوم قرآن کی تحقیق و تفسیر میں مصروف رہے۔ الغرض ان میں سے کسی نے آج تک قرآن کو حل نہیں کیا۔ بس آج ان جدید تحقیقات ہی نے دنیا کو قرآن اور معارف قرآن سے آگاہ کیا۔ ایسی صورت میں تو کوئی کہنے

والا کہہ سکتا ہے کہ خداوند عالم نے بلا وجہ قرآن سید الانبیاء والمرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا اور صحابہؓ کو اس کا اولین مخاطب بنایا۔ بہتر ہوتا کہ لندن یا اکسفورڈ یونیورسٹی کے کسی فلاسفر اور انجینئر پر قرآن اتارا جاتا العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ۔ یقیناً کوئی بھی ایسا شخص جس میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو یہ بات سوچنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا۔ پھر یہ بھی بات قابل غور ہوگی، کہ قرآن کے مخاطب اہل عرب تھے اور اس وقت وہ ان چیزوں سے قطعاً نا آشنا تھے حتیٰ کہ قیصر وکسریٰ جیسی متمدن حکومتوں کو ان چیزوں سے کوئی خاص شغف نہ تھا، بلکہ کل روئے زمین پر بھی اس وقت ان جدید سائنسی ترقیات کا ماہر نہ تھا تو اگر قرآن کا موضوع یہی تھا تو پھر ان کے سامنے ان مسائل کو بیان کرنے سے کیا حاصل اور کیا فائدہ ہوا۔ سب سے بڑی خرابی اس مفروضہ میں یہ لازم آئے گی، ایک شخص یہ دعویٰ کردے گا کہ جب مقصد قرآن یہی امور ہیں تو میں ان سائنسی تحقیقات و ترقیات کو قرآن کے بغیر بھی حاصل کر سکتا ہوں۔ اور اس منزل مقصود تک پہنچنے کے واسطے مجھے نہ قرآن کی ضرورت ہے اور نہ پیغمبر کی۔ بلکہ اس منزل مقصود تک تو یورپ کے سائنسدان بہتر رہنمائی کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا یہ بات نہایت واضح ہے کہ قدرت کی طرف سے صنعت وحرفت کے تمام شعبے انسانوں کے انظار و افکار کے حوالہ کر دیئے گئے ہیں کہ تم ان مادی چیزوں میں جس طرح چاہو تصرف کرو۔ بڑے بڑے کارخانے قائم کرو۔ مشینیں بناؤ۔ سمندروں میں کشتیاں تیراؤ اور ہواؤں پر راکٹ و جہاز اڑاؤ جیسے چاہو عجیب سے عجیب مصنوعات ایجاد کرو مگر ان چیزوں کو علوم الٰہیہ اور قرآنی تحقیقات کہنے کی جرأت نہ کرو۔ یہ سب چیزیں علوم انسانیہ ہیں۔ علوم الٰہیہ اور علوم مادیہ میں اتنا ہی تفاوت و فرق ہے جتنا کہ خود خالق اور مخلوق کے درمیان ہے۔ اس لیے مضامین قرآن صرف علوم الٰہیہ ہی سے متعلق رہیں گے۔ فنی اور صنعتی امور کو مبدأ و معاد، ایمان و کفر، ہدایت و ضلالت اور سعادت و شقاوت کے مضامین

پر ترجیح دینا کلام ربانی کے علو و منقبت کو پامال کر کے جرمن و جاپان کی ایجادات کے معیار پر پورے آنا ہو گا۔

اگر عقل و خرد سے محروم کسی انسان نے ایسا کیا تو پھر تو قرآن کریم کا تمام دنیا میں بہترین کتاب اور معجزۂ الٰہی ہونا ہی مخدوش ہو جائے گا۔ کیونکہ ایسی صورت میں تو قرآن کا کمال صنعتی ترقیات کے کمال سے پرکھا جانے لگے گا۔ اب اس معیار پر جو بھی کتاب پوری اترے اسی کو حق ہو گا کہ وہ یہ دعویٰ کرے ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ

بہرکیف موضوع تفسیر صرف وہی مضامین ہیں جو علوم الٰہیہ اور مقاصد قرآن سے تعلق رکھتے ہوں جن کی تشریح و تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مبارکہ آپ کے اقوال و افعال اور عادات و احوال اور حضرات صحابہ کی روایات نے کی۔

جدید تحقیقات اور سائنسی ترقیات کو مقصد کائنات کا دل فریب عنوان دے کر مضامین قرآن میں داخل کرنے والوں کے طرز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو قرآن کا موضوع معلوم ہی نہیں ہے۔

قرآن نہ تو فلسفہ جدیدہ ہے اور نہ سائنس کی کوئی کتاب ہے۔ نہ ہی وہ کوئی تاریخ و جغرافیہ ہے وہ تو طب روحانی کی آخری اور بے مثال کتاب ہدایت ہے جس میں باطنی امراض اور بیماریوں کے علاج اور روحانی شفاء اور دنیا و آخرت کی فلاح و کامیابی کے نسخے دنیا کو بتائے گئے ہیں۔

جیسے کہ خود قرآن کریم نے اعلان کیا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ	اے انسانو! بیشک تمہارے پاس آچکا تمہارے رب
مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ	کی طرف سے ایک پیغام نصیحت اور سامان شفاء و
لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَ	عافیت کا اُن تمام بیماریوں کیلئے جو دلوں میں ہوں۔
رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۔	اور ہدایت و رحمت اہل ایمان کے واسطے۔

ان شاء اللہ العزیز ہم آئندہ کسی عنوان کے تحت علوم قرآن اور مقاصد قرآن کی کچھ تفصیل قارئین کرام کی خدمت میں پیش کریں گے۔

تفسیر قرآن کے لیے علوم ضروریہ

تفسیر و تاویل کی بحث میں امام ابو حیانؒ کے حوالہ سے علم تفسیر کی تعریف نقل کی جاچکی ہے کہ "وہ ایک ایسا علم ہے جس میں الفاظ قرآن کی کیفیت نطق اور معانی الفاظ اور ان کے افرادی و ترکیبی حالات اور تتمات بیان کیے جائیں"۔ تو یہ تعریف جن قیود اور فصول پر مشتمل ہے، اس سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ تفسیر کے لیے علم القرأت، لغت، صرف و نحو، بیان و بدیع معرفت، ناسخ و منسوخ اور معرفت ظاہر و نص اور مفسر و محکم اور ظاہر نص مفسر و محکم کے مقابل اقسام اور معرفت احوال امم ماضیہ (غرض یہ تمام علوم تفسیر کے لیے) مبادی بلکہ اجزاء ترکیبیہ ہیں۔ ناسخ و منسوخ اور اسباب نزول کی معرفت مقاصد آیات کی تشریح الفاظ غریبہ کی توضیح ابہام و اجمال کی تفصیل تو روایت یعنی نقل صحیح اور اقوال سلف سے تعلق رکھنے والے امور ہیں اور اکثر متقدمین اسی حصہ کو تفسیر کہتے ہیں۔ اور تفسیر کے لیے علوم ضروریہ کا دوسرا حصہ لغت، صرف و نحو اور معانی وغیرہ، روایت (حدیث مرفوع) آثار سلف اور نقل صحیح پر موقوف نہیں۔ بالعموم حضرات مفسرین اس حصہ کو مبادی تفسیر کے عنوان سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس بحث کی تفصیل کرتے ہوئے شیخ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تفسیر کے لیے پندرہ علوم ضروری ہیں اور کسی شخص کو قرآن کریم کی تفسیر کا حق نہیں ہے، جب تک وہ ان تمام علوم میں مہارت نہ رکھتا ہو:

۱۔ لغت عربیہ: جس کے ذریعہ الفاظ مفردہ کی تشریح کی جاسکے اور کلمات کا وضعی

اور لغوی مفہوم معلوم ہو سکے۔ مجاہدؒ سے منقول ہے کہ کسی ایسے شخص کے لیے جو اللہ پر اور اس کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان رکھتا ہو یہ حلال نہیں ہے کہ وہ کتاب اللہ کے بارہ میں کچھ لب کشائی کرے تا وقتیکہ وہ لغت عربیہ کا عالم نہ ہو۔

اور یہ کافی نہیں ہے کہ کوئی شخص چند لغات کے معانی جان لینے کے بعد یہ گمان کرنے لگے کہ میں لغت عربیہ کا عالم ہوں۔ کسی لغت کا ماہر اور عالم اسی شخص کو کہا جاتا ہے جو اس زبان کے پورے لغات پر عبور رکھتا ہو، ان کی اوضاع کو پہچانتا ہو۔ محاورات سے پوری طرح واقف ہو۔ اشتراک و ترادف کو سمجھتا ہو۔

۲۔ علم النحو: کیونکہ معانی کا دار ومدار اعراب ہی پر ہے۔ اعراب ہی سے کلام کا صحیح مفہوم سمجھا جا سکتا ہے۔ زیر زبر کے فرق ہی سے زمین و آسمان کا فرق ہو جاتا ہے۔

مثلاً کوئی شخص اگر آیت وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ میں آدم کو نصب اور ربّہ رفع کے ساتھ پڑھے تو معنی فاسد اور قطعاً لغو ہو جائیں گے اور اسی فرق سے کلام کا مفہوم حضرت آدم کی حکم عدولی کے بجائے العیاذ باللہ، خدا تعالیٰ کی خطا اور غلطی کا مضمون بن جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی إِنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ کو لام کے کسرہ کے ساتھ ورسولِہ پڑھے تو معنی قطعاً فاسد ہو جائیں گے۔ اور بجائے اس کے کہ آیت کا ترجمہ یہ ہو اللہ اور اس کا رسول مشرکین سے بری ہے۔ اس غلط اعراب کی بنا الٹا ترجمہ یہ ہوگا، خدا مشرکین سے اور العیاذ باللہ اپنے رسول سے بری ہے۔ غرض اس وجہ سے تفسیر کے لیے علم نحو کا جاننا ضروری ہے تاکہ اعراب کی رعایت سے صحیح مراد سمجھ سکے۔

۳۔ علم الصرف: اس لیے کہ علم صرف ہی کے ذریعہ بنا، کلمات اور صیغوں کا علم ہو سکتا ہے اور جب تک انسان یہ نہ جانے کہ یہ کونسا صیغہ ہے اور اس کی اصل کیا ہے وہ کیسے کلام کے معنی سمجھ سکتا ہے۔

۴۔ علم الاشتقاق: کیونکہ اس علم کے ذریعے مادہ لغات پر مطلع ہو سکے گا۔ اور

اس کے بغیر بھی معنی کا سمجھنا ممکن ہے۔ اس وجہ سے کہ لبسا اوقات لفظ کی صُورت یکساں ہوتی ہے لیکن اختلاف مادہ کی وجہ سے معنی میں بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ مثلاً لفظ مَسِیحؑ سیاحت بمعنی سیر سے بھی مشتق ہوسکتا ہے اور مسح سے بھی مفعول کا صیغہ ہوسکتا ہے جس کے معنی مَلا ہُوا مَسح کیا ہُوا ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ لفظ مسیح کے معنی متعیّن کرنے کے لیے اصل مادہ لغت کا معلوم اور متعیّن ہونا ضروری ہے۔

۵۔ علم المعانی ۔ ۶۔ علم البیان ۔ ۷۔ علم البدیع ۔
اس لیے کہ ان علوم کے بغیر ترکیب کلام اور اس کے محاسن و خوبیوں کا سمجھنا ممکن نہیں۔ حقیقت و مجاز۔ استعارہ و کنایہ اور تشبیہ کے لطائف اور فصاحت و بلاغت کا معیار نیز قرآن کریم کے وُجوہ اعجاز کا جاننا بھی انہی علوم پر موقوف ہے۔

۸۔ علم القرآت : اس لیے کہ کلام اللہ کے الفاظ کا صحیح تلفظ اور کیفیت نطق اسی سے معلوم ہوسکتی ہے۔

۹۔ علم اصُول الدین : تاکہ حلال و حرام، فرض و واجب، جائز و ناجائز کے درجات معلوم کرسکے اور ان پر آیاتِ قرآنیہ سے استدلال کرسکے۔

۱۰۔ علم اصُول فقہ : تاکہ تمام احکام شرعیہ اور فقیہہ تفصیلی طور پہ آیات قرآن اور احادیثِ نبویہ سے مستنبط کر سکے۔

۱۱۔ علم اسباب النزول والقصص : اس لیے کہ آیات کا مضمون لبسا اوقات اسباب نزول اور متعلقہ واقعات و احوال کے جانے بغیر سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔

۱۲۔ علم ناسخ و منسُوخ : اس لیے کہ شریعت میں بہت سے احکام منسُوخ کیے گئے ہیں اور ان کے قائم مقام دُوسرے احکام مقرر ہُوئے تو ضروری ہے کہ احکام کلام اللہ کی حقیقت اور نوعیت معلوم کرنے کے لیے انسان ناسخ و منسُوخ کا بھی علم رکھتا ہو۔

۱۳۔ فقہ : یعنی احکام شرعیہ سے متعلق تفصیلی جزئیات اور فروع کا علم۔

۱۴۔ علم الحدیث و علم الاسناد و اسماء الرجال : کیونکہ قرآن کریم کی اصل شرح و تفسیر تو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ اور آپؐ کا اسوۂ عملی قرآن ہے جیسا کہ حضرت عائشہؓ کا قول ہے کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْآن ۔ لہٰذا بغیر حدیث کے قرآن کریم کیسے سمجھا جاسکتا ہے ۔ اور حدیث کے متعلقات میں سے علم الاسناد و علم اسماء الرجال بھی ہے لہٰذا یہ بھی ضروری ہوگا

۱۵۔ علم الموہبہ : یعنی وہ صحیح ذوق اور فہم اور باطنی نور بصیرت جو انسان کو علم صحیح اور کلام اللہ کی مراد اس کے حقائق اور اغراض و مقاصد کے فہم کی طرف رہنمائی کرے ۔ یہ فہم اور ذوق صحیح انسان کو عمل صالح اور زہد و تقویٰ کی برکات سے محض من جانب اللہ عطا ہوتا ہے ، جس کے بعد ایسے شخص پر کلام اللہ کے اسرار و لطائف منکشف ہوتے ہیں ۔ علم الموہبہ بظاہر غیر اختیاری اور محض عطاء الٰہی ہے جو انسان کی قدرت اور اس کے کسب و اکتساب سے خارج معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن احوال اور اسباب پر یہ علم عطا ہوتا ہے وہ اختیاری ہیں ۔ وہ انسان کا عمل صالح اس کا اخلاق زہد و تقویٰ شہوات اور معاصی سے پرہیز اور انابت الی اللہ ، تو یہ تمام امور چونکہ اختیاریہ ہیں اس علم الموہبہ کو بھی اختیاری علوم میں شمار کیا جاسکتا ہے ۔

چنانچہ شیخ رحمہ اللہ کتاب البرہان میں فرماتے ہیں کہ یہ بات جاننا چاہیے کہ کسی ایسے شخص پر وحی الٰہی کے اسرار اور معارف منکشف نہیں ہوسکتے اور نہ ہی اس کو فہم قرآن سے کوئی حصہ حاصل ہوسکتا ہے جس کے دل میں بدعت کی گندگی بھری ہوئی ہو ۔ کبر و نخوت اور خواہشات نفسانیہ ، حبِّ دنیا اور حرص و طمع میں مبتلا ہو گناہوں پر اصرار کرتا ہو ۔ ایمان و اعتقاد میں کمزور ہو (فرائض کی پابندی نہ کرتا ہو) تو یہ تمام باتیں فہم قرآن اور وحی الٰہی کے اسرار سمجھنے میں حجاب اکبر ہیں ۔ قرآن کریم کی یہ آیت شیخ کے اس کلام کی بنیاد معلوم ہوتی ہے :

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ	یقیناً میں رُخ پھیر دوں گا اپنی آیات
یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ ۔	(اور نشانیوں) سے ان لوگوں کا جو
(اعراف)	تکبر کرتے ہیں زمین میں ۔

ابن ابی الاصبع فرماتے ہیں کہ علوم قرآن اور جو علوم و حقائق اس سے مستنبط ہوتے ہیں وہ ایک ناپیدا کنار سمندر ہے ۔ یہ علوم مفسر کے لیے صرف بمنزلہ آلہ کے ہیں مفسر ان کی مدد سے قرآن کے مفہوم کو حاصل کر سکتا ہے ۔ اور جو شخص ان اصول اور قواعد کے ماتحت تفسیر کرے گا تو اس کی تفسیر کو معتبر شمار کیا جا سکے گا ۔

ان علوم کے بغیر کسی کا تفسیر میں دخل دینا ایسا ہی ہوگا جیسے فن طب میں کوئی ایسا شخص دخل دینے لگے جس کو نبض کی بھی پہچان نہیں ۔ نہ صرف یہ کہ یہ اقدام خلاف شرع اور کتاب الٰہی کی سراسر بے حرمتی کرنا ہوگا ، خلاف عقل بھی ہوگا ۔ انسان اسی فن میں کچھ بولتا ہوا اچھا معلوم ہوتا ہے ۔ جس فن کی اس کو خبر اور تحقیق ہو ۔ اور اگر کوئی اس ضابطہ کو ملحوظ نہیں رکھتا تو وہ دیوانوں کی فہرست میں شامل کرنے کے لائق ہے ۔

شیخ سیوطیؒ نے تفسیر قرآن کے لیے جو یہ پندرہ علوم بیان کیے ان کے علاوہ بھی چند اور علوم ہیں جن کا مفسر کے واسطے جاننا ضروری ہے ۔ وہ یہ ہیں : ۱۶ ۔ علم الکلام ۱۷ ۔ علم التاریخ ۔ ۱۸ ۔ علم جغرافیہ ۔ اس لیے کہ قرآن کی بہت سی آیات ایمان و توحید اور نبوت و رسالت اور ذات و صفات کے مضامین پر مشتمل ہیں تو جب اصول و قواعد کا علم اور تحقیق نہ ہو تو ان آیات کے مضامین پوری طرح واضح نہیں ہو سکتے ۔ علیٰ ہذا القیاس بہت سی آیات قصص و واقعات پر اور مختلف علاقوں اور بستیوں کے بیان پر مشتمل ہوتی ہیں ..... تو ان کے سمجھنے کے لیے تاریخ اور جغرافیہ کی ضرورت ہوگی ۔ ۱۹ ۔ علم الزہد والرقاق ۲۰ ۔ علم الاسرار ۔ کیونکہ اسرار قرآنی کا فہم اسی پر موقوف ہے ۔ ۲۱ ۔ علم الجدل و الخلاف اس لیے کہ قرآن کریم میں متعدد مواقع ہیں حقائق و دلائل توحید اور معارف ربوبیت استدلال و حجت کے انداز میں اہل باطل کے مقابل پیش کیے گئے تو ان آیات کے

اسرار و حقائق اسی شخص پر واضح ہو سکتے ہیں جو احتجاج و استدلال کے اصول جانتا ہو۔ ۲۲۔ علم السیرۃ۔ ۲۳۔ علم الحقائق یعنی وہ علم جس میں حقائق موجودات کا بیان ہوتا ہے۔ یہ علم نہایت وسیع علم ہے اور اس کی بہت سی شاخیں ہیں حقائق موجودات کے بارہ میں حکماء قدیم کا علم جدا ہے اور حکماء جدید کا علم اور مسلک دوسرا ہے اور حضرات صوفیاء و ارباب حقیقت اس سلسلہ میں کچھ اور ہی مسلک رکھتے ہیں، جو ان کے روحانی مکاشفات پر مبنی ہے اور یہ روحانی مکاشفات ان حضرات کو بارگاہ نبوت سے بلا واسطہ یا بالواسطہ حاصل ہوتے ہیں۔ ۲۴۔ علم الحساب کیونکہ قرآن کا ایک حصہ میراث و فرائض کے مسائل پر مشتمل ہے اور اس میں لامحالہ حساب کی ضرورت ہے۔ ۲۵۔ علم منطق کیونکہ منطقی مسائل و قواعد کے ذریعے قرآن کریم کے طرق استدلال اور دلائل کی قوت معلوم ہو سکے گی۔

غرض تفسیر قرآن کے لیے ان علوم میں مہارت و بصیرت شرط ہے۔ ان علوم کے بغیر کسی شخص کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ قرآن کریم کی تفسیر کا قصد کرے۔

لیکن اس دور میں جہاں اور مختلف انواع و اقسام کے فتنے دنیا میں پھیل رہے ہیں یہ بھی ایک عظیم فتنہ ہے کہ ہر کس و ناکس چند اُردو یا انگریزی تراجم دیکھ کر تفسیر کرنے لگتے ہیں۔ دراصل ایسے لوگوں کی غرض تفسیر قرآن نہیں ہوتی بلکہ اپنے افکار و خیالات کو بر رنگ تفسیر پھیلانا ہوتا ہے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ اپنے ان مفروضہ مقاصد و خیالات کے سامنے ائمہ متقدمین اور سلف کی تحقیقات پر بھی ردّ و قدح کرنے لگتے ہیں اور ان اکابر امت جن کی زندگیاں علوم قرآن ہی کی اشاعت میں گزریں اور وہ حقائق و معارف کے ایک ناپیدا کنار سمندر اور علمی عظمتوں کے بلند و بالا پہاڑ ہیں۔ پر صرف یہ ہی نہیں کہ جرح و قدح کریں نہایت جسارت و بے باکی کے ساتھ ان کا ردّ کر دیتے ہیں۔

غزالیؒ اور رازیؒ کی تحقیق و تجہیل کریں اور اپنے اوہام باطلہ اور یورپ کی تقلید میں ان کے افکار کی اشاعت کو کمال سمجھیں۔ یقیناً یہ اس دور کا بدترین فتنہ ہے۔ خداتعالیٰ مسلمانوں کو ان فتنوں سے محفوظ و مامون رکھے۔ آمین۔

ان بیان کردہ شرائط کے علاوہ مفسر و مترجم کے واسطے یہ بھی ایک شرط ہے کہ اس نے علم باضابطہ کسی استاذ سے حاصل کیا ہو۔ محض تراجم دیکھ کر یا چند کتب تفسیر کے مطالعہ کو کافی سمجھنا نہ شرعاً درست ہے اور نہ عقلاً۔ جس طرح کوئی شخص ڈاکٹری یا فن طب کی کتابوں کا مطالعہ کرکے ڈاکٹر اور طبیب نہیں ہوسکتا، اور قانون کی دو چار کتابوں کا ترجمہ دیکھ کر بیرسٹر اور وکیل نہیں ہوسکتا اسی طرح تراجم اور چند کتب کے مطالعہ سے کوئی مفسر نہیں ہوسکتا، حالانکہ ڈاکٹر اور قانون و وکالت انسانی علوم ہیں، انسانی فکر کا اپنی صلاحیتوں اور جدوجہد سے اس کو حاصل کرلینا ممکن ہے، لیکن قرآن کریم تو علوم الٰہیہ اور معارف ربانیہ کا ایک ناپیدا کنار سمندر ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے انسان باقاعدہ علم حاصل کیے بغیر ان روحانی علوم میں مہارت کا مدعی بن جائے۔

مترجم و مفسر ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ علماء معاصرین اور فضلاء زمانہ کی نظروں میں اس کا علم و فہم اور تقویٰ مسلّم ہو۔ کیونکہ علم تو وہی ہے جس کا اہل علم و فضل اعتراف کریں۔ علم محض دعوؤں سے یا اخبارات و رسائل میں دوچار مضامین کی اشاعت سے نہیں حاصل ہوجاتا۔

ترجمہ و تفسیر صرف ایسا ہی عالم کرسکتا ہے جو غیر مترجم قرآن کریم سے آیات کی تلاوت کرکے ان کے صیغے اعراب وغیرہ کی تشریح کے ساتھ آیات کی شرح و تفصیل کرسکے اور یہ بتاسکے کہ آیات کا ربط سیاق و سباق سے کیا ہے اور الفاظ کلام اللہ سے کون کون سے احکام مستنبط ہورہے ہیں۔ اور شان نزول آیات کیا ہے اور جس شخص میں یہ صلاحیت و قدرت نہیں اس کو چاہیے کہ وہ امت کے سامنے اپنے کو مفسر قرآن کی حیثیت سے پیش نہ کرے مناسب ہے کہ کوئی

toobaa-elibrary

اور کام کرے۔

مفسر و مترجم کے لیے ان تمام شرائط اور علوم مذکورہ سے متصف ہونا خود قرآن کریم کے ارشاد سے ظاہر ہو رہا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (سورۃ القصص)

اور اس شخص سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو اپنی خواہشات کی پیروی کر رہا ہو، بغیر اس کے کہ اللہ کی طرف سے کوئی ہدایت وعلم ہو (تو ایسے لوگ یقیناً ظالم ہیں) اور اللہ تعالیٰ ظالموں کی رہنمائی نہیں فرماتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ثَانِىَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهٗ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ۔ (سورۃ الحج)

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو جھگڑتے رہتے ہیں، اللہ کے بارے میں بغیر علم اور ہدایت اور بغیر کسی کھلی ہوئی روشن کتاب کے درانحالیکہ پہلو پھیرے ہوئے ہوتا ہے ایسا شخص اپنی جانب اور رُخ کو حق کے راستہ سے باطل کی جانب تاکہ بھٹکا دے لوگوں کو خدا کے راستہ سے (یقیناً) ایسے شخص کے واسطے دُنیا میں ذلت و رسوائی ہے اور آخرت میں ہم اس کو ایک بھڑکتے ہوئے اور جلا دینے والے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

تو آج کل اسی طرح یورپ کے افکار و نظریات سے مرعوب یا اس کی اشاعت کرنے والے لوگ اہل حق کے ساتھ اپنے گمراہ کن نظریات و خیالات کو لے کر جدال و خصومت پر آمادہ رہتے ہیں اور حال یہ کہ نہ ان لوگوں کے پاس کوئی علم ہوتا ہے اور نہ کوئی حجت و برہان اور اس کے باوجود اہل حق اور سلف کی تردید و مخالفت

آمادہ رہتے ہیں۔

جو شخص قانون حکومت اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنا چاہے اور اس کی دفعات کی ایسی عجیب و غریب تشریحات کرے جو عدالت عالیہ کے کسی فاضل جج یا کسی ماہر قانون نے نہیں کی اور نہ اس کے حاشیہ خیال میں کبھی اس دفعہ کی یہ تشریح گذری تو ایسا شخص یقیناً حکومت کا مجرم ہے اور حکومت کی قانونی گرفت اور تعزیر سے نہیں بچ سکتا۔ بالکل اسی طرح وہ شخص بھی ہے جو قانون خداوندی اور کلام الٰہی کے ایسے عجیب و غریب معنی بیان کرے جو عہد صحابہ سے لے کر اس وقت تک کسی امام مفسر اور عالم ربانی سے نہ نقل کیے گئے اور نہ ہی وہ معنی ایسے حضرات ائمہ اور مفسرین کی تحقیقات یا اصول سے مستنبط ہوسکتے ہیں تو یہ شخص خداوند عالم اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مجرم ہے اور يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ اور يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ کا مصداق ہونے کے باعث شریعت کے قانون سے ملحد اور زندیق ہے۔

مراتبِ تفسیر

قسم اوّل تفسیر القرآن بالقرآن

اصول تفسیر کے تتبع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ مفسرین کے نزدیک تفسیر قرآن کے مراتب و درجات متعدد ہیں جو بظاہر پانچ قسموں میں منحصر ہیں :

قسم اوّل یہ کہ قرآن کی تفسیر قرآن ہی کے ذریعے کی جائے جس کا عنوان "تفسیر القرآن بالقرآن" ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں بہت سے مضامین اور احکام کا مکرر ذکر ہے۔ اور وہ مضامین کسی جگہ اجمال سے ذکر کیے گئے ہیں تو دوسرے کسی موقع پر ان کو تفصیل سے بیان کیا گیا۔ کہیں کسی مضمون کا کوئی پہلو کسی ایک موقع پر بیان کیا گیا تو دوسرا پہلو کسی دوسری جگہ ذکر کیا گیا تو اس طرح قرآن کے ایک بہت بڑے حصہ کی خود قرآن کریم ہی سے تشریح و تفصیل ہوتی ہے اور بہت سی آیات کا اجمال کلام اللہ ہی کی دوسری آیات کے ذریعے دور ہو جاتا ہے

مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حق تعالیٰ کی ہمکلامی کا قصہ، اور ان کو فرعون کی طرف تبلیغ اور دعوت الی اللہ کے مقصد سے بھیجنے اور اس پر فرعون کی سرکشی اور غرور انکار و کفر کا واقعہ قرآن کریم میں متعدد مواقع پر ذکر فرمایا گیا۔ سورۃ والنازعات میں جس کو نہایت ہی ایجاز و اختصار کے رنگ میں بیان فرمایا گیا : ارشاد ہے :

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى (اے پیغمبر) کیا آپ کو پہنچا ہے قصہ موسیٰ کا

اِذْ نَادٰهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى فَكَذَّبَ وَعَصٰى ۔

(والنازعات)

جب کہ پکارا ان کو ان کے رب نے ایک میدان وادی مقدس طوٰی میں کہ (اے موسٰی) جا فرعون کی طرف کیونکہ اس نے بہت ہی سرکشی اختیار کر لی ہے ۔ اور پھر کہہ (اس سے) کیا ہے کچھ خیال تیرا اس بات کے لیے کہ تو پاکی اختیار کر لے (کفر کی نجاست و گندگی سے مالک حقیقی کی اطاعت کرتے ہوئے) اور راستہ بتاؤں میں تجھ کو تیرے رب کا کہ تو اس سے ڈرنے لگے تو حضرت موسٰی گئے فرعون کے پاس اور پھر انہوں نے) دکھائی اس کو ایک بہت بڑی نشانی ۔ مگر اس نے جھٹلایا اور نافرمانی پر قائم رہا ۔ الخ

تو اس جگہ قرآن کریم نے صرف ان چند کلمات ہی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حق تعالیٰ کے ساتھ مناجات اور ان کا فرعون کے پاس اللہ کا پیغام لے کر تبلیغ کے لیے جانا پھر اس کے سامنے آیات و معجزات میں سے آیت کبریٰ اور بہت بڑی نشانی کا ظہور اس کے باوجود فرعون کا غرور تکبر اور انحراف و سرکشی اور اس کا ایمان لانے سے صاف انکار کر دینا بیان فرمایا گیا ۔ واقعات کے ان اجزاء کو قرآن کریم نے متفرق اور متعدد مواقع میں بسط و تفصیل سے بیان کیا ۔ کسی موقعہ سے یہ واضح ہوا کہ حق تعالیٰ کے ساتھ مناجات و ہمکلامی کب اور کس طرح ہوئی ۔ اس وادی میں موسیٰ علیہ السلام کیا تلاش کرنے گئے تھے اور خدا کی طرف سے کیا کیا نعمتیں ملیں اور کس طرح شرف ہمکلامی سے موسیٰ کلیم اللہ کے مقام عالی پر پہنچے ۔ فرعون کے پاس کب گئے اور اس سے کس طرح خطاب کیا ۔ فرعون نے دعوت ایمان پر کیا جواب دیا اور موسیٰ علیہ السلام نے کیا کیا دلیلیں پیش کیں اور کس قسم کی

مناظرانہ گفتگو باہم ہوئی ۔ اور پھر موسیٰ علیہ السلام نے کس شان و شوکت اور عظمت کے ساتھ اللہ رب العزت کی نشانی اور معجزہ ظاہر فرمایا۔ اس معجزہ کو دیکھ کر فرعون اور اس کے عمائد سلطنت نے کیا خیال قائم کیا۔ معجزۂ خداوندی کے مقابلہ کی کس طرح تیاری کی گئی اور جادوگروں کی جو جماعت معجزۂ خداوندی کا مقابلہ اور کفر کی حمایت کے لیے آئی تھی اس معجزہ کو دیکھ کر ان کا دم کے دم کس طرح رنگ بدل گیا۔ اور ان کے دل نور ایمان سے کس طرح جگمگا گئے اور ایک مضبوط پہاڑ کی طرح ایمان پر اس طرح قائم ہوئے ۔ فرعون کی تمام دھمکیوں اور ہاتھ پاؤں قطع کر کے تختۂ دار پر لٹکا دینے کی دل ہلا دینے والی دھمکیوں کو خاطر نہ لاتے ہوئے جواب دے دیا فاقض ما انت قاض کہ اے تجھے کچھ کرنا ہے کرلے ۔ اور تو کر بھی کیا سکتا ہے سوائے اس کے کہ یہ چند روزہ زندگی تو قطع کر ڈالے ۔ الغرض یہ متعدد اجزاء واقعہ قرآن کریم کے مختلف حصوں میں موتیوں کی طرح بکھیر دیئے گئے ۔ بالخصوص سورۂ اعراف ۔ یونس ۔ ہود ۔ طہٰ ۔ مؤمنون ۔ الشعراء ۔ النمل ۔ القصص ۔ حٰم المؤمن اور سورۂ دخان میں اس وضاحت و تفصیل سے بیان کیے گئے کہ بعض جگہ مسلسل کئی کئی رکوع اسی بیان میں چلتے رہے اور حال یہ کہ ان ہی تمام اجزاء پر سورۂ والنازعات کے یہ چند کلمات مشتمل ہیں

قسم ثانی تفسیر القرآن بالسنۃ

تفسیر قرآن کی دوسری قسم التفسیر بالسنۃ ہے کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے مضامین قرآن کی تفسیر و تشریح کی جائے ۔ کیونکہ کلام اللہ کے اصل شارح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کامل و مکمل تفسیر سنت رسولؐ ہی ہے ۔ آپؐ کی تمام تر سیرت مبارکہ قرآن کریم کی عملی تشریح ہے اور یہ بات خود قرآن ہی نے متعین کر دی اور بار بار نہایت واضح لفظوں میں یہ فرمایا گیا کہ قرآن کا سمجھنا اور اس کی اتباع و پیروی آپ کی حیات مبارکہ کی اتباع و پیروی

میں مضمر ہے۔ ارشاد ہے:

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ۔ (سورۃ النحل)

اور نازل کیا ہے ہم نے آپ کی طرف ذکر (قرآن) کو تاکہ آپ واضح کریں لوگوں کے سامنے وہ چیز جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (سورۃ الجمعۃ)

وہ حق تعالیٰ ہی ہے جس نے اُمیّوں میں ایک رسول انہی میں سے بھیجا تاکہ وہ ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرے اور ان کا تزکیہ و تطہیر کرے اور ان کو کتاب و حکمت یعنی احکام فقہیہ و اسرار شریعت اور دانش کی باتیں سکھائے۔ اگرچہ وہ لوگ اس رسول کی بعثت سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

عروۃ بن الزبیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منجملہ چند سوالات کے ایک یہ بھی سوال کیا کہ آپؐ کی عادت مبارکہ اور عملی زندگی کیسی تھی؟ جواب میں یہ کلمہ فرمایا، کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ کہ آپ کی عادات اور حیات مبارکہ عین قرآن تھی۔ یعنی قرآن کریم ایک علمی کتاب ہدایت ہے اور جن علوم اور فضائل و کمالات کو قرآن کریم کی آیات میں ہم سنتے اور پڑھتے ہیں ان تمام فضائل اور محاسن و کمالات اور علمی و اخلاقی اور معاشرتی خوبیوں کے آپؐ عملی پیکر و نمونہ تھے۔ مثلاً ہم قرآن کریم میں جب یہ آیات تلاوت کرتے ہیں

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش

---

[1] صحیح مسلم۔

وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ الخ	اور رات و دن کے اختلاف میں بڑی نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور اس حال میں وہ اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوں ۔ الخ

تو اگر ہم چاہیں کہ یہ احوال اور فضائل عملی رنگ میں دیکھیں تو یہ سب کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نظر آئے گا ۔

شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے الاتقان میں امام شافعیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے

کل ما حکم به رسول الله صلی الله علیه وسلم فهو مما فهم من القرآن- قال تعالیٰ ، اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ، وَقَالَ تَعَالیٰ ، وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ	جو فیصلہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بس وہ وہی ہے جو آپ نے قرآن سے سمجھا ۔ حق تعالیٰ کا فرمان ہے "بے شک ہم نے حق کے ساتھ کتاب آپ کی طرف اتاری ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ فرمائیں جو اللہ آپ کو سمجھائے" اور خداوند عالم کا ارشاد ہے" اور نہیں نازل کی ہم نے آپ پر یہ کتاب مگر صرف اسی غرض

ـلـه یہ سورۃ آل عمران کا آخری رکوع ہے ۔ اس رکوع کو مترجم قرآن کریم میں ملاحظہ فرماتے ہوئے یہ بات ذہن میں آسکتی ہے کہ جن جن اعمال عبادات اخلاق ۔ زہد و ورع اور تقویٰ اور صبر و استقامت کے اوصاف کو بیان کیا گیا ۔ وہ سب کچھ عملی شکل میں رسول خدا کی ذات اقدس میں موجود تھے گویا ایک طرف قاری قرآن ان فضائل و اوصاف کو آیات قرآنیہ میں تلاوت کر رہا ہے تو دوسری طرف عملی پیکر میں ان تمام خوبیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں مشاہدہ کر رہا ہے علیٰ ہٰذا القیاس پورے قرآن کا عملی پیکر رسول اللہ صلعم ہیں ۔

وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔	کے لیے کہ آپ واضح طور پر بیان کر دیں لوگوں کے سامنے وہ چیز جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور یہ قرآن ہدایت و رحمت ہے ایمان والوں کے لیے ۔

بہرحال تفسیر قرآن میں سب سے اعلیٰ درجہ قرآن کریم کی تفسیر کا تفسیر بالقرآن ہے اور پھر سب سے زیادہ کامل درجہ تفسیر بالسنۃ کا ہے ۔

قسم ثالث تفسیر بآثار الصحابہ رضی اللہ عنہم

تفسیر بالسنۃ کے بعد درجہ تفسیر القرآن بآثار الصحابہ کا ہے کہ اگر کسی آیت کی شرح و تفسیر کسی حدیث مرفوع یا عمل رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ملتی تو پھر آثار صحابہ کی طرف رجوع کیا جائے گا کیونکہ یہی حضرات قرآن کریم کے سب سے پہلے مخاطب ہیں ۔ وحی الٰہی ان کے سامنے اترتی تھی ۔ یہی حضرات اس کو زبانِ نبوت سے سنتے تھے اور تشریح و تفصیل براہِ راست پیغمبر خدا سے معلوم کرتے تھے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت اور انوار و برکات نبوت سے ان کے قلوب منور تھے لہٰذا امت میں یہی حضرات سب سے بہتر قرآن اور دین کے سیکھنے اور تمام امت کو سکھانے والے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ان سے بہتر قرآن کا سمجھنے اور سمجھانے والا کون ہو سکتا ہے ۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس "مقدس" گروہ کے اوصاف و فضائل اس بلند پایہ عنوان کے ساتھ ذکر فرمائے :

اُولٰئِكَ اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانُوْا اَفْضَلَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَاَبَرَّهَا قُلُوْبًا وَّ اَعْمَقَهَا عِلْمًا وَّاَقَلَّهَا تَكَلُّفًا	یہ حضرات تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء اور ساتھی ہیں جو اس امت کے افضل ترین افراد تھے ۔ اور سب سے زیادہ پاکیزہ دل تھے اور امت میں سب سے

toobaa-elibrary

اِختَارَهُمُ اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهٖ وَلِاِقَامَةِ دِيْنِهٖ فَاعْرِفُوا لَهُمْ فَضْلَهُمْ وَاتَّبِعُوْا عَلٰى اَثَرِهِمْ وَتَمَسَّكُوْا بِمَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ اَخْلَاقِهِمْ وَسِيَرِهِمْ فَاِنَّهُمْ كَانُوْا عَلَى الْهُدٰى الْمُسْتَقِيْمِ

زائد گہرا علم رکھنے والے تھے اور کم سے کم تکلّف والے (بلکہ تکلّف اور تصنع کا تو نام و نشان بھی نہ تھا) جن کو اللہ نے منتخب کیا تھا اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت کے لیے اور اپنا دین قائم کرنے کے لیے۔ اس لیے اے لوگو تم ان کی فضیلت و برتری کو پہچانو اور ان کے نقش قدم پر چلو اور جہاں تک ہو سکے ان کے اخلاق اور طور و طریق کی پیروی کرو کیونکہ وہ حضرات یقیناً ہدایت اور سیدھے راستہ پر تھے۔

تو معلوم ہوا کہ حضرات صحابہؓ کی تفسیر کے مقابلہ میں کسی اور کی تفسیر و تشریح قابل اعتبار بلکہ قابل اعتناء و توجہ بھی نہ سمجھی جائے گی۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ان کلمات سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ علمی کمالات میں یہ امور دراصل معیار ہیں۔ علم کا عمق اور اس کا رسوخ۔ قلب کی طہارت و پاکیزگی۔ تکلّف و تصنع سے اجتناب و پرہیز (نہ یہ کہ انسان کو اپنے علمی کمال پر ناز یا غرور ہو اور دوسروں کو اپنے سے کمتر اور حقیر تصور کرتا ہو) اعتقاد حق پر قائم ہونا اقامت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے ہمہ وقت مستعد اور تیار رہنا۔

یہ وہ اوصاف ہیں جو علم کے صحیح ہونے اور اہل علم کے نزدیک کسی عالم کے مستند ہونے کے واسطے معیار اور بنیاد ہیں۔ تو جن کی زندگی ان اوصاف کا مظہر ہو ان کو حق ہوگا وہ کتاب اللہ کی تفسیر کا قصد کریں۔ محض لغت اور زبان سے واقفیت یا تاریخ میں مہارت پر بھروسہ کرتے ہوئے کسی کا یہ سمجھ لینا کہ وہ تفسیر قرآن کا اہل ہے اس کی غلطی ہے۔

درسگاہِ نبوت سے فیض پانے والے حضرات صحابہؓ کی پیروی اور ان کے نقشِ قدم پر چلنا اور اسی کوشش میں لگ جانا علوم الٰہیہ کے حصول کا ذریعہ ہے ورنہ تو پھر قرآن فلسفہ و سائنس کی کوئی کتاب یا صرف ایک تاریخی مجموعہ بن کر رہ جائے گی۔

قسم رابع التفسير باصول اللغة والقواعد العربيّة

چوتھا درجہ تفسیر قرآن کا یہ ہے کہ کسی مضمون کی توضیح و تشریح یا لطائف و معارف کا بیان لغت اور قواعد عربیہ کی رو سے ہو۔ اس سے مراد کلام اللہ کے وہ اسرار اور لطائف ہیں جو از روئے لغت سمجھ میں آئیں اور فصاحت و بلاغت کے وہ نکات جن سے قرآن کریم کا اعجاز نمایاں اور معلوم ہو جائے۔ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال صحابہ سے قرآن کریم کا اصل مفہوم اور مدلول اور احکام شریعہ کا علم ہوتا ہے اور تفسیر کے اس درجہ سے قرآنی فصاحت و بلاغت کے اسباب اور وجوہ ظاہر ہوتے ہیں جن کی تفصیل قرآن کریم کے وجوہ اعجاز میں بیان کی جائے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قسم خامس تفسير المتشابهات

تفسیر کے بیان کردہ چار وجوہ کے علاوہ تفسیر کی یہ پانچویں صورت ہے جو متشابہات قرآنیہ کی تفسیر سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ ان بیان کردہ صورتوں میں سے کسی ذریعے سے بھی ثابت اور متعین نہیں ہوتی بلکہ وہ اہل علم حضرات مفسرین اور عارفین کے بیان کردہ اسرار و لطائف ہیں جو ان پر وجدانی اور روحانی طور پر منکشف ہوں۔ یا متشابہات کے بارے میں باطنی معرفت کی بناء پر ان کا کوئی قول ہو مثلاً مقطعات قرآنیہ (یعنی وہ حروف ہجائیہ جو سورتوں کی ابتداء میں ہیں) کے بارہ میں حضرات عارفین کے اقوال۔ تو یہ اقوال چونکہ کسی مرفوع حدیث

یا تفسیر قطعی اور یقینی دلیل سے ثابت نہیں ہوتے اس وجہ سے ان کو حجت و قطعی کے درجہ میں شمار نہیں کیا جاتا، کیونکہ خود قرآن کریم نے متشابہات کے بارہ میں غور و خوض سے منع کر دیا۔ اور علماء راسخین کی یہی نشانی بیان کی:

وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِہٖ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا (آل عمران)

اور جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم اس پہ ایمان لائے۔ ہر چیز ہمارے رب کی طرف سے ہے۔

اور ایسے متشابہات کی تحقیق و تفتیش کو پسند نہیں فرمایا گیا جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا۔ بہرکیف مقطعات قرآنیہ کے تحت عارفین کے بیان کردہ اسرار ہوں یا دیگر صفات خداوندی اور آیاتِ قرآنیہ سے استنباط کیے ہوئے لطائف و معارف مفسرین کے نزدیک ظنی امور میں سے ہیں۔ اسی طرح آیت وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ میں روح کی تفسیر اور اس کا حقیقی مفہوم و مدلول کسی دلیل سے متعین نہیں۔

شیخ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ علوم قرآن کی تین قسمیں ہیں۔ ایک تو کتاب اللہ کے وہ اسرار جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو مطلع نہیں کیا۔ اور صرف اپنے ہی علم کے ساتھ مخصوص رکھا۔ مثلاً حق تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے غیب کی حقیقتیں، تو ایسے اُمور پر غور و فکر اور بحث و تحیص کسی کے لیے بھی درست نہیں جیسے کہ ارشاد فرمایا گیا لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ کہ انسان کی نگاہیں اور افکار اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ قسم ثانی کتاب اللہ کے وہ اسرار جن پر حق تعالیٰ نے صرف اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع فرمایا، تو ایسے اسرار و رموز پہ کلام صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما سکتے ہیں یا وہ جس کو اللہ تعالیٰ اجازت دے دے جیسے مقطعات قرآنیہ کے اسرار اور رموز کہ الٓمٓ سے کیا مراد ہے اور الٓمٓ کے کیا معنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلف اور جمہور مفسرین ان کلمات پر یہی کہہ دیتے ہیں اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِہٖ بِذٰلِکَ کہ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ ان کلمات سے اس کی کیا مراد ہے۔

قسم ثالث وہ تمام علوم جو اللہ رب العزت نے اپنے پیغمبر کو عالم کی ہدایت اور فلاح و کامیابی کے لیے سکھائے۔ ان علوم میں بعض تو نقل اور روایت پر موقوف ہیں، جیسے اسباب نزول اور ناسخ و منسوخ کی معرفت، حشر و نشر اور جزا و سزا جنت و جہنم اور تمام اعتقادی اور تعبدی احکام یہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جس طرح ثابت اور منقول ہیں ان پر اسی طرح یقین کرنا لازم ہے اور بعض امور وہ ہیں جو روایت اور نقل پر مبنی نہیں ہیں بلکہ دلائل عقلیہ اور نظر و فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً حق تعالیٰ کی خالقیت اور توحید و ربوبیت پر قائم کیے جانے والے دلائل اور شواہد۔ یا ایسے ہی تمام لطائف و اسرار جن سے اس قسم کے موضوع کی تائید و تثبیت ہوتی ہو تو یہ امور روایت اور نقل پر موقوف نہیں۔ اسی پر حق تعالیٰ نے اہل علم کو نظر و فکر کی دعوت دی اور ایسے انداز سے خود قرآن کریم نے دلائل قدرت پیش کیے کہ ان پر بہت سے اور دلائل و شواہد کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

اسی وجہ سے بار بار قرآن کریم نے دلائل قدرت کا مختلف عنوانات اور تعبیرات میں ذکر کیا ہے تا کہ ان کے ذریعے معرفت خداوندی حاصل ہو۔

تو تفسیر کا یہ شعبہ اہل نظر و فکر کے ایسے لطیف اور موثر دلائل اور استنباطات پر مشتمل ہیں جو اس مقصد کی تکمیل کرتے ہوں۔ یہی وہ عجائب اور اسرار ہیں جن کے متعلق حدیث کے یہ کلمات وارد ہوئے، ھُوَ الَّذِیْ لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ یعنی قرآن ایسا کلام ہے جس کے عجائب و لطائف اور اسرار قیامت تک نہیں ختم ہوں گے۔

شانِ نزول

اصطلاح مفسرین میں شان نزول یا اسباب نزول آیات قرآنیہ سے تعلق رکھنے والے ان واقعات کو کہا جاتا ہے جو نزول آیات کا سبب بنے۔ اصل تو یہی ہے کہ جملہ آیات قرآنیہ اور احکام خداوندی کے نزول کا حقیقی سبب بندوں کی حاجت و ضرورت ہے اور اسی مقصد کے لیے قرآن کریم نازل کیا گیا تاکہ نوع انسانی قیامت تک پیش آنے والی اپنی تمام ضرورتیں جو فلاح دارین سے تعلق رکھتی ہوں قرآن کریم کے ذریعہ پوری کرتی رہے۔ مگر بسا اوقات آیات کا نزول کسی خاص پیش آجانے والے واقعہ پر ہوتا ہے تو مفسرین ان واقعات کو شانِ نزول اور اسباب نزول کہتے ہیں، اور کتب تفسیر میں ان واقعات کو شان نزول کے طور پر ذکر کرتے ہیں۔

مثلاً ایک عورت[۱] نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے شوہر کی ناراضگی بیان کی اور اس کے ظلم وستم کی شکایت کی اور یہ کہ اس نے ظہار کر لیا ہے۔ یہ کہہ کر اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّیْ (کہ تو مجھ پر میری ماں کی طرح سے حرام ہے) اور اس وقت تک عرب کے سابق دستور کے لحاظ سے ظہار کو طلاق شمار کیا جاتا تھا تو یہ عورت بار بار اپنی مصیبت کی داستان دہرا رہی تھی اور آنحضرتؐ اس بنا پر کہ ابھی ظہار کا وہ حکم نازل نہیں ہوا تھا جو اس سلسلہ میں مذکور ہے، غور فرماتے رہے یہاں تک کہ یہ عورت ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگی کہ اے اللہ میری مشکل کشائی کے لیے کوئی حکم نازل فرما دیجیے یہاں تک کہ

---

[۱] یہ صحابیہ خولہ بنت ثعلبہ ہیں۔ واقعہ کی تفصیل کے لیے تفسیر ابن کثیر ج ۴ کی مراجعت فرمائیں۔ ۱۲

آپ پر وحی کے آثار ظاہر ہوئے اور سورۃ مجادلہ کی یہ ابتدائی چار آیات نازل کی ہوئیں۔[1]

یا مثلاً بدر کے قیدیوں کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرات صحابہؓ سے رائے لینا کہ ان کو قتل کر دیا جائے یا فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے؟ اس مسئلہ میں صحابہؓ کی رائے مختلف ہوئی۔ ایک جماعت کا خیال تھا کہ یہ لوگ کفر کے پیشوا اور سرغنہ ہیں، اسلام اور رسولِ خدا کی عداوت میں انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور جو بھی مظالم و جرائم ممکن تھے وہ انہوں نے کر لیئے اس لیے کفر کی طاقت کو پاش پاش کرنے کا یہی طریقہ ہے ان کو قتل کر دیا جائے۔ دوسری جماعت کا خیال تھا، بہرکیف یہ لوگ قریش کے مسلمانوں ہی کے اہل قبیلہ و خاندان ہیں۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ احسان و مروت کا طریقہ اختیار کرنے سے خود ان کو ہدایت حاصل ہو جائے اور اس طرح سے اسلام کو فائدہ پہنچے تو انہوں نے فدیہ کی رائے دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طبعی نرمی اور رحمت و مہربانی کے جذبات کے باعث فدیہ لے کر رہا کر دینے کی صورت کو پسند فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ (الانفال)	نہیں ہے یہ بات مناسب پیغمبر کے واسطے کہ اس کے پاس قیدی ہوں یہاں تک کہ زمین میں خوب اچھی طرح خون نہ بہا دے (کافروں کا) اے لوگو! (کیا) تم دنیا کا سامان چاہتے ہو (کہ فدیہ کی صورت کو پسند کیا) حالانکہ اللہ تعالیٰ آخرت چاہتا ہے۔

---

[1] جن میں ظہار کرنے کے بعد رجوع کا حکم اور اس کے کفارہ کی تفصیلات ذکر فرمائی گئیں۔ تفصیل سورۃ مجادلہ کی ان آیات کا کتب تفسیر میں ملاحظہ فرمایا جائے۔

[2]

الغرض اس طرح جو واقعات احادیث کے ذریعے اسباب نزول کے طور پر معلوم ہوئے ان کو مفسرین شانِ نزول کے عنوان سے بیان کر دیتے ہیں بعض مفسرین مثلاً محمد بن اسحٰق کلبی نے ہر آیت کے لیے شانِ نزول بیان کرنے کا التزام کیا جو محققین کے نزدیک ایک تکلف ہے۔ چونکہ آیات قرآنیہ کا مقصود صرف بیان احکام اور امور ہدایت اور سعادت و شقاوت کے اصول متعین کرنا ہوتا ہے اس وجہ سے اکثر مفسرین نے اس طرح کے التزام کو محض غلو اور تکلف سمجھا ہے البتہ جن مقامات پر آیات کی تفسیر اور مضمون کی توضیح و تشریح بیان واقعہ پر موقوف ہو وہاں نزول آیات سے تعلق رکھنے والے واقعات کو ذکر کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً: وَ اِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰهُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّهَا لَکُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَةِ تَکُوْنُ لَکُمْ [1] اور اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْکُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَ اللّٰهُ وَلِیُّهُمَا وَ عَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ وَلَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ اَلَنْ یَّکْفِیَکُمْ الخ [2]

یا وہ آیات جن کا اصل مدلول و مفہوم ہی بیان واقعہ ہے جیسے امم سابقہ کے قصص و احوال سے تعلق رکھنے والی آیات مثلاً اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ [3] تو ایسی آیات کی تفسیر میں محققین مفسرین نے واقعات کے بیان سے التزام کیا ہے کیونکہ بغیر اس واقعہ کے ذکر کیے ہوئے مضمون آیت کی توضیح ہی نہیں ہو سکے گی۔

لیکن اس کے باوجود جمہور مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ آیت کا تعلق واقعہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتا بلکہ الفاظ کا عموم معتبر ہوتا ہے اور اس لحاظ سے ہر ایسی

---

[1] تفصیل واقعہ کے لیے آیات متعلقہ کی تفسیر کتب تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔
[2] ان آیات کے مضمون کے لیے سورۂ انفال اور سورۂ آل عمران کی مراجعت فرمائیں۔
[3] سورۂ آل عمران۔ [4] تشریح کے لیے سورۂ والفجر کی ان آیات کا کتب تفسیر میں ملاحظہ فرمایا جائے۔

آیت جو خواہ کسی بھی شخص یا واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہو اس کو ایک قانونِ عام سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً آیاتِ لعان[1] ایک خاص شخص کے واقعہ میں نازل ہوئیں لیکن ان کا حکم قیامت تک کے لیے عام ہے۔ اسی طرح مسافر کے لیے قصرِ صلوٰۃ کا حکم جو آیۃ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ سے مشروع و مقرر ہوا تھا جب کہ حضرات صحابہؓ دوران سفر خائف ہوتے تھے اور دشمن کی طرف سے اندیشہ رہتا تھا۔ لیکن آیت کا مضمون نہ تو ان حضرات کے ساتھ مخصوص رہا اور نہ ہی اس قید اور خصوصیت کے ساتھ مخصوص رہا جس کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآن کریم نے یہ حکم نازل کیا تھا، چنانچہ حدیث میں ہے کہ عمر فاروقؓ نے ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ ہم لوگ اب تو پوری طرح مامون و مطمئن ہو چکے ہیں۔ اور خوف و اندیشہ کا نام و نشان بھی نہیں (تو کیا اب بھی نماز کا قصر کریں۔) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، هٰذہ صدقۃ تصدق اللہ بہ علیٰ عبادہ فاقبلوا صدقتہ کہ یہ تو ایک صدقہ ہے جو اللہ نے اپنے بندوں پر فرمایا ہے لہٰذا تم کو چاہیے کہ تم اس کے صدقہ اور انعام کو قبول کرو۔ تو آپؐ نے واضح فرما دیا کہ "اِنْ خِفْتُمْ" کی قید محض اتفاقی تھی۔ جو اس وقت کی صورت حال کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآن نے ذکر کر دی تھی لیکن حکم اس قید کے ساتھ مخصوص و مقید نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے۔

علیٰ ہذا القیاس صلوٰۃ الخوف کی مشروعیت ایک خاص غزوہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں ہوئی اور نزولِ حکم بھی اسی عنوان سے ہوا، وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ[2] لیکن اس کا حکم ہمیشہ کے لیے ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم موجودگی صلوٰۃ الخوف قائم کرنے کے لیے شرط نہیں ہے

صحابہؓ و تابعین کے دور میں شانِ نزول کے مفہوم میں بہت توسع ملحوظ

---

[1] سورۂ نور کی یہ چار آیتیں وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ مراد ہیں۔ کتب تفسیر میں مضمون کی تشریح ملاحظہ فرمائیں۔ [2] آیات کی تفسیر سورۃ النساء میں ملاحظہ فرمائیں

رکھا جاتا تھا اور جو واقعہ حقیقت میں شان نزول ہے اسی کو اس عنوان سے تعبیر کرنا ضروری نہ سمجھتے تھے بلکہ ہر اس واقعہ یا احوال و اُمور کو اس عنوان سے بیان کر دیتے تھے جن پر الفاظ آیت دلالت کرتے ہیں اور اس پر منطبق ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر وہ امور نزولِ آیت کے بعد بھی پیش آتے ہوں تو بھی کہہ دیتے ہیں کہ نزلت فی کذا کہ یہ آیت اس بارے میں نازل ہوئی ہے۔

یا کسی جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بات کی توضیح و تفہیم اور تشریح کے لیے یا کسی حکم کے استنباط کے واسطے کوئی آیت تلاوت فرمائی تو یہ حضرات اسی واقعہ کو آیت کا شانِ نزول کہہ دیتے ہیں۔ یا کسی آیت کو آپ نے استدلال کے لیے کسی موقعہ پر تلاوت فرمایا تو اسی کو کہہ دیا کہ نزلت فی کذا۔ محققین مفسرین اپنی تفاسیر میں اس بات کو ملحوظ رکھتے ہیں کہ کن مواقع میں شان نزول حقیقی اور واقعی اعتبار سے کہا جا رہا ہے اور کن مواقع میں توسع کے طور پر یہ عنوان اختیار کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے بعض آیات کے شان نزول کے متعلق حضرات صحابہؓ اور تابعین سے متعدد اور مختلف اقوال اور متعدد واقعات منقول ہوئے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں بعض آیات کی توضیح و تفہیم میں کچھ ایسے کلمات مذکور ہوتے ہیں جن کی سطح سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی مخصوص واقعہ کی طرف اشارہ ہے اور بظاہر بیان واقعہ ہی مقصود ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ وہاں ایک امر کلی اور ضابطہ عام کا بیان ہوتا ہے تو اس سطحی امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض مفسرین اس جگہ واقعہ متعلقہ کی تحقیق و بیان کے درپے ہو جاتے ہیں حالانکہ اس جگہ الفاظ کلام اللہ کی غرض کسی جزئی اور مخصوص واقعہ کی خبر دینا نہیں ہے بلکہ ایک عام مقصد اور امر کلی ہوتا ہے، زوائد تکلف میں پڑ جانے کی وجہ سے بسا اوقات کلام اللہ کا حقیقی مقصد فوت ہو جانا لازم آجاتا ہے۔

مثلاً ایک ... قرآن کریم نے انسان کی نیکی اور بدی کی حالتوں اور ان کے

مرتب ہونے والے اچھے اور برے ثمرات ونتائج کا بیان فرمایا، ارشاد ہے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا	اور ہم نے حکم دے دیا انسان کو اس کے والدین کے ساتھ اچھا سلوک اور احسان کرنے کا، اٹھایا ہے اس کی ماں نے اس کو حالتِ حمل میں سختی اور مشقت کے ساتھ اور جنا بھی ہے اس کو مشقت وسختی ہی کی
(الاحقاف)	حالت میں۔

اسی طرح آیت وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ[1] اور آیۃ (۲) كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ اور آیۃ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ (۳) اور آیۃ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (۴) اور آیۃ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشَّاهَا (۵) الخ

تو ان سب آیات کا مقصد محض واقعات مخصوصہ کو بیان کرنا نہیں ہے بلکہ ایک عمومی اور کلی مقصود ہے جس پر الفاظ آیات دائر ہیں۔ بعض مفسرین نے ان آیات کے تحت کچھ واقعات ذکر کیے، جو سند صحیح سے ثابت نہیں ہیں بلکہ آیت جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ کے تحت تو بعض مفسرین نے ایک ایسا قصہ حضرت آدمؑ وحواؑ کی اولاد کے بارے میں نقل کردیا اور اس میں حضرت آدم وحوا سے ایک مشرکانہ فعل کے صدور کا بھی ذکر ہے جو شریعت کے اصول موضوعہ اور

---

[1] سورۃ النحل (۲) سورۃ البقرہ (۳) سورۃ نون والقلم۔ (۴) سورۃ النحل۔ (۵) سورۃ اعراف۔ حضرات قارئین ان مواقع پر کتب تفسیر میں آیات مذکورہ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

اور مقاصد کے قطعاً خلاف اور انبیاء علیہم السلام کی شان عصمت سے منافی ہے۔

علماء مفسرین نے جس طرح قرآن کریم کے تمام متعلقہ موضوعات پر مستقل کتابیں تالیف کیں شان نزول پر بھی ائمہ نے کتابیں لکھی ہیں۔ سب سے پہلے شیخ علی بن المدینی متوفی ۲۳۴ھ نے ایک کتاب تالیف فرمائی۔ پھر شیخ عبدالرحمٰن بن محمد م ۳۲۷ھ اور شیخ ابوالحسن علی بن احمد م ۴۶۸ھ اور شیخ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی بن الجوزی البغدادی وحافظ شہاب الدین ابن حجر عسقلانی ۸۵۲ھ اور شیخ جلال الدین سیوطیؒ ودیگر ائمہ کی تصانیف ہیں۔

لہ البیان فی علوم القرآن بحوالہ کشف الظنون ومفتاح السعادہ۔

صحت تفسیر کے اصول اور تفسیر بالرائے

حق تعالیٰ شانہ کے اس فرمان مبارک "وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ" سے یہ بات تو واضح طور پر معلوم ہو چکی کہ کلام اللہ کے اصل شارح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ کا اسوۂ مبارکہ ہی قرآن کریم کی کامل تفسیر ہے۔ آپؐ کے اسوۂ مبارکہ ہی سے قرآنی مضامین اور مقاصد کی تعیین ہوتی ہے اور حقائق و معارف اور اسرار و لطائف وہی ہیں جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کی روشنی میں معلوم کیے جائیں۔

تفسیرِ کلام اللہ ایسی چیز نہیں کہ مختلف الخیال لوگوں کے ذوق ان کے خیالات و افکار اور معتقدات کے حوالہ کر دی جائے کہ ہر شخص اپنے خیالات و اعتقادات کے مطابق قرآن کو ڈھالنے لگے۔ بالفرض اگر ایسا ہوتا تو قیامت تک قرآن کریم کا کوئی مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکتا تھا تو افکار و اذہان کے باہمی تصادم اور اس طرح کی کشاکشی سے محفوظ رکھنے کے لیے حق تعالیٰ نے خود ہی اپنی طرف سے اپنے کلام کا شارح و مفسر مقرر فرما دیا کہ جو لفظ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلے گا وہی تفسیرِ قرآن ہوگا۔ اس کے خلاف ایک حرف بھی کتاب اللہ کی تفسیر میں برداشت نہیں کیا جائے گا۔

اپنے قلبی رجحانات اور خواہشات کے مطابق قرآن کے معانی اور مطالب تجویز کرنے والوں کے حق میں یہ آسمانی فیصلہ نازل کر دیا گیا:

اَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ	کیا دیکھا اے مخاطب تو نے اس انسان کو
ھَوَاہُ وَاَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی	جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے

عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۔

اور گمراہ کر دیا ہے (اس کی بدبختی کی بدولت) اس کو خدا نے باوجود اس کے علم کے اور مہر لگا دی ہے اس کے کان پر اور اس کے قلب پر اور ڈال دیا ہے اس کی نگاہ پر پردا۔

ائمہ مفسرین نے صحت تفسیر کے واسطے جن امور کو لازم قرار دیا ہے ان کا انحصار اصول ذیل میں ہے :

(۱) ہر آیت کی تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرات صحابہ کی تفسیر کے مطابق ہو۔ یا وہ کسی حدیث مرفوع یا اقوال صحابہ سے ماخوذ اور مستنبط ہو۔

(۲) سیاق وسباق کے مطابق ہو، یعنی کلام اللہ کی ان آیات سے مربوط ہو جو اس آیت سے پہلے اور اس آیت کے بعد ہیں۔

(۳) قواعد عربیہ اور اہل لسان کے استعمال کے موافق ہو۔

(۴) اصول شریعت اور دین کے ان تمام قواعد وضوابط کے مطابق ہو جو دین کے اصول موضوعہ اور بنیادی امور کے درجہ میں طے اور ثابت ہیں اور ان پر اعتقاد وایمان لازم ہے مثلاً آخرت جنت وجہنم اور جزا وسزا۔

(۵) مقاصد قرآن کے ماتحت ہوں۔

غرض صحت تفسیر کے یہ پانچ بنیادی اور معیاری اصول ہیں۔ اگر کسی آیت کی کوئی شرح وتفسیر ان اصول موضوعہ میں سے کسی کے بھی خلاف ہوگی تو اس کا اعتبار نہ کیا جائے گا :

(۱) لہٰذا کسی آیت کی ایسی کوئی تفسیر معتبر نہ ہوگی جو حدیث مرفوع اور حضرات صحابہ کی اس تفسیر کے خلاف ہو جو ان سے منقول اور ثابت ہے مثلاً آیت اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ " (بقرہ ۶۲) کی تفسیر میں

یہ کہہ دیا جائے کہ یہ آیت اس بات کو ظاہر کر رہی ہے کہ اہل ایمان اور مسلمانوں کے علاوہ یہودی نصرانی اور صابی[1] شخص بھی نجات کا مستحق ہے۔ جب کہ وہ اعتقاد صحیح اور آخرت پر یقین رکھتے ہوئے عمل صالح رکھتا ہو اور اس طرح سے نجات اسلام کے علاوہ دوسرے آسمانی مذہب رکھنے والوں مثلاً یہودیوں اور نصرانیوں کے لیے بھی ممکن ہے اور اہل کتاب کو بھی اس صورتحال کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہدایت پر ہیں۔ اور نجات و ہدایت صرف اسلام میں منحصر نہیں " تو اس قسم کی تفسیر کھلی تحریف اور دین اسلام کے بنیادی اصول کا صریح انکار ہے کیونکہ ایمان باللہ کا مفہوم ہی اصول شریعت سے طے ہوچکا کہ وہ حق تعالیٰ کی الوہیت و وحدانیت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانا ہے اور مَنْ آمَنَ بِاللّٰہ کی تفسیر احادیث مرفوعہ سے اسی طرح ثابت ہے اور نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بات فرما دی گئی ہے کہ کسی یہودی یا نصرانی اور کتابی مذہب رکھنے والے کی نجات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ آپ پر ایمان لائے اور اگر یہ تصور کرے کہ وہ اپنے مذہب اور دین سماوی پر رہتے ہوئے بھی نجات پائے گا تو یہ ایک لغو اور باطل تصور ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَا یَسْمَعُ بِیْ اَحَدٌ مِّنْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ یَھُوْدِیٌّ وَّلَا نَصْرَانِیٌّ ثُمَّ یَمُوْتُ وَلَمْ یُؤْمِنْ بِالَّذِیْ اُرْسِلْتُ اِلَّا کَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ[2]	قسم ہے کہ اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کبھی نہیں ہوسکتا کہ کوئی یہودی یا نصرانی اس امت کا میری بعثت و نبوت کے متعلق سنے اور پھر وہ مرجائے اس حال میں کہ ایمان نہ لائے اس دین پر جو دین دے کر مجھے مبعوث کیا گیا تو سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوگا کہ وہ جہنمیوں میں سے ہو۔

[1] صابی ستارہ کی پرستش کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔ [2] صحیح مسلم ج ۱ بروایت ابی ہریرۃؓ۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر نے بروایت سدی نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت سلمان فارسیؓ کے اصحابؓ کے بارے میں نازل ہوئی کہ وہ ایک دفعہ اپنے اصحابؓ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہنے لگے کہ وہ لوگ نمازیں پڑھتے تھے اور روزہ رکھتے تھے اور یارسول اللہ وہ آپ پر بھی اس بات کا ایمان و اعتقاد رکھتے تھے کہ آپؐ عنقریب مبعوث ہونے والے ہیں۔ سلمانؓ جب ان کی تعریف و توصیف سے فارغ ہوئے تو آپؐ نے فرمایا اے سلمانؓ وہ تو اہل جہنم میں سے ہیں۔ سلمانؓ یہ سُن کر گھبرا گئے جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اس آیت میں یہ بتایا کہ یہود کا ایمان یہ ہے کہ وہ تورات پر عمل کریں اور حضرت موسیٰؑ کی پیروی کریں یہاں تک کہ جب عیسیٰ علیہ السلام آجائیں تو اب ان کا تورات پر عمل کرنا اور حضرت موسیٰؑ کی پیروی یہ ہوگی کہ وہ عیسیٰؑ پر ایمان لائیں۔

علیٰ ہذا القیاس نصاریٰ کا ایمان یہ ہے کہ وہ انجیل پر عمل اور عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کریں یہاں تک کہ جب نبی آخر الزمان محمد رسول اللہ مبعوث ہوں تو ان پر ایمان لائیں اور جو شخص بھی نصاریٰ میں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے گا وہ انجیل اور عیسیٰ کا متبع نہ ہوگا اور ہلاک و تباہ ہوگا۔

بہرحال یہ آیت جن یہود و نصاریٰ کے ہدایت و ایمان اور نجات کو بیان کر رہی ہے وہ یا تو ایسے لوگ ہیں جو آپؐ کی بعثت سے قبل مر چکے۔ اور اگر انہوں نے آپ کی نبوت کو پا لیا تو اب ان کا ایمان تورات و انجیل پر بھی اسی صورت میں ممکن اور متصور ہوگا۔ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں۔ نہ یہ کہ وہ آپؐ کا کفر و انکار کرتے رہیں اور پھر بھی یہ کہا جائے کہ وہ چونکہ اپنے صحیح سماوی مذہب پر ہیں لہٰذا ناجی ہیں کیونکہ آپ پر ایمان لائے بغیر تو ان کا ایمان بالتورات، اور ایمان بالانجیل بھی باقی نہ رہے گا۔

اس بناء پر تورات و انجیل اور حضرت موسیٰ و عیسیٰ کی تعلیمات آنحضرتؐ کی

لے تفسیر ابن کثیر، ج ۱۔

بشارت پر اور آپؐ کی نبوّت پر ایمان لانے کے حکم پر مشتمل ہے۔ لہٰذا ہر یہودی اور نصرانی آنحضرتؐ پر ایمان نہ لانے کی صورت میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا پہلے کافر ہوگا اور بعد میں آنحضرتؐ کا۔

تو آیت اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا الخ کی اس طرح تفسیر کرنا جس سے یہ مستفاد ہوتا ہو کہ نجات اخروی اسلام کے علاوہ کسی اور راستے بھی ممکن ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان و متعین کردہ مُراد کے صریح خلاف ہے، نہ صرف اسی حد تک بلکہ یہ تفسیر خود قرآن کریم کی متعدد آیات کے مضمون کی تردید ہوگی۔ مثلاً۔ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ بلکہ اور بھی شریعت کے ایسے متفق علیہ اصول و ضوابط کی نفی لازم آئے گی۔ لہٰذا اس طرح کی ہر تفسیر اصول شریعت سے رَد اور باطل سمجھی جائے گی۔

۴۔ اور نہ ہی ایسی کوئی تفسیر معتبر ہوگی جس کے بعد کلام اللہ کے سیاق و سباق (ماقبل اور مابعد) میں کوئی ربط باقی رہے جیسے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں آیت فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا (البقرۃ) جس کا مقصد بیان تو دراصل حق تعالیٰ شانہٗ کی قدرت احیاءِ موتیٰ کا ایک نمونہ دکھانا ہے جو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال اور اشتیاق پر مقدر فرمایا گیا، رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى کہ اے پروردگار مجھ کو دکھا دے کہ تو مُردوں کو کس طرح زندہ فرمائے گا، تو حق تعالیٰ نے اوّل تو یہ فرما کر اَوَلَمْ تُؤْمِنْ کہ کیا اے ابراہیم تم اس پر ایمان و یقین نہیں رکھتے ابراہیم علیہ السلام کا جواب دنیا کو سنا دیا فرمایا " بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ کیوں نہیں! اے پروردگار بے شک ایمان و یقین کامل ہے لیکن یہ سوال صرف اس وجہ

سے سے ہے کہ میرے دل کو سکون ہو جائے تو اس پر خداوند عالم کی جانب سے احیاء موتیٰ کا ایک نمونہ دکھانے کے واسطے یہ حکم دیا گیا کہ اے ابراہیمؑ تم تم چار پرندوں کو پکڑ کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر لو۔ اور پھر ان ٹکڑوں کو خلط ملط کرنے کے بعد ایک ایک پہاڑ پر ان کے اجزاء کو رکھ دو۔ اور پھر ان کو پکارو تو (وہ اللہ کی قدرت سے) تمہاری طرف دوڑتے ہوئے آجائیں گے تو تم دیکھ لینا کہ بس اسی طرح قیامت کے روز اللہ کی ندا پر تمام مردے میدان حشر میں جمع کر دیئے جائیں گے، ان کے ابدان اور جسم کے ٹکڑے خواہ عالم فضا میں منتشر ہوں یا سمندر کی موجوں میں بہہ رہے ہوں یا زمین کی تہوں میں اجزاء ترابیہ میں خلط ملط ہو چکے ہوں۔

تو اگر کوئی تفسیر کی کتاب لکھنے والا شخص کچھ اقوال ضعیفہ اور ایسی روایات ساقطہ کے سہارے جن کو ائمہ تفسیر نے لغو اور باطل قرار دیا ہو، اس آیت کے یہ معنی بیان کرے کہ پرندوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پہاڑ پر ان کے اجزاء کو رکھ دینا اور ان کا اس طرح دوبارہ زندہ ہو کر دوڑتے ہوئے آنا مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو یہ حکم دیا کہ تم چار پرندوں کو اپنے سے مانوس بنا لو اور پھر ان میں سے ایک ایک کو ایک ایک پہاڑ پر بٹھا کر آواز دو اور بلاؤ، تو وہ تمہاری آواز پر دوڑتے ہوئے تمہارے پاس آجائیں گے۔ اس سے ابراہیمؑ تم یہ سمجھنا کہ جب وحشی جانور اور بے عقل و ادراک پرندے چند دنوں کی تربیت سے ایسے مانوس ہو سکتے ہیں، کہ جب تم آواز دو تو تمہاری آواز پر دوڑے چلے آئیں تو تم سمجھ لو انسان تو عقل و شعور میں بڑا کمال رکھتا ہے وہ کیوں نہیں تمہاری تربیت سے اپنے میں تبدیلی پیدا کرے گا وہ بھی یقیناً تم سے مانوس ہو کر تمہاری دعوت حق پر لبیک کہتا ہوا تمہارے سامنے حاضر ہوگا تو ایک پرندہ اپنے مربی کی آواز سے مانوس ہو سکتا ہے تو کیا انسان اشرف المخلوق ہو کر دعوت حق سے مانوس نہ ہوگا۔

تو یقیناً یہ تشریح تفسیر نہیں بلکہ تحریف کلام اللہ ہو گی۔ آنحضرت ﷺ اور حضرات صحابہؓ سے جو تفسیر اس آیت کی کی گئی ہے اس کے صریح خلاف ہونے کے ساتھ یہ بات لازم آئے گی ماقبل اور مابعد کے مضمون سے بھی اس کا کوئی ربط باقی نہ رہے گا، اور ان تمام آیات کی جو غرض ہے وہ بھی فوت ہو جائے گی، جیسا کہ ظاہر ہے[1]۔

---

[1] آیت، اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا اور آیت رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی کی تفسیر میں جن لغزشوں اور حضرات اہل حق کی تفسیر کے خلاف ہونے کی نشان دہی کی گئی۔ یہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی تفسیر ترجمان القرآن میں واقع ہے۔ حضرات قارئین تفسیر سورۂ بقرہ میں صفحہ ۱۹۰ جلد اول مطبوعہ دفتر ترجمان القرآن جید برقی پریس دہلی ملاحظہ فرمائیں ترجمہ اور توضیحی کلمات میں تحریر کرتے ہیں "دراصل اس بارے میں خدا کا ٹھیرایا ہوا قانون تو یہ ہے کہ فلاح و سعادت ایمان و عمل سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ نسل و خاندان یا مذہبی گروہ بندیوں سے۔ جو لوگ پیغمبر اسلام پہ ایمان لاچکے ہوں وہ ہوں یا وہ لوگ ہوں جو یہودی ہیں یا نصاریٰ اور صابی ہوں، کوئی ہو اور کسی گروہ بندی میں سے ہو" خدا اور آخرت پہ ایمان کا اجر اپنے پروردگار سے ضرور پائے گا"

تو موصوف نے پیغمبر اسلام پر ایمان لانے والوں کے علاوہ صاف طور پہ یہود و نصاریٰ کے نجات اور اجر عنداللہ کو بیان کیا جو اصول دین اور ائمہ مفسرین کی تفسیر کے سراسر خلاف ہے۔ اور پھر تعجب یہ کہ مزید اس کی کوئی توضیح بھی نہیں کی۔ آیت رَبِّ اَرِنِی کی تفسیر میں واقع شدہ غلطی کے لیے اسی جلد کے صفحہ ۲۷۰ کو ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں:

"اچھا یوں کرو کہ پرندوں میں چار جانور پکڑ لو اور انہیں اپنے پاس رکھ کر اپنے ساتھ ہلا لو (یعنی اس طرح تربیت کرو کہ وہ اچھی طرح تم سے ہل جائیں) پھر ان چاروں میں سے ہر ایک کو اپنے سے دور ایک ایک پہاڑ پہ بٹھاؤ۔ پھر انہیں بلاؤ وہ آواز سنتے ہی تمہاری طرف اڑتے ہوئے چلے آئیں گے"

اس کے بعد مصنف نے وحشی جانور کے مانوس ہونے کو نکتہ کو بیان کیا (اگلے صفحہ پر دیکھیں)

۴۔ اور نہ وہ تفسیر معتبر ہوگی جو قواعد عربیہ اور اہل لسان کے استعمال اور ان کے اصول اور طرق متعارفہ کے خلاف ہو۔ مثلاً آیت اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں ایک معروف معجزہ کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو پتھر پر عصا مارنے کا حکم دیا جس سے بارہ چشمے اس پتھر سے جاری ہوگئے، پر محمول کرنے کے بجائے یہ عجیب و غریب تشریح کی کہ اضرب بعصاك الحجر کے معنی لاٹھی کے سہارے پتھر اور پہاڑ پر چڑھنا ہے کہ اے موسیٰ

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ پر) قارئین کرام اس پوری عبارت کے ساتھ دوعنوان کے طرز پر کہا دے پر لکھی ہوئی عبارت بھی دیکھیں۔ آزاد صاحب نے آیت کونوا قردۃ خاسئین کی تفسیر میں بھی یہی روش اختیار کی۔ مسخ صوری جس پر جمہور مفسرین کا اتفاق ہے کے بجائے مسخ معنوی پر محمول کیا ہے ملاحظہ فرمائیں ص۱۹۱ جلد اول تفسیر سورہ بقرہ۔

اسی طرح آیات معراج کی تفسیر میں بھی اہل حق کے اجماعی مسلک کے صریح خلاف اسراء و معراج کے مسئلہ کو ایک خواب کا واقعہ قرار دینے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں بعض حضرات صحابہؓ کا نام لے کر جن اقوال کی نسبت کی ان کی قطعاً کوئی اصل نہیں اور یہ رنگ دینا چاہا کہ یہ مسئلہ حضرات صحابہؓ کے درمیان اختلافی تھا۔ ملاحظہ فرمائیں ص۳۶۹ جلد دوم پر لکھتے ہیں "لیکن حضرت عائشہؓ حذیفہ بن الیمان حسن معاویہؓ سے مروی ہے کہ یہ ایک روحانی معاملہ تھا" اور ص۳۶۹ پر جو تحقیق ابن عباسؓ کی طرف کی ہے وہ بھی سرتاسر اہل حق کے مسلک کے خلاف ہے۔

معراج جیسے عظیم الشان معجزہ کے بارے میں مصنف کی یہ روش قابل افسوس ہے، جس معجزہ کو قرآن نے تمام معجزات نبویہ کے درمیان نہایت ہی عظمت و اہتمام کے ساتھ ذکر کیا ہو ایک دو آیت نہیں بلکہ سورۂ والنجم کے تو پہلا رکوع کی اکثر آیات واقعہ معراج ہی پر مشتمل ہیں۔ اس کو خواب یا روحانی معاملہ قرار دینا اسلام اور پیغمبر اسلام کے ایک عظیم الشان معجزہ کا انکار کرنا ہے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

اسی طرح ان کی تفسیر میں اور بھی لغزشیں ہیں۔ ۱۲

تم اپنی لاٹھی کے سہارے پہاڑ پر چڑھ جاؤ وہاں تم کو بارہ چشمے پانی کے بہتے ہوئے مل جائیں گے، جس کا حاصل ظاہر ہے کہ یہ ہوگا کہ اس آیت کا مضمون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پتھر پر عصا مارنے سے بطور معجزہ چشموں کا جاری ہو جانا مراد نہیں ہے بلکہ اتفاقاً جیسے پہاڑوں پر چڑھنے والے کو کہیں بہتے ہوئے چشمے مل جایا کرتے ہیں۔ اسی طرح سے موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ پر چڑھنے کے بعد پانی کے چشموں کا مل جانا ہے۔ سو ظاہر ہے کہ یہ تفسیر اُمت کے تمام ائمہ مفسرین حضرات صحابہؓ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح بیان کردہ تفسیر کے خلاف ہونے کے علاوہ لغت اور قواعد عربیہ اور استعمال اہل لسان کے بھی خلاف ہے اور خداوند عالم کے ایک جلیل القدر پیغمبر کے اس عظیم الشان معجزہ کا انکار ہے جس کا قرآن کریم نے بڑی اہمیت کے ساتھ متعدد بار ذکر فرمایا۔ پھر عقل سے بھی سوچنے کی بات ہے کہ محض پہاڑ پر چڑھ کر پانی کے چشموں پر پہنچ جانا کونسی ایسی خاص بات ہے جس کو خداوند عالم دلائل نبوت اور حضرت موسیٰؑ کے فضائل اور ان پر خصوصی انعامات کے طور پر بیان فرما رہا ہے۔

پہاڑ پر چڑھ کر چشموں تک پہنچ جانا تو ہر شخص کے لیے ممکن ہے حتیٰ کہ کافر بھی پہنچ سکتا ہے۔ اس عجیب و غریب تشریح کے مہمل اور بے معنی ہونے کو ہر شخص اس مقام پر کلام اللہ کی چند آیات ماقبل اور چند آیات مابعد دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے۔ اور ہر وہ تفسیر بھی معتبر نہ ہوگی جس میں اصول شریعت کا انکار و ابطال لازم آتا ہو۔ یا شریعت کے اصول مسلّم کا رد ہو اور ان امور میں سے کسی امر پر کوئی زد پڑتی ہو جو شریعت نے طے اور ثابت کر دیئے ہیں۔ مثلاً کسی تفسیر سے انکار معجزاتؑ، حشر و نشر اور معاد جسمانی کی نفی، وزن اعمال اور ملائکہ و شیاطین کے وجود کا انکار لازم آتا ہو یا عالم جنت و جہنم کی تردید کرتے ہوئے نعماء جنت کو محض قلبی سکون اور جہنم کے عذاب کو قلبی اذیت اور بے چینی کے معنی پر محمول

کیا جائے۔

چنانچہ بعض لوگوں نے موضوع تفسیر کے عنوان سے ایسی کتابیں لکھی ہیں کہ ان کے مطالعہ سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کی غرض صرف یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان فرمائے ہوئے ان حقائق کا ردّ ہو جن پر دین قائم ہے۔ لہذا قیامت، حشر و نشر، جنّت و جہنم اور معجزات کی آیات و مضامین کی ایسی تشریح کی جاتی ہے کہ اس کے بعد نہ قیامت باقی رہتی ہے نہ جنّت و جہنم اور نہ حشر و نشر (اَعَاذَنَا اللّٰہُ تَعَالٰی وَجَمِیْعَ الْمُسْلِمِیْنَ عَنْ ھٰذِہِ التَّحْرِیْفَاتِ) فلسفہ اور یورپ سے مرعوب ذہنیت رکھنے والوں کا قدرِ مشترک ایسا ہی انداز اور طرز ہوتا ہے کہ دین کو مسخ کرنے کے لیے ایسی تاویلیں کریں۔[2]

۵۔ اور ایسی تفسیر بھی معتبر نہ ہوگی جس سے مقاصد قرآن کا فوت ہونا لازم آئے، جیسے آیات قرآنیہ کو قرآن کے حقیقی مقاصد پر محمول کرنے کے بجائے اصول سائنس و فلسفہ صنعتی ایجادات اور مادی ترقیات پر منطبق کیا جائے اور اسی کا نام مقصد کائنات تجویز کر کے تمام آیات قرآنیہ کو اسی مقصد پر ڈھالنے کی کوشش کی جائے، جس کے نتیجہ میں تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفوس کے وہ تمام بلند مقاصد ختم ہو جائیں۔ جن کے واسطے قرآن نازل کیا گیا اور خاتم الانبیاء سید الرسل جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا۔

---

[1] جیسا کہ منکرین حدیث کی یہ روش عام ہے۔

[2] علمی دیانت و امانت اس بات کی مقتضی ہے کہ مسلمانوں کو ان باتوں سے آگاہ کیا جائے جو کتاب اللہ اور دین اسلام کو مسخ کرنے والی ہیں۔ اور ایسی کتابوں سے بھی مطلع کیا جائے جن میں اس قسم کا مواد موجود ہے تاکہ مسلمان اپنے عقائد و خیالات کو گمراہی سے محفوظ رکھ سکیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے ان اہل کتاب کا قرآن میں ذکر کیا ہے جو کتاب الٰہی میں تحریف اور ردّ و بدل کرتے تھے تو محض دینی ذمہ داری اور فریضہ کی بجا آوری کے لیے اس کتاب کی یا ایسی ہی بعض دیگر کتب تفسیر کی با دل ناخواستہ نشان دہی کی گئی تاکہ اہل علم کو کسی قسم کا خفا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

الغرض یہ ہیں وہ اصول خمسہ جن کی رعایت و پیروی کرتے ہوئے مضامین قرآن کی تشریح ائمہ مفسرین اور علماء امت کے نزدیک تفسیر قرآن ہے اور ان اصول کو نظر انداز کر کے مضامین قرآن کی تشریح کرنا تحریف قرآن ہے ۔ قرون اولیٰ میں معتزلہ اور فلاسفہ نے چند روایات اور بعض آیات میں ایسی کچھ تاویلیں اختیار کی تھیں ، لیکن اس قرن کے جدت پسند اور روشن خیال یعنی مغربی علوم سے مرعوب ذہنیت رکھنے والے تو پورے قرآن ہی کو مسخ کرتے اور اس کو علوم الٰہیہ سے دور اور جدا کر کے صرف ایک فلسفہ اور سائنس کی کتاب ہی بنانے کے درپے ہیں ۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) اور مغالطہ نہ رہے ۔ اس موقعہ پر وضاحت نہ کرنا یقیناً ایک بہت بڑی علمی خیانت اور دینی مداہنت ہوتی ۔

جامعہ ملیہ دہلی کے ایک پروفیسر مولوی عبدالحی استاذ تفسیر جامعہ ملیہ نے بھی ایک ایسی ہی تفسیر لکھی تھی جو اوّل سے آخر تک اسی قسم کی تحریفات سے بھری پڑی ہے ۔ اس تفسیر کو دیکھ کر اُن کے بعض احباب و معاصرین جو ان سے علمی تعلق رکھتے تھے کی زبان سے بے ساختہ یہ لفظ نکلا : "یَا لَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا" اے کاش میں اس سے قبل مر جاتا یا نسیًا منسیًا ہو چکا ہوتا ۔

اس تفسیر کی تحریفات کی نشان دہی پر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی صدر مدرس مدرسہ مفتاح العلوم مئو ضلع اعظم گڑھ کی ایک کتاب "التنقید السدید علی التفسیر الجدید" کے نام سے ۱۳۴۹ھ میں طبع ہوئی تھی ۔

بلاشبہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین اسلام کی حقانیت کے دلائل اور معجزات میں سے ہے کہ اللہ ربّ العزت اس اُمت میں ایسے افراد پیدا فرماتا رہتا ہے جو اس فرمان نبوی کا مصداق ہوتے ہیں

يحمل هٰذا العلم من كلّ خلفٍ عدولُه ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتاويل الجاهلين ۔ (مشكوٰة المصابيح)

آنے والی نسل میں سے عادل و ثقہ لوگ اس علم کو حاصل کرتے رہیں گے اور اس کی حفاظت کریں گے جس کے ذریعہ وہ غلو کرنے والوں کی تحریف اور اہل باطل کی م

م اختراع کردہ باتوں اور جاہلوں کی تاویلات کا ردّ اور ازالہ کریں گے ۔

اُردو زبان میں تصنیف کی جانے والی اس قسم کی تمام تفاسیر کی بنیاد اور اصل سرسیّد احمد خاں کی کتاب تفسیر القرآن ہے جس میں انکارِ آدمؑ سے لے کر جنّت و جہنم اور احوالِ جنّت و جہنم تک سب ہی چیزوں کا انکار ہے۔ جگہ جگہ معجزات اور ایسے ہی دوسرے دین کے بنیادی مقاصد کو بار بار خلافِ عقل اور خلافِ فطرت جیسے الفاظ ذکر کر کے ان کی تردید کی ہے۔ اس تفسیر کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے تفسیرِ حقانی کا مقدمہ ملاحظہ فرمایا جائے۔

تفسیر بالرائے کتاب اللہ میں تحریف ہے

امام قرطبیؒ اور حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں، قرآن کریم کی تفسیر میں محض رائے اور قیاس کرنا اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہ کرنا حرام ہے۔

بعنوان سابق میں جو پانچ اصول صحت تفسیر کے ذکر کیے گئے ہیں ان کی رعایت اور پابندی کرتے ہوئے کلام اللہ کی تشریح کو تفسیر کہا جا سکتا ہے اور ان اصول کو نظر انداز کرتے ہوئے مضامین کی تشریح اصطلاح علماء میں تفسیر بالرائے اور تحریف قرآن ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے مقدمۂ تفسیر میں بحوالہ ابن جریر حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت تخریج کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

قَالَ مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ أَوْ بِمَا لَا يَعْلَمُ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔ هٰكَذَا أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَرَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ وَرَوٰى ابْنُ جَرِيْرٍ عَنْ جُنْدُبٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَقَدْ أَخْطَأَ وَفِي رِوَايَةٍ مَنْ قَالَ فِي كِتَابِ اللّٰهِ بِرَأْيِهِ فَأَصَابَ	جس شخص نے قرآن کریم میں اپنی رائے سے کوئی بات کہی یا ایسی کوئی بات کہی جس کا اسکو علم نہیں ہے (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے) تو اس کو اپنا ٹھکانا جہنم بنا لینا چاہیے اور روایت کو اسی طرح تخریج کیا ہے امام ترمذی نسائی اور ابو داؤد نے اور ترمذی نے بیان کیا کہ یہ حدیث حسن ہے، اور ابن جریر نے جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے

فَقَدْ اَخْطَاءَ لِاَنَّهُ تَكَلَّفَ مَالَا عِلْمَ لَهُ بِهٖ وَسَلَكَ غَيْرَ مَا اُمِرَ بِهٖ وَهٰكَذَا سَمّٰى اللّٰهُ تَعَالٰى اَلْقَذَفَةَ كَاذِبِيْنَ فَقَالَ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَاُولٰئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكَاذِبُوْنَ وَلَوْ كَانَ قَدْ قَذَفَ مَنْ زَنٰى فِىْ نَفْسِ الْاَمْرِ لِاَنَّهُ اَخْبَرَ بِمَا لَا يَحِلُّ لَهُ الْاِخْبَارُ بِهٖ

قرآن میں کوئی بات اپنی رائے سے کہی تو یقیناً اس نے خطا کی۔ اور ایک روایت کے لفظ یہ ہیں جس شخص نے کتاب اللہ میں اپنی رائے سے کچھ کہا تو اس نے درست بھی کہا تو بھی خطا کی۔ کیونکہ اس نے جس چیز کا اسے علم نہ تھا اس کا تکلف کیا اور اس نے وہ راستہ اختیار کیا جس پر اسے چلنے کی اجازت نہیں تھی اور اسی طرح (تو) اللہ تعالیٰ نے (ان) بہتان لگانے والوں کو جھوٹا کہا ہے (جن کے پاس گواہی نہ ہو) تو فرمایا ہے پس جب کہ وہ گواہ نہ پیش کر سکیں تو وہ اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں۔ اگرچہ جس شخص نے (مثلاً) کسی کو زنا کے ساتھ متہم کیا اس نے درحقیقت زنا کیا بھی ہو (مگر پھر بھی تا نونًا اس کو جھوٹا کہا گیا) اس لیے کہ اس نے وہ چیز بیان کی ہے جس کا بیان کرنا اس کو (بغیر شہادت اور ثبوت کے) حلال نہ تھا۔

تو اسی طرح قرآن کریم کی تشریح و تفسیر میں اللہ نے جو قانون مقرر کر دیا ہے اس قانون کی پیروی کے بغیر کتاب اللہ میں جو بھی کہا جائے خواہ وہ چیز اپنی جگہ درست ہی کیوں نہ ہو خطا اور غلطی ہی شمار کی جائے گی۔

امام قرطبیؒ نے ابوبکر انباری کا قول نقل کیا ہے فرماتے ہیں، حدیث ابن عباسؓ میں مذکور بات کہنے کے دو معنیٰ ہیں۔ ایک یہ کہ مضامین قرآن کی تشریح

لے تفسیر ابن کثیر ج ۱ ۔ احکام القرآن للقرطبی ج ۱۔

اور مشکلات کے حل میں ایسی کوئی چیز بیان کی جائے جو نہ حدیث مرفوع سے ثابت ہو اور نہ صحابہؓ و تابعین سے منقول اور نہ ہی وہ تشریح و تفسیر ان کے اقوال سے ماخوذ و مستنبط ہو۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں جو شخص قرآن میں ایسی بات کے جس کے متعلق جانتا ہے کہ یہ خلاف حق ہے اور حق اس کے علاوہ ہے۔ گویا جان بوجھ کر غلط تفسیر کرتا ہے تو ہر دو معنی کے لحاظ سے وعید بیان فرمائی گئی ہے کہ ایسے لوگوں کو اپنا ٹھکانا جہنم بنالینا چاہیے اور فرمایا حدیث جندب میں بھی اسی چیز کو اس عنوان سے بیان کیا گیا کہ جو شخص کوئی چیز اپنی خواہش اور افکار کے مطابق بیان کرے۔ جس کا کوئی ماخذ نہ احادیث میں ہے اور نہ اقوال صحابہؓ و متقدمین میں۔ تو اگر ایسی بے سند کوئی چیز نفس الامر میں درست بھی ہو تو بھی خطا ہے کیونکہ قرآن کریم کے متعلق کوئی بات بغیر سند اور بلا دلیل بیان کرنا جائز ہی نہیں ہے۔

اہل علم اس بات کو جانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کوئی حکایت یا شخصی واقعہ بھی نقل کرے تو اس کے قابل اعتبار ہونے کا ثبوت طلب کیا جاتا ہے۔ کلام اللہ کی شان تو سب سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ لامحالہ ہر اس قول کے لیے جس کو یہ کہا جائے کہ یہ اللہ کی مراد ہے محکم ثبوت اور قوی سند پیش کرنا ضروری ہوگا۔

ابن عطیہ بیان کرتے ہیں تفسیر بالرائے کرنے والا ہر وہ شخص ہوگا، جو کلام اللہ کی مراد بیان کرنے میں نہ صحابہ کی تفاسیر اور اقوال کو ملحوظ رکھے، نہ اصول شریعت اور قواعد عربیہ کی رعایت کرے۔ بلکہ ان سب سے آزاد ہو کر اپنے افکار و خیالات کی ترجمانی کو ترجمان قرآن سمجھتا ہو۔

امام قرطبیؒ ان متعدد اقوال کو نقل کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ تفسیر بالرائے کا منشا اپنے خاص معتقدات اور خیالات کی جانب رجحان اور ان سے متاثر ہونا ہوتا ہے۔ فطرتاً خیالات کا رجحانات انسان کو اپنی خواہشات کی جانب مائل کرتا ہے اور اس قسم کے جذبات مجبور کیا کرتے ہیں کہ آیات قرآنیہ کو انسان اپنے ذوق اور خیالات کے مطابق بنائے تو ایسی صورت میں کبھی تو ایسا ہوگا کہ غیر ارادی طور پر

آیاتِ قرآنیہ کے مفہوم اور تعیین مراد میں اس کے ذاتی افکار و خیالات کی آمیزش ہو جاتے گی جو اس کا خود ذاتی ذوق اور اختیار کردہ ایک غلط مسلک ہے، اور کبھی یہ ہوگا کہ دیدہ و دانستہ تلبیس کرے گا۔ اور طرح طرح کے تکلّفات اختیار کرکے کسی نہ کسی طرح قرآن کی آیات اپنی خواہش اور مسلک کی طرف پھیرنے کی کوشش کرے گا جیسے کہ باطل پرست لوگ بعید از قیاس تاویلات اختیار کرتے ہیں جس سے ان کا مقصد صرف یہی ہوتا ہے وہ ان اپنے اعتقادی امور کی ان تاویلات کے ذریعے تائید کریں۔

بہرکیف یہ دونوں صورتیں تفسیر بالرّائے کی ہیں۔ اوّل صورت کا حاصل جہل عَنِ الحق اور ضلال و گمراہی کا ہے۔ اور دوسری صورت تلبیس بین الحق والباطل اور کتمان حق یعنی باطل کو بزنگِ حق ظاہر کرنا اور حق کو چھپانا ہے۔[۱]

یہود نے یہی بیہودہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا جس کو قرآن کریم نے بیان فرمایا:

وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۔	اور بے شک ایک جماعت ان میں ایسی ہے جو حق کو چھپاتی ہے، حالانکہ وہ لوگ خوب جانتے ہیں (کہ حق کیا ہے)
(البقرہ)	

اور ارشاد فرمایا:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۔	ہلاکت و بربادی ہے ان لوگوں کے واسطے جو اپنے ہاتھوں سے لکھ لیتے ہیں کچھ لکھی ہوئی چیزیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے ذریعے دنیا کا حقیر سامان اور منفعت حاصل کریں۔ پس ہلاکت اور افسوس ہے اس چیز کے باعث جس کو جو ان کے ہاتھوں نے لکھی اور ہلاکت و بربادی ہے اس چیز کے باعث جو وہ کمائی کر رہے ہیں
(سورۃ البقرہ)	

[۱] ملخص من کلام القرطبی۔

اہل کتاب میں سے تحریف کرنے والے تو یہ کیا کرتے تھے، کہ اپنی طرف سے منگھڑت چیزیں لکھ کر یہ دعوت کرتے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اپنی قوم کے سامنے اس کو بحیثیت کلام الٰہی پیش کرتے۔ قرآن کریم چونکہ حق تعالیٰ شانہٗ کا ایک عظیم الشان معجزہ ہے اور اس جیسا کلام پیش کرنا طاقت بشریہ سے خارج ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا فصیح و بلیغ شخص بھی کوئی مختصر سا کلام یہ لکھ کر پیش کرے کہ یہ قرآن جیسا کلام ہے۔ اور اس کی حفاظت کا اللہ نے وعدہ کیا ہے اس وجہ سے اس امت کے محرفین کے لیے اس بات کا امکان ہی نہ تھا کہ تحریف لفظی کرتے البتہ بظاہر تحریف معنوی کا امکان رہا تو اس امت کے محرفین نے اپنی تحریفات کا یہی ڈھنگ اختیار کیا۔ کلام اللہ کی مراد اور آیات قرآنیہ کے معنی اپنی طرف سے تجویز کر کے کہنا شروع کر دیا کہ "یہ ہے کلام اللہ کی مراد"۔ اور عوام کو مغالطہ میں ڈالنے کے لیے ان معنوی تحریفات کو یہ عنوان دیا کہ یہ تحقیقات جدیدہ ہیں۔ اور جب اہل ایمان کے قلوب ان معنوی تحریفات کو قبول کرنے میں متامل ہوئے تو یہ کہا کہ پرانے زمانہ کے لوگ فرسودہ خیال تنگ نظر ان کے افکار و خیالات ان مضامین تک نہ پہنچ سکے۔ وَغَيْرُ ذٰلِكَ مِنَ الْهفوات، لیکن خداوند عالم کی شان کبریائی ہے کہ جس طرح اس کا کلام لفظی تحریف سے محفوظ ہے۔ اور رہے گا۔ اسی طرح معنوی تحریفات سے بھی محفوظ رہا اور آج تک محرفین کی یہ تدبیر اور تلبیس بین الحق و الباطل کی کوئی سازش کارگر نہیں ہو سکی اور نہ قیامت تک ہو سکے گی۔ اور جیسے کلام اللہ محفوظ ہے۔ ان کلمات خداوندی کا مفہوم اور مدلول بھی تحریف اور تلبیس سے محفوظ رہے گا۔ اور جب بھی کوئی محرف تحریف معنوی کی جسارت کرے گا، حق اور باطل چھٹ کر دنیا کے سامنے ظاہر ہو جائے گا اور اللہ کا قانون بھی اسی طرح ہے، لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ

شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ نے علامہ ابن النقیب کا ایک کلام نقل کیا ہے جس میں انھوں نے تفسیر بالرائے کی صورتوں کو واضح فرمایا ہے۔ فرمایا:

جملۃ ما تحصل فی معنی حدیث التفسیر بالرائے خمسۃ اقوال احدھا التفسیر من غیر حصول العلوم التی تجوز معھا التفسیر. والثانی تفسیر المتشابہ الذی لا یعلم الا اللہ الثالث التفسیر للمذھب الفاسد بان یجعل المذھب اصلا والتفسیر تابعا فیرد الیہ بای طریق امکن وان کان ضعیفا الرابع التفسیر ان مراد اللہ کذا علی القطع من غیر دلیل.
الخامس التفسیر بالاستحسان للھوی۔ [۱]

کہ حدیث تفسیر بالرائے کی شرح میں مجموعی طور پر جو اقوال حاصل اور مفہوم ہیں وہ پانچ ہیں۔ ایک یہ کہ تفسیر بالرائے یہ ہے کہ انسان ان علوم کو حاصل کیے بغیر تفسیر قرآن کرے جن کے حاصل کیے بغیر تفسیر کرنا جائز ہی نہیں ہے اور دوسرے ان متشابہات کی تفسیر اور بحث و تحقیق جن کی مراد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ تیسرے یہ کہ مذہب فاسد اور باطل کی حمایت کے لیے تفسیر کرے جس کی صورت یہ ہو کہ اپنے اس مسلک اور مذہب کو اصل قرار دے لے اور پھر آیات قرآن کی تفسیر کو اسی مذہب اور مسلک کی طرف پھیر لے اور اس پر منطبق کرے۔ جہاں تک بھی اس کو قدرت و امکان ہو اگرچہ ایسی تاویلات بعیدہ اختیار کرنے کے لیے سند ضعیف ہی کیوں نہ ہو۔ چوتھے یہ کہ بلا کسی ثبوت اور سند (اپنی رائے سے) یہ دعویٰ کرے کہ بس اللہ کی مراد یہی ہے۔ پانچویں صورت یہ کہ اپنی پسندیدہ خواہشات کے مطابق تاویل کرے اور ان ہی کی طرف آیات قرآنی کو پھیرے (اور ان پر منطبق کرے۔)

[۱] تذکرۃ فی الاتقان

یہی وہ چیز ہے جس کو خداوند عالم نے قرآن کریم میں بھی واضح فرما دیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا۔ (سورۃ بنی اسرائیل)

اور اے مخاطب مت درپے ہو تو اس چیز کے جس کا تجھے کوئی علم نہیں۔ بے شک انسان کے کان اور نگاہ اور دل یہ سب کے سب قیامت کے روز باز پرس کیے جائیں گے۔

اور اسی طرح فرمایا گیا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُنِيرٍ ثَانِيَ عِطْفِهِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۖ لَهُ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۖ وَنُذِيقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَذَابَ الْحَرِيقِ۔ (سورۃ الحج)

اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ کے بارہ میں جدال و خصومت کرتے ہیں بغیر کسی علم و واقفیت اور بغیر کسی ہدایت اور روشن کتاب کے۔ جھکائے ہوئے ہے اپنے بازو (تکبر و غرور سے) تاکہ (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے گمراہ کر دے۔ ایسے شخص کے لیے دنیا میں ذلت و رسوائی ہے اور قیامت میں ہم اس کو ایک جلتی ہوئی آگ کے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

اللہ کے ساتھ اور اس کے بارے میں جدال و خصومت یہی ہے کہ اللہ کی طرف ایسے امور کی نسبت کرے جو اس کے منشاء اور اس کے دین کے خلاف ہیں اور جن کو وہ پسند نہیں فرماتا، گویا یہ روش نظری اور فکری اعتبار سے اللہ رب العزت سے مقابلہ اور خصومت کرنا ہے۔ اور اللہ کے ساتھ خصومت و جدال کرنے والا انسان اپنا رُخ حق سے پھیر کر باطل ہی کی طرف مائل کرنے والا ہوتا ہے تو بالکل اس کی یہی تصویر ہوتی ہے۔ اپنے بازو پھیرے ہوئے غرور و تکبر سے جس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکائے۔ ایسے ہی ظالموں اور خواہشاتِ نفسانیہ کو اپنا معبود بنا لینے والوں کے لیے یہ وعید نازل ہوتی ہے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ

اور اس شخص سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جس نے اپنی خواہشات کی پیروی کی بغیر اللہ کی طرف سے کسی ہدایت کے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ایسے ظالموں کی رہبری نہیں فرماتا۔

علامہ نظام الدین نیشاپوری تفسیر غرائب القرآن میں فرماتے ہیں کہ یہ بات جان لینی چاہیے کہ دیانت اور تقویٰ کا تقاضہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں ہرگز ایسی کوئی تاویل اختیار نہ کی جائے جن سے ان حقائق کا ابطال لازم آتا ہو جن کی تفسیر و تشریح اور تحقیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صحابہؓ اور سلف صالحین نے کی جیسے معاد یعنی حشر و نشر، جنت و جہنم، صراط، میزان اعمال، نعماء جنت، حور و قصور، انہار و اشجار وغیرہ۔ بلکہ لازم اور ضروری ہے کہ ان تمام چیزوں کو انہی کیفیات، اور احوال کے ساتھ مانا جائے۔ جن احوال و کیفیات سے یہ چیزیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت اور منقول ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان حقائق کو برقرار رکھتے ہوئے دوسرے بعض لطائف و اسرار اور رموز کی طرف اشارہ کر دیا جائے جو ان ہی حقائق و امور سے ماخوذ و مستنبط ہوں۔ جن کو شارع علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے اس نوع کے جو رموز و لطائف حضرات عارفین اور صوفیاء کی تفاسیر میں جو منقول ہوئے ہیں وہ محض ایک تمثیل و تشبیہ اور اشارہ کا درجہ ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عالم کائنات میں جو حقائق خارج اور نفس الامر (یعنی عالم صورت) میں پیدا فرمائی ہیں ان کی کوئی نہ کوئی مثال اور نظیر عالم معنی میں ہوتی ہے۔ (انتہی کلامہ)

بلکہ عالم معنی میں تو انسان کے اعمال و افعال کی بھی مثالی صورتیں ہوتی ہیں جس کا قرینہ وہ حدیث ہے جس میں فرمایا گیا ہے۔ مرد صالح اور مومن کے سامنے اس کی قبر میں سوال و جواب کے بعد ایک حسین و جمیل شکل ظاہر ہوگی تو یہ شخص پوچھے گا کہ تو کون ہے تیرا چہرہ تو خیر کی مخبری کر رہا ہے وہ شکل جواب دے گی " اَنَا عَمَلُكَ الصَّالِحُ " کہ میں تو تیرا عمل صالح ہوں۔ اور فاجر و بدکار شخص کے سامنے

ایک شکل ظاہر ہوگی جو نہایت ہی قبیح اور ہیبت ناک ہوگی جس کو یہ دیکھ کر یہ کافر دغاجیرآدمی دریافت کرے گا تو جواب دیا جائے گا اَنَا عَمَلُكَ الْخَبِيْثُ کہ میں تیرا عمل خبیث ہوں۔ غرض قبر میں ظاہر ہونے والی یہ حسین جمیل شکل اور قبیح و مصیبت ناک صورت اعمال کی صورتیں ہوں گی۔

بہرکیف تفسیر بالرائے کی ان پانچ صورتوں کے علاوہ ایک شکل یہ ہے کہ قرآن وحدیث کے ایسے معنی بیان کرنا جس سے ان حقائق کا ابطال اور رد لازم آتا ہو جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا اور شریعت نے اس کو متعین کیا۔

یہ شکل بھی تفسیر بالرائے کے ساتھ ملحق ہے کہ کسی آیت کے کوئی ایسے جدید معنی اختراع اور ایجاد کیے جائیں جس کی طرف نہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی اشارہ فرمایا ہو اور نہ ہی صحابہ سلف صالحین اور ائمہ متقدمین میں سے کسی کا ذہن اس عجیب وغریب معنی کی طرف متوجہ ہوا ہو تو یہ تفسیر وتشریح بھی اصول شریعت کے لحاظ سے الحاد اور تحریف ہے، اس لیے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ قرآن کے یہ معنی نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھے اور صحابہ اور ائمہ مفسرین جن کی زندگیاں ہی قرآن وحدیث کی خدمت میں گذریں وہ بھی اس مفہوم کو نہ سمجھ سکے اور ناگہاں چودہ سو برس کے بعد یورپ کی یونیورسٹیوں سے تربیت پاکر آنے والوں پر یہ معانی اور عجیب وغریب حقائق منکشف ہونے لگے اور یہ لوگ نہایت بے باکی کے ساتھ پیغمبر خدا اور صحابہ و ائمہ اور علماء اسلام کے مدمقابل ان کی تعلیمات کو مٹانے اور مسخ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور جن حقائق کو قرآن اللہ اور اس کے رسول نے ثابت کیا ان کے رد کرنے کے لیے کبھی سائنس اور فلسفہ کا سہارا لے رہے ہیں۔ کبھی ادیبانہ عبارتوں سے نہایت عیاری اور چالاکی سے عامۃ المسلمین کے ذہنوں کو پراگندہ اور مرعوب کر رہے ہیں۔

بہرکیف تمام اُمّت کا اس پر اجماع ہے اور شریعت کے اصول سے یہ

بات طے شدہ ہے۔ صحابہؓ و تابعین اور ائمہ مفسرین کے نزدیک قرآن کریم اور آیات کلام اللہ کی جو تفسیر متفق علیہ ہے اس سے خروج اور عدول بلا شبہ ضلالت اور گمراہی ہے۔ کچھ نئے تعلیم یافتہ لوگ ان جدت طرازیوں کو کمال سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ کمال نہیں بلکہ یہ تو ضلال ہے۔

خداوند عالم سب مسلمانوں کو قرآن کریم اس طرح سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، جس طرح کہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا اور اس پر عمل کی توفیق سے ہمارے قلوب کا تزکیہ اور تطہیر فرمائے جس کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث فرمائے گئے۔ آمین یا ربّ العالمین۔

تفسیر کلام اللہ میں حضرات صوفیا و عارفین کے اقوال

بعض آیات قرآنیہ کی تفسیر میں عارفین اور صوفیاء سے کچھ لطائف اور اشارات منقول ہوتے ہیں جو سلوک و طریقت اور تصوف کے نکات کے درجہ میں ہوتے ہیں وہ اصل تفسیر نہیں ہوتے بلکہ اصل تفسیر تو وہی ہے جو حدیث مرفوع اور حضرات صحابہؓ سے ثابت و منقول ہوئی - اس تفسیر کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ لطائف قابل اعتبار ہوتے ہیں - جیسے آیۃ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی جس کا مفہوم سفر حج کے لیے زادِ راہ اختیار کرنے کا حکم ہے اور یہ کہ بہتر زادِ راہ اتنا ہے کہ انسان کسی کے سامنے دست سوال پھیلانے سے بچا رہے لیکن اس مفہوم کو برقرار رکھتے ہوئے یہ بیان کرنا کہ فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی سے حق تعالیٰ نے ایک دنیوی سفر کے زاد راہ کا مسئلہ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ آخرت کے زاد راہ کی طرف بندوں کو متوجہ کیا کہ بہترین زاد راہ تقویٰ ہے اور یہ زاد راہ آخرت میں کام آنے والا ہے -

علامہ آلوسی تفسیر روح المعانی میں فرماتے ہیں آیات قرآنیہ میں صوفیاء اور عارفین کا کلام بطریق تفسیر نہیں ہوتا ہے - اس لیے کہ تفسیر تو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی بیان کردہ مراد کا نام ہے بلکہ وہ تو صرف رموز اور باطنی اشارات اور ایسے لطائف ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ ان کے قلوب پر فائض اور وارد فرماتا ہے - ارباب طریقت و سلوک کے قلب زہد و تقویٰ اور باطنی ریاضتوں کی وجہ سے منور ہوتے ہیں - اور ان پر تجلیات غیبیہ کا نزول ہوتا رہتا ہے ، تو گاہ بگاہ ان کی زبان سے آیات کلام اللہ کی تشریح میں کچھ ایسے لطائف اور

معارف جاری ہو جاتے ہیں جن کا تعلق ظاہری علوم سے نہیں ہوتا بلکہ وہ محض ایک روحانی تلقین اور تفہیم علیٰ ہوتے ہیں۔ یہ باطنی اشارات کلام اللہ کے اس مفہوم اور مدلول قطعی کو برقرار رکھتے ہوئے معتبر ہوں گے جو شریعت کے اصول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم اور صحابہ کی تفسیر سے ثابت ہے۔ اس لیے اگر ارباب تصوف سے کوئی ایسی چیز منقول ہو جو احکام شریعت کے خلاف ہو یا اس سے شریعت کی حدود کا انکار لازم آتا ہو تو وہ ہرگز مقبول اور معتبر نہ ہوگی۔ قابل اعتبار صرف وہی لطائف ہیں جن سے نہ احکام شریعت پر کوئی زد پڑتی ہو اور نہ کسی ایسے امر کا صراحۃً یا دلالۃً رد و انکار لازم آتا ہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کے صحابہؓ سے ثابت ہے۔

حضرت حسن بصریؒ سے مروی ہے فرمایا:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِکُلِّ اٰیَۃٍ ظَھْرٌ وَبَطْنٌ وَلِکُلِّ حَرْفٍ حَدٌّ وَلِکُلِّ حَدٍّ مُطَّلَعٌ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ ہر آیت کے لیے ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن ہوتا ہے اور ہر حرف کے لیے ایک حد یعنی حکم شرعی ہے اور ہر حکم شرعی کے واسطے ایک اطلاع پانے کی جگہ ہے (کتاب اللہ میں سے)

علامہ ابن النقیب بیان کرتے ہیں ظہر آیات سے وہ معانی مراد ہیں جو اہل علم قواعد شریعت اور ظاہری علوم رسمیہ کے ذریعے جانتے ہوں اور بطن سے مراد وہ اسرار ہیں جن پر اللہ تعالیٰ عارفین اور ارباب باطن کو مطلع فرماتا ہے جو عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا کے آثار و مظاہر ہوتے ہیں اور لکل حد مطلع کا مفہوم یہ ہے کہ ہر حرف کے معانی اور حقائق کا ایک منتہی ہوتا ہے جو بھی اللہ ارادہ فرمائے۔ اور یہی وہ اسرار اور حقائق ہیں جن کے بارہ میں فرمایا گیا۔ هُوَالَّذِیْ

لہ بحوالہ الاتقان ج ۲

"لا تنقضی عجائبہ" کہ قرآن اللہ کا وہ کلام ہے جس کے عجائب اور لطائف کبھی ختم نہیں ہوں گے۔

الغرض مدلول قرآنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی تفسیر سے مقرر اور متعین ہے جس میں ادنیٰ تغیر و تبدل کا امکان نہیں۔ اسی مدلول قطعی اور طے شدہ مفہوم پر تمام احکام شریعت کا دارو مدار ہے۔ اب اس کے بعد جو باطنی معارف اور اسرار و لطائف ہیں ان کی کوئی حد و انتہاء نہیں۔ شیخ تاج الدین بن عطاء اللہ بھی کتاب لطائف المنن میں فرماتے ہیں کہ عارفین و صوفیاء کے بیان کردہ اسرار و رموز کلام اللہ کے اس مفہوم کو ذرہ برابر بھی متغیر نہیں کرتے جو اصول شریعت، اور آنحضرت کی تفسیر سے طے ہے۔ یہ غرائب و لطائف محض تفہیم غیبی ہوتے ہیں، جو بطور علم لدنی ارباب باطن پر منکشف ہوتے ہیں۔

علامہ سید محمود آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں ارباب باطن کے ان لطائف و معارف کے بیان کا خاص اہتمام کیا ہے اور اکثر آیات کی تفسیر و تشریح اور فقہی احکام کے بیان کے بعد" ومن باب الاشارۃ" عنوان قائم کر کے ایسے لطائف بیان کرتے ہیں۔ کہیں کہیں قاضی بیضاوی بھی ایسے عارفانہ نکات بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ آیت " اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ" الخ کی تشریح و تفسیر اور ظاہری اصول و قواعد سے جو مراد ہے اس کے ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

ولعلہ سبحانہ وتعالیٰ اراد من	اور شاید یہ کہ حق تعالیٰ شانہ نے آیت اخیرہ
الآیۃ الاخیرۃ مع مادل علیہ	(یعنی اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا)
الظاھر وسیق الکلام فیہ	سے اس مدلول کے باوجود جس پر ظاہر کلام
اشارۃ الی تفصیل خلق الانسان	دلالت کر رہا ہے اور جس مقصد کے لیے کلام
وما افاض علیہ من المعانی	جاری کیا گیا، ارادہ کیا ہے اشارہ فرمانے کا

ملاحظہ ہو مفتاح السعادۃ ج ۲ ص ۴۲۲

والصفات على طريقة التمثيل فمثل البدن بالارض والنفس بالسماء والعقل بالماء وما افاض عليه من الفضائل العملية والنظرية المحصلة بواسطة استعمال العقل للحواس وَ ازدواج القوى النفسانية والبدنية بالثمرات المتولدة من ازدواج القوى السماوية الفاعلية والارضية المنفعلة بقدرة الفاعل المختار. فانّ لكلّ آية ظهر وبطن ولكل حد مطلع.	تخلیق انسان اور اس پر فائض کردہ اوصاف و معانی اور اس کے فضائل عملیہ اور نظریہ کی تفصیل کا بطور تمثیل و تشبیہ تو بدن انسانی کو تشبیہ دی گئی ارض (زمین) ہے۔ اور اس کے نفس کو سماء یعنی آسمان سے اور عقل کو ماء یعنی پانی سے اور انسان کو عطا کردہ فضائل عملیہ اور کمالات نظریہ کو جو حواس کے لیے استعمال عقل کے توسط سے، اور قوائے نفسانیہ و قوائے بدنیہ کے امتزاج و اختلاط سے حاصل ہوتے ہیں، کو ان ثمرات سے تعبیر فرمایا جو آسمان (بارش) کی قوت فاعلیہ اور زمین کی قوت منفعلہ (قابلیہ) کے امتزاج و اختلاط کی وجہ سے فاعل مختار (یعنی رب العالمین) کی قدرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اشارہ (ان امور کی جانب) اس وجہ سے (معلوم ہوتا) ہے کہ ہر آیت کے واسطے ایک ظہر ہے اور ایک بطن (یعنی ظاہری مفہوم ہے اور باطنی رمز و اشارہ بھی) اور ہر حکم کے واسطے ایک اطلاع کا مقام ہے۔

بہرحال اس طرح عارفانہ لطائف و اشارات کا آیات کلام اللہ سے عارفین استنباط کرتے ہیں اور یہ استنباط ایسا ہی ہوتا ہے جیسے شعر ؎

چشم بکشا زلف بشکن اے یار من ‌ ‌ ‌ بہر تسکین دل بریان من

سے حضرت علیؓ کا نام علی اخذ کیا گیا۔

اس طرح سے کہ لفظ چشم بکشا یعنی آنکھ کھول کا عربی میں ترجمہ افتح العین ہوگا اور لفظ افتح فتح (زبر) دینے کو بھی کہا جا سکتا ہے تو گویا اشارہ ہُوا ع کو فتح دو اور زلف کو شعراء لام سے تعبیر کرتے ہیں اور بشکن یعنی توڑ کا عربی میں ترجمہ اکْسِرْ سے ہوگا تو گویا یہ کہا گیا اکسر اللام اور اس سے اشارۃً سمجھا جا سکتا ہے کہ لام کو کسرہ دے۔ "بہرِ تسکین دل بریانِ من" میں بریان کا دل یعنی درمیانہ حرف ی ہے اور تسکین کے معنی ساکن کر دینے کے بھی ہوتے ہیں، تو گویا یہ اشارہ ہوا کہ یؔ ساکن کر دو۔ تو اس طرح عین مفتوح اور لؔ مکسور اور یاء ساکن سے عَلِیْ نام ظاہر ہُوا۔ تو اس شعر کے لفظی اور قانونی مراد کے ساتھ بطور رمز جس طرح علی نام اخذ لیا گیا اسی طرح آیات کے اس مدلول و مفہوم کو جو اصولِ شریعت اور قواعد عربیہ سے ملے ہے ملحوظ رکھتے ہوئے یہ عارفانہ نکات اور اشارات ذکر کیے جا سکتے ہیں۔

طبقاتِ مفسّرین

(طبقۂ اوّل)

اُمت کا اس بات پر اجماع و اتفاق ہے کہ اصل شارح قرآن اور مفسر وحی خداوندی یعنی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ اقدس کے بعد مفسّرین کے طبقات میں سب سے اوّل اور اعلیٰ طبقہ حضرات صحابہؓ کا ہے۔ اس لیے کہ یہی حضرات اُمت میں سب سے زائد برگزیدہ علم و فہم میں اعلیٰ اور زہد و ورع میں کامل تھے یہی حضرات وحی الٰہی کے مخاطب تھے۔ جبریلؑ انہی کے سامنے وحی لے کر آتے تھے اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم ان کو آیاتِ قرآن پڑھاتے، اس کے معانی و مطالب اور مقاصد سمجھاتے تھے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے فیض صحبت سے ان کے قلوب منور تھے۔ استعداد و قابلیت پیدا ہو گئی تھی۔ قرآن کریم کے اسرار و معارف اور رموز و نکات سمجھ سکیں اور سمجھا سکیں اس لیے ظاہر ہے کہ ان سے زائد قرآن کریم کا سمجھنے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ اگرچہ اس طبقہ میں بالعموم تمام حضرات صحابہؓ شمار کیے جاتے ہیں کیونکہ ان اوصاف و کمالات میں سب ہی شریک تھے لیکن اذہان اور قابلیتوں کا تفاوت جیسے ہر طبقہ میں اور جماعت میں ہوتا ہے۔ اسی طرح سے خداوند عالم نے حضرات صحابہؓ میں باطنی انوار و کمالات اور علوم و معارف میں کسی کو کسی پر بلندی بخشی تھی۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کی طرح تو حضرات صحابہؓ کے درمیان فنِ تفسیر میں امتیاز اور علی الاطلاق فوقیت رکھنے والے یہ دس حضرات شمار کیے گئے ہیں:

خلفاء اربعہ : (۱) ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

(۲) عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ

(۳) عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

(۴) علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

ان کے بعد عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ
ابی بن کعب رضی اللہ عنہ۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ۔ ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ
عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ۔

خلفاء راشدین میں تفسیری روایات خاص طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کثرت کے ساتھ منقول ہیں۔ ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم سے تفسیری روایات نسبتہً کم ہیں۔

ابوالطفیل سے روایت ہے، بیان فرمایا" میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر تھا، وہ خطبہ دے رہے تھے دوران خطبہ فرمانے لگے :

سلونی فواللہ لا تسألونی عن شیئ الا انبئتکم بہ وسلونی عن کتاب اللہ فواللہ ما من آیۃ الا وانا اعلم أبلیل نزلت ام بنھار فی سھل ام فی جبل[1]

اے لوگو! مجھ سے دریافت کرو (احکام دین) خدا کی قسم جو بھی کوئی چیز (احکام دین میں سے) تم مجھ سے دریافت کروگے میں تمہیں بتادوں گا۔ اور پوچھو تو تم مجھ سے کتاب اللہ میں سے جو چاہو۔ خدا کی قسم کوئی بھی آیت قرآن کی ایسی نہیں ہے کہ میں اس کے بارہ میں بہ نہ جانتا ہوں کہ وہ کہاں نازل ہوئی وہ رات میں اتری ہے یا دن میں نرم اور ہموار میدان میں یا پہاڑوں میں۔

اور فرمایا کرتے یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ کس جگہ آئی اور کس شخص یا کس واقعہ کے متعلق ہے

[1] الاتقان ج ۲ صفحہ

خدا نے مجھے ایک سمجھ دار قلب اور تحقیق کرنے والی زبان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے عطا فرمائی ہے۔

ابن ابی حجرہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا کرتے تھے۔ اگر میں چاہوں تو سورہ فاتحہ کی تفسیر ہی سے ستر اونٹ لاد دوں[1]

---

[1] سطحی نظر سے اس لفظ پر ممکن ہے کہ کسی کو تامل ہو لیکن جب اس کی نظر سورۂ فاتحہ کے ان علوم و حقائق پر پڑے گی جن پر یہ سورت مشتمل ہے تو وہ سمجھ لے گا کہ یہ کلمہ عین حقیقت ہے۔ اجمالاً بطور مثال دیکھ لیجیے کہ آیت الحمد للہ رب العالمین کی شرح محتاج ہے حمد کے بیان معنی اور اللہ رب العزت کے اسم جلال کی تحقیق اور اس کی تقدیس و تنزیہ کی۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ عالم کا مفہوم بیان کیا جائے اور اللہ نے جتنے عالم پیدا کیے ہیں ان میں سے جو ہمارے احاطہ علم میں آچکے ہیں ان کو واضح کیا جائے۔ حضرات مفسرین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ چار سو عالم خشکی میں ہیں اور چھ سو عالم سمندر میں اور ان کا ذکر مقتضی ہے کہ ان میں بسنے والی مخلوقات اور ان کے کچھ احوال و صفات سے بھی مخاطبین کو متعارف کرایا جائے۔ الرحمن الرحیم کی تشریح میں حق تعالیٰ کے اسماء ذاتی و صفاتی کا بھی ذکر ضروری ہوگا۔ ان کی شرح بھی کی جائے گی۔ اسماء حسنیٰ حق تعالیٰ کی صفات جمالیہ اور جلالیہ کا عنوان ہیں تو ان صفات پر بھی کلام کرنا ہوگا اور پھر یہ بھی کہ ان عنوانات یعنی اسماء حسنیٰ کا ذات خداوندی کے ساتھ کس طرح اختصاص ہے

اس آیت سے متعلقہ ان مضامین کی تحقیق کے بعد مالک یوم الدین کی تفسیر میں قیامت اور قیامت کے احوال اور اهوال کی تفصیل بھی ضروری ہو گی۔ ایاک نعبد وایاک نستعین میں عبادت و استعانت کا مفہوم ان کے انواع و اقسام اور جملہ تفاصیل کا ذکر بھی ہوگا۔ اسی طرح اھدنا الصراط المستقیم" میں ہدایت کا مفہوم اس کے اقسام اور درجات کا بیان ہوگا۔ اس کے بعد آخری آیت میں منعمین کا راستہ انعام اور ضلال و غضب کی تحقیق ہوگی۔ اہل انعام اور اہل غضب و ضلال کے احوال اور اسباب نعمت اور غضب کا بیان ہوگا۔ غرض یہ عنوانات و مضامین ہوں اور ان پر تحقیق و تفسیر کرنے والے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خلفاء راشدین کے بعد صحابہؓ میں سب سے فائق حضرت عبد اللہ بن عباسؓ ہیں جن کو حَبرُ الامۃ اور ترجمان قرآن کے عنوان ولقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فوقیت و برتری ان کو حاصل ہونی ہی چاہیے تھی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے آپ کے حق میں یہ کلمات دعائیہ جاری ہو چکے تھے۔ اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ وَالتَّاوِیْلَ۔ علوم قرآن میں فائق ہونے کی کھلی شہادت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے خود ابن عباس نقل کیا کرتے تھے فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے بارے میں ارشاد فرمایا ہے "نِعْمَ تَرْجُمَانُ الْقُرْاٰنِ اَنْتَ" کہ اے ابن عباس تم بہترین ترجمان ومفسر ہو قرآن کریم کے۔

صاحب جوہر الحسان کا قول ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ صحابہؓ کے درمیان یعنی بعد خلفاء ثلثہ صدر المفسرین حضرت علیؓ ہیں اور ان کے بعد عبد اللہ بن عباس رضا کا درجہ ہے۔ عبد اللہ بن مسعودؓ سے بھی ابن عباسؓ کے بارہ میں یہ منقول ہے کہ وہ بہترین مفسر قرآن ہیں۔

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اپنے اس علمی تفوق وبرتری کے باعث عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مجلس بہت بلند مقام رکھتے تھے حتیٰ کہ ایسے معمر صحابہ پر بھی فاروق اعظمؓ ابن عباس کو فوقیت دیتے تھے جن کی اولاد خود ابن عباسؓ کے برابر تھی۔ بعض بزرگ ومعمر صحابہؓ کو جب اس امر کا احساس ہوا تو ایک بار عمر فاروقؓ کی خدمت میں اس کا اظہار کیا۔ فاروق اعظمؓ نے ابن عباسؓ کی علمی فضیلت اور برتری ان سب پر واضح کرنے کی غرض سے سورۃ اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ" کی تفسیر حاضرین مجلس سے دریافت کی۔ بہت سوں نے تو سکوت اختیار کیا۔ کسی نے صرف ظاہری اور لفظی مراد بیان کرنے پر اکتفا کیا، کہ حق تعالیٰ نے اپنی فتح ونصرت کی بشارت سنائی ہے اور اس پر حمد وثنا، اور

(بقیہ حاشیہ) حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہوں تو سوچیے تحقیق وتشریح کا ذخیرہ کہاں تک پہنچا ہوگا۔

پاکی بیان کرنے کا حکم دیا ہے اور توبہ و استغفار کی طرف اپنے پیغمبر کو متوجہ کیا ہے۔ سب سے آخر میں جب اس کی تفسیر ابن عباسؓ سے دریافت کی گئی تو جواب دیا کہ یہ سورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر وفات ہے۔ عمر فاروقؓ نے ابن عباسؓ کی اس علمی بصیرت اور تفسیر کلام اللہ میں ان کی مہارت و فوقیت کو حاضرین مجلس کے سامنے ظاہر کرتے ہوئے فرمایا۔ بس یہی امر اس نو عمر کی تم سب پر برتری اور فضیلت کا سبب ہے۔

ابن ابی ملیکہ عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں فرمایا کہ ایک روز عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مجلس میں اپنے رفقاء اور اصحابؓ سے دریافت کیا کہ آپ لوگ آیت اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ کی . . . مراد کیا سمجھتے ہو۔ لوگوں نے کہا اللہ اعلم۔

عمر فاروقؓ قدرے گرانی کے ساتھ فرمانے لگے یا تو یہ کہو کہ ہم نہیں جانتے یا کہو کہ ہم جانتے ہیں۔ ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں، میں نے عرض کیا اے امیرالمومنین میرے خیال میں اس آیت کے کچھ اور معنی ہیں۔ فرمایا اے عزیز بھتیجے کہو اپنے کو حقیر نہ خیال کرو۔ ابن عباسؓ نے کہا یہ آیت انسان کے عمل کی ایک مثال بیان کی گئی ہے۔ فاروق اعظمؓ نے فرمایا کس قسم کے عمل کی؟ اس پر ابن عباسؓ نے وضاحت کی کہ یہ اس تونگر و مال دار انسان کے عمل کی مثال ہے جو ایک عرصہ تک اللہ کی اطاعت و بندگی میں لگا رہا پھر اس پر شیطان مسلط ہو گیا اور معصیتوں میں اس نے اپنے تمام اعمال حبط اور برباد کر دیئے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف تفسیر کے متعدد مجموعے منسوب ہیں۔ تمام اسانید زائد معتبر سند تفاسیر ابن عباس کے لیے علی بن طلحہؒ، الہاشمی کی ہے احمد بن حنبلؒ سے منقول ہے کہ ان کی سند تفسیر ابن عباسؓ کا ایک صحیفہ مصر میں موجود تھا۔

لے الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ ۔

حافظ ابن حجرؒ کا بیان ہے کہ مصر میں یہ نسخہ ابوصالح کاتب اللیث محدث کے پاس تھا جس کو وہ بروایت معاویہ بن صالح بواسطۂ ابوطلحہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے تھے ۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں ابوصالح کی روایت سے اسی مجموعہ پر اعتماد کرتے ہوئے ابن عباسؓ کی تفاسیر کو تعلیقات کے ساتھ روایت کیا ہے ۔ ابن جریر ابن ابی حاتم اور ابن ابی المنذر بھی متعدد وسائط کے ساتھ ابوصالح ہی کے سلسلہ سے ابن عباسؓ کی روایات تخریج کرتے ہیں[1]۔

بعض حفاظ محدثین کا خیال ہے کہ علی بن طلحہؓ کو براہ راست ابن عباسؓ سے سماع نہیں ہے بلکہ ابن عباسؓ اور اُن کے درمیان مجاہد یا سعید بن جبیر کا واسطہ ہے ۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ مجاہد اور سعید بن جبیر چونکہ ثقہ ہیں اور ائمۂ محدثین کے نزدیک قابل اعتبار ہستیاں ہیں اس وجہ سے کوئی حرج اور روایت میں کسی نوع کا ضعف نہیں شمار کیا جائے گا ۔

خلیل اپنی کتاب "الارشاد" میں بیان کرتے ہیں کہ ابوصالح کے شیخ معاویہ بن ابی صالح قاضی اندلس" کی روایت کو جو وہ اپنے شیخ علی بن ابی طلحہ سے اور وہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں اس کو بڑے بڑے مستند ائمہ اور محدثین نے معتبر مانا ہے باوجودیکہ حفاظ محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ علی بن ابی طلحہ نے خود ابن عباسؓ سے کچھ نہیں سُنا ہے ۔

مفسرین صحابہؓ میں عبداللہ بن عباسؓ کے بعد عبداللہ بن مسعودؓ کا درجہ ہے ۔ عبداللہ بن مسعودؓ کی فضیلت اور فن تفسیر میں ان کے بلند مقام کی شہادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مبارک ہے اے لوگو! تم قرآن ان چار آدمیوں سے سیکھو، جن میں ابن مسعودؓ کا نام سب سے مقدم ذکر فرمایا[2]۔

عبداللہ بن مسعودؓ کی تفسیری روایات کی تعداد حضرت علیؓ کی روایات سے

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ ۔

[2] بحوالہ البیان فی علوم القرآن صفحہ

زائد ہے ۔ ان کے بعد ابی بن کعبؓ ۔ زید بن ثابتؓ ۔ ابوموسیٰ اشعریؓ
اور عبداللہ بن زبیرؓ کا درجہ ہے ۔

شیخ جلال الدین سیوطیؒ کا بیان ہے کہ ابی بن کعبؓ سے بسند صحیح ایک بہت بڑا ذخیرہ تفسیر کا ثابت ہے جس کو ابوجعفر الرازی بروایت ربیع بن انس ابوالعالیہ سے نقل کرتے ہیں ۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اس کا بہت سا ذخیرہ روایت کیا ہے ۔ اسی طرح حاکم نے مستدرک میں اور امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں بھی ابی بن کعبؓ کی ان تفسیری روایات کو تخریج کیا ہے[1] ۔

ان حضرات صحابہؓ کے علاوہ اور بھی صحابہ سے روایات تفسیر منقول ہیں ، لیکن ان کی تعداد قلیل ہے ۔ اس وجہ سے بطور مجموعہ تفسیر ان روایات کو مورخین نے ذکر نہیں کیا ہے ۔ مثلاً انس بن مالکؓ ۔ ابوہریرہؓ جابر بن عبداللہؓ اور عبداللہ بن عمرو بن العاص ۔

ان حضرات اور اسی طرح عبداللہ بن عمرؓ سے بہت سی روایات قصص و واقعات امم ماضیہ ۔ احوال فتن اور احوال آخرت کے سلسلہ میں روایت کی گئی ہیں ۔ جن میں بعض احادیث و روایات سند کے لحاظ سے قابل اعتبار نہیں ۔ اور بعض روایات اہل کتاب سے منقول و ماثور واقعات پر مشتمل ہیں ۔ بہرکیف محدثین نے اسنادی مباحث سے فن تفسیر کی بھی جملہ روایات کی چھان بین کر کے صحیح اور غیر صحیح قوی اور ضعیف کو ممتاز و جدا کر دیا لہٰذا بعض کتب تفسیر میں ایسی ضعیف روایات کے مذکور ہو جانے سے قرآن کریم کی حقانیت اور علوم قرآن کی عظمت و بلندی پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ ۔

دوسرا طبقہ

مفسّرین میں دوسرا طبقہ تابعین کا ہے۔ یعنی وہ حضرات جن کو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ اور اُنھوں نے حضرات صحابہؓ سے علوم قرآن اور معارف شریعت سیکھے جیسے مجاہدؒ عکرمہؒ۔ عطاؒ بن ابی رباح طاؤس اور سعیدؒ بن جُبیر وغیرہم کہ یہ تمام ائمہ طبقہ تابعین میں تفسیری روایات کا مدار ہیں۔

حافظ ابن تیمیہؒ بیان کرتے ہیں کہ تفسیر میں سب سے زائد علم رکھنے والے لوگ اہل مکّہ ہیں کیونکہ اہلِ مکّہ بکثرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد ہیں اور عکرمہؒ تو اِن کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ اور کُل متاخرین مفسّرین کی کتابیں، انہی کی روایات سے بھری ہُوئی ہیں۔

کوفہ میں عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگردوں کی بہت بڑی جماعت، اور اور اہلِ مدینہ میں کبار صحابہؓ کے شاگردوں کی ایک جماعت مفسّرین کی تھی، اور ان کا فن تفسیر ہی میں اشتغال تھا، جیسے زید بن اسلم جن سے ان کے بیٹے عبدالرحمٰن بن زید اور انس بن مالک روایات کرتے ہیں۔

حسن بصریؒ عطاء بن ابی مسلم خراسانی۔ محمد بن کعب قرظی۔ ابوالعالیہ[۲] ضحاک بن مزاحم عطیہ عوفی اور قتادہ طبقہ تابعین میں فن تفسیر کے امام شمار کیے گئے ہیں۔ علوم قرآن اور تفسیر میں یہ حضرات جو کچھ کہا کرتے تھے وہ حضرات صحابہؓ سے ہی سُنا ہُوا ہوتا تھا۔[۱]

---

[۱] ملخص من الاتقان فی علوم القرآن، البیان فی علوم القرآن۔ [۲] ابوالعالیہ ریاحی بنو تمیم کے قبیلہ ریاح کی طرف منسوب ہیں۔ ابی بن کعبؓ کے شاگردوں میں سے تھے۔
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ائمہ متقدمین کی نقول سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات میں سب سے زائد فائق فن تفسیر میں مجاہد شمار کیے گئے ہیں۔

فضل بن میمون بیان کرتے ہیں، میں نے مجاہد سے یہ سنا فرماتے تھے کہ میں ابن عباس رضؓ کے روبرو قرآن کریم کو تیس بار پیش کیا، یعنی علوم و مضامین قرآن از اوّل تا آخر بالاستیعاب تیس مرتبہ ان سے پڑھے۔ ہر بار میں ان سے ہر آیت کا شان نزول اور یہ کہ وہ آیت کب نازل ہوئی دریافت کرتا تھا اور اس کی مراد و مفہوم کو ان سے سنتا۔

امام نووی رحؒ نے فرمایا جب کسی آیت کی تفسیر مجاہد سے منقول ہو تو بس وہ کافی ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ امام بخاریؒ اور اکثر ائمہ مجاہد ہی کی تفسیر پر اعتماد کرتے ہیں۔ سفیان ثوریؒ کا مقولہ ہے، قرآن کریم کی تفسیر ان چار شخصوں سے حاصل کرو، سعید بن جبیر مجاہدؒ، عکرمہ اور ضحاکؒ۔ قتادہ سے نقل کیا گیا کہ تابعین میں سب سے زائد اعلم چار شخص ہیں۔ عطاء بن ابی رباح مناسک (احکام حج) کے سب سے بڑے عالم ہیں اور سعید بن جبیر اعلم بالتفسیر ہیں اور عکرمہ اعلم بالسیر (مغازی) اور حسنؒ اعلم بالحلال والحرام ہیں۔ یعنی فقہ میں وہ اپنے دور میں سب پر فائق ہیں۔ شعبی کہا کرتے تھے کہ اس وقت روئے زمین پر عکرمہ سے بڑھ کر کوئی شخص کتاب اللہ کا عالم نہیں ہے۔ غرض ان حضرات ائمہ اور مفسرین کو اس طبقہ میں خاص فضیلت اور برتری حاصل تھی جو ان اقوال و نقول سے ظاہر ہے۔

ان کے بعد مفسرین کا وہ طبقہ شمار کیا جاتا ہے جو حضرات صحابہؓ اور تابعینؒ کے اقوال کو جمع کرنے والا ہے گویا فن تفسیر کی تدوین اور تہذیب و ترتیب کی تمام عمارت ان ہی بنیادوں پر

(بقیہ پچھلے صفحہ کا حاشیہ) ان کی وفات سنہ ۱۰۹ھ میں ہوئی۔ ضحاک بنو عبد مناف کے قبیلہ بنو ہلال سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ہلالی کے لقب سے معروف ہیں۔ سنہ ۱۰۲ھ میں وفات پائی۔

(تیسرا طبقہ)

مفسّرین کا یہ وہ طبقہ ہے جس نے حضرات صحابہؓ اور تابعین کے علوم جمع کیے۔ اور اسی طبقہ سے باضابطہ کتب تفسیر کی تصنیف و تالیف کا دور شروع ہُوا اور کثرت کے ساتھ بکثرت تفاسیر لکھی گئیں۔ سفیانؒ بن عیینہ، وکیعؒ بن الجراح اور شعبہؒ جیسے حضرات اسی دور کے امام ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ اس طبقہ میں جن ائمہ مفسّرین نے تفاسیر لکھیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

تفسیر یزید بن ہارون۔ تفسیر عبد الرزاق۔ تفسیر آدم بن ابی ایاس۔ تفسیر اسحٰق بن راہویہ۔ تفسیر رُوح بن عبادہ۔ تفسیر عبد بن حمید۔ تفسیر سعید۔ تفسیر ابوبکر بن ابی شیبہ[1]، یہ سب اس دور کے ائمہ اور مفسّرین میں اعلیٰ طبقہ میں شمار کیے جانے والے مفسّرین ہیں۔ اسی طبقہ میں ابن جُریج سُدّی[2] ابن قتیبہ ابو محمد عبد اللہ بن مسلم دینوری، صاحب مشکل القرآن، و غریب القرآن ہیں۔ کلبی[3] کا شمار بھی مؤرخین اسی طبقہ کے مفسّرین میں کرتے ہیں۔ مگر روایات

---

[1] ابوبکر بن ابی شیبہ مشہور محدث اور امام ہیں۔ مسند ابن ابی شیبہ کے نام سے ان کی کتاب مشہور ہے۔ ۲۲۰ھ میں وفات پائی۔ تفسیر کے موضوع پر کتاب فضائل القرآن تصنیف کی۔

[2] سُدّی نام اسماعیل بن عبد الرحمٰن ہے شعبہ اور سُفیان ثوری کے شاگردوں میں سے ہیں۔ سدہ عربی لغت میں چبوترہ کو کہا جاتا ہے یہ جامع مسجد کوفہ کے چبوترہ پر بیٹھ کر درس حدیث و تفسیر دیا کرتے تھے اس وجہ سے ان کا لقب سُدّی مشہور ہوگیا۔ فن تفسیر و حدیث کے امام تھے ان کی وفات ۱۲۷ھ میں ہوئی۔ (البیان فی علوم القرآن)۔

[3] کلبی قبیلہ کلب کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے کہا جاتا ہے ان کا نام ابو النصر محمد بن سائب ہے کوفہ کے رہنے والے ہیں، اور سفیان و محمد بن اسحاق کے شاگردوں میں شمار کیے گئے ہیں۔ ۱۴۶ھ میں وفات پائی۔ ۱۲

تفسیر میں یہ احتیاط نہیں برتتے تھے بکثرت ضعیف حتیٰ کہ موضوع روایات بھی تخریج کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ائمہ اور محققین کے نزدیک ان کی تفاسیر مستند اور معتمد نہیں شمار کی جاتیں۔ اسی زمانہ میں ایک شخص مقاتل بن سلیمان بھی گزرا ہے۔ بعض مورخین اور ائمہ رجال نے اس کو شیعی شمار کیا ہے۔

(چوتھا طبقہ)

تیسرے طبقہ کی مفسرین نے باقاعدہ فنِ تفسیر میں سلسلۂ تصنیف و تالیف شروع کر دیا تھا اور بہت سے ائمہ نے اس موضوع پر کتابیں تصنیف کیں مگر ہر کام کے آغاز میں جس طرح کچھ نہ کچھ خامی اور کمی رہ جاتی ہے ایسے ہی اس دور کی تصانیف میں یہ خامی واقع ہوگئی کہ ذخیرۂ تفاسیر میں ضعیف روایات اور غیر مستند نقول بلکہ کچھ موضوع احادیث بھی شامل ہوگئیں۔ اس بنا پر طبقہ چہارم کے مفسرین قدرے تنقیح و تحقیق کے معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے تفسیر کلام اللہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اگرچہ اسنادی حیثیت سے ان حضرات کا معیار تنقیح وہ نہ تھا جو امام بخاری اور مسلم نے اپنی کتابوں میں اختیار کیا تاہم متقدمین کی نسبت بہت کچھ صحت روایات کا اہتمام کیا۔ اس کے ساتھ تفسیر میں وجوہ اعراب اور احکام و مسائل کے استنباط کو بھی مدنظر رکھا۔ اس دور کی تفاسیر میں سب سے زائد معروف و مشہور اور عظیم المرتبہ تفسیر ابن جریر طبری متوفی سنہ ۳۱۰ھ کی تفسیر ہے۔ شیخ جلال الدین سیوطی رح ان کی تفسیر کے بارہ میں فرماتے ہیں۔ ان کی کتاب اعظم التفاسیر اور نہایت بلند پایہ اور نافع تفسیر ہے[1]۔ اور اس طبقہ کے دیگر مفسرین مثلاً ابن ابی حاتم[2]۔ ابن ماجہ، حاکم ابن مردویہ ابوالشیخ

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج ۲۔

[2] کتاب الاشارات اور شفاء الصدور ابن ابی حاتم کی تالیف کردہ تفاسیر ہیں۔ اسی طبقہ میں ایک کتاب تفسیر لباب القرآن بھی تصنیف کی گئی ۱۲۔ (البیان فی علوم القرآن)

ابن حبان اور ابن المنذر کی تفاسیر ابن جریر طبری کی تفسیر کے بعد درجہ رکھتی ہیں، کیونکہ ان حضرات نے صرف نقول جمع کرنے پر کفایت کی اور ابن جریر طبری احادیث اور اقوال صحابہ و تابعین جمع کرنے کے ساتھ ترجیح اقوال کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ وجوہ اعراب کا بھی ان کی کتاب میں ذکر ہے۔ حل لغات اور لطائف عربیہ کے بیان کے ساتھ احکام و مسائل کا استنباط بھی ہے۔ اس وجہ سے ابن جریر کی تفسیر اپنے دور کے تمام ائمہ پر فوقیت رکھتی ہے۔

اس قرن کے بعد آنے والے مفسرین نے بھی ان کی تفسیر کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا امام نوویؒ نے فرمایا تفسیر ابن جریر طبریؒ کی دنیا میں کوئی مثال نہیں ابن جریر طبریؒ قرن ثالث کے یہ بلند پایہ امام ہیں جن کی تفسیر علماء اور ائمہ فن کے نزدیک مقبول و مستند ہے۔ ابن جریر طبری نام کا ایک اور شخص بھی گزرا ہے، جو فرقہ کرامیہ اور شیعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ بعض حضرات کو نام کے اشتراک سے دھوکہ اور التباس ہو جاتا ہے۔

اس طبقہ میں تشریح الفاظ کے موضوع پر تصنیف کی جانے والی کتاب، کتاب الاشارات ابن ابی حاتم الفاظ قرآن کی تشریح و تحقیق بنیادی درجہ رکھتی ہے۔

مضامین و معانی قرآن کی توضیح و تفصیل کتاب الواب القرآن یہی حیثیت رکھتی ہے۔

(پانچواں طبقہ)

اس دور میں کتب تفسیر کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بہت وسیع ہو گیا اور متقدمین نے تفسیری روایات کا جو ذخیرہ جمع کیا تھا اس کی تہذیب و تنقیح کی طرف اس طبقہ کے ائمہ متوجہ ہوئے اور اسانید حذف کر کے صحابہ اور تابعین کی جانب اقوال تفسیر کی نسبت کی اور بعض نے مضامین قرآن کی تشریح و تفصیل کا

معیار بنایا۔ امام ابو محمد عبداللہ جوینی جو امام الحرمین کے والد تھے جن کی وفات ۴۳۸ھ میں ہوئی۔ شیخ ابوالقاسم عبدالکریم قشیری متوفی ۴۶۵ھ اور شیخ ابوالحسن واحدی نیشاپوری متوفی ۴۶۸ھ طبقہ خامسہ کے ممتاز اور نمایاں ائمہ مفسرین میں ہیں۔

اس طبقہ میں بعض لوگ اہل حق اور اہل سنت کے مسلک سے خارج بلکہ ایسے بھی تھے جن پر تشیع اور رفض کا اثر تھا۔ اُنہوں نے کچھ تفاسیر لکھیں جن میں رطب ویابس موضوع وغیر مستند روایات کو جمع کیا جیسے ابواسحاق احمد ثعلبی، ان کی طرف بہت بڑی تفسیر منسوب ہے لیکن تمام کتاب جھوٹے قصوں اور موضوع روایات سے بھری ہوئی ہے۔ مرتضیٰ علم الہدیٰ شیعی نے اپنی تفسیر الدرر والغرر میں شمار کیا ہے اس کا انتقال ۴۳۶ھ میں ہوا۔ اسی طرح ایک کتاب ابو عبدالرحمن محمد بن حسین سلمی کی ہے۔ اس میں بھی بے اصل روایات اور لغو و مہمل نقول کو جمع کیا ہے۔ تو اس قسم کے لوگوں کی کتابیں اہل علم کے نزدیک کسی درجہ میں بھی قابل اعتبار نہیں ہیں۔

چھٹا طبقہ

اس طبقہ کے مفسرین سے وہ متاخرین مراد ہیں جو چھٹی صدی ہجری میں گزرے ہیں۔ گذشتہ پانچ طبقات کے مفسرین کا غالب طرز تو یہی رہا کہ وہ اپنی کتابوں میں بالعموم آثار و روایات ہی کو جمع کرتے تھے اور احادیث کے مضامین ہی پر تشریح آیات اور تفسیر مضامین دائر ہوتی تھی لیکن ان کے بعد اس طبقہ کے حضرات مفسرین نے اپنی تفاسیر متعدد حیثیات کا لحاظ فرماتے ہوئے تفسیر قرآن کی طرف توجہ کی۔ کسی نے اپنا مطمح نظر علوم نحو و صرف اور قواعد عربیہ کو بنا کر تفسیر کی جیسے شیخ نورالدین ابوالحسن علی بن الحسین باقولی متوفی ۵۴۳ھ اس موضوع پر ان کی تصنیف کتاب الکشف ہے۔ کسی نے فقہی احکام و مسائل کے استنباط اور ان کی دلائل کے ذریعے تائید و تثبیت کو مدنظر رکھتے ہوئے تفسیر کی

کسی نے متکلمانہ اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے فلاسفہ کے اصول و مسائل اور ادران کے دلائل کا ردّ کیا جن کے ذریعے وہ اصول دین پر معترض ہوتے ہیں۔ عارفین و صوفیاء نے سلوک و تصوف کے مسائل اور عارفانہ اسرار و نکات کو مقصد ٹھیرایا اور اپنی تفاسیر انہی امور پر دائر رکھیں۔ کسی نے فصاحت و بلاغت کے قواعد کے پیش نظر قرآن کریم کے معجزانہ نکات اور دلائل اعجاز کا بیان اپنی تصانیف کا موضوع بنایا اور اسی نوع کے مضامین اپنی تفاسیر میں جمع کیے جیسے امام ابوالقاسم محمد بن عمر زمخشری متوفی ۵۳۸ھ کی کتاب تفسیر کشاف ہے۔ انہی کو جاراللہ زمخشری بھی کہتے ہیں۔ یہ کتاب لطائف عربیہ اور فصاحت و بلاغت کے نکات میں بعد میں آنے والے تمام مفسرین کے واسطے بنیاد ہے۔ سب کشاف ہی سے ان اسرار و لطائف بلاغت کو اخذ کرتے ہیں۔

قاضی بیضاوی نے خاص طور پر اپنی تفسیر[1] میں فصاحت و بلاغت کے لطائف زمخشری کی تفسیر کشاف ہی سے لیے ہیں۔ علامہ زمخشری حنفی المسلک لیکن اعتزال کی جانب مائل تھے۔ اسی وجہ سے بعض باتیں قاضی بیضاوی کی تفسیر میں اس قسم کی آگئی ہیں۔ اسی طبقہ میں امام ابوحامد محمد بن محمدؒ الغزالی متوفی ۵۰۵ھ بھی ہیں۔ جواہر القرآن اور یاقوت التاویل امامؒ ہی کی تصانیف میں سے ہیں۔ یہ وہی امام غزالیؒ ہیں جن کی تصوف و اسرار شریعت پر مشہور و معروف کتاب احیاء علوم الدین ہے۔

امام ابومحمد حسین بن محمود بغوی بھی اسی طبقہ کے مفسرین میں سے ہیں جن کی تفسیر معالم التنزیل اہل علم کے درمیان معروف اور بلند پایہ تفسیر ہے[2]۔

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن، البیان مقدمہ تفسیر حقانی۔

[2] تفسیر بیضاوی بھی نہایت مخدوم کتاب ہے۔ متقدمین و متاخرین اس پر شروح و حواشی تالیف فرماتے ہیں۔ شیخ محی الدین محمد بن الشیخ مصلح الدین قونوی متوفی ۹۵۱ھ کا حاشیہ جو نو ضخیم ترین جلدوں پر مشتمل ہے ــــــ علامہ ابن التجید مصلح الدین استاذ سلطان محمد

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مفسرین کے اس طبقہ میں علوم نحو وصرف و قواعد عربیہ کو موضوع بنا کر تفسیر کرنے والوں کی تعداد خاص طور پر زائد ہے۔ چنانچہ امام ابوحیان کی کتاب البحر اور ان کے شاگرد شہاب الدین احمد بن یوسف الحلبی کی کتاب "الدر المصنون فی علم الکتاب المکنون" اسی نوع کی تفسیر ہے۔ اسی موضوع پر ابراہیم محمد سفاقسی ۷۴۲ھ جو بعد کے طبقہ کے ہیں کی کتاب المجید ہے اور امام ابوالبقاء عسکری النحوی متوفی ۶۱۶ھ کی کتاب البیان اور امام ابوالحسن علی بن ابراہیم حوفی متوفی ۵۶۲ھ کی تفسیر دس جلدوں میں ہے اور شیخ مکی بن ابی طالب حموشی بن محمد قیسی متوفی ۴۳۷ھ کی کتاب بالخصوص آیات مشکلہ کے اعراب میں ہے۔ متقدمین کے دور میں بھی اعراب قرآن پر بہت سی کتابیں تصنیف کی گئی تھیں۔ اسی طرح احکام قرآن پر بھی متقدمین کی تفاسیر ملتی ہیں، جیسے تفسیر امام شافعیؒ شیخ ابوالحسن علی بن حجر سعودی متوفی ۲۲۴ھ۔ شیخ ابوجعفر احمد بن محمد الطحاویؒ متوفی ۳۲۱ھ قاضی ابو اسحاق اسماعیل ازدی متوفی ۲۸۲ھ۔ شیخ ابوالحسن علی بن موسوی ۳۰۵ھ۔ شیخ ابوبکر احمد بن حسین بیہقی م ۴۵۸ھ اور شیخ ابوبکر احمد بن محمد جصاص رازی حنفی متوفی ۳۷۰ھ۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) فاتح قسطنطنیہ کا حاشیہ جو تین جلدوں میں ہے۔ قاضی زکریا انصاریؒ کا ایک حاشیہ ہے۔ شیخ جلال الدین سیوطیؒ کا حاشیہ قواعد الابکار وشواہد الافکار۔ شمس الدین محمد بن یوسف کرمانی متوفی ۹۸۶ھ کا حاشیہ۔

شیخ شہاب الدین خفاجیؒ کا عظیم المرتبہ حاشیہ جو آٹھ جلدوں میں ہے ۔۔۔ ملا عوض متوفی ۹۹۴ھ کا حاشیہ جو تیس ضخیم جلدوں میں ہے۔ اسی طرح اور متعدد حواشی و شروح کا علماء اور مؤرخین نے ذکر کیا ہے ۔۔۔ ان متقدمین ائمہ کے حواشی و شروح کے ساتھ تفسیر بیضاوی پر ناچیز کے والد محترم شیخ المحدثین والمفسرین حضرت العلامہ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ شارح مشکوٰۃ المصابیح کی ایک مبسوط و بلندپایہ شرح الفتح السماوی ہے جو ہنوز طبع نہیں ہو سکی۔ خدا تعالیٰ جلد اہل علم کو اس شرح سے مستفیض ہونے کا موقعہ عطا فرمائے۔ آمین۔

شیخ جصاص کی تفسیر احکام القرآن فقہ حنفی پر نہایت بلند پایہ اور محققانہ تفسیر ہے جس میں کتاب وسنت کے دلائل کے ساتھ مسائل فقہ حنفی پر کلام کیا گیا ہے۔

اسباب نزول کے موضوع پر بھی اس دور میں بہت سے مفسرین نے تفاسیر لکھیں اور ان کی تفاسیر کا ماخذ متقدمین میں شیخ المحدثین علی بن المدینی م ۲۳۴ھ شیخ ابوالحسن علی بن احمد واحدی م ۴۶۸ھ اور ابن الجوزی وغیرہ ہیں[1]۔

ساتواں طبقہ

ساتویں صدی ہجری کے ائمہ اور مفسرین اس طبقہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اس طبقہ کے ممتاز و نمایاں اور قابل فخر اماموں میں امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ ہیں جن کی تفسیر "مفاتیح الغیب" جو "تفسیر کبیر" کے نام سے معروف ہے علوم عقلیہ اور معارف و حکم کا ایک عظیم الشان خزانہ اور بہترین ذخیرہ ہے گو بعض علماء کی طرف سے ان کی مزاجی اور ذوقی خصوصیات کی بنا پر ایک کلمہ تنقید بھی نقل کیا گیا لیکن بنظر غور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کلام اللہ کی نہ صرف تفسیر بلکہ اسرار و لطائف سے کتاب لبریز ہے۔ اصول دین کی تحقیق میں بے نظیر تفسیر ہے۔ شاید ہی امت میں کسی اور کی کتاب اس کے ہم پلہ ہو۔ فلاسفہ اور ملحدین کا دلائل عقلیہ اور اصول کلام سے خوب رد کیا ہے۔

اثبات الوہیت و ربوبیت اور خداوند عالم کی خالقیت کے دلائل کے ایسے گرانقدر مباحث ہیں کہ ان کی برتری اور عظمت کو ظاہر کر دینے کے لیے بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ امام رازیؒ کا امت مسلمہ پر یہ ایک ایسا احسان ہے کہ جس کا بدلہ صرف حق تعالیٰ کی رحمتیں اور عنایتیں ہی ادا کر سکتی ہیں۔ استاذ الاساتذ حضرت الشیخ مولانا سید انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ کا یہ کلمہ میں نے اپنے بزرگوں سے

---

[1] مقدمہ احکام القرآن قرطبی - الاتقان فی علوم القرآن - البیان فی علوم القرآن مقدمہ ابن عطیہ

سنا، فرمایا کرتے تھے کہ تفسیر کبیر کے بارے میں بعض ناقدین کا یہ کہنا "فیہ کل شیئ الا التفسیر" (یعنی اس کتاب میں سب کچھ ہے سوائے تفسیر قرآن کے) اس بلند پایہ تفسیر کو اس کے مرتبہ سے گرانا ہے۔

دراصل بعض لوگوں کو تفسیر کبیر میں ایسے بعض مباحث اور مسائل و دلائل کو دیکھ کر جو فلاسفہ کے رد میں ضمناً ذکر کیے گئے، یہ خیال ہوا کہ بظاہر یہ مباحث تفسیر کے موضوع سے خارج ہیں، حالانکہ خود قرآنی دلائل کا بہت سا ذخیرہ اسی نوع کے مباحث پر مشتمل ہے۔ امام رحمۃ اللہ نے صرف انہی دلائل قرآنیہ کی تحقیق و تثبیت فرمائی۔ اسی طبقہ میں امام محمد بن ابی بکر الرازی متوفی ۶۰۶ھ بھی ہیں جن کی تفسیر لغات قرآن کے موضوع پر ہے۔ قاضی ناصر الدین بیضاوی متوفی ۶۸۵ھ اس طبقہ کے بے نظیر اور بلند پایہ محقق اور امام ہیں۔ ان کی تفسیر "انوار التنزیل واسرار التاویل" جو عام طور پر تفسیر بیضاوی کے نام سے معروف ہے نہایت ہی نافع اور جامع تفسیر ہے اس کے فوائد اور لطائف احاطۂ بیان سے خارج ہیں۔ عنوان کے لحاظ سے بظاہر یہ ایک کتاب ہے لیکن درحقیقت یہ کتاب بہت سی تفاسیر اور عظیم الشان کتب اصول دین کا لباب اور جوہر ہے۔ قواعد عربیہ علم بیان و معانی سے تعلق رکھنے والے حقائق اور معارف تفسیر کشاف سے ماخوذ ہیں۔ علوم عقلیہ اور حکمت نیز اسرار کلام اللہ سے تعلق رکھنے والے مباحث تفسیر کبیر سے ماخوذ ہیں۔ اور لغات القرآن کی تحقیق میں ان کی کتاب مفردات قرآن امام راغب اصفہانی کا جوہر ہے خود اپنی ذہنی اور طبعی بلند پایہ صلاحیتوں اور فن کلام میں مہارت کے باعث تفسیر آیات میں جن محاسن اور خوبیوں کا اضافہ کردیا وہ اپنی جگہ دریکتا ہیں۔ پھر ان لطیف اور دقیق بلند پایہ مباحث کو جس اختصار و جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا اس پر دنیا کے علماء اور مفسرین متحیر ہیں اور اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس شان جامعیت میں تفسیر بیضاوی بے مثال تفسیر ہے جو صدیوں سے

درسِ تفسیر میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے ۔ ہر قرن اور دور میں علماءِ امت اس کے حواشی و شروح لکھتے رہے ہیں ۔ روایتی حیثیت اور محدثانہ اصول سے مرتبہ کچھ ہلکا ہے ۔ بعض مقامات پر ضعیف روایات اور فضائل سور کہیں کہیں موضوع اور بے اصل روایات بھی آگئی ہیں ۔

آٹھواں طبقہ

اس طبقہ کے ممتاز اور بلند پایہ مفسرین میں امام ابوالبرکات عبداللہ بن احمد محمود نسفی متوفی ۷۱۰ھ ہیں جو حنفی المسلک اور فقہ و اصول فقہ میں اپنے دور کے یکتا امام اور محقق شمار کیے جاتے تھے ۔ ان کی کتاب "تفسیر مدارک" اگرچہ مختصر ہے لیکن نہایت مفید اور عمدہ تفسیر ہے ۔ اسی طبقہ میں امام ابوالفداء عماد الدین اسمٰعیل بن عمر بن کثیر متوفی ۷۷۴ھ ہیں جو حافظ ابن کثیر کے نام سے معروف ہیں شافعی المسلک اور حافظ تیمیہؒ کے تلامذہ میں سے ہیں ۔ ان کی تفسیر دراصل ابن جریرؒ کی تفسیر کا خلاصہ اور لباب ہے ۔ روایات تفسیر کا نہایت ہی معتمد ذخیرہ ہے ۔ روایت اور درایت کی جامعیت کی وہ شان حاصل ہے کہ محدثین کی تفاسیر میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی ۔

امام المحدثین حضرت شاہ انور رحمۃ اللہ کا مقولہ ہے " اگر کوئی کتاب کسی دوسری کتاب سے مستغنی کر سکتی ہے تو وہ صرف تفسیر ابن کثیر ہے جو تفسیر ابن جریر سے بے نیاز کر دینے والی ہے ۔

امام شرف الدین حسن بن محمد جو علامہ طیبیؒ کے عنوان سے مشہور ہیں اسی طبقہ کے علماء میں سے ہیں ، ان کی ایک تفسیر "فتوح الغیب عن قناع الریب " نہایت عمدہ اور نافع تفسیر ہے ۔

علامہ طیبیؒ کا کشاف پر چھ جلدوں میں ایک حاشیہ ہے ۔ مشکوٰۃ المصابیح کی شرح بھی انہی کی ہے جو محدثین کی نظر میں نہایت بلند پایہ شرح ہے ۔ علامہ طیبیؒ

مشکوٰۃ شریف کے مؤلف شیخ ولی الدینؒ عراقی کے استاذ ہیں اسی طبقہ کے اواخر میں علامہ سعدالدین تفتازانی بھی مشہور و معروف امام ہیں۔

نواں طبقہ اور اس کے بعد کے مفسّرین

ان طبقات کے ائمہ اور مفسّرین کے بعد نویں صدی ہجری کے اور اس کے بعد کے مفسّرین ہیں جن میں خصوصیت کے ساتھ شیخ جلال الدین محلی م ۸۶۴ھ اپنے فضل و کمال کے باعث ممتاز اور اپنے ہم قرن علماء میں فائق ہیں۔ تفسیر جلالین کا آخری حصہ سورۃ اسراء سے ختم قرآن تک انہی کا ہے۔ عمر نے وفا نہ کی اس لیے اس تفسیر کی تکمیل نہ کر سکے۔

اسی طبقہ میں ملا مخدوم مہائمی متوفی ۸۳۵ھ ہیں جن کی تفسیر تبصیر الرحمٰن نہایت ہی عجیب و غریب تفسیر ہے شیخ مہائمی نے نہایت ہی لطیف انداز میں ربط آیات اور سورتوں کا التزام کیا ہے اور عارفانہ اسرار و لطائف اور سلوک و تصوف کے نکات بکثرت ذکر کیے۔ قرآن کریم کی معجزانہ شان کے لیے ایک آئینہ ہے۔ علماء میں یہ بات مشہور ہے کہ انہوں نے روحانی طور پر حضرت خضر علیہ السلام سے علوم حاصل کیے جو اسرار تکوینیہ کی تفہیم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے معلم بنائے گئے تھے۔ قرآن کریم نے خضر علیہ السلام کے بارہ میں وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا کہا ہے۔

اس قرن کے بعد شیخ جلال الدین سیوطیؒ م ۹۱۱ھ نے شیخ جلال الدین محلی ہی کے طرز پر ان کی تفسیر کی تکمیل کی اور سورۂ فاتحہ سے سورہ اسراء تک تفسیر قرآن پوری کر دی۔ اسی وجہ سے یہ کتاب تفسیر جلالین کے نام سے مشہور ہے۔ نہایت ہی اختصار بلکہ صرف چند کلمات اور الفاظ ہی سے پوری پوری آیات کی توضیح و تشریح کر دی گئی۔ حتیٰ کہ علماء میں یہ مشہور ہے کہ تفسیر جلالین کے کل الفاظ قرآن کریم کے کلمات کی تعداد سے بھی کم ہیں۔ اپنے اس طرز میں یہ کتاب بے نظیر تفسیر ہے۔

اسی طبقہ میں شیخ عبدالرحمٰن بن عمر بلقینی اور شیخ ابوالسعود محمد بن عماد حنفی م ۹۸۲ھ جن کی تفسیر اپنی شان افادیت میں تفسیر کشاف اور بیضاوی کے قریب اور ہم پلہ شمار کی جاتی ہے۔ ان طبقات کے بعد سے آج تک ہر دور اور قرن سے علماء مفسرین اور محققین قرآن کریم کی تفاسیر لکھتے رہے اور قیامت تک اسی طرح علماء امت کتاب اللہ کی شرح و تفسیر میں مصروف و منہمک رہیں گے اور اپنے علمی کارناموں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی تصدیق کرتے رہیں گے " هُوَ الَّذِيْ لَا تَنْقَضِيْ عَجَائِبُهُ " کہ قرآن اللہ کا وہ کلام ہے جس کے عجائب و لطائف کبھی بھی ختم نہ ہوں گے۔"

تفسیر و مفسرین کے طبقات کی یہ ایک اجمالی سی فہرست ہم نے ذکر کر دی ہے تفصیل کے لیے حضرات قارئین کشف الظنون اور مفتاح السعادۃ کی مراجعت فرمائیں — علماء ہند میں امام المحدثین حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ[1] سلسلہ تفسیر کا آغاز فرمانے والے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے ایک مختصر و جامع اور نفیس تفسیر تالیف فرمائی جس کا نام " فتح الخبیر بما لابد من حفظہ فی علم التفسیر" ہے۔ اس مختصر تفسیر میں حل الفاظ اور تشریح کلام بالخصوص حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے آثار و روایات سے کی ہے اور اسباب نزول میں صحیح بخاری" جامع ترمذی" مستدرک حاکم کو ماخذ بنایا ہے۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر جو اصول تفسیر میں نہایت ہی محققانہ اور جامع تصنیف ہے وہ دراصل اسی تفسیر کا مقدمہ ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے قرآن کریم کا فارسی زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے جس کا نام فتح الرحمٰن ہے۔ نہایت ہی نافع اور بہترین اسلوب پر ہے۔ علماء و مفسرین اس سے

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ سرزمین ہند میں تفسیر و حدیث کی اشاعت کا سرچشمہ اور مدار ہیں۔ تمام اکابر علماء کی سند حضرت شاہ صاحب ہی کی ذات کے ساتھ وابستہ ہے۔ حضرت شاہ صاحب کی وفات ۱۱۷۶ھ میں ہوئی۔ ۱۲

بہت استفادہ کرتے ہیں ۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی م ۱۲۳۹ھ جو حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ کے صاحبزادے ہیں' نے فارسی زبان میں تفسیر فتح العزیز ، جو "تفسیر عزیزی" کے نام سے مشہور ہے ، تصنیف فرمائی جو ناتمام رہی ، پہلا حصہ سورۂ فاتحہ سے آیۃ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ (بقرہ) تک ہے اور دوسرا حصہ تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ سے ختم قرآن کریم تک ہے ۔ نہایت ہی محققانہ مباحث اور کلام اللہ کے لطائف و اسرار تفصیل کے ساتھ جمع فرمائے ہیں ۔ یہ تفسیر اگرچہ ناتمام اور مختصر ہے لیکن اس کے مضامین تمام قرآن کے لیے بنیادی حیثیت فہم قرآن میں بڑی ہی بصیرت اور اصولی معرفت پیدا کرنے والے ہیں ۔ اور قرآن کریم کے حقیقی مقاصد سے قلوب کی وابستگی کا نہایت ہی موثر ذریعہ ہیں ۔ حضرت شاہ ولی اللہ رح کے تلامذہ و شاگردوں میں محقق علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جن کی تفسیر عربی زبان میں تفسیر مظہری کے نام سے معروف ہے ۔ مضامین قرآن کی تشریح و تفصیل میں بڑی عجیب و غریب تفسیر ہے ۔ مذاہب فقہیہ کی تحقیق اور دلائل کا بہترین ذخیرہ موجود ہے ۔ اس کے مختلف اجزا مختلف مطابع میں طبع ہوئے تھے ۔ اہل علم اس تفسیر کے علوم و فیوض کے تشنہ و متمنی تھے ۔ الحمد للہ کہ اب یہ تفسیر کامل طبع ہو چکی ہے ۔

علامہ محمد بن علی محمد یمنی شوکانی متوفی ۱۲۵۵ھ کی تفسیر فتح القدیر جو ذخیرۂ تفاسیر میں ایک گرانقدر تفسیر ہے ۔ محدثانہ طرز پر علوم کلام اللہ کو واضح فرمایا ہے ۔ نقلیات و روایات میں بہت احتیاط برتی ہے ۔

نواب صدیق حسن خان صاحب مرحوم ۱۳۰۷ھ کی تفسیر فتح البیان بھی تفسیر علامہ شوکانی کا ماخذ ہے ۔

حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ[له] ابن شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ نے

له ۔ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۱۲۳۰ھ میں ہوئی ۔ ۱۲ ۔

اُردو زبان میں سب سے پہلے ترجمہ فرمایا۔ اس میں یہ التزام فرمایا کہ ترجمہ تحت اللفظ ہو۔ اگرچہ اس ترجمہ کے تحت اللفظ ہونے کی وجہ سے عوام الناس کو فہم مُراد میں دقت ہوتی ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ کلام اللہ کی حقیقی عظمت و ہیبت اور کلام الٰہی کا جمال و جلال اگر کسی ترجمہ سے محسوس کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف حضرت شاہ عبدالقادرؒ ہی کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ اُردو زبان کا قرآن ہے۔ ترجمہ کے ساتھ مختصر فوائد بھی جو نہایت ہی ٹھوس اور جامع ہیں اور تنقیح مطالب میں ایک مختصر تفسیر کے قائم مقام سمجھے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد اُردو زبان میں دوسرا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے بھائی حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جن کی وفات ۱۲۳۳ھ میں ہوئی۔ یہ ترجمہ نہایت ہی مفید اور جامع ہے۔ محض ترجمہ ہی نہیں بلکہ اربابِ بصیرت کے لیے کلام اللہ کے حقائق و معارف کے لیے رہنمائی بھی کرتا ہے۔

ان قرن کے ائمہ مفسرین میں ایک بلند پایہ اور بے مثال محقق و مفسر علامہ شہاب الدین سید محمود آلوسی البغدادی مفتیٔ بغداد ہیں جن کی وفات ۱۲۷۰ھ میں ہوئی۔ ان کی تفسیر رُوح المعانی نہایت مبسوط اور بلند مرتبہ تفسیر ہے۔ جس میں متقدمین کے تمام علوم جمع کرنے کے علاوہ روایت اور درایت کی روشنی میں مضامین قرآن کی ایسی عجیب و لطیف تشریح فرمائی کہ مطالعہ کرنے والوں کے قلوب عظمت کلام اللہ سے لبریز ہو جائیں۔

خاص طور پر آیات کی تفسیر میں عارفانہ اسرار و نکات کے بیان کا بھی اہتمام بلکہ التزام فرمایا ہے۔

متاخرین مفسرین میں فخر المفسرین عمدۃ المتکلمین مولانا ابو محمد عبدالحق حقانی دہلویؒ کی تفسیر فتح المنان جو تفسیر حقانی کے نام سے مشہور ہے اُردو زبان میں بے نظیر تفسیر ہے جس میں حل لغات، اعراب، فصاحت و بلاغت کے نکات مطالب قرآن کی تشریح کے ساتھ مخالفین و معترضین کے اعتراضات

اور شکوک و شبہات کے رد کا بھی بہت اہتمام فرمایا ہے گویا متقدمین کے ذخیرۂ علوم کو اس تفسیر میں بڑی خوبی کے ساتھ جمع کر دیا ہے ۔ زیادہ تر تفسیر کا مآخذ امام رازی کی تفسیر کبیر اور قاضی بیضاوی کی تفسیر ہے اور قواعد عربیہ کی رو سے فصاحت و بلاغت کی وجوہ و تفصیلات کا مآخذ تفسیر کشاف ہے ۔ ان تمام خوبیوں کے علاوہ اس تفسیر کی امتیازی شان یہ ہے کہ زمانہ حال کے فلاسفر اور مستشرقین یورپ کے مقابلہ میں اصول اسلام کا ایک مدلل مجموعہ ہے ۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہ کی تفسیر بیان القرآن بھی ایک نہایت بلند پایہ اور محققانہ تفسیر ہے جو متقدمین کے علوم کا لباب اور جوہر ہے ۔ عجیب مؤثر انداز اور پاکیزہ اسلوب سے مطالب قرآن کی توضیح و تفصیل کی گئی ہے ۔ آیات کا شان نزول مسائل فقہیہ اور سلوک و تصوف کے لطائف و معارف کے بیان کا خاص اہتمام ہے ۔ تفسیر درمنثور تفسیر کبیر تفسیر بیضاوی تفسیر روح المعانی اور کشاف اس کا مآخذ ہیں ۔

اردو تفاسیر و تراجم کے ذخیرہ میں حضرت الشیخ المحقق مولانا محمود الحسن الدیوبندی م ۱۳۳۹ھ کا ترجمہ، فوائد بھی ایک گراں قدر خزانہ ہے ۔ حضرت شیخ رحمہ کے فوائد صرف سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء پر تھے ۔ بقیہ تمام قرآن کے فوائد کی تکمیل محقق عصر شیخ الاسلام حضرت العلامہ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ۔ شیخ الاسلام حضرت علامہ عثمانی نے بڑے ہی محققانہ انداز میں مضامین قرآن کی تشریح فرمائی ۔ لطائف و معارف کا ایک سمندر ان مختصر فوائد میں جمع کر دیا ہے ۔ بہت سے اشکالات جن کے حل کے لیے بڑے بڑے دفتر بھی شاید کفایت نہ کر سکیں ان کا حل نہایت ہی سہل اور لطیف انداز میں موتیوں جیسے چند پاکیزہ کلمات میں کر دیا ، بالخصوص اہل باطل کی تحریفات اور مخالفین کے اعتراضات کا بڑی خوبی سے رد کیا گیا ہے جس کے دیکھنے کے بعد کسی بھی صاحب فہم کو ادنیٰ بھی متردد نہیں رہ سکتا ۔ ہندوستان میں بار بار طبع ہو چکنے کے بعد پاکستان میں بھی

یہ فوائد متعدد بار طبع ہو چکے ہیں اور انشاء اللہ ہوتے رہیں گے۔ اور امت ان علوم سے مستفیض ہوتی رہے گی۔ حکومت افغانستان نے ان فوائد کا ترجمہ فارسی زبان میں بڑے اہتمام سے طبع کرا کر شائع کیا ہے۔)

علماء ہند و پاک میں والد محترم حضرت العلامہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی دامت برکاتہم کی تفسیر **معارف القرآن** علوم قرآن کا ایک جامع ذخیرہ ہے اور متقدمین و متاخرین کی کتب تفسیر کا جوہر و لباب ہے۔ حقائق و معارف کلام اللہ میں یہ تفسیر خصوصاً امام رازی کی تفسیر کبیر علامہ ابوحیان کی تفسیر البحر المحیط علامہ سید محمود آلوسی کی تفسیر روح المعانی قاضی ابوبکر بن العربی کی تفسیر احکام القرآن اور تفسیر ابوالسعود کا خلاصہ اور جوہر ہے۔ عارفانہ اسرار اور باطنی نکات میں ملا مخدوم مہائمی کی تفسیر تبصیر الرحمٰن عربیت و بلاغت کے اسرار و لطائف میں علامہ زمخشری کی تفسیر کشاف اور تفسیر قاضی بیضاوی کی تلخیص ہے۔ مسائل فقہیہ اور بیان احکام میں قاضی ابوبکر جصاص کی تفسیر احکام القرآن اور تفسیر مظہری مولانا ثناء اللہ پانی پتی اس کی بنیاد ہے۔ تحقیق مفردات میں امام راغب کی مفردات القرآن اس کا اہم ترین مأخذ ہے۔ جگہ جگہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ اور حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے خصوصی علوم اس تفسیر کی نمایاں زینت ہیں۔

تفسیر مذکور کی ابھی چار جلدیں طبع ہوئی ہیں۔ جلد رابع سورۂ مائدہ اور سورۂ انعام کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ امید ہے کہ یہ تفسیر تقریباً بارہ جلدوں میں پوری ہوگی۔ خداوند عالم اس کی تکمیل فرمائے اور اس کے علوم سے اہل علم کو مستفیض فرمائے۔

تفسیر معارف القرآن کے نام سے ایک دوسری تفسیر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی دامت برکاتہم کی ہے جس کی تاحال تین جلدیں طبع ہو چکی ہیں۔ متقدمین علوم کا نہایت ہی جامع اور مفید ذخیرہ ہے۔ مضامین قرآن کی

توضیح و تفصیل محققانہ انداز میں فرمائی گئی۔ قرآنی معارف و حقائق کو بڑی خوبی کے ساتھ جمع فرمایا۔ خاص طور پر جن مسائل میں دورِ حاضر کے فلاسفہ اور مستشرقین تحیّر میں پڑے ہوئے ہیں ان کا حل اور ان کے شکوک و شبہات کا دلائل کے ساتھ ازالہ ہے۔ اقتصادی اور آئینی مباحث بھی کتاب و سنّت کی روشنی میں اس طرح واضح فرما دیئے کہ مطالعہ کرنے والوں کو بخوبی یہ بات عیاں ہو سکتی ہے کہ ان تمام مشکلات و مصائب کا اصل حل قرآنی ہدایات و تعلیمات ہی میں ہے۔ خداوند عالم اس تفسیر کی بھی تکمیل فرمائے اور اہلِ علم کو اس کے علوم سے بھی مستفیض فرمائے آمین۔

اعجازِ قرآن

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا

مسئلہ اعجاز قرآن اُمت میں ہمیشہ ہی سے نہایت مہتم بالشان مسئلہ رہا ہے۔ ہر دور اور ہر قرن میں علماء اس موضوع پر مستقل تصانیف کرتے رہے ہیں ائمہ متقدمین میں خطابی۔ الرمانی۔ امام رازی۔ الزملکانی۔ ابن سراقہ اور قاضی ابوبکر باقلانی کی کتابیں اعجاز قرآن کے موضوع پر بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

ابوبکر باقلانی کی کتاب اعجاز القرآن کے متعلق ابن العربی کا قول ہے کہ دنیا میں ایسی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

بہرحال اہل اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید معجزہ ہے اور اس کے مانند کوئی کلام پیش کرنا طاقت بشریہ سے خارج ہے۔ اگر تمام عالم بھی متحد اور متفق ہو کر قرآن کریم جیسا کلام پیش کرنے کی کوشش کرے تو یہ بھی ممکن نہ ہوگا۔ جیسا کہ خود رب العالمین نے ارشاد فرمادیا:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا۔ (اسراء)	کہہ دیجیے (اے ہمارے پیغمبر) بیشک اگر جمع ہو جائیں انس و جن بھی اس بات پر کہ لے آئیں اس قرآن جیسا کوئی کلام تو ہرگز نہ لاسکیں گے اس کا مثل اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار و معاون ہو جائیں۔

تو اس آیۂ مبارکہ میں حق تعالیٰ نے اعلان فرما دیا کہ تمام عالم کے انسان اور جن بھی باہم مل کر اور ایک دوسرے کے مددگار و معاون ہو کر بھی کوشش کریں اور چاہیں ان سب کی مشترکہ صلاحیتوں سے قرآن جیسا کوئی کلام پیش کر دیا جائے تو بھی یہ ممکن نہ ہوگا۔

اس اعلان کی صداقت میں تردد اور شبہ کرنے والوں کو مقابلہ کی دعوت بھی دے دی گئی کہ اگر اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کسی کو ذرہ برابر بھی تردد ہے تو پھر واضح اور صاف راستہ یہ ہے کہ ایسے لوگ کوشش کریں اور اس بارہ میں معاون و مددگار بھی حاصل کریں، خود ان کو ظاہر ہو جائے گا کہ ہم عاجز ہیں۔ اور کسی میں یہ قدرت نہیں کہ اس کا مثل بنا کر لائے کیونکہ اللہ کا کلام ہے چنانچہ فرمایا:

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔

(البقرہ ۲۳)

اور اگر تم کسی قسم کے تردد اور شبہ میں پڑے ہوئے ہو اس چیز کی طرف سے کہ جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو بنا لاؤ تم بھی اس جیسی کوئی سورت یا کوئی ٹکڑا اور بلا لو تم اپنے مددگاروں کو سوائے خدا کے اگر تم سچے ہو۔

عرب کے ان فصحاء و بلغاء اور مایۂ ناز شعراء اور خطباء کو مقابلہ کی دعوت دی گئی جن کا بچہ بچہ شعر گوئی اور گہوارۂ فصاحت ہی میں تربیت پاتا تھا۔ وہ قوم جب ہر چند کوشش اور طرح طرح کی تدبیروں کے باوجود بھی قرآن کے مانند کوئی مختصر سا کلام بھی بنا سکنے سے عاجز رہی تو عقلاً یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ قرآن اللہ کی طرف سے معجزہ (دلیل نبوت) ہے اور دنیا کو اس نے اپنے مقابلہ سے عاجز کر دیا ہے۔ اگر ادنیٰ امکان بھی ہوتا تو وہ لوگ اپنی اسلام دشمنی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے غایت درجہ عناد رکھنے کی وجہ سے پیچھے

بھٹنے والے نہ ہوتے لیکن ہر چند جدّ و جہد اور اپنی امکانی کوششوں سے تھک چکنے کے بعد سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہ پایا کہ مہمل اور بے معنی اعتراضات ہی کرنے لگیں۔ کبھی کہتے قرآن کہانت ہے اور کبھی آپؐ کی طرف جنون کی نسبت کرتے۔ کبھی کہتے کہ شعر ہے۔ جب یہ سب باتیں خود ان کو ہی لغو اور بے معنی محسوس ہوتیں تو کہنے لگتے کہ سحر اور جادو ہے۔ قرآن کریم میں ان کی اس قسم کی لغویات کا جواب دیا جاتا ہے کہ "مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ" کہ آپ تو اپنے ربّ کے فضل و انعام سے مجنون نہیں (صحیح العقل آدمی کا یہ کام نہیں کہ وہ ایسی ذات کو جس کی زبان سے حقائق و معارف کے سمندر جاری ہوں وہ اس کو مجنون کہہ سکے۔ اس لیے جو کہنے والا ہے یہ قول خود اس کے مجنون ہونے کی دلیل ہے۔

کسی جگہ فرمایا گیا "اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ۔ سیرت کی روایات میں مذکور ہے کہ ولید اپنے گروہ کی باتیں سن کر کہا کرتا تمہاری یہ سب باتیں غلط اور لغو ہیں۔ آپ کاہن بھی نہیں۔ میں کاہنوں کو خوب جانتا ہوں اور نہ آپؐ کا کلام کاہنوں کے کلام کے مشابہ ہے اور نہ آپ کا کلام شعر ہے میں خود عرب کا بہترین شاعر اور اقسام شعر کا ماہر ہوں۔ اس کلام کو شعر سے کوئی نسبت نہیں اور آپ ساحر بھی نہیں اور نہ آپ کا کلام ساحروں کا دم کرنا اور پھونکنا ہے۔" لوگوں نے کہا اے ابوعبدشمس (کنیت ولید) آخر پھر وہ ہے کیا، خدا کی قسم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام میں ایک عجیب حلاوت اور شیرینی ہے اس پر عجیب قسم کی رونق ہے۔ اس قول کی جڑ نہایت تر و تازہ اور اس کی شاخیں ثمردار ہیں۔ اور جو کچھ تم نے کہا ہے میں خوب جانتا ہوں کہ وہ سب لغو اور باطل ہے۔ میرے نزدیک سب سے بہتر اور مناسب بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ کہو کہ وہ شخص ساحر ہے اس کا کلام سحر ہے کیونکہ سحر میں تاثیر ہوتی ہے اور سحر کا خاصہ ہے میاں بیوی میں تفریق ڈالنا اور اس کا کلام ایسا ہی ہے کہ میاں بیوی۔ باپ بیٹے۔ بھائی بھائی اور

قبیلہ اور کنبہ میں تفریق ڈالتا ہے "۔ گویا انھوں نے نبی کریمؐ اور قرآن سے لوگوں کو برگشتہ بنانے کے واسطے اس پروپیگنڈے کو زیادہ بہتر اور اپنے زعم میں کامیاب سمجھا کہ قرآن کو سحر کہا جائے تاکہ اس کی روحانی تاثیر کو محسوس کرنے کی صورت میں لوگوں کے اذہان و خیال کو بسہولت روحانی اور قلبی تاثیر سے ہٹا کر جادو کی تاثیر کی طرف منتقل کردیں لیکن مشرکین کی یہ تدبیر بھی کارگر نہ ثابت ہوئی بلکہ اس کے بعد اطراف و اکناف سے آنے والوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کی حقانیت بخوبی واضح ہوگئی ۔ تاریخ گواہ ہے کہ کسی نے انفرادی یا اجتماعی طور پر اس امر کی ہمت نہ کی کہ کہہ دیتا ہمیں نے تو قرآن کے اس اعلان کا جواب دیتے ہوئے یہ کلام پیش کیا ہے ۔

معجزہ کا مفہوم

لفظ معجزہ اعجاز سے مشتق ہے جس کے معنی عاجز کر دینے کے ہیں ۔ اصطلاح اور عرف شریعت میں ہر اس خارق عادت امر کو کہا جاتا ہے جو پیغمبر کے ذریعہ ظاہر ہو اس طرح کہ قدرت بشریہ اس جیسی چیز پیش کرنے سے عاجز رہے جس کو دیکھتے ہی لوگ سمجھ جائیں کہ یہ کام مادی طاقت اور انسانی قوت سے بالا و برتر ہے ، اور دائرہ اسباب سے خارج ہے اس لیے لامحالہ قدرت خداوندی کا کرشمہ ہے ۔

معجزات دلائل نبوت ہوتے ہیں اس لیے حق تعالیٰ اپنے تمام پیغمبروں کو معجزات قاہرہ دے کر مبعوث فرماتا ہے تاکہ قدرت خداوندی کی یہ نشانیاں دیکھ کر لوگوں کی گردنیں انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کے لیے ہی خم ہوجائیں ۔

انبیاء بنی اسرائیل کو معجزات بالعموم وہ دیئے گئے جو محسوس اور مشاہد تھے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ عصا و ید بیضا اور سمندر میں عصا مارنے سے بارہ راستے پیدا ہوجانا اور پتھروں سے بارہ چشموں کا نکل پڑنا اور حضرت عیسیٰؑ کا مادرزاد نابیناؤں اور کوڑھیوں کو تندرست کردینا ، مردوں کا زندہ کرنا ،

پرندوں کی صورت بنا کر انہیں اُڑا دینا اور یہ بتا دینا کہ لوگوں کے گھروں میں کیا ذخیرہ ہے اور وہ کل کیا کھائیں گے ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے دہکتی ہوئی آگ کا برد و سلام ہوجانا ۔ اور حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں میں لوہے کا نرم موم کی طرح بن جانا وغیرذالک ۔ یہ سب معجزات حسیہ بنی اسرائیل کو دیئے گئے کیونکہ ان قوموں میں بلادت و حماقت غالب تھی ۔ فہم و دانائی اور بصیرت کا اکثر میں نام ونشان نہ تھا اس لیے ایسے معجزات دیئے گئے کہ آنکھوں سے نظر آسکیں اور بلید سے بلید آدمی کو بھی گنجائش و تردد نہ رہے ۔ اس کے برعکس امت محمدیہ کے لیے معجزات عقلیہ دیئے گئے جن کا تعلق فہم و بصیرت اور عقل سے تھا کیونکہ اہل عرب جو وحی کے اوّلین مخاطب تھے وہ عقل و دانائی اور فکر و تدبر میں امتیازی خصوصیت رکھتے تھے اس لیے ان کو معنوی اور رُوحانی معجزے دکھلائے گئے اور جو ان میں سابقین کی طرح کودن و احمق اور کوڑھ مغز تھے ، ان کی خاطر حسی معجزات بھی معنوی معجزات معنوی معجزات کے ساتھ جمع کر دیئے گئے ۔

نیز یہ کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت قیامت تک کے لیے مشروع کی گئی اور آپ کا دین ہمیشہ کے لیے اُتارا گیا تھا اس لیے ایسے معجزات آپؐ کی نبوت اور شریعت کے مناسب تھے جو آپؐ کی وفات پر انبیاء سابقین کی طرح منقطع ہونے والے نہ ہوں بلکہ ان معجزات کی معجزانہ شان قیامت تک اسی طرح باقی اور قائم رہے جیسے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ نبوت میں تھی ۔ ظاہر ہے کہ یہ شان معنوی اور رُوحانی معجزات ہی میں ہوسکتی ہے اس لیے آپ کی نبوت کے دلائل زیادہ تر معجزات عقلیہ بنائے گئے جن میں سب سے بڑا اور اعظم المرتبت معجزہ قرآن کریم ہے ، جس کو قیامت تک لوگ دیکھیں گے اور اس کے ذریعے ایمان لائیں گے ۔ صحیح مسلم میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے :

انّ رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم قال ما من الانبیاء من	کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ، انبیاء سابقین میں کوئی نبی بھی ایسا نہیں

نَبِيٍّ اِلّاَ قَدْ اُعطی من الآیات	مگر یہ کہ اسے دیا گیا ہو آیات و معجزات میں سے
ما مثلہ اٰمن علیہ البشر	کوئی ایسا معجزہ کہ اس جیسے پر انسان ایمان
وانّما کان الّذی اُوتیتُ وحیًا	نہ لایا ہو (بلکہ ہر پیغمبر کو معجزات ایسے دیئے گئے
اوحیٰ اللہ الیّ فارجوان اکون	کہ اُن پر لوگ ایمان لائے) اور جز این نیست
اکثرھم تابعًا یوم القیامۃ	کہ جو چیز مجھ کو دی گئی وہ اللہ کی وحی ہے جو
	اللہ نے میری طرف بھیجی (یعنی قرآن) پس میں
	اُمید کرتا ہوں میں ہی زائد ہوں گا قیامت
(صحیح مسلم)	کے روز متبعین کی تعداد کے اعتبار سے .

کلمات مبارکہ اسی مضمون کی جانب رہنمائی کر رہے ہیں کہ انبیاء سابقین کے معجزات (مثلاً حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام) بے شک اپنی اپنی جگہ نہایت عظیم الشان معجزے اور قدرت خداوندی کی واضح نشانیاں اور ان کی نبوّت کے لیے برہان قاطع تھے لیکن وہ معجزات ان حضرات انبیاء کے زمانوں کے ختم ہو جانے کے ساتھ ختم ہو گئے اب عصا و ید بیضا اور احیاء موتیٰ کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا لیکن نبی آخر الزمان خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ ایسا معجزہ ہے کہ جو کسی زمانہ کے ساتھ ختم نہ ہوگا بلکہ دنیا فنا ہو جائے گی . اور یہ معجزہ اسی طرح زندہ رہے گا اور لوگ ہر دور و قرن میں اس کے ذریعے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت پر ایمان لاتے رہیں گے . اس لیے لا محالہ آپ کے متبعین کی تعداد بھی تمام پیغمبروں کے متبعین سے زائد ہوگی .

کفّار مکہ جب مقابلہ سے عاجز رہے اور قرآن کے اس اعلان صداقت کے خلاف کوئی آواز بلند کرنے پر قدرت نہ پا سکے تو یہی کہنا شروع کیا کہ :

لولا انزل علیہ اٰیات من ربہ .	کیوں نہیں اتاری جاتیں آپ پر نشانیاں آپ کے رب کی طرف سے .

اس کے جواب میں آپؐ کو ارشاد فرمایا گیا :

قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۔

کہ دیجیے کہ نشانیاں تو اللہ کے یہاں ہیں (اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں) اور تو کھلم کھلا (عذاب الٰہی سے) ڈرانے والا ہے (فرمایا خداوند عالم نے) اور کیا ان کو یہ (سب سے بڑی نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر نازل کیا قرآن جو ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے۔

یعنی قرآن سے بڑھ کر اور کیا معجزہ اور نشانی ان کو درکار ہے۔ یہی تو سب سے بڑی دلیل و نشانی ہے کہ اللہ کا کلام ان کے رُوبرو تلاوت کیا جاتا ہے جس کی ہر آیت بذات خود کلام الٰہی ہونے کی دلیل ہے۔

قرآن کریم کے وجوہ اعجاز

قرآن کریم تمام ابواب ہدایت کے لیے ایک جامع اور وسیع تر خزانہ ہے اس کے علوم ایک دریائے ناپیدا کنار ہیں جس کے عجائب قیامت تک ختم نہیں ہوسکیں گے علماء امت اور محققین وجوہ اعجاز پر مختلف دور میں کتابیں تالیف فرماتے رہے بالاجمال یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جس طرح اس کتاب الٰہی کے معارف و حقائق کی کوئی حد و نہایت نہیں اس کی معجزانہ شان کی کیفیات اور صورتیں بھی بے شمار ہیں۔ آئمہ مفسرین نے کچھ اصول و کلیات اعجاز قرآن کے ایسے بیان فرمائے ہیں جو بہت سے وجوہ اعجاز کو حاوی اور شامل ہیں۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ "شفا" میں فرماتے ہیں کہ اعجاز قرآن کی صورتیں تو بہت ہیں جن کا احاطہ مشکل ہے البتہ وہ انواع جو اکثر وجوہ اعجاز کے لیے جامع ہیں چار ہیں:

۱۔ قرآن کریم کی حسن تالیف، کلمات و آیات کا باہمی ارتباط و مناسبت اور

اس کا وہ معیار فصاحت و بلاغت جس نے دُنیا کو عاجز بنا دیا۔ میدانِ بلاغت کے عرب کے شہسواروں نے ذلّت و عاجزی کے گھٹنے ٹیک دیئے۔

۲۔ نظم قرآنی کا وہ عجیب و غریب اور نرالا طرز جو عرب نظم و نثر کے ہر اسلوب اور طرز سے جُدا اور ممتاز نظر آتا تھا۔ عرب کے شعراء و بلغاء اور خطباء نظمِ قرآنی کو انواع اور اقسام نظم و نثر سے مختلف پاکر متحیّر ہوتے تھے کہ یہ طرز کلام اور اندازِ بیان آخر کس معیار پر ہے۔

۳۔ امم سابقہ اور گذرے ہوئے زمانوں کے ان واقعات کو بیان کرنا جن کو ایک اُمی شخص تو درکنار بہت سے خواص اور احبار اہل کتاب بھی نہ جانتے تھے ایسے گذرے ہوئے واقعات نادرہ اس اعلان کے ساتھ بیان کرنا کہ یہ واقعات ثابت اور برحق ہیں اور اللہ کی طرف سے آپ پر وحی کیے گئے قرآن کا کھلا ہُوا اعجاز ہے۔ بلکہ قرآن کریم نے تو ان واقعات کو تحقیق و تثبیت کے رنگ میں بیان کیا جن میں خود اہل کتاب اور بنو اسرائیل باہم اختلاف کرتے تھے جیسے کہ ارشاد فرمایا گیا:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ۔	کہ بیشک یہ قرآن بیان کرتا ہے بنو اسرائیل سے (ان کے) اکثر وہ واقعات جن میں وہ خود اختلافات کر رہے ہیں۔

۴۔ غیب کی خبروں اور آنے والے واقعات کے بیان پر مشتمل ہونا اور پھر ہر آنے والی خبر جو قرآن میں بیان کی گئی اس کا اسی طرح ظہور پذیر ہونا۔ قرآن کریم نے جن جن واقعات کی خبر دی وہ صبح صادق کی روشنی کی طرح دُنیا کی نگاہوں کے سامنے آکر رہے۔

مثلاً حق تعالیٰ نے عجم پر روم کے غلبہ کی خبر دی اس وقت جب کہ عالم اسباب میں بظاہر اس کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا۔

الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ مغلوب ہوگئے ہیں رومی قریب ہی

وَهُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ۔ سرزمین (یعنی ملک فارس) میں لیکن یہ لوگ (رومی) اپنے مغلوب ہونے کے بعد چند سالوں ہی میں غالب آجائیں گے۔

(ایران کے مجوسیوں پر)

فارس کے آتش پرست مجوس کو مشرکین مکہ مذہبًا اپنے سے نزدیک سمجھتے تھے اور روم کے نصاریٰ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے بھائی یا ان کے کم ازکم قریبی دوست تصور کیے جاتے تھے تو فارس کے غلبہ کی خبر پر مشرکین مسرور ہوئے کہنے لگے کہ آج ہمارے بھائی ایرانیوں نے تمہارے بھائی رومیوں کو مٹا دیا ہے۔ ہم بھی اسی طرح کل تمہیں مٹا ڈالیں گے۔ اس وقت قرآن نے ظاہری سلسلۂ اسباب کے بالکل خلاف اعلان کیا کہ بیشک اس وقت رومی فارس سے مغلوب ہوگئے ہیں لیکن چند سال (نو سال) کے اندر اندر پھر وہی غالب اور کامیاب ہوں گے۔ چنانچہ قرآن کی اس پیش گوئی کے مطابق ٹھیک نو سال کے اندر (یعنی ہجرت کا ایک سال گذرنے کے بعد) عین بدر کے روز جب کہ مسلمان اللہ کے فضل سے مشرکین پر فتح و نصرت حاصل کرکے خوشیاں منا رہے تھے۔ اسی روز یہ خبر سُن کر مسلمانوں کی مسرتوں پر اور مسرتوں کا اضافہ ہوا کہ اہل کتاب رومیوں کو اللہ تعالیٰ نے ایران کے مجوسیوں پر غالب فرما دیا قرآن کریم کی اس عظیم الشان اور محیر العقول پیشین گوئی کی صداقت کا مشاہدہ کرکے بہت سے لوگ مشرف باسلام ہوئے۔

۵۔ قاضی ابوبکر فرماتے ہیں، قرآن کریم کا (سب سے بڑا) اعجاز یہ ہے کہ اس کی تالیف و ترتیب اور کلمات و آیات کا تناسب کچھ ایسے اسلوب پر واقع ہوا ہے کہ عرب کے تمام معتاد اور متعارف طریقوں سے جدا اور نرالا تھا۔ عرب میں نظم ونثر کے جس قدر اسلوب تھے ان میں سے کوئی اسلوب قرآن کے طرز بیان کے مشابہ نہ ہوسکتا تھا۔ اس مرتبہ اعجاز کے ساتھ بدیع کے تمام اقسام کچھ اس طرح جمع ہیں کہ

کہ دُنیا کے کسی کلام میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی[۱]۔

خداوندِ عالم کی یہ سنّت رہی ہے کہ جو فن اور ہُنر کسی زمانہ میں اپنے عروج وکمال کو پہنچا ہوا ہوتا تو اسی نوع کا معجزہ اپنے پیغمبروں کی تصدیق وتائید کے لیے عطا فرماتا تاکہ لوگ اس معجزہ کو دیکھ کر انسانی ہنر وکمال، مادی وسائل وطاقتوں اور قدرتِ خداوندی کے درمیان بخوبی امتیاز کرسکیں۔ حضرت موسیٰ علیہم السّلام کے زمانہ میں جادو کا بہت زور تھا۔ مایۂ ناز جادوگر سرزمین مصر میں موجود تھے، اس کی مناسبت سے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو عصا اور ید بیضا کا معجزہ دیا گیا، حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں چونکہ طب اپنے عروج پر تھی اس لیے حضرت عیسیٰؑ کو احیاء موتیٰ اور ابراءُ اکمہ و ابرص کا معجزہ عطا کیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فصاحت وبلاغت شباب پر تھی ایک سے ایک مایۂ ناز شاعر وخطیب اپنے اشعار وقصائد بیت اللہ کی دیواروں پر ھل من مبارز (ہے کوئی مقابلہ کرنے والا) کے اعلان کے ساتھ آویزاں کرتا تھا اس لیے ایسے دَور میں آپ کو خصوصی معجزہ قرآن کریم دیا گیا جس کی فصاحت کے سامنے عرب کے تمام فصحاء وبلغاء کی مجموعی طاقت بھی مقابلہ سے عاجز رہی۔

ابتداء دَور میں جب کہ شعراءِ عرب کے قصائد خانہ کعبہ کی دیواروں پر لٹکائے جاتے تھے، کسی صحابی نے سورہ "اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ" لکھ کر دیوار کعبہ سے لگادی اس کاغذ پر نیچے کچھ اور لکھنے کے لیے بہت سی جگہ چھوڑ دی۔ ہر سال دُور دراز سے آنے والے شعراء اس کو آکر غور سے پڑھتے اور ہرچند کوشش کرتے کہ کچھ اس کے نیچے لکھ دیں لیکن عاجز رہتے۔ آخر ایک بڑے شاعر نے جس کی فصاحت وبلاغت کا عرب میں بہت چرچا تھا صرف یہ جملہ لکھ دیا:

مَا هٰذَا كَلَامُ الْبَشَرِ کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہے۔

پھر ایسے دلربا انداز فصاحت اور جامع ومؤثر طرز بیان سے ایسے علوم وحکم کو

---

[۱] الاتقان فی علوم القرآن صفحہ ۱۱۹ ج ۲۔

جمع کردیا کہ دُنیا کے علوم و معارف اور حقائق کے خزانے ان سے خالی ہیں ، (جس کی تفصیل آئندہ سطور میں آئے گی) پھر طرفہ یہ کہ جو ہادی اس کتاب کو لایا اس نے نہ کسی درسگاہ میں تعلیم حاصل کی نہ کسی تاثیر یہ ی کا مطالعہ کیا ۔ نہ کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور نہ اس کے گردو پیش تعلیمات کا کوئی ایسا مواد موجود تھا جس کے ذریعے مدد لی جا سکتی ۔ آپ کے نبی اُمّی ہونے کی شان قرآن نے ان الفاظ میں صاف صاف بیان کر دی ۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۔

اور نہ آپ پڑھتے تھے قرآن کے نازل ہونے سے پہلے کوئی کتاب اور نہ ہی آپ اپنے دائیں ہاتھ سے (کوئی حرف) لکھ سکتے تھے اگر ایسا ہوتا تو بیشک باطل پرستوں کو کچھ شک و تردّد کی گنجائش ہو سکتی تھی

بہرکیف یہ سب کچھ اس امر کا کھلا ہُوا ثبوت ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے ۔ وجوہ مذکورہ کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہ اعجاز ہیں ۔

۶ ۔ مثلاً قرآن کے الفاظ و کلمات میں ایسی حلاوت و شیرینی ہے جس کو ہر ایک محسوس کرتا ہے خواہ کوئی کلام عربی کا ذوق و فہم رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو ۔ عرب و عجم جوان بوڑھے مرد عورت سب یکساں طور پر قرآن کی حلاوت محسوس کرتے ہیں۔ الفاظ قرآن کا حُسن و جمال اس طرح نمایاں ہے کہ قرآن کی کوئی آیت کسی عربی کی کتاب میں بھی آجاتی ہے تو اس کی خوبی و جمال نمایاں طور پر نظر آنے لگتا ہے حتیٰ کہ فصیح سے فصیح کتاب یا مجموعہ قصائد اور دیوان ہی کیوں نہ ہو لیکن ہر خاص و عام آیت قرآنیہ اس کے درمیان اس طرح ممتاز روشن دیکھے گا جیسے آسمان کی تاریکی میں ستاروں کا نور ۔

۷ ۔ ہر قوم اور ہر ملک کا مزاج ذوق کلام میں مختلف ہوتا ہے اور امر شاہد ہے کہ کسی کلام کی فصاحت ایک طبقہ کے نزدیک کمال ترقی کے اعلیٰ مقام پر ہے تو اس کے بالمقابل دوسرے مزاج کے نزدیک اس کلام میں وہ خوبی اور معیار پسندیدگی نہیں

سمجھا جاتا ہے مگر قرآن کی فصاحت و بلاغت ہر قوم اور ہر مزاج کو مرغوب ہے۔ اس کی حلاوت سے عرب و عجم ایشیا، افریقہ یورپ امریکہ سب ہی لطف اندوز ہوتے ہیں کہ باایں ہمہ کہ وہ کسی کے بھی مذاق اور طرز پہ نہیں۔ نہ باقاعدہ نظم ہے کہ کوئی شاعر عروض و قوافی کے حسن پرمست ہو سکتا ہو اور نہ ہی وہ اسالیب نثر پر منطبق ہے کہ ماہر نثر اپنے انداز طبع سے اس کو لذیذ سمجھے۔

۸۔ ہر طویل کلام میں یہ بات دیکھی گئی ہے کہ اگرچہ آغاز سخن شوکت الفاظ سے مرصّع اور حُسن تعبیر کی رنگینیوں سے مزیّن ہے تو بسا اوقات درمیان میں کلام کی وہ رونق نہیں رہتی، ابتداء کی جو شان ہے وہ اختتام اور وسط میں نہیں۔ کہیں کوئی بات بے موقع آجاتی ہے، کہیں کسی چیز کا وزن گرا ہوا ہوتا ہے کہ جس سے مضمون کی عظمت اور اہمیت بہت ہی گر جاتی ہے مگر قرآن کی جس سورت کو بھی دیکھیے اس کی شان ابتداء و انتہا اور درمیان میں یکساں ہی معلوم ہوگی۔ ابتداء کلام سامع کو مضمون کی بلندی کا یقین دلاتی ہے۔ پھر وسط اس کی تصدیق کر دیتا ہے۔ اور مقطع اس پر مہر ہو جاتا ہے۔

9۔ ہر ایک کلام سے متکلّم کی شان نمودار ہوتی ہے۔ عرفاء کا کلام پڑھنے سے دل پہ ایک نورانی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس سے یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ یہ کسی شیریں چشمہ کا پانی ہے۔ بادشاہوں کے کلام سے ان کی عظمت و جلال کی شان ٹپکتی ہے۔ شہوت پرستوں کے کلام سے آثار شہوت خود بخود محسوس ہوتے ہیں۔ فلسفہ کی دلدل میں پھنسے ہوؤں کا کلام فلسفیانہ تحیر اور آثار تکدر کا مظہر ہوتا ہے لیکن کلام ربانی ان سب باتوں سے منزہ اور بالا برتر حق تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور اس کی شان الوہیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ایک اعرابی نے کسی قاری کو یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے سُنا:

وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ	اور کہہ دیا گیا کہ اے زمین تو اپنا پانی چوس لے
وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ	اور اے آسمان تو تھم جا اور (خدا کا یہ فرمانا ہی تھا کہ)
وَقُضِيَ الْأَمْرُ ۔	پانی جذب ہو گیا اور کام تمام کر دیا گیا۔

آیت سنتے ہی اعرابی اسلام لے آیا کہنے لگا کہ زمین و آسمان کے نام یہ شاہانہ احکام جاری کرنا صرف اسی ذات کے لیے ممکن ہے جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے۔ اور کسی سے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے، اس لیے میں نے جان لیا کہ یہ کلام اسی رب العالمین کا ہے جس نے کائنات کو پیدا کیا اور میں اس پر ایمان لایا۔ الفاظ قرآن سے عظمت خداوندی برستی ہے۔ اس کی تلاوت سے قلب پر توحید و خدا پرستی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ دنیا سے بے رغبتی اور عالم جاودانی کا اشتیاق پیدا ہوتا ہے۔ حسنات کا شوق اور معصیت سے نفرت محسوس ہونے لگتی ہے۔

۱۰۔ ایک مضمون یا کوئی قصہ بار بار اگر بیان کیا جائے تو سامع کو بے لطفی بلکہ طبیعت پر انقباض و گرانی محسوس ہونے لگتی ہے لیکن یہ قرآن کا خاصہ اعجاز ہے کہ ایک آیت بار بار دہرائی جاتی ہے لیکن ہر اعادہ میں سامع کو اس کا ایک نیا لطف محسوس ہوتا ہے۔ جو قصہ بھی مکرر بیان کیا جاتا ہے وہ ایسے نرالے انداز کے ساتھ بیان ہوتا ہے کہ بالکل نیا مضمون اور نیا قصہ معلوم ہوتا ہے۔ دنیا میں یہ انداز بیان کسی بھی فصیح و بلیغ قادر الکلام کے کلام میں نہ آج تک آسکا اور نہ قیامت تک پایا جاسکے گا۔

۱۱۔ دنیا میں ہر فصیح و بلیغ اس بات سے عاجز ہے کہ ایک مضمون سے دوسرے مضمون اور ایک موضوع سے دوسرے مختلف موضوع کی طرف لطیف انداز سے منتقل ہوجائے، یہ خوبی صرف قرآن ہی کی ہے کہ مختلف موضوع اور مضامین ایک سے دوسرے مضمون کی طرف اس عمدگی اور مناسبت کے ساتھ منتقل ہوجاتا ہے کہ کلام کی عظمت و بلندی تک عقل پرواز سے قاصر رہتی ہے۔ کہیں توحید کے مضمون سے احکام کی طرف کسی جگہ قصص سے توحید اور کہیں احکام طلاق و نکاح سے احکام صلوٰۃ و زکوٰۃ کسی مقام پر تعلیم اخلاق کے ساتھ اصول جہاد و احکام غزوات کی طرف کلام منتقل ہو رہا ہے۔

اور پھر نہ کلام کے ربط و تسلسل میں کوئی فرق ہے نہ اس کی حلاوت و لطافت

نہیں تفاوت معلوم ہوتا ہے۔ مختلف مضامین کو اسی شان جامعیت کے ساتھ بیان کرنا یہ قرآن ہی کا معجزہ ہے۔ ورنہ دنیا میں کوئی بھی متکلم خواہ کتنا ہی شیریں بیان اور قادر الکلام فصیح ہو اگر مختلف موضوع کو ممزوج و پیوستہ کرکے کوئی کلام پیش کرنے لگے تو چند جملوں سے زائد اس کلام کو اہل ذوق سننا بھی گوارا نہ کریں گے۔

اعجاز قرآن باعتبار مفردات

امام العصر حضرت مولانا انور شاہ قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میرے نزدیک من کل الوجوہ معجزہ ہے۔ اس کا اعجاز اس کے مفردات میں مرکبات میں۔ ترتیب کلمات میں اور اس کے مقاصد و حقائق میں جاری و ساری ہے۔ غرض قرآن از روئے لفظ اور ترکیب اغراض و مقاصد حقائق و علوم ہر طرح معجزہ ہی ہے۔

از روئے مفردات معجزہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مفردات میں قرآن کریم وہ کلمہ اختیار فرماتا ہے کہ اس مقام پر اس معنی کو ادا کرنے اور حقیقت مقصودہ کو واضح کرنے کے لیے اس سے زائد جامع اور بلیغ اور کوئی کلمہ نہیں ہوسکتا، جو اس طرح مراد کو کامل طور پر ادا کرسکے۔ مثلاً موت کے واسطے اہل عرب کے یہاں متعدد لغات استعمال کیے جاتے تھے۔ الحتف۔ الحمام۔ المنون۔ الشعوب۔ الفود۔ السام۔ القاضیۃ۔ المنیۃ۔ الخالج۔ الشجب وغیر ذالک۔ مگر قرآن نے ان تمام الفاظ کو چھوڑ کر لفظ توفی موت کے لیے استعمال کیا جس کے معنی کسی چیز کو پورا پورا لے لینا ہے کیونکہ حقیقت موت کی یہی ہے کہ روح حیوانی جو تمام اجزاء جسم میں سرایت کی ہوئی ہے اس کو اجزا جسم میں سے سمیٹ کر پورا پورا نکال لینا کہ جسم کے کسی حصہ میں ادنیٰ مادہ حیات نہ رہے جیسے دہکتے ہوئے انگارے کے ایک ایک جز میں مادہ آتشی سرایت کیے ہو اور اس پر پانی ڈال کر بجھا دیا جائے۔ اس لیے حقیقت موت کو ظاہر کرنے کے لیے لفظ

توفی سے زائد جامع کوئی لفظ نہیں ہوسکتا تھا۔ نیز اس کلمہ کے استعمال سے مشرکین۔ اور اہل جاہلیت کے اس اعتقاد کا بھی رد کردیا جو یہ سمجھتے تھے کہ موت انسانی فناء محض اور عدم مطلق کے درجہ میں ہوجانے کا نام کہا کرتے ہیں۔ أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا۔

قرآن نے اس لفظ کو بدل کر یہ حقیقت آشکارا کردی کہ موت کا مفہوم فناء محض اور اعدام مطلق نہیں بلکہ موت کی حقیقت ارواح کا تعلق اجسام انسانیہ اور اجزاء بدنیہ سے جدا کردینے کے بعد کسی دوسرے مستقر میں منتقل کردینا ہے اس لیے کہ ہر انسان کی روح اللہ کے یہاں موجود ہے وہ جب چاہے گا پھر ان ارواح کو اپنے اجسام کے ساتھ جمع کردے گا اور اٹھادے گا۔ وَهُوَ عَلَىٰ جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيرٌ۔

چنانچہ فرمایا قُلْ يَتَوَفَّاكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ۔ تو اس لفظ توفی نے جہاں حقیقت موت کی وضاحت و تعیین کی اس کے ساتھ مسئلہ بعث بعد الموت کو بھی اس طرح واضح کردیا کہ یہ سمجھ لینے کے بعد اس پر کوئی اشکال ہی رہا[لہ] (ف) لفظ توفی کے استعمال میں اور بھی بہت سے لطائف و معارف ہیں تفصیل کے لیے مقدمہ مشکلات القرآن کی مراجعت فرمائی جائے۔

قرآن مجید کے اعجاز مفردات میں یہ چیز بھی ہے کہ قرآن بعض مقام پر ایک لفظ اختیار کرتا ہے کہ اگر وہی لفظ نظم قرآنی کے علاوہ کسی دوسری جگہ دیکھا جائے تو وہ اپنے مترادفات کے درمیان کچھ زائد فصیح اور اہل ذوق کے نزدیک لذیذ و شیریں محسوس نہ ہوتا ہوگا مثلاً لفظ ضیزیٰ جس کے ہم معنی الفاظ جائرہ ظالمہ وغیرہ ہیں اور یہ الفاظ بہ نسبت ضیزیٰ زیادہ مستحسن اور بلغاء کے نزدیک معیار فصاحت پر پورے ہیں۔ برخلاف ضیزیٰ کے کہ اس میں

لہ مشکلات القرآن صہ۵۶

• "ثقل علی اللسان" اور قدرے "کراھۃ فی السمع" کی آمیزش ہے مگر یہ قرآن کی معجزانہ شان ہے کہ جب اس نے اس لفظ کو سورہ والنجم کی آیت "تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ" میں استعمال کیا تو ایسا متناسب اور لطیف اور کانوں کو اس قدر لذیذ معلوم ہونے لگا کہ کوئی بھی کلمہ اس کے ہم معنی الفاظ میں سے اس مقام پر ہرگز اس قدر لطیف و مناسب نہ رہتا اور اس لفظ نے آیت میں جو حسن پیدا کر دیا یقیناً کوئی دوسرا لفظ اس حسن کے پیدا کرنے سے قاصر تھا کیونکہ سورۂ والنجم کی آیات شروع سے یاءِ مقصورہ پر ختم ہوتی ہیں اور اس کے آخری الفاظ سب اسی قافیہ پر ہیں۔ وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ تو ان آیات کے درمیان تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ میں جو حسن و خوبی لفظ ضِيزَىٰ نے پیدا کی ہے وہ کسی دوسرے لفظ سے ناممکن تھی۔

حاصل یہ کہ یہی ایک کلمہ مثلاً دوسرے کلام میں استعمال کیا جائے تو فصحاء اور بلغاءِ عرب ثقل علی اللسان اور کراہت فی السمع جیسے امور سے معیار فصاحت پر جرح کرنے لگیں گے۔ لیکن اسی کلمہ کو قرآن نے جب استعمال کیا تو غایت درجہ لطیف اور مستحسن معلوم ہونے لگا۔ پھر ایک خوبی اس میں یہ بھی ہے کہ یہ مضمون چونکہ کفارِ مکہ کی اس غلط تقسیم کے متعلق ہے جو انہوں نے اختیار کی تھی کہ اپنے واسطے تو بیٹے تجویز کرتے اور اللہ کے لیے بیٹیاں۔ جیسے کہ فرمایا گیا "أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنثَىٰ" تو ان احمقوں کی اس غلط اور ظالمانہ تقسیم کو تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ سے بیان فرمایا گیا کہ یہ تقسیم تو بہت ہی ظالمانہ تقسیم ہے تو ان کی اس تقسیم کی قباحت کے بیان کرنے کے لیے یہی لفظ زیادہ موزوں اور مناسب تھا تاکہ اس لفظ کے ثقل یا استکراہ فی السمع کے رنگ سے ان کی اس تقسیم کی کراہت اور قباحت بھی نمایاں کر دی جائے کیونکہ فصحاء و بلغاء کا یہ طرز ہے کہ جب ان کو کوئی ہولناک اور قابلِ نفرت امر بیان کرنا

ہوتا ہے تو وہاں کچھ ایسے ہی کلمات اور تعبیر کرتے ہیں کہ سنتے ہی سامع پر تنفر اور ہیبت کے آثار واقع ہو جائیں۔

بظاہر یہی وجہ فرق ہے کہ قرآن نے جس کسی جگہ زوجین کے باہمی قرب و اختلاط کو بیان کیا اس کے لیے لطیف کنایات اور استعاروں کو اختیار کیا۔

کہیں فرمایا:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۔ کہ وہ تمہارے واسطے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔

کسی جگہ فرمایا:

نِسَاءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ ۔ کہ تمہاری عورتیں تمہارے واسطے کھیتیاں ہیں الخ

کسی موقعہ پر اس مضمون کو "فَلَمَّا تَغَشَّاهَا" (کہ جب اس نے ڈھانک لیا اس کو) اور کسی جگہ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ (کہ حال یہ کہ پہنچ چکا ہے تم میں سے ایک دوسرے کی طرف یعنی بے حجابانہ مل چکا ہے) سے تعبیر کیا گیا اور کہیں اسی ضرورت اور تقاضہ کو پورا کرنے کے لیے عنوان "وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ" (کہ تلاش کرو اس (اولاد) کو جو اللہ نے تمہارے لیے مقدر فرمادی ہے) اختیار کیا گیا۔ کسی موقعہ پر وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۔ غرض اس سے زائد اور کوئی واضح اور صریح تعبیر اس مضمون کے لیے قرآن نے نہیں اختیار کی۔ اِلّا یہ کہ کسی مسئلہ شرعی کے خصوصی شرائط کی توضیح کے لیے لفظ دخول وغیرہ ذکر کر دیا جائے جیسے مِن نِسَاءِكُمُ اللَّاتِي دَخَلْتُم بِهِنَّ باقی کسی اور جگہ یہ لفظ بھی نہیں لایا گیا۔ اس کے برخلاف جہاں حق تعالیٰ شانہٗ کو مثلاً "حد زنا" کا ذکر فرمانا تھا وہاں کسی نوع کے استعارہ و کنایہ اور تلمیح کے بجائے ایسے بدکار اور گندہ افراد کے لیے اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي جیسا صاف لفظ اور عنوان اختیار فرمایا۔ اور

ارشاد فرمایا اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (بے شک) زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد کو مارا کرو ہر ایک کو ان میں سو سو کوڑے۔) تاکہ عنوان کو سنتے ہی اوّل مرحلہ ہی میں حساس طبیعتیں ہیبت زدہ ہوجائیں اور زنا جیسے قابل نفرت لفظ کو سن کر اس ناپاک فعل سے استنکاف و نفرت کے تمام جذبات و دواعی قلب و دماغ میں جمع کرتے ہوئے یہ فرمان خداوندی سنیں۔ چنانچہ الفاظ آیت ہی سے بہت کچھ آثار جلال و قہر خداوندی کے برس رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مقام پر بس یہی تعبیر سب سے زائد ابلغ تھی اور یہ مقام وہ مقام نہ تھا کہ اس کے لیے کوئی لطیف تعبیر اور پاکیزہ استعارہ اختیار کیا جاتا۔

اعجاز مفردات میں یہ امر بھی ہے کہ کلمات عرب میں بعض کلمات کا استعمال مفرد ہونے کی حالت میں فصیح اور اہل لسان کے نزدیک مستحسن ہے اور اگر وہ لفظ جمع استعمال کیا جائے تو فصحاء اور ارباب ذوق اس کو ثقیل شمار کرتے ہیں اور کبھی اس کا عکس ہوتا ہے کہ وہ لفظ جمع تو فصیح ہے اور اس کا مفرد مستعمل ہونا موجب ثقل ہے اور فصحاء اس سے اعراض کرتے ہیں مثلاً لفظ ارض کا استعمال مفرداً فصیح ہے اور جمع اس کی ارضین ثقیل اور غیر مستحسن ہے۔ اس لیے قرآن نے لفظ ارض ہر جگہ مفرد ہی استعمال کیا کسی موقعہ پر اس کی جمع ارضین نہیں استعمال کی گئی حتیٰ کہ کسی مقام پر سبع سمٰوات کے ذکر کے ساتھ طبقات ارض بھی اتنے ہی بیان کرنے مقصود ہوئے تو جمع کے لفظ سے اعراض کرتے ہوئے قرآن نے اس طرح تعبیر اختیار فرمائی:

اَللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ۔	اللہ نے پیدا کیے سات آسمان اور زمین سے بھی اللہ نے اسی قدر طبقے بنائے۔

اگر اس کے بجائے سبع ارضین کہا جاتا تو وہ معیار فصاحت اور خوبی کا نہ رہتا، جو لفظ الارض میں ہے اگرچہ لفظ ارضین جمع کسی کلام میں مستعمل ہونا خلاف فصاحت نہیں ہے لیکن قرآن کے اعجاز مفردات کا مفہوم تو یہی ہے کہ جس جگہ قرآن نے جو لفظ استعمال کر لیا۔ اس مقام پر وہی لفظ سب سے اعلیٰ اور سب سے زائد لطیف ہے۔ لفظ لُبّ (بمعنی عقل) مفرداً قدرے ثقل سمجھا گیا برخلاف اس کی جمع "الباب" کے کہ وہ اہل لسان کے نزدیک نہایت لطیف و مستحسن اور زبان پر خفیف سمجھا جاتا ہے تو قرآن نے کسی جگہ اس لفظ کو مفرد نہیں استعمال کیا بلکہ جہاں کہیں بھی یہ لفظ ہے جمع کے صیغہ کے ساتھ مثلاً اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۔ اسی طرح لفظ رجاء بمعنی کنارہ صیغہ جمع ارجاء کے ساتھ مستحسن ہے اسی لیے ہم قرآن میں ہر جگہ یہ لفظ صیغہ جمع کے ساتھ دیکھتے ہیں وَالْمَلَكُ عَلٰۤى اَرْجَآئِهَا کہیں رجاء مفرد نہیں آیا۔

جس جگہ کوئی کلمہ بذاتہٖ ثقیل ہوتا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا لفظ اس معنی کے لیے موضوع نہیں ہوتا جو مستحسن سمجھا جاتا ہو تو قرآن سرے سے اس لفظ ہی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس حقیقت کے اظہار کے لیے کوئی مستقل تعبیر اختیار کر لیتا ہے۔ جیسے اینٹ کے لیے لفظ آجُرّ، خرمد اور اہل مصر کے نزدیک طوب یہ لفظ ثقیل ہیں اور فصحاء ایسے ثقل اور اس قسم کے مبتذل الفاظ سے اعراض کرتے ہیں اور اس سے زائد مستحسن کوئی اور کلمہ بھی اس معنی کے لیے موضوع نہیں تھا تو قرآن نے ان سب الفاظ کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک ایسی تعبیر اختیار کی جس سے حقیقت مقصودہ واضح ہو جائے اور ایسا کوئی ثقیل، یا مبتذل لفظ بھی استعمال نہ ہوا۔ فرعون کے واقعہ میں مذکور ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ	اور فرعون نے کہا اے جماعت نہیں جانتا ہوں
مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِىْ	میں تمہارے واسطے کوئی معبود بجز اپنے تو اے
فَاَوْقِدْ لِىْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ	ہامان تو دہکا دے میرے واسطے آگ گارے (مٹی) پر

وتود علی الطین (گارے پر آگ دہکا دینا) کا عنوان اختیار فرمایا جس سے اظہار حقیقت کے ساتھ اس صنعت کی طرف بھی رہبری ہوگئی۔ (مقدمہ مشکلات القرآن)

اعجاز قرآن باعتبار ترتیب کلمات

اعجاز قرآن باعتبار ترکیب کلمات یہ ہے کہ قرآن ایک ایسی ترکیب اختیار کرتا ہے کہ اس مقام پر اس مقصد کے ادا کرنے کے لیے اگرچہ اور بھی تعبیرات ممکن تھیں لیکن قرآن نے جو تعبیر اختیار کی وہی سب سے زیادہ بلیغ اور مراد کو ادا کرنے کے لیے سب سے زیادہ جامع ہوتی ہے۔ اور اگر اس میں ذرہ برابر بھی تغیر یا تقدم یا تاخر کر دیا جائے تو وہ حسن و خوبی اور درجۂ بلاغت نہیں رہتا۔ اور نہ ہی اس تغیر کردہ تعبیر میں پوری پوری مراد اس خوبی کے ساتھ ادا ہوتی ہے مثلاً قرآن کریم میں جن کو الوہیت و معبودیت خداوندی میں شریک کرنے والوں کا رد کرتے ہوئے فرمایا۔ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ (یعنی اور تجویز کیے ان مشرکوں نے اللہ کے لیے شریک جنوں کو) بادی النظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ تعبیر اس طرح ہوتی وَجَعَلُوا الْجِنَّ شُرَكَاءَ اللّٰهِ کہ بنایا انہوں نے جنات کو اللہ کا شریک لیکن قرآن کی غرض صرف اسی امر کو بیان کرنا نہیں ہے بلکہ غرض اولاً غیر اللہ کو اللہ کی الوہیت میں شریک بنانے اور ارتکاب شرک کی قباحت کو بیان کرنا اور ثانیاً اس حماقت کو کہ شریک بھی بنایا تو جنوں کو بنایا تو گویا اس عنوان نے ان کی ہر دو حماقتوں کو نمایاں کیا۔ اول بیہودگی اور حماقت شرک مع اللہ اور پھر حماقت بالائے حماقت یہ کہ خدا کا شریک بنایا بھی جنات کو تو یہ مقصد صرف یہی تعبیر ادا کر سکتی تھی اس کی جگہ ہر ممکن تعبیر متعدد تعبیرات میں سے اس معنی کو ادا کرنے سے قاصر تھی۔ اسی لیے جعلوا اللہ شرکاء کو جعلوا کا مفعول بنا کر پھر اس سے لفظ "الجن" بدل قرار دیا۔ اس لیے اب ترجمہ ان کلمات کا اس طرح کرنا کہ بنایا انہوں نے جن کو اللہ کا شریک تقریباً غلط ہوگا کیونکہ یہ ترجمہ غرض قرآنی کو ادا

نہیں کرسکے گا، البتہ یہ ترجمہ کیا جائے اور بنائے انہوں نے اللہ (رب العزت) کے لیے شریک (کہ جو ایک عظیم الشان جرم ہے اور وہ شریک بھی اچھی مخلوق میں سے نہیں کہ فرشتہ کو خالق کا شریک بنائیں یا کسی انسان کو بلکہ خالق کے ساتھ شریک بھی بنایا تو اس کی مخلوق میں سے ارذل ترین اور بدتر مخلوق) یعنی جن کو۔[1]

امام العربیہ علامہ زمخشری نے اپنی اس عبارت سے اس نکتہ پر متنبہ کیا: قلت فما فائدۃ التقدیم قلت فائدتہ استعظام ان یتخذ اللہ شریک من کان ملکاً او جنیاً او انسیاً۔ اسی کی نظیر قرآن کریم کی اختیار کردہ تعبیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ہے جب کہ فرعون کی فوج کو تعاقب میں دیکھ کر ان کی قوم نے کہا:

اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (کہ بیشک ہم تو پکڑ لیے گئے) اس پر اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کا مقولہ ذکر کیا کہ انہوں نے اپنی قوم کو ڈانٹتے ہوئے فرمایا:

كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۔ خبردار (ایسا ہرگز نہیں یقیناً میرے ساتھ تو میرا رب ہے)

اسی مضمون کے قریب وہ الفاظ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غار ثور میں حضرت ابوبکرؓ کو تسلی دیتے ہوئے فرمائے جب کہ ابوبکر کو پریشانی تھی کفار مکہ تعاقب میں ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم کو دیکھ پائیں اور پکڑ لیں:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۔ (غمگین نہ ہو بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے)

یہ دونوں مقولے بظاہر قریب قریب ایک ہی مضمون " یعنی حق تعالیٰ کی معیت اور اس کی نصرت اور امداد کا شامل حال ہونا" ادا کر رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے جو تعبیر جس جگہ اختیار کی ہے وہی اس مقام کی غرض صحیح طور پر ادا کرسکتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جواب میں كَلَّا حرف تنبیہ اور

[1] مقدمہ مشکلات القرآن ۱۲

معیٰ ضمیرِ واحد متکلم ہے کیونکہ ان کے مخاطب وہ لوگ تھے جن پر مایوسی غالب تھی اور رحمت خداوندی کے شامل حال ہونے کا ان کے دلوں پر کوئی اثر نہ تھا، اس لیے ان کے جواب کے لیے تنبیہ کا عنوان اختیار کرتے ہوئے ضمیرِ واحد متکلم ہی استعمال کرنا چاہیے تھی کہ خبردار میرا رب تو میرے ساتھ ہے۔ برخلاف آنحضرتؐ کے خطاب سے کہ آپؐ کے مخاطب حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے جو پیکرِ صداقت اور اپنے قلب میں ایمان محکم اور رحمت خداوندی کا یقین کامل لیے ہوئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ادنیٰ تکلیف کا تصور ان کے لیے ایک غم کا پہاڑ تھا تو ان کے لیے یہی عنوان موزوں تھا، اختیار کیا گیا کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا تسلی کے کلمات اور معنیٰ ضمیرِ جمع متکلم کے ساتھ کیونکہ یہاں مخاطب اور متکلم دونوں رحمتِ خداوندی کے ساتھ ہونے پر یقین رکھتے ہیں اس لیے یہاں کے مناسب جمع متکلم ہی کا عنوان ہوسکتا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں مقصد صرف یہی عنوان ادا ادا کرسکتے ہیں جو اپنی اپنی جگہ اختیار کیے گئے۔ اگر ان دونوں مقام کی تعبیروں میں کچھ بھی تغیر کردیا جائے تو یقیناً عبارت مقصد ادا کرنے سے قاصر رہے گی تو یہ اعجاز شانِ قرآن کی اختیار کردہ ترکیب اور ترتیب میں ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں اِمْرَاَۃُ عَزِیْز (زلیخا) کا یوسفؑ کو اپنی طرف مائل کرنے کا واقعہ بیان کیا گیا۔ جس عنوان سے قرآن نے اس کو ادا کیا ہے اس مقصد کو اس کے علاوہ کوئی دوسری تعبیر ہرگز نہ ادا کرسکتی تھی۔ مثلاً فرمایا :

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا	اور پھسلایا یوسف کو ان کے نفس سے
عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ	اس عورت نے کہ جس کے گھر میں وہ تھے
وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۔	اور دروازے بند کردیئے اور کہا کہ جلدی کر

اپنی جانب مائل کرنے اور پھسلانے والی اس عورت کے لیے اور بہت سی تعبیریں ممکن تھیں اس کا نام یا امراۃ العزیز یا سیّدۃ البیت وغیرہ اور لفظ

امراۃ العزیز خود قرآن نے آگے چل کر بولا بھی ہے "وَقَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ الْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدْتُّهُ عَنْ نَّفْسِهِ" لیکن یہاں نام و لقب اور کوئی دوسرا مختصر عنوان چھوڑ کر یہ عنوان اَلَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا اختیار کیا، جس کے ذریعے ایک ایسا مقصد ادا ہو رہا ہے کہ دوسرے کسی عنوان سے اس کا ادا ہونا ممکن نہ تھا۔ وہ یہ کہ مخاطب اس عنوان کے ذریعے یہ جان لے کہ مائل کرنے والی محض کوئی عورت نہ تھی کہ وہ صرف جنسی میلان اور طبعی دواعی اور تقاضوں ہی سے مائل کرتی ہو بلکہ پھسلانے والی تو وہ تھی کہ جس کے گھر میں حضرت یوسف موجود تھے خود اسی کی طرف سے رغبت کا اظہار پھر اس کے یہاں کے انعامات اور ظاہری عطاؤں سے حضرت یوسف ممنون بھی تھے۔ اسی کے گھر میں بھی اور تنہائی و خلوت بھی۔ ان سب اُمور کے بعد نکلنے کے لیے راستوں کی بندش تھی اور اسی پر بس نہیں بلکہ اس کے تقاضوں پر لبیک نہ کہنے پر یہ تنبیہی عنوان کے ساتھ یہ بھی کہ آخر آمادگی کیوں نہیں ۔۔۔۔ مگر اللہ اکبر کیا عفت و پاکدامنی تھی کہ ان سب احوال کے جمع ہونے کے باوجود خدا کے پیغمبر کا جواب یہ ہوتا ہے مَعَاذَ اللّٰهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ (خدا کی پناہ، ہر مصیبت سے) وہ عزیز میرا محسن ہے مجھے اچھا ٹھکانا دیا (میں اس کی امانت میں کیسے خیانت کروں۔ ایسا کروں گا تو ظالم بنوں گا اور) حقیقت یہ ہے کہ ظالم لوگ کبھی فلاح نہیں پاتے تو حضرت یوسف علیہ السلام کی عفت و پاکدامنی مقصد بیان ہے وہ اس شان کے ساتھ صرف دَرَاوَدَتْه اَلَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا کے عنوان سے بیان کی جاسکتی تھی جس کے لیے قرآن نے یہ تعبیر اختیار کی۔ اہل فکر سوچ لیں۔ اور خوب سوچ لیں کہ کیا ان حقائق اور لطیف معانی کو اس تعبیر کے سوا کوئی دوسری تعبیر ادا کرسکتی تھی؟ نہیں ہرگز نہیں حَاشَا وَكَلَّا ثُمَّ حَاشَا وَكَلَّا۔

یہی وہ چیز ہے جس کو امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

ومن تامل لطائف هذا النظم وبدائع ترتیبها علم ان القرآن کما انه معجز بحسب فصاحة الفاظه و شرف معانیه فهو ایضاً معجز بحسب ترتیبه ونظم آیاته (تفسیر کبیر ص ۵۶۳ ج ۲)	اور جو شخص نظم قرآنی کے لطائف اور آیات قرآنیہ کی ترتیب اور اس کے حقائق پر غور کرے گا تو وہ یہ جان لے گا کہ قرآن جس طرح اپنے الفاظ کی فصاحت اور شرف معانی کے لحاظ سے معجزانہ شان رکھتا ہے وہ اسی طرح ترتیب کلمات اور ربط آیات کے اعتبار سے بھی معجزہ ہے۔

وجوہ اعجاز باعتبار مقاصد

قرآن کریم اسی طرح مقاصد کے اعتبار سے بھی درجۂ اعجاز رکھتا ہے۔ مقاصد قرآن مبدء ومعاد کی تحقیق انسان کے معاد ومعاش کی بہترائی، دنیا وآخرت کے فلاح ونجاح کے اصول، اصلاح عقائد اعمال واخلاق، اور معاملات کے طریقے۔ صانع عالم اور خالق کائنات کی معرفت اس کی ربوبیت وتوحید کی تعلیم۔ دلائل نبوت کا بیان اور یہ کہ خالق حقیقی کی اطاعت انسانی فطرت کا صحیح تقاضہ ہے جس فطرت سلیم پر انسان کی تخلیق ہے عبادت وبندگی کی ترغیب اور نافرمانی پر وعید۔ دنیا کی بے ثباتی، جزاء وسزا کا معیار غرض ان مقاصد کو قرآن نے ایسے معجزانہ انداز کے ساتھ ادا کیا ہے کہ دنیا کا کوئی بلیغ سے بلیغ کلام ایسے پاکیزہ مؤثر اور محیّر العقول تعبیرات کے ساتھ ادا کرنے سے یقیناً عاجز ہے۔ قرآن نے مقاصد کو کہیں ایجاز واختصار اور کہیں تفصیل وتوضیح اور کسی جگہ تمثیل وتشبیہ اور کنایات اور کسی مقام پر دلائل و براہین کے انداز میں کچھ اس طرح سے بیان کردیا ہے کہ عقل وانصاف سے نظر کرنے والے مخاطبین کے لیے ایک ایک آیت ہی قلب ودماغ کو ان مقاصد کے رنگ میں رنگ دینے کے واسطے بہت کافی ہے۔ مثلاً ایک مقام پر ارشاد

فرمایا، حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو نقل کرتے ہوئے جب کہ وہ اپنے قید خانہ کے ساتھیوں کو سمجھا رہے ہیں:

یَاصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ، مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ

کہ اے میرے دونوں قید کے ساتھیو! بتاؤ کہ متفرق اور بہت سے معبود بہتر ہیں یا اللہ واحد قہار؟ نہیں عبادت کرتے ہو تم اس معبود حقیقی کو چھوڑ کر کسی کی بجز چند ناموں کے کہ جن کو تم نے اور تمہارے آباء نے تجویز کر لیا ہے کہ جس کے واسطے نہیں نازل کیا اللہ نے کسی برہان و دلیل کو۔ شانِ حاکمی صرف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے حکم کیا کہ نہ عبادت کرو بجز اس کے اور کسی کی (یہی توحید خداوندی) دین قیّم ہے۔

ان کلمات میں توحید ربوبیت کے اثبات کے ساتھ ابطال شرک کیا گیا اور یہ ظاہر فرما دیا گیا کہ فرضی معبودوں کی پرستش مقتضائے عقل اور فطرت کے خلاف ہے ربوبیت و معبودیت کے ساتھ شانِ حاکمیت بھی صرف خدا کے لیے ہے اور صحیح راستہ فلاح و کامیابی کا اسی دین کی اطاعت و پیروی ہے۔ ایک مقام پہ یہ فرمایا گیا

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا یَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ حَتّٰٓی اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّیَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَیْهَآ اَتٰهَآ اَمْرُنَا

دنیا کی زندگانی کی مثال صرف ایسی ہی ہے جیسے کہ پانی جس کو اتارا ہم نے آسمان سے پھر مل گیا اس کے ساتھ زمین کا سبزہ جس کو کھاتے ہیں انسان اور چوپائے (بھی) یہاں تک کہ جب اختیار کر لی زمین نے اپنی رونق اور خوب مزین ہو گئی اور خیال کرنے لگے زمین کے مالک کہ (اب) ہم اس پر قدرت

لَيۡلًا اَوۡ نَهَارًا فَجَعَلۡنٰهَا حَصِيۡدًا كَاَنۡ لَّمۡ تَغۡنَ بِالۡاَمۡسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ	حاصل کر چکے ہیں۔ ناگاہ پہنچا اس پر ہمارا حکم رات میں یا دن میں پھر کر ڈالا اس کو کٹا ہوا ڈھیر۔ اس طرح کہ (گویا) کل یہاں نہ تھی کوئی آبادی (شادابی) اسی طرح ہم کھول کھول کر بیان کرتے ہیں اپنی نشانیاں (دوسرے ایک مقام پر ان اہم ترین اور متعدد) اس قوم کے لیے جو غور وفکر کرتی ہے۔
(یونس ۲۴)	
مقاصد کو اس طرح ادا فرمایا گیا: اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا لَعِبٌ وَّلَهۡوٌ وَّزِيۡنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيۡنَكُمۡ وَتَكَاثُرٌ فِى الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَوۡلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيۡثٍ اَعۡجَبَ الۡكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيۡجُ فَتَرٰٮهُ مُصۡفَرًّا ثُمَّ يَكُوۡنُ حُطٰمًا ؕ وَفِى الۡاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيۡدٌ ۙ وَّمَغۡفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضۡوَانٌ ؕ وَمَا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الۡغُرُوۡرِ ۔	جان لو کہ دنیا کی زندگانی بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ کھیل اور تماشہ اور بناؤ سنگار اور (ایک دوسرے پر) آپس میں بڑائیاں کرنا اور مال و اولاد میں کثرت کی طلب۔ (یہ سب کچھ ایک) بارش کی طرح ہے (جس کے ذریعے) بھلا معلوم ہوا کسانوں کو اس کا سبزہ پھر وہ لہلہانے لگا پھر تو دیکھے گا اس کو اس حالت میں کہ وہ زرد ہے پھر وہ ہو جاتا ہے پارہ پارہ اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور معافی بھی ہے اللہ سے اور رضامندی اور نہیں ہے دنیوی زندگی (کچھ بھی) سوائے دھوکے کے سامان کے۔
(الحدید ۲۰)	

اس آیت میں انسانی حیات کے تمام احوال اور مختلف ادوار کو بیان کرنے کے ساتھ دُنیا کی زندگانی اور اس کی حقیقت ایک نہایت ہی لطیف اور عجیب انداز کے ساتھ بیان فرما دی گئی کہ انسان کی زندگی کا پہلا دَور کھیل تماشہ ہے پھر بچپن کی منزل

ذرا آگے بڑھا اور جوانی کی شاہراہوں پر قدم رکھنا ہی تھا کہ بناؤ سنگار (یعنی فیشن) کا دلدادہ بن گیا پھر عزت وجاہ اور نام ونمود کی فکر میں پڑ گیا کچھ آگے اور بڑھا تو اولاد اور مال و دولت کی کثرت کے لیے حیران و پریشان اور کوشاں ہوا کہ زندگی آرام سے بسر ہو۔ اور جمع شدہ سرمایہ بعد میں اولاد کے کام آئے۔ مگر یہ سب شان و شوکت سامانِ فانی ہے جس کی حقیقت صرف اس کھیتی کی سی ہے جو چند روزہ بہار دکھا کر زرد پڑ جاتی ہے پھر اگلی گذشتہ چند دنوں کی اس شاداب کھیتی کا یہ حشر ہوتا ہے کہ پارہ پارہ ہو کر انسان اور جانور اس کو اپنے قدموں میں روند رہے ہیں۔ غرض یہی حال کل دُنیا کا ہے کہ فی الحقیقت وہ دغا کی پونجی اور دھوکہ کی ٹٹی ہے۔ آدمی کو اس کی عارضی بہار سے دھوکہ میں نہ پڑنا چاہیے۔ انسان کو کام وہ کرنا چاہیے جو آخرت کے لیے اس کے کام آئے وہ ایمان و عمل صالح ہے۔ یہی چیز اس کے مولیٰ کی خوشنودی کا ذریعہ ہے اور اپنے مولیٰ کی نافرمانی سخت ترین عذاب اور اس کے قہر کا سبب ہے۔ انسان کو کسی مرحلہ پر بھی عارضی اور ناپائیدار رونق کو دیکھ کر دھوکہ نہ کھانا چاہیے کہ اپنی عاقبت کو برباد کر بیٹھے۔

اعجاز قرآن باعتبار حقائق یہ ہے کہ وہ امور غامضہ اور بلند و بالا حقائق جن تک انسانی عقول اور افکار کی پرواز ممکن نہیں اور وہ مسائل جو وجوہ مختلفہ کی کشاکشی سے اہل عقل کے نزدیک محل نزاع رہے جیسے مسئلہ خلق افعال عباد کہ بندے کا اپنے افعال سے کیا اور کیسا ربط ہے اور اس فعل کا قدرت ازلیہ سے تعلق کس نوع کا ہے تو قرآن کریم نے ان مشکل اور اُلجھے ہوئے مسائل کو اس طرح واضح کیا کہ ادنیٰ تردّد کا بھی مقام نہ رہا۔ اور ایسے مواقع پر قرآن نے وہ روش اختیار کی کہ توضیح حقیقت کے لیے اس سے بہتر اور کامل تعبیر پیش کرنا طاقت بشریہ سے خارج ہے (مشکلات القرآن)

بہرحال اعجاز قرآنی کی تفہیم کے لیے یہ چند امور صرف بطور مثال ذکر کر دیئے گئے

مفسرین نے وجوہ اعجاز پر جو کچھ کلام فرمایا ہے اگر ہم اس کا اقتباس ہی لینے کا ارادہ کریں تو یہ چند اوراق اور پیش نظر مقالہ کی محدود وسعت یقیناً اس کو اپنے میں نہیں سما سکے گی اگر اعجاز قرآنی کے انواع و اقسام ہی بیان کیے جائیں تو اس کے لیے بھی ایک مستقل تصنیف چاہیے۔

علامہ ابن ابی الاصبع نے صرف فن بدیع سے متعلق لطائف اور محسنات کو جمع فرمایا تو تقریباً سو قسم کے بدائع ذکر کیے جو کلام الٰہی میں موجود ہیں جس کے لیے ان کی کتاب اِعْجَازُ الْقُرْآن دُنیا کے سامنے موجود ہے۔ اس مرحلہ پر اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ یہ وہ امور ہیں جن کا ادراک اہل علم کی نظر و فکر نے کرلیا ہے۔ باقی ان کے علاوہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کس قدر معارف و لطائف اور وجوہ اعجاز ہوں گے کہ جن کا تصور بھی نہ ہوسکا ہوگا۔ کلماتِ ربّ کی شان تو یہ ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (سورۂ کہف)

کہہ دیجیے اگر سمندر روشنائی ہو جائے میرے ربّ کے کلمات کے لیے تو سمندر ختم ہو جائیگا قبل اس کے کہ میرے ربّ کے کلمات ختم ہوجائیں اگرچہ ہم لے آئیں ایک اور سمندر اسی جیسا اس کے اضافہ کے لیے۔

تو جو شانِ کلماتِ خداوندی کی اس آیت سے مستفاد ہے کہا جاسکتا ہے کہ اس سے کم کسی طرح اس کلام الٰہی کے معارف اور خوبیوں کی شان نہیں ہوسکتی۔ اس لیے جو کچھ ہمارے پیغمبر سرورِ کائنات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ربّ کی حمد و ثنا میں فرمایا:

اَللّٰهُمَّ لَا اُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ

کہ اے اللہ میں احاطہ نہیں کرسکتا تجھ پر حمد و ثنا کا۔ بس اے پروردگار تو ایسا ہی مستحق ہے حمد و ثنا کا جیسا کہ خود نے اپنی ذات کے واسطے اختیار کی

بس ایسا ہی کچھ ہم اپنے رب پاک کے کلام کی خوبیوں اور عظمتوں کے بارہ میں کہہ سکتے ہیں ۔ ہماری زبانیں ہمارا نطق و بیان اس امر سے عاجز ہے کہ کلام اللہ کی عظمتوں اور کمالات کو بیان کر سکے ۔

قرآن کریم کا طرزِ بیان

اعجازِ قرآن کی بحث میں قرآنی فصاحت و بلاغت کا وہ اعلیٰ اور محیّر العقول معیار معلوم ہو چکا جس کے سامنے دُنیا کے تمام فصحا و بلغا عاجز و درماندہ رہے۔ ان تمام کمالات اور فصاحت و بلاغت وفن بدیع کی تمام خوبیوں کے علاوہ اور بھی بہت سی خصوصیات ہیں جو قرآن کریم کے طرز بیان میں ودلیعت رکھی ہوئی ہیں۔ مناسب ہے کہ مزید کلام اللہ کے طرز بیان کی کچھ خصوصیات اس عنوان کے تحت ذکر کر دی جائیں۔

متقدمین کے کلام کے تتبع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے طرزِ بیان کی خصوصیات میں سے ایک عظیم خصوصیت آیات قرآن میں مناسبت اور باہمی ربط ہے کہ خواہ مضامین متعدد الابواب اور مختلف موضوعات کے ذکر کیے جا رہے ہوں لیکن اس کے باوجود ہر آیت دوسری آیت کے ساتھ اس طرح مربوط ہے کہ گویا ایک لڑی میں نہایت ہی لطیف ترتیب اور تناسب کے ساتھ یہ تمام موتی پروئے ہوئے ہیں، دُنیا حیران اور عاجز ہے کہ کیسی خوبی اور لطیف پیرائے کے ساتھ ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف کلام منتقل ہو رہا ہے اور پھر مزید خوبی یہ کہ ان مضامین متعددہ و مختلفہ کے لیے نہ ابواب باندھے جا رہے ہیں اور نہ فصول قائم کی جا رہی ہیں۔ باوجودیکہ تیئیس برس کی مدت میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مختلف اوقات و احوال اور مقامات میں یہ قرآن نازل ہوا لیکن ربط و مناسبت از اول تا آخر برابر قائم ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ مناسبت و ربط کسی مقام پر لطیف ہو اور سطحی نظر رکھنے والوں کو اس کا احساس یا اس کی خوبی کا علم نہ ہوسکے

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

مناسبت و ربط

مناسبت لغت میں باہمی مشاکلت اور مقاربت کو کہا جاتا ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ متعدد آیات کو ایک معنی اور ایک ہی غرض کے ساتھ اس طرح مربوط کر دیا جائے کہ وہ ایک لڑی میں پروئے ہوئے موتی معلوم ہونے لگیں ۔ اور اس غرض و مضمون کے واسطے ان میں سے ایک ایک جملہ ایک دیوار کی اینٹوں کی طرح

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا) مضامین قرآن میں یہ موضوع بھی علماء مفسرین کے نزدیک نہایت اہم رہا ہے اور مفسرین کی ایک جماعت نے اس موضوع پر مستقل اور مبسوط و مفصل تصانیف بھی کیں ۔ علم المناسبۃ پر سب سے پہلے شیخ ابوبکر نیشاپوری نے تالیف فرمائی ۔ شیخ نیشاپوری علوم شریعت اور ادب کے امام تھے ۔ شیخ کا طریقہ تھا کہ اپنے زمانہ کے علماء سے ہر سورت کا دوسری سورت اور ہر آیت کا دوسری آیت سے ربط اور مناسبت اور حکمت ربط کا سوال کرتے ۔ لیکن جب ان علماء کا جواب شیخ کی دقت نظر اور پرواز فکر کے مطابق نہ ہوتا تو خود مناسبت اور ربط کی توضیح و تقریر فرماتے ۔ اہل بغداد ربط آیات کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کرتے تھے تو شیخ کو اہل بغداد کی یہ روش پسند نہ تھی ۔ شیخ ابوبکر نیشاپوری کے بعد دوسرے ائمہ بھی اس طرف متوجہ ہوئے ۔ امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں ربط آیات کا بہت کچھ اہتمام فرمایا ہے ۔ علامہ ابوجعفر الزبیر (جو ابوحیان کے شیخ ہیں) نے ایک کتاب "البرھان فی مناسبۃ ترتیب سور القرآن" لکھی ۔ شیخ برہان الدین بقاعی کی بھی ایک کتاب "نظم الدرر فی تناسب الآی والسور" اسی موضوع پر ہے (اتقان) شیخ سیوطیؒ کی کتاب اسرار التنزیل اور ملا مخدوم مہائمیؒ کی تفسیر "تبصیر الرحمٰن" ربط آیات پر بے نظیر کتابیں ہیں ۔ اردو ذخیرہ تفاسیر میں تفسیر حقانی اور حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ کی تفسیر بیان القرآن دیگر علوم و معارف پر مشتمل ہونے کے علاوہ ربط آیات پر بھی ان تفاسیر میں بہترین کلام فرمایا گیا ہے ۔ ۱۲

ایک دوسرے سے مربوط ہے اور استحکام و تکمیل کا باعث ہے۔

آیات قرآنیہ میں باہمی ارتباط کبھی امر عام ہوتا ہے کبھی خاص کبھی حسی کبھی عقلی کبھی خیالی اور کبھی تلازم ذہنی ہوتا ہے۔ جیسا کہ سبب و مسبب علت و معلول۔ نظیریں و ضدین وغیرہ علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ تو بعض آیات کا ذکر بعض کے بعد ظاہر الارتباط ہوتا ہے کہ دونوں میں ربط کسی طرح بھی مخفی نہیں۔ مثلاً آیت ثانیہ پہلی آیت کے لیے بمنزلۂ جزا یا کسی معلول کے لیے بمنزلہ علت ذکر کی گئی ہو یا ماقبل کا وہ تکملہ و تتمہ یا تفسیر و تشریح اور تاکید تنبیہ ہے تو ایسی صورتوں میں باہمی ربط خود بخود واضح ہے اور محتاج بیان نہیں۔ البتہ بعض مقام پر ربط مخفی ہوتا ہے جب کہ ہر دو جملے بذات خود مستقل ہوں۔ تو اب یہ دیکھنا ہوگا کہ ہر ایک دوسرے پر حروف عاطفہ (جو دو جملوں کو ایک حکم میں شریک کر دیتے ہیں) کے ساتھ معطوف ہے یا نہیں۔ اگر معطوف ہے تو ضرور ان دونوں میں ذکر کردہ علاقات میں سے کوئی نہ کوئی علاقہ ہوگا، مثلاً یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا، تو ان کلمات میں ولوج[۱] و خروج۔ نزول و عروج، ارض و سماء یعنی آسمان و زمین جو باہم علاقہ تضاد رکھتے ہیں، بذریعہ عطف جمع ہیں اور ایک سلسلۂ کلام میں شریک کر دیئے گئے ہیں۔

اسی طرح آیت وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَیَبْسُطُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ میں قبض و بسط کہ جس میں علاقہ تضاد ہے جمع کر دیا گیا۔ اسی بنیاد پر وہ تمام آیات ہیں جن میں عذاب کے بعد ثواب کا، رحمت کے بعد غضب کا، ترغیب کے بعد ترہیب وعدے کے بعد وعید اور بشارت کے بعد انذار و تخویف کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان سب میں یہی علاقہ تضاد باہمی ارتباط کا سبب ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں اکثر احکام حلال و حرام کے بیان کے بعد وعدہ وعید اور

---

[۱] ولوج بمعنی دخول اور عروج بمعنی چڑھنا۔

کبھی وہ گذشتہ واقعات بیان کیے جاتے ہیں جن میں فرمانبرداروں پر عنایت و بخشش اور نافرمانوں پر عتاب و عذاب کا تذکرہ ہوتا ہے تاکہ احکام مذکورہ کی تعمیل کی رغبت ہو اور نافرمانی سے بچیں۔

قیامت اور مرنے کے بعد راحت و رحمت اور عذاب و مصیبت کے احوال بھی بیان کیے جاتے ہیں تاکہ نتیجۂ عمل اور انجام سعادت و شقاوت بخوبی سامع کے ذہن پر نقش ہوجائے۔ اور اسی طرح کبھی احکام کے ذکر کے ساتھ آیات توحید و انعام کا بھی بعد میں تذکرہ کیا جاتا ہے تاکہ بیان احکام کے ساتھ امر و ناہی کی شان بھی معلوم ہوجائے کہ یہ ایسے احکم الحاکمین شہنشاہ رب العالمین اور منعم کے احکام ہیں۔

سورۂ بقرہ نساء اور مائدہ (جن میں غالب حصہ آیات احکام کا ہے) میں غور کریں گے تو آپ کو ان سورتوں کے مضامین میں اسی قسم کے لطائف اور مناسبتیں منکشف ہوں گی۔ یہ تفصیل تو اس شکل کی تھی۔ دو جملے یا آیتیں عطف کے عنوان کے ساتھ ہوں۔ اگر دونوں میں عطف نہ بھی ہو تو بھی کوئی نہ کوئی رابطہ اتصال اور ارتباط کلام کے لیے قرائن معنویہ میں سے ایسا ہوتا ہے، کہ اس سے کلام سابق اور لاحق کلی طور پر مربوط و ہم آہنگ محسوس ہونے لگتا ہے۔ جس کے متعدد اسباب ہیں ان میں ایک:

۱۔ تنظیر ہے (یعنی ایک شئی کو دوسری کے لیے نظیر و مثال بنانا) اس لیے کہ اہل کمال اور عقلاء کی یہ شان اور طرز ہے کہ ایک نظیر کو دوسری سے لاحق کرتے ہیں۔ اس کی مثال حق تعالیٰ کا فرمان " كَمَا اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ " ہے جس کو اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا کے بعد ذکر فرمایا گیا۔ بادی النظر سے ہر دو مضمون کے درمیان ربط نمایاں نہیں ہوتا، لیکن نوعیت تنظیر نے ہر دو مضمون کو ایک دوسرے سے پورے طور پر مربوط کردیا کہ حق تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کا حکم فرمایا آپ

مالِ غنیمت کی تقسیم اللہ کے حکم کے موافق فرمائیے اور عام امور مصلحت میں کسی کی طبعی گرانی یا مخالف کے طعن و مخالفت کی پروا نہ کیجیے۔ اسی طرح جیسا کہ جب آپؐ کو آپؐ کے ربّ نے آپؐ کے گھر سے نکالا[1] تو بعض طبائع اس میں گرانی محسوس کرتے تھے لیکن آپؐ اس کی پروا نہ کرتے ہُوئے حکم خداوندی کی تعمیل کی، جس کے نتیجہ میں اللہ نے فتح و کامیابی، اور مالِ غنیمت عطا فرمایا اور ان برکتوں کا سب نے مشاہدہ کر لیا اسی طرح اس گرانی کے بعد بھی انجام کار حق تعالیٰ کی طرف سے برکات اور رحمتوں کا مشاہدہ ہوگا۔

مضادت و تقابل

۲ - مضادت - یعنی ایک چیز کے بیان کے بعد اس کی ضد کا بیان کرنا تاکہ اس تقابل اور تضاد سے اس کی پُوری حالت منکشف ہوجائے۔ جیسے سورۂ بقرہ میں ھُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کی آیات میں اہلِ ایمان ان کے اوصاف اور دُنیا و آخرت میں ان کی نیکیوں کے ثمرات بیان کرکے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے کفار و منکرین اور منافقین کے احوال، ان کی بُرائیاں اور آخرت میں ان کے اعمالِ بد کی سزائیں بیان فرمائی گئیں۔

استطراد

۳ - استطراد - یعنی ایک مضمون کی مناسبت سے دُوسرا مضمون تبعاً ذکر کردینا

---

[1] كما اخرجك ربّك کی مراد مکّہ مکرمہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنا ہے جو اگرچہ ایذا کفار و مشرکین کے باعث تھا لیکن کائنات کی ہر چیز راحت ہو یا تکلیف سب کچھ حق تعالیٰ کے تکوینی ارادہ سے ہوتی ہے اس لیے اخراج نسبت خدا نے اپنی طرف کی یا گھر سے نکلنے کی مراد قریش کے مقابلہ کے لیے مدینہ سے میدان بدر کی طرف نکلنا ہے ۱۲

مثلاً یَا بَنِیْ آدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِكَ خَیْرٌ۔ زمخشری بیان کرتے ہیں کہ آیت ولباس التقویٰ استطراد کے طور پر ذکر کی گئی ہے کیونکہ اس سے پیشتر آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور آدم کی اس حالت کا ذکر ہوا کہ وہ لباس کے بجائے درختوں کے پتوں سے اپنا جسم ڈھانکتے تھے تو اس موقع پر تبعاً و استطراداً حق تعالیٰ نے اپنے انعامات میں نعمت لباس کا ذکر فرما دیا کہ جس سے انسان ستر عورت کر سکے اور زیب و زینت بھی۔ اور لباس صوری و ظاہری کی تبعیت میں لباس معنوی اور باطنی بھی بیان فرما دیا۔ لباس التقویٰ ذٰلك خیر کہ لباس تقویٰ ہی بہترین لباس انسانی ہے۔

حسن تخلص

۴۔ حُسنِ تخلص یعنی ایک مضمون کے بیان کے ساتھ دوسرے ایک مضمون مقصود کی طرف ایسے حسنِ اسلوب سے منتقل ہو جانا کہ سامع کو انتقال مضمون کا احساس بھی نہ ہو۔

قرآن کا یہ طرز بیان ایسا عجیب اور محیّر العقول ہے کہ اس خوبی اور کمال پر دنیا کے فصحاء و بلغاء حیران ہیں۔

مثلاً سورۂ اعراف میں انبیاء علیہم السّلام اور قرون ماضیہ کا تذکرہ چل رہا تھا اس ذیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر شروع ہو گیا کہ وہ اپنی قوم کے ستر آدمی ہمراہ لے کر طورِ طور پر حق تعالیٰ سے کلام کرنے گئے۔ جب شرف ہمکلامی حاصل ہوا تو موسیٰ علیہ السّلام نے اپنی قوم کے لیے دُعا مانگی اُکْتُبْ لَنَا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةً الخ کہ اے اللہ لکھ دے ہمارے واسطے بھلائی اس دُنیا میں اور آخرت میں بھی۔ اس پر جواب ملا کہ میری رحمت ہر شئی کو گھیرے ہوئے ہے مگر میرا عذاب بھی ہے کہ جس کو چاہوں میں وہ عذاب پہنچا دوں تو اس مقام پر

قرآن نے کلام کا رُخ پھیر کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت کے مناقب و فضائل بیان کرنے شروع کر دیئے کہ اے موسیٰ یہ رحمت خاصہ جو ہر شئی کو محیط ہے آپ کی امت کا حصہ نہیں ہے۔ یہ تو ایک آنے والے نبی اُمی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اُمت کے واسطے مخصوص ہے جن کے اوصاف و کمالات یہ ہیں:

فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

(اعراف)

(فرمایا) میں اس حسنہ و رحمت خاصہ کو لکھے دیتا ہوں اُن کے لیے جو حق تعالیٰ سے ڈرتے ہوں گے (جو منجملہ اعمال قلب ہے) اور صدقہ و خیرات کرتے ہوں گے (جو منجملہ اعمال جوارح ہے) اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہوں گے، یہ لوگ وہ ہوں گے جو اتباع و پیروی کرتے ہوں گے اس رسول نبی اُمیّ کی کہ جن کو یہ اہل کتاب لکھا ہوا پائیں گے۔ اپنے پاس توراۃ وانجیل میں جن کی صفت یہ ہے کہ وہ ان کو نیک باتوں کا حکم فرمائیں گے اور بُرائیوں سے انہیں روکیں گے اور ان کے واسطے پاکیزہ چیزیں حلال کریں گے اور حرام کریں گے ان پر خبیث و ناپاک چیزیں۔ اور ان سے سخت بوجھ کے احکام دُور کریں گے اور وہ جکڑ بندیاں جو ان پر قائم کر دی گئی تھیں۔ پس جو لوگ ان نبی اُمیّ پر ایمان لائیں اور ان کی حمایت و مدد کرتے ہوں اور اس نور (ہدایت اور اسوۂ نبویؐ کی) پیروی کرتے رہیں جو نازل کیا گیا ان پیغمبر کے ساتھ تو بس ایسے ہی لوگ فلاح و کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔"

اب اس کے بعد کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے بیان کردہ صفات اور نبی امی کی خصوصیات اس مرحلہ پہ پہنچ گئیں۔ فلاح و نجات کا انحصار اتباع محمدی میں کر دیا گیا، فوراً ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پیغام نبوت اور اور اعلان رسالت کا مضمون شروع ہو گیا۔

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا کہ اے نبی کریمؐ کہہ دو کہ اے لوگو! میں اللہ کا پیغمبر ہوں کہ جو تم سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ میں اس خدا کی طرف سے یہ پیغام لے کر آیا ہوں جس کے لیے آسمانوں، اور زمین کی سلطنت ہے جس کے قبضۂ قدرت میں ہر شئے کی اور ہر ایک کی موت وحیات ہے اس لیے بس اسی خدا پر ایمان لاؤ۔ اور اس کے نبی امی پر جو خود اللہ پر اور اس کے کلمات (احکام و اوامر) پر ایمان رکھتا ہے اسی کی اطاعت کرو۔ امید ہے کہ تم راہ راست پر آجاؤ گے۔ اشارہ گویا یہ فرما دیا کہ اے اہل کتاب تم اپنے عہد میں تحریفات کر کے گمراہ ہو چکے ہو اور تمہارا اصل مذہب تم سب سے چھوٹ چکا۔ اب تو اس نبی آخر الزمان ہی کے وسیلہ سے تم کو ہدایت مل سکے گی۔

بات چلی تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پہ اپنے قوم کے ستر منتخب افراد لے جانے اور حق تعالےٰ شانہٗ سے ہم کلام ہونے کی اس پہ حضرت موسیٰؑ کی اپنی امت کے حق میں حسنہ کی دعا بارگاہ خداوندی سے اس حسنہ دکھلائی کے لیے امت محمدیہ کا اختصاص اس امت اور اس کے پیغمبر نبی امی کی صفات ذکر الٰہی کی پیروی میں فلاح ونجات کا انحصار یہ سب کچھ بیان ہوتے ہوتے ناگہاں پھر کلام الٰہی شروع ہوتا ہے۔ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ یَعْدِلُوْنَ کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سب کے سب ہی گمراہ مذہب حق سے بھٹکنے والے نہیں ہیں بلکہ ان میں سے ایک جماعت ایسی بھی ہے

لہ الاتقان فی علوم القرآن صـ ۱۰۹ ج ۲ - ۱۲

جو حق کی رہنمائی کرتی ہے اور خود حق پر چلتے ہوئے عدل و انصاف کا طریقہ اختیار کرتی ہے جیسا کہ عبداللہ بن سلامؓ اور کعب احبارؓ کہ ایسے حضرات تورات و انجیل کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے ہیں۔

اس حسن تخلص اور استطراد پر غور فرمائیے کہ یہ تمام کلمات موتی ہیں، جو ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ استطراد اور حسن تخلص میں فرق یہ ہے کہ استطراد میں دوسرے مضمون کے ذکر کے بعد فوراً ہی اصل مضمون کی طرف پھر کلام لوٹ آتا ہے۔ اور حسن تخلص میں ایک مضمون سے دوسرے کی طرف اس خوبی کے ساتھ کلام کا رُخ پلٹتا ہے کہ سامع کو محسوس تک بھی نہیں ہوتا اور دوسرا مضمون اس طور پر مسلسل بیان ہوتا ہے کہ ہر دو مضمون میں ایسا اتحاد اور ارتباط ہوتا ہے کہ مخاطب دونوں کو ایک ہی مسلسل اور مربوط مضمون خیال کرتا ہے۔

سورۂ شعراء میں حضرت ابراہیمؑ کا قول نقل کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے ربّ سے یوں مناجات فرماتے تھے وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ کہ اے میرے پروردگار مجھے رُسوا نہ کرنا اس دن جب کہ سب لوگ اُٹھائے جائیں گے۔ اس بیان کے ساتھ ہی ساتھ فوراً آخرت اور معاد کے احوال کی طرف کلام لوٹ گیا۔ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ الخ یعنی وہ دن کہ اس میں نہ نفع دے گا مال اور نہ انسان کے بیٹے (اولاد) الخ۔

غرض قرآن کریم کا یہ خصوصی طرز بیان ایسا نرالا اور عجیب ہے کہ اس کی عظمت و برتری عقول انسانی احاطہ کرنے سے عاجز ہیں بطور نمونہ یہ کلمات عرض کر دیئے گئے۔[1]

سورتوں کے فواتح و مقاطع میں ربط

اسی طرح سورتوں کے فواتح و مقاطع (ابتدائی آیات اور انتہائی کلمات)

[1] الاتقان فی علوم القرآن صفحہ ۱۱۱ ج ۲۔

میں بھی ایک عجیب ربط اور مناسبت کہ دنیا میں کسی فصیح و بلیغ کے کلام میں اس کی نظیر ممکن نہیں[1]۔

مثلاً سورۃ بقرہ کی ابتداء الٓمٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الخ سے ہے کہ یہ کتاب ایسی ہے کہ جس میں کوئی شبہ نہیں جو پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے۔ اس کے بعد پرہیزگاروں کے اوصاف بیان فرماکر ان کی ضد کافروں کے خصائل ذکر کیے۔ اس سورت کا خاتمہ یہ ہے وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔

جس میں کتاب کے ہدایت ہونے اور پرہیزگاری کے دنیوی اور اخروی نتیجہ کا بیان ہے کہ تقویٰ اور ایمان کا اخروی ثمرہ تو یہ ہے کہ خداوند عالم خطا اور لغزشیں معاف فرمائے۔ جو اشارہ اس مضمون کی جانب بھی رہنمائی کر رہا ہے کہ انسان خواہ کتنا ہی پرہیزگار ہو مگر بشریت کی لغزشوں سے وہ پاک نہیں۔ اور یہ بشری لغزشیں منافی تقویٰ نہیں اس کے لیے وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا کہنے کی تعلیم فرمائی۔ اس کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ صرف بخش دینا ہی کافی نہیں بلکہ حق تعالیٰ شانہ کی عنایت اور دار البقاء کی نعمتوں کا ملنا بھی مقصد اعلیٰ ہے تو اس کے لیے اور نیز دنیا میں عزت و عافیت کے ساتھ رہنے کے لیے "وَارْحَمْنَا" کہنے کی تعلیم فرمائی اور ایمان و تقویٰ کا دنیوی ثمرہ خدا کی مدد، فتح و نصرت اور مخالفین پر غلبہ ہے تو اس کے لیے اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ کلمات ذکر فرما کر سورت کو ختم کر دیا گیا کہ فتح و نصرت کا حاصل ہونا اور خدا کا حامی و مددگار ہونا ایمان

---

[1] مفاتح و مقاطع سور پر مفسرین نے مستقلاً کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ شیخ جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب "مراصد المطالع فی تناسب المقاطع والمطالع" اور علامہ بکر باقی کی "العجائب" اس موضوع پر بہترین تصنیف ہیں۔ ۱۲۔

وتقویٰ کا ثمرہ ہے اور مقہور ومغلوب ہونا کفر وبدکاری کا نتیجہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ ابتداء سورت میں ایمان وہدایت اور تقویٰ اس کے بالمقابل کفر ونفاق اور خصائل کفر ونفاق کا ذکر تھا تو اختتام سورت ایمان وتقویٰ اور کفر وبداعمالیوں کے ثمرات وانجام کے بیان پر فرمایا گیا جس سے مبدا ومنتہا میں نہایت ہی لطیف وعجیب مناسبت اور ربط ظاہر ہوگیا۔

اسی طرح سورۂ آل عمران کی ابتدا "الٓمٓ اللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَالْحَیُّ الْقَیُّوْمُ نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىۃَ وَالْاِنْجِیْلَ مِنْ قَبْلُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ" ہے جس میں حق تعالیٰ کی وحدانیت اس کی حیات وقیومیت کے بیان کے ساتھ یہ ظاہر کردیا گیا کہ ان اوصاف کے مقتضیات میں سے یہ امر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد ملتِ ابراہیمیہ زندہ اور قائم رہے جو کہ توحید کی بنیاد اور تمام ملل سماویہ کے لیے قوام ہے تو اس کے واسطے تین کتابیں نازل فرمائیں۔

"اے نبی کریمؐ آپ پر قرآن اتارا جو توحید کا خزانہ اور حیاتِ ابدی کا سرچشمہ ہے۔ اور اس ذاتِ حی وقیوم نے اپنی ان دو صفات کے مطابق قرآن میں دو صفتیں رکھیں اوّل یہ کہ وہ حق ہے کہ باطل کا اس کے قریب بھی کوئی گذر نہیں اور اس کتاب کا سراپا حق ہونا اس کی حیات وبقاء اور دوام کی دلیل ہے کیونکہ حق کی شان بقاء ہے اور باطل کی حقیقت فنا وزوال ہے تو اس طرح قرآن خداوند عالم کی شانِ حیات کا ایک مظہر بنا ہوا ہے دوسرے یہ کہ قرآن اپنے سے پہلی کتب سماویہ کی تصدیق کرنے والا ہے گویا قرآن ان کے لیے ذریعۂ بقاء ہے۔ اور قرآن ہی نے ان کو قائم کر رکھا ہے تو اس طور پر قرآن حق تعالیٰ کی صفت قیومیت کا نمونہ بنا ہوا ہے اور اسی مقصد کے واسطے تورات وانجیل بھی نازل فرمائی۔ قرآن میں دو صف

ہیں اوّل یہ کہ وہ دُنیا میں تھوڑا تھوڑا ہوکر تئیس برس کی مدت میں نازل ہُوا تو اس لحاظ سے نزّل کا لفظ ذکر فرمایا جس کے معنی تھوڑا تھوڑا اُتارنے کے ہیں اور الکتاب کے عنوان سے تعبیر کیا کیونکہ وصف کتابیت بھی پارہ پارہ ہوکر وجود میں آنے کو مقتضی ہے۔ دوم یہ کہ وہ بیت المعمور اور لوح محفوظ سے آسمان دُنیا پر بیک وقت نازل ہُوا تو اس کا لحاظ کرتے ہوئے لفظ انزل سے جس کے معنی بیک اُتارنا ہے اور فرقان کے لفظ سے تعبیر فرمایا تو گویا توریت وانجیل کے مقابلہ میں قرآن دو صفتوں کے ساتھ دوبار بیان فرمایا جس سے یہ بات ظاہر ہورہی ہے کہ جو کچھ تورات وانجیل میں ہے وہ سب کچھ قرآن میں موجود ہے اس لیے قرآن میں تین وصف ہوگئے۔ دو تو وہی اور تیسرا فرقان ہونا۔ اور یہ تینوں اوصاف خدا کے بیان کردہ تینوں اوصاف توحید، حیات اور قومیت سے پوری پوری مناسبت رکھتے ہیں تو یہ تھا آل عمران کا مبداء۔ اب جب یہ سورت اپنے منتہا پر پہنچی ہے تو اس کا اختتام ان کلمات پر ہوتا ہے :

یَآاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ کہ اے ایمان والو صبر و برداشت کرو اور مقابلہ میں ثابت قدم رہو۔ اور نیک کاموں میں دل لگائے رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اُمید ہے کہ تم فلاح و کامیابی حاصل کرلوگے۔

انسانی سعادت کا مدار انہیں تین اوصاف پر ہے (نفسانی خواہشات شہوتوں اور لذائذ فاسدہ سے اپنے کو بچانا۔ یہ بچانا صبر و برداشت ہے اور جب نفس امارہ کا حملہ ہو تو مقابلہ میں مستحکم اور مضبوط رہنا یہ صابروا ہے۔ نیک کاموں کو عمل میں لانا اور خدا سے دل لگانا یہ رابطوا ہے۔

اللہ سے ڈرتے رہنا کسی وصف پر مغرور نہ ہونا برے کاموں سے بچنے اور نیک کاموں میں دل لگانے کا محرک یہی تقویٰ ہے۔ اس سعادت کے حاصل ہونے کے بعد پھر فلاح ہی فلاح ہے۔ چونکہ خدا کی تمام کتابوں کا لب لباب یہی ہے،

اس لیے سورت کو اسی پر ختم فرما دیا ۔ سبحان اللہ کیا عجیب ربط و مناسبت ہے ۔ شروع سورت میں کتابیں تین بیان ہوئی تھیں تو اس مناسبت سے اختتام سورت پر موجبات سعادت بھی تین ہی بیان کیے گئے ۔ مگر قرآن کو چونکہ دو صفتوں کے لحاظ سے دو بار ذکر کیا گیا تھا تو اس اعتبار سے گویا عدد چار ہو گیا تھا تو اسی طرح اصبروا و صابروا قدرے تفاوت اور فرق کے ساتھ ذکر فرما دیا گیا جس کے لحاظ کے بعد موجبات سعادت کا عدد بھی چار ہو جاتا ہے[1] ۔

مفاتح سور (یعنی سورتوں کی ابتدائی آیات وکلمات) کے مضامین سے ربط

قرآن کریم کا ایک خاص طرز بیان یہ ہے کہ سورت میں مضمون زیادہ تر مقصود بیان اور ملحوظ ہے ، اسی کی مناسبت سے ابتداء میں الفاظ لائے گئے ۔ تلاش وتحقیق سے مجموعی طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قرآن نے سورتوں کی ابتداء دس قسم سے کی ہے ۔

۱ ۔ حق تعالیٰ کی حمد وثناء جس کی تعبیر گاہ بگاہ صفات کمالیہ اور محامد کے اثبات کے ساتھ ہوتی ہے اور کسی مقام پر ہر عیب ونقصان سے تقدیس وتنزیہ کے عنوان سے ہوتی ہے ۔ پانچ سورتوں کو تحمید کے ساتھ شروع کیا اور دو تَبَارَكَ الَّذِي کے عنوان سے جس میں دلالۃً ذات باری تعالیٰ کے لیے اثبات حمد ہی ہے ۔ سات سورتوں کو لفظ سُبْحَان سے لیکن اس کے ساتھ یہ خوبی ملحوظ رکھی کہیں عنوان مصدر ہے اور کہیں ماضی اور مضارع اور کہیں صیغہ امر مثلاً "سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ ۔ (اسراء) سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ (سورہ حدید) ، يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ (سورہ جمعہ) سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى (اعلیٰ)

۲ ۔ حروف تہجی سے جو انتیس سورتوں کے شروع میں اختیار کیے گئے ۔ مثلاً الٓمّٓ ۔ الٓرٰ ۔ الٓمّٓرٰ ۔

---

[1] البیان فی علوم القرآن ۔ الاتقان ۱۲

۳۔ حروف نداء سے دس سورتوں کو شروع کیا گیا جن میں سے پانچ کو نداء رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع کیا مثلاً سورۂ احزاب، طلاق، تحریم مزمل اور سورۂ مدثر اور پانچ کو بنداء امت شروع کیا گیا۔ سورۂ نساء، مائدہ، حج، حجرات اور ممتحنہ۔

۴۔ تئیس سورتوں کو جملہ خبریہ سے شروع کیا۔ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ۔ بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ۔ اَتٰى اَمْرُ اللّٰهِ۔ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ اَنْزَلْنٰهَا۔ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ۔ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ۔ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ۔ اَلْحَاقَّةُ مَا الْحَاقَّةُ۔ سَاَلَ سَائِلٌ۔ اِنَّا اَرْسَلْنَا نُوْحًا۔ لَا اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔ لَا اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ۔ عَبَسَ۔ اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ۔ لَمْ يَكُنْ۔ اَلْقَارِعَةُ۔ اَلْهٰكُمُ۔ اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ۔

ابتداء بعنوان قسم

۵۔ پندرہ سورتوں کو قسم سے شروع کیا۔ ایک میں ملائکہ کی قسم ہے۔ وَالصّٰٓفّٰتِ۔ صفا اور دو میں آسمانوں کی وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ۔ وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ اور چھ میں ان کے لوازم کی۔ وَالنَّجْمِ۔ وَالْفَجْرِ۔ وَالشَّمْسِ۔ وَاللَّيْلِ۔ وَالضُّحٰى۔ وَالْعَصْرِ۔ اور دو میں ہوا کی جو ایک عنصر ہے۔

وَالذّٰرِيٰتِ۔ وَالْمُرْسَلٰتِ۔ وَالطُّوْرِ میں زمین کے ایک جز کی جو پہاڑ ہے۔ وَالتِّيْنِ میں نبات کی۔ وَالنّٰزِعٰتِ میں حیوان ناطق۔ یا ایک قسم کے ملائکہ کی۔ وَالْعٰدِيٰتِ میں حیوانات میں سے ایک نوع خاص یعنی گھوڑوں کی

ابتداء بعنوان شرط وصیغہ امر اور استفہام

۶۔ عنوان شرط سے سات سورتیں شروع کی گئیں۔ اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ۔ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ۔ تکویر۔ انفطار۔ انشقاق۔ زلزلہ

اور اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰہِ ۔

۷۔ صیغہ امر چھ سورتوں کے شروع میں لایا گیا۔ قُلْ اُوْحِیَ ۔ اِقْرَاْ ۔ قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ ۔ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ ۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۔

۸۔ صیغہ استفہام چھ سورتوں کے شروع میں ۔ ھَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ ۔ عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ ۔ ھَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَۃِ ۔ اَلَمْ نَشْرَحْ ۔ اَلَمْ تَرَ ۔ اَرَاَیْتَ ۔

۹۔ تین سورتوں کے شروع میں وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ ۔ وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ ۔

۱۰۔ ایک سورت تعلیل کے ساتھ ، لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۔

کلام اللہ کی سورتوں میں اختیار کردہ مضامین کے ساتھ مفاتح سور کی مناسبت کے لیے ایک دو مثال بیان کردینا کافی ہے مثلاً سورۂ کہف جس کے شروع میں " اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ " ہے اس میں چند باخدا لوگوں کے واقعات ہیں ۔ اصحاب کہف کا اور ان دو شخصوں کا جنہوں نے بڑا سرمایہ صرف کرکے باغ بنایا پھر ان میں سے ایک کے غرور اور کفران نعمت کی وجہ سے اس کے باغ پر تباہی اور بربادی آئی اور دوسرے کے باغ میں اس کی خدا ترسی اور اطاعت و نیکو کاری کی وجہ سے خیر و برکت ہوئی ۔ موسیٰؑ اور خضرؑ کے ذکر میں یہ ہے کہ نیکوکار لوگ اور ان کے پسماندگان مصائب سے محفوظ رہتے ہیں ۔ دنیا میں بھی ان کو نیکی کا پھل ملتا ہے اور آخرت میں بھی

ذوالقرنین کا واقعہ ہے جس کو خدا نے نیکو کاری اور تقویٰ کی بدولت ہر قسم کے سامان عطا کیے اور وہ اس بلندی پر پہنچنے کے بعد بھی خدا پرست رہا ۔ مظلوموں کی حمایت کی کہ ایک دیوار بنا کر یاجوج ماجوج کو روک دیا ۔ مختلف مواقع میں دار آخرت اور نیکوکاری کے ثمرات نافع اور

اس کے بالمقابل بُرائی کے دُنیا و آخرت میں بُرے انجام کا بھی بیان ہے۔ ایسے واقعات گذشتہ کا بیان جن کو دُنیا کی کوئی تاریخ اس تحقیق و تفصیل سے نہیں بتاتی۔ ان حقائق و معارف کے ساتھ خدا کی ایک بڑی نعمت و رحمت ہے جو قرآن کے ذریعے بندوں پر پہنچی اس لیے اس کے مطلع (افتتاح) اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتَابَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا سے آنا گویا سورت کے تمام مضامین کا عنوان شروع ہی میں قائم کر دینا ہے۔

اسی طرح سورۂ فاتحہ (جو قرآن کی اوّل سورۃ اور ام القرآن ہے) کے شروع میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لایا گیا کیونکہ قرآن کریم کے جو اہم مقاصد ہیں وہ اس میں بالاجمال جمع کر دیئے گئے جن کی تفصیل باقی تمام سورتوں میں ہے اور یہ چیز حق تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر بڑی نعمت ہے جس پر حمد کرنا مناسب بلکہ حق شناسی ہے۔ اسی لیے ابتداءً الحمد لاکر اشارۃً اجمالی کر دیا کہ اس کے بعد جو کچھ ارشاد ہوگا وہ سراپا نعمت و رحمت ہی ہوگا۔ (البیان فی علوم القرآن)

لہ انبیاء علیہم السّلام کی معرفت جس قدر علوم نازل ہوئے ان کا انحصار حسب ذیل ہے:
علم الاصول جس کا مدار خدا کی ذات و صفات کی معرفت پر ہے اس کا بیان اوّل جملہ الحمد للہ رب العالمین میں ہے۔ علم النبوت جس کی طرف الذین انعمت علیھم میں اشارہ ہے۔ معرفت معاد جس کی طرف مالک یوم الدین میں اشارہ ہے۔ علم العبادات اس کی طرف ایاک نعبد میں اشارہ ہے۔ علم السلوک یعنی نفس کو آدابِ شرعیہ اور انقیاد و ربِّ البریہ کا پابند بنانا، اس کی طرف ایاک نستعین اھدنا الصراط المستقیم میں اشارہ ہے۔
امم ماضیہ کے احوال پر مطلع ہونا تاکہ مطیعین کی سعادت اور نافرمانوں کی شقاوت معلوم ہوسکے۔ اس کی طرف صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین میں اشارہ ہے۔

قرآن کریم کا طرزِ خطاب

قرآن کریم کا طرزِ خطاب اور اس کے انواع و اقسام آئمہ مفسرین کے نزدیک نہایت اہم موضوع رہا ہے۔ شیخ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ علامہ ابن الجوزیؒ نے پندرہ وجوہ طرزِ خطاب کے اپنی کتاب "النفیس" میں جمع کیے۔ دوسرے حضرات مفسرین نے تیس سے زائد شمار[1] فرمائے۔ (تفصیل کے لیے الاتقان فی علوم القرآن صـ۲۳ و صـ۲۴ جلد ۲ کی مراجعت کی جائے)

قرآن کریم کے خصوصیات خطاب میں دیگر اسباب بلاغت مثلاً مجاز، استعارہ، کنایہ اور تشبیہ و تمثیل نیز تمام اقسام بدیع کا جمع ہونا ہی ہے جن کا استعمال ہونا قرآن میں نہایت ہی خوبی اور کمال کے ساتھ ہوا ہے۔

---

[1] ہر سورت اپنے بیان میں ایک مستقل نامۂ شاہی یا فرمان شاہی کی حیثیت رکھتی ہے اور شاہانہ فرامین کی شان مختلف ہوتی ہے۔ کبھی تو نفس مضمون سے ابتداء ہوتی ہے اس کی مثال وہ سورتیں ہیں جن کی ابتداء جملہ خبریہ سے ہے اور کبھی عنوان میں بھیجنے والے کی شان کا اظہار ہوتا ہے جیسے از طرف شاہان شاہ اس لیے بعض سورتوں کی ابتداء میں حق تعالیٰ کی عظمت و جبروت یا صفاتِ کمال کا بیان ہوتا ہے مثلاً تنزیل الکتاب من اللہ العزیز الحکیم۔

اور کبھی مکتوب الیہ کی طرف خطاب ہوتا ہے جیسے بنام فلاں۔ اس لیے بعض بعض سورتیں یاایہا النبی اور یاایہا المزمل جیسے خطاب سے شروع ہوتی ہیں اور کبھی فرمان شاہی مختصر ہوتا ہے اور کبھی مطول تو اسی طرح کچھ سورتیں مختصر ہیں اور کچھ طویل کبھی فرمان شاہی میں اظہار جلال و عظمت کا ہوتا ہے اور کبھی اظہار عنایت و مرحمت تو یہی حال سورتوں کا ہے۔ ۱۲

علامہ بن ابی الاصبع نے اسی موضوع پر ایک کتاب "اعجاز القرآن" لکھی جس میں تقریباً سو قسم کے بدائع ذکر کیے ہیں۔ مجاز فی القرآن ہی کا موضوع اس قدر وسیع ہے کہ اس کی تفاصیل کے لیے ایک مستقل تصنیف چاہیے۔ شیخ عز الدین بن عبدالسلامؒ نے اس پر مستقل تصنیف فرمائی جس کی شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے تلخیص کی اور اس کا نام "مجاز الفرسان الی مجاز القرآن" رکھا۔

حق تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال رہی تو ناچیز اعجاز قرآن پر ایک مستقل رسالہ میں ان وجوہ بلاغت اور مجاز فی القرآن کے محاسن کو بقدر استطاعت جمع کرکے ہدیۂ ناظرین کرے گا۔

ایجاز و اطناب

انواع بلاغت میں سے ایجاز و اطناب بھی عظیم ترین نوع ہے جس کی رعایت سے کلام کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ اور اس کو نظر انداز کر دینے سے کلام حسن و خوبی کے معیار سے بلغاء کے نزدیک گر جاتا ہے۔ یہاں تک صاحب "سر الفصاحۃ" نے بعض آئمہ سے یہ نقل کیا ہے کہ بلاغت ایجاز و اطناب ہی رعایت کا نام ہے۔
علامہ زمخشری بیان کرتے ہیں کہ جس طرح مواقع اجمال میں بلیغ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اجمال و ایجاز کو اختیار کرے۔ اسی طرح مواضعِ تفصیل و تنقیح میں یہ لازم ہے کہ وہ بسط و تفصیل کے ساتھ کلام پیش کرے۔

علامہ قزوینی بیان کرتے ہیں کہ ادائے مقصود کے لیے تعبیر یا تو مقصود و مراد کے مساوی ہوگی یا اس کی نسبت سے کم ہوگی۔ لیکن وہ تعبیر اپنے اختصار کے باوجود مراد بخوبی ادا کر رہی ہو۔ یا مقصود و مراد سے تعبیر زائد ہوگی کسی نکتہ اور فائدہ کی وجہ سے۔ اوّل قسم کلام میں مساوات ہے۔ دوم ایجاز اور سوم اطناب بلغاء کے نزدیک مساوات کی قسم اور اس کے احکام زائد زیر بحث نہیں آتے۔ وجوہ بلاغت میں ایجاز و اطناب ہی موضوع بحث رہتے ہیں۔ (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

قرآن کریم نے اپنی تعبیر میں ان دونوں پہلوؤں کی رعایت حد اعجاز تک کی ہے۔ شیخ سیوطی نے الاتقان میں ایک مستقل فصل میں ان تمام انواع اعجاز کو جمع کیا ہے جو قرآن کریم میں مذکور ہیں۔

قرآن کریم نے اپنے خطاب میں جو طرز ایجاز اختیار کیا دنیا کے فصحا، اس سے عاجز ہیں کہ کس خوبی کے ساتھ چند الفاظ میں حقائق اور معانی کے بے شمار خزانے اور کثیر مضامین جمع کر دیئے گئے، مثلاً آیت مبارکہ:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَا لْمُنْکَرْ۔	بیشک اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے عدل و انصاف اور بھلائی کا اور قرابت داروں کے حقوق ادا کرنے کا اور منع کرتا ہے ہر بے حیائی اور بُرے کام سے۔

تو اس آیت میں لفظ العدل سے اس صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرمائی جو افراط و تفریط کے درمیان عین اعتدال و توسط کا راستہ ہے جس کے ضمن میں اعتقادو اخلاق عبودیت معاملات و معاشرت کی تمام ذمہ داریوں کی تکمیل اور ان کی اصلاح و درستگی کو بیان کر دیا گیا۔

الاحسان سے عبادت کے حسن و کمال اخلاص اور خشوع و خضوع کے اس مرتبہ کو بیان فرما دیا جس کی تعلیم " اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ " کے عنوان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو دی۔ اِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی سے حقوق واجبہ کے بعد تبرع و احسان اور اہل قرابت کے ساتھ حُسن سلوک اور پاکیزگی معاشرت کا مضمون ادا کیا گیا۔ وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ سے تمام معاصی سے اجتناب اور قوت شہویہ سے بچنے کی تعلیم ہے اور المنکر سے اس افراط و غلو اور تعدی کو منع کیا گیا جو انسان کی قوت غضبیہ کے آثار میں سے ہے اور

لے: ایجاز و اطناب کی تعریف میں بلغاء اور علماء اہل عربیہ کی تعبیریں مختلف ہیں۔ تفصیل کے لیے کتب معانی کی مراجعت کی جائے۔ ۱۲ منہ

وَالْبَغْيِ سے اس جور و تسلط کو رد کیا گیا جس کا منشاء قوتِ دہمیہ ہے۔ اسی مضمون کو ابن مسعودؓ کے یہ الفاظ ادا کر رہے ہیں:

مَا فِي الْقُرْآنِ آيَةٌ اَجْمَعُ لِلْخَيْرِ وَالشَّرِّ مِنْ هٰذِهِ الْآيَةِ (الحاکم)

"کہ قرآن کریم میں کوئی آیت خیر و شر کے لیے اس آیت سے زیادہ جامع نہیں ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں حسنؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایک روز اس آیت کو تلاوت کیا، تلاوت کرنے کے بعد ٹھہر گئے اور فرمایا (اے لوگو!) اللہ نے اس ایک ہی آیت میں تمہارے واسطے ہر قسم کی خیر اور ہر قسم کے شر کو جمع کر دیا ہے۔ حق تعالیٰ کی طاعت و بندگی میں سے عدل و احسان کے کسی مرتبہ کو نہیں چھوڑا مگر یہ کہ اس آیت میں جمع کر دیا اور نہ ہی اللہ کی معصیتوں میں سے فواحش و منکرات اور جور و ظلم کے کسی پہلو کو باقی رکھا کہ جو اس آیت میں نہ بیان کر ڈالا ہو۔

ابن شہاب الزہری سے حدیث بعثت بجوامع الکلم کی شرح میں منقول ہے فرمایا مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ جوامع کلم یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے ایک ہی دو کلموں میں ان امور کثیرہ (علوم بلیغہ) کو جمع کر دیا کہ جو آپ سے پہلے متعدد کتابوں میں لکھے جاتے تھے یعنی آپ کے جامع کلمات اپنے میں معانی اور علوم کی وسعت و کثرت رکھتے ہیں کہ اس وسعت و کثرت کو کتابوں کے ذخیرے کو اپنے میں سما سکتے تھے۔ تو جب حق تعالیٰ کی جانب سے عطا کردہ اس قدرت کی بدولت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمات مبارکہ کی یہ شان ہے تو خود اس رب العزت کے کلام پاک کی جامعیت کا کیا ٹھکانا ہوگا؟ انسانی افکار اس منتہیٰ تک پرواز سے قاصر ہیں۔

اسی طرح آیت "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ" ہے کیونکہ اس کے معنی کثیر ہیں اور الفاظ نہایت ہی مختصر و قلیل ہیں۔ یہ الفاظ و کلمات اس امر کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ جب انسان کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ قتل و خونریزی کا انجام

لہ الاتقان ص۱۵۵ ج ۲۔

قصاص ہے تو قاتل و خونریز قسم کا انسان خود بھی اقدام قتل سے باز رہے گا۔ جس کے باعث دوسرے کی حیات کو بھی اتلاف و اضاعت سے محفوظ رکھے گا۔ اور اپنی زندگی بھی قصاصاً ختم کر دیئے جانے سے بچا لے گا۔

اہل عرب کے یہاں اس مضمون کو ادا کرنے کے لیے جو مشہور و معروف اور مایۂ ناز جملہ "القتل انفی للقتل" تھا۔

کلام اللہ کی یہ مختصر سی آیت فصاحت و بلاغت لفظی اور معنوی خوبیوں عرب کے اس مقولہ سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔ علامہ ابن الاثیر بیان کرتے ہیں کہ کلام خالق کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں۔ جو کچھ وجوہ فضیلت علماء بیان کرتے ہیں وہ صرف ان کے اذہان اور وسعت علمی کے بقدر ہوتا ہے۔ ورنہ کلام اللہ کی خوبیاں تو ان بیان کردہ خوبیوں سے بہت بڑھی ہوئی ہیں۔

آیت قرآنیہ کو اہل عرب کے مقولہ سے حروف میں کم ہونے کے علاوہ وجوہ ذیل کے اعتبار سے فوقیت و برتری ہے:

۱۔ مقولۂ عرب میں قتل کو قتل سے رکاوٹ کا ذریعہ بیان کیا گیا تو یہ عنوان مستلزم حیات اور ذریعۂ بقاء زندگانی نہیں برخلاف آیت وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ کے کہ قصاص کو عین حیات صراحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ غرض مطلوب حیات ہی ہے۔

۲۔ نیز حیٰوۃ پر تنوین تعظیم ہے جو حکم قصاص کو حیاۃ عظیم ظاہر کر رہی ہے۔

۳۔ بسا اوقات قتل مزید قتل و خونریزی کا ذریعہ بنتا ہے برخلاف قصاص کہ وہ ہر حال اور ہر صورت میں حیات ہی حیات ہے۔

۴۔ آیت تکرار لفظ سے خالی ہے اور مقولۂ عرب میں لفظ قتل مکرر ہے اور کلام مختصر کا تکرار لفظ پر مشتمل ہونا فصاحت کے لیے مخل ہے۔

۵۔ آیت میں کسی لفظ کے مقدر ماننے کی ضرورت نہیں برخلاف اس مقولہ کے کہ اس میں عبارت کی تقدیر اس طرح مانی جائے گی۔ اَلْقَتْلُ قِصَاصًا

النفی للقتل ظلماً تو ہر اسم تفضیل کے ساتھ قصاصاً اور ظلماً کا اعتبار کرنا ہوگا۔

۶۔ آیت میں صنعت طباق قصاص وحیات کے اجتماع کی وجہ سے ہے برخلاف مقولۂ عرب کے۔

۷۔ لفظ قتل طبائع سلیمہ کے لیے منکر اور قابل دہشت محسوس ہوتا ہے۔ اور قصاص وحیات مانوس طبع معلوم ہوتے ہیں۔

۸۔ لفظ قصاص قتل اور دوسرے جرائم (مثلاً مجروح کردینا اعضاء انسانی کو تلف اور ضائع کردینا) کے قانون کو جامع اور کلی طور پر بیان کر رہا ہے کہ قانون اسلام مساوات و برابری ہے۔ برخلاف مقولۂ عرب کے کہ اس نے صرف قتل ہی کی صورت پر دلالت کی، دوسرے کسی مجرمانہ اقدام کا کوئی قانون ان الفاظ سے ماخوذ نہیں۔

بحث ایجاز حذف اور اس کی صورتیں

اقسام ایجاز میں سے ایک ایجاز حذف بھی ہے جس کی مختلف اور متعدد صورتیں ہیں کلام اللہ میں ایجاز کی یہ نوع بھی پائی جاتی ہے۔ کلام میں کبھی ایجاز حذف جملہ سے ہوتا ہے خواہ ایک جملہ مستقلہ کا حذف ہو یا متعدد جملوں کا۔

مثلاً آیت فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ کہ ہم نے موسیٰؑ کو حکم دیا کہ اپنا عصا اس پتھر پر مارو تب اس پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے تو یہاں ایک جملہ فَضَرَبَ بِهَا یعنی عصا مارا محذوف ہے۔ چونکہ یہ جملہ سبب ہے بارہ چشموں کے نکلنے کے لیے تو مسبب مذکور ہونے کی صورت میں قرینۂ مقام سے سبب کا مضمون خود بخود سمجھا جا سکتا تھا اس لیے جملہ سببیہ حذف کردیا گیا۔

اسی طرح آیت كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ۔

النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ کہ ابتدا میں تمام لوگ ایک ہی طریقہ (توحید) پر تھے۔ پھر اللہ نے بھیجا پیغمبروں کو جو بشارت سناتے (مؤمنین کو) اور ڈراتے (کافروں کو) آیت کے آخری حصہ سے معلوم ہوا کہ انبیاءؑ کے بھیجے کا سبب لوگوں کا اختلاف کرنا تھا۔ اس لیے معلوم ہوا کہ جملہ فاختلفوا محذوف ہے جو کہ سبب ہے مابعد کے کلام کے لیے سبب ذکر کردیا گیا، اور قرینہ پر اعتماد کرتے ہوئے جملہ سببیہ ترک کردیا گیا اور کبھی حذف جزء جملہ ہوتا ہے مثلاً وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا لفظ اہل محذوف ہے یعنی ان اہل قریہ سے سوال کر لیجیے جن میں ہم تھے اور قصہ موسیٰ و خضر علیہما السلام میں ہے۔ وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَّأْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا۔ اس مقام پر سفینۃ کی صفت کی صفت سلیمہ محذوف ہے کہ وہ بادشاہ ہر صحیح وسالم کشتی غصب کرلیتا تھا۔ اقسام حذف کی تفصیل حضرت شاہ ولی اللہ سرہٗ نے الفوزالکبیر میں فرمائی ہے اس کی مراجعت کی جائے۔

اطناب فی الکلام اور اس کی صورتیں

مقصود کو بسط وتوضیح کے ساتھ بیان کرنا اطناب فی الکلام ہے۔ مثلاً حق تعالیٰ نے سورۃ بقرہ و دیگر مواقع میں خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا مضمون بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا کیونکہ یہ خطاب جن وانس۔ عالم وجاہل۔ ذکی وغبی، موافق ومخالف اور ہر زمان ومکان میں بسنے والوں سے تھا۔ اسی وجہ سے تمام دلائل قدرت کے ذکر میں بسط وتفصیل ہی کو اختیار فرمایا ایجاز جس طرح ایجاز قصر اور ایجاز حذف کی جانب منقسم ہے اور ایجاز حذف کے انواع بکثرت کلام اللہ میں موجود ہیں اسی طرح اطناب کے انواع بھی کثیر ہیں۔ شیخ سیوطیؒ نے الاتقان میں اکیس انواع تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں۔

اس بسط وتوضیح کے عنوان سے یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ کلام اللہ میں بعض الفاظ اور تعبیرات زائد از ضرورت ہیں بلکہ اس بسط وتوضیح اور ان الفاظ وحروف میں جن کو مفسرین زائد کہہ دیتے ہیں بہت سے فوائد اور معارف ومعانی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ بغیر اختیار کردہ تعبیر اور بیان کردہ حروف وکلمات کے مفہوم نہیں ہوسکتے۔ ابن جنی فرماتے ہیں ہر وہ حرف جو کلام میں اضافہ کیا جاتا ہے وہ قائم مقام ایک مستقل جملہ کے ہوتا ہے جس کو دوبارہ ذکر کیا گیا ہو۔ زمخشری بیان کرتے ہیں مَا اور لَيْسَ کی خبر پر باء کا آنا (جس کو بالعموم مفسرین زائد کہا کرتے ہیں) تاکید نفی کے لیے ہوتا ہے۔ مثلاً وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ جیسا کہ لا تاکید ایجاب کے لیے استعمال کیا جاتا

اسی لیے وَمَا رَبُّكَ آیت کا ترجمہ صرف یہ نہیں کیا جائے گا کہ "اور تمہارا رب نہیں ہے ظلم کرنے والا اپنے بندوں پر" بلکہ دلالت عربیہ کی رُو سے ترجمہ صحیح یہ ہوگا "اور نہیں ہے تمہارا رب قطعاً (ذرہ برابر) ظلم کرنے والا اپنے بندوں کے لیے"[1]۔

اور اہلِ ذوق کے نزدیک ہر دو تعبیروں میں بڑا تفاوت ہے تو ظاہر قواعد کی رُو سے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ ب لفظ ظلام پر زائد ہے مگر اس اشارہ سے معلوم ہوا کہ معناً زائد نہیں ہے بلکہ اس ب کے آنے سے معنوی طور پر کلام کی مراد میں بڑا عظیم تفاوت پیدا ہو گیا۔ اسی طرح آیت

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ (سورۃ مائدہ ۵)

اور جب سنتے ہیں وہ اس کلام کو جو نازل کیا گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر (یعنی قرآن) تو آپ دیکھیں گے ان کی آنکھوں کو کہ بہتی ہوئی ہیں آنسوؤں سے اس وجہ سے کہ انہوں نے پہچان لیا ہے کہ وہ حق ہے۔

قرآن کریم نے نصاریٰ میں سے مشرف باسلام ہونے والے قسیسین و رہبان (یعنی علم اور تارک الدنیا درویش حضرات) کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کا یہ حال بیان فرمایا۔

بظاہر اس عنوان میں کچھ کلمات کی زیادتی معلوم ہوتی ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ مضمون اگر مختصر عبارت میں ادا کیا جاتا ممکن تھا مثلاً فرما دیا جاتا تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ الخ کے بجائے یبکون کا عنوان محض رونے کے مضمون کو بیان کر سکتا تھا لیکن شدت بکاء و گریہ کی جو کیفیت ان عُبّاد و زُہّاد پر طاری تھی اس کو تو صرف یہی تعبیر ادا کر سکتی تھی جو اختیار کی گئی کہ مخاطب ان الفاظ کو سن کر یہ سمجھ لے کہ ان حضرات کا گریہ و بکا اس درجہ کا تھا کہ آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک بہتا ہوا سیلاب نظر آتا ہے اور ان کی یہ کیفیت دیکھنے والے کو نظر آ جاوے کے طور پر یہ تعالیٰ کہ اس بکاء کو یہی کہنا درست ہے کہ آنکھیں بہہ رہی ہیں آنسوؤں سے تو ظاہر ہے کہ یہ کیفیت بکا محض لفظ یبکون سے ادا نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح آیت وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ہے جس میں کافروں کے اس دعویٰ کی تردید ہے جو وہ اپنے متعلق کیا کرتے تھے کہ ان کے واسطے انجام بہترین ہے تو اس

---

[1] اس میں اشارہ ہے لفظ علیٰ کے بجائے ظلم کے صلہ میں لام استعمال کرنے کی نکتہ جانب کہ اس جگہ لام نے معنوی نوعیت اس طرح نمایاں کی کہ اللہ بھی نہیں فرمانے والا ہے ذرہ برابر ظلم اپنے ہم بندوں کے لیے چہ جائیکہ ان پر کوئی ظلم کیا جائے۔

مضمون کے واسطے اگرچہ یہ تعبیر بھی ممکن تھی وَيُكَذِّبُوْنَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى جو تعبیر مذکور کی نسبت مختصر بھی ہوتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اختیار کردہ تعبیر کی خوبی اور لطافت و بلاغت اس مختصر عبارت میں کبھی نہیں آسکتی تھی کیونکہ "تَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ" الخ کے عنوان سے صرف ان کا جھوٹا بیان ہی بیان کیا گیا بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ لوگ تو دروغ گوئی میں امام اور مقتدیٰ ہیں اس لیے ان کی زبانیں بیان کرتی ہیں کہ جھوٹ کو (یعنی یہ کہ جھوٹ ایسا ہوتا ہے) تو ان کی زبانیں دنیا کے جھوٹ کے واسطے معیار اور کسوٹی ہیں جو دنیا کو بتاتی ہیں کہ جھوٹ ایسا ہوتا ہے اس کی مثال محاوراتِ فصحاء میں ایسی ہے کہ کمال حسن کو بیان کرنے کے لیے کہا جاتے فلان يَصِفُ وَجْهُهُ الحسن کہ فلاں شخص ایسا ہے کہ اس کا چہرہ حسن کی حکایت کرتا ہے اور حسن کو بیان کرتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے نہ صرف یہ کہ وہ حسین ہے بلکہ اس کا چہرہ معیار حسن ہے کہ اسے دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ حسن ایسا ہوتا ہے غرض کلام اللہ کے اطناب میں ہر جگہ اور ہر مقام میں ایسی قسم کے بے شمار نکتے اور لطائف ہیں۔ اطناب کے اقسام [1] کی کلام اللہ سے مثالیں اور ان کے لطائف و معارف کا بیان ان اوراق میں نہیں سما سکتا۔ حق تعالیٰ کی توفیق شامل حال رہی تو اعجاز قرآن کے موضوع پر مستقل تالیف میں ناچیز ان کو جمع کرنے کی کوشش کرے گا۔

بحث اقسام قرآن

قرآن کریم کے طرزِ خطاب میں ایک نمایاں اور خصوصی طرز یہ بھی ہے کہ اکثر مطالب و مضامین کو قسم کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے جو ان مضامین کی صداقت و حقانیت کی گویا دلیل و برہان ہوتی ہیں۔ اہل عرب کا یہ خصوصی ذوق تھا کہ جب کسی امر پر ان کو تاکید و اصرار ہوتا اور اس کی حقانیت و صداقت کو مخاطب پر واضح کرنا چاہتے تو اس مقام پر قسم کا عنوان اختیار کرتے اور قرآن کریم چونکہ لغت عرب پر نازل ہوا اس لیے ان کے اس خصوصی ذوق کی رعایت بھی ایسے معجزانہ انداز کے ساتھ کلام اللہ میں رکھی گئی کہ وہ اقسام قرآن کے لطائف پر حیرت زدہ ہوتے اور بجز اس اعتراف کے کوئی چارہ کار نہ ہوتا کہ خدا کی قسم یہ کلام البشر

[1] حافظ ابن قیمؒ کی اقسام قرآن کے موضوع پر ایک مستقل تصنیف "التبیان فی اقسام القرآن" ہے جس میں تمام اقسام قرآنی کے لطائف و معارف پر کلام فرمایا ہے۔

نہیں ہے۔

استاذ ابو القاسم قشیری فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے کلام میں قسم کا ذکر فرمایا حجت و برہان کی تکمیل و پختگی کے لیے اس لیے کہ حکم کی تاکید اور برتری کا ذریعہ یا تو شہادت ہے یا قسم تو خداوند عالم نے اپنے کلام میں دونوں نوعیں جمع کر دیں۔

ایک جگہ فرمایا شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ۔ کہ اللہ گواہ ہے کہ سوائے اس کے کوئی معبود نہیں اور فرشتے بھی اور اہل علم بھی۔

دوسری جگہ فرمایا قُلْ اِیْ وَ رَبِّیْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ یعنی کہہ دیجیے بے شک قسم ہے میرے رب کی یقیناً وہ حق ہے۔ بعض اعراب سے منقول ہے کہ اس نے جب یہ آیت سنی وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ تو چلا اٹھا اور کہنے لگا کون ہے وہ جس نے ربّ جلیل کو غضبناک کیا حتیٰ کہ ربّ العزّت کو قسم کھانے کی نوبت آگئی۔ (الاتقان صفحہ ۱۳۳ جلد ۲)

قسم ہمیشہ اسی چیز کی کھائی جاتی ہے جو کہ عظمت و برتری والی ہو اس لیے حق تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے دلائل قدرت جو اس کی عظمت و کبریائی کے لیے مستلزم ہیں قسم کے موقع پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ اسی لیے حدیث میں منع کیا گیا کہ کوئی شخص غیر اللہ کے نام سے قسم نہ کھائے۔ بندوں کے استعمال میں خدا کے سوا کسی دوسری چیز کی قسم کھانے میں مقام عظمت میں غیر اللہ کی شرکت لازم آتی ہے۔ اس لیے اس کی ممانعت فرما دی گئی مگر خداوند عالم جب اپنے کلام میں قسم کھائے تو اس کے حق میں یہ برابر ہے کہ وہ اپنے نام اور اپنی ذات و صفات[1] کی قسم کھائے یا اپنی مخلوقات میں سے کسی مخلوق کو برتری عطا فرماتے ہوئے اس کو قسم کے واسطے اختیار کرے۔

[1] قرآن میں اللہ نے جن چیزوں کی قسم کھائی ہے وہ تین ہیں۔ اوّل اپنی (بقیہ اگلے صفحہ)

مثلاً تین۔ زیتون۔ صافات۔ ذاریات۔ قلم، شمس، قمر۔ لیل ونہار نجم مواقع النجوم وغیرہ کہ ان سب مخلوقات کو قسم کے عنوان کے لیے اختیار فرمایا اور ایک مقام پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگانی کی قسم کھائی تھی فرمایا لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ مقسم علیہ یعنی جس چیز پر قسم کھائی جاتی ہے وہ عظیم الشان ہوتی ہے۔ معمولی باتوں پر قسم کھانا بلغاء کا طریقہ نہیں تو قرآن نے جن امور پر قسم کھائی وہ مہتم بالشان امور یہ ہیں:

(۱) اصول ایمان جن کا اعتقاد مخلوق پر لازم ہے۔ (۲) توحید خداوندی۔ (۳) حقانیت قرآن (۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی حق ہونا۔ (۵) قیامت جزا وسزا اور وعد و وعید کے برحق ہونے پر۔ (۶) کبھی انسان کی حالت پر کہ وہ اپنے رب کا ناشکرا ہے اور یہ کہ وہ بغیر ایمان اور عمل صالح خسارہ میں ہے۔ (۷) اور یہ کہ انسانی اعمال باہم مختلف ہیں۔ ہر ایک اپنے زعم میں اپنے ہی طریقہ کو حق اور موجب نجات سمجھتا ہے۔ لیکن اس کا فیصلہ کتاب اللہ ہی کر سکتی ہے[۱]۔

حافظ ابن قیم نے اپنی کتاب التبیان میں اقسام القرآن پر تفصیلی کلام فرمائے ہیں تمام مضامین میں اس امر کی توضیح فرمائی کہ جہاں جس چیز کی قسم کھائی اس چیز کو وہاں بیان کردہ مضمون سے پوری مناسبت ہوتی ہے اور یہ مناسبت معارف اور لطائف قرآنی کا مستقل باب ہے (تفصیل کے لیے اصل کی مراجعت کی جائے۔)

(بقیہ پچھلے صفحہ کا حاشیہ) ذات مقدسہ کی جو سات جگہ ہے اس قسم میں عظمت وجلال مقصود ہے۔ دوم اپنے افعال مقدسہ کی جیسا کہ ونفس وما سوّاھا یہاں بھی عظمت و جلال ملحوظ ہے۔ سوم اپنی مخلوقات کی۔ ۱۲ [۱] تفصیل کیلئے الاتقان فی علوم القرآن دیکھیے۔

امثال قرآن

امثال قرآنی کا موضوع بھی مفسرین کے نزدیک اہم ترین موضوع ہے۔ امام ابوالحسن ماوردیؒ نے امثال القرآن پر مستقل کتاب تالیف فرمائی۔ یہ ایک فطری اور طبعی امر ہے کہ مقام موعظت اور نصیحت میں امثال کا ذکر مخاطب کے لیے نہایت ہی مؤثر اور دل نشین طرز کلام ہے۔ اسی طرح امور معنویہ کو مخاطب کے سامنے محسوس و مشاہد اور ان کے محاسن و قبائح کو نمایاں کردینا تمثیلات ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ کتب سابقہ تورات و انجیل میں بکثرت مضامین تمثیلی رنگ میں بیان کیے گئے تھے۔ قرآن کریم نے بھی اپنی شان بلاغت کے ساتھ طرز خطاب کے اس مؤثر اور بہترین طریقہ کو معجزانہ انداز میں اختیار فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلام فرماتے ہیں کہ خداوند عالم نے اپنے کلام میں امثال وعظ و تذکیر کے لیے بیان فرمائی ہیں۔ بہت سی تمثیلات ثواب و عقاب اور ان کے تفاوت درجات حسنات و سیئات کے ثمرات و نتائج اور ترغیب و ترہیب پر مشتمل ہیں اور غرض مقصود یہ ہوتی ہے کہ مراد کو عقل سے اس طرح قریب کر دیا جائے کہ وہ معقول کے مرتبہ سے تجاوز کر کے سامع کے ذہن میں محسوسات کی شکل اختیار کرے۔ اگر کوئی معنوی خفاء ہے تو وہ بھی دور ہو جائے۔ اگر شیئ کی عظمت بیان کرنی ہے تو اس کی حقیقی اور واقعی عظمت نمایاں ہو جائے اور اگر کسی شیئ کی حقارت و خست ظاہر کرنی ہے تو اس کی حقارت و خست علی وجہ الاتم ظاہر ہو جائے۔ اور اگر کسی چیز کی پائیداری اور قوت یا کسی چیز کا

ضعیف ناپائیدار ہونا بیان کرنا ہے تو وہ بھی بخوبی مخاطبین کے ذہنوں میں راسخ ہوجائے : مثلاً آیت سورۂ بقرہ "کَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ" میں انفاق فی سبیل اللہ کے اجر و ثواب کو محسوس و مشاہد صورت میں ظاہر کیا گیا کہ جس طرح زمین پر ڈالے ہوئے ایک دانۂ گندم سے دنیوی کھیتی میں سات سو دانے انسان کو حاصل ہوجاتے ہیں اسی طرح آخرت کی کھیتی کا بھی حال ہے بلکہ اس سے بڑھ کر جس کے لیے اللہ چاہے کہ ایک حسنہ کو اللہ تعالیٰ سات سو نیکیوں کے ثواب تک بڑھاتا ہے۔ اگر انسان ایمان و اخلاص کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرے لیکن یہی انفاقِ مال بغیر ایمان و تقویٰ محض ریا اور حُبِّ جاہ کے لیے کیا جائے تو اس کی مثال :

فَمَثَلُهٗ کَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَکَهٗ صَلْدًا۔ — ایسی مثال ہے جیسے ایک چکنا پتھر (فرض کرو) جس پر کچھ مٹی ہو (اور اس مٹی میں ڈانہ ڈالنے سے کچھ گھاس پھونس سا بھی پیدا ہوگیا ہو)

پھر اس پر زور کی بارش پڑی تو اس نے اس پتھر کو (جیسا تھا اسی طرح) صاف چکنا بنا ڈالا۔ تو ان کلمات نے مخاطب کے سامنے اس صورت کو محسوس کرکے دکھا دیا کہ انفاق ایمان و اخلاص کے ساتھ ایک نفع بخش کھیتی کے مانند ہے اور یہی بذلِ مال اور صرفِ دولت بغیر ایمان و تقویٰ کے کسی چکنے پتھر پر تخم ریزی کی طرح ہے۔

پھر اس تمثیل کے بعد ایک اور بلیغ تمثیل اس معنی کے لیے ارشاد فرمائی کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے اعمال کو اضاعت و بربادی سے بچائے اور ان اعمال کو اس وقت کے لیے کارآمد ذخیرہ بنانے کی فکر کرے جب کہ ہر طرح سے بے سہارا ہوگا۔ اگر وہ منافع عاجلہ حب جاہ اور احسان جتلانے کی وجہ سے اپنے اعمال کو ضائع کرتا ہے تو اس کا حال تباہی اور بربادی اور حسرت و یاس میں بس ایسا ہے جیسا کہ ایک شخص کا باغ ہو جس میں ہر قسم کے پھل طرح طرح کے

میوے ہوں۔ اس میں نہریں بہتی ہوں۔ شادابی کی کوئی حد و انتہا نہ ہو جب وہ شخص بڑھاپے کو پہنچا اور حال یہ کہ اس کی اولاد چھوٹی ناسمجھ یعنی ایسی نہیں، کہ اس کو کما کر کچھ کھلا دے تو ایسے ضعف و پیرانہ سالی اور بے چارگی کے زمانہ میں جب کہ اس کی تمام تر اُمیدیں اسی باغ کے ساتھ وابستہ تھیں۔ ناگہاں ایک آگ آئی اور بگولوں نے اس باغ کو جلا کر خاک کر ڈالا۔ تو یہی حال اس شخص کے نفقہ کی بربادی کا ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کرکے احسان جتائے یا ایذا پہنچائے اور پھر اُمید لگائے کہ قیامت میں یہ عمل میرے کام آئے گا۔ سو ظاہر ہے کہ قیامت کے روز اس کی اُمیدوں کا یہ باغ حق تعالیٰ کی ناراضگی اور قہر کے شعلوں سے جل کر خاک ہو جائے گا۔ چنانچہ اس مضمون کو ان کلمات میں ارشاد فرمایا گیا:

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ۔

کیا پسند کرتا ہے تم میں سے کوئی اس بات کو کہ اس کے واسطے ایک باغ ہو کھجوروں اور انگوروں کا، اس باغ کے نیچے بہتی ہوں نہریں ایسا باغ کہ اس مالک کے واسطے اس میں ہر قسم کے پھل ہیں اور حال یہ کہ اس کو بڑھاپا پہنچا اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ناگہاں اس باغ پر ایک آندھی پہنچی جس میں آگ تھی پس اس نے جلا ڈالا باغ کو۔

تو اس تمثیل کے ذریعے خداوند عالم نے لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ کے مضمون کی ایسی حقیقت واضح فرمائی کہ گویا آنکھوں سے حَبْطِ اعمال، اور بربادی صدقات کا منظر نظر آنے لگا۔ اسی طرح ایمان و عمل صالح کی پائیداری اور کفر و شرک کا ضعف و اضمحلال مخاطب کی نگاہوں کے سامنے اس طور پر ظاہر فرمایا گیا:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ نِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۔	کیا نہیں دیکھا اے مخاطب کہ کیسی مثال بیان کی ہے اللہ نے کلمہ طیبہ کی کہ وہ ایک پاکیزہ درخت کے مانند ہے جس کی جڑ مضبوطی کے ساتھ زمین میں قائم ہے اور اس کی شاخیں بلندی میں آسمان تک پہنچ رہی ہیں۔ وہ درخت اپنا پھل دے رہا ہے۔ ہر حال اور ہر زمان میں اپنے رب کی قدرت و اجازت سے (غرض) اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لیے اُمید ہے کہ وہ نصیحت قبول کرلیں اور مثال کلمہ خبیثہ (کفر و شرک) کی اس ناپاک درخت کی سی ہے جس کو زمین پر سے اکھاڑ پھینکا گیا جس کے واسطے کوئی مضبوطی اور قرار نہیں ہے۔
(سورۂ ابراہیم)	

غرض اسی طرح قرآن کریم میں حق تعالیٰ نے عُلوم و مَعارف کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تمثیلات کے عنوان میں بیان فرمایا۔

قرآن کریم کا یہ طرز بیان بھی سراپا معجزانہ اور محیّر العقول ہے جس کا اندازہ امام رازیؒ زمخشری بیضاوی اور علامہ سید محمود آلوسی جیسے ائمہ کی تفاسیر سے ہو سکتا ہے۔

تکرار مضامین و آیات

قرآن کریم کے طرز بیان میں ایک خصُوصی طرز یہ بھی ہے کہ وہ واقعات و قصص اور ان کے اجزاء کو بار بار بیان کرتا ہے اور بعض آیات معینہ بار بار دہرائی جاتی ہیں مثلاً ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ حضرت نوحؑ۔ حضرت لوطؑ۔ حضرت صالحؑ۔ حضرت شعیبؑ اور حضرت موسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام کے واقعات قرآن میں متعدد جگہ ذکر کیے گئے

اور حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام اور فرعون کے ذکر سے تو شاید ہی کوئی حصہ قرآن کریم کا خالی ہو۔ ان تمام واقعات کو قرآن بکثرت کہیں اجمال اور تفصیل سے کسی جگہ بعض اجزاءِ قصہ اور دوسری جگہ دوسرے بعض اجزاء بیان کرتا ہے۔ اسی طرح بعض آیات مثلاً: فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ اور وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ایک ہی سورت میں بار بار دہرائی جا رہی ہے۔ تکرار مضامین و آیات کی تفصیلی حکمتیں تو متعلقہ مقامات کی تفسیر میں امام رازی، زمخشریؒ اور علامہ آلوسیؒ کے کلام سے معلوم ہو سکتی ہے۔

اس مقام پر ان حضرات اور شاہ ولی اللہ کے کلام سے اخذ کردہ بعض افکولی چیزیں اشارۃً بیان کرنے پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ قرآن کریم جن واقعات کو بیان کرتا ہے ہر واقعہ اپنے مختلف اجزاء اور متعدد پہلوؤں کے اعتبار سے بہت سے مفید ثمرات اور اہم نتائج پر مشتمل ہوتا ہے تو ہر مقام و موضوع اور مقصد کی رعایت کرتے ہوئے ہر واقعہ کو کبھی مجموعی طور پر اور کبھی اس کے کسی ایک جزء اور پہلو کو کہیں اجمال اور کہیں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے اور متعدد مقامات پر اس ایک ہی واقعہ کو ذکر کرنے سے ہر مقام کے مناسب ایک نئے فائدہ اور نتیجہ کا اخذ کرنا مقصود ہوتا ہے ان ہی مقاصد و نتائج کی کثرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بیان واقعہ یا اس کے اجزاء میں تکرار اختیار کیا جاتا ہے۔ دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ چیز مکرر ذکر کی جا رہی ہے لیکن مقصد اور غرض کے اعتبار سے وہ مکرر نہیں بلکہ نئی چیز ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کے بنیادی اجزاء اور پہلو حسب ذیل ہیں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بعد آغوش مادر کے بجائے سمندر کی موجوں کے حوالہ ہو جانا۔ پھر ایک حیرت انگیز طریقہ سے فرعون کے یہاں پہنچ جانا، اسی کے گھر میں تربیت پانا۔ قبطی کو قتل کر کے مدین کی طرف بھاگنا۔ وہاں ایک انوکھے طور پر نکاح ہو جانا۔ اہلیہ کو ہمراہ لیجاتے ہوئے آگ کے شعلہ کو دیکھ کر پہاڑی پر جانا اور وہاں سے منصب نبوت سے سرفراز ہو کر لوٹنا اور معجزہ کا عطا ہونا۔

پھر دعوتِ ایمان لے کر فرعون کے پاس جانا۔ فرعون کا تمرّد و سرکشی کے ساتھ تحقیر آمیز سوال و جواب کرنا، معجزات دیکھ کر فرعون اور تمام ساحروں کا ذلیل ہونا۔ انجام کار فرعون اور اس کی قوم کا دریائے نیل میں غرق ہو جانا۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا مظفر و منصور ہو کر بنی اسرائیل کو روز روز کے عذاب سے بچا لینا وغیرہ وغیرہ۔

اب قرآن کریم کبھی اس قصہ اور اس کے اجزاء کو اپنی قدرت عظیمہ اور اپنی جلالت شان کے ظاہر کرنے کے لیے ذکر کرتا ہے کہ حق تعالیٰ کی عظمت و طاقت اور سطوت و جبروت کے سامنے فرعون جیسے متمرد اور مغرور و متکبر بادشاہ کی حقیقت نہیں۔ دم کے دم میں اللہ نے اس کی سلطنت اور طاقت و شوکت کو درہم و برہم کر ڈالا۔ اتنے بڑے ساز و سامان والا کس طرح بے گور و کفن مارا گیا۔ کسی جگہ مقصود ان ہی ہیبتناک اور تاسف انگیز واقعات کے بیان کرنے سے غافل بندوں کو عبرت دلانا ہوتا ہے کہ تم کو بھی ان معاصی اور کفریات سے باز رہنا چاہیے جن کا یہ خمیازہ پہلی قومیں بھگت چکی ہیں ورنہ کچھ بعید نہیں کہ خدا کی طرف سے تمہارے ساتھ بھی وہی معاملہ ہو۔ کسی مقام پر حضرت موسیٰ اور ان کی اتباع کرنے والوں پر احسان جتانا مقصود ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان پر پیغمبر خدا کی اطاعت و پیروی کی وجہ سے یہ انعام فرمائے کہ ایسے جابر و خونخوار کے پنجۂ ظلم سے نجات بخشی جس کے مقابلہ کی کوئی طاقت نہ تھی۔ پھر اسی ظالم کے تاج و تخت کا وارث بھی بنا دیا۔

کسی جگہ معجزات کے ذکر سے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی صداقت کا ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ غرض اسی نوع کے اور بہت سے مقاصد ہوتے ہیں جن کے پیش نظر واقعات اور ان کے اجزاء کو ہر ایک مقصد کے اثبات کے لیے ذکر کیا جاتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ تکرار مطالب قرآن کے متعلق الفوز الکبیر فی اصول التفسیر[1] میں فرماتے ہیں "تکرار در مطالب قرآن کریم برائے آلنست کہ ہر

---

[1] صفحہ ۱۰ مطبوعہ کاپتور ۱۲

خواہیم کہ سامع را افادہ نمائیم دو قسم می باشد یکے آنکہ مقصود آنجا مجرد تعلیم مالا یعلم بود تا مخاطب حکم مجہول را معلوم کند وان ناداستہ نادانستہ گردد۔ دیگر آنکہ مقصود استحضار صورت آں علم در مدرکہ او باشد تا ازاں لذت فراواں گیرد و رنگ ایں علم برہمہ قوی غالب آید۔ و قرآن کریم بہ نسبت ہر یکے از علوم خمسہ کہ بیانش خواہد آمد ہر دو قسم افادہ ارادہ فرمود تعلیم مالا یعلم بہ نسبت جاہل۔ و رنگین ساختن نفوس بداں بہ سبب تکرار۔ بہ نسبت عالم۔ اللّٰہم مگر در اکثر احکام کہ تکرار آنجا حاصل نشدہ افادۂ دوم آنجا مطلوب نبودہ واہذا در شریعت بتکرار تلاوت امر فرمودہ اند نہ بمجرد فہم اکتفا کردہ اند۔ ایں قدر فرق نہادہ اند کہ در اکثر احوال آں مسائل بعبارت تازہ و اسلوب جدید اختیار فرمودہ اند تا اوقع باشد در نفوس والذ باشد در اذہان اگر تکرار بیک لفظ کنند چیزے باشد کہ بطور وظیفہ آں را تکرار نمایند و در صورت اختلاف تعبیرات و تفاسیر اسالیب ذہن خوض کند و خاطر بکلی دراں فرو رود۔"

حاصل یہ ہے کہ "قرآن کریم کی ہر تعلیم اور ہر حکم کے مخاطب دو قسم کے آدمی ہوتے ہیں اور دو ہی اعتبار و نظریوں کے ساتھ قرآن خطاب فرماتا ہے۔ ایک وہ کہ جو اس حکم سے ناواقف ہیں ان کو تو صرف ایک نامعلوم چیز کی تعلیم دے دینا ہے۔ دوسرے وہ کہ محض امر غیر معلوم کی تعلیم مقصود نہیں ہوتی بلکہ اس کیفیت کا قلب میں راسخ کر دینا مقصود ہوتا ہے تاکہ قوت مدرکہ اس علم کا پورے طور پر استحضار کرلے اور طبائع اس سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ اس کے رنگ میں رنگی جائیں۔"

اور ظاہر ہے کہ کسی کام میں ملکہ بغیر اس کی پابندی اور التزام اور بار بار کی مشق کے نہیں حاصل ہو سکتا۔ اسی طرح اذہان و طبائع کا علوم الٰہیہ کے رنگ میں رنگا جانا تکرار و مداومت کا محتاج ہوگا جیسا کہ نماز و روزہ اور تمام عبادات کی پابندی اس امر کا باعث ہے کہ ہم اطاعت و انقیاد کے خوگر ہو جاتے ہیں۔

اور بلکہ بسا اوقات اس کے ترک سے اذیت محسوس ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح کلمۂ توحید اور ذکر اللہ کی پابندی حق تعالیٰ کے تصور اور اس کی محبت قلب میں جما دینے کی تاثیر رکھتی ہے۔ قلب میں اس کیفیت کے رسوخ کا ذریعہ کثرت ذکر کثرت تلاوت تکرار اور مواظبت عمل ہے تو مضامین و مطالب قرآنیہ کا تکرار بھی اسی لیے ہے تاکہ مخاطبین کے قلوب میں یہ مضامین و علوم پورے طور پر راسخ و متمکن ہو جاتیں اور طبیعت انہی کے رنگ میں رنگی جاتے۔ ذہن ان کی حلاوت و شیرینی سے لطف اندوز ہونے لگیں۔ پھر مزید خوبی یہ کہ تکرار بعینہ ایک ہی لفظ اور عنوان کے ساتھ نہیں بلکہ ہر جگہ تازہ عبارت اور نئے اسلوب کے ساتھ ہے تو اختلاف تعبیرات کی وجہ سے ذہن کو زیادہ غور و خوض کا موقعہ ملتا ہے اور مدرکۂ انسانی کو ہر بار اس مضمون کے سننے سے نئی لذت حاصل ہوتی ہے۔

سورۂ رحمٰن میں ایک ہی آیت فَبِاَیِّ اٰلَاۤءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ بار بار دہرائی گئی ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے اس سورت میں اپنی مخلوق جن و انس پر بڑے بڑے انعامات کا ذکر کیا ہے۔ اور ہر نعمت کے ذکر کے بعد اس آیت کو لایا گیا۔ تقریر و تثبیت کے اور الزام حجت کے طور پر کہ اے جن و انس (بھلا بتلاؤ) اب اپنے رب کی نعمتوں میں کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے (ان کی ناشکری کرو گے) مقصد یہ ہے کہ سامع ہر ہر نعمت پر متنبہ ہو کر اپنے پروردگار کی نعمتوں کو پہچانے اور ان کا شکر بجا لانے کے لیے آمادہ ہو۔ اس سورت میں انعامات کا ذکر ایک تو بصورت انعام ہے کہ ان نعمتوں کو یاد دلایا گیا۔ جو منعم حقیقی کی طرف سے بندوں پر کی گئیں۔ اور دوسرے اخروی رنج و محن اور عذاب جہنم کے بیان میں اپنے انعام کو ذکر فرمایا تاکہ ان آلام اور کیفیات مصائب کو سن کر ان امور سے پرہیز کریں جو عذاب اخروی کا سبب ہیں۔ ان امور کا ذکر بھی انعام ہے۔

اگرچہ بیان تو عذاب اور شدت کا ہے مگر اس وجہ سے کہ اس سے مقصود بندوں کو ان اعمال و افعال سے بچنے کی تعلیم ہے جو اس عذاب و شدت کا باعث ہیں،

لا محالہ ان احوال کا ذکر بھی یقیناً ایک نعمتِ خداوندی ہی ہُوا اور اس پر آیتہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ اسی طرح مربوط اور چسپاں ہُوا جیسے دیگر انعامات خداوندی پر ہے جیسے زانی و بدکار اور لوٹ و غارتگری ڈالنے والوں کی سزا پاکباز و نیک طینت لوگوں کو بعنوان بشارت اور اس طرح اس کو تعبیر کیا جائے کہ یہ سزا دینے والے حاکم کے انعامات میں سے ایک عظیم انعام ہے۔ یا جیسے تریاق کا ذکر انعام ہے تو اس کے بالمقابل سم اور مہلک زہر کا بیان بھی مخاطب کے واسطے معلّم کا بہت بڑا انعام ہے تاکہ وہ اپنے مخاطب کو نافع اور مضر ہر قسم کی چیزوں سے مطلع اور باخبر کر دے۔

چنانچہ امام رازیؒ "نہایۃ الایجاز فی درایۃ الاعجاز" اور سید مرتضیٰ کتاب "الامالی" میں فرماتے ہیں :

ان فعل العقاب و ان لم یکن نعمۃ فذکرہ ووصفہ والانذار بہ من اکبر النعم لان فی ذلک زجراً عما یستحق بہ العقاب۔[1]

بے شک فعل عقاب اور عذاب بظاہر اگرچہ کوئی نعمت نہیں ہے لیکن اس کا ذکر اور اس کی کیفیت کا بیان بڑی عظیم الشان نعمتوں میں سے ہے کیونکہ اس کے ذکر سے ان بُرے کاموں سے روکنا مقصود ہے جن کے کرنے سے انسان عذاب خداوندی کا مستحق ہو جاتا ہے۔

شیخ سیوطیؒ نے فرمایا[2] :

وقد سئل ای نعمۃ فی قولہ تعالیٰ کل من علیہا فان فاجیب باجوبۃ احسنہا النقل من دار الھموم الی دار السرور و

یہ سوال کیا گیا "کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ" کونسی نعمت کا بیان ہے اکہ جس کے بعد فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ فرمایا گیا جس طرح انعامات خداوندی پر اس کو اس سورۃ میں

---

[1] کتاب الامالی ص۸۸ ۔ [2] الاتقان فی علوم القرآن ۔ التبیان ۔

اِرَاحَۃٌ لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۔

ذکر کیا گیا ہے، تو اس کے متعدد جواب دیئے گئے۔ جن میں سب سے بہتر یہ جواب ہے کہ اس آیۃ میں دارالہموم (یعنی تکالیف وآلام اور رنج وغم کی زندگی) سے دارالسرور کی طرف منتقل ہونے کا اور اہل ایمان کے واسطے راحتوں کا بیان ہے جو یقیناً ایک عظیم الشان نعمت ہے لہٰذا اس کے ذکر پر بھی فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ آیۃ مربوط اور چسپاں بلکہ نہایت ہی لطیف ہے۔

غرض قرآن کریم کے خصوصی طرز خطاب میں تکرار مضامین اور آیات بھی ہے جس کے بے شمار اسرار اور حکمتیں ہیں۔ ہم نے صرف بطور مثال یہ چند چیزیں بیان کردیں۔

اعجاز قرآن کی بحث میں ہم یہ عرض کرچکے ہیں دُنیا کے تمام اہل علم اور ارباب نظر وفکر اور اصحاب فہم وبصیرت بھی قرآن کریم کے حقائق ومعارف اور اس کے اسرار ولطائف کا پوری طرح ادراک نہیں کرسکتے۔ اس باب میں ان سب کی مشترکہ مساعی اور کوششیں صرف وہی نسبت رکھ سکتی ہیں، جو ناپیدا کنار سمندر کے سامنے ایک قطرہ کو ہے۔ وحی الٰہی اور علوم قرآن کے سامنے تمام دُنیا کے اہل علم کی علمی وفکری صلاحیتوں کے بارہ میں قرآن کریم نے فیصلہ فرمادیا ہے:

وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ۔

اور نہیں دیا گیا ہے اے لوگو! تم کو علم میں سے مگر ایک نہایت ہی قلیل حصّہ۔

اس لیے ظاہر ہے کہ یہ محدود علم کس طرح لامتناہی اور غیر محدود علوم اور حقائق کی بلندیوں تک رسائی کرسکتا ہے۔

سُبْحَانَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَلَہُ الْکِبْرِیَآءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۔

بحث غرائب قرآن

غرائب قرآن کی معرفت اور ان کی تشریح بھی ضروریات تفسیر میں سے ہے۔ بیہقی نے بروایت ابوہریرہؓ بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اَعْرِبُوا الْقُرْاٰنَ وَالْتَمِسُوْا غَرَائِبَهٗ یعنی کلمات قرآن (از روئے تلاوت اور معنی) واضح کیا کرو اور اس کے غرائب کو تلاش کرو ان کے معانی اور مفہوم کی تحقیق کرو۔ اس لیے مفسر کے واسطے لازم ہے کہ شرح غریب قرآن کی طرف متوجہ ہو اور اس کو حل کرے۔ تفسیر کا یہ موضوع بھی مفسرین کے نزدیک خصوصی توجہ کا مرکز رہا ہے۔

ابوعمر زاہد ابن درید ابوبکر انباری اور امام راغبؒ نے اس موضوع پر تصانیف فرمائیں، جن میں امام راغبؒ کی "مفردات قرآن" شرح مفردات قرآن پر علماء کے نزدیک نہایت ہی پسندیدہ اور جامع کتاب سمجھی جاتی ہے۔ شرح غریب قرآن بالاستیعاب حضرت ابن عباسؓ سے ان کے اصحاب اسانید صحیحہ کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔ شیخ سیوطیؒ نے اتقان میں ابن عباسؓ کے تفسیری کلمات بروایت عکرمہ سورۂ بقرہ سے تقریباً ختم قرآن تک بیان کیے ہیں۔

کلام میں خفاء معنی کے اسباب متعدد ہوتے ہیں۔ کبھی اشتراک معنی کبھی دلالت لفظ کا اپنے معنی پر ابہام کسی جگہ اضمار کسی جگہ اشارہ کہیں توریہ و کنایہ اور کہیں استعارہ و مجاز اور تمثیل۔ تو یہ امور خفاء مراد کا باعث ہوتے ہیں ان کی تشریح کو فن تفسیر میں شرح غریب کہا جاتا ہے۔ اس میں سب سے بہتر طریقہ تو یہ ہے کہ آیات کلام اللہ کی وضاحت دوسری آیات سے کی جائے۔ اس کے بعد احادیث مرفوعہ پھر آثار صحابہ و تابعین اور جس امر کی وضاحت

محتاج لغت اور قوانین عربیہ ہو اس کی توضیح قوانین لغت اور محاورات اہل لسان کے ذریعے کی جائے۔

شیخ سیوطیؒ صاحب برہان کا قول نقل کرتے ہیں کہ اس فن کا جاننا بھی مفسر کے لیے ضروری ہے اور شرح غریب کے لیے مفسر علم لغت کا بھی محتاج ہوتا ہے تاکہ وہ کلمات عرب کو اسماء و افعال اور حروف کے اوضاع ان کے معانی، اور طرقِ استعمال کے اعتبار سے پہچان سکے۔[1]

ابوبکر انباری فرماتے ہیں کہ حل مشکلات اور شرح غریب کے لیے قدیم اہل عرب کے اشعار کی طرف بھی رجوع ضروری ہوتا ہے تاکہ ان کے استعمال سے الفاظ قرآن کی دلالت واضح ہو جائے اور معنی لغت کے فہم کے لیے یہ امر قابل تردد نہیں۔ مراد کلام اللہ تو بیشک احادیث ہی سے ثابت ہو گی لیکن معنی لغوی کا سمجھنا تو بہرحال اہل لسان کے محاورات اور طرق استعمال پر موقوف ہے۔ حق تعالیٰ کا فرمان ہے اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا۔ ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ شعر دیوان عرب ہے سو اگر ہم پر کوئی حرف اس قرآن کریم کا جس کو اللہ نے لغت عرب پر نازل کیا مخفی رہے تو ہم رجوع کریں گے۔ دیوان عرب کی طرف اور اس کے ذریعے معنی وضعی پہچانیں گے۔[1]

خفاءِ معنی کی طرح کلام میں اشکال پیدا ہو جانے کے بھی مختلف اسباب ہوتے ہیں کبھی کوئی مضمون دوسرے مضمون اور آیات یا احادیث صحیحہ یا تاریخی واقعات سے مخالف معلوم ہوتا ہے اور درحقیقت وہاں کوئی پیچیدگی ہوتی ہے یا واقعات کی ترتیب اور قصہ کی ابتداء معلوم نہ ہونے سے اشکال پیدا ہو جاتا ہے۔ یا اس سے متعلق تمام احکام کا علم نہ ہونے سے مُراد کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مفسر کے ذمہ ہے کہ اصولِ تفسیر کی کامل رعایت رکھتے ہوئے جو اشکال فہم معنی میں پیش آئے اس کو دُور کرے۔

---

[1] الاتقان صـ۱۲۱ ج ۲

حضرت مریم علیہا السّلام کے قصّہ میں یا اخت ہارون کے عنوان پر اشکال پیدا ہوا کہ حضرت مریم ہارون علیہ السّلام کی بہن کیونکر ہوسکتی ہیں دونوں کے زمانہ میں صدیوں کا فصل ہے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس اشکال کا ازالہ فرمایا کہ یہ وہ ہارون موسیٰ علیہما السّلام نہیں بلکہ بنو اسرائیل اپنے پیغمبروں کے نام پر اپنے نام رکھ لیا کرتے تھے تو حضرت مریم اسی ہارون کی بہن ہیں جن کا نام ہارون علیہ السّلام کے نام پر تھا۔

کلام میں اجمال کے بھی متعدد اسباب ہوتے ہیں۔ مثلاً آیت کا کسی ایسے واقعہ کی جانب اشارہ کرنا جس کا کوئی تفصیلی ذکر نہ کلام اللہ میں ہے اور نہ اس کا ذکر کتب سابقہ میں محفوظ اور مستند طور پر ملتا ہے۔ مثلاً آیت :

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ وَأَلْقَيْنَا عَلَىٰ كُرْسِيِّهِ جَسَدًا ثُمَّ أَنَابَ ۔	اور البتہ آزمایا ہم نے سلیمان کو اور ڈال دیا ان کی کرسی پر ایک جسد کو پھر سلیمان متوجہ ہوئے (ہماری طرف)

اب محض ان الفاظ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ سلیمان کی آزمائش کیا تھی اور ان کی کرسی پر ایک جسم کے ڈال دینے کے معنی کیا ہیں۔ غیر محتاط قسم کے لوگوں نے غیر مستند بلکہ اصول دین کے اعتبار سے غلط واقعات ذکر کرنے شروع کر دیئے کہ کسی جن نے حضرت سلیمانؑ کی انگشتری کے ذریعے ان کے تخت سلطنت پر قبضہ کر لیا تھا و غیر ذالک۔ ظاہر ہے کہ ایک پیغمبر کے بارہ میں اصول شریعت کا لحاظ کرتے ہوئے ان قصوں کا اعتبار کرنا ممکن نہ تھا اور نہ ہی وہ قصے کلام اللہ کی مُراد سمجھا سکتے تھے اس عقدہ اور اجمال کا حل آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد سے ہُوا کہ حضرت سلیمانؑ کو اس امر کا شوق ہُوا۔ میری بیویوں سے اولاد پیدا ہو اور وہ سب کی سب مجاہد فی سبیل اللہ بنے۔ اس ارادہ سے قربت کی لیکن انشاء اللہ کہنا یاد نہ رہا۔ انبیاء علیہم السّلام کی ذرا سی فرگذاشت پر بھی حق تعالیٰ کی طرف سے ایک نوع کا تنبیہی برتاؤ کیا جاتا ہے تو قدرت خداوندی سے کوئی حاملہ نہ ہوئی بجز ایک

اور اس نے بھی انجام بخیر جانا۔ جوں ہی یہ بات ظہور میں آئی۔ حضرت سلیمانؑ کو تنبہ ہو گیا اور حقیقتِ حال کو سمجھتے ہوئے حق تعالیٰ کی جانب متوجہ ہوئے جس کے لیے فرمایا گیا:

ثُمَّ اَنَابَ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ۔	کہ پھر متوجہ ہوئے سلیمان۔ کہا اے میرے پروردگار مغفرت فرما میرے لیے اور عطا فرما دے مجھ کو ایک ایسا ملک کہ میرے بعد (میرے سوا) کسی کے واسطے وہ مناسب نہ ہو۔

چنانچہ خداوندِ عالم نے اپنے پیغمبر کی اس دعا اور ان کے جذبۂ جہاد شوقِ اعلاءِ کلمۃ اللہ کو دیکھتے ہوئے اعداء اللہ کی سرکوبی اور مقہور کے لیے ہر نوع کا دنیوی اور مادی سامان اور طاقت انہیں عطا فرما دی۔ اور وہ طاقت کہ ہوائیں، پرند اور جنات بھی ان کے مسخر کر دیئے۔ اسی کو فرمایا کہ ہم نے ایک ایسی سلطنت دے دی۔

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّیْحَ تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَیْثُ اَصَابَ وَالشَّیٰطِیْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ وَّاٰخَرِیْنَ مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔	کہ پھر ہم نے تابع کر دیا ان کے لیے ہوا کو کہ وہ ان کے حکم سے جہاں وہ چاہتے نرم چلا کرتی اور جنات کو بھی (تابع کر دیا) جو ہر ایک عمارتیں بنانے والا اور سمندروں میں) غوطہ لگانے والا ہوتا اور کچھ بھی (ان کے تابع کر دیئے) جو زنجیروں میں (ان کے سامنے) جکڑے ہوئے رہا کرتے اور ہم نے کہہ دیا، یہ ہے ہماری بے حساب بخشش خواہ کسی کو دیں یا روکیں۔

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے واقعۂ ابتلاء و آزمائش کے اجمال کے دور کر دینے سے نفسِ واقعہ کا بھی علم ہو گیا اور آیات کی تفسیر بھی اس طرح ذہن نشین

ہوگئی کہ ماقبل اور مابعد میں پورا پورا معلوم ہونے کے ساتھ حق تعالیٰ شانہٗ کی عظمت اور اس کے ایک جلیل القدر پیغمبر کی قدر و منزلت بھی معلوم ہوگئی۔[۱]

کلام میں تشابہ معنی کے اسباب بھی متعدد ہوتے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ کہ کہیں غیر محسوس کے احوال محسوسات کے پیرایہ میں بیان کیے جاتے ہیں۔ مثلاً حق تعالیٰ کی صفات:

استوا ء علی العرش، یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ۔

کشف ساق اور اللہ کا بادلوں کے سائبانوں میں آنا وغیر ذٰلک اس قسم کے متشابہات کی توضیح صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ہوسکتی کہ جس قدر ان امور کی تشریح آنحضرت نے فرمادی بس اسی حد تک محدود ہے۔ اس سے زائد کسی معنی کی تعیین کے ہم مکلف نہیں (متشابہات کی بحث گزشتہ اوراق میں قارئین کے مطالعہ سے گزر چکی۔)

---

[۱] تفصیل کے لیے تفسیر ابن کثیر اور روح المعانی کی مراجعت کی جائے۔

قرآن کریم کا طرزِ استدلال

قرآن کریم کا اپنے معانی اور مطالب پر طرز استدلال بھی ایک عجیب معجزانہ شان رکھتا ہے جو نہایت لطیف اور محکم ہونے کے باوجود اس قدر سہل اور آسان بھی ہوتا ہے کہ جس کو ایک طرف بڑے سے بڑا حکیم و دانا اور فیلسوف قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو دوسری طرف ادنیٰ سے ادنیٰ فہم والا انسان حتیٰ کہ اونٹ اور بکریاں چرانے والے جاہل بھی اس کو سمجھ سکتے ہیں (ہر دو گروہ کا قرآنی دلائل سے اپنے اپنے ذوق اور فہم کے بموجب مستفید ہونا منجملہ معجزات قرآن ہے کہ) اگر قرآن کریم میں صرف حکیمانہ ہی طریق استدلال بیان کیے جاتے تو عوام مستفید نہ ہوتے۔ مثلاً کتاب الٰہی کا پہلا فرض منصب یہ ہے کہ وہ خدا کے وجود اور اس کے صفات کا وجود کسی دلیل سے پیش کرے۔ کیونکہ انسان فطری طور پر اس بات کا خوگر ہے کہ وہ صرف محسوسات کی حد تک تسلیم کرتا ہے۔ غیر محسوس وجود کا وہ بڑی مشکل سے قائل ہوتا ہے حتیٰ کہ ایک عام انسان تو ان امور کو بھی تسلیم کرنے یا سمجھنے سے قاصر رہتا ہے جو علوم حسیہ کے بلند ترین مقامات پر پہنچے ہوئے ہوتے ہیں اور جو لوگ ان محسوسات کے ماہر اور ان میں حیرت انگیز ایجاد و اختراع پر قدرت رکھتے ہیں ان کو بڑا حکیم و فلاسفر کہا جاتا ہے۔ مگر ان تمام علوم اور ایجادات کی بلندی تک پہنچ جانے کے وجود غیر محسوسات کا وجود تسلیم کرنے میں اکثر اسی ابتدائی حالت میں پڑے ہیں۔

اور غیر محسوسات کے وجود کا انکار کرتے ہیں جس میں حق تعالیٰ کی ذات ملائکہ ارواح جنت و جہنم سب شامل ہیں۔ دوسرے مذاہب کی کتابیں جہاں تک

ہمارے سامنے ہیں جن کو ان کے معتقد الہامی اور کلام الہٰی کہتے ہیں ان سب کو اوّل سے آخر تک دیکھ جائیے کہیں بھی ایک دلیل ایسی نہیں ملے گی جو خدا کے وجود کو ثابت کردے۔ ہاں یہ ملے گا کہ خدا موجود ہے وہ وحدہٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ہے۔ اس کی عبادت کرو اس کو مانو اس سے محبت کرو۔ مگر ظاہر ہے یہ سب دعاوی ہیں جن کو صرف وہی تسلیم کریں گے جو کتاب الہٰی اور الہام خداوندی کے قائل ہیں مگر اس منکرِ کتاب و الہام کے سامنے جو موجودات کا دائرہ صرف محسوسات تک محدود مانتا ہے۔ یہ دعاوی حجت اور تسلی بخش نہیں ہو سکتے۔ اس کے برخلاف قرآن کریم نے سب سے اوّل سورت کے شروع ہی کے پہلے ہی جملہ میں اس بات کو ثابت کردیا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہ سب خوبیاں اور ہر طرح کی ستائش اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ اللہ کون ہے؟ ربّ العالمین۔ اب عالم کے جملہ انواع و اصناف پر ایک نظر ڈال جائیے۔ عالم سفلی سے لے کر عالم علوی تک عالم انسان سے لے کر عالم حیوانات تک، عالم نباتات عالم جمادات عالم عناصر عالم افلاک سیارات و نیرات ان میں سے کوئی سی بھی چیز ایسی نہیں جو اس کے فیض تربیت اور پرورش سے خالی ہو۔

سب سے اوّل انسان اپنے حالات پر غور کرے کہ نطفہ کو تدریجاً کس کمال تک پہنچایا جاتا ہے۔ آخر وہ انسان کامل ہو جاتا ہے۔ سیارات نیرات کی اور بالوں کو جانے دیجیے ان کی مجموعی رفتار ہی عجیب انداز کے ساتھ ہے کہ ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتا۔

یہ نہ تو ان کے مادہ کا فعل ہے نہ ان کی طبیعت کا اس لیے کہ یہ دونوں مدرک اور صاحب شعور نہیں۔ پھر ان کے جس قدر افعال تسلیم کیے جائیں انہی کے اجسام تک محدود ہیں۔ دوسرے جسم میں ایک طبیعت اور مادہ کا فعل ارادی پہنچنا حیطۂ امکان سے باہر ہے

اب اس دلیل سے عوام بھی مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ انہوں نے یہ دیکھ لیا

اور جان لیا کہ ضرور ان سب موجودات سے بالاتر ایک ایسا وجود ہے جو ان سب کی پرورش کر رہا ہے۔ اور اسی کو ایک حکیم بھی منطقی قاعدہ پر برہان بنا کر اطمینان کر سکتا ہے کہ :

عالم مربوب ہے اور جو مربوب ہے اس کے واسطے مُربّی کا ہونا ضروری ہے۔ نتیجہ نکلا کہ عالم کے لیے ایک مربّی ہے اور وہی خدا ہے۔ یہی وہ برہان، اور طرز استدلال ہے جس سے عالم کا حادث ہونا بھی ثابت ہوتا ہے کہ عالم مؤثر سے مستغنی نہیں (کیونکہ وہ مربوب ہے)

اور مؤثر سے مستغنی نہ ہو وہ حادث ہے۔ نتیجہ نکلا کہ عالم حادث ہے پھر یہ ثابت ہوگیا کہ عالم حادث ہے تو اسی سے یہ بھی لازم آئے گا اس کے لیے کوئی مُحدِث و موجد بھی ہے۔ اور وہی خدا ہے۔ دُنیا میں جو بہت سی قومیں گمراہ ہوئیں ان کے لیے سب سے پہلے قدم ڈگمگانے کا یہی مرحلہ پیش آیا کہ اُنہوں نے یہ سمجھا کہ عالم کسی بات میں کسی کا (خدا کا) محتاج نہیں ہے اور یہی گمان خدا کے ابطالِ وجود کا سبب بنا۔ پھر اگر کوئی فرقہ ان فرقوں میں سے ترقی کر کے خدا کا قائل بھی ہوا تو وہ ایک ایسے خدا کا جو بالکل بے کار و معطّل ہو جس کا عالم پر کچھ بھی اختیار و تصرف نہ ہو۔ چنانچہ قرآن نے دہریوں کے اس بنیادی عقیدہ اور باطل خیال کو نہایت ٹھوس دلائل اور عام فہم انداز بیان سے رد کیا اسی طرح احکام کے بیان میں بھی ایک ایسا سہل اور مؤثر طریق اختیار کیا ہے کہ جس سے بندوں کے دلوں پر اثر ہو اور وہ تعمیل کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ اسی لیے کہیں تو اپنی ذات و صفات کے اثبات کے بعد احکام بیان کیے جاتے ہیں تاکہ آمر کی شان اور عظمت اس کو عمل کی مشقت اور پابندی پر آمادہ کر دے۔ کبھی حشر و نشر اور احوال آخرت کے ساتھ ملا کر تاکہ عمل کے نتائج و ثمرات کا بیان عمل پر محرک ہو سکے اور نافرمانی کے بُرے نتائج نافرمانی سے باز رکھ سکیں۔ کہیں نیک و بد لوگوں کے واقعات کے ساتھ تاکہ ان کے احوال کو معلوم کر کے نیک عمل کی

رغبت اور نافرمانی سے نفرت پیدا ہو۔ پھر ان سب کو کسی ایک باب یا ایک فصل میں ترتیب وار جمع نہیں کیا بلکہ اس دوا کو ان شیرینیوں کے ساتھ متعدد جگہ ملا دیا ہے۔ ایک عنوان سے بلکہ مختلف عنوانوں سے پھر ایک بار نہیں بلکہ بتدریج بار بار کسی جگہ اجمال اور کسی جگہ تفصیل کسی مقام پہ ترغیب اور کسی مقام پہ ترہیب کے ساتھ ذکر فرمایا۔ قرآن کریم کا یہ طرز ایک امتیازی اور اعجازی شان رکھتا ہے اس کی نظیر بھی کتب سماویہ میں نہیں ملتی۔

قرآن کریم اپنے اسی طرز کے ساتھ تمام اقسام احکام پہ مشتمل ہے[1]۔

---

[1] اصولیین کے نزدیک یہ امر معروف ہے کہ نصوص شرلیعت دلالت کے اعتبار سے چار انواع پر منقسم ہیں قطعی الدلالہ والثبوت۔ ظنی الدلالہ والثبوت۔ ظنی الثبوت قطعی الدلالہ۔ ظنی الدلالہ قطعی الثبوت۔ احکام میں فرضیت اور حرمت کا درجہ دلالت کی پہلی قسم سے ثابت ہوتا ہے۔ دوسری قسم سے جانب فعل میں استحباب اور جانب ممانعت میں کراہت تنزیہہ۔ تیسری اور چوتھی قسم سے جانب فعل میں وجوب اور سنت کا اور جانب ممانعت میں کراہت تحریم کا حکم ثابت ہوتا ہے (تفصیل کے لیے کتب اصول کی مراجعت فرمائی جائے)۔

مجموعی طور پر احکام کی تقسیم فقہاء نے اس طرح کی ہے۔ مباح ۔جس کا کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہوں۔

فرض : جس کا کرنا کلام اللہ یا تواتر سے لازم اور ترک کرنا معصیت اور موجب عذاب خداوندی اور اس کا انکار کفر ہو۔

واجب : نص غیر متواتر سے جس کا کرنا ضروری ہے لیکن اس کی تاکید و اہمیت، درجۂ فرض سے کم ہے اور اس کے انکار سے انسان کافر نہیں ہوتا البتہ فسق کا حکم لگایا جائے گا۔

مندوب و مستحب : جس کے کرنے پر اجر و ثواب اور نہ کرنے پر دنیوی یا اخروی قباحت اور عذاب مرتب نہ ہو۔

مراتب احکام

فرض و واجب کی علامات ۔ فرض ۔ یوصیکم ۔ یا وصٰی یا اوصینا ۔ لفظ امر (اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ) امر کے تمام صیغے جب کہ کوئی قرینہ فرضیت کے خلاف قائم نہ ہو ۔

لفظ قضیٰ اور اس کے ہم معنی الفاظ یا اس کے ترک پر عقاب اخروی یا قباحت دنیویہ کا بیان یا اس کے فاعل کی مدح اور اس پر اجر و ثواب کا ترتب اس کی پابندی پر تاکید ۔ اس فعل کو ابرار صالحین کا فعل فرمانا ، اس پر اپنی محبت و رضامندی کا ذکر ۔

حرمت و کراہت تحریم کی علامات : لفظ حرام و حرمت کا اطلاق ۔ اس پر ممانعت کا وارد ہونا ۔ اس فعل کو رجس یا نجس یا عمل شیطان بتانا ۔ اس پر عذاب اخروی یا دنیوی قباحت یا عتاب کا صادر فرمانا ۔ اس کے فاعل و مرتکب کی مذمت کرنا ۔ اس فعل کو دوسری خرابیوں کا باعث قرار دینا ۔ اس کو سفہاء اور حمقاء کا فعل قرار دینا اس پر اور اس کے فاعل پر لعنت کرنا ۔ اس کو اپنے غضب و ناراضگی کا موجب بتانا ۔

کلام اللہ کی دلالت احکام شریعت پر : دلالت کی تینوں قسموں " مطابقت تضمن اور التزام " کے ساتھ مندرجہ ذیل صورتوں میں پائی جاتی ہے ۔

اگر کلام ظاہر المراد ہے اور معنی کا ظہور محض الفاظ ہی سے ہے اگرچہ وہ محتمل

حرام ۔ نص قطعی اور تواتر کے ساتھ جس کا ترک کرنا لازم اور اس کا ارتکاب دنیوی قباحت اور اخروی عذاب کا موجب ہو ۔ مکروہ تحریمی : جس کی ممانعت نص غیر قطعی سے ثابت ہو جو بالمقابل واجب کے ہے اور اس کا درجہ حرام سے کم تر ہے ۔ مکروہ تنزیہی : جس سے پرہیز کرنے پر اجر و ثواب ہو اور اس کا کرنا موجب ساخت (رائی) تو ہو لیکن گناہ اور عقاب کے درجہ میں عنداللہ شمار نہ ہوتا ہو ۔

تاویل ہو، اس کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ اگر یہی معنی مقصودی سیاق کلام سے ظاہر ہو رہے ہیں اور متکلم نے اسی کا ارادہ کیا ہے تو نص کہا جائے گا مثلاً آیت لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا۔ مقصد کلام مہاجرین کا مال غنیمت اور فے میں حق بیان کرتا ہے تو اس معنی کے اعتبار سے یہ کلام نص ہے اور اس کے ساتھ لفظ فقراء کے اطلاق سے یہ بھی ظاہر و معلوم ہو رہا ہے کہ دارالکفر میں چھوڑی ہوئی املاک سے مہاجرین کی ملکیت زائل ہو چکی۔ کیونکہ اگر بعد الہجرت ان املاک کا اعتبار ہوتا تو ان کو فقراء کے عنوان سے تعبیر نہ کیا جاتا۔ تو اس مفہوم کے اعتبار سے یہ کلام ظاہر ہے۔

اور اگر کلام کی مراد اس درجہ ظاہر و واضح ہے کہ اس میں کسی دوسرے معنی کی تاویل کا امکان نہیں البتہ نسخ کا امکان ہے تو اس کو مُفسّر کہا جائے گا۔ اور اگر مدلول کی قطعیت اس درجہ ہے کہ اس میں نسخ کا بھی امکان نہیں رہا تو محکم ہے۔ کلام اللہ کی وہ تمام آیات جو فرائض و واجبات اور منہیات توحید و صفات خداوندی نبوت و رسالت مبدا و معاد جزا اور تمام احوال آخرت پر مشتمل ہیں وہ سب مفسّر و محکم ہیں۔

یہ چار قسمیں وہ ہیں جن میں مراد کا درجہ بدرجہ ظہور ہے۔ ان کے بالمقابل ایک حصہ کلام اللہ کا ایسا ہے جس سے مراد اور معنی اخذ کرنے کے لیے اہل علم غور و فکر اور تحقیق و تنقیح کے محتاج ہوتے ہیں اس حیثیت سے بھی نصوص کلام اللہ اور آیات قرآنیہ کے درجات متفاوت ہیں:

(۱) اگر معنی کا خفاء کسی عارضی سبب سے ہے نفس الفاظ اور ان کی دلالت میں کوئی ابہام نہیں تو اس کو خفی کہتے ہیں۔

(۲) اور اگر خفا معنی کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے ہو تو اس کو مشکل کہتے ہیں جیسے کہ آیت سرقہ کفن چور کے حق میں معنی سرقہ کی کمی اور طرار و کیسہ بُر (اُچکے

اور جیب تراش) کے حق میں معنیٰ سرقہ کی زیادتی کی وجہ سے مشکل ہو گئی ہے مگر یہ خفا ایسا ہے کہ مخاطب سیاق و سباق (مابعد و ماقبل کلام) میں غور کرے تو دُور ہو جاتا ہے ۔

(۳) اور اگر یہ خفا دتامل اور غور سے بھی دُور نہ ہو بلکہ متکلم کی جانب سے وضاحت کی احتیاج ہو تو ایسے کلام کو مجمل کہتے ہیں جیسے والعادیٰت ضبحاً وغیرھا کہ ان سے مراد گھوڑے ہیں یا اونٹ ؟

(۴) اور اگر یہ امید بھی باقی نہ رہے تو اس کو متشابہ کہتے ہیں جیسے مقطعات قرآنیہ اور آیات صفات متشابہات غرض ان تمام اقسام اور انواع سے کلام الٰہی اپنے مطالب پر دلالت کرتا ہے ۔

بحث ناسخ ومنسوخ

اصول تفسیر میں معرفت ناسخ ومنسوخ کا مسئلہ ایک اہم اور مشکل ترین مسئلہ ہے۔ متقدمین نے اس موضوع پر مستقل کتابیں تصنیف فرمائیں۔ چنانچہ امام ابوعبیدۃ القاسم بن سلام متوفی ۲۲۳ھ امام ابو داؤد السجستانی صاحب سنن متوفی ۲۷۵ھ ابوجعفر النحاس ۳۳۸ھ ابن الانباری ۳۲۸ھ مکی بن ابی طالب ۴۳۷ھ ابوالفرج ابن الجوزی ۵۹۷ھ اور قاضی ابوبکر ابن العربی وغیرہ ائمہ و مفسرین نے اس عنوان پر تصانیف کیں۔ جمہور مفسرین کا قول ہے کہ کسی ایسے شخص کے لیے کلام اللہ کی تفسیر کرنا جائز نہیں جو ناسخ ومنسوخ کی معرفت نہ رکھتا ہو۔ نسخ لغت میں کسی چیز کے ازالہ یا مٹا دینے نقل وتحویل کر دینے کو کہا جاتا ہے۔ محاورات عرب میں "نَسَخَتِ الرِّیْحُ آثَارَ الْقَوْمِ" بایں معنی استعمال کیا جاتا ہے کہ ہوا نے قوم کے نشانات مٹا دیئے اور اسی طرح بولا جاتا ہے۔ نسخ الکتاب الی کتاب اور نَسَخْتُ الْکِتَابَ جب کہ اس کو نقل کیا جائے۔ لفظ نسخ آیت فَیَنْسَخُ اللّٰہُ مَا یُلْقِی الشَّیْطَانُ ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰہُ اٰیَاتِہٖ میں ازالہ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

اصطلاح شریعت میں نسخ کے معنی یہ ہیں کہ کسی حکم شرعی سابق کو رفع کرکے اس کے قائم مقام دوسرا حکم مقرر کرنا جیسے کہ خود ارشاد خداوندی اس معنی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ مَا نَنْسَخْ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا

اصولیین بیان کرتے ہیں نسخ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک حکم شرعی کی دوسرے کسی حکم سے تبدیلی ہے لیکن حقیقت نسخ یہ ہے کہ حکم سابق جو عنداللہ ایک معین اور محدود وقت کے ساتھ مقید تھا اس کی مدت کے ختم ہونے پر

دُوسرے حکم مؤبّد کا مقرر کر دینا ہے جیسے کوئی طبیب حاذق کسی مریض کے لیے ابتداء معالجہ میں ایک نسخہ تجویز کرتا ہے اور بوقت تجویز یہ جانتا ہے کہ اس مریض کے لیے اس نسخہ کا استعمال مثلاً ایک ہفتہ کرانا ہے۔ ایک ہفتہ گذرنے پر طبیب اس کی جگہ دُوسرا نسخہ بدل دیتا ہے تو حکیم کا یہ دُوسرا نسخہ تبدیل کرنا اس بناء پر (یقیناً) نہیں کہ اس کو اپنے پہلے نسخہ میں آج کسی خرابی اور نقصان کا علم ہُوا یا وہ ثانی نسخہ کی خوبی اور فائدہ سے پہلے غافل تھا۔ آج وہ اس کے فائدہ پر مطلع ہُوا تو جس طرح ایک مدّت گذرنے پر نسخہ کی تبدیلی کمال طب ہے اسی طرح احکام شرعیہ میں نسخ اور تبدیلی بھی حق تعالیٰ کی کمالِ حکمت ہے۔ امور تکوینیہ مثلاً غنا و فقر صحت و مرض سلطنتوں کے زوال و عروج میں تغیر و تبدّل عین مقتضائے حکمت ہے۔ اسی طرح احکام شرعیہ میں۔ باقتضاء زمان و مکان تغیر و تبدّل بھی سراپا حکمت ہی ہے اور اس تغیر و تبدّل سے اللہ کے علم میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ جو کچھ تبدیلی ہے وہ ہمارے علم کے اعتبار سے ہے۔ حق تعالیٰ کی شان تو یہ ہے کہ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسٰی۔ لیکن احکام کی تشریح اور ان کی تبدیل یہ سب اُمور چونکہ منصب نبوّت سے متعلق ہیں۔ اس لیے انبیاء کے علاوہ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی بھی بناء پر اور کوئی مصلحت و حکمت کا مدعی بن کر احکامِ خداوندی کے نسخ یا ان میں تغیر و تبدیل کا اپنے کو اہل تصوّر کرے۔

شیخ جلال الدین سیوطیؒ ابن الحصار سے نقل کرتے ہیں فرمایا کہ نسخ کا دار و مدار نقل صریح (اور صحیح) پر ہے" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی جانب سے یا کسی صحابی سے اس طور پر وضاحت کے ساتھ کہ فلاں آیت فلاں کے لیے ناسخ ہے" اور نسخ کا فیصلہ اس وقت کیا جائے گا جب کہ ہر دو آیات میں تعارض قطعی ہو اور یہ معلوم ہو کہ ان میں کونسی آیت مقدم ہے اور کونسی مؤخر۔ نسخ کے بارہ میں نہ تو عام مفسرین کا قول معتبر ہے اور نہ مجتہدین کا اجتہاد بغیر کسی نقل صریح اور حدیث صحیح کے کیونکہ نسخ ایک حکم شرعی کے رفع اور اس کی جگہ دوسرے حکم شرعی کے رفع، اور

اس کی جگہ دوسرے حکم شرعی کے تقرر کو زمانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں متضمن ہے اور ظاہر ہے کہ احکام شرعیہ کے رفع اور تقرر کا انتساب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی طرف دلیل قطعی نقل صریح اور ثبوت تاریخ کا محتاج ہے۔ رائے اور اجتہاد اس امر میں کسی طرح قابل اعتبار نہیں۔ بعض حضرات اس مسئلہ میں افراط و تفریط کا طریقہ اختیار کرتے ہیں کوئی اخبار احادیث صحیحہ کو بھی (جو عندالاصولیین حجت شرعیہ اور اثبات احکام کے لیے کافی ہیں۔) معتبر نہیں جانتا۔ اگرچہ ان کا ثبوت بلاشبہ ثقہ اور عادل راویوں سے ہوا اور بعض مقابل ہر مجتہد کے اجتہاد اور ہر گمان کرنے والے کے ظن و تخمین کو کافی سمجھ لیتے ہیں۔[1]

اس مقام پر یہ بات قابل وضاحت ہے کہ نسخ کا محل صرف احکام عملیہ اور فرعیہ ہیں یعنی ان احکام کے قوالب اور صورتیں کہ ان میں بلحاظ اقوام، اور حسب ضرورت و اوقات انبیاء کے توسط سے نسخ اور تغیر و تبدل ہوا ہے مثلاً نماز کسی پیغمبر کے زمانہ میں صرف تسبیح و تہلیل اور دعا تھی تو کسی دوسرے پیغمبر کے عہد میں اس میں رکوع و سجود اور بعض دیگر ارکان و شرائط کا اضافہ کر دیا گیا۔ انبیاء سابقین کی شریعتوں میں دوگانہ نمازیں فرض تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں نمازوں کی فرضیت پنجگانہ کر دی گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حرمت خمر کے ساتھ ان برتنوں کے استعمال کو بھی حرام فرما دیا تھا جو شراب کے لیے استعمال کیے جاتے تھے تاکہ شراب کی نفرت دلوں میں پورے طور پر راسخ ہو جائے۔ جب شراب سے نفرت قلوب میں جم گئی تو پھر ان اقسام ظروف اور برتنوں کی حرمت کا حکم رفع فرما دیا گیا اور اجازت دے دی گئی کہ وہ برتن استعمال کر سکتے ہو جو برتن اہل عرب بالعموم شراب بنانے کے سبب استعمال کرتے تھے۔ فروعی احکام اور عملی جزئیات میں نسخ تورات و انجیل سے خود ثابت ہے (لیکن اس کے باوجود محض عناد کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں نسخ احکام پر اہل کتاب معترض ہوتے۔)

[1] الاتقان صفحہ ۲۲ ج ۲

مثلاً حضرت یعقوب علیہ السلام کے عہد میں دو حقیقی بہنیں ایک ساتھ ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنا درست تھا۔ چنانچہ لیاؔ اور راخیلؔ دو حقیقی بہنیں حضرت یعقوب علیہ السلام کے نکاح میں جمع تھیں (سفر تکوین ۲۹)
اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جمع بین الاختین کا جواز منسوخ کر دیا گیا (سفر احبار باب ۱۸) حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں بہت سے جانور حرام کر دیئے گئے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے ان کی حرمت منسوخ فرمائی جیسا کہ ارشاد ہے وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ۔

فروعی احکام اور عملی جزئیات سے مراد وہ احکام ہیں جو شہوات نفس اخلاق رذیلہ سے اجتناب اور روح انسانی پر تاریکی پیدا کرنے والی چیزوں (مثلاً زنا) قتل، جھوٹ، ظلم، بت پرستی کے ماسوا ہوں کیونکہ ان امور کو نہ کوئی دوسری شریعت منسوخ کرتی ہے اور نہ ہی کسی پیغمبر کی شریعت میں ایسا ہوا کہ کبھی حرام ہوں اور پھر کسی زمانہ میں ان کی حرمت منسوخ کر دی جائے۔ اسی طرح اصول عبادات مثلاً نماز، صدقہ، روزہ (اگرچہ ان کی عملی تفاصیل میں نسخ ہوا ہو کہ) مگر ان تمام امور میں تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں متحد ہیں، یہی مطلب ہے حق تعالیٰ کے اس فرمان کا۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ (شوریٰ)

اور یہی معنی آیت أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (انعام) کے ہیں۔ اسی طرح ان تمام علوم و معارف میں بھی نسخ واقع نہیں ہوتا جو حق تعالیٰ کی ذات و صفات سے متعلق ہیں اور نہ ان قصص و واقعات میں جو حضرات انبیاء کے واسطہ سے معلوم ہوئے اور اسی طرح قیامت اور احوال قیامت جنت و جہنم اور جملہ اور امور نظریہ و اعتقادیہ میں

کبھی نسخ نہیں ہوا۔ نہ خود ایک نبی کی شریعت میں ان امور میں کسی وقت کوئی تغیر و تبدل ہوا اور نہ ہی کسی شریعت نے دوسرے پیغمبر خدا کے بیان کیے ہوئے اعتقادی نظریات کو منسوخ کیا۔ نسخ کی یہ تفسیر و تشریح اصولیین کی اصطلاح کے پیش نظر ہے۔

آیات منسوخہ اور ان کی تفصیل

صحابہؓ اور تابعین کے دور میں نسخ کے مفہوم میں توسع اختیار کیا جاتا تھا۔ عام کی تخصیص یا مطلق کی تقیید یا کسی مجمل کا بیان و توضیح یا کسی حکم سابق کو بعد میں کسی شرط اور وصف کے ساتھ مقید کرنے یا کسی قید و وصف سابق کے رفع کرنے کو بھی نسخ کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا تھا اسی وجہ سے متقدمین کے یہاں آیات منسوخہ کا عدد زائد معلوم ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض مفسرین نے تو پانچ سو تک آیات منسوخہ شمار کی ہیں۔

شیخ سیوطیؒ نے الاتقان میں نسخ آیات پر مبسوط کلام فرماتے ہوئے شیخ ابن العربی کی تحقیق کے مطابق تقریباً بیس آیات میں نسخ کا قول اختیار کیا اور اس کو متاخرین کی تحقیق قرار دیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ نے الفوز الکبیر میں ان مواقع کو ذکر کرتے ہوئے بہت سے مواقع پر تردد ظاہر کیا اور تمام قرآن میں صرف پانچ آیات میں نسخ کے قائل ہوئے۔

سورۂ بقرہ: آیت: كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِن تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ منسوخ ہے آیت میراث يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ سے۔ جمہور کا یہی قول ہے اور بعض فقہاء فرماتے ہیں۔ حدیث أَلَا لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ سے منسوخ ہے شاہ صاحب

ــــــــــــــــــــــــــــــ

لہ اس سے معلوم ہوا کہ دین کے امور نظریہ و اعتقادیہ میں رد و بدل اور ان میں کسی نوع کا تغیر گویا تمام انبیاء کی شریعتوں کی تحریف ہے۔

نے فرمایا کہ آیت وصیت منسوخ آیت میراث ہی کے ذریعے سے ہے۔ حدیث اَلَا لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ بیانِ نسخ ہے۔

آیت وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ فِدْیَۃٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ آیت "فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ" سے منسوخ ہے اور بعض کا مسلک یہ ہے کہ محکم ہے اور لفظ لا کی تقدیر کے ساتھ آیت کو شیخ فانی اور عاجز کے حق میں لیتے ہیں۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک آیت کا ایک مفہوم بھی ممکن ہے وہ یہ کہ وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ میں طاقت صوم کے معنی نہ لیے جائیں بلکہ طاقت اطعام (یعنی کھانا کھلانے کی طاقت) مُراد ہو جس سے مقصد حق تعالیٰ کا اُدائے صدقۃ الفطر بیان کرنا ہے۔ روزہ کے قائم مقام اطعام طعام بیان کرنا مقصد نہیں ہے تو حق تعالیٰ اس مقام پر صدقۃ الفطر کے بعد حکم صیام کا ذکر فرمایا جیساکہ آیت ثانیہ میں، بعد میں تکبیرات عیدین کا بیان فرمایا وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ میں۔

آیت اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ الخ ناسخ ہے آیت كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ کے لیے کیونکہ آیت كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ کا مقتضا یہی ہے جس طرح اہل کتاب پر سو جانے کے بعد رات کے کسی حصہ میں بھی کھانا پینا اور اپنی عورتوں سے قربت کرنا حرام تھا، اسی طرح اس شریعت میں بھی۔ چنانچہ ابتدا احوال میں یہی حکم مشروع تھا مگر بعد میں اس کی اباحت کا حکم آیت اُحِلَّ لَكُمْ کے ذریعے بیان کر دیا گیا۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ كَمَا كُتِبَ میں تشبیہ نفس وجوب کے اعتبار سے ہے نہ اس اعتبار سے کہ جمیع احکام فرعیہ اور جزئیات میں بھی اہل کتاب ہی کی طرح روزوں کو مقرر کیا گیا۔ تو اس صورت میں نسخ نہ ہوگا۔ یہ جو کچھ قرآن کریم نے آیت اُحِلَّ لَكُمْ میں بیان کیا وہ اس طریقہ کی تبدیلی ہے جو ان کے درمیان

اس حکم خاص کی مشروعیت سے قبل تھا۔ کیونکہ اس کی کوئی دلیل (قطعی) نہیں ہے کہ یہ حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے مشروع فرمایا تھا۔ اور اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ حرمت اکل وشرب بعد النوم آنحضرتؐ کی جانب سے تھا تو آیت کلام اللہ دوسری آیت کے لیے ناسخ نہ ہوگی بلکہ سنت کا نسخ ہوگا، کتاب اللہ کے ذریعے۔

آیتؑ وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الشَّھْرِ الْحَرَامِ الخ۔ ابن جریر طبری عطاء کی روایت سے نقل کرتے ہیں کہ یہ منسوخ ہے۔ آیت وَقَاتِلُوا الْمُشْرِکِیْنَ کَآفَّۃً سے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ آیت مذکورہ تحریم قتال پر دلالت نہیں کرتی بلکہ جواز قتال آیت سے مفہوم ہوتا ہے۔ درحقیقت آیت کا مدلول مانع عن القتال اور خصم کی دلیل تسلیم کرتے ہوئے یہ ہے کہ قتال شہر حرام میں اگرچہ بہت شدید چیز ہے لیکن کفر وشرک کا فتنہ تو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس لیے کفر وشرک کے بالمقابل قتال فی الشہر الحرام کی قباحت قابل تحمل ہے۔ اور چنانچہ یہ توجیہ سیاق کلام سے بخوبی واضح ہے۔

آیتؒ۔ وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ اِلٰی قَوْلِہٖ مَتَاعًا اِلَی الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ۔ بالعموم ائمہ تفسیر فرماتے ہیں کہ منسوخ ہے آیت " اَرْبَعَۃَ اَشْھُرٍ وَّعَشْرًا سے اور آیت مَتَاعًا اِلَی الْحَوْلِ میں وصیت کا بیان کردہ حکم آیت میراث سے منسوخ ہے۔

آیتؔ۔ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ منسوخ ہے۔ آیت لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا سے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ صورت باب نسخ سے نہیں ہے بلکہ عام کی تخصیص ہے کیونکہ آیت تانیہ نے یہ چیز ظاہر کردی کہ مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ سے مراد (غیر اختیاری وساوس اور خطرات نہیں ہیں بلکہ) اخلاص ونفاق اور وہ باطنی احوال ہیں جو انسان کی قدرت و اختیار کے تابع ہیں۔

آل عمران ۔ آیت اتقوا اللہ حق تقاتہ کہا گیا کہ یہ حکم آیت فاتقوا اللہ ما استطعتم سے منسوخ ہے۔ اور کہا گیا کہ منسوخ نہیں ہے بلکہ محکم ہے اور کوئی آیت بجز آیت مذکورہ کے ایسی نہیں کہ جس سے دعویٰ نسخ صحیح ہو سکے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں میرے نزدیک حق تقاتہ شرک و کفر اور ان تمام امور کے متعلق ہے، جن کا مرجع اعتقاد ہے۔ اور ما استطعتم کا حکم اعمال کے متعلق ہے مثلاً جو شخص وضو کی استطاعت و قدرت نہ رکھتا ہو تو تیمم کر لے۔ یا جو شخص نماز کھڑے ہو کر پڑھنے پر قادر نہیں وہ بیٹھ کر پڑھ لے۔ یہی مضمون مابعد کی آیت " ولا تموتن الا وانتم مسلمون " سے سمجھا جا رہا ہے۔

سورہ نساء ۔ آیت والذین عقدت ایمانکم فاتوھم نصیبھم مفسرین کے نزدیک مشہور ہے کہ آیت واولوا الارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ سے منسوخ ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں (نسخ ماننا ضروری نہیں بلکہ) میرا خیال ہے کہ آیت کا ظاہر مفہوم یہ ہے کہ میراث موالی اور اہل قرابت کے لیے ہے اور ہمدردی و صلہ ان لوگوں کے لیے جن کے ساتھ مواخات و بھائی چارگی کا عہد ہو چکا ہے۔

آیت: واذا حضر القسمۃ اولوا القربی الخ کہا گیا کہ منسوخ ہے، اور بعض مفسرین کہتے ہیں منسوخ نہیں البتہ بالعموم لوگوں نے اس پر عمل کرنے میں تھاون (سستی) کا برتاؤ کیا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ آیت محکم ہے اور حکم استحبابی ہے (کہ عام رشتہ داروں کو جو ذوالفرض اور عصبات کے علاوہ تقسیم ترکہ کے وقت حاضر و موجود ہوں اور ان کو بھی بطور تبرع مستحق میراث رشتہ دار اپنے اپنے حصوں میں سے کچھ دے دیں تو اچھا ہو)۔

آیت: والتی یاتین الفاحشۃ الخ منسوخ ہے آیت سورہ نور " الزانیۃ والزانی " سے شاہ صاحب فرماتے ہیں ظاہر یہ ہے کہ اس مقام پر کوئی نسخ نہیں ہے بلکہ حکم سابق جو ایک غایت اور انتہا کے ساتھ مقید تھا اس

حکم کو اس منتہی تک پہنچا دیا گیا اور آیت نور نازل ہوتے پر آنحضرتؐ نے فرمایا اے لوگو! یہ ہے وہ راستہ جس کے پیدا کرنے کا اللہ نے وعدہ فرمایا تھا۔ بس اسی کو اختیار کرلو۔

سورۂ مائدہ۔ آیت وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ منسوخ ہے ان آیات کے ذریعے جن میں شہر حرام میں قتال کی اجازت بیان کردی گئی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں اس آیت کا ناسخ نہ ہم قرآن میں پاتے ہیں اور نہ سنت صحیح میں۔ آیت کا مفہوم تو یہ ہے کہ شہر حرام میں قتال محرم کی برائی میں اور زائد شدت ہوجاتی ہے۔ اوّل تو قتال و خونریزی خود حرام ہے پھر یہ فعل حرام شہر حرام میں حرمت بالائے حرمت کا مصداق بن جائے گا۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا:

الّا ان دماءکم واموالکم حرام علیکم کحرمۃ یومکم ھٰذا فی بلدکم ھٰذا فی شھرکم ھٰذا۔

آیت فان جاؤک فاحکم بینھم او اعرض عنھم منسوخ ہے آیت "وان احکم بینھم بما انزل اللہ" سے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں میرے نزدیک ہر دو آیتوں کے معنی یہ ہیں اگر آپؐ ان کے درمیان فیصلہ کرنا پسند فرمائیں تو پھر فیصلہ کیجیے اس کے متعلق جو اللہ نے نازل کیا اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم اہل ذمہ کو اس بات کی اجازت دیں کہ وہ اپنے باہمی قضیے اور مشاجرات اپنے زعماء کے پاس پیش کرکے فیصلہ کرالیں لیکن اگر وہ اپنا معاملہ آپؐ کے پاس لائیں تو پھر اس کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق ہوگا۔

آیت۔ او اٰخران من غیرکم منسوخ ہے۔ "واشھدوا ذوی عدل منکم" سے امام احمد بن حنبل ظاہر مفہوم کا اعتبار فرماتے ہیں اور بعض مفسرین فرماتے ہیں من غیرکم کی مراد من غیر اقاربکم یعنی اپنے

رشتہ داروں کے علاوہ دو گواہ لے کر آؤ تو اس تقدیر پر آخران من غیرکم مسلمانوں ہی میں سے ہوں گے اور آیت منسوخ نہ ہوگی ۔

سورۂ انفال - آیت ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مأتین منسوخ ہے ۔ بعد والی آیت الآن خفف اللہ عنکم و علم ان فیکم ضعفاً سے ۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں میرا خیال بھی یہی ہے کہ آیت سابقہ بعد والی آیت سے منسوخ ہے جیسا کہ مفسرین کے درمیان مشہور ہے

سورۂ براۃ - انفروا خفافاً و ثقالاً منسوخ ہے آیت عذر "لیس علی الاعمی حرج " اور آیت " لیس علی الضعفاء سے ۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں خفافاً کا مفہوم میرے نزدیک یہ ہے کہ ادنی وہ تیاری اور سامان ، جس سے جہاد ممکن ہو اور ثقالاً کے معنی یہ ہیں کہ خدام اور سواریوں ، ساز و سامان کی کثرت کے ساتھ تو اس صورت میں آیت کا نسخ نہ ہوگا ۔

سورۂ نور - الزانی لا ینکح الا زانیہ آیت "وانکحوا الایامی منکم" سے منسوخ ہے ۔ امام احمد اسی کے قائل ہیں ۔ دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ ان کے معنی یہ ہیں کہ زانی مرد کفو (اور مماثل) نہیں کسی کا بجز زانیہ عورت کے اور وحرم ذالک علی المؤمنین " سے تحریم زنا اور شرک کی طرف اشارہ ہے ۔ تحریم نکاح غرض کلام نہیں تو اس طرح آیت کی مراد ایک خاص امر ہے اور انکحوا الایامی عام ہے جو خاص کے لیے ناسخ نہیں ہو سکتا ۔ آیت لیستأذنکم الذین ملکت ایمانکم کہا گیا کہ منسوخ ہے اور کہا گیا کہ یہ حکم منسوخ نہیں لیکن لوگوں نے اس پر عمل میں تھاون اور سستی کی ہے ۔ ابن عباسؓ کا مذہب غیر منسوخ ہونے کے متعلق ہے اور یہی رائے زیادہ اولیٰ اور قوی ہے ۔

سورۂ احزاب - لا یحل لک النساء من بعد منسوخ ہے ۔ آیت انا احللنا لک ازواجک اللاتی سے ۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں احتمال ہے کہ

ناسخ مقدم ہو از روئے تلاوت ۔

سورہ مجادلہ ۔ اذا ناجیتم الرسول فقدموا منسوخ ہے بعد والی آیت سے۔ شاہ صاحب اسی کو اختیار فرماتے ہیں۔

سورہ ممتحنہ ۔ فاتوا الذین ذھبت ازواجھم مثل ما انفقوا بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ منسوخ ہے آیت قتال وجہاد سے۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ آیت غنیمت سے۔ اور بعض کے نزدیک محکم ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں، ظاہر یہی ہے کہ آیت سابقہ منسوخ نہیں ہے البتہ وہ حکم مسلمانوں کی کمزوری اور کفار کے غلبہ و قوت کے زمانہ میں ہے۔

سورہ مزمل ۔قم اللیل الا قلیلا منسوخ سورۃ کے آخری حصہ " فاقرءوا ما تیسر من القرآن سے پھر دوبارہ اس حکم کا نسخ پنجگانہ نمازوں کی فرضیت سے ہوا۔ شاہ صاحب اس مقام پر بھی نسخ کے قائل نہیں فرماتے ہیں ۔قم اللیل الا قلیلا قیام اور تہجد کی تاکید ہے ۔ اس تاکید کو آخر سورت سے تبدیل کرکے محض ندب اور استحباب کا درجہ بیان و معین فرما دیا گیا۔

غرض شاہ صاحب ان مواقع مذکورہ میں سے صرف پانچ مقام پر نسخ کے قائل ہیں اور جلال الدین سیوطیؒ بموافقت ابن العربی ان اکیس آیات میں نسخ کا قول اختیار کیا کرتے ہیں[1]

شیخ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ کتاب اللہ کا نسخ تین صورتوں کے ساتھ ہے۔

ایک یہ کہ تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہو جائیں۔

جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ احزاب سورۂ بقرہ کے بقدر طویل تھی مگر اس کا اکثر حصہ تلاوت اور حکم کے اعتبار سے منسوخ ہو

---

[1] الفوز الکبیر ص۲۸

دوسری صورت یہ کہ تلاوت منسوخ ہوگئی لیکن اس کا حکم باقی رکھا گیا، جیسے آیت رجم کہ اس کی تلاوت منسوخ ہوگئی اور حکم باقی ہے۔ ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

إِنَّا كُنَّا لَنَقْرَءُ فِيهَا آيَةَ الرَّجْمِ قُلْتُ وَمَا آيَةُ الرَّجْمِ قَالَ الشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوهُمَا الْبَتَّةَ نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ

البتہ ہم اس سورت میں اجن کی بہت سی آیات منسوخ کردی گئیں) آیت رجم تلاوت کیا کرتے تھے۔ راوی ذربن حبیش کہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا اور آیت رجم کیا ہے تو فرمایا الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموہا البتۃ نکالاً من اللہ الخ یعنی جب کہ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت (مراد شادی شدہ) زنا کرلیں تو رجم کرڈالو ان کو ضرور بطور عبرت (یہ قانون) اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ غالب ہے اور بڑی حکمت والا ہے۔

صاحب برہان نے عمر فاروق رضؓ کا قول نقل کیا ہے۔ اگر لوگوں کے اس کہنے کا اندیشہ نہ ہوتا کہ عمر نے اپنی طرف سے کتاب اللہ میں زیادتی کردی تو میں آیت رجم قرآن کریم میں لکھ دیتا اور یہ بھی منقول ہے فرمایا کرتے اے لوگو! آگاہ ہوجاؤ آیت رجم الہی آیات میں سے ایک آیت تھی جو کتاب اللہ میں اللہ نے اپنے پیغمبر پر اتاری۔ ہم نے اس کو پڑھا اور تلاوت کیا اور (اس پر عمل کرتے ہوئے) رجم بھی کیا۔ اب ہرگز ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص کتاب اللہ میں اس کو لکھا ہوا نہ دیکھ کر رجم کے شرعی ہونے کا انکار کردے۔ تیسری صورت یہ کہ حکم منسوخ ہوجائے اور تلاوت باقی ہے یہ صورت قرآن کریم میں کثیر ہے اور اس قسم پر ائمہ نے کتابیں بھی تصنیف فرمائیں۔ شیخ سیوطیؒ نے اسی قسم کی وہ اکیس مثالیں بیان کیں جن میں ابن العربی نسخ کے قائل ہوئے ان اکیس مواقع کی تفصیل گذر چکی ہے[1]

[1] الاتقان فی علوم القرآن ص۲۲ جلد ۲۔

نزول قرآن کریم کے وقت عرب کی حالت

عرب قوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزول قرآن سے قبل کس حالت میں تھی؟ اس سوال کا خود قرآن کریم نے جواب دیا اور بتایا کہ ہر طرح کی ذلت وپستی اور اعمال واخلاق کی برائیوں میں یہ قوم مبتلا تھی۔ ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ	وہ خداوند عالم ہے جس نے اُمیوں میں
رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ	ایک رسول بھیجا جو انہی میں سے ہے، جو
آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ	ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرے اور ان
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا	کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور یقیناً یہ
مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ۔	لوگ اس ہمارے رسول سے پہلے کھلی ہوئی
(آل عمران)	گمراہی میں تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ عرب قوم کی ذلت وپستی کی کوئی حد وانتہا نہ تھی۔ سلطنت و دولت کے لحاظ سے بھی یہ لوگ بہت گرے ہوئے تھے کیونکہ جنوبی و مشرقی یمن کا بہت بڑا حصہ اور نجد تو شاہان ایران کے زیر تسلط تھا۔ نوشیروان و یزد جرد وغیرہ یکے بعد دیگرے ان پر حکمران تھے۔ شمالی و غربی حصہ شاہان روم یا ان کے باجگزاروں کے ماتحت تھا۔ عراق پر کبھی ایرانی حکمرانی کرتے تھے اور کبھی روم حکمران رہتے۔ البتہ حجاز اور کچھ ملحقہ ریگستانی حصہ آزاد تھا۔ لیکن ان پر بھی باقاعدہ سلطنت اور حکمرانی کسی کی نہ تھی۔ ہر ایک قبیلہ گویا ایک مستقل ریاست تھی۔ ہر قبیلہ کا شیخ ان کا حکمران ہوتا تھا۔ بدامنی فساد لوٹ غارت گری اور بدکاری عام تھی۔ شراب ہر ایک کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ شائستگی اور ہنرمندی سے قطعاً محروم تھے۔ علوم وفنون اور تمدن کا کوئی نام ونشان بھی نہ تھا۔ اس

جہالت اور بدکاری کے ساتھ افلاس اور غربت میں پوری قوم مبتلا تھی۔ نہ تجارت جانتے تھے اور نہ کسی اسباب معیشت کی فراہمی کا کوئی سلیقہ تھا۔ صنعت و حرفت کی کوئی صلاحیت نہ تھی۔ زمین کے جس حصے پر از خود بارشوں کے پانی سے زراعت ہوتی اس کو یہ لوگ باہمی قتل و خونریزی اور فساد و بدامنی کے نذر کر دیتے۔ عرب میں جب سے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی نسل آباد ہوئی اس وقت ملت ابراہیمیہ کے کچھ آثار ضرور اس قوم میں ظاہر ہوئے اور ان کی ہدایات کی کچھ جھلک ضرور پائی گئی۔ لیکن جاہلانہ رسوم و عادات نے ان پر ایسا پردہ ڈالا ہوا تھا کہ شاذ و نادر ہی کوئی ایسا شخص تھا جس کو ملت ابراہیمیہ کے آثار و ہدایات سے کچھ روشنی حاصل ہوتی ہو، اور جو تھوڑی بہت ہدایت کسی تک پہنچی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے زمانہ تک ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کے مانند ہو چکی تھی۔ لیکن ایسے ناپاک اور تاریک ماحول میں آفتاب رسالت نے طلوع ہو کر نہ صرف عرب بلکہ سارے عالم کو اپنے انوار ہدایت سے منور کر دیا اور تعلیمات قرآن نے عرب کے ان جاہل بداخلاق و بداطوار اور بے ہنر بدوں کو ایسا شائستہ و مہذب علم و ہنر کا ماہر۔ اعمال و اخلاق طہارت و پاکیزگی کا مجسم پیکر بنا دیا کہ وہ لوگ تمام دنیا کے ہادی و معلم اور مصلح بنے۔ ان میں سے ایک ایک فرد فضائل و کمالات اور خوبیوں میں وہ مقام و مرتبہ حاصل کرنے والا جو انبیاء بنی اسرائیل کا تھا، پورے ماحول کو حتیٰ کہ پوری قوم کے مزاج کو یکسر اس طرح بدل دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور دلائل حقانیت میں سے ایک عظیم ترین معجزہ اور واضح ترین تاریخی حقیقت ہے جس کے سامنے ہر صاحب عقل کو سرنگوں ہونا عقل اور فطرت کا تقاضہ ہے۔

قرآنی تعلیمات نے کیسے کیسے علوم اور فن لوگوں کو سکھائے۔ اس کی تفصیل علوم قرآن کے حصہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہ کلمات صرف بطور اشارہ ذکر کر دیئے گئے۔

وہ گمراہ فرقے جن کو قرآن کریم نے مخاطب بنایا اور ان کا رد کیا

قرآن کریم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت ایک ہی سچا دین رہا اور تمام دنیا اسی پر متفق رہی مگر اس کے بعد ایک مدت گذرنے اور بہت سے قرن ختم ہونے پر حق و باطل کا اختلاف پیدا ہوا اور دنیا کے لوگ اس کشمکش میں مبتلا ہونے لگے تو حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا سلسلہ شروع فرمایا تاکہ لوگ اپنے کو ضلالت و گمراہی سے بچا کر ہدایت اور حق کی اتباع و پیروی کر سکیں۔ چنانچہ ارشاد ہے :

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۔

تمام (دنیا کے) لوگ ایک ہی امت تھے (اور ایک ہی دین پر تھے) پھر اللہ تعالیٰ نے (ان میں) اپنے پیغمبر بھیجے جو بشارت سنانے والے اور (عذاب الٰہی سے) ڈرانے والے ہوتے، اور ان کے ساتھ کتاب بھی اللہ نے نازل کی حق اور ہدایت کے ساتھ تاکہ فیصلہ کریں لوگوں کے درمیان اس بات کا جس میں انہوں نے اختلاف کیا (یعنی حق و باطل کا)

اسی طرح اور بھی متعدد آیات میں بھی فرمایا گیا کہ دنیا میں سب لوگ قوانین ہدایت اور اصول فطرت میں متحد و متفق تھے اور حق تعالیٰ نے ان کو جس فطرت صحیحہ اور سلیمہ پر ان کو پیدا کیا تھا وہ اسی پر قائم تھے لیکن بعد میں خلاف فطرت امور اختیار کرنے لگے تو اس کی اصلاح کے لیے حق تعالیٰ کی طرف سے انبیاء بھیجے گئے اور کتابیں بھی نازل کی گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے تمام پیغمبر اصول دین میں متحد ہیں اور ان کی تعلیمات آپس میں مشترک ہیں کیونکہ سب کا مقصد انسانوں کو گمراہی کے طریقوں سے ہٹا کر اصل فطرت کے مطابق معبود حقیقی کی طرف ان کا رخ پھیر دینا تھا۔ اور اختلاف محض فروع اور جزئیات میں ہوا۔ اسی چیز کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے یہ کلمات اشارہ کررہے ہیں "تمام انبیاء وہ علّاتی بھائی ہیں جن کا باپ ایک ہے اور مائیں مختلف ۔ یعنی اصول شریعت اور مقاصد میں سب متحد ہیں البتہ اختلاف فروع وجزئیات کا ہے ۔ اس کی مثال ایسی سمجھ لیجیے کہ تندرستی[1] ایک شے ہے (تمام انسانوں کے لیے) اور بیماریاں بے شمار۔ جب ایک مرض پیدا ہوا تو اس کے مطابق دوا اور پرہیز تجویز کر دیا گیا۔ جب کوئی دوسرا مرض پیدا ہوا تو اس کے مطابق دوا اور پرہیز متعین کر دیا گیا (تو) یہی حال انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں کا ہے کہ ان کی شریعتیں روحانی امراض کے علاج ہیں ۔ ایک عرصہ تک یوں ہی تدریجی رفتار اصلاح امراض اور ان کے واسطے دوا وک اور معالجات کی جاری رہی یہاں تک کہ آخر میں ایک ایسا طریقہ اور نسخہ تجویز فرما دیا جو سب بیماریوں سے تحفظ کے لیے کافی ہو اور تمام دواؤں اور نسخوں کے بدلے کام دے ، وہ طریقہ اسلام ہے جس کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا اور قرآن نازل کیا گیا ۔"

ابتداءِ شرک کی تاریخ

علامہ ابو الشکور سالمیؒ اپنی کتاب "التمھید" میں فرماتے ہیں کہ شرک کی ابتداء اور ظہور خدا کے ایک پیغمبر حضرت اخنوخ علیہ السّلام (جن کو حضرت ادریسؑ کے لقب سے تعبیر کیا جاتا ہے) کے زمانہ سے ہوئی ہے ۔ اس دور سے قبل مخلوق نے کسی قسم کا شرک نہیں کیا تھا ۔ البتہ جزوی اور انفرادی طور پر بعض افراد معصیت و نافرمانی میں مبتلا ہو جاتے تھے جیسے آدمؑ کے بیٹے قابیل نے ہابیل کو قتل کر کے ارتکاب معصیت کیا تو عالم میں جب شرک کا ظہور ہوا تو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے شرک کا رد اور مقابلہ کرنے کے لیے حضرت نوح علیہ السلام[2]

---

[1] : از فوائد حضرت مولانا محمود الحسن قدس اللہ سرہٗ ۔ سورۂ بقرہ ۔

[2] : التمھید لابی الشکور السالمی ص۲۰

دنیا میں مبعوث فرمایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان اَوَّلُ رَسُوْلٍ بُعِثَ اِلَی الْاَرْضِ نوحٌ کہ سب سے پہلے جو رسول زمین کی طرف بھیجے گئے وہ نوح علیہ السلام ہیں کے یہی معنی ہیں کہ مشرکین کے رد اور مقابلہ کے واسطے سب سے پہلے رسول حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔

جس کی تفصیل یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کے زمانہ سے قبل حضرت ادریس علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے جن کو علوم ہدایت کے ساتھ بطور معجزہ علم نجوم اور رمل بھی دیا گیا تھا۔ جب ان کو آسمان پر اٹھا لیا گیا تو ان کے چند شاگرد اور خصوصی تلامذہ اس قوم کی رہنمائی کرتے رہے جن کے نام وَدّ۔ سُوَاعٌ۔ یَغُوْثَ۔ یَعُوْقَ اور نَسْرًا تھے۔ یہ پانچوں حضرات اللہ کے پیغمبر ادریس علیہ السلام کے بعد شب و روز عبادت اور قوم کی تعلیم و تربیت میں مشغول رہتے۔ جب یہ ہستیاں بھی اس عالم سے گذر گئیں تو قوم متحیر اور پریشان ہوئی کہ اب کس سے احکامِ دین سیکھیں اور رہنمائی حاصل کریں۔ کسی نے مشورہ دیا مناسب ہوگا کہ ہم ان حضرات کے مجسمے بنالیں تاکہ ان کو دیکھ کر ان حضرات کی یاد تازہ رہے اور ان کی ہدایات و تعلیمات اور طور وطریق یاد آتے رہیں۔ قوم نے ایسا ہی کیا اور ان کے مجسمے تیار کر لیے گئے۔ اور ہر ایک کے مجسمہ کے لیے وہی نام بھی تجویز کر دیا جو ان حضرات میں سے ہر ایک کا تھا۔

ابتداء میں تو بات اسی حد تک محدود رہی کہ یہ لوگ عبادت تو خدا ہی کی کرتے تھے اور ان تصاویر و مجسموں کو محض روحانی تذکر کے لیے سامنے رکھا کرتے، اور اس طریقہ کو عبادت الٰہی میں خشوع و خضوع کا ذریعہ خیال کرتے رہے لیکن اس جماعت کے گذرنے کے بعد ان کی اولاد (جنہوں نے اپنے بزرگوں کو یہ عمل کرتے ہوئے دیکھا تھا) کے سامنے شیطان آیا۔ اور گویا شیطان نے شرک و بت پرستی کے لیے جو میدان اس سے قبل تیار اور ہموار کر لیا تھا اس پر شرک و بت پرستی کی

کی عمارت مکمل طور پر قائم کرنے کی غرض سے اس نسل اور نئی ذریت کو یہ سمجھایا کہ تمہارے آباؤ اجداد کے یہی معبود تھے وہ انہی کی پرستش کرتے تھے اور ان بتوں کے توسط سے یہ اعلان کیا کہ اے لوگو میں ہی تمہارا معبود ہوں تم میری ہی عبادت کرو۔ گویا ہر بت میں سے اس نوع کی آواز اس نئی ذریت کے کانوں میں پہنچی تو ان کے رگ و ریشہ میں ان بتوں کی محبت اور پرستش رچ گئی۔ اور اس غافل قوم نے ندائے ابلیسی کے ساتھ جب یہ دیکھا کہ ان کے بزرگ واقعی ان تصویروں کی تعظیم و تکریم کرتے تھے تو یہ بات اور بھی پوری طرح قلب و دماغ میں راسخ ہوگئی کہ دراصل بس یہی بت ہمارے معبود ہیں اور پھر ان مجسموں کو پیتل چاندی اور سونے سے تیار کرنا شروع کر دیا اور شرک و بت پرستی نے ان کے دماغوں کو اس درجہ ماؤف کر دیا کہ اس کے خلاف کوئی آواز سننا بھی گوارا نہ کیا اس پر خداوند عالم نے دنیا میں ان پہلے مشرکوں کی اصلاح و ہدایت کے واسطے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا تاکہ وہ انہیں خالق حقیقی کی عبادت و الوہیت کی طرف دعوت دیں اور یہ پیغام لے کر قوم کے سامنے آئے :

يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ	کہ اے میری قوم تم اللہ ہی کی عبادت کرو
مِنْ إِلٰهٍ غَيْرُهُ ۔	اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ۔

لیکن اس بدنصیب قوم (جس کے قلب و دماغ کفر و شرک کی گندگیوں سے ماؤف ہو چکے تھے) کی طرف سے دعوت نوحؑ کا جواب سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا، جس کو قرآن کریم نے بیان فرمایا :

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ	اور کہا ان لوگوں نے ہرگز نہ چھوڑو تم اپنے
وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا	معبودوں کو اور ہرگز نہ چھوڑنا ود اور
وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا	سُواع اور یغوث و یعوق اور نسر کو ۔

(سورۃ نوح)

حضرت نوح علیہ السلام مسلسل ان کو توحید کی دعوت دیتے رہے لیکن یہ

لوگ کسی طرح باز نہ آئے مایوسی حالت میں ساڑھے نو سو سال گذرنے پر خداوندعالم کی طرف سے نوح علیہ السلام کو مطلع کیا گیا:

اِنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۔ (سورۃ ھود)	کہ (اے نوح) اب آپ کی قوم میں کوئی شخص ایمان نہیں لائے گا بجز اس کے کہ جو ایمان لاچکا۔ تو اے نوح غمگین نہ ہو ان اعمال پر جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔

اس اعلان خداوندی پر مایوسی ایک طبعی اور فطری امر تھا۔ حسرت و افسوس اور مایوسی کے جذبات کے ساتھ بے اختیار زبان سے یہ کلمات جاری ہوگئے۔

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۔ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۔ (سورۃ نوح)	اے میرے پروردگار مت چھوڑ تو اب کافروں میں سے کسی ایک کو بھی زمین پر بسنے والے کو اس لیے کہ یقیناً اگر اے پروردگار تو ان کو باقی چھوڑے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور نہیں جنیں گے یہ مگر بدکار اور کافر ہی اولاد

حق تعالیٰ شانہ نے قبولیت دعا کے ساتھ فرمایا کہ تم ایک کشتی تیار کرلو جو تم کو اس طوفان سے بچائے گی جو اس نافرمان قوم کو غرق اور تباہ کرنے کے واسطے بھیجا جائے گا مفسرین بیان کرتے ہیں کہ نوح علیہ السلام نے جن لوگوں کو اپنے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا ان میں سے سب وفات پاگئے۔ صرف ان کی اولاد میں سے سام حام اور یافث مع اپنی عورتوں کے باقی رہے۔ جن سے بنوآدم کا سلسلۂ نسل جاری رہا۔ الغرض شرک و بت پرستی کا وہ ناپاک مرض جو عالم میں پھیل چکا تھا وہ نسلاً بعد نسلٍ قوموں میں سرایت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ سرزمین عرب میں بھی یہ ناپاک اثرات پہنچ گئے۔ عرب میں بت پرستی شروع کرنے والا اور رواج دینے والا سب سے پہلا شخص عمرو بن لحی ہے جو آنحضرت کی بعثت سے تین سو سال قبل گذرا ہے۔ اہل عرب نے اس مرض میں اپنے سے پہلی قوموں سے بھی زیادہ ترقی کی اور اس میں

اس قدر آگے بڑھے کہ صرف چند بتوں اور معبودوں کی پرستش ہی تک معاملہ محدود نہ رہا بلکہ ہر قبیلہ نے اپنا ایک مستقل معبود تجویز کیا۔ قبیلۂ بنو کلب نے وَد کا بت اپنا معبود بنایا اور اس کی پرستش کرنے لگے۔ قبیلہ ھُذیل نے سُواع کو مُذحج نے یغوث کو ہمدان نے یعوق اور حمیر نے سبا میں نسر کو معبود بنایا۔ اور ان بتوں کی ان قبیلوں میں پرستش ہونے لگی۔

قریش نے بہت سے بت بنا کر خاص مسجد حرام بلکہ خانہ کعبہ کے اندر بھی رکھ دیئے۔ کوئی بت حضرت ابراہیمؑ کے نام کا بنایا اور کوئی حضرت اسماعیلؑ کے نام پر اور ان کے علاوہ پتھروں کے تراشے ہوئے بہت سے چھوٹے چھوٹے بت بھی انہی کے قریب رکھ لیے۔ اور ایک بہت بڑا بت تیار کر کے خانہ کعبہ کے گرد، (اور سامنے) رکھا جس کا نام ہُبل تجویز کیا۔ اکثر اہل عرب اسی بت کے نام کی دُہائی دیتے ہوئے کہا کرتے اُعْلُ ھُبَل، اسی نعرہ کو سن کر غزوۂ بدر میں حضرت صحابہؓ نے باآواز بلند جواب دیا تھا، .... اَللّٰہُ اَعْلٰی وَ اَجَلّ۔

اہل عرب نے بعض اور بت بھی تجویز کیے جن کے نام یہ لیا کرتے تھے، لات - عُزّٰی - مَنَات اور ذوالخلصہ وغیرہ۔ انہی ناموں کو قرآن کریم نے سورۂ والنجم میں ذکر کیا ہے:

اَفَرَاَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَ مَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَ لَہُ الْاُنْثٰی تِلْکَ اِذًا قِسْمَۃٌ ضِیْزٰی۔

عرب کے لوگ بالعموم شرک اور بت پرستی میں مبتلا تھے۔ معدودے چند افراد ایسے تھے جو اصل فطرت صحیح اور توحید پر قائم رہے۔ اور ان کو اللہ کے پیغمبر کا بھی انتظار تھا۔ ان لوگوں میں زید بن عمرو بن نفیل تھے جو کعبۃ اللہ سے تکیہ لگا کر بیٹھتے اور ایسے اشعار و قصائد پڑھا کرتے جن میں خداوند عالم کی معرفت توحید اور اس کی قدرت و خالقیت کا ذکر ہوتا تھا۔ اور ایسے ہی مضامین کثرت سے بیان کیا کرتے اور شرک و بت پرستی سے نفرت دلاتے تھے۔ انہی لوگوں میں

قیس بن ساعدہ۔ عامر عدوانی[2]۔ قیس بن عاصم تمیمی۔ صفوان بن اُمیہ اور عفیف بن معدیکرب کندی بھی تھے۔

ایسے افراد کو عرب محصلہ کہا جاتا ہے اور ان کے بالمقابل جواہلِ عرب کا عام گمراہ طبقہ تھا اس کو عرب معطلہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کے بہت سے فرقے ہیں جن کا قرآن کریم نے جابجا ردّ کیا ہے۔

عرب معطلہ کے فرقے

پہلا فرقہ: وہ تھا جو خالق کائنات کا منکر تھا اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے اور حساب و کتاب، جزا و سزا کا بھی انکار کرتا تھا۔

ان کا دعویٰ تھا کہ طبیعت اور مادہ ہی زندہ کرنے والا ہے اور مادہ و طبیعت کے تقاضے ہی اور زمانہ (دہر) ہی فنا کرتا ہے۔

انسان و حیوان اور نباتات ترکیب اجسام کے طبعی تقاضوں سے خود بخود پیدا ہوتے ہیں اور گردش زمانہ سے تحلیل ہوتے ہوتے خود ہی فنا ہو جاتے ہیں اور ہر چیز کے فنا اور موت کے بعد عدم محض کا درجہ طاری ہو جاتا ہے لہٰذا نہ دوبارہ حشر و نشر ہے اور نہ حساب و کتاب اور جزا و سزا۔ نہ جنت و جہنم۔ اس قسم کے لوگوں کو دہریہ کہا جاتا ہے۔ انگلستان اور جرمنی میں ان کی ذریت بکثرت ہے اور روس ان کا سب سے بڑا مقتدیٰ و پیشوا ہے۔ قرآن کریم نے اس فرقہ کا یہ عقیدہ ذکر کیا ہے۔ فرمایا:

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا	اور ان مشرکوں نے کہا نہیں ہے ہماری یہ
نَمُوْتُ وَنَحْيٰى وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا	زندگی کوئی چیز بجز اس دنیوی حیات کے

---

[1] تفصیل کے لیے مقدمہ تفسیر حقانی جلد اوّل صفحہ ۹۷-۸۰ کی مراجعت فرمائیں۔ ۱۲

[2] یہ شخص عرب کے حکماء اور خطباء میں عظیم اور بلند پایہ خطیب و حکیم شمار کیا گیا ہے۔ اس کی وصایا نہایت حکیمانہ ہیں اس نے اپنے اوپر شراب اور زنا کو حرام کر لیا تھا اور بہت سے اشعار

الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ

اسی میں ہم مرتے ہیں اور اسی میں ہم زندہ رہتے ہیں۔ اور ہم کو بجز زمانہ کی گردش کے اور کوئی چیز ہلاک کرنے والی نہیں ہے۔ (حق تعالیٰ نے فرمایا) اور حال یہ کہ ان کو کچھ بھی علم نہیں ہے بجز اس کے کہ وہ تخمین اور گمان کی باتیں کرتے ہیں۔

(سورۃ جاثیہ)

قرآن کریم میں ان کے اس لغو اور غیر معقول خیال کی تردید میں بکثرت آیات نازل فرمائیں۔ فرمایا گیا:

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ۔ (سورۃ اعراف)

کیا یہ لوگ نظر نہیں کرتے آسمانوں اور زمین کی موجودات اور ان تمام چیزوں میں جو اللہ نے پیدا کی ہیں۔

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْ اَنْشَاَهَا اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ الخ

اور عبدیت خداوندی کا انکار کرنے والے نے کہا کون ہے جو ہڈیوں کو ان کے بوسیدہ ہونے کے بعد زندہ کرے گا۔ کہہ دیجیے (اے ہمارے پیغمبر) زندہ کرے گا ان ہڈیوں کو وہ پروردگار جس نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے اور وہ اپنی ہر مخلوق کا پورا پورا علم رکھنے والا ہے۔

(سورۃ یٰسین)

اس لیے انسانی اجزاء جس جگہ بھی منتشر اور جس حال میں بھی ہوں گے خدا تعالیٰ ان کو پھر دوسری مرتبہ حیات و زندگی عطا فرمائے گا۔

اس موضوع کی تفصیل حضرات قارئین اثبات بعث عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیں گے۔ (اِنْ شَاءَ اللّٰہ تعالیٰ)

دوسرا فرقہ وہ تھا جو خالق کائنات کا قائل تو تھا اور تسلیم کرتا تھا کہ جہاں خلق اللہ کی طرف سے ہے مگر بعث جسمانی اور حشر و نشر کا منکر تھا۔ قرآن کریم کا یہ فرقہ بھی

مخاطب ہے اور اس کے ردّ میں بکثرت آیات حق تعالیٰ نے نازل فرمائیں۔
بنیادی طور پر ان پر اتمام حجت قائم کرنے کے واسطے فرما دیا:

كَمَا بَدَاْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ (سورۃ الانبیاء) — کہ جس طرح ہم نے مخلوق کو پہلی مرتبہ پیدا کیا اسی طرح ہم اس کا اعادہ بھی کریں گے۔

اور فرما دیا اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ۔ (سورۃ ق) "کیا ہم عاجز رہے پہلی مرتبہ پیدا کرنے سے؟" (تو پھر کسی بھی عقل والے کو یہ بات کیسے زیب دیتی ہے کہ وہ انکار بعث کرے) بلکہ یہ لوگ نواز سر نو مخلوق کو پیدا کرنے کے معاملہ میں شبہ اور التباس میں پڑے ہوئے ہیں۔

تیسرا فرقہ وہ تھا جو خالق کائنات کا قائل ہونے کے ساتھ کسی نہ کسی حد تک قیامت اور بعث کا بھی قائل تھا مگر رسولوں کا منکر تھا اور بت پرستی میں مبتلا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ ہماری بت پرستی دراصل اللہ ہی کے قرب کے لیے ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى۔ — کہ ہم نہیں عبادت کرتے ہیں ان بتوں کی مگر صرف اس وجہ سے کہ یہ بت ہم کو اللہ کے کچھ قریب کر دیں۔

تو قرآن کریم کا یہ فرقہ بھی مخاطب ہے اور اس کی تردید بھی عقلی دلائل کی روشنی میں بکثرت آیات سے کی گئی۔ اور فرما دیا کہ قیامت کے روز کسی کو اللہ کی بارگاہ میں شفاعت اور لب کشائی کی بھی قدرت نہ ہوگی۔ بس صرف انہی رسولوں اور پیغمبروں کو یہ قدرت ہوگی جن کو اللہ کی طرف سے اس کی اجازت حاصل ہوگی۔ یہ فرقہ جانوروں کو ذبح کرتے وقت اپنے بتوں کا نام لیتا تھا اور ان کی نذر و نیاز کرتا اور گوشت میں ان کا ایک حصہ مخصوص کر دیتا تھا۔ جیسے کہ فرمایا گیا:

وَقَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ — اور ان مشرکین نے کہا یہ چوپائے اور کھیتیاں ممنوع ہیں۔ ان کو کوئی نہیں کھا سکتا بجز اس کے

بِزَعْمِهِمْ ۔ کہ جس کو ہم چاہیں (یہ ممانعت ان احمقوں کی محض
(سُورَۃُ الْعَامِ) اپنے زعم اور گمان سے (تھی)

اس گروہ کو رسولوں کی بشریت کی وجہ سے ان کی رسالت پر ایمان لانے میں تامل تھا
اور کہا کرتے تھے :

مَالِهٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ کیا ہوگیا اس رسول کو یہ کھانا بھی کھاتا ہے
وَيَمْشِىْ فِى الْاَسْوَاقِ ۔ اور بازاروں میں بھی پھرتا ہے ۔

تو قرآن کریم نے اس گروہ کے رد میں بھی دلائل سے ثابت کیا کہ نبوت اور بشریت میں
کوئی منافات نہیں ہے ۔ اور اللہ کا ہر نبی اور رسول بشر ہی ہوا ہے ۔ ان کی اولاد
اور بیویاں ہوئیں ۔ وہ کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی آتے جاتے تھے ۔
قرآن کریم نے فرمایا :

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى اِلَّا اَنْ قَالُوْا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۔ قُلْ لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۔ (سورۃ اسراء)

اور نہیں روکا لوگوں کو ایمان لانے سے کسی چیز نے جب کہ ان کے پاس ہدایت آگئی بجز اس کے کہ انھوں نے کہا کیا اللہ نے بھیجا ہے بشر کو رسول بنا کر (اے ہمارے پیغمبر) کہہ دیجیے اگر زمین پر بسنے والے فرشتے ہوتے جو اطمینان سے زمین پر چلتے پھرتے ہوتے تو بے شک ہم ان پر آسمان سے فرشتہ ہی اتارتے ۔

لیکن جب کہ زمین پر بسنے والی آبادی انسانوں کی ہے تو ظاہر ہے نوع بشر کی ہدایت
اور رہنمائی کے لیے انھی میں سے کسی کو رسول بنا کر بھیجا جا سکتا تھا ۔ اور بالفرض
اگر کوئی فرشتہ آسمان سے اتارا بھی جاتا تو بھی اس کو بشکل بشر ہی بھیجا جاتا تاکہ
وہ انسانی جملہ احوال کی ہدایت اور تعلیم و تربیت دے سکے ، جیسے ارشاد فرمایا :
وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا (سورۃ انعام) اور پھر ایسی صورت میں
ان منکرین کے وہی شکوک و اوہام برقرار رہتے جو اس صورت میں ہیں اور یہ

ظاہر ہے کہ فرشتہ کا انسان کے جملہ احوال اور کیفیات کے لیے ہادی و مصلح ہونا ممکن نہیں ہے۔

چوتھا فرقہ تناسخ کا قائل تھا تو یہ فرقہ بھی قرآن کا مخاطب ہے اور متعدد مواقع پر حق تعالیٰ نے اس کی بھی تردید فرمائی۔ علما متکلمین فرماتے ہیں آیت قُلْ لَنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا اور اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اور ایسی ہی وہ تمام آیات جو اس مضمون پر مشتمل ہیں اسی فرقہ کے رد میں ہیں۔

پانچواں فرقہ عرب معطلہ میں سے وہ تھا جو خدا تعالیٰ کے لیے العیاذ باللہ بیٹیاں تجویز کرتا تھا اور دعویٰ کرتا تھا کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ ایسے لوگوں کو قرآن کریم نے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ۭ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ۭ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْــَٔلُوْنَ ۔	اور بنایا ہے ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو اللہ رحمٰن کے اطاعت گزار ہیں بیٹیاں (اللہ کے واسطے) کیا یہ لوگ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے ان کا یہ دعویٰ لکھا جاتا ہے اور (پھر) ان سے اس کے بارہ میں سوال ہوگا۔
(سورۃ زخرف)	(باز پرس کی جائے گی)

ایسے لوگوں پر الزام حجت کے لیے فرمایا گیا:

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ۔	(اے ہمارے پیغمبر) ان سے پوچھو کہ کیا تمہارے رب کے واسطے تو بیٹیاں ہوں اور تمہارے واسطے بیٹے ہوں۔
(وَالصّٰفّٰت)	

اور پھر واضح الفاظ میں ان کے بیہودہ اور لغو تخیل کا رد فرمایا:

اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ	آگاہ ہو جاؤ۔ یہ یقیناً ان بہتانوں میں سے ایک عظیم بہتان ہے جو یہ کہہ رہے ہیں کہ

أَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۔ (سُوْرَةُ صَافَّات)

اللہ نے اولاد جنی ہے اور بے شک وہ لوگ جھوٹے ہیں کیا اللہ نے بیٹیوں کو پسند کیا ہے بیٹوں پر (تعجب اور افسوس) کیا ہو گیا تم کو کیسے فیصلے کرتے ہو۔

اس گروہ کے اس احمقانہ اعتقاد اور تصور کا رد کرتے ہوئے حق تعالیٰ نے الزام حجت کے طور پر ان لوگوں سے ایک سوال کیا :

أَوَمَنْ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ۔ (سُورۂ زخرف)

کیا (پروردگار عالم) ایک ایسی صنف کو اپنی اولاد بنائے گا جس کی پرورش زیورات اور زیب زینت میں کی جاتی ہے (گویا جو صنف نازک ہے) اور خصومت و مباحثہ میں وہ (اپنے مدعیٰ کو پوری طرح) ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہے۔ کیونکہ عورت کے قویٰ تخلیقی لحاظ سے مرد سے کمزور ہوتے ہیں۔

اسی فرقہ کے ساتھ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو جنات کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کرتے اور ایک نوع کے نسبی رشتہ کے قیام کا دعویٰ کرتے تھے ایسے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :

وَجَعَلُوْا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ إِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۔ (سُورۂ الصَّافَّات)

اور قائم کیا ہے ان لوگوں نے خدا اور جنوں کے درمیان ایک نسب حالانکہ جنوں کو یہ خوب معلوم ہے کہ وہ (خداوند عالم کے سامنے) پیش کیے جائیں گے۔ (اعمال کی جزا و سزا کے لیے) پاکی ہے اللہ کی ذات کے لیے ان چیزوں سے جن کی یہ اللہ کی طرف نسبت کرتے ہیں۔

چھٹا فرقہ وہ تھا جو ستاروں کی تاثیر کا قائل تھا اور اس کا اعتقاد تھا کہ بارشوں کا برسنا، سبزوں کا اُگنا اور غلوں کا پیدا ہونا یہ سب کچھ ستاروں کی تاثیر اور انہی کے

نظام طلوع و غروب اور گردش کے تابع ہے اور کہا کرتے مُطِرْنَا بِنَوْءِ کَذَا وَ نَوْءِ کَذَا کہ فلاں فلاں ستاروں کی وجہ سے ہم پہ بارش برسی ہے۔ قرآن کریم نے اس فاسد اور لغو عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے فرمایا :

وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۔ (سورۂ واقعہ) اور بناتے ہو تم اپنا رزق یہ کہ تم (خدا کی قدرت کو) جھٹلاتے ہو۔

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کہ سنہ ۶ھ میں مقام حدیبیہ میں رُکے ہوئے تھے تو ایک روز صبح کی نماز کے بعد فارغ ہو کر آپؐ نے حضرات صحابہؓ کی طرف رُخ فرمایا اور اس رات بارش برسی تھی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا : حق تعالیٰ کا ارشاد پاک ہے " صبح کی ہے میرے بندوں نے اس حال میں بعضے میرے شکر گذار اور مؤمن ہیں اور بعض میرا کفر و انکار کرنے والے ہیں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بارش برسی ہے اللہ کے فضل اور اس کی قدرت سے تو وہ لوگ مجھ پر ایمان لانے والے اور شکر گذار ہیں۔ اور جو یہ کہتے ہیں بارش برسی ہے فلاں فلاں ستاروں کے طلوع و غروب سے۔ تو وہ میرا کفر کرتے ہیں، اور ستاروں کی تاثیر پر ایمان لاتے ہیں۔ اور اسی موقعہ پر یہ آیات نازل ہوئیں

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ ‎ پس میں ستاروں کے چھپنے کی قسم کھاتا ہوں
وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۔ ‎ اور اگر تم سمجھو تو یہ قسم بہت بڑی قسم ہے۔

قرآن کریم میں جس قدر مواقع میں ستاروں اور چاند سورج کی گردش اور افلاک و بروج ان کی سیر ذکر ہے ان تمام آیات سے اس گروہ کا رَدّ ہو رہا ہے۔

الغرض عرب معطلہ کے ان فرقوں کو قرآن کریم نے مخاطب بنایا۔ اور ان کے عقائد فاسدہ اور باطل خیالات کا دلائل اور حقائق کے ساتھ رَدّ فرمایا۔ اور ان کے رَدّ میں انداز تعبیر ایسا سہل اور سادہ اختیار کیا گیا کہ ایک عامی انسان بھی بخوبی اس کو سمجھ سکے حتیٰ کہ اُونٹ اور بکریاں چرانے والے ان حقائق کو اسی طرح

سمجھ جائیں جس طرح کوئی فلسفیانہ دلائل اور طرز استدلال کا ماہر انسان سمجھ سکتا ہو نہ اور سننے والا ان دلائل کو سن کر محسوس کرتا ہو کہ یہ دلائل نہیں بلکہ مواعظہ حسنہ ہیں۔

اہل عرب میں ان فرقوں کے علاوہ کچھ گروہ ایسے بھی تھے کہ ان میں بعض کا میلان یہودیوں کی طرف تھا اور بعض کا نصاریٰ کی طرف اور کچھ مجوس کی طرف۔ اور یہ اثرات یمن اور عراق میں ایک عرصہ تک ایرانیوں کے تسلط کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں انبیاء سابقین نے اگرچہ حشر و نشر اور قیامت کا ذکر کیا اور ان کی کتابوں میں ایسے مضامین بھی نازل کیے گئے لیکن وہ اس بسط و شرح سے نہیں تھے جیسا کہ قرآن کریم نے وضاحت و تفصیل اور تحقیق کے ساتھ ان مسائل کو واضح اور ثابت کیا۔

یہ لوگ اگرچہ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ علیہما السلام بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوّت کا بھی اعتراف کرتے تھے لیکن انبیا علیہم السلام کی صفات بشریہ کے بارہ میں تردد اور شبہات میں مبتلا تھے اور اس بنا پر کہ انبیاؑ عام لوگوں کی طرح کھاتے پیتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں ان کی نبوّت تسلیم کرنے سے انکار کیا۔

یہ لوگ الوہیت کے بھی منکر نہ تھے اور نہ ہی قدرت خداوندی میں ان کو کوئی شبہ تھا مگر اس وجہ سے انبیاء کی رسالت کا انکار کیا اور اس حکمت کو نہ پہچانا جس کے باعث اللہ نے جنس بشر سے رسُول بنائے۔ قرآن کریم نے ان کو بھی کافروں اور منکروں ہی کے [illegible] مخاطب بنایا۔ اور دلائل سے یہ بات ثابت فرمائی کہ خدا کا پیغمبر تو جنس بشر ہی ہو سکتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اس گمراہ قوم میں ملت ابراہیمیہ کی اقامت فرمائی جیسا کہ خود آپؐ نے اعلان فرمایا بَلْ نَتَّبِعُ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا۔

آپؐ نے آیات قرآنیہ کے ذریعے ان اہل عرب سے مخاصمہ فرمایا اور انہی

چیزوں سے استدلال فرمایا جو ان میں ملت ابراہیمیہ کے بقایا میں سے تھیں ، اور جن کو وہ خود بھی تعلیم کرتے تھے تاکہ ان پر اتمام حجت ہو جائے ۔

عرب معطلہ کے گمراہ فرقوں کے بالمقابل بیان کردہ قرآنی دلائل کا خلاصہ

ان تمام دلائل اور الزامات کا خلاصہ جو قرآن کریم نے اپنے ان مخاطب گمراہ فرقوں کے مقابلہ میں ردِ شرک کے لیے پیش کیے ان چار عنوانات میں منحصر ہے۔

(۱) حق تعالیٰ کی عبادت و الوہیت میں غیر اللہ کو شریک کرنے کے لیے مطالبہ .... دلیل اور یہ کہ بلا دلیل بلکہ خلاف عقل آباؤ اجداد کے طریقوں کی پیروی کرنا عقل و فطرت کے صریح خلاف ہے ۔

(۲) غیر اللہ کو ذاتِ خداوندی کے ساتھ مساوات و برتری تو کیا کوئی نسبت ہی نہیں ۔ خداوند عالم ہی انتہائی عظمتوں اور خوبیوں کا مالک ہے ۔ اس لیے صرف وہی معبود ہے اور جو چیز کسی عظمت و خوبی سے متصف نہیں وہ ہرگز لائق تعظیم اور مستحق عبادت نہیں ۔

(۳) دعوتِ توحید اور ردِ شرک خدا کے تمام پیغمبروں کا مقصد نبوت اور غایت رسالت ہے جیسے کہ ارشاد مبارک ہے :

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُوْلٍ إِلَّا نُوْحِيْ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۔ (سورۃ الانبیاء)

(۴) مشرکین کے اپنے ہاتھوں تراشے ہوئے اصنام اور بت حس و حرکت اور حیات و ادراک سے بھی عاری ہیں ۔ انسان جیسی اشرف المخلوق نوع کا ان کو معبود تجویز کرنا دنیا میں پیش آنے والی بدترین حماقت ہے ۔ حشر و نشر اور بعث بعد الموت کے دنیا میں بھی بہت سے نمونے موجود ہیں منکرین کا اس میں تردد و شبہ کرنا خلاف عقل ہے ۔

الغرض ان اصولی اور بنیادی دلائل عرب کے ان تمام گمراہ فرقوں کا قرآن کریم

رد کیا جو قرآن کریم کے گمراہ مخاطبین کی نوع اول ہے۔

مخاطبین قرآن کے گمراہ فرقوں کی قسم دوم اہلِ کتاب و منافقین

فریق اوّل یہود

عرب معطلہ اور ان کے تمام فرقوں کے علاوہ گمراہ فرقوں کی جن کو قرآن کریم نے مخاطب فرمایا ایک دوسری قسم بھی ہے جو اہلِ کتاب اور منافقین پر مشتمل ہے ان میں فریق اوّل یہود ہیں جو قرآن اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بمقابل نہایت معاند اور مخاصم فریق رہا۔ ان کے عقائد باطلہ اور لغو خیالات کی تردید کی گئی مناظرہ بھی واقع ہُوا اور دلائل قائم کر کے یہ ظاہر کیا گیا کہ یہ لوگ خود اپنی کتاب تورات اور اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھی منکر اور کافر ہیں۔ ان کی افتادِ طبع فطری زیغ اور بے راہ روی سے انبیاء علیہم السلام طرح طرح کی تکلیفیں اُٹھاتے تھے۔ شقاوت و بدبختی کی یہ حد تھی کہ ایسی لغو اور بیہودہ باتیں بھی اپنے پیغمبر کی طرف منسوب کرنے میں کوئی تامل نہ کرتے تھے جن کی اجازت شرافت انسانی کبھی بھی نہیں دے سکتی۔

صحیح بخاری و دیگر کتب حدیث میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہایت حیادار تھے اور پردہ کی بہت ہی احتیاط فرماتے تھے۔ اس حیاء اور احتیاط پر ہی یہ بیہودہ لوگ اعتراض کرنے لگے اور کہنے کہ ان کی یہ حیا و شرم اور پردہ کسی جسمانی عیب اور مرض کی وجہ سے ہے کہ اس کے ظاہر ہونے سے شرماتے ہیں۔

قرآن کریم نے اسی کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے مسلمانوں کو فرمایا :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا	کہ اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ
كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسَىٰ فَبَرَّأَهُ	جنھوں نے موسیٰ کو ایذا پہنچائی۔ پھر اللہ نے

لے کہ ان کے خصیے پھولے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے پردہ اور احتیاط کرتے ہیں۔ ۱۲۔

مِمَّا قَالُوْا وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا۔ برأۃ ظاہر فرمادی موسیٰ (علیہ السلام) کی اس عیب سے جو انہوں نے کہا اور وہ (سورۃ احزاب) اللہ کے نزدیک بڑی ہی وجاہت والے تھے

اس فریق کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن کریم نے ان بیہودہ اور لغو الزامات کی بھی جو اُنہوں نے حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم علیہما السلام کے بارہ میں لگائے۔ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم تو تورات پر ایمان رکھتے ہیں۔ قرآن نے اس دعویٰ کو رد کیا اور بتایا کہ یہود کی مجموعی عملی زندگی اور ان کی زندگی کا ایک ایک پہلو خود ان کے دعوے کی تردید ہے۔

قرآن کے مدمقابل فریقوں میں یہ فریق شدید قسم کا جھگڑالو اور مخاصم تھا۔ اس کی ضلالت وگمراہی کی صورتیں عرب معطلہ کے گمراہوں کی طرح متعدد قسم کی تھیں مثلاً تحریف کتاب اللہ یعنی تورات خواہ لفظی ہو یا معنوی۔

۲۔ کتمان آیات: یعنی اصل تورات کے احکام چھپانا۔ اور اپنی خواہشات کے مطابق چیزوں کو اس رنگ میں پیش کرنا کہ یہ ہیں احکام تورات۔

۳۔ اقامت احکام میں تساہل۔

۴۔ محض مذہبی تعصب وعناد کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار اور آپ کی شان میں گستاخی اور طعن وتشنیع۔

۵۔ حُبِّ جاہ اور حرصِ مال میں دین فروشی۔

قرآن کریم نے ان کے تمام عیوب وامراض کا بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے متعدد مواقع میں خوب رد کیا۔

اہل کتاب کی تحریف لفظی کی صورت تو ظاہر ہے کہ خود اپنے ہاتھوں اللہ ... کے کلام میں ردّ و بدل کرتے اور اپنی طرف سے اختراع کردہ چیزیں اللہ کی طرف منسوب کر دیتے جیسا کہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ پس ہلاکت و بربادی ہے ان لوگوں کے لیے

بِاَیْدِیْھِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ لِیَشْتَرُوْا بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۔	کر لکھتے ہیں (کتاب الٰہی میں) کوئی نوشتہ اپنے ہاتھوں سے اور پھر دعوی کرتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اس غرض سے کہ حاصل کرلیں دُنیا کی معمولی سی دولت
(سُوْرَۃ البقرہ)	
یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُکِّرُوْا بِہٖ ۔	پھیر دیتے ہیں کلماتِ الٰہیہ (اور احکام خداوندی) ان کے مواقع سے اور بھلا دیا ہے ان لوگوں نے بہت سا حصہ ان چیزوں کا جن کی انہیں یاددہانی کرائی گئی ۔
(سُوْرَۃ مائدہ)	

حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ بروایت ابن عباسؓ فرماتے ہیں تحریف معنوی تاویل فاسد کا نام ہے، جس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی آیت کو اس کے حقیقی مفہوم سے ہٹا کر کسی دوسرے مفہوم پر عمل کرنا اور دیدہ دلیری کے ساتھ صراط مستقیم (یعنی صحیح مفہوم) سے انحراف کرنا۔

یہود ہر قسم کے عیب اور گندگیوں، خداوند عالم کی نافرمانی، شہوت پرستی، بداخلاقی اور حرص وبخل میں مبتلا ہونے کے ساتھ اس مرض میں بھی مبتلا تھے کہ اپنی خواہشات کے مطابق کلام الٰہی میں تحریف کرتے اور پھر دعویٰ یہ کرتے تھے کہ اگر یہ لوگ جہنم میں گئے تو صرف چند روز کے واسطے جائیں گے جتنے روز کہ ان کے آباؤ اجداد نے گوسالہ پرستی کی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہا کرتے: لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّۃَ اِلَّا مَنْ کَانَ ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی اور کبھی کہتے نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ کہ ہم تو اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔

حالانکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہر ملت اور شریعت نے مؤمن وکافر اور متدین و فاسق اور مطیع وفرمانبردار اور نافرمان کے درمیان فرق رکھا ہے کفار ہمیشہ عذاب جہنم میں رہیں گے اور فساق وفجار انبیاء کی شفاعت سے عذاب سے نجات پاسکیں گے۔ مطیعین اخروی نعمتوں اور راحتوں کے مستحق

ہوں گے، چنانچہ تورات میں خود اپنی ملت کے متدین یہود کو اس مرتبہ میں شمار کیا گیا اور اسی طرح انجیل میں بھی اسی نصرانی کو ناجی قرار دیا گیا جو اپنی شریعت کے مطابق عمل پیرا ہو لیکن یہود کا گمان تھا کہ بہشت میں صرف وہی داخل ہوگا جو یہودی ہوگا اور نصاریٰ یہ سمجھتے کہ نجات و کامیابی صرف ان کا حق ہے۔ اور اس حقیقت سے ہر ایک غافل رہا کہ نجات کا دارو مدار ایمان باللہ اور اس کے احکام کی اطاعت و پیروی پر ہے کہ اس کے ہر حکم کے سامنے سرنگوں ہوجانا ہی سعادت و نجات کا معیار ہے۔ قرآن کریم نے ان کے اس احمقانہ تخیل کو نہایت صاف اور واضح لفظوں میں رد فرمایا:

بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّاَحَاطَتْ بِہٖ خَطِیْٓئَتُہٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ۔ (سورۃ بقرۃ)	ہاں! بے شک قانون یہی ہے کہ جس شخص نے برائی کا ارتکاب کیا اور اس کا احاطہ کرلیا اس کی خطاؤں نے تو یقیناً ایسے لوگ جہنمی ہیں وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے البتہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے تو یہ لوگ بے شک جنتی ہیں اور ہمیشہ اسی میں رہنے والے ہوں گے۔

کتمانِ آیات کے علاوہ تَلْبِیْس بَیْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِل بھی یہود کا ایک نمایاں عیب تھا بلکہ ان کے سربرآوردہ لوگ تو اپنے چھوٹوں کو اس بات سے بھی روکا کرتے تھے کہ کوئی کلمہ حق بھی ہرگز اپنی زبان سے ایسا نہ نکالیں جس سے مسلمان ہم پر حجت اور استدلال کرسکیں جیسے کہ ارشاد ہے:

اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْکُمْ لِیُحَآجُّوْکُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّکُمْ۔ (سورۃ بقرۃ)	کیا تم بتا دیتے ہو مسلمانوں سے وہ چیزیں جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں جس کا انجام یہ ہوگا کہ وہ تمہارے مقابلہ میں حجت اختیار کرلیں گے تمہارے رب کے نزدیک۔

غرض قرآن کریم نے اسی طرح ان کی تمام اعتقادی عملی اور معاشرتی خرابیوں کا رد فرمایا، جن میں وہ مبتلا تھے اور جگہ جگہ ان کی تفصیل کی گئی۔

فریق دوم نصاریٰ اور ان کی گمراہی

ان مخاطبین قرآن میں دوسرا فریق نصاریٰ کا ہے جس کے ساتھ قرآن کریم کا مناظرہ واقع ہوا ہے، یہ بھی یہود کی طرح مختلف قسم کی گمراہیوں میں مبتلا تھے جو مجموعی طور پر یہود کی گمراہیوں سے کم نہ ہوں گی۔ اس فریق کی سب سے بڑی گمراہی یہ تھی کہ ان میں سے بہت سوں نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بارہ میں الوہیت کا اعتقاد اختیار کیا۔ کسی گروہ نے یہ عقیدہ اختیار کیا کہ وہ خدا کے بیٹے ہیں اور بعض فرقوں نے اقانیم ثلثہ یعنی عقیدۂ تثلیث اختیار کیا، تو قوم نصاریٰ ان مختلف عقیدوں کو اختیار کر کے تین گروہوں میں منقسم ہو گئی۔ ان تمام لغو اور خلاف عقل عقائد کی قرآن کریم نے ایسے واضح اور روشن دلائل سے تردید کی کہ ادنیٰ عقل رکھنے والا انسان بھی ان کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں کرسکتا۔ ارشاد فرمایا:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ	یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے یہ کہا کہ
هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ قُلْ فَمَنْ	بیشک اللہ مسیح بن مریم ہی ہے۔ کہہ دیجیے
يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْــــًٔا اِنْ اَرَادَ	(اگر بالفرض ایسا ہے) تو پھر بتاؤ کون ہے
اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ	جو روک سکے اللہ کی طرف سے کسی چیز کو
وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ	اگر وہ ارادہ فرماتے مسیح بن مریم کے ہلاک کرنے کا اور ان کی والدہ کو بھی اور ان تمام
(سورۃ مائدہ ۵)	انسانوں کو جو روئے زمین میں ہیں۔

تو قرآن کریم کے ان کلمات نے صاف طور پر یہ بتا دیا کہ حضرت عیسٰی الوہیت کی صفت کے ساتھ کیونکر متصف ہو سکتے ہیں جب کہ ان پر اللہ کی قدرت

اور اس کا تصرّف اس طرح جاری ہے کہ اگر وہ خود ان کو ہلاک کرنا چاہے تو کوئی نہیں روک سکتا اور ان کی والدہ مریم کو اور بلکہ تمام دُنیا کے انسانوں کو، تو اے مخاطبو! بتاؤ ایسی صُورت میں عقلاً یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ عیسٰی علیہ السّلام کے متعلق خدا ہونے کا تصوّر کیا جائے۔

اور اگر کسی کو یہ تصوّر اس لیے ہُوا کہ وہ بلا باپ کے پیدا ہُوئے تو اس میں کیا تعجب کی بات ہے۔ آخر حضرت آدم علیہ السّلام بھی تو اللہ کے بندے اس کے پیغمبر اور خلیفہ ہیں حالانکہ ان کے نہ باپ ہیں اور نہ ماں تو جب اللہ کی قدرت آدمؑ کو بلا باپ اور ماں کے پیدا کر سکتی ہے تو حضرت عیسٰیؑ کے بغیر باپ کے پیدا ہونے میں کیا تردّد اور شبہ کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ صُورت اس بات کا کیونکر دلیل ہو سکتی ہے کہ وہ خدا ہیں۔ اس کو ارشاد فرمایا:

اِنَّ مَثَلَ عِيسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔	بے شک عیسٰی کی مثال اللہ کے یہاں آدم کی سی مثال ہے کہ اللہ نے ان کو مٹی سے بنایا اور پھر ان کو فرما دیا ہو جا، بس وہ پیدا ہو گئے۔

(سُورۃ آل عمران)

قرآن کریم نے اپنے ان مخاطبین کو یہ بھی بتایا کہ حضرت عیسٰیؑ کے متعلق یہ اعتقاد کہ وہ خدا کے بیٹے ہیں لغو اور باطل ہے۔ کیا یہ لوگ عقل سے کام نہیں لیتے کہ خدا خالق ہے اور عیسٰی اس کی مخلوق اور بندے ہیں بھلا خالق و مخلوق کے درمیان یہ رشتہ کیونکر قائم ہو سکتا ہے۔ اور اگر بلا باپ کے پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے تو پھر حضرت آدمؑ کو بدرجۂ اولیٰ خدا کا بیٹا (العیاذ باللہ) ہونا چاہیے۔ اسی طرح عقیدۂ تثلیث کا بھی ابطال اور ردّ فرمایا کہ اقانیم ثلاثہ نصاریٰ کے ایک طبقہ نے اختیار کر رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک اقنوم باپ یعنی خدا ایک اقنوم بیٹا یعنی عیسیٰؑ اور ایک اقنوم رُوح القدس یعنی جبرئیل امین۔ اور یہ کہ ہر ایک اقنوم خدا ہے اور پھر تینوں مل کر ایک خدا، تو

اس طرح ایک تین ہے۔ اور تین ایک۔ تو اس احمقانہ عقیدہ کو دلائل کے ساتھ ردّ فرماتے ہوئے ارشاد فرما دیا:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (سورۃ مائدہ)

بلکہ اس کے کفر صریح اور محالِ عقل ہونے پر کسی دلیل و برہان کے قائم کرنے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ ہر انسان اپنی عقل و فطرت سے یہ جان سکتا ہے کہ یہ تینوں اپنے وجود و تشخص اور خدائی میں مستقل ہیں یا نہیں۔ اگر مستقل ہیں تو پھر تین خدا ہونے میں کیا تامل اور تردد ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں ان کو ایک خدا کہنے کے کیا معنی؟ اور اگر تینوں خدا مستقل نہیں ہیں تو پھر ہر ایک کو خدا کہنا اور اس کو ازلی سمجھنا خلاف عقل اور لغو ہے۔ اور دوسری شکل میں کہ یہ تینوں اپنے وجود و تشخص میں مستقل نہ ہوں، یہ سوال ہو گا کہ جو شئے ان اجزاء غیر مستقلہ سے مرکب ہے اس کا کیا نام ہے؟ وہ خدا ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو پھر یہ لازم آئے گا کہ ایک خدا تو اجزاء ثلثہ کا مجموعہ مرکب۔ دوسرا خود خدا جو ان میں ایک ہے۔ تیسرا وہ جُز اس مرکب کا جس کو اب (باپ) کہا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ مجموعہ ہی کا نام ربّ ہے تو پھر تین اقنوم کہاں رہے بلکہ صرف دو رہ گئے۔ ایک ابن (بیٹا) دوسرا رُوح القدس۔

بہرکیف یہ عقیدہ لغو اور مہمل ہونے کے علاوہ ایسا مضحکہ خیز بھی ہے کوئی سنجیدہ انسان نہ اس کو قابلِ فہم تصوّر کر سکتا ہے اور نہ اس پر قادر ہے کہ کسی دوسرے کو سمجھا سکے۔ خداوندِ عالم نے اس عقیدہ کو بھی بڑی تحقیق اور تفصیل کے ساتھ ردّ فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ	نہیں ہیں مسیح بن مریم کچھ مگر اللہ کے رسول
قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَاُمُّهٗ	یقیناً گذر چکے ہیں ان سے پہلے بہت سے رسول
صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَاْكُلَانِ الطَّعَامَ	(تو یہ بھی انہی جیسے ایک رسول ہیں) اور ان
(سورۃ آل عمران)	کی والدہ سچائی اور پاکی کا پیکر ہیں۔ یہ دونوں کھانا

... قرآن کریم نے اس موقعہ پر "کَانَا یَاْکُلٰنِ الطَّعَامَ" کا لفظ بول کر گویا عیسٰی علیہ السّلام کی ابطالِ الوہیت کے دلائل کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع کر دیا۔ کہ یہ دونوں تو کھانے کے محتاج تھے اور ظاہر ہے کہ جو کھانے کا محتاج ہوگا وہ صرف اسی ایک چیز کا ہی نہیں بلکہ بہت سی چیزوں کا محتاج ہوگا بلکہ کائنات کے تقریباً کل موجودات اور جملہ مادی اسباب و وسائل کی حاجت اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے۔ ان تمام احتیاجات کے ساتھ کیا کسی ذات کو خدا تصور کیا جاسکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے واقعہ پیدائش کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا[۱] حالانکہ اس طرح تفصیل کے ساتھ انبیاء علیہم السّلام کی پیدائشوں کا قرآن میں ذکر نہیں کیا گیا۔

نہ صرف یہ کہ حضرت عیسٰی بلکہ ان کی والدہ مریم علیہما السّلام کی پیدائش اور بچپن کے احوال تک بھی بیان کر دیئے تاکہ ایک طرف عیسٰی علیہ السّلام کے لیے عقیدۂ الوہیت کے ابطال کے ساتھ یہود کے باطل خیالات اور بیہودہ تہمتوں کا بھی ردّ ہو جائے کہ اللہ کے یہاں ان کی اور ان کی والدہ کے تقدّس اور فضیلت کا یہ مقام ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کے بنیادی اصول شمار فرماتے ہوئے ظاہر فرمائی ارشاد فرمایا:

مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ — جس کسی شخص نے اس بات کی گواہی دی کہ سوائے اللہ کے اور کوئی معبود نہیں، اور

---

[۱] تفصیل کے لیے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی کتاب ازالۃ الشکوک و اظہار الحق اور البیان فی علوم القرآن جلد اوّل و مقدمہ تفسیر حقانی اور والد محترم حضرت مولانا محمد ادریس صاحب رحمہ اللہ کی علم الکلام کلمۃ اللہ فی حیات روح اللہ۔ الحسن الحدیث فی ابطال التثلیث کا مطالعہ فرمائیں۔

[۲] سورۂ مریم کی ان آیات کا مطالعہ فرمایا جائے فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يٰلَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا الٰی آخر الآیات۔ مضمون کی تفصیل و توضیح کے لیے کتب تفسیر کی مراجعت فرمائی جائے۔ ۱۲

مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَ اَنَّ عِیْسٰی عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ وَابْنُ اَمَتِہٖ وَکَلِمَتُہٗ اَلْقَاھَا اِلٰی مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْہُ وَ الْجَنَّۃُ حَقٌّ وَّالنَّارُ حَقٌّ اَدْخَلَہُ اللّٰہُ الْجَنَّۃَ عَلٰی مَا کَانَ مِنَ الْعَمَلِ۔

محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور بے شک عیسٰی (بھی) اللہ کے بندے اور اس کے رسول اور اس کی بندی کے بیٹے اور اس کا وہ کلمہ ہیں جس کو مریم کی طرف القا فرمایا اور اس کی طرف سے رُوح ہیں اور یہ کہ جنّت بھی حق ہے اور جہنم بھی حق ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو جنّت میں داخل فرما دے گا جس کسی عمل پر بھی ہو یعنی طاعات کی کمی اور زیادتی یا خطاؤں اور بُرائیوں کے ساتھ

نصاریٰ کے عقائد باطلہ میں یہ چیز بھی تھی کہ وہ حضرت عیسٰی کے متعلق گمان کرتے تھے کہ ان کو قتل کر دیا۔ اور اس گمراہی میں یہ فرقہ نسلاً بعد نسلٍ مبتلا رہا حتیٰ کہ قرآن کریم نازل ہُوا اور نصاریٰ کو اس مغالطہ اور اشتباہ سے نکالا جس میں یہ لوگ پڑے ہوئے تھے۔ فرمایا :-

وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ

(سُورۃ نسآء)

اور انہوں نے نہ تو قتل کیا عیسٰی کو اور نہ ہی سُولی دی۔ لیکن ان کے واسطے معاملہ مشتبہ کر دیا گیا۔

وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْہِ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ مَا لَھُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًا بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ۔

اور بیشک جن لوگوں نے ان کے یعنی (عیسٰی) کے بارہ میں اختلاف کیا وہ البتہ شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ نہیں ہے ان کو کوئی علم ان کے متعلق سوائے اٹکل اور گمان کے پیروی کرنے کے اور نہیں قتل کیا ہے یقیناً ان یہودیوں نے عیسٰی کو بلکہ ان کو اللہ نے اپنی طرف

لہ صحیح بخاری و صحیح مسلم۔

نصاریٰ کا گمان تھا کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو قتل کر دیا ہے یا سُولی دی۔ اور ان کی مصلوبی تمام اولاد آدم کے گناہوں کا کفارہ ہوگئی۔ اور کہتے تھے کہ آدم علیہ السّلام سے جو خطا سرزد ہوئی تھی وہ خطا ان کے توبہ و استغفار سے معاف نہیں ہوئی اور یہ گناہ نسلاً بعد نسلاً ان کی اولاد پہ منتقل ہوتا رہا۔ اور خدا کو اس کی سزا دیئے بغیر کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ حتیٰ کہ اس موروثی گناہ سے انبیاء علیہم السّلام بھی پاک نہ تھے تو اس گناہ کی پاداش میں خدا نے اپنے فرزند یسوع مسیح کو یہودیوں کے ہاتھوں سُولی پر لٹکوا دیا۔ یسوع مسیح آہ و زاری کرتے رہے مگر خدائے عادل اس کی کب پرواہ کرنے والا تھا اس کو تو مقصود تھا کہ اپنے فرزند کو تمام دُنیا کے واسطے کفارہ بنائے۔ نصاریٰ کا یہی عقیدہ مسئلہ کفارہ کے نام سے مشہور ہے تو حق تعالیٰ نے ان آیات میں نصاریٰ کو مخاطب بناتے ہوئے ان لغو اور باطل خیالات کی تردید فرمائی۔

فریق سوم منافقین

گمراہ فرقوں میں قرآن کریم کے مدمقابل ایک منافقین کا گروہ بھی تھا جس کا قرآن کریم نے خاص طور پر متعدد مواقع میں نہایت ہی شدومد سے رد کیا۔ اور ان کے کفر و نفاق کی گندگیوں کو دلائل اور تمثیلات سے اس طرح طشت ازبام کیا کہ دُنیا کے سامنے ان کی منافقانہ فطرت ان کی عادات و خصلتوں کی گندگی اور ذلت و رُسوائی ایسی عیاں ہوگئی کہ نفاق گندگی اور حقارت و ذلت کا عنوان بن گیا اور جس طرح یہ قوم عذاب آخرت کے لحاظ سے اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ کا مصداق ہے، اسی طرح دُنیا میں بھی ذلت و خواری کے طبقہ اَسْفَلَ السّٰفِلِيْنَ میں پہنچ گئے۔

---

[1] اس قسم کی خرافات کی تفصیل کے لیے پولس کے خطوط بائبل میں ملاحظہ فرمائے جائیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافقین کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وہ تھے جو زبان سے ایمان کا دعویٰ کیا کرتے اور کہا کرتے آمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْآخِرِ اور جب آپ کی مجلس میں حاضر ہوتے تو کہتے نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ مگر دلوں میں کفر کی گندگیاں رچی ہوئی تھیں کفر و عناد پر بڑی پختگی کے ساتھ قائم تھے مگر صرف دنیوی منافع حاصل کرنے اور مجاہدین کے سیف و سنان سے محفوظ رہنے کے لیے یہ عیاری اور مکر و فریب کا طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔

دوسرا گروہ ان میں ایسا تھا جو ضعف اعتقاد کے ساتھ اسلام کا اظہار کرتا تھا۔ ان کے دلوں میں تذبذب تھا۔ کبھی اہل ایمان کی طرف مائل ہوتے اور پھر باطنی خبث کی وجہ سے کافروں کی طرف کھلم کھلا لوٹ جاتے۔ خواہشات نفسانیہ اور دنیوی لذتوں نے ان کے دل مسخ کر دیے تھے۔ حرص مال، حُبّ جاہ، حسد اور کینہ ان کے دلوں میں بھرا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان امراض کے ہوتے ہوئے مناجات مع اللہ، عبادتِ خداوندی کی لذت و شوق کے لیے کہاں گنجائش ہو سکتی تھی اسی کو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَاِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۔	اور جب کھڑے ہوں نماز کی طرف تو کھڑے ہوتے ہیں۔ بہت ہی کسل مندی اور کاہلی کے ساتھ دکھلاتے ہیں لوگوں کو اور ذکر نہیں کرتے اللہ کا مگر نہایت ہی قلیل۔ یہ لوگ ایمان و کفر کے درمیان تذبذب میں پڑے رہنے والے ہیں نہ اس گروہ (مؤمنین) کی طرف ہیں اور نہ اس گروہ (کفار) کی طرف ہیں۔
(سُورۃ مائدہ)	

ان کے ایسے ہی تمام امراض و عیوب کا ذکر حق تعالیٰ نے اس ایک ہی کلمہ میں فرما دیا فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا۔

منافقین میں بعض ایسے تھے کہ وہ دنیوی معاملات اور فکر معاش میں اس قدر مصروف و منہمک تھے کہ ان کو آخرت، امور معاد اور آیات الٰہی میں غور و فکر کرنے کی مہلت ہی نہ تھی، جیسے کہ فرمایا گیا:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۔ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا۔	کیوں نہیں وہ غور کرتے قرآن میں (نہیں غور و فکر تو کیا کرتے) بلکہ ان کے دلوں پہ قفل ہیں۔

ان منافقین میں بعض بدباطن ایسے بھی تھے کہ ان کے دلوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں طرح طرح کے خیالات فاسدہ پیدا ہوتے تھے اور گاہ گاہ آپس میں ان عزائم و خیالات کا ذکر بھی کرتے۔ طعن و تشنیع اور تمسخر بھی کیا کرتے۔ قرآن کریم ان کی ان باتوں پہ تنبیہ و تہدید کرتا حیران و بدحواس ہو کر تاویلیں اور حیلے بہانے اختیار کرتے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے اسی کو فرمایا:

یَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَیْھِمْ سُوْرَۃٌ تُنَبِّئُھُمْ بِمَا فِیْ قُلُوْبِھِمْ قُلِ اسْتَھْزِءُوْا اِنَّ اللّٰہَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ۔ (سورۃ برآءۃ)	منافقین اس بات سے ڈرتے ہیں کہیں کوئی سورت نہ نازل کر دی جائے ان کے بارے میں جو ظاہر کر دے اس چیز کو جو ان کے دلوں میں ہے۔ کہہ دیجیے کر لو مذاق (خدا اور اس کے رسول کی باتوں پہ) بیشک اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے اس چیز کو جس سے (اے منافقو!) تم ڈر رہے ہو۔

غرض قرآن کریم نے منافقین کے مکر و فریب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دشمنی و عناد کے برتاؤ کو اس وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ دنیا یہ سمجھ لے کہ یہ لوگ اسلام کے جیسے بدترین دشمن تھے۔ خدا نے ان کو ایسا ہی ذلیل و رسوا بھی کیا۔ اور یہ بھی معلوم ہو جاتے کہ اسلام کی ترقی اور اس کی اشاعت میں ان کے ناپاک عزائم اور مفسدانہ تدابیر بے اثر ہو کر رہ گئیں۔ اور یہ سب کچھ

اسلام اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کی دلیل ہے۔

یہ تفصیل تو آیات قرآنیہ سے منافقین کے عقائد ان کے اخلاق و اطوار اور باطنی خبث و گندگی کی معلوم ہوئی۔ اس کے علاوہ ایک قسم نفاق عملی کی ہے جو اس زمانہ میں کثیر الوقوع ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ثلث من کن فیہ کان منافقاً خالصاً۔ اذا حدث کذب واذا وعد اخلف واذا ؤتمن خان۔	تین خصلتیں ہیں ایسی جس کسی شخص میں وہ تینوں خصلتیں ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھائی جائے تو اس میں خیانت کرے

عرب معطلہ کے گمراہ فرقوں کے علاوہ قرآن نے جن فرقوں کو مخاطب بنایا وہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ اور منافقین ہے۔ ہر ایک کے عقائد اور خیالات باطلہ کی پوری پوری تردید کی۔ اور توحید و رسالت کے ایسے دلائل پیش کیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور اسلام کی حقانیت دنیا کے سامنے سورج کی طرح روشن ہوگئی اور دلائل قرآنی نے دنیا کو یہ منظر دکھا دیا۔ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ: اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ ، آمین بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ۔

علوم قرآن

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ۝ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ

اس میں کوئی شبہ اور خفا نہیں ہے کہ قرآن کریم وہ کتاب ہدایت ہے جس میں اوّلین و آخرین کے تمام علوم جمع کر دیئے گئے ہیں جیسا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے فِيْهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ کہ اس کتاب الٰہی میں تم سے پہلوں کے بھی احوال ہیں اور بعد والوں کے بھی۔ اور جو واقعات و مسائل تمہارے درمیان پیش آئیں ان کا فیصلہ بھی اسی کتاب میں ہے۔

قرآن کریم کی یہ شان جامعیت اور کاملیت خود قرآن ہی نے بیان کر دی۔ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ کہ ہم نے اس کتاب میں کسی چیز کی کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اور ارشاد فرمایا گیا وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ کہ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور نازل کردی ہے ہم نے آپ پر یہ کتاب جس میں ہر چیز کے واسطے کامل وضاحت و بیان ہے اور ہدایت و رحمت اور بشارت ہے اطاعت و فرمانبرداری کرنے والوں کے لیے۔

یہ آیات اور اسی طرح دیگر متعدد آیات سے یہ واضح ہوگیا کہ قرآن کریم بےشمار اور غیر متناہی علوم و معارف کا خزانہ ہے۔

شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ نے بروایت سعید بن منصور حضرت

ے الاتقان فی علوم القرآن ج ۲۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فرمایا جس شخص کو جو بھی علم درکار ہو اسے چاہیے کہ وہ قرآن کریم سیکھے کیونکہ اس میں اوّلین و آخرین کی خبریں اور علوم ہیں ۔

امام بیہقی نے حسن سے ایک روایت نقل کی ہے، جس کا مضمون یہ ہے، کہ اللہ رب العزت نے ایک سو چار کتابیں (اپنے خاص خاص پیغمبروں پر) نازل فرمائیں جن کے تمام علوم ان کتابوں تورات و انجیل اور زبور میں جمع فرما دیئے ۔ پھر اللہ نے ان کے علوم کو فرقان (یعنی قرآن کریم) میں ودیعت فرما دیا۔ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تمام انبیاء سابقین کے کمالات نبوت کو جامع ہے اسی طرح آپؐ پر نازل کردہ کتاب (قرآن)، بھی تمام آسمانی صحیفوں اور کتب الٰہیہ کے علوم کو جامع ہے ۔

امام شافعی رحمۃ اللہ نے فرمایا جو کچھ بھی فقہاء اُمت کہتے ہیں وہ شرح ہے سنت کی ۔ اور جو کچھ سنت میں ہے وہ شرح ہے قرآن کریم کی ۔ اور جو حکم و فیصلہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ قرآن کریم ہی سے فرمایا ہے اسی کی تائید آپؐ کا یہ فرمان مبارک کر رہا ہے :

اِنِّیْ لَا اُحِلُّ اِلَّا مَا اَحَلَّ اللّٰہُ وَ اِنِّیْ لَا اُحَرِّمُ اِلَّا مَا حَرَّمَ اللّٰہ

کہ بے شک میں حلال نہیں کرتا ہوں کسی بھی چیز کو بجز اس کے کہ جس کو اللہ نے حلال کیا ۔ اور حرام بھی صرف اسی چیز کو کرتا ہوں جس کو خدا نے حرام کیا ۔ یعنی میری طرف سے جن چیزوں کی حلت و حرمت کا حکم دیکھو اس کو یہی سمجھو اور اسی کا اعتقاد رکھو کہ یہ اللہ نے حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے ۔ اس لیے آپؐ کا فرمان تو حقیقت میں اللہ کا ہی حکم و فرمان ہے جیسا کہ رب العزت نے ارشاد فرمایا ۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔[۳]

---

[۱] الاتقان فی علوم القرآن ۔ تفسیر ابن کثیر ۔
[۲] الاتقان ج ۲ ۔ [۳] سورۃ والنجم پ ۲۷ ۔

سعید بن جبیرؓ فرمایا کرتے تھے ، جو بھی کوئی حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھ کو پہنچی میں نے اس کا مصداق اور اس کی اصل کتاب اللہ سے پائی۔[1]

امام شافعیؒ نے ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں یہ فرمایا اے لوگو! تم جو چاہو مجھ سے دریافت کرلو میں تمہیں اس بات کا حکم کتاب اللہ سے بتادوں گا۔

حاضرین مجلس یہ سُن کر کہنے لگے تو اے امام فرمائیے آپ مُحرِم کے بارہ میں کیا حکم دیں گے جو زنبور مار ڈالے تو جواب اس طرح فرمانا شروع کیا : بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ مَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۔ مقصد یہ تھا کہ یہ جانور ان جانوروں میں سے ہے جن کے قتل کرنے کی محرم کو اجازت دی گئی ہے ۔ گویا یہ بھی از قسم عقرب (بچھو) ایک موذی جانور ہے اور بروایت مسعر بن کدام یہ فتوی عمر فاروق رضؓ سے نقل کیا گیا ہے ۔

امام بخاری نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے ، انہوں نے فرمایا لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاشِمَاتِ وَالْمُسْتَوْشِمَاتِ الخ کہ اللہ نے لعنت فرمائی ہے بدن پہ گودنے والی عورتوں پر اور ان عورتوں پہ جو گدوانے والی ہیں ۔ تو اس حدیث کا مضمون جب بنو اسد قبیلہ کی ایک عورت نے سُنا تو وہ عبداللہ بن مسعود کے پاس حاضر ہوئی اور کہنے لگی کہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ اس قسم کی عورتوں پہ لعنت کرتے ہو ۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ فرمانے لگے " میں کیسے اس پر لعنت نہ بھیجوں جس پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہو ۔ اور وہ اللہ کی کتاب میں بھی ملعون ہو ۔ وہ عورت کہنے لگی کہ میں نے ما بین اللوحین قرآن کریم (یعنی از اول تا آخر) پڑھ لیا ہے مگر میں نے تو قرآن میں کسی جگہ ایسی عورت پر لعنت کا مضمون نہیں پایا ۔ عبداللہ بن مسعودؓ

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن بحوالہ ابن ابی حاتم ۔

نے فرمایا ، اے عورت اگر تو کتاب اللہ پڑھتی تو اس میں ضرور پالیتی ، کیا تو نے قرآن کریم میں یہ نہیں پڑھا وَمَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا (کہ جو کچھ تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیں تم کو اس کو لے لو اور جس چیز سے تم کو منع کریں تم اس سے باز آجاؤ۔)
یہ سن کر اس عورت نے کہا بیشک یہ آیت تو قرآن کریم میں ہے۔ ابن مسعودؓ نے فرمایا پس پھر یہی تو ہے (جس کی بناء پر میں نے یہ کہہ دیا کہ ایسی عورت کتاب اللہ میں بھی ملعون ہے۔

شیخ ابن ابی الفضل المرسی نے اپنی تفسیر میں بیان فرمایا قرآن کریم ایسے بے شمار علوم و فنون پر مشتمل ہے کہ ان کا احاطہ ممکن نہیں خداوند عالم نے ان بلند پایہ علوم کا اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو وارث بنایا۔ پھر ان علوم کی وراثت آپؐ سے آپؐ کے کبار صحابہؓ نے حاصل کی جیسے خلفاء راشدین۔ عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ اور ایسے ہی دیگر حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اس کے بعد ان حضرات سے کبار ائمہ تابعین ان علوم کے وارث ہوئے یہ حضرات فرمایا کرتے تھے ہمارے سامنے جو بھی کوئی بات پیش آتے ہم اس کا حکم کتاب اللہ سے معلوم کر لیتے ہیں۔ قرون اولیٰ کی یہ پاکیزہ ہستیاں اور حضرات ائمہ۔۔ علوم نبویہ کے سچے اور کامل وارث تھے۔ لیکن بعد کے طبقات میں ہمتوں میں ضعف اور عزائم میں اضمحلال پیدا ہوگیا اور جن علوم و فنون کے حضرات صحابہؓ اور تابعین حامل تھے بعد والے اس کے متحمل نہ ہوسکے اور ان میں جامعیت کی وہ شان نہ رہی جو متقدمین میں تھی۔ اس بناء پر علوم قرآنیہ میں سے ایک ایک شعبہ کی طرف علیحدہ علیحدہ گروہ اور علماء کی جماعتیں متوجہ ہوئیں اور اس طرح ہر گروہ ایک مخصوص علم کی طرف منہمک و متوجہ ہوکر اسی میں مشغول ہوا۔ کسی کی کوشش ضبط لغات

لے صحیح بخاری - ۱۲۔

اور مخارج حروف وکلمات کی تحقیق کی طرف مبذول ہُوئی تو اس نے اپنا موضوع علم القراۃ بنالیا۔ کوئی گروہ اصولِ عربیہ اور قواعد بلاغت کی طرف متوجہ ہُوا تو اس نے اسی کو موضوع بنالیا۔ اور اپنی تفاسیر میں ان ہی اُمور کو ملحوظ رکھا جو اس موضوع سے تعلق رکھتی تھیں۔

حضرات متکلمین نے توحید و رسالت اور اصول دین اور عقائد کو مرکز توجہ بنایا اور قرآن کریم کی تفسیر میں انہی امور سے بحث کی۔ قرآن کریم کی اسی آیت لَوْ کَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا کو حق تعالیٰ کی خالقیت قدرت، اس کی ازلیت و ابدیت اور بقاء و قدم اور تسبیح و تقدیس اور اس کی وحدانیت اور اس کے ذات و صفات کے جملہ کمالات کے لیے بنیاد بناتے ہُوئے ایسے محیر العقول دلائل اور شواہد عقلیہ مدون و مرتب فرمائے کہ دُنیا کے تمام فلاسفہ اور مدعیان عقل و فکر کو عاجز بنا ڈالا۔ اور ان دلائل و اصول کے مجموعہ کا نام علم اصول الدین یا علم الکلام متعین ہُوا۔

کسی گروہ نے معانی خطابیہ پر نظر رکھتے ہُوئے عموم و خصوص اطلاق و تقیید حقیقت و مجاز اور اصول بلاغت کو موضوع بحث بنایا کسی نے نصوص قرآنیہ سے اصول استنباط احکام کو مدنظر رکھتے ہُوئے نص ظاہر مفسر و محکم اور خفی مجمل و متشابہ سے بحثیں کیں اور ان مباحث کو علم اصول الفقہ سے موسوم کیا گیا۔

کسی نے حلال و حرام فرض و واجب سنت و نفل اور مکروہ و مستحب اور جملہ احکام عملیہ و فرعیہ کو مطمح نظر بنایا اور اس علم کو علم الفقہ کہا گیا۔ کسی کی نگاہ امم سابقہ کے احوال و واقعات کی طرف متوجہ ہُوئی اور اسی کو موضوع بحث بناتے ہُوئے ایک علم مدون کیا جس کا نام علم التاریخ والقصص ہے تو ان علماء نے امم سابقہ اور تاریخی وقائع ہی سے بحث کی حتیٰ کہ اس سلسلہ میں اُنہوں نے بدء عالم اور ایجادات کائنات کا بھی ذکر کرتے ہُوئے اصول تاریخ کے

طور پر ایک مستقل علم مدون فرمایا چنانچہ صحیح بخاری میں امام بخاریؒ نے کتاب بدء الخلق منعقد فرما کر اس ضمن میں نہایت اہمیت اور استیعاب کے ساتھ ابواب مرتب فرمائے۔

بعض حضرات ان واقعات اور امم سابقہ کے احوال میں[1] جو اسرار و حکم اور عبرت ناک امثال ہیں ان کی طرف متوجہ ہوئے اور وعدہ وعید اور ترغیب و ترہیب جزا و سزا جنت و جہنم اور انذار و تبشیر کے مضامین سے انہوں نے علم الموعظۃ مستنبط کیا۔ اور قرآنی حقائق و اسرار اس رنگ میں بیان کیے کہ پہاڑوں کی مضبوط چٹانوں کی طرح سخت دل بھی لرز جائیں۔

اور اگر ادنیٰ درجہ بھی ان میں سعادت اور فطری صلاحیت کا جوہر ہو تو ضلالت و گمراہی کی تاریکیوں سے نکل کر نور ہدایت سے اپنی زندگیاں منور کرلیں۔

کسی نے حضرت یوسف علیہ السّلام کے قصّہ میں گیارہ ستاروں اور چاند و سورج کو سجدہ کرتے ہوئے خواب میں دیکھنے اور یوسف علیہ السلام کے قید کے دو ساتھیوں[2] کے خواب اور بادشاہ مصر کے خواب "سبع بقرات"[3] سے فن اصول تعبیر کا استنباط کیا۔ اور کسی نے اختلاف لیل و نہار اور شمس و قمر اور کواکب کی رفتار سے علم الہیئۃ والمواقیت مدون کیا۔

اور بعض نے آیات میراث میں غور و فکر کرتے ہوئے علم المیراث والفرائض مستنبط فرمایا۔

---

[1] حضرت یوسف علیہ السلام کے قصّہ میں پہلا خواب اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کوکبًا آیات میں بیان کیا گیا اور ان کے قید خانہ کے دو ساتھیوں کا وہ خواب مراد ہے جس کو قرآن کریم نے ان آیات میں بیان فرمایا ہے۔ وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَیٰنِ الخ اور [2] بادشاہ مصر کا سبع بقرات والا خواب وہ ہے جو وَقَالَ الْمَلِکُ اِنِّیْ اَرٰی سَبْعَ بَقَرٰتٍ سے ختم رکوع تک بیان کیا گیا۔ تفصیل کے لیے تراجم و کتب تفسیر کی جانب مراجعت فرمائی جائے۔ م۔

علما و اہل عربیہ اور فصحاء و بلغاء نے آیات قرآنیہ کی فصاحت و بلاغت حسن تعبیر اور معجزانہ طرز بیان کو دیکھ کر علم المعانی والبدیع مرتب کیا۔

ارباب حقیقت نے الفاظ قرآنی کے اشارات سے جو باطنی اسرار و رموز اور روحانی حقائق و معارف جھلکتے تھے۔ ان کا مشاہدہ کرتے ہوئے علم طریقت اور سلوک و تصوف مرتب فرمایا۔

قرآن کریم میں ملل باطلہ اور خصوم کے مقابلہ میں جو دلائل و براہین مذکور ہیں ان کو دیکھ کر اصول مناظرہ اور استدلال کا فن اور علم الجدل والخصوم اخذ کیا گیا۔

کسی نے آیت اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ کو بنیاد بناتے ہوئے علم الہندسہ مدون کر لیا۔

فن طب کا دارومدار اور موضوع نظام صحت کی حفاظت ہے جسمانی قوت کا استحکام اور بدن انسانی میں متضاد کیفیات کے اجتماع کے ساتھ اعتدال مزاج کے قائم رہنے ... غور کرنے پہ معلوم ہوا کہ ان تمام بنیادی اصول طب صحت کو آیۂ مبارکہ وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا اور آیت شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ حاوی ہے جس میں نظام صحت کے مختل ہو جانے کے بعد نظام صحت اور جسم انسانی کے بیماریوں میں مبتلا ہونے پر حصول شفاء کے بنیادی اصول کی جانب رہنمائی ہے۔ مزید براں وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا۔

استعمال اغذیہ اور نباتات و ثمرات سے ماکولات و مشروبات کی انواع و اقسام حاصل کرنے کے طریقے معلوم کر لیے گئے۔ نہ صرف یہ کہ اسی حد تک بات معلوم ہو بلکہ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان ثمرات و فواکہ اور نباتات سے ماکولات و مشروبات کی حاصل کردہ انواع بعض حلال و طیب ہیں اور بعض ناپاک و حرام۔

کسی نے آیت وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا دیکھ کر جہازوں اور کشتیوں کی

ؔ سورۂ والمرسلات پ ۲۹

صنعت اور بحری سفر اور اس کے طور و طریق اصولی طور پر مستنبط کر لیے۔
کسی نے اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی اور وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرَاتٍ ۔ اُنْظُرُوْا اِلٰی ثَمَرِهٖ اِذَا اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزَّارِعُوْنَ اور وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ جیسی آیات مبارکہ کو دیکھ کر فن زراعت مدوّن کر لیا اور اسی بنیاد پر جملہ مسائل و احکام زراعت مستنبط کیے گئے۔
کسی نے قصہ ذوالقرنین میں آیت آتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ اور اس دیوار القرنین کی تعمیر کے مضمون سے فن تعمیر اور اس کے متعلقہ اصول اخذ کر لیے۔
کسی نے ذوالقرنین کے قصہ ہی سے فن سیاحت اور اس کے اغراض و مقاصد کی بھی تدوین کر لی۔
کسی نے وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَ۔ اَنِ اعْمَلْ سَابِغَاتٍ وَقَدِّرْ فِی السَّرْدِ[1] اور وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا[2]، قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ[3]۔ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ[4]۔ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ[5]، اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِیْ خُبْزًا[6]۔ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا[7]۔ اُحِلَّ لَكُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّیَّارَةِ[8]۔ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ[9]۔ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِیْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ

---

[1] حضرت داؤد علیہ السّلام کے ذکر میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ اور ہم نے نرم کر دیا ان کے واسطے لوہے کو کہ بناؤ کشادہ زرہیں اور اندازہ سے جوڑو کڑیاں (سورۂ سبا)

[2] اور نہ ہو جاؤ تم اس عورت کی طرح کہ جس نے توڑا اپنا سوت کاتا ہُوا (سورۂ النحل)

[3] کہا بے شک یہ تو ایک محل ہے جڑے ہُوئے شیشوں کا (سورۂ نمل)

[4] سورۂ نور ۔ [5] سورۂ علق ۔ [6] اٹھائے ہوئے ہوں میں اپنے سر پر روٹیاں، سورۂ یوسف ۔ [7] اور جب تم احرام سے حلال ہو جاؤ تو شکار کر لیا کرو۔ سورۂ مائدہ

[8] حلال کیا گیا ہے (بحالت احرام) تمہارے واسطے سمندر کا شکار اور اس کا رزق۔ سورۂ مائدہ

[9] پھر دیر نہ کی یہاں تک فوراً ہی لے آئے ابراہیم علیہ السّلام ایک بھنا ہُوا بالا ہُوا بچھڑا (سورۂ ہود)

اللہِ عَلَیہِ ۔ وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ ۔ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ ۔ فَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَتَسْتَخْرِجُوْا مِنْہُ حِلْیَۃً تَلْبَسُوْنَھَا ۔
اور اسی طرح کی دوسری آیات پر نظر کرتے ہوئے علوم صنعت وحرفت اسلحہ سازی فنونِ تعمیر و جامہ بافی ، شکار اور ضیافت و مہمانی ، نظافت و طہارت کے آداب اور تجارتی امور میں اصول دیانت مستنبط کر لیے ۔

کسی نے وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْھِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَعَدُوَّکُمْ ۔ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَھَا وَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ جیسی آیات سے دشمن کے مقابلہ کے لیے تیاری کے احکام اور مصالحت و جہاد کے اصول مرتب کیے ۔

قاضی ابوبکر بن العربی اپنی کتاب "قانون التاویل" میں بیان فرماتے ہیں کہ قرآن کا احاطہ و استیعاب پوری طرح تو ممکن نہیں ۔ البتہ جس قدر علوم آیات و الفاظ قرآن سے صراحۃً یا اشارۃً مستنبط ہوتے ہیں ان کی تعداد خود کلمات قرآن یعنی ۷۷۴۳۹ کی تعداد تک پہنچ جاتی ہے ۔ اور اگر اس لحاظ سے نظر کی جائے کہ لکل آیۃ منھا ظھر و بطن کہ ہر ایک آیت اور بعض روایات میں ہے ہر ایک کلمہ کے لیے ظہر بھی ہے اور بطن بھی تو تعداد اس سے دوچند ہو جائے گی ۔ اسی طرح ابن جریر سے بھی منقول ہے کہ انواعِ علوم میں سے کوئی نوع ایسی نہیں ہے کہ اس کی اصل و بنیاد کتاب اللہ میں موجود نہ ہو ۔ حتیٰ کہ قرآن کریم ملکوت السماوات والارض کے عجائب اور آسمانوں سے بلندی پر اور ما تحت الثریٰ کیا ہے

لہ سورۂ مدثر ۔ لہ آل عمران ۔ لہ اعراف ۔ لہ سورہ النحل ۔
لہ اور تیار کرو کافروں کے مقابلہ کے لیے جو کچھ بھی تم جمع کر سکو قوت سے یعنی اسلحہ و ہتھیار اور پلے ہوئے گھوڑے جس کے ذریعے تم مرعوب کر دو اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو ۔
(سورۂ انفال)

لہ بحوالہ الاتقان فی علوم القرآن جلد ۲ ۔ ص ۱۲۸ ۔

اس پر بھی مشتمل ہے، تخلیق عالم اور اس کی ابتدا قیامت اور مابعد قیامت احوال بھی مذکور ہے۔ اور تاریخ عالم کے وہ عظیم اور عبرت ناک واقعات بھی جن کو قرآن کریم نے معجزانہ شان کے ساتھ بیان کیا۔

لہ مثلاً قصۂ آدم علیہ السلام اور ان کے ساتھ ابلیس کا معاملہ اور خروج از جنت۔ حضرت ادریس علیہ السلام کا رفع الی السماء، قوم نوح کا غرق، قصۂ عاد و ثمود و قوم لوطؑ و شعیبؑ اور قوم تبع۔ ابراہیم علیہ السلام اور ان کا اپنی قوم کے ساتھ مناظرہ و محاجہ نیز نمرود کے ساتھ مناظرہ۔ اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کو مکّہ کی وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ دینا اور حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ تعمیر کعبہ اور ان کا ذبح کا خواب دیکھ کر اس پر تیار ہو جانا۔

قصۂ یوسفؑ۔ موسیٰ علیہ السلام کی تفصیلی تاریخ اور بنی اسرائیل کے احوال اور ان کا اپنی قوم کو لے کر بحر قلزم سے عبور کر جانا اور فرعون کا اسی میں غرق کر دیا جانا۔ طالوت و جالوت کے واقعات۔ ہاروت و ماروت کا تذکرہ۔

خضر و موسیٰ علیہما السلام کی ملاقات اور ذوالقرنین کے محیر العقول کارنامے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قصۂ ولادت اور ان کے معجزات اور ان کی والدۂ مطہرہ کی طہارت و نزاہت کے دلائل۔ اصحاب الکہف والرقیم اور بخت نصر کے واقعات جو تاریخ کے ایسے نوادر ہیں کہ ان کو پڑھ کر ہر وہ شخص جو تاریخی حقائق کو تسلیم کرتا ہے۔ قرآن کریم کے کتاب الٰہی ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یقیناً ہر ذی شعور انسان کے لیے ایسے نوادر تاریخ پر قرآن کریم کا مشتمل ہونا اس کے کتاب الٰہی ہونے کا واضح اور کامل ثبوت ہے، اور ان مضامین کو سرسری نظر سے بھی دیکھ لینا ہر شخص کی ہدایت و ایمان کے واسطے کافی ہے۔ تاریخی حقائق کا تسلیم کرنا تمام دنیا کے عقلا کے نزدیک ایک تسلیم شدہ قانون ہے جس سے انحراف و انکار کسی صاحب عقل انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ ان حقائق کا انکار یا ان میں تردد صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو دیوانہ اور مجنون ہو۔

امام راغب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حق تعالیٰ شانہٗ نے جس طرح ہمارے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو انبیاء سابقین کی نبوت اور شریعتوں کے لیے من وجہ مختتم اور منسوخ کرنے کا ذریعہ بنایا اور من وجہ ان کو تکمیل کا سبب اسی طرح آپ کی کتاب قرآن کریم کو بھی تمام آسمانی صحیفوں اور کتب کے لیے مختتم بھی بنایا اور مکمل بھی۔ یعنی کتب سابقہ کے لیے ناسخ بھی اور ان کے علوم ہدایت کی تکمیل کا ذریعہ بھی ہے تو ایک حیثیت سے قرآن کریم تمام کتب سابقہ کے لیے ناسخ ہے تو دوسری جہت سے جملہ کتب سماویہ کے لیے مکمل و متمم بھی ہے اسی تکمیل و تتمیم کی شان کو یہ آیت قرآنیہ واضح کررہی ہے:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (سورۃ مائدہ)

اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ختم نبوت کی تمثیل میں اپنی ذات اقدس کو قصر نبوت کی وہ آخری اینٹ فرمایا جس کے ذریعے اس قصر نبوت کی تکمیل فرمائی گئی۔

بلاشبہ یہ امر بھی قرآن کریم کے اعظم معجزات میں سے ہے کہ ضخامت کی قلت کے باوجود علوم کی وسعت اور کثرت کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ ایسے بلند پایہ علوم و معارف کا خزانہ ہے کہ عقول بشریہ اور کسب و اکتساب کے آلات ان کے احاطہ اور ادراک سے عاجز ہیں۔

ہر چند غور و فکر کے بعد آخر الامر انسانی مدرکات اور عقول کو یہ اعتراف کرنا پڑے گا۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَۃٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّہٗ مِنْۢ بَعْدِہٖ سَبْعَۃُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ کَلِمٰتُ اللّٰہِ۔ (سورۃ لقمان)	کہ اگر روئے زمین کے کل درخت قلم ہوں اور سمندر اس کی روشنائی اس حال میں کہ اس کے بعد اور سات سمندر اس میں اضافہ کردیں تو بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے۔

اور غور و تدبر انسان کو اسی مرحلہ پہ پہنچائے گا بے شک یہی شان حق تعالیٰ شانہٗ کے ان علوم و معارف کی بھی ہے جن کا خزانہ اور لباب یہ قرآن کریم ہے

تقسیم علوم قرآنیہ

قرآن کریم کے ان بے شمار علوم جن کا کچھ اجمالی نقشہ گذشتہ کلمات سے ذہن میں آسکتا ہے" کا استیعاب و احاطہ تو بہر کیف ممکن نہیں ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ وہ علوم جن پر انسان کی اعتقادی، عملی اخلاقی اور تمدنی اصلاح اور اس کی سعادت عظمیٰ یعنی فلاح دارین موقوف ہے۔ ان علوم کی تلخیص کر لی جائے۔

قاضی ابوبکر بن العربی علوم قرآن کی بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ علوم قرآن کی بنیاد تین چیزیں ہیں۔ توحید۔ تذکیر (یعنی وعظ و نصیحت اور ترغیب و ترہیب) اور احکام[1]۔

توحید میں تو مخلوقات اور خالق کی معرفت اس کے جملہ اسماء و صفات اور افعال کے ساتھ داخل ہے کہ ان سب کی پوری طرح معرفت توحید کی روح اور حقیقت ہے۔ تذکیر میں وعدو وعید (ترغیب و ترہیب) جنت و جہنم کا بیان اور ظاہر و باطن کے تصفیہ و تطہیر کے امور داخل ہیں اور احکام سے وہ تمام عملی پابندیاں مراد ہیں جن کا انسان مکلف و مامور ہے جس میں امر و نہی حلال و حرام واجب و مستحب اور جملہ منافع و مضار کا بیان شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ فاتحہ اُمّ الْقُرْآن ہے کیونکہ وہ ان تینوں علوم توحید و تذکیر اور احکام پر مشتمل ہے اور سورۂ اخلاص کو ثلث قرآن فرمایا گیا کیونکہ وہ ان علوم ثلٰثہ میں سے علم توحید پر مشتمل ہے۔

[1] الاتقان فی علوم القرآن للشیخ السیوطی رح۔

ابن جریرؒ بیان فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے مضامین کا خلاصہ تین چیزیں ہیں توحید، اخبار اور دیانات اور سورۂ اخلاص ان مضامین میں سے مضمون توحید پر مشتمل ہے اس وجہ سے اس سورۂ کو ثلث قرآن فرمایا گیا۔

یہ تین مضامین قرآن کریم کے جملہ علوم و مضامین کے لیے چونکہ ایک بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اس بنا پر ائمہ مفسرین نے ان علوم ثلثہ کے تحت بہت سے انواع و اقسام ذکر کیے ہیں۔

علوم نظریہ اور علوم عملیہ

الغرض قرآن کریم کے ان بے شمار علوم کا استیعاب تو ممکن نہیں ہے۔ البتہ وہ علوم جن پر انسان کی اعتقادی عملی اخلاقی اور تمدنی اصلاح اور سعادت عظمیٰ (یعنی فلاح دارین) کا دار و مدار ہے ان کی تلخیص اس طرح کی جا سکتی ہے۔

اوّل علوم نظریہ اور دوم علوم عملیہ[1]۔ کیونکہ انسان میں حق تعالیٰ نے دو قوتیں ایسی رکھی ہیں کہ اگر ان کی اصلاح ہو جائے انسان نجات و کامیابی، اور سعادت عظمیٰ کا مستحق ہو سکتا ہے۔ اب اس کے بعد ان دو قوتوں میں جس قدر بھی ترقی کرے گا اسی قدر اس کی سعادت میں بھی ترقی ہو گی اور جس قدر ان میں قصور و نقصان رہے گا اسی قدر اس کی سعادت میں بھی قصور رہے گا۔ ایک قوت نظریہ ہے یعنی وہ علم و ادراک جو حقیقی اور مطابق واقع ہو اور دوسری قوت عملیہ ہے جو اس کی عملی زندگی سے تعلق رکھتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ انسانی قوتوں میں قوت نظریہ سب سے زائد قوی اور اعلیٰ و ارفع ہے کیونکہ اس کی تمام تر عملی زندگی کا دار و مدار اسی پر ہے اور یہی قوت انسان کو اعمال پر برانگیختہ و آمادہ کرتی ہے اور مرنے کے بعد یہی قوت اس کے ساتھ رہتی ہے جب کہ

---

[1] وہ علوم جو عملیہ ہیں ان کے تحت (الف) علم تہذیب النفس۔ (ب) علم تدبیر المنزل اور (ج) علم سیاست مدن داخل ہے۔ ۱۲۔

اس کی زندگی سے تمام قوتوں کا رشتہ منقطع ہوچکا ہوتا ہے۔ اس کی اصلاح وتکمیل یہ ہے کہ حقائق وموجودات کو صحیح طور پہ جانے۔ وہ مجردات ہوں یا مادیات عالم محسوس ہو یا معقول۔

محسوسات اور مادیات کے علوم اور ان کا انکشاف مجردات کے مقابلہ میں نہایت ہی ناقص اور حقیر ہے کیونکہ مادیات متغیر ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان کے تغیر سے علوم کا بھی متغیر ہونا لازم ہے۔ نیز یہ کہ مادیات بہ نسبت مجردات کے خسیس اور ارذل بھی ہیں تو لامحالہ ان کا علم بھی اسی مرتبہ کا ہو۔ جس طرح کہ انسانی ابدان کے صحت و مرض کا علم حیوانات کے صحت و مرض کے علم سے یقیناً اشرف و افضل ہوتا ہے اور اس کے بالمقابل حیوانات سے متعلق علم الابدان خسیس اور کم مرتبہ ہوتا ہے اس وجہ سے کہ حیوانات کا مرتبہ انسان سے نہایت ہی گھٹیا ہوا اور خسیس ہے تو اسی طرح مادیات کا علم بھی مجردات کے علم کے مقابلہ میں خسیس اور کم تر ہوگا مرتبہ کے تفاوت کی وجہ سے۔

اور مجردات میں سب سے اعلیٰ واشرف حق تعالیٰ شانہ' کی ذات وصفات کی معرفت ہے لہٰذا جملہ علوم میں وہی علم سب سے اعلیٰ و افضل اور اشرف ہوگا جو حق تعالیٰ شانہ' کی ذات وصفات سے متعلق ہو۔ اسی بنا پر کہ ہر علم کا مرتبہ اور شرف اس کے متعلق کے لحاظ سے ہے۔ قرآن کریم کا بہت بڑا حصہ اسی علم سے متعلق اور اس پر مشتمل ہے چنانچہ سورۂ فاتحہ کی پہلی ہی آیت نے خداوند عالم کی ذات کبریائی اور اس کی صفات عظیمہ کو اس طرح نمایاں اور ثابت کر دکھایا کہ وہ ایک حکیم دانا اور فیلسوف کے مذاق پر برہان و دلیل بھی ہے اور عوام کے اذہان و دماغ بھی اپنے سادہ مذاق کے بموجب اس سے یقین کامل اور اذعان تام حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً الحمد للہ رب العٰلمین۔ یہاں چار لفظ ہیں۔ حمد یعنی ستائش وخوبی۔ اللہ جو اس ذات واجب الوجود کا نام ہے جس میں اس کی جملہ صفات کاملہ کا تصور علیٰ وجہ الاتم پایا جارہا ہے۔ رَبّ پرورش

کرنے والا یعنی درجہ بدرجہ ہر چیز کو اس کے حدکمال تک پہنچانے والا - اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی شئے کسی بھی وقت اور حالت میں اپنے مربی سے مستغنی نہیں ہوسکتی - ہرآن ولحہ اس کا دست احتیاج اپنے مربی ہی کی طرف پھیلا ہُوا رہتا ہے -
عالمینؔ جو عالم کی جمع ہے تمام جہانوں کے مفہوم پر دلالت کر رہا ہے جو عالم جواہر عالم مجردات عالم اجسام - عالم مادیات عالم سفلیات عالم عناصر و بسائط ، عالم نباتات - عالم حیوانات - عالم انسان اور عالم معقول ومحسوس سب ہی کو مشتمل ہے - تمام جہانوں پر نظر تو بہت بڑی چیز ہے - اگر صرف انسان ہی پر ذرا غور سے نظر ڈالی جائے تو ہر دیکھنے والے کو یہ چیز صاف اور قطعاً بے حجاب نظر آئے گی کہ انسانی اعضاء کی ساخت کیسی عجیب وغریب ہے - ان میں کس قدر صنعتیں اور حکمتیں رکھی ہُوئی ہیں -

اس کے ادراک سمع وبصر قوت گویائی اور دیگر اعضاء جسمانی کا پورا نظام حیرت میں ڈالتا ہے کہ یہ مختصر سا انسان باوجود اپنے جسمانی اختصار کے کس قدر عالموں کی وسعت اپنے میں رکھتا ہے - جس چیز پر نظر ڈالے گا عقل وشعور کا یہی جواب ہوگا کہ بے شک اس کا خالق اور بنانے والا نہایت ہی حکیم و دانا اور مدبّر اور بڑی زبردست طاقت رکھنے والا ہے اور عقل وبصیرت انسان کو مجبور کرے گی کہ وہ یہ اقرار کرے -

اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ ۔

کہ بے شک اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی ہر چیز کا وکیل و نگران بھی ہے -

صُنْعَ اللّٰہِ الَّذِیْ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ ۔

اللہ ہی کی یہ کاریگری ہے کہ اس نے ہر چیز کو بڑی ہی مضبوطی اور قوت (تدبیر و حکمت) کے ساتھ پیدا کیا ہے -

غرض جب یہ ثابت ہوگیا کہ عالم کا خالق اور مربی اللہ ہے اور جملہ موجودات

اپنے وجود اور بقاء میں سرتاپا ہر آن و ہر لحہ اسی کے محتاج ہیں ۔ اسی نے اپنے فیض عام اور حکمت سے مخلوق کی آفرینش میں حکمت و اتقان کو ملحوظ رکھا وہی اپنے انعام وکرم سے سب کو سرفراز فرماتا ہے تو ۔ ۔ ۔ لامحالہ اس سے ظاہر و معلوم ہوا کہ اس ذات میں جملہ صفات کمال موجود ہیں اور وہ ذات جملہ کمالات کے ساتھ متصف ہے ۔ اور جو ذات ہر کمال اور خوبی کے ساتھ متصف ہو وہ یقیناً ہر طرح کی حمد و ستائش اور ثناء و تمجید کی بھی مستحق ہے ۔

اب اگر انہی کلمات کو حکماء کے قواعد کے مطابق ترتیب دوگے تو حق تعالیٰ شانہ کے وجود اور صفات کمال پر قائم ہونے کی ایک نہایت ہی واضح برہان اور دلیل قطعی حاصل ہو جائے گی ۔ بایں طور کہ تمام عالم اور اس کے جملہ افراد و موجودات مؤثر سے مستغنی نہیں ۔ کیونکہ ان کا تدریجی دلبقاء اور اسباب بقاء میں احتیاج بھی بتا رہا ہے کہ وہ مؤثر سے کسی حال میں بھی مستغنی نہیں ہو سکتیں جس طرح کہ چلتی ہوئی ریل اور کسی مشین کو چلانے والے سے مستغنی سمجھنا خلاف عقل اور فطرت ہے اسی طرح جملہ موجودات عالم کو مدبر اور مربی حقیقی رب العالمین سے مستغنی و بے نیاز تصور کرنا خلاف عقل اور فطرت ہوگا ۔ اور جو چیز[1] مؤثر سے مستغنی نہ ہو وہ یقیناً حادث ہوتی ہے جس کا ظاہری نتیجہ یہی نکلا کہ تمام عالم خواہ وہ جواہر ہو یا اعراض معقولات ہو یا محسوسات حادث ہیں ۔ ذات قدیم صرف وہی ایک ذات ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا ۔ کائنات کی ہر چیز اسی کی محتاج ہے اور وہ ہر چیز سے مستغنی و بے نیاز علیم و خبیر ہے اور کائنات عالم کا ہر ہر ذرہ اپنے وجود سے اپنے خالق حقیقی کی توصیف اور حمد و ستائش[2] میں یہی کہہ رہا ہے ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔

غرض اس ایک آیت ہی میں اپنی ذات و صفات کا ثبوت روز روشن کی طرح

---

[1] تفسیر کبیر امام رازی ۔ الاتقان فی علوم القرآن ۔ مقدمہ تفسیر قرطبی ۔

[2] علم الکلام ۔ البیان فی علوم القرآن ۔

نمایاں فرما دینے کے بعد اپنی غیر متناہی صفات میں سے ایک ایسی صفت کو بیان فرما دیا جو خدا اور بندہ کے درمیان رشتۂ محبت قائم کرتی ہے وہ "الرَّحمٰن الرَّحِیم" ہے۔ کہ صفت رحمانیت ہی کا مقتضیٰ تمام مخلوقات کو وجود عطا کرنا اور پھر تربیت کرنا ہے۔ اور رحیمیت کا اقتضاء ہے کہ عالم خلق کے بعد ایک دوسرے عالم میں مطیعین اور نیکوں پر انعام فرمایا جائے اور نافرمانوں کو ان کی نافرمانی اور بغاوت پر سرزنش وسزا جس کی طرف۔۔۔ مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ نے اشارہ کردیا۔ اور یہ کہ انسان انعامات اخرویہ کا مستحق اپنے کسی ذاتی فضل وکمال سے نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس کا ذریعہ حق تعالیٰ کی ربوبیت و الوہیت کا قلب میں استحکام اور عملی زندگی کی اس سے مطابقت ہے جس کو ایمان واطاعت سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا جامع ترین عنوان عبادت و بندگی ہے اور یہ سعادت عظمیٰ انسان کے کسب واکتساب ہی سے نہیں حاصل ہوتی بلکہ یہ توفیق خداوندی اور اس کی اعانت پر موقوف ہے لہٰذا فکر انسانی کو اس حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے ارشاد فرما دیا گیا۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِينُ۔

انسان میں قوائے ملکیہ کے ساتھ قوائے بہیمیہ کا بھی اجتماع ہے جو اس کو توہمات میں مبتلا کرکے بے صبری ناعاقبت اندیشی کی وادی میں ڈال کر نفسانی شہوتوں اور دنیوی لذتوں کے تابع بنا دیتے ہیں اور اس طرح انسان معبود حقیقی کو فراموش کرکے خیالاتی معبودوں کے پیچھے پڑجاتا ہے تو اس پر قائم رہنے کے لیے اسی معبود حقیقی رب کریم اور رحمٰن و رحیم سے توفیق استقامت طلب کرنا ضروری ہے۔ اس وجہ سے ان امور کے ساتھ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" کی درخواست کا بھی اضافہ کردیا گیا کہ اے اللہ ہم کو سیدھی راہ دکھا۔ اور اسی پر ہم کو چلا۔ اور یہ ایک ایسا عام عنوان ہے کہ تمام معاملات میں خواہ دینی ہوں یا دنیوی فلاح ونجاح کے لیے ضامن ہے۔ کیونکہ راہ راست ہی ہر امر میں صحیح مقصد کی طرف لے جانے والی اور پہنچانے والی ہوتی ہے۔

انسان کو قدرت خداوندی نے دو قوتیں عطا کی ہیں۔ ان میں سے ایک قوت نظریہ ان تمام علوم اور اعتقادات کو شامل ہے جو خدا تعالیٰ کی ذات و صفات ملائکہ و انبیاء حشر و نشر جزا و سزا اور سعادت و شقاوت کے جملہ علوم نظریہ و اعتقادیہ سے متعلق ہے۔

تو الحمد للہ رب العالمین اور اس کے بعد چند کلمات نے ان مضامین کی طرف رہنمائی کی۔ اب ان کلمات کے ذریعے قوت نظریہ کی اصلاح و ہدایت کا مرحلہ جب گویا تکمیل پذیر ہوگیا تو انسان کی دوسری قوت یعنی قوت عملیہ کی اصلاح کے لیے "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" سے اشارہ کر دیا گیا۔ کیونکہ افراط و تفریط میں مبتلا ہو جانا ہی انسان کی عملی صلاحیتوں کو تباہ کر دینے والی چیز ہے۔ اور اعتدال و توسط اور راہ راست کی اتباع و پیروی ہی تمام تر عملی خوبیوں اور اخلاقی محاسن کو متضمن و جامع ہے۔ اس بناء پر اس درخواست کو پیش کر دیا گیا کہ "اے اللہ تو ہم کو راہ راست پر چلا۔"

مثلاً جود و سخاوت ایک نہایت عمدہ اور بلند ترین وصف ہے جو اسراف و تبذیر اور بخل کے درمیان ایک معتدل و متوسط راستہ کا نام ہے، کیونکہ اسراف و تبذیر افراط کا پہلو ہے اور تفریط بخل کا نام ہے۔ اور یہ دونوں پہلو لامحالہ مذموم ہیں، اور اعتدال و توسط سے ہٹے ہوئے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ افراط و تفریط کے دونوں پہلو موجب غضب اور قہر خداوندی اور باعث ضلالت و گمراہی ہیں۔ اور راہ حق وہی ہے جو اللہ کے ان بندوں نے اختیار کی جن پر خدا تعالیٰ کے خصوصی انعامات ہیں یعنی انبیاء و صدیقین اور شہداء و صالحین۔ اس وجہ سے صراط مستقیم کی توضیح و تعیین کے لیے یہ بھی فرما دیا گیا صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ

الغرض اسی طرح کلام اللہ کی وہ تمام آیات جو امور اعتقادیہ ایمان باللہ والملائکہ والرسل والیوم الآخر اور مضامین جزا و سزا جنت و جہنم اور دلائل

آفاق و انفس میں غور و فکر اور صانع عالم کی ربوبیت و توحید پہ استدلال سے متعلق ہیں وہ تمام نظریہ پر مشتمل ہیں۔ سورۂ فاتحہ کے یہ کلمات اور جن امور کی طرف یہ کلمات رہنمائی کرتے ہیں اشارات و رموز کے درجہ میں محض ایک مثال کے طور پر بیان کر دیئے گئے ورنہ آیات قرآنیہ سے علوم نظریہ کی تفصیل اور اس کے شعبوں کی تحقیق کے لیے تو ایک مستقل کتاب چاہیے۔ ان مختصر سطور میں گنجائش نہیں ہے کہ تفصیل و تحقیق کی طرف رُخ مائل کیا جائے۔

قوتِ عملیہ اور اس سے متعلقہ عُلوم

انسان میں ودیعت رکھی ہوئی قوتوں میں سے دُوسری قوت قوتِ عملیہ ہے جو اس کی عملی زندگی اور کسب و اکتساب سے متعلق ہے۔ اس قوت عملیہ سے متعلق تین علم ہیں۔ اگر شخص واحد کی انفرادی اصلاح اور فلاح کا علم ہے تو علم "تہذیب النفس" ہے۔ اور اگر وہ علم ان عملی اُمور سے متعلق ہے جو چند افراد کے باہمی معاملات اور اجتماعی معاشرت پر مشتمل ہے تو اس علم کا نام "تدبیرِ منزل" ہے۔ اور اگر وہ انتظام مملکت اور امور سلطنت سے متعلق ہے تو اس کا نام۔۔ علم سیاست مدن (سیاست مدنیہ) ہے اور ان علوم ثلثہ کے تحت متعدد شعبے ہیں اور قرآن کریم نے ہر شعبہ علم کی پُوری پوری تحقیق و تفصیل فرمائی ہے۔

اس موقعہ پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے انسان کی ان دونوں قوتوں سے متعلق علوم نظریہ اور علوم عملیہ اور ان کے شعبوں کی کچھ تفصیل پیش کر دی جائے جو ان شعبوں کی صرف ایک فہرست کے درجہ میں ہو۔ اُمید ہے کہ قارئین کرام اس فہرست کے مطالعہ سے ان علوم کی وسعت و عظمت اور کلام الٰہی کی جامعیت کا اندازہ لگالیں گے۔

عُلومِ نظریہ اور مُتعلّقہ شعبے

گذشتہ کلمات میں یہ بات واضح ہو چکی کہ انسانی سعادت وفلاح کی بُنیاد قوّتِ نظریہ کی اصلاح و درستگی ہے۔ جس قدر بھی غور و فکر اور تدبّر کیا جائے گا، یہی حقیقت منکشف ہوگی کہ اس فلاح وسعادت کا اصل سرچشمہ ..... حق تعالیٰ شانہٗ کی معرفت ہے اور اس معرفت کے مطابق اس کی اطاعت و بندگی۔

کیونکہ اقوامِ عالم اور دُنیا میں پیدا ہونے والے تمام فرقوں اور ان کے افکار ونظریات کا جائزہ لینے سے ہر صاحب فہم اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ تاریخ عالم میں جتنے مذاہب باطلہ اور ادیان کا ذبہ پیدا ہوئے ہیں ان سب کی گمراہی کا اصل سبب صرف یہی ہے کہ انہوں نے خدا کو نہیں پہچانا اور بجائے خالق حقیقی کے پہچاننے اور اس پر ایمان لانے کے لیے اپنے خیالات کے تراشے ہوئے معبودوں کی پرستش میں لگ گئے۔ کسی نے عقل و دانش سے محرومی کے باعث خالق کائنات کا سرے سے انکار ہی کر ڈالا اور دہریت و مادہ پرستی کی راہ اختیار کرلی۔ کسی نے اپنی بدنصیبی سے شرک و بت پرستی کی گندگیوں میں اپنے آپ کو ڈال دیا۔

انبیاء سابقین ہر دور میں اپنی قوموں کو اگرچہ یہی سبق پڑھاتے رہے، کہ "یا قوم اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلٰهٍ غَيْرُهٗ" دلائل اور حجج ظاہرہ سے حق تعالیٰ شانہٗ کی الوہیت و ربوبیت اور اس کی خالقیت و وحدانیت ثابت کرتے رہے لیکن ظاہری علم رکھتے ہوئے بھی اور کتاب الٰہی کی معرفت کے مدعی ہونے کے باوجود بھی اپنے اہواء و خواہشات اور لذائذ دنیویہ میں

پڑے رہے ۔ نہ طاعت و بندگی کا کوئی حق ادا کیا اور نہ ہی اس کی توحید پر قائم رہے ۔ کسی نے تثلیث کا عقیدہ اختیار کیا تو کسی نے خدا کے واسطے اولاد اور بیٹے تجویز کرنے شروع کر دیئے ۔ غرض اس طرح دنیا حق تعالیٰ شانہ کی معرفت سے محروم ہو کر شکوک و اوہام کی دلدل میں پھنسی ہوئی تھی قرآن کریم نے نازل ہو کر دنیا کے لیے اس بدنصیبی اور محرومی سے نجات پانے کا راستہ ظاہر کر دیا ۔ اور خالق کائنات کی معرفت اس کے کمالات اس کی عظمت و کبریائی اور وحدانیت روز روشن کی طرح نمایاں کر کے ہدایت و ضلالت کو نور و ظلمت اور لیل و نہار کی طرح ممتاز و جدا کر ڈالا ۔

قرآن کریم نے بہت سی آیات میں غور و فکر اور عقل سے کام لینے کا حکم دیا اور کہہ دیا کہ اے انسانو ! تم اپنی ذات وصفات اور کائنات عالم کے حالات میں غور و فکر کرو گے ۔ تمہارا دل خود بخود اس بات کی گواہی دینے پر مجبور ہو گا ۔ وَمَا مِنْ اِلٰـهٍ اِلَّا اللّٰهُ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (سورۃ آل عمران) (اور نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے اور بے شک وہی غالب اور بڑی حکمت والا ہے ۔)

اس موضوع کی تفہیم و تکمیل آیات قرآنیہ میں دو طرح سے کی گئی ۔ ایک طریقہ احقاق حق کا اختیار کیا گیا اور دوسرا طریقہ ابطال باطل کا لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (تاکہ حق کو حق کی حیثیت سے ثابت کر دے اور باطل کو نیست و نابود کر دے اگرچہ مجرمین کو یہ بات ناگوار ہو)

بلکہ اسلامی تعلیمات کا یہ خصوصی امتیاز ہے کہ ہر شعبہ حیات میں احقاق حق اور ابطال باطل کے بعد ایسے صحیح اور واقعی اعتقادات و نظریات کی تعلیم دیتا ہے جو عین عقل اور فطرت کے مطابق ہیں اور فطرت سلیم ان کے حق اور نافع ہونے کو تسلیم کرتی ہے اور قدم قدم پر دلائل عقلیہ اور براہین قاطعہ اس امر کی تائید و تثبیت میں پائے جاتے ہیں اور اس رخ کی تکمیل کے ساتھ

باطل اور غلط نظریات وعقائد فاسدہ کو دلائل و براہین سے ردّ اور باطل کرتا ہے۔

قرآن کریم ان حقائق کی بصیرت افروز انداز میں تحقیق کرتے ہوئے عالم کو اسی کی دعوت دیتا ہے کہ حق کو اختیار کرو اور باطل سے پرہیز کرو۔

الغرض قرآن کریم نے اقوام عالم کی بنیادی گمراہی دُور کرنے یا احقاق حق اور ابطال باطل کے لیے سب سے زائد اہتمام کے ساتھ خالق کائنات کی معرفت اور اس کی قدرت وکبریائی دو طرح کے دلائل سے ثابت فرمائی۔

دلائل کی ایک نوع وہ ہے جس کو دلائل انفس کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے اور دلائل کی دُوسری قسم دلائل آفاق ہے۔

قرآن کریم نے دلائل کی ان دونوں قسموں کو ایسی خوبی، جامعیت اور وضاحت کے ساتھ بکثرت آیات میں بیان فرمایا کہ خالق کائنات کی ہستی عالم کائنات کے ایک ایک ذرّہ میں اس طرح نمایاں اور روشن ہوگئی جس طرح سُورج کی شعاعیں عالم کے گوشہ گوشہ کو روشن ومنور کررہی ہوں حتیٰ کہ کسی ذی عقل اور ذی شعور انسان کو یہ مجال باقی نہ رہی کہ وہ خالق کائنات کا انکار کرسکے۔

حق تعالیٰ شانہٗ کی معرفت اور اُس کی خالقیت وقدرت کا دلائل انفس سے اثبات

دلائل انفس سے مراد خود انسانی زندگی کے وہ جملہ احوال و کیفیات اور تغیرات ہیں جن میں سے ہر ایک حق تعالیٰ شانہٗ کی ہستی اس کی خالقیت وقدرت کے لیے واضح دلیل اور برہان قطعی ہے۔ کہ انسان جب بھی اپنی ذات وصفات اور جو احوال اس پہ واقع ہیں میں غور کرے گا اس کو اس بات کا کامل یقین ہوجائے گا کہ ضرور میرا پیدا کرنے والا ایک رب ہے جس کی عظمت وکبریائی اور کمال قدرت کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ وہی میرا پالنے والا ہے اسی کے قبضۂ قدرت میں میری موت وحیات ہے۔ اسی کا نام خدا ہے اور صرف وہی عبادت کا مستحق ہے جب اس کی خالقیت میں کوئی شریک نہیں تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کی الوہیت ومعبودیت میں کوئی اور اس کے ساتھ شریک ہو۔
دلائل انفس کے تتبع وتلاش کے لیے فکر انسانی کو حق تعالیٰ نے دعوت دی اور ارشاد فرمایا:

وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔ (سورۃ الذاریات)

کہ اور تمہارے نفسوں میں خود بہت نشانیاں اور دلائل ہیں (کہ جن سے تم اپنے رب کو پہچان سکتے ہو) تو کیا اے لوگو! پھر بھی تم نہیں دیکھتے (کہ کیسے کیسے دلائل خدا تعالیٰ کی قدرت و وحدانیت کے موجود ہیں)

یعنی اے انسان تو اپنی ذات اور اپنی حالت میں غور و فکر اپنی ابتداء کو بچپن و جوانی اور نشوونما اپنے اعضاء و جوارح آنکھ ناک کان اور دل و دماغ اور اپنی ذات میں پیدا ہونے والے احوال و تغیرات ان سب چیزوں پر جب نظر کرے گا تو تیری زبان بے ساختہ بول اٹھے گی :

"تَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ"۔ دلائل النفس کے سلسلہ میں حق تعالیٰ شانہ نے انسانی ہستی کی ابتداء اس کی خلقت و پیدائش کو متعدد آیات میں نہایت اہمیت اور تحقیق و تفصیل سے بیان فرمایا اور اس ضمن میں ان مدعیان عقل فلاسفہ کا دلائل و براہین سے خوب رد کیا گیا جو اس بات کے قائل ہیں کہ انسانی ہستی کی کوئی ابتدا نہیں وہ ہمیشہ سے پیدا ہوتا چلا آرہا ہے اور اسی طرح ہمیشہ پیدا ہوتا رہے گا۔ اس سلسلہ کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ کوئی انتہا۔

قرآن کریم نے انسانی ہستی کی ابتداء اور اس ضمن میں اپنی خالقیت کا اس طرح ذکر فرمایا :

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ۔ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۔	بیشک انسان پر یقیناً ایک ایسا زمانہ گذرا ہے کہ انسان میں اس وقت کوئی چیز بھی نہ تھا کہ جس کا ذکر کیا جائے بیشک انسان کو ہم نے ایک ملے جلے نطفہ سے پیدا کیا ہے اس غرض سے کہ ہم اس کی آزمائش کریں تو ہم نے اس کو سننے اور دیکھنے والا پیدا کیا۔

(سورۃ دھر)

حق تعالیٰ نے اس ارشاد مبارک میں انسانی تخلیق کا یہ ذکر فرماکر یہ ظاہر فرما دیا کہ ایک ناپاک اور گندہ پانی کے قطرہ سے پیدا کرنا یہ صرف ہماری قدرت ہے ہمارے سوا کسی میں یہ قدرت نہیں کہ ایک ناپاک اور بدبودار قطرۂ آب سے ایک بہترین ساخت پیکر حسن و جمال مخلوق پیدا کردے جس کے اعضاء کی ساخت اس کے قویٰ و مدرکات نے دُنیا کو حیرت میں ڈال رکھا ہے۔

انسان پیدا کرنے کی تو کسی کو کیا قدرت ہو سکتی ہے اگر دنیا کی تمام طاقتیں مل کر اپنے تمام مادی وسائل و ذرائع خرچ کرکے ایک مکھی یا مچھر جیسی حقیر چیز بھی پیدا کرنا چاہیں تو ہرگز ہرگز پیدا نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۔ (سورۃ الحج)	کہ بے شک جن معبودوں کی تم خدا کو چھوڑ کر پرستش کر رہے ہو یہ سارے معبود ہرگز (کبھی) ایک مکھی بھی پیدا نہ کر سکیں گے اگرچہ یہ سب معبود اس کے واسطے جمع ہو جائیں

انسانی ہستی حق تعالیٰ شانہٗ کی خالقیت اور کمال قدرت کی ایک ایسی زندہ دلیل ہے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا بھی کوئی فلسفی اس دلیل کے معارضہ اور مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا۔

ظاہر ہے کہ انسان ابتدا میں معدوم محض تھا۔ اس کو نہ کسی قسم کا حسی وجود حاصل تھا اور نہ عقلی وجود۔ خدا ہی نے اس کو وجود کا خلعت عطا فرمایا۔ وہ ابتداءً خلقت میں شکم مادر میں ایک نطفہ تھا۔ اس کو خدا ہی نے منجمد خون بنایا پھر گوشت کا لوتھڑا اس کے بعد ہڈیوں کا ڈھانچہ بنایا اور پھر اس پر گوشت و پوست چڑھایا گیا اور جب یہ سب کچھ مراحل تکمیل پذیر ہو گئے تو اس میں جان ڈالی گئی اور اس عرصہ میں خون حیض کو اس کی غذا بنائے رکھا۔ پھر ولادت کا مرحلہ آسان فرما کر اس کو جیتا جاگتا دیکھنے سننے والا انسان بنا کر پیدا فرمایا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا :

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ، ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا۔ فَكَسَوْنَا	اور بیشک انسان کو ہم نے مٹی کے خلاصہ سے بنایا (کہ اوّل حضرت آدمؑ کی تخلیق اسی طرح ہوئی) پھر ہم نے اس انسان کو نطفہ سے پیدا کیا جس کو ایک مدت معینہ تک ایک محفوظ مقام (یعنی رحم مادر) میں محفوظ رکھا۔ پھر اس نطفہ کو جما ہوا خون بنایا۔ پھر اس جمے ہوئے خون کو

الْعِظَامَ لَحْمًا ۔ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۔

(سورۃ مؤمنون پ۱۸)

گوشت کا لوتھڑا بنایا ۔ اس کے بعد گوشت کے اس ٹکڑے کو ہڈیاں بنایا اور پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا ۔ پھر ہم نے اس کو ایک دوسرا طرح کی ہیئت کی مخلوق بنا کر پیدا کیا سو کیسی بڑی شان والا ہے ۔ اللہ رب العزۃ جو تمام صناعوں سے بڑھ کر بہترین صانع و خالق ہے ۔

پروردگار عالم کی کیسی عجیب صناعی ہے کہ ایک قطرۂ آب عورت کے رحم میں پہنچ کر کس طرح لوٹ پلٹ ہوتا ہوا کن کن احوال و تغیرات کو قبول کر رہا ہے ۔

بتدریج کس طرح ہڈیوں اور اعضاء کی ساخت ہو رہی ہے ۔ گوشت پوست رگ اور پٹھے بنتے جا رہے ہیں اور ناپاک خون سے اس کو غذا مل رہی ہے ، اور تنگ و تاریک مقام میں اس کی نشو ونما کا سلسلہ جاری ہے ۔ اسی میں اس کے تنفس کا سامان بھی مہیا کر دیا گیا ہے ۔ پھر ایک معین مدت کے بعد تخلیقی مراحل کے پورے ہونے پر اس کی ولادت ہو رہی ہے ۔ اس کی شکل و صورت اعضاء کی ساخت اور زیبائش کو دیکھو اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ و مدرکات پر نظر کرو ۔ پھر یہ کہ پیدا ہوتے ہی اس کو ماں کا دودھ چوسنا کس نے سکھایا عقل و فہم اور شعور کی صلاحیتیں کس نے دیں ۔ اس کی آنکھوں میں نور اور بینائی کس نے پیدا کی ؟

انسانی عقول کو حیرت میں ڈالنے والی اس صناعی کو دیکھ کر کوئی بہت ہی احمق انسان ہو سکتا ہے جو یہ کہہ دے کہ یہ سب نوع انسانی اور صورت انسانی کا ظہور محض مادہ اور نیچر سے خود بخود اس کی حرکت سے واقع ہوتا رہتا ہے لیکن عقل و فہم سے کام لینے والا انسان کہتا ہے کہ نہیں یہ حیرت انگیز کرشمے ایک بے حس و شعور مادہ کی اتفاقی حرکتوں کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ سب عجیب و غریب کرشمے خلاق عظیم و علیم کی قدرت و حکمت ہے ۔ اس کا غور و فکر یہی جواب دے گا:

بَلٰى وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيْمُ ۔ اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۔ فَسُبْحَانَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۔

قدرتِ خداوندی کے ان کرشموں کے ساتھ یہ بات بھی قابلِ حیرت اور تعجب ہے کہ انسان عناصرِ اربعہ یعنی آگ پانی ہوا اور خاک کا مجموعہ ہے جو باہم متضاد عناصر ہیں اور ان تمام اجزا ترکیبیہ کی خاصیتیں بھی مختلف اور جُدا ہیں جیسا کہ ظاہر ہے اور پھر بھی یہ سب ایک محل یعنی بدن انسانی میں مجتمع ہیں ۔ حالانکہ مادہ اور طبیعت کا یہ تقاضہ نہیں ہو سکتا کہ متضاد عناصر ایک محل میں جمع ہوں اور اس کے باوجود ان سب کے خواص و آثار علیحدہ علیحدہ محفوظ رہیں ۔ آگ اور پانی ہی کو اگر ایک محل میں جمع کردو تو نہ آگ آگ رہے گی اور نہ پانی پانی رہے گا ۔ تو معلوم ہُوا کسی بڑے ہی طاقتور اور قاہر و مقتدر ذات کے تصرف اور علم کے ماتحت یہ متضاد عناصر ایک بدنِ انسانی میں جمع ہیں اور ہر ایک کے خواص و آثار بھی محفوظ و برقرار ہیں ۔ اس حقیقت کو دیکھ کر تو سب سے پہلے مادہ اور طبیعت کے قائلین کو ایمان لانا چاہیے ۔ اور سمجھنا چاہیے کہ یہ تمام صُورت و ہیئت بغیر کسی صانع حکیم کے خود بخود تیار نہیں ہُوئی ہے ۔

دہریت اور مادہ پرستی کے اوہام میں مبتلا ہونے والوں کو حق تعالیٰ نے غور و فکر اور عقل سے کام لینے کی قرآن کریم میں بار بار دعوت دی اور دلائلِ عقلیہ سے ان پر حجت قائم فرمائی ۔ اس مضمون کی قرآن کریم میں دو چار نہیں سیکڑوں آیات موجود ہیں ۔

دہریت و مادہ پرستی کے احمقانہ تصوّر رکھنے والوں سے دریافت کیا گیا :

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ ۔ کہ یہ لوگ یعنی دُنیا میں بسنے والے انسان کیا خود بخود پیدا ہوگئے ہیں ؟ یا وہ خود ہی اپنے خالق اور بنانے والے ہیں کہ جیسے اور مصنوعات

لکڑی لوہے پیتل وغیرہ کی انسان خود اپنے
ہاتھوں یا مشینوں کے ذریعے تیار کر لیتے
ہیں تو کیا اسی طرح انسان بھی کسی مشین یا
کارخانہ میں گھڑے جاتے ہیں۔

بہرحال کسی بھی شی کے لیے عدم سے وجود میں آنے کے لیے کوئی نہ کوئی علت اور سبب ہونا چاہیے اور یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی صانع اور کاریگر انسانوں کو کسی مشین و کارخانہ میں تیار نہیں کرتا ہے اور نہ ہی عقلاً یہ ممکن ہے کہ ایک بدبودار قطرۂ آب خود بخود ایک حسین وجمیل شکل اختیار کر لے۔ کامل اعضاء اور بہترین ساخت قوائے مدرکہ حس وشعور اور عقلی صلاحیتوں کو لے کر ایک دم کسی عورت کے رحم سے نمودار ہو جائے۔

اس لیے ماننا پڑے گا انسان کا خالق وہی قادر مطلق اور بڑی حکمتوں والا خلاق علیم ہے جو جس طرح چاہتا ہے ارحام میں بچوں کی تصویر وتخلیق فرماتا ہے۔ هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا استدلال

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ حجۃ الاسلام میں فرماتے ہیں "کون شخص ہے کہ جو یہ نہ جانتا ہو کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہم پردۂ عدم میں مستور تھے اور عنقریب پھر ایسا ہی ایک زمانہ آنے والا ہے کہ اسی پردۂ عدم میں جا چھپیں گے۔ ہمارا وجود دو عدموں میں اس طرح گھرا ہوا ہے جس طرح نور زمین شب گذشتہ اور شب آئندہ کی دو ظلمتوں میں محصور ہے۔ زمین پر نور کی یہ آمد ورفت بآواز بلند کہہ رہی ہے کہ یہ نور زمین کا ذاتی نہیں ہے بلکہ مستعار ہے اور عطاء غیر ہے (کیونکہ) اگر یہ نور زمین کا ذاتی ہوتا تو کبھی زائل نہ ہوتا۔ پس اسی طرح موت وحیات کی کش مکش اور وجود کی آمد ورفت

اس امر کی واضح دلیل ہے کہ کائنات کا وجود ذاتی نہیں ہے ورنہ عدم اور زوال کو کبھی قبول نہ کرتا، بلکہ جس طرح زمین کی روشنی آفتاب کا فیض ہے اور پانی کی گرمی آگ کا فیض ہے اسی طرح ہمارا وجود بھی کسی ایسی ذات کا فیض اور عطیہ ہوگا کہ جس کا وجود اصلی اور خانہ زاد ہو۔ اور وجود اس ذات کے لیے اس طرح لازم ہو جیسے آفتاب کے لیے نور اور آگ کے لیے حرارت اور چار (عدد) کے لیے زوجیت اور تین کے لیے فردیت لازم ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ آفتاب ہو اور نور نہ ہو آگ ہو اور حرارت نہ ہو چار ہو اور زوجیت نہ ہو۔ تین ہو اور فردیت نہ ہو۔ اسی موجود اصلی کو اہل اسلام، اللہ تعالیٰ خدا اور واجب الوجود کہتے ہیں۔[1]

یہی وہ مضمون ہے جس کو قرآن کریم کی یہ آیت ادا کر رہی ہے:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (سورۃ بقرہ)

"اے لوگو! تم کیونکر انکار کرتے ہو اللہ کا، حالانکہ تم پہلے موجود نہ تھے۔ اسی خدا نے تم کو حیات عطا کی اور وہی پھر تم کو موت دے گا اور اس کے بعد تم سب اسی کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے۔"

حکیم فرفوریوس کا مقولہ ہے کہ جو امور بداہت عقل سے ثابت ہیں منجملہ ان کے ایک مسئلہ ثبوت صانع کا بھی ہے جتنے حق پسند حکماء گزرے ہیں وہ سب اس مسئلہ کی بداہت کے قائل تھے اور جو لوگ ثبوت صانع کی بداہت کے قائل نہیں وہ قابل ذکر نہیں ہیں اور نہ زمرہ علماء میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔[2]

اسی طرح فرمایا گیا:

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ءَاَنْتُمْ — اچھا ذرا یہ تو بتلاؤ کہ وہ منی جو تم رحم میں

---

[1] حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی شرح عقیدہ اصفہانیہ حافظ ابن تیمیہ بحوالہ علم الکلام شیخ المتکلمین والمحدثین مولانا محمد ادریس کاندھلوی۔ [2] علم الکلام۔

toobaa-elibrary

تَخْلُقُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الْخَالِقُوْنَ ڈالتے ہو تو کیا تم اس کے پیدا کرنے اور بنانے والے ہوتے ہو؟ یا ہم اس کے خالق ہیں۔ (سورۃ واقعہ پ۲۷)

اس قسم کے احتجاجی سوال کا واضح اور صریح جواب بارگاہ الٰہی سے ان ملحدین اور قدرت خداوندی کے منکرین کو مبہوت کر ڈالنے والے دلائل کے ساتھ دے دیا گیا۔

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ کہ ہم نے تم کو پیدا کیا ہے۔ پھر کیوں نہیں تم تصدیق کرتے (اور مانتے کہ ہم تمہارے خالق ہیں۔ حالانکہ تم بے شمار دلائل کا مشاہدہ کر رہے ہو۔) (سورۃ واقعہ)

کسی زندیق نے ایک اعرابی (دیہاتی) سے یہ سوال کیا کہ خالق کائنات کی ہستی اور اس کے وجود کی کیا دلیل ہے۔ اعرابی نے جواب دیا:

اَلْبَعْرَةُ تَدُلُّ عَلَى الْبَعِيْرِ ، وَآثَارُ الْاَقْدَامِ عَلَى الْمَسِيْرِ
اَلسَّمَاءُ ذَاتُ اَبْرَاجٍ ، وَالْاَرْضُ ذَاتُ فِجَاجٍ
وَالْبِحَارُ ذَاتُ اَمْوَاجٍ ، لَا تَدُلُّ عَلَى الصَّانِعِ اللَّطِيْفِ
الْخَبِيْرِ الْعَلِيْمِ الْقَدِيْرِ۔ (تفسیر کبیر ج ۱)

"اونٹ کی مینگنی اونٹ کے وجود پر دلالت کرتی ہے اور قدموں کے نشان چلنے والے کو بتاتے ہیں تو کیا یہ برجوں والا آسمان اور راستوں والی زمین اور یہ موجوں والا سمندر صانع لطیف (جو بڑے علم و قدرت والا ہے) پر دلالت نہ کریں گے۔

ہارون رشید نے ایک مرتبہ امام مالک رحمۃ اللہ سے وجود صانع پر دہریوں کے مقابلہ کے لیے کوئی دلیل معلوم کرنی چاہی تو فرمایا نوع بنی آدم کی صورتوں کا مختلف ہونا اور ہر ایک شخص کی آواز کا جدا اور ممتاز ہونا حق تعالیٰ شانہٗ

کی کمال قدرت اور خالقیت کی بڑی عظیم دلیل[1] ہے کہ انسان کا ایک مختصر سا چہرہ ہے۔ وضع اور ساخت کے لحاظ سے چہرہ کی ہیئت آنکھ ناک اور دہن سب کا ایک ہی طرح کا ہے لیکن پھر بھی ہر شخص کا چہرہ دوسرے شخص کے چہرہ سے مختلف اور ممتاز ہوتا ہے۔ کروڑ ہا کروڑ انسانوں کے چہروں کو دیکھتے چلے جایئے لیکن دو آدمیوں کے چہرے بھی اس طرح بالکل یکساں نہ ہوں گے کہ ان میں امتیاز ہی نہ کیا جا سکے کہ یہ زید ہے یا عمر۔ اسی طرح مشرق و مغرب کے انسانوں کی آوازیں کہ ایک آدمی کی آواز دوسرے کی آواز سے نہیں ملتی۔ غرض ہر ایک کی چال ڈھال صورت و سیرت اور آواز دوسرے سے مختلف ہے تو معلوم ہوا کہ بڑی ہی قدرت والا کوئی حکیم و علیم خالق ہے جس نے ہر ایک کو علیحدہ صورت و سیرت اور خصوصیت پر پیدا کیا، ورنہ کسی مادہ اور طبیعت کے اقتضاء سے ہرگز یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد انسان ایک جداشان رکھتا ہو اپنی صورت و ہیئت اور لب و لہجہ نغمہ و آواز اور چال ڈھال ممتاز ہو۔ اگر کوئی مادہ یا طبیعت انسانی افراد کو وجود میں لانے والی ہوتی تو چاہیے تھا کہ سب انسانوں کی صورتیں ان کی رفتار و گفتار بالکل یکساں ہوتی جس طرح کہ کسی مشین یا کارخانہ میں مثلاً ایک سانچہ سے ڈھالے ہوئے لوٹے اور برتن سب یکساں ہوتے ہیں۔ بال برابر بھی ایک عدد دوسرے سے مختلف نہیں ہوتا۔

انسانوں کے رنگ و روپ ان کے لب و لہجہ اور زبانوں کے اختلاف سے صانع عالم کی معرفت اور اس کی قدرت و حکمت پر استدلال کی بنیاد قرآن کریم کی یہ آیت مبارکہ ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ	اور اللہ کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور
وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ	زمین کا پیدا کرنا اور اے انسانو! تمہاری

---

[1] کذا ذکرہ الرازی فی تفسیرہ ۱۲۔

وَاَلْوَانِکُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ
(سُورۃ روم پ ۲۱)

زبانوں اور رنگتوں کا مختلف ہونا ہے بے شک اس میں بڑی عظیم نشانیاں ہیں علم (اور سمجھ) والوں کے لیے۔

غرض انسانی تخلیق کے یہ حیرت انگیز احوال اور انسان میں ودلیعت رکھے ہوئے علوم وفنون اور عقلی وفکری بلند پایہ وہ صلاحیتیں جن کے باعث وہ ساری کائنات اور مادّی طاقتوں سے منتفع ... ہو رہا ہے۔ طرح طرح کی ایجادات کے مراحل ومنازل طے کرتا رہتا ہے۔ یہ سب کچھ حق تعالیٰ کی معرفت کے لیے بہت کافی اور قوی دلائل اور شواہد ہیں۔

انسانی فطرت میں حق تعالیٰ کی معرفت رچی ہوئی ہے

خالق کائنات کے وجود اس کی خالقیت وقدرت اور وحدانیت کے قرآن کریم نے جہاں اور بہت سے دلائل اور براہین قطعیہ بیان کیے ان میں یہ بھی واضح طور پر ذکر فرمایا گیا کہ حق تعالیٰ کی معرفت اور اس کی الوہیت وربوبیت انسان کی فطرت میں رچی ہوئی ہے اور انسانی ہستی کے ساتھ یہ عقیدہ اس طرح لازم ہے کہ کسی بھی حال میں انسان کا قلب اس اعتقاد سے خالی نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو اپنے عناد وتعصب سے مغلوب زبان سے انکار کرتے ہوں اور بغاوت وسرکشی سے ایک لمحہ کے لیے اطاعت وفرمانبرداری کے لیے گردن جھکانے کے واسطے تیار نہ ہوں وہ بھی اس فطری معرفت کے سامنے مجبور ہوکر اقرار واعتراف پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔

انسانی فطرت میں رچی ہوئی اس معرفت کا ذکر قرآن کریم نے اس طرح فرمایا:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰي شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ	اور جب کہ نکالا آپ کے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو اور ان کو ان کی جانوں پر گواہ بنا کر (یہ فرمایا کہ) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں سب بولے (کیوں نہیں) بیشک (تو ہمارا رب ہے) ہم اس کے گواہ ہیں اقرار کرتے ہیں (یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے) کہ تم یہ نہ کہنے لگو قیامت کے روز کہ ہم کو تو اس کی خبر ہی نہ تھی۔

(سورۃ الاعراف)

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں واشهدهم علىٰ انفسهم کی شرح کرتے ہوئے

فرمایا کہ حق تعالیٰ نے ذریت آدم کو اپنی توحید و ربوبیت کی جانب پیدائشی (فطری) طور پر رہنمائی فرمائی۔ اور اس طرح گویا انسانی فطرت میں حق تعالیٰ کی معرفت ابتدا ہی سے رچا دی گئی۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں:

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُسْئَلُ عَنْھَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی خَلَقَ آدَمَ ثُمَّ مَسَحَ ظَھْرَہٗ بِیَمِیْنِہٖ فَاسْتَخْرَجَ مِنْہُ ذُرِّیَّۃً فَقَالَ خَلَقْتُ ھٰؤُلَاءِ لِلْجَنَّۃِ وَبِعَمَلِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ یَعْمَلُوْنَ. ثُمَّ مَسَحَ ظَھْرَہٗ فَاسْتَخْرَجَ مِنْہُ ذُرِّیَّۃً فَقَالَ خَلَقْتُ ھٰؤُلَاءِ لِلنَّارِ وَبِعَمَلِ اَھْلِ النَّارِ یَعْمَلُوْنَ فَقَالَ رَجُلٌ فَفِیْمَ الْعَمَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی اِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلْجَنَّۃِ اسْتَعْمَلَہٗ بِعَمَلِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ حَتّٰی یَمُوْتَ عَلٰی عَمَلٍ مِّنْ اَعْمَالِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ فَیُدْخِلُہُ الْجَنَّۃَ وَاِذَا

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ جس وقت اس کے متعلق آپ سے سوال کیا جا رہا تھا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔ پھر اپنا دایاں ہاتھ اس کی پشت پر پھیرا۔ اس سے کچھ اولاد ظاہر ہوئی۔ فرمایا کہ ان لوگوں کو میں نے جنت کے لیے پیدا فرمایا، اور یہ جنت والوں کے کام سرانجام دیں گے پھر دوبارہ اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ اس سے کچھ اولاد ظاہر ہوئی فرمایا کہ ان لوگوں کو میں نے دوزخ کے لیے پیدا کیا اور یہ دوزخ والوں کے کام سرانجام دیں گے ایک شخص نے عرض کیا کہ پھر اعمال کس لیے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے جب کسی بندے کو جنت کے لیے پیدا فرمایا تو جنت کے کام اس پر آسان ہو جاتے ہیں۔ جنت والے

خَلَقَ الْعَبْدَ لِلنَّارِ اسْتَعْمَلَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتَّى يَمُوتَ عَلَىٰ عَمَلٍ مِنْ أَعْمَالِ أَهْلِ النَّارِ فَيُدْخِلَهُ اللّٰهُ النَّارَ۔

اعمال میں سے کسی عمل پر خاتمہ ہوکر جنت میں داخل ہوجاتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو دوزخ کے لیے پیدا فرمایا، تو دوزخ کے کام اس پر آسان ہوجاتے ہیں۔ دوزخ والے اعمال میں سے کسی عمل پر خاتمہ ہوکر دوزخ میں داخل ہوجاتا ہے۔

اسی بناء پر کہ انسان اپنی ابتداء آفرینش ہی سے حق تعالیٰ کی معرفت اور اس کی ربوبیت کا اقرار کرچکا ہے اس کو ایمان باللہ اور توحید خداوندی کا مامور و مکلف فرمایا گیا ہے۔ اور اس فطری معرفت اور اقتضاء کو نظر انداز کرنے پر وہ منکر و کافر ہوا اور مستحق عذاب و عقوبت ٹھیرا۔

تمام عقائد حقہ اور ادیان سماویہ کا بنیادی پتھر یہی ہے کہ انسان خدا کی ہستی اور ربوبیت عامہ پر اعتقاد رکھے۔ مذہب کی ساری عمارت اسی سنگ بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ اس اعتقاد کے بغیر انسان کو نہ تو عقلی اور فکری رہنمائی کام دیتی ہے اور نہ ہی انبیاء و مرسلین کی ہدایات سے وہ منتفع ہوسکتا ہے۔

جس قدر بھی غور و فکر کیا جائے گا یہی ظاہر ہوگا آسمانی مذاہب کے تمام اصول و فروع بالآخر خدا کی ربوبیت عامہ کے اسی عقیدہ پر منتہی ہوتے ہیں وحی الٰہی اور الہام اسی اجمال کی شرح ہے اور عقل سلیم اس کو دلائل و حقائق کی روشنی میں تسلیم کرتی ہے اور ان کی حقانیت پر براہین قائم کرتی ہے۔

اس وجہ سے ضروری تھا یہ تخم ہدایت انسانوں کے قلوب اوران کی فطرت میں راسخ ہوتا کہ ہر انسان عقل و فہم اور وحی والہام کی آبیاری سے اس تخم کو شجر ایمان توحید کے درجہ تک پہنچا سکے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ فوائد قرآن کریم میں فرماتے ہیں کہ اگر قدرت کی طرف سے قلوب بنی آدم میں ابتداً ہی یہ تخم ریزی نہ ہوتی اور انسانی حیات کا سب سے زائد اساسی اور جوہری عقدہ کا حل ناخن عقل و فکر کے سپرد کر دیا جاتا تو یقیناً یہ مسئلہ بھی منطقی استدلال کی بھول بھلیاں میں پھنس کر صرف ایک نظری مسئلہ بن کر رہ جاتا جس پر سب تو کیا اکثر آدمی بھی متفق نہ ہوسکتے جیسا کہ تجربہ شاہد ہے کہ فکر و استدلال کی ہنگامہ آرائیاں اکثر اتفاق سے زیادہ اختلاف آراء پر منتج ہوتی ہیں۔ اس لیے قدرت نے جہاں غور و فکر کی قوت اور نور وحی والہام کے قبول کرنے کی استعداد بنی آدم میں ودیعت فرمائی وہیں اس اساسی و بنیادی عقیدہ کی تعلیم سے ان کو فطرۃً بہرہ ور اور مانوس بنا دیا۔ جس کے اجمال میں کل آسمانی ہدایات کی تفصیل لپٹی ہوئی تھی، اور جس کے بغیر مذہب کا کوئی ستون کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔

اسی ازلی اور خدائی تعلیم کا یہ اثر ہے کہ آدم کی اولاد ہر قرن اور ہر گوشہ میں حق تعالیٰ کی ربوبیت پر کسی نہ کسی حد تک متفق رہی ہے اور جن معدود افراد نے کسی عقلی اور روحانی بیماری کی وجہ سے اس عام فطری احساس کے خلاف آواز بلند کی وہ انجام کار دنیا کے سامنے بلکہ خود اپنی نظروں میں بھی ذلیل اور اسی طرح جھوٹے ثابت ہوئے جیسے بخار اور صفراء میں مبتلا مریض لذیذ و خوشگوار غذاؤں کو تلخ اور بدمزہ بتلانے میں جھوٹا ثابت ہوتا ہے۔

بہرحال ابتداء آفرینش سے لے کر آج تک ہر طبقہ اور درجہ کے انسانوں کا خدا تعالیٰ کی ربوبیت کبریٰ پر عام اتفاق و اجماع اس بات کی نہایت قوی اور واضح دلیل ہے کہ یہ عقیدہ عقول و افکار کی تگ و دو سے پہلے ہی خاطر عشق کی

طرف سے اولادِ آدم کو بلا واسطہ تلقین فرما دیا گیا ہے۔ ورنہ فکر و استدلال کے راستہ سے ایسا اتفاق پیدا ہوجانا تقریباً ناممکن تھا۔ قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے ان آیات میں انسانی فطرت میں رچے ہوئے اس عقیدہ پر روشنی ڈالی۔ یہ صحیح ہے کہ ہم کو یہ یاد نہیں ہے کہ اس بنیادی عقیدہ کی تعلیم کب اور کہاں دی گئی اور کس ماحول میں ہم اس عقیدہ سے مانوس ہوئے لیکن جس طرح کہ کسی انشأ پرداز اور صاحب بیان انسان کو زمانہ طفولیت میں طے ہونے والے ان تمام مراحل کا علم نہیں اور نہ ہی قوت حافظہ میں ان چیزوں کے نقوش وہ مستحضر پاتا ہے تاہم وہ یقین کرتا ہے کہ ضرور کسی نہ کسی معلم نے اس کو ابتداء عمر میں اس کو یہ الفاظ بولنے سکھائے ہیں اور اس کو ان الفاظ کے لکھنے کی تربیت دی ہے تب ہی ہر اس طرح رواں دواں بول رہا ہے اور لکھ رہا ہے۔ اسی طرح بنی نوع انسان کا عقیدہ ربوبیت الٰہی پر متفق ہونا اس کی کھلی شہادت ہے کہ یہ چیز ابتداء فطرت اور خلقت میں ضرور کسی معلم کے ذریعے ان تک پہنچی ہے[1]۔

حضرت شاہ صاحب[2] رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی اولاد اور ان سے ان کی اولاد نکالی سب سے اقرار کروایا اپنی خدائی کا، پھر پشت میں داخل کیا، اس سے مقصد یہ ہے کہ ہر ایک شخص کو چاہیے کہ خدا کو رب مطلق مانے۔ حتیٰ کہ اگر کسی شخص کا باپ شرک میں مبتلا ہے تو بیٹے کو چاہیے کہ ایمان لائے۔ اس لیے کہ ایمان ایک فطری امر بنا دیا گیا ہے۔ کسی کی تقلید پر ہدایت و ایمان کا توقف نہیں۔ اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ وہ عہد تو یاد نہیں رہا۔ پھر کیا حاصل۔ تو یوں سمجھیے کہ اس کا نشان ہر ایک کے دل میں ہے۔ اور ہر زبان پر مشہور ہو رہا ہے کہ وہ سب کا خالق ہے۔ سارا جہاں قائل ہے اور جو کوئی منکر ہے یا شرک کرتا ہے سو اپنی عقل ناقص کے دخل سے اور

---

[1] از تحقیقات شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ۔

[2] یعنی حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ ۱۲

پھر آپ ہی جھوٹا ہوتا ہے[1]۔

امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے ایک روایت نقل کی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس کی تفسیر میں بیان فرمادیا) اُخِذُوْا مِنْ ظَهْرِهٖ كَمَا يُؤْخَذُ بِالْمُشْطِ مِنَ الرَّاْسِ وَ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُمْ عُقُوْلًا كَنَمْلَةِ سُلَيْمَانَ وَاَخَذَ عَلَيْهِمُ الْعَهْدَ بِاَنَّهٗ رَبُّهُمْ وَاَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ. فَاَقَرُّوْا بِذٰلِكَ وَالْتَزَمُوْا وَاَعْلَمَهُمْ اَنَّهٗ سَيَبْعَثُ اِلَيْهِمُ الرُّسُلَ نَشْهَدُ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ. قَالَ اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ وَاَشْهَدَ عَلَيْهِمُ السَّمٰوٰتِ السَّبْعَ وَالْاَرَضِيْنَ السَّبْعَ. فَلَيْسَ مِنْ اَحَدٍ يُّوْلَدُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اِلَّا وَقَدْ اُخِذَ عَلَيْهِ الْعَهْدُ[2]۔

"کہ ذریت آدم حضرت آدمؑ کی پشت سے اس طرح نکالی گئی جس طرح سر کے بالوں میں سے کنگھا نکالا جائے اور اللہ نے ان میں عقل و ادراک کا مادہ پیدا فرمایا سلیمان علیہ السلام کی چیونٹی کی طرح (کہ جس نے اپنی جماعت کو لشکر سلیمانی دیکھ کر بلوں میں گھس جانے کا حکم دیا تھا) اور تمام ذریت سے عہدو پیمان لیا گیا کہ وہ ان کا رب ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ چنانچہ سب نے اس بات کا اقرار کرلیا اور اس کی پابندی قبول کی۔ اور اللہ نے ان کو یہ بتا دیا کہ وہ ان کی جانب رسولوں کو بھیجے گا۔ الغرض اس طرح ایک دوسرے پر گواہ ہوا ابی بن کعبؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے ان پر ساتوں آسمانوں (اور سات زمینوں کو بھی گواہ بنایا تو کوئی بھی شخص قیامت تک پیدا ہونے والا ایسا نہیں ہے، کہ جس سے یہ عہد و میثاق نہ لے لیا گیا ہو۔

اور ایک روایت میں ابی بن کعبؓ سے یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم پر تمہارے باپ آدم کو گواہ بناتا ہوں (کہ تم نے یہ اقرار کرلیا ہے) اور پھر

---

[1] موضح القرآن قدرے اختصار کے ساتھ۔

[2] تفسیر قرطبی جلد ۷۔

میں تمہارے پاس اپنے پیغمبر اور رسول بھی بھیجوں گا جو تم کو یہ عہد واقرار یاد دلائیں گے۔ دیکھو اب ایسا نہ ہو کہ تم قیامت کے روز یہ کہہ دو کہ ہم تو اس چیز سے غافل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص زمانہ بچپن میں قبل از بلوغ مر جائے وہ ناجی ہے[1]۔ کیونکہ اس کے ساتھ اس کی فطرت صحیحہ اور معرفت الٰہیہ موجود ہے۔ اور اس کے ہوتے ہوئے وہ نجات و رحمت کا مستحق ہے۔ اور بعد شعور و بلوغ کے کفر کرنے والا نافرمان و عاصی ہے اس وجہ سے مستحق عذاب ہے۔

بہرکیف انسان کا وجود بلکہ کل عالم حیوان اپنے جملہ احوال و کیفیات کے ساتھ حق تعالیٰ کی خالقیت اور اس کے کمال قدرت کی دلیل ہے کہ نوع انسانی و حیوانی کا وجود کس طرح جمادیت سے نباتیت کی طرف منتقل ہو پھر نشو و نما پاتے ہوئے حیوانیت و انسانیت کے مرحلہ میں داخل ہوتا ہے۔ انسانوں کے الوان و اشکال، اخلاق و عادات اور اختلاف السنہ اور اس کے اعضاء کی ساخت اس کے ادراک و شعور کے احوال قوائے فکریہ اور عقلیہ نظام خورد و نوش اور ہضم اور غذاؤں کا جوہر قوام بدن ہو جانا اور فضلہ کا خارج ہونا۔ یہ تمام وسیع نظام جو دنیا کے عقلاء و فلاسفہ کو حیرت میں ڈالنے والا ہے۔ خلاق عالم کے وجود و قدرت اور وحدانیت کے واسطے واضح دلیل اور روشن برہان ہے۔ جس میں کسی ایسے انسان کو ادنیٰ تردد کا امکان نہیں ہے جس میں کسی درجہ میں بھی عقل و شعور کا مادہ موجود ہو جیسے کہ ارشاد خداوندی ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ	اور بیشک اللہ کی نشانیوں میں سے تمہاری
وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ	زبانوں اور لغات کا اختلاف اور تمہاری
لِّلْعٰلِمِيْنَ۔	صورتوں اور شکلوں کا مختلف ہونا ہے،

[1] حضرات متکلمین نے اولاد مسلمین و مشرکین کے بارہ میں جو قبل از بلوغ و شعور انتقال کر جائیں ناجی ہونے کے قول ہی کو ترجیح دی ہے۔ اور کچھ متکلمین نے توقف اختیار کیا ہے۔ ۱۲

بے شک اس میں بڑی بڑی نشانیاں ہیں تمام

جہانوں میں ۔

اور یہ کہ انسانوں اور حیوانوں کا نظام معیشت کیسے کیسے عجیب اسلوبوں سے مرتب ہے ۔ حیوانات کے انواع اور ان کی جسمانی ساخت درندوں اور پرندوں کے احوال و اطوار اور خواص زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑے اور ان میں شعور اور حس و حرکت یہ سب کچھ دلائل کا ایک وسیع عالم ہے ۔ ہر ایک نوع پر اور اس کے احوال پر نظر کرتے رہو ۔ اور ہر ہر چیز کو دیکھ کر کہتے جاؤ :

وَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَهُ آيَةٌ تَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ وَاحِدٌ ۔

امام رازی رحمۃ اللہ اور علامۃ الدھر شیخ حسین جسر طرابلسی نے الرسالۃ الحمیدیہ فی حقیقۃ الدیانۃ الاسلامیہ و حقیقۃ الشریعۃ المحمدیہ میں یہ دلائل[1] بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں ۔ اہل علم حضرات اصل کی طرف مراجعت فرمائیں ۔

---

[1] اس موضوع پر انشاء اللہ مستقل رسالہ عنقریب ہی حضرات قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے گا جس میں انسانی وجود کے ظاہری و باطنی مادی اور روحانی احوال اور اس کے قوائے عقلیہ و فکریہ کے اطوار سے مستنبط ہونے والے عجائب و اسرار سے توحید خداوندی رسالت محمد رسول اللہ کے ثبوت اور اسلام کی حقانیت اور شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت و کاملیت اور اس پر بھی کہ دین و شریعت دنیا و آخرت کی فلاح و سعادت کا ذریعہ ہے دلائل قائم کیے جائیں گے ۔ انشاء اللہ ربی عز و جل ۔ ۱۲ ۔

دلائلِ آفاق

قرآن کریم نے حق تعالیٰ شانہ کی ہستی اس کی خالقیت و قدرت اور وحدانیت پہ دُوسری قسم کے دلائل جو قائم کیے وہ دلائل آفاق ہیں کہ کائنات عالم اور آسمان و زمین اور ان کے درمیان جملہ موجودات و مخلوقات کو دیکھ کر اور ایسے عجائب احوال کا مشاہدہ کر کے جو عقول انسانی کو حیرت میں ڈالنے والے ہیں جن کو دُنیا کا بڑے سے بڑا فیلسوف اور طبیعیات کا ماہر بھی ان کو مادی اسباب و علل پہ محمول کرنے سے عاجز ہے۔ ان موجودات کا مشاہدہ اور ان میں پیدا ہونے والے تغیرات سے خالق حقیقی کی خالقیت و قدرت پہ استدلال کرنا دلائل آفاق سے استدلال کہا جاتا ہے۔ اس موضوع پر قرآن کریم نے نہایت بسط و تفصیل اور تحقیق سے بنیادی اور تفصیلی مضامین اور دلائل کا ذکر فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں
وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ	اور رات و دن کے لوٹنے پلٹنے میں اور
وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ	ان کشتیوں میں جو سمندر میں چلتی ہیں وہ
بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ	سامان لے کر جو لوگوں کو نفع پہنچائے اور
اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ	اور جو کچھ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا
فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا	پھر جس سے زمین کو سیراب و شاداب
وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ کُلِّ دَآبَّةٍ	بنادیا بعد اس کے کہ وہ بنجر ہو چکی تھی
وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ	اور زمین میں ہر قسم کے چوپائے پھیلا دیئے
الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ	اور ہواؤں کے لوٹ پلٹ کرنے میں

لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ ۔ (سورۃ بقرۃ)

ان بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان مسخر اور اللہ کے تابع ہیں (غرض ان سب چیزوں میں) بڑی بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہوں (اور حقائق کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

غرض یہ کہ اہلِ عقل اگر آسمانوں اور اجرامِ فلکیہ پہ نظر کرکے یہ دیکھیں کہ یہ کیسا عجیب نظامِ قدرت ہے آسمان پہ ستارے کس ترتیب و نظام سے سجے ہوئے ہیں بعض ثوابت اور بعض سیارات و متحرک ہیں اور بارہ برج ہیں۔ ہر سیارہ کی حرکت کی مقدار اور زمانۂ مسافت اور حدودِ مسافت اور خطوطِ رفتار اور ان کے طلوع و سقوط کا وقت متعین ہے جس سے سرِ مُو تفاوت نہیں۔

آفتاب و ماہتاب کی جسامت ان کی عظمت و نورانیت اور نظامِ رفتار کس قدر عجیب ہے۔ آفتاب جب تک کرۂ ارض پر ہے تو دن ہے اور جب زمین کے نیچے آیا نورات ہوگئی۔ پھر آفتاب ہی کی شعاعوں اور اس کی حرکت سے موسموں اور فصول کی تبدیلی ہوتی ہے۔ ان تمام کواکب کا یہ نظامِ رفتار کیسے حسن اسلوب سے جاری ہے کہ کوئی ستارہ نہ کسی دوسرے سے ٹکراتا ہے نہ کوئی ایک دوسرے سے آگے پیچھے ہوتا ہے جو رفتار جس کی مقرر ہے اسی پر وہ چل رہا ہے:

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا
ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ
وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ
حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ
لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ

اور سورج اپنے ٹھہرنے کے مقام اور وقت تک کے لیے چل رہا ہے۔ یہ طے کردہ نظام ہے اس زبردست قدرت اور علم والی ذات خداوندی کا اور چاند کی بھی ہم نے منزلیں طے کردی ہیں یہاں تک کہ وہ آخر منزل میں

الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۔ (یٰسین پ ۲۳)

ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک پرانی سوکھی ٹہنی کی طرح نہ سورج کے لیے یہ ممکن ہے کہ چاند کو پکڑ لے اور نہ رات کو یہ قدرت ہے کہ وہ دن سے سبقت کر جائے۔ یہ سب ایک ایک گھیرے میں تیر رہے ہیں (جو ان کے واسطے مقرر کر دیا گیا ہے)

بہرحال یہ تمام ستارے اور آفتاب و ماہتاب اور ان کی نقل و حرکت سب کچھ اسی پروردگار عالم کے دست قدرت میں اس طرح گھری ہوئی ہے کہ دنیا کی تمام طاقتیں مل کر بھی اگر چاہیں کہ ان بے شمار سیارات میں صرف ایک ہی سیارہ کی حرکت کا رُخ ہی تبدیل کر دیں تو ہزار سر پٹخیں مگر عاجز ہو کر بیٹھ رہیں گے۔ اللہ رب العزت کی قدرت کاملہ اسی طرح ظاہر ہو کر رہے گی جیسے کہ حضرت ابراہیم کے ساتھ جب نمرود خدا تعالیٰ کی خدائی میں مناظرہ کرنے لگا اور بزعم خویش حق تعالیٰ کی ایک عطا کردہ نعمت اور عارضی بادشاہت کو اپنی ذاتی طاقت سمجھ کر کہنے لگا أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ کہ میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں، تو حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اس کی عاجزی اور حماقت کو ظاہر کرنے کے لیے فرمایا: إِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ ۔

کہ بے شک اللہ تعالیٰ سورج کو نکالتا ہے، مشرق سے (اگر تجھ کو اپنی قدرت کا دعویٰ ہے تو) تو اس سورج کو مغرب سے نکال لا۔

جس کا انجام یہ ہوا کہ:

فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ

کہ مبہوت و حیران رہ گیا یہ آدمی جس نے خدا کی خدائی کا انکار کیا۔

پھر آسمان کے نیچے دیکھو تو ابر ہے جو پانی سے بھرا ہوا ہوتا ہے جس کے ایک ایک ٹکڑے میں ہزارہا من پانی کا ذخیرہ ہے جو بغیر کسی مشین کی طاقت و مدد کے

آسمان و زمین کے درمیان معلق ہے۔ اس میں سے کبھی موسلا دھار بارش برستی ہے اور کبھی ایک ایک قطرہ ٹپکتا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ہوا مشرق کی سمت چل رہی ہے مگر بادل مغربی سمت کی جانب دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ ہوائیں کبھی تیز و تند ہیں اور کبھی پُرسکون اور کبھی ایسا حبس کہ درخت کا پتہ بھی نہیں ہلتا۔ آخر مادہ پرست بتائیں کہ یہ احوال کن اسباب و علل پر دائر ہیں اور کون سے مادّہ اور طبیعت کا تقاضا ہے جس پر یہ مختلف ثمرات اور زمین و آسمان کا تفاوت مُرتب ہو رہا ہے۔ دُنیا کے فلسفی ان میں سے کسی ایک امر کا بھی کوئی سبب تجویز نہیں کر سکتے۔ اوہام و ظنون کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں لیکن حل کچھ نہیں ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خُدا ملتا نہیں
ڈور کو سُلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

اس راز کو حکمت یونانیاں حل کرنے سے عاجز و قاصر ہے۔ اس گتھی کو سلجھانے کا ذریعہ صرف حکمت ایمانیاں ہی ہے۔

زمین کے قطعے اپنے رنگ و رُوپ، مزاج و خواص میں مختلف پہاڑوں کے رنگ عجیب و غریب۔ ایک ہی زمین ہے جس پر بارش کا پانی برستا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا مزاج رنگ اور اثر سب ایک لیکن اس سے پیدا ہونے والے پھل اور پھُول کس قدر متفاوت کہ حد و انتہا نہیں۔ اسی کو حق تعالیٰ شانہٗ نے ارشاد فرمایا:

وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ	اور زمین میں طرح طرح کے ٹکڑے ہیں جو
وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ	ایک دُوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور باغات
وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ	ہیں انگوروں کے اور کھیت ہیں اور درخت
یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ	ہیں کھجوروں کے ایک جڑ پر دو شاخوں والے
بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُکُلِ اِنَّ	ہیں اور الگ الگ جڑ والے بھی ہیں جن کو

فِيْ ذَالِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ ۔

ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے لیکن (ہم اس کے باوجود) مزے میں ایک کو دوسرے پر بڑھاتے ہیں بیشک ان سب باتوں میں (قدرت خداوندی کی بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں ۔

(سورۃ الرعد پ ۱۳)

اِسی طرح ارشاد فرمایا گیا :

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا اِنَّ فِيْ ذَالِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ

(اے دیکھنے والے) کیا تو نے نہیں دیکھا، کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے چشمے بنا دیئے زمین میں پھر اس پانی سے رنگ برنگ کی کھیتیاں پیدا فرماتا ہے ۔ پھر جب وہ کھیتی پک جاتی ہے ۔ تو اس کو دیکھتا ہے کہ زرد ہوگئی ہے پھر اللہ تعالیٰ اس کو سکھا کر چورہ چورہ کر دیتا ہے بے شک ان تمام باتوں میں بڑی سی عبرت و نصیحت کا سامان ہے عقل والوں کے لیے ۔

(سورۃ الزمر پ ۲۳)

دلائل قدرت کے اسی سلسلہ میں حق تعالیٰ نے فرمایا :

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذَالِكَ ۔

اے دیکھنے والے کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس پانی سے ہم نے مختلف رنگوں کے پھل پیدا کیے اور اسی طرح پہاڑوں کی گھاٹیاں (اور طبقے) بنائے کچھ تو ان میں سفید رنگ کے اور کچھ سرخ اور کچھ کالے بھجنگ اور اسی طرح آدمیوں اور جانوروں اور چوپاؤں کے بھی

(سورۃ فاطر پ ۲۲)

ہم نے طرح طرح کے رنگ برنگ بنائے۔

کہیں یہ فرمایا:

وَاِنَّ لَکُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَۃً نُسْقِیْکُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِہٖ مِنْ بَیْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِّلشَّارِبِیْنَ۔ وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِیْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْہُ سَکَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔

(سورۃ النحل پارہ ۱۴)

اور بے شک چوپاؤں میں بھی اے لوگو! تمہارے واسطے سوچنے اور عبرت کے بہت مواقع ہیں کہ ہم ان کے پیٹوں میں جو چیزیں ہیں گوبر اور خون میں سے ایک خالص دُودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے نہایت ہی مزے دار اور سہل ہوتا ہے۔ اور اسی طرح کھجور اور انگور کے پھلوں میں سے تم شراب بناتے ہو اور بہتر قسم کا رزق بھی (یعنی کھانے کا سامان) یقیناً اس چیز میں قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہوں۔

دُنیا کے مدعیانِ عقل مادہ پرست اور طبیعیات کے ماہرین اس امر کا راز اور وجہ بتانے سے عاجز ہیں کہ کس عجیب نظام کے ساتھ خون اور گوبر کے درمیان سے نہایت پاکیزہ اور خوشگوار دُودھ نکل رہا ہے۔ نہ دُودھ میں قدرتِ خداوندی خون کی رنگت کا ادنیٰ سے ادنیٰ اثر آنے دیتی ہے اور نہ ہی گوبر کا مزہ اور بدبو کا کوئی اثر اس میں آرہا ہے۔

دلائل قدرت کا یہ وسیع بیان تمام قرآن کریم میں از اوّل تا آخر پھیلا ہُوا ہے اور حق تعالیٰ نے قدرت کی یہ نشانیاں اور دلائل اس انداز کے ساتھ ذکر فرمائے ہیں کہ عقلی اور فکری نقطۂ نظر سے انسان کے واسطے کوئی گنجائش نہ چھوڑی گئی کہ وہ پھر بھی ایمان نہ لائے۔ ان آیات سے جو انواع دلائل مستنبط ہیں ان کے لیے بھی ایک مستقل تالیف کی ضرورت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ فرعون کی حجت بازی

فرعون خدا کا منکر تھا۔ امام رازی رحمۃ اللہ نے سورۃ طٰہٰ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ فرعون دہری تھا کیونکہ اس کا یہ کہنا کہ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرِيْ "کہ میں اپنے سوا تمہارے لیے کوئی خدا نہیں سمجھتا اور اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کسی خدا کا قائل ہی نہ تھا کیونکہ یہ بات تو کوئی کم سے کم عقل رکھنے والا بھی تصور نہیں کرسکتا کہ وہ خدا کا قائل ہونے کے بعد اپنے لیے بڑا خدا ہونے کا مدعی تھا۔ بلکہ اصل منشا یہی تھا کہ خدا کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ جو جس کی تربیت کرنے والا ہے وہی اس کا رب ہے۔ اولاد کو ماں باپ پالتے ہیں تو والدین ان کے رب ہوں گے۔

حاکم رعایا کی تربیت اور ملک کی نگرانی کرتا ہے تو وہ رعایا کا رب ہے، اور بادشاہ سب سے بڑا حاکم ہے تو اس وجہ سے وہ سب سے بڑا رب ہوگا تو اس طرح فرعون نے یہ دعویٰ کیا اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى کہ میں ہی تمہارا سب سے بڑا رب ہوں اور کہا کہ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرِيْ۔ اور اس کا عقیدہ تھا کہ آسمان و زمین اور یہ تمام عالم قدیم ہے۔ اسی طرح ازل سے سلسلہ چلا آرہا ہے اور یہی سلسلہ ابدالآباد تک قائم جاری رہے گا۔ اور عالم میں موت و حیات اور تغیرات کا جو سلسلہ جاری ہے وہ سب کچھ کواکب و نجوم کی تاثیر سے ہے۔ نہ کوئی خدا ہے اور نہ کسی خدا کی قدرت و ارادہ کی بنا پر ہے۔ فرعون کے اس فاسد اور لغو عقیدہ کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تردید

ل؎ تفسیر کبیر ج ۶ ۔ فرعون کے دہری ہونے کے لیے دلائل متعدد مواقع پر بیان کیے گئے تفسیر مظہری کی بھی اہل علم مراجعت فرمائیں ۔ ۱۲۔

فرمائی، جب کہ وہ حضرت ہارون علیہ السلام کی معیت میں فرعون کو حق کی دعوت دینے کے لیے آئے اور فرعون نے ان سے ردّ و قدح کی تو ایسے ہی دلائل سے فرعون کو لاجواب اور مبہوت کیا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے جاتے ہی اعلان فرما دیا:

اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ — کہ ہم رسول ہیں رب العالمین کے۔

تو فرعون نے نہایت ہی تعجب کے انداز میں دریافت کیا:

وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ — اور رب العالمین کیا چیز ہے؟

یعنی رب العالمین کی پہلے تم حقیقت بتاؤ کہ وہ کیا ہے کہ جس رب کے تم اپنے کو رسول اور فرستادہ پیغمبر بتاتے ہو۔ اس ذات کو سمجھاؤ تاکہ اس کے بعد تمہارے مسئلہ رسالت پر غور کیا جا سکے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا:

قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ — موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا، جس خدا نے مجھ کو رسول بنا کر بھیجا وہ ذات ہے جو آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان کا رب ہے اگر تم یقین کرنا چاہتے ہو۔

مقصد یہ کہ اگر تم یقین و معرفت چاہتے ہو وجود خداوندی اور اس کی قدرت کا علم حاصل کرنے کے لیے بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ وہ ایسی ذات والاصفات ہے کہ اس نے یہ بڑے بڑے اجسام یعنی آسمان و زمین پیدا کیے۔ اور ان کے درمیان تمام مخلوقات کو اسی نے وجود عطا فرمایا وہی ان چیزوں کا خالق و مربی ہے حقیقت یہ ہے کہ وہی خدا اور رب ہو سکتا ہے نہ یہ کہ چند روزہ اقتدار اور مخصوص خطۂ زمین کا انتظام کرنے والا حاکم یہ دعویٰ کرے کہ وہ رب اور خدا ہے۔

فرعون اس معقول اور وزنی استدلال کو سُن کر بڑی ہی جہالت کا ثبوت دیتے ہوئے مغرورانہ انداز میں کہنے لگا ۔

قَالَ لِمَنْ حَوْلَهُ أَلَا تَسْتَمِعُونَ فرعون نے کہا اپنے اردگرد بیٹھنے والوں کو اے لوگو! کیا تم نہیں سُن رہے ہو ، (کہ یہ کیسا جواب ہے ۔)

ازراہِ تمسخر گویا یہ کہہ رہا ہے کہ اے لوگو سنو تو سہی یہ موسیٰ کیا کہتے ہیں کہ آسمان وزمین کا ربّ اور پالنے والا وہی ربّ اور خدا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص آسمانوں اور زمین کا کسی ذات کو صانع اور پیدا کرنے والا تصوّر کر رہا ہے ۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے جب یہ دیکھا کہ یہ تو نہایت غبی شخص ہے اور آسمان وزمین کی پختہ عمارت چونکہ اس کی پیدائش سے بہت پہلے ہے تو اس وجہ سے ان چیزوں کی پیدائش و حدوث کا منکر ہے ۔ اور عقل وفہم سے اس قدر دُور ہے کہ ایسی عظیم اور پختہ عمارت کے بنانے والے کا اعتقاد اور اس پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تو حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے وجود صانع کے لیے ایک ایسی چیز سے استدلال پیش کیا جس کے احوال تغیر اور حدوث کا خود فرعون مشاہدہ کرتا ہے ۔ اور اس حدوث میں اس کے واسطے کسی قسم کے بھی خفا اور تردّد کی گنجائش نہیں ہو سکتی ۔ تو فرمایا :

رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ ۔ کہ اے فرعون وہ خدا تم سب کا اور تمہارے آباء اوّلین (پہلے باپ دادوں) کا ربّ ہے (جس نے تم سب کو عدم سے وجود عطا کیا ۔

مُراد یہ تھی کہ یہ بات تو ظاہر ہے کہ اے فرعون تو خود ہمیشہ سے موجود نہ تھا بلکہ ایک مخصوص وقت میں عدم سے تو وجود میں آیا ۔ ایک وقت تھا کہ تیرے

آباؤ اجداد تھے جو آج اس وقت موجود نہیں۔ آخر سوچ تو سہی تیرے بزرگوں کو، کونسی وہ قدرت تھی جس نے وجود سے فنا کے گھاٹ ان کو اتار دیا اور کونسی وہ طاقت ہے جو تجھ کو عدم سے وجود میں لے آئی۔ اور جس طرح تیرے آباؤ اجداد آج دنیا میں نہیں رہے۔ کل تو بھی اسی طرح فنا کا راستہ اختیار کرے گا۔ تو بس سمجھ لے کہ وہی ذات قادر مطلق جس کے یہ تمام کرشمہائے قدرت تیرے سامنے ہیں وہی خدائے برتر رب العالمین ہے اور میں اسی رب العالمین کا رسول ہوں۔

الغرض جب اس واضح اور قطعی حجت کے سامنے فرعون عاجز ہوا تو جھنجھلا کر کہنے لگا:

اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْۤ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ۔	(اے لوگو!) یقیناً یہ تمہارا رسول، جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے بالکل ہی دیوانہ ہے

اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اور ایک فیصلہ کن حجت پیش کرنے کے طور پر اس طرح جواب دیا:

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ مَا بَیْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ	کہ وہ رب ہے مشرق اور مغرب کا اور ان تمام چیزوں کا جو ان کے درمیان ہیں

کہ اگر تو آباؤ اجداد کے وجود و فنا اور تغیرات کو اور خود اپنے متعلق عدم سے وجود میں آنے کا مسئلہ نہیں سمجھتے پر قادر ہے اور زمانوں اور قرنوں کے تغیرات تجھ کو نہیں محسوس ہوتے تو ایک ہی دن رات میں سورج کے طلوع و غروب اور مشرق و مغرب کے مابین موجودات کے تغیرات و انقلابات تو ہر روز تیری نظروں کے سامنے ہیں تو ان ہی چاند و سورج اور مشرق و مغرب اور ان کے درمیان تمام موجودات کا مالک ہی رب العالمین ہے۔ جس سے تو خود سمجھ سکتا ہے کہ زمانہ اور احوال زمانہ موسموں کی تبدیلی لیل و نہار کا انقلاب ان چاند و سورج اور کواکب سے کیا ہو سکتا ہے۔ یہ سب خود ہی اللہ کے

قبضۂ قدرت میں ہیں تو ان کو اُگا۔ اور چاند و سورج کا مالک ہی رب العالمین ہے جس نے مجھے رسول بنا کر بھیجا۔ اگر وہ رب العالمین شمس و قمر کو روشنی نہ بخشتا اور ان میں کھیتیوں کو پکانے کی خاصیت نہ رکھتا تو یہ کھیتیاں کہاں پکتیں۔ کیا تمہارے میں یہ قدرت و طاقت تھی کہ اپنے مادی وسائل و اسباب سے غلے اور پھل اُگا لیتے اور ان کو پکا لیتے۔ یہ سب کچھ رب العالمین ہی کی شان ربوبیت ہے کہ وہ جملہ انواع و اجناس اور تمام اشخاص و افراد کو محیط ہے تو رب العالمین کا لفظ بول کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی شان ربوبیت کو ظاہر فرمایا۔ پھر "رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا" سے یہ بتا دیا کہ اس کی ربوبیت تمام امکنہ اور جہات کو احاطہ کیے ہوئے ہے کہ عالم کا کوئی گوشہ اس کی خدائی اور قدرت سے خارج نہیں ہے۔

اس کے بعد تیسری مرتبہ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا فرما کر یہ ظاہر کر دیا کہ حق تعالیٰ کی ربوبیت تمام اوضاع و اطوار اور حالات اور جملہ تغیرات اور ہر نوع کی کیفیات کو حاوی اور محیط ہے۔[1]

---

[1] حضرات عارفین سے یہ منقول ہے کہ ارواح کے کانوں میں سب سے پہلے جو ندا پہنچی وہ وصف ربوبیت ہی کا نغمۂ جانفزا تھا اور سب سے اوّل اسی وصف سے خدا کو پہچانا جیسا کہ ارشاد مبارک ہے واذ اخذ ربك من بني آدم من ظهورهم ذريتهم واشهدهم على انفسهم الست بربكم قالوا بلىٰ۔

تو حق تعالیٰ شانہ نے سب سے پہلے اسی وصف ربوبیت سے مشتق عنوان یعنی اسم رب کے ساتھ ارواح کو مخاطب کیا اور اسی نام سے ان سے عہد اور میثاق لیا۔ بظاہر یہی وجہ ہے کہ اوّل سے لے کر خاتم الانبیاء والمرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک اللہ کے تمام پیغمبر و رسول اور اسی طرح خدا کے تمام عباد مخلصین اور برگزیدہ بندے دعاؤں اور مناجاتوں میں خدا کو رَبَّنَا رَبَّنَا کہہ کر ہی پکارتے رہے۔ اور ایک مقام پر رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ[2] کے سلسلۂ آیات میں رَبَّنَا کے از حاشیہ: اگلے صفحہ پر دیکھیں

[2] (آل عمران)

الغرض حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان دلائل قاہرہ کے سامنے فرعون جب لاجواب بلکہ بے بس و لاچار اور مبہوت ہوا تو بدحواسی اور بوکھلاہٹ کے عالم میں کہنے لگا :

لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِىْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ — کہ اے موسیٰ اگر آپ تم زائد ہوئے اور میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تم کو جیل خانہ میں ڈال دوں گا۔

طاقت اقتدار کے گھمنڈ میں مغرور و بدمست انسان جب دلائل کی قوت و شوکت کے سامنے عاجز ہو جاتا ہے تو پھر اس کا شیوہ یہی ہوتا ہے کہ دھمکیوں سے مرعوب کرنا چاہتا ہے۔

مگر تاریخ عالم میں اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اقتدار و شوکت اور جاہ پسند حکمرانوں کی طاقتیں حق کے مقابلہ سے عاجز رہیں اور حق کی قوت اور غلبہ نے یہ دکھا دیا کہ :

اَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ۔ — بہرکیف (پانی کی سطح پر ابھرنے والا) جھاگ وہ مٹ ہی جایا کرتا ہے اور جو چیز لوگوں کے لیے نافع ہوتی ہے۔ وہ ٹھوس ہونے کی وجہ سے زمین کی تہہ میں پہنچتی ہے، اور ٹھہرتی ہے۔

(سورۃ الرعد پ ۱۳)

سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف پیغام توحید دے کر بھیجا، یہ کہ خداوند عالم کی ربوبیت پر ایمان لائے۔ چنانچہ فرمایا گیا۔ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى — کہ اے موسیٰ فرعون کی طرف جاؤ کیونکہ وہ بہت سرکش ہو چکا ہے۔

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) عنوان سے دعا کرنے والوں کو اُولوالالباب یعنی صاف ستھری اور ٹھوس عقل رکھنے والے فرمایا گیا۔

توحضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے جاکر حق تعالیٰ شانہ کی خالقیت وقدرت اور ربوبیت ثابت کرنے کے واسطے اسی طرح کے دلائل بیان کیے جیسے دلائل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے مقابلہ میں قائم کیے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام دعوت حق لے کر فرعون کے پاس گئے تو اسی بنیادی عقیدہ کو آغاز گفتگو کا عنوان بنایا اور اس منکر خدا و مدعی ربوبیت کو اس طرح مخاطب فرمایا:

اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ ۔ (طٰہٰ) — بیشک ہم دونوں تیرے رب کے رسول ہیں۔

تاکہ آغاز گفتگو ہی فرعون کے دعوائے خدائی کو باطل کرنے والے عنوان سے ہو۔ کہ اے وہ فرعون جس کا گمان اور دعویٰ ہے کہ میں اپنے سوا کوئی خدا ہی نہیں جانتا ہم دونوں تیرے ربّ کے رسول و قاصد ہیں۔ اس کا پیغام لے کر تیرے پاس آئے ہیں۔ فرعون اس عنوان پر چونکا اور کہا:

فَمَنْ رَّبُّكُمَا يَا مُوْسٰى — کہ اے موسیٰ پھر تم دونوں کا ربّ کونسا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا:

رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى۔ — کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کا وجود عطا کیا۔ پھر شی کو (اسباب بقاء کی طرف) رہنمائی فرمائی۔

اسی کا یہ اثر ہے کہ بچہ شکم مادر سے نکلتے ہی دودھ کے لیے ماں کے پستان ڈھونڈنے لگتا ہے اور مرغی کا بچہ زمین پر چونچ مارتا ہے۔ اور ہر جانور ابتداءً پیدائش ہی سے یہ علم رکھتا ہے کہ اسے کونسا گھاس کھانا چاہیے اور کونسا نہیں۔ کس درخت کے پتے اس کے لیے مفید ہیں اور کس درخت کے مضر ہیں اور جانور جب بیمار ہوتا ہے تو خود ہی اپنا علاج کر لیتا ہے حتیٰ کہ مکھی اور مچھر بھی اپنی تدابیر سے غافل نہیں۔ حالانکہ ان جانوروں نے نہ تو کسی نباتات کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی ہے اور نہ ان کے پاس کسی طبی ادارہ اور میڈیکل کالج کی سند ہے۔ تو یہ خداوند عالم

ہی کی ہدایت کا کرشمہ ہے جو اس طرح رونما ہے۔

فرعون اس دلیل کو سن کر جب لاجواب و بدحواس ہوا تو عنوان بدل کر بولا

فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی — تو اچھا بتاؤ پہلے قرون کے گذرے ہوئے لوگوں کا کیا حال ہے۔

یعنی تم تو کہتے ہو اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰی کہ عذاب سر اس شخص پر ہے جو خدا کو جھٹلائے اور اس کی فرمانبرداری سے روگردانی کرے تو پہلے لوگ بھی صدہا برس سے اسی مذہب پر تھے کہ خدا کا انکار کرتے اور بت پرستی کرتے تھے تو پھر ان لوگوں کا حال کیا ہے۔ جنہوں نے پیغمبروں کی تکذیب کی تمہارے قول کے مطابق تو ان پر عذاب آنا چاہیے تو بتاؤ ان پر کیا قہر اور عذاب آیا۔
اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَ لَا یَنْسَی الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ سَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی كُلُوْا وَ ارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی۔

کہ ان کا علم تو میرے پروردگار کے یہاں لکھا ہوا (ایک کتاب میں) جو پروردگار نہ تو غلطی کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے جس پروردگار نے زمین کو تمہارے واسطے بستر بنایا اور اس میں تمہارے واسطے چلنے کے راستے بنائے اور آسمان سے پانی اتارا (تاکہ تم زندہ رہ سکو) پھر ہم نے اس پانی کے ذریعہ طرح طرح کے نباتات (یعنی سبزے پھل اور غلے وغیرہ) پیدا کیے کہ خود تم بھی کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ۔ بیشک اس تمام نظام میں قدرت خداوندی کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں اہل عقل کے واسطے۔

مقصد یہ تھا کہ پہلی امتوں پر کیا کیا عذاب نازل ہوئے اور اس کی تفصیلات کیا ہیں

اور ان کا راز کیا ہے یہ سب باتیں اصل مقصد سے بعید اور بے تعلق اور لایعنی باتیں ہیں ان کی سب تفصیل میرے اس پروردگار کے یہاں لکھی ہوئی موجود ہے جس کی بارگاہ میں نہ غلطی کا امکان ہے اور نہ بھول چوک کا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اے فرعون تو خدا کی اس قدرت و حکمت کے کرشموں میں غور کر اور عقل سے کام لے تو خود تجھ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کارخانہ عالم اور اس کا یہ عظیم الشان عجیب و غریب نظام حق تعالیٰ ہی کی کمال قدرت اور حکمت سے قائم ہے اور وہی رب ہے تمام عالم کا جس کے ہم قاصد و رسول بن کر تیرے پاس آئے ہیں۔

اور خدائی کے قابل وہی ذات ہو سکتی ہے جس کے قدرت اور علم و حکمت کے یہ کرشمے ہوں تو اے فرعون آخر بتا تو ان چیزوں میں کس چیز کا مالک ہے؟ جب ان چیزوں میں کوئی بھی چیز تیرے علم اور احاطۂ قدرت میں داخل نہیں تو پھر کس منہ سے دعوائے خدائی کرتا ہے۔

مادہ پرستوں کے مقابلہ میں علامہ جسر طرابلسی کا فیصلہ کن استدلال

علامۃ الدہر شیخ حسین آفندی جسر طرابلسی نے اپنی کتاب الرسالۃ الحمیدیہ میں دہریین اور مادہ پرستوں کے خلاف دلائل باہرہ ذکر کرتے ہوئے عالم انسان عالم حیوانات، عالم نجوم و کواکب پر تفصیلی بحث کی ہے اور ان عالموں کی حیرت انگیز وسعت اور عجائب قدرت اور اسرار و لطائف بیان کر کے حق تعالیٰ شانہ کی قدرت اور خالقیت پر جس طرح دلائل قائم کیے وہ اہل علم کے لیے علوم و معارف اور حقائق کا عظیم خزانہ ہے۔ اسی سلسلہ میں عالم نباتات کے احوال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نباتات کا عالم بھی ایسے عجائب و غرائب پر مشتمل ہے، اور ایسا محکم اور منضبط نظام اور اس کے اسرار و حکمتوں نے دنیا کے عقلاء کو حیرت میں ڈال رکھا ہے اور یہ تمام باتیں ایسی وسیع ہیں کہ ان کا احاطہ طاقت بشری

سے خارج ہے۔ چنانچہ ایک اجمالی نظر ڈالنے ہی سے نظر آئے گا نباتات کی قسموں میں سے بعض قسم ایسی ہیں کہ زمین پر بچھی ہوئی ہیں بعض سطح زمین سے بلندی کی طرف اُبھرنے والی ہیں کسی کی بلندی ہاتھ دو ہاتھ تک ہے بعض تنا ور درخت ہیں اور بعض صرف باریک تنکوں کی طرح ہیں اور کوئی ایک پتی ہی ہے۔ کوئی جڑی ہوئی پتیوں کا نظر آرہا ہے۔ کسی پر پھول ہیں کسی پر پھل ہیں۔ پھر پھولوں اور پھلوں کی قسمیں دیکھیے کہ کس قدر ہیں۔ پھولوں کے رنگ اور ان کی خوشبوؤں پر غور کریں۔ یہ بھی دیکھیں کہ بعض پھول دُوسرے بعض سے رنگت اور وضع میں بالکل مشابہ ہیں لیکن ہر ایک کی خوشبو جُدا ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ پھولوں کی خوشبوؤں میں بھی انواع و اقسام کی کثرت حیرت انگیز ہے۔ کسی کی خوشبو لطیف ہے تو کسی میں کثافت ہے اور کسی میں ناگوار بُو بلکہ بدبو ہے پتوں کی رنگتیں ان کی وضع اور ہیئت۔ ان کی نرمی اور خشونت۔ ان میں رنگوں کی آمیزش، ان کا طویل و عریض یا مستدیر ہونا۔ پھر پتوں اور سبزوں میں بعض غذا اگر ایک طرف انسان ان سے لذیذ انواع و اقسام کے کھانے تیار کر رہا ہے تو دوسری طرف حیوانات و بہائم دن رات ان کو چر رہے ہیں اور خداوند عالم کے اس فرمان مبارک "كُلُوا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ" کی شان ہر گھر بازار اور سبزہ زار میں نظر آرہی ہے۔ اور بعض دوا ہیں تو بعض ایسے ہیں جن سے مختلف قسم کے تیل کشید کیے جارہے ہیں۔ ایک طرف ان ہی پتوں سے تلخ عرقیات اور کثیف تیل کشید ہو رہے ہیں تو دُوسری طرف انہی پتوں اور پھلوں و پھولوں سے شہد کی مکھیاں عرق چوس چوس کر الیسا بہترین اور خوشگوار شہد اللہ کے حکم سے دُنیا کو پلا رہی ہیں کہ جس شہد میں بے شمار بیماریوں کا علاج اور غذاؤں کا بہترین جوہر ہے بعض ایسے ہیں کہ ان پر بیج لگتے ہیں اور کچھ زمین پر پھیلتی ہوئی بیلیں ہیں کہ ان پر خربوزہ تربوز جیسے وزنی اور جسیم پھل آتے ہیں۔ بعض بوٹیاں اور نباتات ایسے ہیں کہ ان میں اس طرح دُودھ ٹپکتا ہے جیسے دُودھ والے جانوروں کے تھن سے دودھ

ٹپکتا ہو۔ صرف نارجیل (ناریل) کے ایک درخت ہی کو دیکھ لیجیے کہ وہ اللہ ربّ العزّت کی بے پایاں قدرتوں کا کرشمہ اس میں کس طرح ظاہر ہے کہ اس سے فوائد و منافع حاصل ہونے والے کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے کہ ناریل کا پھل کھایا بھی جاتا ہے۔ دواؤں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس سے تیل بھی نکل رہا ہے۔ اس کے خول کے توڑنے پر اس میں سے صاف و شفاف پانی بھی جو نہایت صحتمند ہے نکل رہا ہے اور اسی میں سے دودھ کی طرح سیال عرق بھی نکلتا ہے۔ اس کی کونپل اور کلیوں سے مختلف قسم کے مشروب تیار ہوتے ہیں اس کے پتے بعض علاقوں میں ترکاریوں کی طرح پکائے بھی جاتے ہیں۔ اس سے چٹائیاں بُنی جاتی ہیں۔ اور سائبان و پردے بھی۔

اس کی چھال اور ریشوں سے رسیاں بن رہی ہیں۔ تھیلے تیار ہو رہے ہیں۔ ٹہنیاں اور لکڑیاں چھتوں میں استعمال کی جا رہی ہیں۔ انہی سے ایندھن اور سوختہ کا کام بھی لیا جا رہا ہے۔ کہیں اس کے پتوں سے روشنائی تیار ہو رہی ہے اور کاغذ بھی بن رہے ہیں۔

غرض یہ صرف ایک درخت ہے جس کے فوائد و منافع انسانی نظامِ زندگی کے کس قدر شعبوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ انسان سوچے اور غور کرے کہ یہ سب کچھ کسی مدبّر و حکیم اور دانا خالق کے بغیر کیونکر ممکن ہے۔ یہ محیّر العقول نظام کیا کسی بے حس و بے شعور مادہ اور طبیعت کا اقتضاء ہے اور یہ سب کرشمہ سازیاں اور حیرت انگیز محض بخت و اتفاق ہیں۔ یہ بے شمار مختلف رنگوں اور خاصیتوں والے سبزے ایک ہی پانی سے اور ایک ہی زمین سے اُگتے ہیں۔ منکرین خدا بتائیں تو آخر ایک زمین جو اپنے جوہر کے لحاظ سے واحد ہے اور ایک پانی جو اپنے مزاج و خاصیت میں یکساں ہے۔ آخر اس قدر مختلف رنگ اور خواص اور ذائقوں والے پھل و پھول کیسے پیدا ہوئے۔ حق تعالیٰ شانہ نے اسی امر کو اس لفظ میں واضح فرمایا:

يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ

کہ یہ سب نباتات ایک ہی پانی سے سیراب کیے جاتے ہیں لیکن مزے میں ہم کسی کو کسی پر فضیلت و برتری بخشتے ہیں۔

علامہ آفندی کہتے ہیں کہ ماہرینِ نباتات نباتات کی جن قسموں کی تحقیق کرسکے اور ان کا علم ان کو ہوسکا وہ اسّی ہزار اقسام سے متجاوز ہیں۔

علمِ طب میں مفردات کے موضوع پر جو ضخیم ترین کتابیں موجود ہیں، ان کو دیکھ کر عالمِ نباتات کی وسعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور جڑی بوٹیوں کے جو خواص و تاثیرات ذکر کی گئی ہیں ان پر نظر ڈالنے کے بعد اللہ کی خالقیت اور اس کی قدرت پر ہر ایسا شخص ایمان لانے پر عقلاً اور فطرۃً مجبور ہوجاتا ہے جس کو ادنیٰ درجہ کی بھی عقل و شعور حاصل ہو۔ اگر اس کے باوجود بھی کوئی شخص خداوندِ عالم کی خالقیت و قدرت پر ایمان نہیں لاتا تو وہ یا تو آخری درجہ پر پہنچنے والا دیوانہ ہے۔ یا انتہائی معاند و متعصب ہے، دیدہ و دانستہ اس طرح خدا کا انکار کر رہا ہے جیسے کوئی شخص عین دوپہر کے وقت جب کہ سورج کا نور اور اس کی شعاعیں عالم کو منور کر رہی ہوں یہ احمق سورج کے وجود کا انکار کر رہا ہو۔

نباتات کے ماہرین کو تو سب سے پہلے قدرتِ خداوندی پر ایمان لانا چاہیے[1]۔

---

[1] کچھ عرصہ ہوا میں سیلون (لنکا) کے علاقہ میں گیا ہوا تھا۔ وہاں کے تمام علاقوں کا دورہ کیا ایک پہاڑی علاقہ میں پہنچنے پر یہ معلوم ہوا کہ وہاں ایک ایسی گھاس ہے کہ انسان کے بدن پر اگر لگ جائے تو جسم کا خون کھینچنا شروع کر دیتی ہے اور اس گھاس کی نوک بدن پر اس طرح پیوستہ ہوجاتی ہے کہ اگر بدن سے اس کو جدا کرو تو اوپر سے ٹوٹ جائے گی اور نوک بدن پر چمٹی رہے گی اور اسی نوک کے پیوستہ رہنے سے بدن سے خون بہنے کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اور جب تک آدمی کے جسم میں خون کا کوئی قطرہ باقی ہے اس گھاس کا یہ عمل (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

کیونکہ ان کے سامنے قدرت کے یہ کرشمے ہیں۔ تفسیر کبیر میں امام رازی رحمۃ اللہ نے بیان فرمایا کہ کسی طبیب سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ تم نے اپنے رب کو کس بات سے پہچانا۔ جواب دیا ہلیلہ سے پہچانا ہے کہ یہ سرد اور خشک ہے اور اسہال زائی ہے لیکن اس کا لعاب تر ہے اور وہ قبض کرتا ہے۔

کسی حکیم نے کہا کہ میں نے خدا کو شہد کی مکھی سے پہچانا ہے کہ ایک طرف اس کے نوش ایپے یعنی نہایت شیریں اور خوشگوار شہد اور دوسری طرف اس کے نیش یعنی ڈنک ہے، دیکھیے کہ صانع حکیم کی کیسی صناعی اور کاریگری ہے کہ ایک چھوٹی سی مکھی اوّل تو وہ اپنی کارکردگی میں ایک عظیم الشان فیکٹری سے بھی بڑھ کر ثابت ہو رہی ہے کہ اس میں پھلوں پھولوں اور پتوں کے رس پہنچ رہا ہے اور پھر اس کے معدہ میں جانے کے بعد شہد بن کر نکل رہا ہے۔ ایک جانب سے یہ میٹھا اور خوشگوار شہد نکل رہا ہے تو اسی مختصر سی مکھی کی دوسری جانب سے ایک تیز ڈنک ہے۔ بڑے سے بڑے توانا آدمی کے بھی مارے تو وہ بھی بے چین ہو جائے۔

لغت عرب کے لطائف بھی عجیب ہیں۔ شہد کے لیے لغت عَسَل مقرر کیا تو ڈنک مارنے کے لیے اسی مادہ کو الٹا کر لَسَع تجویز کیا کیونکہ شہد کی مکھی سے بھی سیدھی طرف سے عَسَل ہے تو اس کی اُلٹی طرف سے لَسَع، یعنی ڈنک مارتا ہے۔

(بقیہ پچھلے صفحہ کا حاشیہ) جاری رہے گا۔ ان پہاڑیوں پر رہنے والوں کا طریقہ یہ ہے کہ جب کبھی وہ گھاس لگ جائے اس کو بدن کی کھال پر سے جلا دیتے ہیں کہ کھال کا اتنا حصہ بھی جل جائے جس میں گھاس کی نوک چپیاں ہے۔

سبحان اللہ کیا خدا وند عالم کی قدرت ہے۔ گھاس کا ایک باریک ریزہ لیکن اس کی قوت تاثیر کا یہ عالم کہ انسان کے رگ و ریشہ سے خون جوش رہا ہے۔

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ۔

عالم حیوانات بھی ایک نہایت وسیع عالم اور قدرت خداوندی کے دلائل کا ایک ناپیدا کنار سمندر ہے۔ برو بحر کے جانور کے انواع واقسام ان کے الوان واشکال ان کے احوال و اطوار اور ان کے مزاج وخواص اور ان کے معاشی اور انکسابی کے طور وطریق یہ تمام باتیں جن کی تفصیل کے لیے ایک مستقل کتاب چاہیے۔ ان میں سے ہر ایک جانور حتی کہ ایک چیونٹی خدا کی خالقیت اس کی قدرت وحکمت کی عظیم تر دلیل ہے۔ ایسا چھوٹا سا حیوان، کہ غور سے دیکھو تو نظر آئے۔ لیکن اسی نقطہ جیسی جسامت میں جسمانی نظام کی تمام چیزیں موجود ہیں۔ ہاتھ پاؤں بھی ہیں۔ ناک بھی زبان بھی ہے۔ معدہ بھی اور حتی کہ ادراک وشعور کی بھی صلاحیتیں بھی موجود ہیں کہ اگر ٹڈی کا پر سونگھ کر ایک چیونٹی اس کو کھینچنے کے لیے آئے اور وہ اپنے وزن اور ثقل کے باعث اس ایک تنہا چیونٹی سے نہ کھنچے تو چند ہی لمحول میں یہ دیکھو گے کہ وہی ایک چیونٹی اپنے ہمراہ ایک بڑا لشکر (قطار) لیے چلی آرہی ہے اور یہ پوری قطار اس ٹڈے یا اس کے پر کو گھسیٹ کر لے جارہی ہے۔ کیا ہم اس قسم کے ادر مشاہدوں سے یہ نہیں سمجھ سکتے کہ چیونٹی میں ادراک وشعور بھی ہے قوت شامہ بھی ہے اور فراست وفہم کا وصف بھی موجود ہے کہ اس نے اس ثقل اور وزن کو ناقابل برداشت خیال کرکے اپنی ساتھ لگ جانے کے لیے اپنی قوم کو دعوت دی ہے اور انہوں نے اس پر لبیک کہا اور سب نے مل جل کر ایک مقصد انجام دے لیا۔

غرض کائنات عالم میں سے ہر ایک چیز ایک طرف خداوند عالم کی قدرت وخالقیت اور اس کے وجود کی دلیل ہے تو دوسری طرف ہر ایک موجود اپنی زبان حال سے اللہ کی وحدانیت پر بھی برہان قاطع ہے۔

اسی وجہ سے ہر دور میں مبعوث ہونے والے رسولوں نے مادہ پرست دہریوں اور منکرین خدا کو یہی فرمایا اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ

والارض کہ کیا اللہ کے وجود میں کوئی شک ہے ، جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے ۔ اسی نوع کے دلائل خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی قوت کے ساتھ دُنیا کے سامنے پیش فرمائے ۔

اہلِ اسلام اور مادّہ پرستوں کی ایک عجیب مثال

علامہ حسین آفندیؒ رسالہ حمیدیہ میں لکھتے ہیں کہ اہل اسلام اور مادہ پرستوں کی مثال ان دو شخصوں کی سی ہے جو کسی نہایت رفیع الشان محل میں داخل ہوئے جس میں مختلف کمرے اور متعدد نشستگاہیں ہیں ، اور اور ہر کمرہ میں اعلیٰ درجہ کے تخت اور عمدہ قسم کے قالین اور فرش بچھے ہوئے ہیں ۔ اور طرح طرح کے ساز و سامان سے آراستہ ہیں ۔ ہر چیز اس میں قرینہ کے ساتھ لگی ہوئی ہے ۔ کمروں کے سامنے سیرگاہیں اور قسم قسم کے سبزے اور شاداب چمن بھی ہیں ۔ درمیان میں حوضیں ہیں نہریں بھی بہہ رہی ہیں ۔ غرض یہ دونوں شخص اس محل میں داخل ہوئے ۔ اب ان میں سے ایک شخص نے دیکھ کر یہ کہا کہ گو میں نے اس کے بنانے والے کو نہیں دیکھا ہے اور نہ اس کی پوری حقیقت اور کُنہ سے واقف ہوں اور نہ ہی اس محل کی صنعتوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں ۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس کا بنانے والا کوئی بہت ہی بڑا مدبّر اور ذی اختیار اور حکمتوں کی رعایت کرنے والا ہے ۔ گو میں ان حکمتوں کو اپنی عقل نارسا کی وجہ سے پوری طرح نہ سمجھ سکوں لیکن اس کے مدبر اور حکیم ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور جو کچھ بھی اس نے بنایا ہے وہ ضرور حکمت اور مصلحت پر مبنی ہے ۔

اس کے برعکس دوسرا شخص چاروں طرف دیکھنے لگا اور گویا وہ کسی گتھی کو سلجھانے کی فکر کر رہا ہے کہ اچانک اس کی نظر ایک پہاڑ پر پڑی جس میں کچھ چشمے جاری بھی نظر آئے ۔ کچھ سوچ کر کہ بڑے مدبّرانہ

انداز میں) کہنے لگا (نہیں یہ بات نہیں جو تم کہہ رہے ہو کہ یہ مکان کسی بڑے صناع و کاریگر نے بنایا ہے بلکہ) ان سب کی علت یہ معلوم ہوتی ہے کہ قدیم زمانہ میں اس پہاڑ کی جانب سے ایک ہوا چلا کرتی تھی۔ بس وہ ہوا اسی طرح ہزاروں لاکھوں سال تک چلتی رہی اور اس کی وجہ سے مختلف مقامات سے پتھر اور مٹی حرکت کرکے اپنے طبعی اور مادی تقاضا کی وجہ سے ایک جگہ جمع ہوگئے اور سالہا سال ان پر بارش ہوتی رہی حتیٰ کہ ایک طویل عرصہ اور مدت دراز کے بعد اس تدریجی اور اتفاقی اجتماع سے ارتقائی طور پر یہ محل خود بخود تیار ہوگیا۔ اس طرح کہ اتفاقاً یہ پتھر اور اینٹیں خود بخود ایک دوسرے پر جمتی رہیں اور اسی طرح جب بلند ہوگئیں تو دیواروں کی شکل ہوگئی۔ اور اتفاق یہ کہ ان کے بیچ میں کچھ کشادگی ہوتی رہی تو وہ کمروں کی وسعت ہوگئی۔ پھر اتفاق یہ کہ جب دیواریں بلندی کو پہنچ گئیں تو کچھ لمبی لمبی لکڑیاں شہتیر اور کڑیوں کی صورت میں ان دیواروں پر آکر جم گئیں۔ پھر اتفاقاً ان پر کچھ تختے آڑے آڑے کر رکھے گئے۔ پھر وہ اپنے طبعی تقاضہ سے ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ ہوگئے۔ پھر ایک ہوا چلی تو اتفاق سے مٹی ان تختوں پر جم گئی اور اس طرح اس محل کی چھت مکمل ہوگئی۔ پھر اتفاق یہ کہ وہ پانی جو پہاڑ کی چشموں سے بہہ رہا تھا اس کا رُخ محل کی طرف ہوگیا جس کی وجہ سے یہ حوضیں اور نہریں محل میں جاری ہوگئیں۔

اور رہا یہ امر کہ اس محل میں زیب و زینت اور آراستگی کے اسباب عمدہ عمدہ، قالین اور مرصع تخت کہاں سے آئے ؟ سو اصل میں اس کا سبب یہ ہے کہ کسی زمانہ میں ایک قافلہ اس پہاڑ پر آکر اُترا اور اتفاقاً وہ اپنا سامان بھول کر چلا گیا۔ ہوائیں تو چلتی ہی ہیں تو ہواؤں نے رفتہ رفتہ یہ سامان اس محل میں لا ڈالا۔ اور یہ سامان تدریجی طور پر اپنے مادہ اور طبعی تقاضا سے مرتب ہوگیا اور ہر جگہ اس طرح سے سلیقہ سے رکھا ہوا نظر آرہا ہے (سبحان اللہ ذرا غور فرمائیے۔ بخت و اتفاق اور مادہ و طبیعت کے تقاضوں پر ایمان

لانے والوں کا اندازہ لگائیے کہ ان کی یہ کہانی عقل و دانش سے کس قدر بعید ہے بلکہ سرادنیٰ اعقل والا انسان بھی مادہ ترابی کی حرکتوں کے قائل اس محقق فلسفی کے اس فلسفہ کو سُن کر ہنسے گا اور سمجھے گا کہ ایسے شخص کا اصل ٹھکانا تو پاگل خانہ ہے اور جس چیز کو یہ شخص فلسفیانہ تحقیقات تصور کر رہا ہے وہ بیہودہ بکواس اور خرافات ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے دشمن عقل آدمی میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ وہ دلائل و حقائق کو سُن سکے یا ان کو سمجھ سکے۔ ان چیزوں کو سمجھنا اور پہچاننا تو عقل والوں کا کام ہے جیسے کہ خود ربّ العالمین کا ارشاد ہے :

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ

کہ بے شک ان تمام چیزوں میں یقیناً عبرت و نصیحت ہے۔ ہر ایسے شخص کے واسطے جس کے لیے قلب (شعور و فہم) ہو یا ان کی طرف کان لگائے حاضر الحواس ہو کر۔

یورپ کا ایک محقق راسٹن انہی مناظر قدرت کو دیکھ کر کہتا ہے کہ ....

" اے آسمانو ! مجھ کو خبر دو اے دریاؤ مجھ کو بتاؤ اے زمین مجھ کو جواب دے اے بے انتہا ستارو تم بولو کہ کونسا ہاتھ ہے جس نے تم کو افق میں تھام رکھا ہے۔ او شب چاردہ[2] کس نے تیری تاریکی کو خوبصورت بنادیا ہے تو کس قدر پُرشان ہے۔ کس قدر عظمت مآب ہے تو خود بھی بتارہی ہے کہ تیرا کوئی صانع ہے۔ جس نے تجھ کو بغیر کسی زحمت کے بنایا ہے۔ اس نے تیری چھت کو

---

[1] شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک معرکۃ الآراء تقریر بعنوان الاسلام سے یہ حوالہ اخذ کیا گیا ہے۔ مادہ پرستوں اور دہریوں کے رد پر نہایت جامع نصوص اور عقلی دلائل سے مرصع مضمون ہے۔ مضمون کا ایک ایک لفظ یہ بتا رہا ہے کہ ... حضرت کا نہایت بلند پایہ مفکر اور فلسفی اور اپنے دور کا بے مثال فقیہہ و محقق بول رہا ہے۔ ایک ایک جملہ سے علم و معرفت کے دریا امڈتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اللہ ربّ العزت میرے اس شیخ محترم کی آرام گاہ کو انوار و برکات سے معمور فرمائے۔ اور اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے آمین یا ربّ العالمین۔ [2] یعنی چودھویں رات۔

قبہ ہائے نور سے مرصع کیا ہے جس طرح اس نے زمین پر خاک کا فرش بچھایا ہے اور گرد کو اُبھارا ہے۔ او مژدہ رسانِ سحر! او تیر شگرف او ہمیشہ روشن رہنے والے ستارے! او آفتاب درخشاں بیج بتا تو کس کی اوا طاعت کے لیے محیط کے پردے سے باہر آتا ہے، اور نہایت فیاضی کے ساتھ اپنی روشن شعاعیں عالم پر ڈالتا ہے۔ اے پُر رعب سمندر اے وہ کہ غضبناک ہو کر زمین کو نگل جانا چاہتا ہے۔ کس نے تجھ کو محبوس کر رکھا ہے۔ جس طرح کہ شیر کٹھرہ میں قید کر دیا جاتا ہے تو اس قید خانہ سے بے فائدہ نکل جانے کی کوشش کرتا ہے لیکن تیری موجوں کا زور ایک حد معین سے آگے ہرگز نہیں بڑھ سکتا۔"

بہرکیف ہر ایک شخص کو علی رغم انفہ[۱] یہ ماننا پڑے گا اس عالم ہستی اور پُراسرار کائنات کا پیدا کرنے والا وہی ایک قادر مطلق اور علام الغیوب پروردگار ہے اور یہی اعتقاد رکھنا قرین قیاس اور مطابق عقل ہے جو دنیا کے اب سارے انسانوں کی رائے ہے جو آدم علیہ السلام کے عہد سے اس وقت تک گذرے ہیں جن میں بڑے حکماء فلاسفہ اور اولوالعزم انبیاء بھی شامل ہیں۔ دنیا کے چند غافلوں اور بد مستوں کی یہ رائے کہ اس کائناتِ عالم کا سبب وجود ایک بے حس و بے شعور اور ایا بج مادہ ہے سراسر خلافِ عقل ہے۔

اس سلسلہ میں اثبات صانع عالم کے تفصیلی استدلالات کی تو گنجائش نہیں ان کی تفصیل علما متکلمین کی کتب کی طرف اہل علم مراجعت فرمائیں تاہم یہ چند باتیں جو لکھی گئیں وہ اس مدعا کو ثابت کرنے کے لیے کافی معلوم ہوتی ہیں جن کو عام فہم انداز میں پیش کر دیا گیا۔

---

[۱] ناک رگڑ کر اور ذلیل ہو کر۔

توحید

شَهِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَا اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ۔ لَا اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝

جملہ مذاہب سماویہ اور تعلیمات الٰہیہ کا جوہر اور لب لباب توحید خداوندی ہے حق تعالیٰ نے عالم کی ہدایت کے لیے جس قدر پیغمبر مبعوث فرمائے اُنھوں نے اور خاتم الانبیاء و المرسلین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کی وحدانیت ہی کی تعلیم دی۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّا نُوْحِیْ اِلَیْہِ اَنَّہٗ لَا اِلٰـہَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۔

(سورۃ الانبیاء)

اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول اور نبی ایسا نہیں بھیجا کہ اس کی طرف ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو کر (وہ یہ پیغام پہنچا دے) بے شک حقیقت یہ ہے کہ کوئی نہیں ہے معبود میرے سوا ۔ لہٰذا اے لوگو! بس تم صرف میری ہی عبادت کرو ۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰـہٍ غَیْرُہٗ وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا ۔ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ

بے شک بھیجا ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف (رسول بناکر) پس اُنھوں نے کہا اے میری قوم عبادت کرو تم اللہ کی کوئی معبود نہیں ہے تمہارا سوائے اللہ کے ۔ اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہودؑ کو رسول

اِلٰـهٍ غَيْرُهٗ ۝ وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صَالِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰـهٍ غَيْرُهٗ ۝

بنا کر بھیجا۔ انہوں نے کہا اے میری قوم اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰـهٍ غَيْرُهٗ ۝

اور مدین کی طرف ہم نے بھیجا ان کے بھائی شعیب کو انہوں نے کہا اے میری قوم عبادت کرو اللہ کی نہیں ہے کوئی معبود تمہارا اس کے سوا۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے جامع ترمذی میں حارث اشعری سے ایک واقعہ تخریج کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خداوند عالم نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو پانچ کلمات (احکام و ہدایات) کا مامور فرمایا کہ قوم بنی اسرائیل کو وہ ہدایات اور باتیں پہنچا دیں اور یہ کہ وہ ان پر عمل کریں حضرت یحییٰ نے ان پیغامات کے پہنچانے میں (کسی مصلحت کی بنا پر) کچھ تاخیر کی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا جن کلمات کا اے یحییٰ اللہ نے تم کو پہنچا دینے کا حکم دیا ہے یا تو تم ان کو پہنچا دو ورنہ میں اس کی تعمیل کرتا ہوں حضرت یحییٰ نے فرمایا نہیں اگر تم نے اس کام میں مجھ سے سبقت کی تو مجھے اندیشہ ہے کہ مجھ پر عذاب خداوندی نازل ہو جائے۔ حضرت یحییٰ نے فوراً بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں جمع کیا۔ سب لوگ جمع ہو گئے حتیٰ کہ ٹیلوں اور دیواروں پر بھی بیٹھ گئے تو آپ نے بیان کیا کہ اے لوگو! اللہ نے مجھے پانچ باتوں کا حکم فرمایا ہے کہ میں ان پر عمل کروں اور تم کو بھی اس بات پر مامور کروں کہ تم بھی ان پر عمل کرو۔ ان پانچ باتوں میں سب سے پہلی (اور مقدم) بات یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بناؤ اور جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے کہ جس نے ایک غلام صرف اپنے مال سے خریدا، سونا اور چاندی دے کر اور اس کو کہا کہ (دیکھ) یہ میرا گھر ہے اور میرا کام ہے (یعنی میرے واسطے یہ کاروبار تیرے سپرد ہے) تو

عمل کرتا رہ اور کمائی (نفع) مجھے ادا کرتے رہنا تو یہ غلام کاروبار کرنے لگا، لیکن منافع اپنے آقا کے سوا دوسرے کو دیتا رہا تو بتاؤ تم میں سے کون شخص اس بات کو پسند کرسکتا ہے کہ اس کا غلام اس طرح کا ہو اور یہ رویّہ اختیار کرے مقصد یہ کہ جب ایک انسان اپنے غلام کی اس روش کو گوارا نہیں کرسکتا تو یہی حال اللہ کے ساتھ شرک کرنے کا ہے تو خداوند عالم کو کیونکر شرک گوارا ہوسکتا ہے (حدیث کا پورا مضمون جامع ترمذی میں ملاحظہ فرمائیں)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مشرکین اور بُت پرستوں کے سامنے رب العالمین کی خالقیت اور توحید کے ایسے روشن اور محکم دلائل قائم کیے کہ ان کو سوائے سرنگوں ہوجانے کے اور کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا۔ مناظرے کرکے ان کو لاجواب کیا۔ اور دلائل قاہرہ کی قوت سے شرک وکفر کی چٹانوں کو پاش پاش کرڈالنے کے بعد فرمادیا:

اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللهِ "افسوس اور تباہی تمہارے واسطے اور تمہارے ان معبودوں پر بھی افسوس کہ جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کررہے ہو"

غرض تمام انبیاء اور خدا کے برگزیدہ رسول توحید کی دعوت دیتے رہے، لیکن جس طرح اور تمام کمالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زائد فوقیت وبرتری رکھتے ہیں اور آپ کی شریعت تمام ادیان سماویہ اور انبیاء سابقین کی شریعتوں کے محاسن اور خوبیوں کا مجموعہ ہے اسی طرح توحید کی تعلیم بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس جامعیت اور خوبی وکمال سے دی اس کی نظیر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقی اور خالص توحید آج صرف مذہب اسلام میں باقی ہے۔ دنیا کے اور مذاہب یا تو سرے سے توحید سے عاری اور خالی ہیں یا اگر کوئی اس کا قائل ہے تو صرف برائے نام۔ توحید کے دعوے کے ساتھ اعتقادی اور عملی طور پر شرک کی گندگیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔

عیسائی تین خداؤں کے قائل ہوئے اور عقیدۂ تثلیث ان کے مذہب کی بنیاد ہے۔ یہود نے بھی حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانا جیسے کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ	یہود نے کہا کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور
وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ	نصاریٰ نے یہ کہا کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں
ذَٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ	یہ ان کا قول ہے جو اپنے منہ سے وہ
قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ	بول رہے ہیں اس بات میں وہ مشابہت اختیار کر رہے ہیں ان لوگوں کی جو ان سے پہلے کافر ہو چکے ہیں۔
(سورۃ توبہ ۴)	

مجوسیوں کا یہ عقیدہ کہ الوہیت یعنی خدائی دو طاقتوں میں منقسم ہے۔ خیر کا خالق یزدان ہے اور شر کا اہرمن۔ یزدان کسی چیز کو بناتا ہے اور اہرمن بگاڑتا ہے ہر ایک خدا دوسرے کا محتاج ہے۔ دونوں کے اختیارات تقسیم شدہ ہیں وہ خیر میں دخل نہیں دیتا اور یہ شر میں دخل نہیں دیتا۔ اور اسی طرح یہ سارا کارخانۂ عالم چل رہا ہے۔

ہندوؤں آریوں اور تمام بت پرستوں کے شرک کی تو کوئی حد و نہایت ہی نہیں جنہوں نے درختوں اور جانوروں حتیٰ کہ شرمگاہ کو اپنا معبود بنالیا۔ شرک و بت پرستی کے ایسے دور میں جب کہ بیت اللہ کے اندر بھی ان مشرکین نے تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ قرآن کریم نے توحید کی دعوت دی اور اس کو ایسے دلائل سے ثابت کیا کہ توحید ایک بدیہی اور فطری امر بن گیا اور جو لوگ ہزاروں بلکہ لاکھوں بتوں معبودوں اور دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے وہ ایسے پکے موحّد اور خدا پرست بنے کہ ان کے قلب اور دماغ میں خدا کی محبت اور تعلق کے سوا کوئی چیز ہی باقی نہ رہی۔ اس موضوع پر قرآن کریم نے نقلی اور عقلی دلائل کے علاوہ فطری اور طبعی امور سے بھی

توحید خداوندی کا اثبات کیا اور یہی وہ بحث ہے جس کے ضمن میں اسلام کے چمکتے ہوئے امتیازات ظاہر ہوتے ہیں۔

حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عبودیت و بندگی کا حق ادا کرنے اور توحید اختیار کرنے پر مامور فرماتے ہوئے اس طرح ارشاد فرمایا:

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔

(سورۃ البقرۃ)

اے انسانو! عبادت کرو اپنے اس رب کی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو جو تم سے پہلے ہیں امید ہے کہ تم تقویٰ اختیار کرنے والے ہو جاؤ گے۔ (عبادت کرو) اس ذات کی جس نے تمہارے واسطے زمین کو بچھونا بنایا اور آسمان کو عمارت اور برسایا اس آسمان سے پانی جس نے مختلف قسم کے پھل تمہارے واسطے رزق بنا کر پیدا کیے۔ پس نہ بناؤ اے انسانو! خدا کے واسطے مماثل اور شریک حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ خدا کا کوئی مثال اور شریک نہیں ہے)

امام رازیؒ تفسیر کبیر[1] میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بندہ اگر ہزار طاعت و عبادت بھی کرے تب بھی وہ ذرہ برابر ثواب کا مستحق نہیں ہوتا کیونکہ عبادت تو ان انعامات کا حق ہے جو اللہ کی طرف سے بندہ پر کیے گئے۔ اور اس وجہ سے کہ وہ پروردگار بندہ کا خالق ہے تو اس بنا پر بندہ اگر زائد سے زائد عبادت کمال آداب اور خشوع و خضوع کے ساتھ بھی ادا کرے تو صرف حق فرض ادا کرنے والا ہوگا۔ اوّل تو یہ بھی مشکل ہے کیونکہ اللہ کی ایک نعمت کا حق بھی ادا ہونا ممکن نہیں چہ جائیکہ اس کے غیر متناہی کا انعامات کا حق ادا کرے۔ اس لحاظ سے ہر مرحلہ پر بندہ قصور وار

[1] تفسیر کبیر ج ۲۔

رہے گا ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ جو کچھ بھی ثواب ملے گا وہ محض انعام خداوندی ہی ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس فرمان مبارک کا یہی مطلب ہے:

اِنَّكُمْ لَنْ يُّنْجِيَ اَحَدًا كُمْ عَمَلُهٗ اِلَّا اَنْ يَّتَغَمَّدَ هُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ ۔ — کہ یقیناً ہرگز تم میں سے کسی شخص کا عمل اس کو نجات دلانے والا نہ ہوگا بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف سے اپنی رحمت میں ڈھانک لے۔

گویا اس آیت میں حق تعالیٰ شانہٗ نے عبادت کا حکم دینے کے ساتھ ہی ساتھ معبود کی معرفت کے پانچ طریقے بتا دیئے یا یہ کہہ دیجیے کہ پانچ دلائل بیان کر دیئے دو دلائل تو نفس کے متعلقات میں سے ہیں اور تین دلائل آفاق کے شعبہ سے ہیں "اَلَّذِيْ خَلَقَكُمْ" فرما کر اپنے نفسوں میں غور و فکر اور اس بات کی جانب متوجہ ہونے کو فرما دیا گیا کہ تم کو اسی خدا نے عدم کے بعد وجود کی نعمت سے نوازا۔ اسی طرح تمہارے آباؤ اجداد بھی پہلے پردۂ عدم میں تھے۔ ان کو بھی اسی خدا نے وجود عطا کیا ہے۔ زمین کو فرش بنانا آسمان کو چھت اور آسمان سے برسائے ہوئے پانی سے قسم قسم کے پھل اور غلے پیدا کرنا یہ تینوں دلائل آفاق کے قبیل سے ہیں۔

بہرکیف اس طرح پروردگار نے اپنا خالق و منعم ہونا ان پانچ دلائل سے ثابت فرما کر یہ بتا دیا کہ عبادت پروردگار عالم کا ایک ایسا فطری اور بدیہی حق ہے کہ اس میں عقلی حیثیت سے ذرہ برابر بھی شک اور تردد کی گنجائش نہیں ہے۔ اس آیت میں اعبدوا مامورات میں پہلا اور بنیادی حکم ہے۔ اسی طرح سے فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا الخ منہیات میں پہلا حکم ہے۔

اطاعت و فرمانبرداری کے تمام شعبے انہی دو بنیادوں پر قائم ہیں اور شریعت کے جملہ احکام اسی امر و نہی کے دائرہ پر دائر ہیں۔

قرآن کریم نے خداوند عالم کی وحدانیت کا اعلان اس عظمت و برتری کے ساتھ کیا: شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ — اللہ تعالیٰ گواہ ہے اس بات کا کہ اس کے

اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ۗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (آل عمران)	سوا کوئی سچا معبود نہیں اور فرشتے بھی گواہ ہیں اور علم والے بھی۔ درانحالیکہ وہ عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کر رہا ہے یقیناً اس کے سوا کوئی سچا معبود نہیں وہ زبردست غلبہ اور حکمت والا ہے۔

اعلان توحید کر کے اس پر ایک ایسی عقلی دلیل اور برہان قاطع قائم کی کہ دنیا کے عقلاء اور حکماء سر پٹخ کر بیٹھ رہیں لیکن اس قائم کردہ دلیل کو بلند ترین پہاڑ سے زائد راسخ اور محکم و مضبوط پائیں گے۔ خواہ کتنے ہی عقلی اور فکری بلند پروازی کر لیں مگر قرآن کریم کی بیان کردہ اس دلیل میں ادنیٰ سے ادنیٰ بھی رخنہ اندازی پر قادر نہ ہوں گے۔ پھر خوبی یہ کہ یہ استدلال عقل و فکر کی جہاں انتہائی بلندیوں پر پہنچا ہوا ہے اس کے ساتھ اس قدر سہل الفہم بھی ہے کہ عامی سے عامی انسان اور کم سے کم عقل و فہم رکھنے والا ان پڑھ بھی اس استدلال کو اسی طرح سمجھے گا جس طرح کہ بڑے سے بڑا حکیم فیلسوف سمجھتا ہو۔

توحید خداوندی اور تعدد آلہہ کے ابطال پر قرآن کا بنیادی استدلال

تعدد آلہہ کے ابطال اور توحید خداوندی پر یہ دلیل قرآن کریم کی یہ آیت مبارکہ ہے۔

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۔ (الانبیاء)	اگر ہوتے آسمانوں اور زمین میں چند معبود اللہ کے سوا تو دونوں (عالم) درہم برہم ہو جاتے سو پاک ہے اللہ جو عرش کا مالک ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ بتلاتے ہیں۔

تعدد آلہہ کے ابطال اور توحید خداوندی کے اثبات پر قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں یہ دلیل نہایت پختہ اور واضح پیش کی ہے۔ شیخ الاسلام حضرت العلامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فوائد قرآن کریم میں بیان فرماتے ہیں

"اس کو یوں سمجھو کہ عبادت نام ہے کامل تذلل کا اور کامل تذلل صرف اسی ذات کے سامنے اختیار کیا جا سکتا ہے جو اپنی ذات وصفات میں ہر طرح کامل ہو۔ اسی کو ہم اللہ یا خدا کہتے ہیں (اس لیے) ضروری ہے کہ خدا کی ذات ہر قسم کے عیوب اور نقائص سے پاک ہو۔ نہ وہ کسی حیثیت سے ناقص ہو اور نہ بیکار۔ نہ عاجز ہو نہ مغلوب، نہ کسی دوسرے سے دبے نہ کوئی اس کے کام میں روک ٹوک کر سکے۔ اب اگر فرض کیجیے کہ آسمان و زمین میں دو خدا ہوں تو دونوں (لامحالہ) اسی شان کے ہوں گے۔ اُس وقت دیکھنا یہ ہے کہ عالم کی تخلیق اور علویات و سفلیات کی تدبیر دونوں کے کلی اتفاق سے ہوتی ہے یا گاہ لگاہ باہم اختلاف بھی ہو جاتا ہے۔ اتفاق کی صورت میں دو احتمال ہیں یا تو اکیلے ایک سے کام نہیں چل سکتا تھا اس لیے دونوں نے مل کر انتظام کیا تو معلوم ہوا کہ دونوں میں سے ایک بھی کامل قدرت والا نہیں ہے اور اگر تنہا ایک سارے عالم کا انتظام کامل طور پر سر انجام کر سکتا تھا تو دُوسرا بیکار ٹھیرا حالانکہ خدا کا وجود (تو) اسی لیے ماننا پڑا ہے۔ اس کے مانے بغیر کوئی چارہ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اختلاف کی صورت فرض کریں تو لامحالہ مقابلہ میں ان میں سے ایک مغلوب ہو کر اپنے ارادہ اور تجویز کو چھوڑ بیٹھے گا تو وہ خدا نہ رہا۔ اور یا دونوں بالکل مساوی اور متوازی طاقت سے ایک دُوسرے کے خلاف اپنے ارادہ اور تجویز کو عمل میں لانا چاہیں گے۔ اوّل تو معاذ اللہ خداؤں کی اس رسّہ کشی میں سرے سے کوئی چیز موجود ہی نہ ہو سکے گی اور موجود چیز پر زور آزمائی ہونے لگی تو (وہ) اس کشمکش میں ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جائے گی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ آسمان و زمین میں اگر دو خدا ہوتے تو آسمان و زمین کا یہ نظام کبھی کا درہم برہم ہو جاتا۔ ورنہ ایک خدا کا بیکار یا عاجز و ناقص ہونا لازم آتا ہے، جو خلاف مفروض ہے۔"

کیونکہ یہ امر طے ہے کہ خدائی کے لائق وہی ہے جس میں ہر طرح کا کمال ہو

اور ہر عیب و نقصان سے منزہ و پاک ہو۔

یہ دلیل علماء متکلمین کے یہاں "برہان تمانع" کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اس میں استدلال کا انداز یہی اختیار کیا گیا کہ ایک خدا کو دوسرے خدا کے ارادہ سے مانع اور مزاحم فرض کیا گیا۔ علماء نے اس استدلال کو مختلف عنوانات اور متعدد تعبیروں سے بیان فرمایا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے علاوہ اور بھی متعدد براہین اور دلائل ابطال تعدد الٰہہ پر قائم کیے۔ حضرات اہل علم تفسیر کبیر کی مراجعت فرمائیں)

قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر دو دلیلیں نہایت لطیف اور عجیب بیان فرمائیں۔ فرمایا "اہل اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ اگر عالم کے لیے دو یا دو سے زائد (خدا) صانع ہوں تو کارخانہ عالم بالکل درہم برہم ہو جائے گا اور کوئی شے بھی وجود میں نہ آئے گی کیونکہ اس میں تو کسی کلام نہیں ہے کہ خدا کے لیے کامل الذات اور کامل الصفات ہونا ضروری ہے۔ خدا وہی ہو سکتا ہے جو ہر قسم کے نقص سے پاک ہو ورنہ خالق اور مخلوق میں کیا فرق ہے اس لیے کہ بندے خدا بننے سے اس وجہ سے محروم ہیں کہ ان میں طرح طرح کے نقصانات موجود ہیں۔ وجود ان کا ناقص، قدرت ان کی ناقص، علم ان کا ناقص۔ پس اگر خدا بھی العیاذ باللہ ہماری طرح ناقص ہو ہماری ہی طرح مجبور ہو تو اس کو ہم پر خدا بن جانے کا کیا حق ہو سکتا ہے۔

پس جب ہر خدا کامل اور مستقل ٹھیرا تو ہر ایک کی تاثیر بھی کامل اور مستقل ہوگی اس لیے کہ خالق کی مثال آفتاب و ماہتاب اور مخلوق کی مثال زمین کی سی ہے۔ زمین آفتاب سے بقدر آفتاب منور ہوتی ہے اور ماہتاب سے بقدر ماہتاب۔ پس جب دو صانع ہوں گے اور ہر ایک کی تاثیر کامل ہوگی تو ہر خدا کی طرف سے دو کامل وجود ہر مخلوق کے پیمانہ میں آئیں گے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ایک سانچہ میں دو چیزیں اور ایک نیام میں دو تلواریں اور سیر بھر کے پیمانہ میں

دوسیر اور ایک جوتے میں ایسے ہی دو قدم اور ایک اچکن (شیروانی) میں
دو بدن اور ایک محدود جگہ میں اس سے دو چند اسباب نہیں سما سکتا اور اگر
زبردستی کر کے اس میں ڈال بھی دیا جائے تو وہ سانچہ یا نیام اور اچکن ایک
لمحہ کے لیے بھی سالم نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح یہ ممکن نہیں کہ دو خداؤں کی طرف
سے ایک مخلوق میں وجود سما سکے۔ اگر ایسا فرض کرو گے تو کسی بھی مخلوق کا وجود
سالم باقی نہ رہ سکے گا۔

اور اگر یہ فرض کرو کہ دو خداؤں نے مل کر ایک مخلوق کو ایک ہی۔ خود عطا
کیا ہے تو پھر ایسی صورت میں ہر خدا اعطاء وجود کی مستقل علت اور مستقل
خالق نہ ہوگا۔ بلکہ بحیثیت مجموعی دو خداؤں کا مجموعہ مل کر مؤثر ہوگا جس کا لازمی
نتیجہ یہ ہے کہ ہر ایک ان میں سے ناقص اور غیر مستقل بالارادہ والاختیار
ہوگا۔ ہاں! اگر یہ احتمال ممکن ہوتا خدا ناقص بھی ہو سکتا ہے تو یہ کہنا کسی نہ کسی
درجہ میں ممکن ہو جاتا۔ جس طرح کہ دو چراغوں کی روشنی مل کر قوی روشنی ہو جاتی
ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کہہ دیا جاتا کہ دو خداؤں کے عطا کردہ وجود مل کر کامل
وجود ہو گئے۔ لیکن اس کا کیا علاج کیا جائے کہ تمام اہل عقل اس پر متفق ہیں
کہ بارگاہ خداوندی میں کسی قسم کے نقص اور نقصان کا گذر بھی نہیں۔

بہر کیف اگر دو خدا کامل الذات اور کامل الصفات ہوتے یہ کارخانہ عالم
بالکل ہی صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہو جاتا اور قرآن کریم کی آیت مبارکہ کا
"لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا" اسی کی طرف اشارہ
ہے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے توحید خداوندی کا دوسرا استدلال
اس طرح سے کیا کہ "عالم کے موجودہ نظام پر نظر ڈالنے سے ہر فہیم شخص
یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس عالم کے جس سلسلہ پر بھی نظر ڈالتے ہیں معلوم ہوتا ہے
کہ وہ ایک ہی اصل پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ مثلاً روشنی کا سلسلہ کہ وہ آفتاب پر

ختم ہوتا ہے۔ گرمی کا سلسلہ دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ وہ آثار آتش پر جاکر ختم ہوجاتا ہے۔ عدد کا سلسلہ دیکھو تیجیے جو الی غیر النہایۃ پھیلا ہوا مگر اس کی اصل بھی عدد ایک ہی ہے اور یہی عدد واحد (ایک) تمام اعداد غیر متناہیہ کا اصل اور مبداء ہے۔ اسی طرح ضروری ہوا کہ موجودات عالم کا سلسلہ بھی کسی نہ کسی ایک اصل پر جاکر ٹھیرے گا۔ اور وہی ایک تمام موجودات کا اصل اور مبداء ہوگا کہ اس سے یہ تمام موجودات اور کائنات عالم کا سلسلہ وجود جاری وساری ہے تو یقیناً وہ ذات خداوندی ہے کہ صرف اسی ایک ذات سے یہ ساری کائنات عالم وجود میں آئی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو حق تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا:

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَا
اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سَيَقُوْلُوْنَ
لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ قُلْ مَنْ
رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ
الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ سَيَقُوْلُوْنَ
لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۔ قُلْ مَنْ
بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ
يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ
فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ
بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ مَا
اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ
مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ
كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا

(اے ہمارے پیغمبر ان سے) پوچھیے کہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے کس کی ہے اگر تم جانتے ہو (تو بتاؤ) وہ ضرور یہی کہیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کی ہے اس پر آپ کہہ دیجیے کہ تو پھر آخر غور کیوں نہیں کرتے ہو تم لوگ پوچھیے کہ کون ہے ساتوں آسمانوں کا رب اور عرش عظیم کا رب یہ کہیں گے کہ یہ سب اللہ ہی کا ہے تو آپ کہیں اے لوگو! کیا پھر بھی تم اللہ سے نہیں ڈرتے ہو۔ پوچھیے ان سے کس کے ہاتھ میں ہے ملکوت ہر چیز کو وہی (عذاب و قہر سے) بچانے والا ہے اور کوئی نہیں ہے کہ اس کے مقابل میں جس کو عذاب و قہر سے بچایا جاسکے۔ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ، وہ کہیں گے کہ یہ سب

بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔

اللہ ہی کے واسطے ہے تو آپ کہیں آخر اے لوگو! پھر تم کہاں بھٹک رہے ہو۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ہم نے ان کے پاس حق بات پہنچا دی ہے اور وہ بے شک جھوٹے ہیں۔ اللہ نے کسی کو اپنا بیٹا ہرگز نہیں بنایا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی دوسرا خدا نہیں کیونکہ اگر اس کے ساتھ کوئی دوسرا خدا ہوتا تو ہر ایک اپنی اپنی بنائی ہوئی چیزیں لے کر چلا جاتا اور مد مقابل ہو کر ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے لگتا۔ خدا کی پاکی ہے ان باتوں سے سے جو یہ مشرکین اس کی طرف نسبت کرتے ہیں وہ پروردگار غیب اور حاضر کا جاننے والا ہے۔ پس برتر ہے وہ پروردگار ان چیزوں سے جن کا یہ اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔

(سورۃ المؤمنون)

اسی طرح ارشاد فرمایا گیا:

ءَ اللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ۔

بھلا بتلاؤ کہ اللہ بہتر ہے یا وہ کہ جن کو یہ شریک بناتے ہیں۔ بھلا کس نے آسمان و زمین بنائے اور کس نے تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اس کے ذریعے بہت سے تر و تازہ (شاداب) باغ اگائے۔ کیا تمہیں قدرت تھی کہ تم ان کے درخت اگاتے (بناؤ) کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَ جَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ءَاِلٰـهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰـهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۔ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰـهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ءَاِلٰـهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۔ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔

(نہیں) بلکہ یہ وہی لوگ ہیں جو کجروی اختیار کر رہے ہیں ۔ بھلا وہ کون ہے جس نے زمین کو ٹھیرنے کی جگہ بنایا اور اس کے درمیان نہریں جاری کیں اور زمین کے لیے (جمادینے والے) لنگر (یعنی پہاڑ) بنائے اور دونوں دریاؤں (شیریں اور شور) کے درمیان ایک پردہ (رکاوٹ) کو قائم کر دیا ۔ بتاؤ کیا ہے اللہ کے ساتھ کوئی شریک (نہیں) بلکہ وہ اکثر بے علم ہیں ۔ بھلا کون ہے جو بے قرار کی دعا کو قبول کرتا ہو جب کہ وہ اس کو پکار رہا ہو اور اس کی برائی اور تکلیف کو دور کرتا ہو وہ تم کو زمین کا خلیفہ (اور بعد میں لینے والا) بنائے ۔ کیا ہے اللہ کے ساتھ اور بھی کوئی خدا (نہیں) اے لوگو ! تم بہت ہی کم سمجھتے ہو کون ہے وہ جو تم کو جنگل اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ بتلائے اور کون ہے وہ جو اپنی رحمت (باران) سے پہلے خوشخبری سنانے والی ہواؤں کو بھیجے ۔ بھلا کیا ہے اور کوئی معبود اللہ کے ساتھ ؟ (نہیں) برتر ہے اللہ ان چیزوں سے جو یہ اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں بھلا یہ بتاؤ کون ہے وہ جو خلقت کو از سرِ نو پیدا کرتا ہے اور پھر اس کو دوبارہ لوٹائے اور کون ہے وہ جو تم کو آسمان و زمین سے رزق

دیتا ہو۔ کیا ہے خدا کے ساتھ کوئی اور معبود؟ کہہ دیجیے اے ہمارے پیغمبر لاؤ تم اپنی کوئی دلیل اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

(سُورۃ النَّمل)

غرض قرآن کریم نے از اوّل تا آخر طرح طرح سے دلائل توحید قائم کرکے یہ اعلان فرما دیا کہ جو لوگ توحید خداوندی پر ایمان نہیں رکھتے اور خدا کے ساتھ شرک کرتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل و برہان نہیں ہے چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَمَن يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِندَ رَبِّهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ۔

(سُورۃ المؤمنون)

اور جو کوئی شخص اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارے جس کے واسطے اس کے پاس کوئی برہان و دلیل نہیں تو بس اس کا حساب اللہ ہی کے یہاں ہے۔ بیشک حقیقت یہ ہے کہ جو کافر ہیں وہ کبھی بھی پنپ نہیں سکیں گے اور نہ کامیاب ہوں گے۔

ردِّ شرک

قرآن کریم نے جہاں ایک طرف اثبات توحید کے لیے دلائل قائم کیے اسی کے ساتھ دوسری طرف ردِّ شرک پر بڑی تفصیل و توضیح سے کلام کیا اور مختلف انواع و اقسام سے اس موضوع پر بھی دلائل پیش کیے اور شرک کی قباحت اور اس کی تباہی و بربادی بھی بسط و تفصیل سے بیان کی۔ چنانچہ فرمایا:

قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔

(سُورۃ مائدۃ)

کہہ دیجیے (اے ہمارے پیغمبر) کیا اے لوگو! تم عبادت کرتے ہو خدا کو چھوڑ کر ایسی چیز کی (اور ایسے معبودوں کی) جو تمہارے واسطے نہ ضرر کا مالک ہے اور نہ نفع کا۔ اور اللہ تعالیٰ

خوب سننے اور جاننے والا ہے ۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ هُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۔ قُلْ اِنِّيْ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔

کہہ دیجیے (اے ہمارے پیغمبر) کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا ولی معبود بنالوں، جو خدا کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہی خدا تو (ساری مخلوق کو) کھلاتا ہے۔ نہ یہ کہ اس کو کھلایا جاتا ہے کہہ دو کہ بیشک میں تو اس بات کا حکم دیا گیا ہوں کہ میں ہو جاؤں سب سے پہلا وہ شخص جو اللہ کے سامنے سر جھکانے والا (اطاعت کرنے والا) ہو اور (یہ حکم دیا گیا کہ) ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا۔

(سورۃ انعام)

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۔

اور (اے مخاطب) اگر اللہ تجھ کو کوئی تکلیف پہنچائے تو کوئی طاقت اس کو دور کرنے والی نہیں (مثلاً بیماری یا احتیاج و پریشانی) اور اگر اللہ تجھ کو کوئی بھلائی اور خیر پہنچائے تو بھی (کوئی اس کو روکنے والا نہیں ہے پس) وہ پروردگار ہر ایک چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے

(سورۃ انعام)

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ

کہہ دیجیے (اے ہمارے پیغمبر) اے کافرو! بھلا یہ تو بتاؤ اگر تم پر خدا کا عذاب آجائے یا تم پر قیامت قائم ہو جائے تو کیا تم اس وقت اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے، (بتاؤ) اگر تم اپنے اس دعوے میں (کہ

إِنْ شَاءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُونَ ۔

(سورۃ انعام)

(کہ خدا کے ساتھ اور بھی معبود ہیں) سچے ہو۔ (نہیں ہرگز نہیں تم کسی اور کو نہیں پکارو گے) بلکہ صرف اسی خدا کو پکارو گے پھر وہی خدا وحدہ لاشریک لہ دُور کرے گا اس تکلیف کو جس کے لیے تم اس کو پکارتے ہو اگر اس نے چاہا اور (اس وقت تو) تم بھلا دو گے ان تمام معبودوں کو جن کو خدا کے ساتھ تم شریک کرتے ہو۔

ردِّ شرک پر یہ دلائل گویا اس طرح قائم کیے جا رہے ہیں۔ انسانی فطرت خود ان دلائل کی عملی ترجمانی ہے۔ اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک ادا بآواز بلند انہی دلائل کو برآن ولمحہ پیش کر رہی ہے اور عقل ان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے ورنہ تو چاہیے کہ تمام دُنیا کے مدعیان عقل ان حقائق پر کوئی اعتراض کر کے دکھائیں، عاجز ہو کر بیٹھ رہیں گے اور قرآن کریم کے پیش کردہ ان عقلی اور فطری دلائل کا معارضہ قیامت تک نہ کر سکیں گے :

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَخَذَ اللَّهُ سَمْعَكُمْ وَأَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِهِ انْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُونَ ۔

(سورۃ انعام)

کہہ دیجیے اے پیغمبر اگر اللہ تعالیٰ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے تو بھلا بتاؤ اللہ کے سوا کون ہے ایسا خدا جو تم کو یہ چیزیں عطا کر دے۔ دیکھ اے مخاطب ہم کس طرح لوٹا پلٹا کر یہ دلائل بیان کرتے ہیں لیکن (افسوس) پھر بھی بے رخی ہی کرتے ہیں۔

سورۃ انعام کی اکثر بیشتر آیات ردِّ شرک اثبات توحید اور دلائل قدرت کے بیان پر مشتمل ہیں اور جس قوت و شوکت سے اس سورت میں مشرکین کا

ردّ اور ان کی تجہیل و تحمیق کی گئی۔ اس طرح قرآن کریم کی کسی اور سورت میں نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت سورۃ انعام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تو ستر ہزار فرشتوں کا پہرہ اس کے ساتھ تھا۔[1]

حضرات قارئین اس موضوع کی تفصیل کے لیے سورۃ انعام کی دیگر آیات کا کتب تفاسیر میں رجوع فرمالیں۔

انہی دلائل کے پیش نظر خداوند عالم نے ایسے معاندین و منکرین جو عقل اور فطرت کے دلائل سے انحراف و روگردانی کرتے ہوں۔ بار بار تہدید و تنبیہ فرمائی اور فیصلہ فرما دیا کہ عبادت صرف اسی ربّ حقیقی کی کی جا سکتی ہے اور جو بھی خدا کے ساتھ عبادت میں ایسی چیزوں کو شریک کرے گا جن کے قبضہ میں کچھ بھی نہیں تو اس کے واسطے سوائے خسارہ اور ذلت و ناکامی اور کچھ نہیں ہے جیسے کہ ارشاد فرمایا:

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا	اے ہرگز مت بنا خدا کے ساتھ کسی اور کو معبود ورنہ تو بیٹھ رہے گا بدحال و محروم اور رسوا ہو کر۔
(سورۃ بنی اسرائیل)	

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت سلاطین عالم کے نام دین اسلام کی دعوت دیتے ہوئے نامہ ہائے مبارک روانہ فرمائے تو اس میں خاص طور پر اس آیت مبارکہ کو عظمت و اہتمام کے ساتھ تحریر فرمایا:

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْــًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا	کہہ دیجیے (اے پیغمبر) اے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) آجاؤ ایک ایسے کلمہ کی طرف (اور اس پر متفق ہو جاؤ) جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے وہ یہ کہ ہم سوائے خدا کے اور کسی کی عبادت نہ کریں اور

---

[1] تفسیر قرطبی

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۔ (سورۃ آل عمران)

اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائیں اور ہم آپس میں ایک دوسرے کو اپنا رب نہ بنائیں خدا کو چھوڑ کر۔ پھر اگر وہ نہ مانیں تو (اے ہمارے پیغمبر اور مسلمانو) کہہ دو تم گواہ رہو تم اس بات پر کہ بیشک ہم تو صرف ایک ہی خدا کے تابعدار اور اطاعت کرنے والے ہیں

رب حقیقی کی ہی اطاعت و بندگی انسان کو زیب دیتی ہے۔ اپنے ہاتھوں کے گھڑے ہوئے معبودوں کی پرستش یا خیالات کے تراشے ہوئے بتوں کی پوجا کسی درجہ میں عقل گوارا نہیں کرتی ۔۔ شرک سے برأت و بیزاری کا اعلان سنت ابراہیمی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۔ (سورۃ انعام)

بیشک میں نے تو اپنا رُخ اور چہرہ صرف اسی ذات کی طرف کرلیا ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اس حال میں کہ میں ہر باطل سے اپنا رُخ موڑنے والا ہوں اور میں تو شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اسی انابت الی اللہ کی شان اور شرک و کفر سے بیزاری کی خصوصیت اختیار کرنے کی حق تعالیٰ شانہ نے تمام عالم کے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْ اِبْرٰهِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا

بیشک اے مسلمانو! تمہارے واسطے ایک بہترین نمونہ ہے حضرت ابراہیم کی زندگی میں اور ان لوگوں کی زندگی میں جو ان کے ساتھ ہوئے جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے یہ کہہ دیا اے قوم ہم تو بیزار ہیں تم سے اور

بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ۔

تمہارے ان معبودوں سے بھی جن کی تم عبادت کرتے ہو خدا کو چھوڑ کر، ہم نے تمہارا اور تمہاری ہر بات کا انکار کیا۔ اور ہمارے تمہارے درمیان عداوت اور نفرت ظاہر (واقع) ہو چکی ہے ہمیشہ کے لیے، یہاں تک کہ تم اللہ وحدہٗ پر ایمان لے آؤ۔

(سورۃ ممتحنہ)

اسی کا قرآن کریم نے بار بار اعلان آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف کیا، کہ:

اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ۔

کہ میں اس بات کا مامور ہوں کہ صرف اللہ ہی کی عبادت کروں اسی کے واسطے اپنے دین کو خالص کرتے ہوئے۔

کسی موقعہ پر فرمایا گیا: وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ

عابد کے واسطے جس طرح یہ ممکن نہیں کہ ربّ حقیقی کی عبادت میں غیر اللہ کو شریک نہ بنائے اسی طرح یہ امر بھی فرمایا گیا مساجد اور عبادت گاہیں بھی شرک سے پاک رکھی جائیں فرمایا:

وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا۔

اور بیشک یہ مسجدیں صرف اللہ ہی کی عبادت کے لیے ہیں۔ لہٰذا اے لوگو! خدا کے ساتھ اور کسی کی پرستش نہ کیا کرو۔

بلکہ جیسے تم اللہ کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوئے یہ اقرار کرتے ہو: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ، اسی کے مطابق تمہاری عملی زندگی بلکہ اعتقادات و نظریات مکمل طور پر اسی اقرار کی ترجمانی کرتے ہوئے ہونے چاہئیں۔ اس موضوع کی تفصیل کے لیے تو مستقل ایک کتاب چاہیے۔ اجمالاً اس بات پر اکتفا کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ قرآن کریم میں اثبات توحید اور ردّ شرک کے مضامین جن سورتوں میں ذکر کیے گئے ہیں، ان کی طرف

اجمالی اشارہ کر دیا جائے۔

مواقع مضامین توحید

سُورَۃ فَاتِحَہ ۔ بَقرَۃ ۔ آلِ عِمرَان ۔ نِسَآء ۔ مَائِدَہ
انعَام ۔ توبَہ ۔ الرَّعد ۔ اَلنَّحل ۔ بَنِیۡ اِسرَائِیل ۔ الکہف
طٰہٰ ۔ الانبیَاء ۔ الحج ۔ اَلقَصَص ۔ فاطِر ۔ صٓ ۔ الزُّمَر
اَلتَّغَابُن ۔ مُمتَحِنَہ ۔ جِنّ ۔

قرآن کریم میں وہ مواقع جہاں ردِّ شرک کے مضامین ذکر فرمائے گئے

سُورَۃ فَاتِحَہ ۔ بَقرَۃ ۔ آلِ عِمرَان ۔ نِسَآء ۔ مَائِدَہ ۔ الانعَام
الاَعرَاف ۔ التَّوبَہ ۔ یُونُس ۔ ھُود ۔ اَلرَّعد ۔ اِبرَاھِیم ۔ النَّحل
بَنِیۡ اِسرَائِیل ۔ الکَہف ۔ مَریَم ۔ الاَنبیَاء ۔ الحَج ۔ اَلمُؤمِنُون
اَلفُرقَان ۔ الشُّعَرَاء ۔ النَّمل ۔ اَلقَصَص ۔ اَلعَنکبُوت ۔ الرُّوم
لُقمَان ۔ الاَحزَاب ۔ اَلسَّبَا ۔ فَاطِر ۔ یٰسٓ ۔ الزُّمَر ۔ اَلمُؤمِن
حٰمٓ السَّجدَہ ۔ الشُّورٰی ۔ الزُّخرُف ۔ اَلاَحقَاف ۔ الفَتح
الذَّارِیَات ۔ الطُّور ۔ اَلنَّجم ۔ التَّغَابُن ۔ الملک ۔ اَلقَلَم
اَلجِن ۔ البَیِّنَہ ۔ اَلکَافِرُون ۔

تعداد آیات مضامین توحید ۲۹

تعداد آیات مضامین ردّ شرک ۱۷۷

یہ آیات وہ ہیں جن میں خصوصیت اور اہمیت کے ساتھ ان مضامین کو حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے باقی وہ آیات جن میں ضمناً اور اشارۃً یہ مضامین بیان کیے گئے ان کی تعداد تو بہت زائد ہے۔ ابتداءً قرآن سے انتہا تک مختلف انواع مضامین کے ساتھ اسلام کے ان دونوں بنیادی مضامین کو سینکڑوں آیات میں ذکر فرمایا گیا۔

صفاتِ خداوندی

اَللّٰهُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ لَـهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى

حق تعالیٰ شانہٗ کی خالقیت و قدرت اور اس کی وحدانیت ہی اپنے اجمال میں اس بات کی رہنمائی کر رہی ہے کہ وہ ذاتِ خداوندی بہت سے کمالات اور غیر متناہی خوبیوں کی مالک ہے۔ اس کی عظمت و برتری یقیناً اس پر دلیل ہے کہ وہ بہت ہی بلند پایہ صفات کے ساتھ متصف ہے اور اس میں شبہ نہیں ہے کہ صفات کی کثرت موصوف کی برتری اور عظمت کی نشانی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک ذات اگر اپنے میں ادب فصاحت و بلاغت فلسفہ و حکمت تفسیر و حدیث اور فقہ میں مہارت اور ایسی ہی دُوسری خوبیاں رکھنے کی وجہ سے مستحق کمال ہے تو اسی طرح سمجھ لیجیے کہ خداوند عالم کا کمال اور عظمت بھی اپنے میں گوناگوں صفات کو لیے ہوئے ہے اور وہ اسی طرح غیر محدود اور لامتناہی ہیں جس طرح کہ خدا تعالیٰ کی عظمت و برتری کی کوئی حدو انتہا نہیں ہے۔ ذات خداوندی جیسے مکان و زمان کی حدود اور احاطہ ادراک سے بالا و برتر ہے۔ اس کی صفات بھی حدو شمار کے احاطہ سے بلند و بالا ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے بہت سی آیات میں ان صفاتِ خداوندی کا ذکر کیا ہے جو بندوں کے احوال سے متعلق ہیں اور بندے ان صفات کو اپنے ناقص فہم اور محدود فکر کی حُدود میں سما سکیں۔

قرآن و حدیث میں بیان کردہ صفات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم کی صفات میں جس طرح صفات ثبوتیہ ہیں جیسے حیاتِ علم قدرت سمع

بصر وغیرہ اسی طرح اس کی صفات میں ایک باب تسبیحات و تقدیسات یعنی تنزیہات کا بھی ہے کہ وہ ہر عیب سے منزہ اور پاک ہے ان کو صفات سلبیہ کہا جاتا ہے ۔ صفات کی ان دونوں قسموں کا ثبوت یہ سورہ مبارکہ ہے : قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (سورۃ اخلاص)

کہہ دیجیے (اے ہمارے پیغمبر) وہ خداوند عالم اللہ یکتا ہے ۔ اللہ بے نیاز ہے ۔ نہ کوئی اس سے پیدا ہوا ۔ اور نہ وہ کسی سے ۔ اور نہ ہی اس کا کوئی ہم سر (مشابہ و نظیر) ہے۔

صفاتِ خداوندی کے بیان میں یہ سورت جامع ترین سورت ہے ۔ صحیح بخاری[1] و صحیح مسلم[2] میں روایت ہے کہ ایک شخص جس کو آپؐ نے کسی سفر میں امیر لشکر بنا کر بھیجا تھا ۔ ہر نماز کی ہر رکعت میں جب قرأت ختم کرتے تو قل ہو اللہ احد پہ ختم کرتے ۔ رفقاء نے سفر سے واپسی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا ، ان سے دریافت کرو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں ۔ ان صحابی نے جواب دیا کہ اس سورت میں (میرے رب) رحمٰن کی صفات ہیں اور اس وجہ سے میں اس سورت کو محبوب رکھتا ہوں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جواب سن کر ارشاد فرمایا اس شخص کو خبر کر دو (کہ اس جذبہ کی بدولت) خدا (بھی) تجھے دوست رکھتا ہے (کیونکہ تو اس کی صفت کو محبوب رکھتا ہے ۔)

امام رازی رحمۃ اللہ نے تفسیر کبیر[3] میں ضحاک سے یہ روایت نقل کی ہے کہ مشرکین مکہ نے عامر بن طفیل کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا اور یہ کہا کہ تم جا کر ان سے ہمارا یہ پیغام کہہ دینا ، آپؐ نے اس نئے مذہب کے اعلان سے ہمارے اتحاد و اتفاق کو پارہ پارہ کر دیا ۔ آپؐ ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتے ہیں آپ نے

---

[1] صحیح بخاری جلد اوّل و دوم [2] صحیح مسلم جلد اوّل ۔
[3] تفسیر کبیر جلد ۳۲ طبع جدید ۔

اپنے آباؤ اجداد کے دین کی مخالفت کی ہے تو بتائیے (کہ آخر اس کا کیا سبب ہے ؟) اگر آپؐ تنگدست ہیں تو ہم آپ کو مالدار بنادیں گے اور اگر جنون و دیوانگی ہے تو ہم علاج و دوا کریں گے ۔ اور اگر کسی عورت کی خواہش ہے تو اس سے شادی کردیں گے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب کچھ سُن لینے کے بعد فرمایا اے لوگو! نہ تو میں فقیر و تنگدست ہوں اور نہ ہی میں مجنون و دیوانہ ہوں اور نہ مجھے کسی عورت کی خواہش ہے ۔ میں تو اللہ کا رسول ہوں ۔ تم کو پتھروں اور بتوں کی پرستش کے بجائے خداوند عالم کی عبادت و بندگی کی طرف بلاتا ہوں ۔ مشرکین مکہ نے اپنی بدعقلی اور عناد اور حق کے انحراف کی روش کے باعث دوبارہ آپؐ کے پاس قاصد بھیجا اور یہ احمقانہ سوال کیا بتائیے کہ وہ خدا کیسا ہے اور اس کی جنس کیا ہے جس کی عبادت کی آپ دعوت دیتے ہیں ، وہ خدا سونے کا ہے ، یا چاندی کا ؟ (استغفر اللہ)

مشرکین کے اس سوال پر خداوند عالم نے یہ سورۂ اخلاص نازل فرمائی اس سورت کو سُن کر یہ بدبخت اور بے عقل گروہ کہنے لگا کہ ہمارے تین سو ساٹھ معبود تو ہماری تمام حوائج و ضروریات پوری نہیں کرسکتے تو بھلا ایک خدا ساری مخلوق کی حاجتیں کیسے پوری کرے گا ۔ اس پر سورۂ والصافات کی ابتدائی آیات[1] اور یہ آیتیں نازل کی گئیں :

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ (الآیات سورۃ تغابن)

امام احمد بن حنبلؒ اور امام بخاری نے اپنی تاریخ میں اور حاکم نے مستدرک

---

[1] سورۂ والصافات کی یہ آیات بل عجبت ویسخرون تک نازل کی گئیں جن میں الٰہیت والوہیت کے ساتھ مشرکانہ لغو تصورات اور بیہودہ عقائد کی پوری قوت اور دلائل عقلیہ کی روشنی میں تردید کی گئی ۔ قارئین کرام قرآن کریم کی ان آیات کی تفسیر کے لیے کتب تفاسیر کی مراجعت فرمائیں

میں بروایت ابی بن کعب یہی مضمون بیان کیا ہے کہ مشرکین مکہ کے اس قسم کے سوال پر یہ سورت نازل کی گئی۔

بیہقی اور بعض محدثین کی بیان کردہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء یہود نے یہ سوال کیا تھا تو اس پر سورۃ اخلاص نازل ہوئی۔ لیکن یہ تصریح محتاج تاویل ہے۔ اصل میں تو مکہ مکرمہ ہی میں نازل ہوئی تھی مگر جب پھر مدینہ منورہ میں بھی اسی طرح کا سوال کیا گیا جیسا کہ مشرکین مکہ نے کیا تھا تو اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سورت تلاوت فرمادی۔ اور بالعموم ایسا ہوتا ہے کہ کسی موقعہ پر پہلی نازل شدہ آیات یا کوئی سورت تلاوت کردینے کو بھی راوی کہہ دیتا ہے فنزلت تلك السورة او الآية کہ یہ سورۃ یا یہ آیت اس موقعہ پر نازل ہوئی۔

غرض اس سورۂ مبارکہ میں توحید و الوہیت اور عقائد اسلام کے ایسے بنیادی امور ذکر کیے گئے جن کا تعلق حق تعالیٰ شانہ کی ذات وصفات سے ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ثلث قرآن یعنی تہائی قرآن فرمایا ہے۔ اس وجہ سے کہ مضامین قرآن مجموعی طور پر تین انواع پر مشتمل ہیں۔

۱- مضامین توحید وصفات باری تعالیٰ۔

۲- مضامین کیفیت اعمال عباد یعنی بندوں کے اعمال واحوال اور ان کے متعلقہ احکام خواہ وہ کسی بھی عمل شعبہ سے متعلق ہوں۔

۳- مضامین قیامت واحوال آخرت۔

تو اس لحاظ سے سورۂ اخلاص کو قرآن کا تہائی حصہ فرمایا گیا۔ اور پھر یہ کہ جو صفات خداوندی ان کلمات میں ذکر کی گئیں وہ جملہ صفات خداوندی خواہ وہ ثبوتی ہوں یا سلبی، اضافی ہوں یا ذاتی ان سب صفات کو ان جامع کلمات نے اپنے احاطہ میں لے رکھا ہے۔ اَللّٰهُ اَحَدٌ سے وحدانیت و یکتائی بیان کی گئی جو قدرت وخلق کے جملہ اوصاف کو حاوی اور مشتمل ہے۔

اور یہ عنوان بتارہا ہے کہ وہ ذات حیّ قیوم سمیع علیم اور قادر و مالک ہے اور الصمد[1] سے اس کی شان بے نیازی بیان کر کے اس کی ربوبیت اور انعام و اکرام کے جملہ کمالات بیان کر دیئے۔ اس کا ہر عیب اور نقصان سے منزّہ اور پاک ہونا ظاہر کر دیا۔ اور وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ سے یہ اعلان کر دیا کہ اس کا

---

[1] لفظ صَمَد لغت عربیہ میں دو معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اوّل قصد و ارادہ کرنا تو اس لحاظ سے صمد مصمود یعنی مقصود کے معنی میں ہوگا تو حق تعالیٰ پر اس کا اطلاق ہوگا کہ وہی سب کا مقصود ہے۔ ہر ایک اسی کی طرف قصد کرتا ہے۔ دوسرے صمد کے معنی ٹھوس کے ہیں تو اس معنی کے لحاظ سے ذات خداوندی پر اس کا اطلاق بایں معنی ہوگا کہ وہ ایسا قوی اور زبردست ہے کہ اس پر کسی طرح کا کوئی تغیر نہیں آسکتا۔ گویا یہ عنوان ذات باری تعالیٰ کے واجب الوجود ہونے کو بتارہا ہے۔ یہ تو صرف لغوی حیثیت لفظ صمد کے مفہوم اور ذات پروردگار پر اس کے اطلاق کی وجہ و مناسبت بیان کر دی گئی لیکن اہل عرب کے عرف میں لفظ صمد بہت سے معانی میں مستعمل ہوتا ہے اور حضرات مفسرین کتب تفاسیر میں ان معانی کو بیان کرتے امام رازیؒ قرطبی اور علامہ آلوسیؒ نے بھی ان میں سے بعض معانی ذکر کیے ہیں :

۱۔ جمیع اشیاء کا جاننے والا حاجت روا کیونکہ خلق کی حاجت روائی بغیر علم کے ممکن نہیں ہے

۲۔ سب سے اعلیٰ اور برتر سردار جس سے اوپر کوئی سردار نہ ہو (ابن مسعودؓ)

۳۔ تمام کائنات کا خالق (اصم)

۴۔ ہر کام میں جو مقصود اصلی ہو جس کی طرف ہر معاملہ میں فریاد کی جائے۔ (سدی)

۵۔ اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے والا۔ (حسین بن فضیل)

۶۔ فرد کامل اور بزرگ۔

گویا یہ معانی حق تعالیٰ کی صفات ثبوتیہ کی خبر دے رہے ہیں۔ ان معانی کے علاوہ دوسرے وہ معانی جو صفات سلبیہ پر دلالت کرتے ہیں وہ یہ ہیں : (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نہ کوئی مساوی وہم پلہ ہے نہ ہمسر ہے ۔ نہ کوئی مشابہ و نظیر ہے ۔ نہ ذات میں اور نہ اس کی صفات میں نہ ماضی میں اور نہ حال و مستقبل میں ۔

(بقیہ پچھلے صفحہ کا حاشیہ)

۱ ۔ بے نیاز جس کو کسی کی حاجت نہ ہو ۔

۲ ۔ جس پر کسی کی بالادستی نہ ہو ۔

۳ ۔ جو کھانے پینے کا محتاج نہ ہو ۔

۴ ۔ جس پر کبھی فنا اور زوال طاری نہ ہو اور مخلوق کے فنا کے بعد باقی رہے ۔

۵ ۔ جس پر کسی قسم کا تغیر و زوال واقع نہ ہو (حسن بصری)

۶ ۔ جس پر کبھی موت واقع نہ ہو اور نہ اس کا کوئی وارث بنے (ابی بن کعب)

۷ ۔ جو نہ کبھی سوئے اور نہ اس پر اونگھ طاری ہو (ابو مالک ۔ یمان)

۸ ۔ جس پر کبھی بھول چوک واقع نہ ہو ۔

۹ ۔ وہ جس کے صفات کے ساتھ کوئی موصوف نہ ہو ۔

۱۰ ۔ جو ہر عیب اور نقص سے پاک ہو (مقاتل بن حیان)

۱۱ ۔ جس پر کوئی آفت و حادثہ واقع نہ ہو ۔

۱۲ ۔ جو کسی سے مغلوب نہ ہو ۔ ۱۳ ۔ جس کو کسی کی کوئی پرواہ نہ ہو ۔

۱۴ ۔ جو کسی کو نظر نہ آتا ہو ۔ ۱۵ ۔ جس کی حقیقت و کیفیت دریافت کرنے سے مخلوق نا امید ہو چکی ہو ۔ ۱۶ ۔ وہ جو نہ کسی کو جنے اور نہ وہ کسی سے جنا گیا ہو ۔

۱۷ ۔ جو زیادتی اور نقصان سے پاک ہو ۔

گویا لفظ صمد اپنے ان عربی معانی کے لحاظ سے حق تعالیٰ شانہ کی ان بہت سی صفات کا سرچشمہ ہے جو قرآن کریم کی سینکڑوں آیات میں بیان کی گئی ہیں ، اور نتیجۃً صفات خداوندی کی دونوں قسموں کا مجمع و منبع ہے ۔ اسی وجہ سے لفظ صمد کو اللہ احد اور لم یلد ولم یولد کے درمیان رکھا گیا کہ خالقیت و قدرت اور وحدانیت جیسی صفات ثبوتیہ اور لم یلد ولم یولد جیسی صفات سلبیہ صمدیت ہی کے سرچشمہ سے متفرع ہونے والی صفات ہیں اور یہ جملہ صفات شان صمدیت کے ساتھ مربوط اور وابستہ ہیں ۔ ۱۲ ۔ واللہ اعلم بالصواب (از تفسیر کبیر امام رازی ج ۳۱ ۔ تفسیر قرطبی ۔ الفرحقانی)

صفات خداوندی کے لیے جامع عنوانات خواہ وہ صفات ثبوتیہ ہوں یا سلبیہ، اضافی ہوں یا غیر اضافی جملہ اسماء حسنیٰ ہیں۔ جن کو حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم کی چار سورتوں میں ذکر فرمایا ہے۔ اوّل سورۃ اعراف میں، چنانچہ ارشاد مبارک ہے:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِىْٓ اَسْمَآئِهٖ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔

(سورۃ اعراف)

اور اللہ ہی کے واسطے ہیں پاکیزہ نام پس اے لوگو! انہی ناموں کے ساتھ تم اللہ کو پکارا کرو۔ اور چھوڑ دو تم ان لوگوں کو، جو اللہ کے ناموں میں ٹیڑھی روش اختیار کرتے ہیں۔ عنقریب ان کو سزا دی جائے گی ان اعمال کی جو وہ کرتے تھے۔

دُوسری جگہ فرمایا:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔

(سورۃ بنی اسرائیل)

کہہ دیجیے (اے پیغمبر) تم پکارو اللہ کو اللہ کہہ کر یا پکارو رحمٰن کہہ کر جس کسی نام سے بھی پکارو (تم اسی کو پکار رہے ہو) اس کے واسطے یہ سب اسماء حسنیٰ ہیں۔

ایک اور موقعہ پر فرمایا:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔ (سورۃ طٰہٰ)

اللہ ہی وہ معبود ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں اسی کے واسطے اسماء حسنیٰ ہیں۔

سورۂ حشر کے آخر میں کچھ اسماء حسنیٰ مزید بیان کیے گئے۔ فرمایا گیا:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔

احادیث صحیحہ سے حق تعالیٰ شانہٗ کے حسب ذیل ننانوے اسماء حسنیٰ ثابت ہیں۔ امام ترمذی نے اپنی جامع میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی سند سے بیان فرمایا:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ:

اِنَّ لِلّٰہِ تِسْعَۃً وَّتِسْعِیْنَ اِسْمًا — کہ اللہ کے ننانوے نام یعنی ایک کم سو نام
مِائَۃً اِلَّا وَاحِدَۃً مَنْ اَحْصَاھَا — ایسے ہیں کہ جو ان کا احاطہ کرے وہ
دَخَلَ الْجَنَّۃَ ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ — جنت میں داخل ہوگا اور وہ اسماء یہ ہیں
لَا اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ — الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ الْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُھَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ الْغَفَّارُ الْقَھَّارُ الْوَھَّابُ الرَّزَّاقُ الْفَتَّاحُ الْعَلِیْمُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الْخَافِضُ الرَّافِعُ الْمُعِزُّ الْمُذِلُّ۔ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ۔ الْحَکَمُ الْعَدْلُ اللَّطِیْفُ۔ الْخَبِیْرُ۔ الْحَلِیْمُ الْعَظِیْمُ الْغَفُوْرُ الشَّکُوْرُ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ۔ الْحَفِیْظُ الْمُقِیْتُ الْحَسِیْبُ الْجَلِیْلُ الْکَرِیْمُ الرَّقِیْبُ الْمُجِیْبُ الْوَاسِعُ الْحَکِیْمُ الْوَدُوْدُ الْمَجِیْدُ الْبَاعِثُ الشَّھِیْدُ الْحَقُّ الْوَکِیْلُ الْقَوِیُّ الْمَتِیْنُ الْوَلِیُّ الْحَمِیْدُ الْمُحْصِیْ الْمُبْدِئُ الْمُعِیْدُ۔ الْمُحْیِیْ الْمُمِیْتُ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ الْوَاجِدُ الْمَاجِدُ الْوَاحِدُ الْاَحَدُ الْفَرْدُ۔ الصَّمَدُ الْقَادِرُ۔ الْمُقْتَدِرُ الْمُقَدِّمُ الْمُؤَخِّرُ الْاَوَّلُ الْاٰخِرُ الظَّاھِرُ الْبَاطِنُ الْوَالِیْ۔ الْمُتَعَالِیْ الْبَرُّ۔ التَّوَّابُ الْمُنْتَقِمُ الْعَفُوُّ الرَّءُوْفُ مَالِکُ الْمُلْکِ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ الرَّبُّ الْمُقْسِطُ الْجَامِعُ الْغَنِیُّ الْمُغْنِیْ الْمَانِعُ الضَّارُّ۔ النَّافِعُ النُّوْرُ۔ الْھَادِیْ الْبَدِیْعُ الْبَاقِیْ الْوَارِثُ الرَّشِیْدُ الصَّبُوْرُ

ان میں سے ہر ایک نام پروردگار عالم کی صفات عظیمہ سے ایک ایک صفت کا عنوان ہے۔ ان اسماء حسنیٰ سے مستنبط اور ظاہر ہونے والی صفات کا صرف اجمالی ذکر بھی ایک مستقل کتاب کا محتاج ہے۔ حضرات قارئین کرام اسماء حسنیٰ کی شرح پر مشتمل کتب کی

مراجعت فرمائیں ۔ امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں اسماء حسنیٰ پر اپنی تصنیف کردہ ، عظیم الشان کتاب "لوامع البینات فی تفسیر الاسماء والصفات" کا ذکر فرمایا ۔ اور آیت وللہ الاسماء الحسنیٰ کی تفسیر میں اس سلسلہ کی کچھ اصولی لطیف و دقیق بحثیں فرمائیں ۔ اہل علم حضرات تفسیر کبیر جلد ۱۵ ص ۶۶ کی مراجعت فرمائیں

آیۃ الکرسی قرآن کریم میں سیدۃ الآیات اسی وجہ سے ہے کہ وہ خداوند عالم کی صفات عظیمہ کے بیان پر مشتمل ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن کعب سے دریافت فرمایا :

یا ابا المنذر اتدری ای ایۃ	کہ اے ابوالمنذر جانتے بھی ہو کہ کتاب اللہ
من کتاب اللہ معک اعظم	میں سے اعظم ترین کون سی آیت ہے جو تم کو یاد ہو

تو دوسری دفعہ بھی دریافت فرمانے پر ابی کعب نے جن کی کنیت " ابوالمنذر " ہے جواب دیا اَللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ یعنی آیۃ الکرسی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غایت مسرت سے ان کے سینہ پر ہاتھ مار کر فرمایا اے ابوالمنذر " مبارک ہو تم کو یہ علم " جن خاص اور عظیم الشان صفات پر یہ کلمات مبارکہ مشتمل ہیں ان کی قدرے وضاحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ کلمات کر رہے ہیں ۔

بروایت ۔ عن ابی موسی الاشعری	ابوموسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ
رضی اللہ عنہ قَالَ قَامَ فِيْنَا	علیہ وسلم پانچ باتیں لے کر ہمارے درمیان کھڑے
رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	ہوئے (اور خطبہ میں) یہ ارشاد فرمایا بیشک
بِخَمْسِ كَلِمَاتٍ فَقَالَ إِنَّ اللّٰهَ لَا	اللہ تعالیٰ سوتا نہیں ہے اور نہ ہی یہ اس کی
يَنَامُ وَلَا يَنْبَغِيْ لَهٗ أَنْ يَنَامَ	شان کے لائق ہے کہ وہ سوئے ۔ وہ (رزق
يَخْفِضُ الْقِسْطَ وَيَرْفَعُهٗ يُرْفَعُ	اور اعمال کی) ترازو جھکاتا ہے اور اس کو
إِلَيْهِ عَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ	بلند بھی کرتا ہے ۔ اس کے سامنے رات کا عمل
وَعَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ	دن سے پہلے پیش کیا جاتا ہے اور دن کا عمل
حِجَابُهُ النُّوْرُ لَوْ كَشَفَهٗ لَأَحْرَقَتْ	رات سے پہلے ۔ اس خداوند ذوالجلال کا حجاب

لہ اہل علم آیۃ الکرسی کی تفسیر کے لیے کتب تفاسیر کی مراجعت فرمائیں ۔ ۱۲

سُبُحَاتُ وَجْهِهِ مَا انْتَهٰى اِلَيْهِ بَصَرُهٗ مِنْ خَلْقِهٖ

نور ہے اور اگر وہ اس حجاب کو ہٹا دے تو اس کے وجہ (ذات کبریاء) کی تجلیات و شعاعیں جلا ڈالیں - ان تمام چیزوں کو جہاں تک کہ اس کی نظر اس کی مخلوق میں پہنچے

حیات

صفات خداوندی میں سے جن صفات کو قرآن کریم نے خصوصیت و عظمت اور اہتمام سے بیان کیا ان میں ایک وصف حیات ہے کہ حق تعالیٰ میں صفت حیات اس درجہ کامل و اکمل ہو کہ تمام عالم کی حیات اسی کا پرتو عکس، اور فیض ہو اور ہمیشہ موت سے پاک ہو۔ اور صفت حیات خود اس کی ذاتی ہو نہ یہ کہ کسی غیر کی عطا کردہ ہو کیونکہ دوسرے کی طرف سے عطا کردہ حیات لامحالہ کسی نہ کسی وقت سلب بھی کی جاسکتی ہے تو اس طرح موت اور زوال حیات کا امکان ظاہر ہے جو شان الوہیت کے قطعاً منافی ہے۔ چنانچہ ان دونوں پہلوؤں کو ان دو آیتوں نے واضح کیا۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ کہ وہ معبود یکتا حی قیوم ہے کہ اس کی حیات خود اس کی ذات کے ساتھ لازم و قائم ہے نہ یہ کہ کسی نے اس کو یہ حیات عطا اور بخشش کی ہو - اور اس کے ساتھ یہ کہ وہ ذات سارے عالم کو حیات و زندگی بخشنے والی ہے - اس کو ان الفاظ میں واضح فرمایا گیا:

وَهُوَ الَّذِیْ اَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ۔

وہی خدا ہے جس نے تم کو زندگی بخشی وہی خدا تم پر موت بھی واقع کرے گا اور وہی پھر تم کو دوبارہ جلائے گا۔

غرض صفت حیات خداوند عالم کے لیے اس حیثیت کے ساتھ ثابت ہے کہ اس کی حیات خود اس کی ذاتی ہے یہ نہیں کہ کسی اور نے اس کو یہ حیات عطا کی ہو اور یہ کہ دنیا میں ہر ایک کی حیات اسی کی طرف سے عنایت کردہ حیات ہے اس

مفہوم کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا میں ہر جاندار چیز مجازی طور پر حی ہے۔ حقیقۃً حی تو وہی ذاتِ خداوندی ہے جس کو حیّ قیوم اور حیّ لا یموت کہا جاتا ہے۔

علم

قرآن کریم نے حق تعالیٰ کی صفت علم بھی بکثرت آیات میں بیان کی ہے۔ اور اس کا علیم و خبیر ہونا ہزاروں مضامین کے ساتھ ذکر فرمایا گیا اور اس علم کی شان یہ بیان فرمائی گئی کہ عالم کا کوئی ذرّہ بھی اس کے علم سے مخفی و پوشیدہ نہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ۔ — بے شک اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں ہے نہ زمین میں اور نہ آسمان میں

(آلِ عمران)

عالم میں جو کچھ ہو رہا ہے ازازل تا ابد ہر ہر چیز کا اس کو علم ہے ؎

بر او علم یک ذرہ پوشیدہ نیست
کہ پیدا و پنہاں بنزدش یکے است

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ۔ — کیا وہ پروردگار نہیں جانتا ان چیزوں کو جو اس نے پیدا کیں۔ یقیناً وہی ایک ایسی ذات ہے جو باریک بین اور خبردار ہے (اور اس کا لطیف خبیر ہونا ہی ہر چیز کے عالم ہونے کو کافی ہے۔ چہ جائیکہ وہ خالق بھی ہو)

بہر کیف قرآن کریم نے حق تعالیٰ شانہٗ کی شان علمی کی جامعیت اور کمال کو اس عظمت کے ساتھ بیان کیا:

وَعِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُھَا اِلَّا ھُوَ وَیَعْلَمُ مَا — اور خدا ہی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو بجز اس کے اور کوئی نہیں جانتا اور وہی جانتا

فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ	جو کچھ خشکی میں ہے اور جو کچھ سمندر میں ہے
مِنْ وَرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَ	اور حتیٰ کہ کوئی پتہ درخت سے نہیں گرتا
لَاحَبَّةٍ فِيْ ظُلُمَاتِ الْاَرْضِ	مگر یہ کہ اللہ اس کو جاننے والا ہوتا ہے
وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ	اور نہ ہی کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں ایسا
كِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۔	ہے کہ خدا اس کو نہ جانتا ہو اور نہ کوئی تر
	چیز اور نہ ہی کوئی خشک چیز ہے کہ وہ
	(اللہ کی) کتاب مبین لوح محفوظ اور اس کے
(سورۃ انعام)	علم محیط میں موجود نہ ہو ۔

اور فرمایا :

وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي اللَّيْلِ وَ	اسی کے واسطے ہے ہر وہ چیز جو رات میں
النَّهَارِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ	ٹھہری ہوئی اور وہ جو دن میں وہی سمیع
(سورۃ انعام)	علیم ہے ۔

یہاں تک کہ عالم دنیا اور آخرت کائنات کے زمانہ وجود کے احوال و تغیرات ان کا بقا و فنا، انسانوں کا رزق اور اس کی تنگی و وسعت اور ان کی نقل و حرکت یہ سب کچھ اللہ ہی کے احاطۂ علم میں ہے چنانچہ ارشاد مبارک ہے :

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ	بے شک اللہ ہی کے پاس ہے قیامت کا
وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا	علم اور وہی بارش برساتا ہے اور وہی
فِي الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ	جانتا ہے جو ماؤں کے رحم میں (اولاد)
مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِيْ	ہے (کہ وہ مذکر ہے یا مؤنث) اور کوئی
نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ	نفس نہیں جانتا کہ کل کیا کمائے گا اور نہ ہی
اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۔	کوئی نفس یہ جانتا ہے کہ وہ کس جگہ مرے گا
	(یہ سب کچھ اللہ ہی کے علم میں ہے ۔ بیشک
(سورۃ لقمٰن)	اللہ ہی علیم خبیر ہے ۔

قدرت

صفتِ قدرت کو بھی قرآن کریم نے سینکڑوں آیات میں ذکر فرمایا ہے۔ اور مختلف انواع مضامین کے اختتام پر بار بار اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ دہرایا گیا۔ قرآن کریم نے یہ بھی ظاہر کیا کہ صفت حیات کی طرح قدرت کا وصف بھی دراصل حق تعالیٰ کے واسطے ہے اور دُنیا میں جس کسی شئے میں کسی طرح کی بظاہر کوئی قدرت مثلاً حیوانات اور انسانوں میں چلنے پھرنے دیکھنے اور سننے کی قدرت ہے وہ مجازی ہے۔ اور اللہ ہی کی قدرت قدیمہ اور کاملہ فیض اور عطیہ ہے جب چاہے وہ قدرت عطا کرے اور جب چاہے سلب فرمالے۔ حقیقی اور اصلی قدرت صرف ذات باری تعالیٰ ہی کے ساتھ مختص ہے۔

فلاسفہ اور دہریئے حق تعالیٰ کی قدرت کا انکار کرکے مادی اسباب اور انسان کے قوائے فکریہ وعملیہ ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ اپنے بعض مکتوبات میں تحریر فرماتے ہیں کہ فلاسفہ نے اپنی سفاہت (قلت عقل اور سوءِ فہم) سے ایجاب و اضطراری کو کمال سمجھا اور حق تعالیٰ شانہٗ کو ایسا معطل و بیکار قرار دیا کہ اس سے صرف ایک مصنوع کے صدور کو تسلیم کیا اور وہ بھی اس طرح کہ قدرت و اختیار کا اس میں دخل نہیں اور اس کے بعد تمام حوادثِ کائنات اور واقعات افعال و احوال کو عقل فعّال کی طرف منسوب کیا جس کا وجود خود وہمی ہے اور سوائے فلاسفہ کے تخیل و توہم کے اس کی کوئی حقیقت و واقعیت نہیں۔ اس کے برعکس قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ کائنات کے ایک ذرّہ اور پتّہ کی حرکت بھی اس کی قدرت اور اختیار سے خارج نہیں ہے[1]۔

[1] اثبات قدرتِ خداوندی کے تفصیلی دلائل اور ان پر فلاسفہ کے شبہات اور ان جوابات کا یہ کتاب موضوع نہیں ہے اس لیے ان تفصیلات کے لیے قارئین کرام کتب علم کلام کی مراجعت فرمائیں۔ اسی طرح مسئلہ تقدیر کی تفصیل بھی ان محدود اوراق میں نہیں سماسکتی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سمع و بصر

ان صفات عظیمہ میں سے قرآن کریم نے خاص طور پر وصف سمع و بصر کو بھی ازاوّل تا آخر بے شمار مواقع پر ذکر فرمایا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ پروردگار عالم کی ذات ہر آواز کو سنتی ہے اور ہر چیز کو دیکھتی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيْرٌ۔ — بے شک اللہ ہر چیز کو سننے اور جاننے والا ہے۔ بے شک وہ خدا ہر چیز کو دیکھنے والا ہے۔

اور یہ بات ظاہر ہے کمالات خداوندی اسی کو مقتضی ہیں کہ اس کے واسطے سمع و بصر کی صفت تسلیم کی جائے۔ کیونکہ اس سے خالی اور عاری ہونا عیب ہے، اور یہ ممکن نہیں کہ ذات خداوندی کے واسطے کسی درجہ میں بھی کسی عیب اور نقصان کا تصور کیا جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پتھروں کے بتوں کی پرستش کرنے والوں اس لغو حرکت اور اس پر تحمیق و تجہیل اسی عنوان سے فرمائی اور اپنے باپ آزر کو اس طرح خطاب فرمایا:

لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا (سورۃ مریم) — کہ کیوں ایسی چیز کی پرستش کرتے ہو جو نہ سن سکتی ہے اور نہ وہ کسی چیز کو دیکھ سکتی ہے اور نہ ہی وہ تمہارے کچھ کام آسکتی ہے۔

اور یہ صفت بھی حیات و قدرت کی طرح دراصل خداوند عالم میں ہے۔ کائنات میں جو چیز بھی سمع و بصر کی صلاحیت رکھتی ہے وہ اس میں مجازی اور عارضی ہے۔ اصل خزانہ اسی ذات خداوندی کے پاس ہے وہی سب کو سمع و بصر عطا کرنے والی ہے چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ — اور اسی ذات خداوندی نے پیدا کیا تمہارے واسطے کان اور آنکھیں اور دل مگر پھر بھی

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) اور نیز اسی سلسلہ میں معتزلہ، قدریہ و جبریہ کے مذاہب اور ان کے اوہام کا رد اسی کتاب میں مکمل ہے۔ تفصیل کے لیے علم الکلام حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی مراجعت کی جائے۔

قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۔ بہت کم سو تم اے لوگو ! کہ اللہ کے شکر گزار ہو۔

(سورۃ ملک)

کلام

کمالات الوہیت سے صفت کلام بھی ہے۔ اس وجہ سے کہ گونگا ہونا ایک عیب ہے اور اللہ رب العزت ہر عیب اور نقص سے منزہ و پاک ہے۔ لہٰذا قرآن عزیز نے اللہ کے لیے وصف کلام ثابت کیا اور ارشاد فرمایا گیا۔

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيمًا اور کلام کیا اللہ نے موسیٰؑ سے کلام کرنا۔

اور جس طرح اس کی قدرت اور سمع و بصر مخلوقات کی قدرت اور سمع و بصر کے مشابہ نہیں ہے اور نہ ہی اس کی سمع و بصر مخلوق کی سمع و بصر کی طرح اعضاء (کان آنکھ) کی محتاج ہے اسی طرح اس کا کلام و تکلم بھی زبان جیسے گوشت کے ٹکڑے کا محتاج نہیں ہے جیسے اور صفات اس طرح ثابت ہیں کہ اس کی شان کے لائق ہو۔ علیٰ ہذا القیاس کلام بھی اللہ کے لیے ثابت ہے جس طرح بھی اس کی شان کبریائے بے چون و چگون کے لائق ہو۔[1]

کلام سے عاری ہونے کو معبودان باطلہ کی پرستش پر منجملہ دلائل رد کے ذکر فرمایا گیا۔ اور اسی بنیاد پر کہ جو چیز بولنے پر بھی قادر نہیں بیان کیا گیا کہ اس کی عبادت کرنا ایک کھلی ہوئی حماقت ہے۔ فرمایا۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ اور ڈھال لیا قوم موسیٰ نے ان کے بعد ان مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ کے زیورات سے ایک ڈھانچہ بچھڑے کا

---

[1] مسئلہ کلام اور تکلم خداوندی بھی مسائل کلامیہ میں سے ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ یہاں اس مسئلہ کے بھی پہلوؤں کو بیان کرنا ممکن نہیں۔ کتب علم کلام کی مراجعت فرمائی جائے۔ اسی طرح یہ مسئلہ کہ قرآن اللہ کا کلام کس نوعیت سے کلام لفظی یا نفسی ؟ تو یہ بحثیں بھی ان محدود اوراق میں نہیں سما سکتیں۔ ۱۲۔

خُوَارٌ. اَلَمْ یَرَوْا اَنَّـهٗ لَا یُکَلِّمُھُمْ وَلَا یَھْدِیْھِمْ سَبِیْلًا۔ اِتَّخَذُوْہُ وَکَانُوْا ظَالِمِیْنَ۔

(سورۃ اعراف)

جس کی آواز بیل کی طرح تھی (اور اسی کو اپنا معبود بنا لیا) کیا نہیں دیکھا انھوں نے یہ کہ وہ تو ان سے بات بھی نہیں کر سکتا اور نہ ہی ان کو راستہ بتا سکتا ہے۔ بنا لیا ان لوگوں نے اس کو اپنا معبود اور بے شک وہ اس بارے میں بڑا ہی ظلم کرنے والے تھے۔

غناء اور صمدیت یعنی بے نیازی

احتیاج ایک عیب ہے اور استغناء و بے نیازی کمال ہے۔ اس وجہ سے حق تعالیٰ شانہٗ کی صفت غنا و صمدیت بھی یعنی استغناء و بے نیازی بیان کی اور احتیاج سے اس کو منزہ اور پاک فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ اَللّٰہُ الصَّمَدُ۔

کہ بیشک اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے غنی اور بے نیاز ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ سب ہی اس کے محتاج ہیں۔

وَاللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ۔ (سورۃ محمد)

اور اللہ غنی و بے نیاز ہے اور اے لوگو تم ہی اس کے محتاج ہو۔

ایک حدیث قدسی کا مضمون اس مفہوم کی تمام آیات کی اس طرح تشریح کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، حق تعالیٰ شانہٗ کا فرمان نقل کرتے ہوئے:

"اے میرے بندو! اگر تم میں کے اوّلین و آخرین زندہ و مُردہ جن و انس تر اور خشک چیزیں سب کی سب مل کر دُنیا میں زیادہ متقی اور پاکباز انسان کے قلب پر مجتمع ہو جائیں اور اسی کا نمونہ بن جائیں تو میرے ملک میں (ان سب کا تقویٰ زہد اور عبادت) ایک مچھر کے پر کا بھی اضافہ نہ کر سکیں گے اور اگر یہ سب مل کر دُنیا میں سب سے زائد شقی اور فاسق و فاجر انسان کا نمونہ

بن جائیں تو میرے ملک و سلطنت میں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہ کر سکیں گے

بعض فرقے خدا تعالیٰ کو اس کے وصف تخلیق و تکوین میں مادہ اور روح کا محتاج قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ احتیاج کا ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ بھی شانِ ربوبیت کے ساتھ جمع ہونا ممکن نہیں ہے۔

قدم و بقا یعنی ازلیت و ابدیت

قرآن کریم نے شئون الٰہیہ اور صفات خداوندی میں اس وصف کو بھی بیان اور ثابت فرمایا ہے کہ وہ پروردگار قدیم ہے اس سے قبل کچھ نہیں وہ ابدی ہے کہ اس کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ غرض نہ اس سے قبل کچھ ہے اور نہ اس کے بعد کچھ ہے وہی اوّل ہے اور وہی آخر ہے۔ جیسے کہ ارشاد ربانی ہے:

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ — وہی اوّل ہے اور وہی آخر ہے۔ وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے اور وہی ہر چیز کا پورا پورا علم رکھنے والا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صلوٰۃ اللیل کی دعاؤں میں اور اذکار میں یہ کلمات احادیث سے ثابت ہیں۔ آپ بکثرت فرمایا کرتے:

اللّٰھم انت الاول فلیس قبلك شئ وانت الاٰخر فلیس بعدك شئ وانت الظاھر فلیس فوقك شئ وانت الباطن فلیس دونك شئ۔

لہ اس حدیث قدسی کا مضمون مفصّل ہے۔ پورے مضمون اور کلمات مبارکہ کے لیے صحیح مسلم مشکوٰۃ المصابیح و دیگر کتب حدیث کی مراجعت فرمائیں۔ ۱۲۔

لہ یعنی اے اللہ تو ہی اوّل ہے کہ تجھ سے قبل کوئی چیز نہیں اور تو ہی آخر ہے کہ تیرے بعد کچھ نہیں۔ تو ہی ظاہر ہے کہ تجھ سے فوق و بلند کوئی چیز نہیں اور تو ہی باطن ہے کہ تجھ سے ورا اور پیچھے یعنی پوشیدہ کوئی چیز نہیں۔ ۱۲ (صحیح مسلم)

عقلی طور پر اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر خداوند عالم کو ازلی اور ابدی نہ تسلیم کیا جائے تو لامحالہ وہ حادث ہوگا اور یہ بات قطعی اور یقینی ہے کہ جو چیز بھی حادث اور مخلوق ہوتی ہے اس کا ضرور کوئی نہ کوئی صانع اور موجد ہوتا ہے تو اس طرح ذاتِ خداوندی کا صانع و موجد کا محتاج ہونا لازم آئے گا جو عقلاً محال اور باطل ہے۔ اس لیے کہ وہ خدا ہی کیا ہوگا جو خود اپنے وجود میں دوسرے کا محتاج ہو۔

شیخ سبکیؒ نے "شرح عقیدہ ابن الحاجب" میں بیان کیا ہے کہ واجب الوجود اسی کو کہتے ہیں جس کا وجود اصلی اور ذاتی ہو، اور جس کا وجود اصلی اور ذاتی ہوگا اس کا عدم اور فنا یقیناً محال ہوگا اور یہی مفہوم قدیم اور ازلی ہونے کا ہے۔
یہ وہی چیز ہے جس کو حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس عنوان سے ارشاد فرمایا ہے:

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ — کائنات کی ہر چیز فنا اور ہلاک ہوجانے والی ہے بجز اس پروردگار کی ذات کے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ — ہر وہ چیز جو روئے زمین پر ہے وہ فنا ہوجائے گی، اور باقی رہے گی (اے ہمارے پیغمبر) آپ کے رب کی ذات جو رب بڑے جلال عظمت وہیبت اور اکرام والا ہے۔

(سورۃ الرحمٰن)

اسی مضمون کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ارشاد فرمایا كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ مَعَهُ شَيْءٌ کہ سب سے پہلے اللہ تھا اور اللہ کے ساتھ کوئی چیز نہ تھی۔
امام ربانی رحمۃ اللہ نے مکتوبات میں فرمایا اور یہی تمام اہل اسلام کا اجماعی عقیدہ ہے۔ اسی وجہ سے امام غزالی رحمۃ اللہ نے فارابی اور ابن سینا کی تکفیر کی ہے کہ یہ

ـــــــ
[1] غزالی الاتحاف ج ۱ ص ۲ بحوالہ علم الکلام

لوگ عقول اور نفوس دہیولیٰ اور سمٰوات کے قدیم ہونے کے قائل ہوئے ہیں۔

احاطہ

قرآن کریم نے خداوند کریم کے اوصاف میں سے اس کا محیط ہونا بھی بیان کیا ہے۔

وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطًا۔ (سورۃ نساء)	اور اللہ ہی کے لیے ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہی سے ہر چیز کو احاطہ کرنے والا ہے

جیسے کہ ارشاد مبارک ہے اَلَا اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ۔ کہ کائنات کی کوئی چیز اس کے احاطۂ علم و قدرت اور سمع و بصر سے باہر نہیں ہے۔ عالم کا کوئی ذرہ نہ اس کے علم سے باہر ہو سکتا ہے اور نہ اس کی قدرت و اختیار سے اور نہ اس کے ملک و سلطنت سے۔

حضرت مجدد سرہندی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ تمام اشیاء کو محیط ہے اور سب کے ساتھ اس کو قرب و معیت بھی ہے مگر وہ قرب و معیت اور احاطہ ایسا نہیں ہے کہ جو ہمارے فہم قاصر میں آسکے بلکہ یہ سب کچھ اسی طرح ہے جیسے اس کی شان کے شایاں اور لائق ہو۔ ہم اپنے کشف و شہود سے جو معلوم کرتے ہیں وہ اس سے بھی منزہ اور مقدس ہے[2]۔

اس احاطہ اور قرب و معیت کے بے مثال ہونے کے لیے اس طرح سمجھ لیجیے کہ مثلاً عقل انسان کے ساتھ ہے جس کے واسطے ہم کسی سمت بلندی یا پستی اور اسی طرح اس کی کوئی کیفیت اور صورت تجویز نہیں کر سکتے۔ بس یہی کہ عقل کو ذات انسانی سے تعلق و اتصال ہے یا... نور چشم کو چشم سے یا روح کو بدن سے لیکن اس ربط و اتصال اور تعلق کی نوعیت اور صورت ہمیں معلوم نہیں۔ یہ حال تو حادث

[1] مکتوبات امام ربانی ج ۱ بحوالہ علم الکلام۔

[2] مکتوبات امام ربانی ج ۱ مکتوب ۲۶۶۔

اور مخلوق کا ہے۔ اللہ رب العزت کی شان تو اس سے بہت زائد اعلیٰ وارفع ہے کہ وہ کیفیت و نوعیت کے تشخصات سے بالا و برتر ہے اور قیاس و گمان اور عقل کی پرواز سے بہت بلند ہے۔

تخلیق و تکوین

قرآن کریم نے یہ بھی بتایا کہ تخلیق و تکوین کا وصف بھی صرف اللہ رب العزت ہی کے لیے ثابت ہے۔ وہی سب کا خالق ہے اور کائنات میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ جو اس کی تخلیق و تکوین سے مستثنیٰ ہو۔ خدا تعالیٰ اپنے اختیار و قدرت اور ارادہ سے جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے اور وجود عطا کرتا ہے اور جب چاہتا ہے اس مستعار و عارضی وجود کو واپس لے لیتا ہے:

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (سورۃ یٰسٓ)

پس اس کا تو امر یہی ہے کہ جب کسی چیز کے ایجاد کا ارادہ کرے تو فرمادے کُن (ہوجا) چنانچہ وہ ہوجاتی ہے۔

ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ [1]

اے لوگو! یہی تو تمہارا رب ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں جو ہر چیز کا خالق ہے پس تم سب اسی کی عبادت کرو وہ ہر چیز پر نگران و وکیل ہے۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ [2]

اور (اے ہمارے پیغمبر!) آپ کا رب ہی پیدا کرتا ہے ہر وہ چیز جو چاہے اور چھانٹ لیتا ہے جس کو چاہے ان کو کسی نوع کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

الغرض تمام کائنات کا وجود پروردگار عالم کے وجود ازلی کا ایک عکس اور پرتو ہے

[1] سورۃ انعام ۔ [2] سورۃ القصص ۔

جس طرح کہ زمین کا نور اصلی اور ذاتی نہیں بلکہ محض آفتاب کا فیض اور عطیہ ہے جب چاہے اپنی شعاعوں کے فیض سے اس کو منور کردے اور جب چاہے اس کو محروم کردے۔ بالکل اسی طرح کائنات میں ہر موجود کا وجود اللہ کی صفت تخلیق اور تکوین کا عطا کردہ فیض ہے۔ اور اسی کے وجود ازلی کا عکس اور پرتو ہے جو اسی کے ارادہ اور مشیت کے تابع ہے۔ جب ارادہ کرتا ہے تو اپنے نور وجود کے عکس سے سبع سموات اور ارضین کو منور کردیتا ہے۔ اسی کو فرمایا:

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ : اللہ ہی نور ہے آسمانوں اور زمین کا۔

تو زمین آئینہ ظلمت تھی نور آفتاب نے اس کو منور کیا۔ اسی طرح سمجھ لیجیے کہ کائنات اپنی اصل سے اعدام تھے اور عدم کی ظلمتوں میں مستور و ناپید تھے۔ اللہ رب العزت کے وجود ازلی کے انعکاس نے ان اعدام کو وجود کا نور بخشا۔ لہذا معلوم ہوا کہ موجودات عالم وجود خداوندی کے عکوس اور ظلال (یعنی سائے) ہیں جن کو ہم موجودات اور حقائق کے عنوان سے یاد کرتے ہیں:

کل ما فی الکون وھم او خیال او عکوس فی المرایا او ظلال[1]

اس مضمون کو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ نے مکتوبات میں اور شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ نے تفہیمات میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام جب عزیز مصر ہوگئے تو بچپن کے ایک دوست ملاقات کے واسطے آئے حالات و واقعات ہر ایک نے جب سنا لیے تو یوسفؑ نے فرمایا بتلاؤ تم ہمارے لیے کیا تحفہ لائے ہو؟ مہمان دوست نے کہا میں نے بہت غور کیا اور سوچا کہ آپ کے واسطے کوئی ایسی پیش کش لے کر پہنچوں جو آپ کی شان کے لائق ہو۔ لیکن ہر چند غور کرنے پر بھی کوئی چیز آپ کے شایان شان نہیں ملی، صرف ایک چیز لایا ہوں۔ یہ کہہ کر بغل میں سے ایک آئینہ نکالا اور کہا کہ صرف یہ لایا ہوں تاکہ اس میں آپ اپنے حسن و جمال بے مثال کا مشاہدہ کریں اور جب

---

[1] علم الکلام۔

یہ دیکھیں تو مجھے یاد کر لیا کریں۔

بعینہٖ یہ بات اس مقام پر سمجھ لیجیے کہ جمال کبریائی کے لیے مخلوق کی طرف سے کسی آئینہ کا تحفہ چاہیے تھا تو اس مخلوق نے اپنے خالق کردگار کی بارگاہ میں اپنے عدم و نیستی اور ذلت و خواری کا آئینہ پیش کیا تاکہ اس آئینہ نیستی میں اس واجب الوجود کی ہستی کا اور اس آئینہ ذلت و خواری میں اس ذو الجلال و الاکرام کی عزت و جلال کے عکس کا مشاہدہ کیا جا سکے جیسے کہ آئینہ میں خود اپنی کوئی صورت نہیں اس میں ایک موجود اور حقیقی چیز کا عکس نمایاں ہوگا۔ اسی طرح کائنات کے اس آئینہ نیستی میں سوائے عدم اور نیستی کے اور کچھ نہ تھا۔ اب ہر موجود کا وجود اصل واجب الوجود کے وجود ذاتی ہی کا جلوہ اور پرتو ہے۔ قرآن کریم کی یہ آیت اس حقیقت کو آشکار کر رہی ہے اولا یذکر الانسان انا خلقنٰہ من قبل ولم یک شیئًا۔ عارف رومیؒ نے مثنوی[1] میں اس کو بیان فرمایا ہے۔ اہل علم مراجعت فرما کر عارف رومیؒ کے حقائق و لطائف سے مستفیض ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر شے کی تین حالتیں ہوتی ہیں۔ ابتدائی، درمیانی اور انتہائی اور ہر حالت دوسری حالت سے جدا اور ممتاز ہوتی ہے اور ہر ایک کے احکام بھی بالکل علیحدہ اور جداگانہ ہیں۔ ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا عقل کے خلاف ہے۔ اسی طرح سمجھ لیا جائے کہ دنیا کی بھی تین حالتیں ہیں اور ہماری نظروں کے سامنے نہ تو اس کی ابتدائی حالت ہے کہ دنیا کیا تھی اور کیسی تھی اور نہ وہ حالت ہے کہ آخر میں دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ صرف درمیانی حالت ہی ہماری نظروں کے سامنے ہے اور یہ حالت موجودہ ایک عدم سے نکل کر حاصل ہوئی ہے اور پھر اس کے بعد اس حالت موجودہ پر عدم اور فنا طاری ہوگی۔

ہمارا یہ علم بالکل اس مچھر کی طرح جو نہ باغ کی ابتدا جانتا ہے اور نہ اس کو

---

[1] عارف رومیؒ نے یہ مضمون دفتر اول صفحہ ۲۸۸ ج ۱ میں ان اشعار سے شروع فرمایا ہے ۔۔۔ گفت یوسف ہیں بیاور ارمغاں   او ز شرم این تقاضا زد فغاں

اس باغ کی انتہا کا علم ہے وہ تو بس موسم بہار میں ہی پیدا ہوا اور اسی میں ختم بھی ہوجائے گا۔ تو جو لوگ دنیا میں عقل کے مدعی تو ہیں لیکن نہ عالم کی ابتدا جانتے ہیں اور نہ اس کی انتہا کی خبر ان کا علم و فلسفہ بر ساتی مچھر ہی کے درجہ کا معلوم ہوتا ہے۔ تفصیل کے لیے علم الکلام کی مراجعت فرمائیں۔

وجود و لقاء اور حیات و موت کے علاوہ عالم موجودات میں پائی جانے والی چیزوں کے خواص و تاثیرات کے بارے میں بھی قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ اسی پروردگار عالم کے وصف تخلیق و تکوین کا مظہر ہیں۔ ارشاد رب العزت اسی بات کی ترجمانی کر رہا ہے:

أَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ءَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ۔

(سورۃ واقعہ)

اے لوگو! پھر یہ تو بتاؤ کہ یہ آگ جس کو تم جلاتے ہو کیا تم نے اس کے درختوں کو اگایا ہے (اور اس میں گویا آتشی مواد پیدا کیا) یا ہم اس کے پیدا کرنے والے ہیں۔

یہ اسی کی شان ہے کہ:

جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنتُم مِّنْهُ تُوقِدُونَ

سورۃ یٰس

جس نے تمہارے سبز و شاداب درختوں سے آگ بنائی پھر تم ہو کہ اب اسی سے آگ سلگا رہے ہو۔

بہرکیف صفاتِ خداوندی غیر محدود و غیر متناہی ہیں اور اس باب سے متعلق وہ تفصیلات جو قرآن کریم کے آیات سے ماخوذ ہیں اگر جمع کی جائیں تو ایک ضخیم تر کتاب ہوجائے۔ مثال کے درجہ میں ان چند صفات عظیمہ کو جو بیان کر دیا تاکہ یہ سمجھ لیا جائے کہ قرآن حکیم کس جامعیت و تحقیق کے ساتھ حق تعالیٰ کی ذات و صفات پر کلام کر رہا ہے۔ قرآن کریم نے حق تعالیٰ کی ذات و صفات کا تعارف اس انداز سے کرایا ہے کہ ہر دیکھنے والا یہ کہنے پر مجبور ہوگا:

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ اور وہ کسی کے ساتھ متحد نہیں۔
اور نہ اللہ رب العزت اپنی مخلوقات میں سے کسی کے اندر حلول کیے ہوئے ہے
جیسے نصاریٰ کہتے ہیں خدا تعالیٰ اور عیسیٰؑ اور روح القدس تینوں مل کر ایک ہیں
اور خدا عیسیٰ میں حلول کیے ہوئے ہے۔ العیاذ باللہ

تو خداوند عالم کی حقیقی معرفت اور اس کی ذات و صفات کا علم صرف قرآن کریم ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ قومیں جن کو آسمانی کتابیں دی گئی تھیں انہوں نے اپنی تحریفات سے اپنے عقائد و مذہب اور کتابوں کو ایسا مسخ کر ڈالا کہ کوئی صحیح العقل انسان ان کے ذریعے اپنے خدا کو نہیں پہچان سکتا۔ یہ خوبی صرف اسلام اور قرآن ہی کو حاصل ہے۔

صفات متشابہات

قرآن کریم میں ایک باب حق تعالیٰ شانہٗ کی صفات متشابہات کا بھی ہے، ارشاد مبارک ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ	وہی ذات خداوندی ہے جس نے آپ پر
الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ	ایسی کتاب نازل کی جس میں سے کچھ آیات تو
هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ	محکمات یعنی واضح اور کھلی کھلی ہیں، جو
مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ	ام الکتاب یعنی بنیاد اور جڑ ہیں اور کچھ
فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ	دوسری آیات متشابہات (اور پیچیدہ) ہیں
مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ	پھر وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے اس
الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ	میں سے پیچیدہ اور متشابہات کے پیچھے
وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ	پڑ جاتے ہیں گمراہی کا راستہ تلاش کرنے
وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ	کے لیے اور اس کی تاویل کرنے کے لیے حالانکہ
اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا	اس کی تاویل (حقیقت) کو سوائے خدا کے

وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ۔ (آل عمران)

اور کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ علم میں ثابت و مضبوط ہیں وہ یہ کہتے ہیں "ہم اس پر ایمان لائے۔ یہ سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ نصیحت وہی لوگ قبول کیا کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔

قرآن کریم میں وہ آیات جن پر احکام شریعت، حلال و حرام فرائض و واجبات اصول دین ایمان باللہ والرسول امور آخرت، جنت و جہنم معاشرت و اخلاق کا دارومدار ہے ان کو اُم الکتاب (یعنی محکمات) کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں کتاب الٰہی کی اساس و بنیاد ہیں یہ آیات صریح اور واضح ہوتی ہیں جن میں کسی نوع کی تاویل کی گنجائش نہیں ہوتی لیکن کہیں کسی مصلحت بعض کلمات آیات رمز اور اشارہ کے درجہ میں ہوتے ہیں۔ ان کا مفہوم بعض جگہ عقول و علوم کی پرواز سے بلند تر ہوتا ہے اور کہیں نہایت مبہم و پیچیدہ ہوتا ہے اور کہیں اس کی مراد میں ایسے احتمالات ہوتے ہیں ان میں سے کسی ایک کو طے اور معین کرنا بہت مشکل ہوتا ہے ایسی آیات کا نام متشابہات ہے۔ محکم لغت میں مضبوط شے اور بنیاد کو کہا جاتا ہے اور متشابہ ایسی دو چیزوں کو کہا جاتا ہے جو آپس میں ملی جلی ہوں۔ قرآن کریم نے مجموعی طور پر کل آیات قرآنیہ کو کِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ کے عنوان سے جو تعبیر کیا اس کا مفہوم یہ ہے کہ تمام آیات قرآنیہ حسن و خوبی اور معجزانہ فصاحت و بلاغت اور اسرار و دقائق میں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ انسانوں کے کلام کی طرح نہیں کہ ان کے کلام کا ایک حصہ اگر فصیح ہوتا ہے تو لبا اوقات دوسرا حصہ اس کلام کا معیار فصاحت سے گرا ہوا ہوتا ہے۔ اور اس لحاظ سے قرآن کا ہر لفظ محکم اور مضبوط ہے جس کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں بدل سکتی۔ کل قرآن محکم ہے تو اس لحاظ سے اس آیت مبارکہ "الٓـر

"کِتَابٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ" میں قرآن کریم کے تمام آیات محکمات فرما دی گئیں لیکن باعتبار مفہوم کی وضاحت و تعیین اور اس کی پیچیدگی و ابہام آیات قرآنیہ ان دو قسموں پر منقسم ہیں جن کو اس آیت آل عمران میں ذکر فرمایا گیا : ھُوَالَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ مِنْہُ آیَاتٌ مُّحْکَمَاتٌ ھُنَّ اُمُّ الْکِتَابِ وَ اُخَرُ مُتَشَابِھَاتٌ۔

متشابہ اصطلاح اس کلام کو کہا جاتا ہے جس کی مراد و مفہوم متعین نہ ہو اور اس میں ایسے متعدد احتمالات مساوی درجہ کے موجود ہوں کہ کسی ایک کی ترجیح اور تعیین ممکن نہ ہو۔

علماء اصول نے کلام کی تقسیم اس طرح کی ہے کہ جو کلام کسی معنی کے لیے موضوع ہے اگر اس میں معنی موضوع کے علاوہ کسی دوسرے کا احتمال نہیں اور وہ کلام اسی مقصد کے لیے ذکر کیا گیا ہے تو اس کو نص کہتے ہیں اور اگر ایک معنی کے سوا دوسرے معنی کا احتمال بھی برابر درجہ کا ہے تو اس کا نام مشترک ہے اور اس حیثیت سے کہ اس میں سے کسی ایک کی تعیین نہیں ہو سکی مُجْمَل کہا جاتا ہے ۔ اور اگر ایک احتمال قوی ہو اور دوسرا ضعیف تو قوی کے لحاظ سے ظاھر کہتے ہیں، اور ضعیف کے لحاظ سے مأوّل کہتے ہیں۔

ان میں نص اور ظاھر کو محکم کے درجہ میں شمار کیا جاتا ہے ۔

اصول فقہ میں بعض علماء محققین نے اس طرح تقسیم کی ہے۔ جو کلام کسی معنی پر ظاہراً دلالت کرتا ہے اور اس میں کسی دوسرے معنی کی گنجائش اور احتمال بھی ہے تو اگر یہ معنی نفس الفاظ سے سمجھے جاتے ہیں تو اس کو ظاھر کہیں گے ۔ اور اگر یہ معنی ایسے ہوں کہ کلام اسی مقصد کے لیے جاری کیا گیا تو اس کو نص کہا جائے گا اور عرفاً آیات و احادیث کو نصوص قرآن و نصوص حدیث سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کلام میں ایک معنی کے سوا کسی دوسرے معنی کا کوئی احتمال و گنجائش نہ ہو تو اگر نسخ کا امکان ہے تو اس کو مُفَسَّر کہتے ہیں اور اگر نسخ کا

ابہام بھی باقی نہیں تو اس کو مُحکَم کہا جائے گا ۔ اور اگر کلام کی دلالت ظاہراً کسی معنی پر مفہوم نہیں ہوتی بلکہ اس میں خفا و پوشیدگی ہے ۔ مفہوم کا یہ خفا و پوشیدگی کسی عارضی سبب کی وجہ سے ہے اور وہ زائل ہوسکتا ہے تو اس کو خفی کہا جائے اور مراد کا ابہام اور خفا اصل الفاظ و کلمات ہی میں ہے اور وہ ابہام و خفا قرائن کی مدد سے دُور ہوسکتا ہے تو اس کو مُشکل کہیں گے ۔ اور اگر یہ ابہام وخفا قرائن کی مدد اور تتبع سے بھی دُور نہیں ہوسکتا تو اس کو مُجمَل کہا جائے گا ۔ اگر آئندہ اس ابہام کے دُور ہونے کی توقع ہو ۔

اور اگر یہ اُمید و توقع بھی ختم ہوجائے تو اس کا نام اہلِ اصول کے یہاں متشابہ ہے ۔ اس آیت آلِ عمران میں متشابہات سے اسی مفہوم کے لحاظ سے متشابہ مُراد ہے اور ایسے متشابہات کی مُراد سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا اور اس سلسلہ میں بعض عارفین اور سلف سے جو لطائف و اسرار ذکر اور نقل کیے گئے ہیں وہ صرف وجدانی اور باطنی رموز و اسرار کا درجہ رکھتے ہیں ۔ ان کو مفہوم کلام اور مرادِ خداوندی قطعی اور یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا ۔ چنانچہ عبداللہ بن عباسؓ ، ام المؤمنین عائشہؓ مالک بن انسؒ اور امام ابوحنیفہؒ و دیگر ائمہ فقہا و مفسرین اور قرأ سے یہ نقل کیا گیا کہ " لَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ " پر کلام تمام ہوگیا اور وقف لازم ہے ، اور " وَالرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ " علیحدہ کلام ہے ۔ ماقبل پر عطف نہیں ہے اور وصل کے ساتھ ملاکر پڑھنا بھی درست نہیں ۔ یہی قول سلف اور متاخرین کے نزدیک ۔ یہ سب اس آیت کی اس طرح تفسیر کرتے ہیں ۔ کہ راسخین فی العلم کا تو یہ قول ہے اور وہ یُوں کہتے ہیں متشابہات کو علم الٰہی کے حوالہ کرتے ہُوئے کہ ہم اس پر ایمان لائے سب کچھ ہمارے رب ہی کی طرف سے ہے اور جو چیزیں علم الٰہی کے حوالہ کردی گئیں ان کی کھوج میں لگنا درحقیقت فطرت کی کجی اور قلوب کا زیغ (ٹیڑھاپن) ہے اس لیے یہ حضرات راسخین فی العلم تو صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ ان پر ایمان لاکر اللہ کے حوالہ کردیں بلکہ ایسے کجرووں کی روش سے

بھی پناہ مانگتے ہوئے دعا کرتے ہیں : رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا ۔ کہ اے اللہ تو ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کرنا بعد اس کے کہ تو نے ہم کو ہدایت دی ۔ اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے زائغین کا حال بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جب ایسے لوگوں کو دیکھو تو ان سے پرہیز کرنا ــــ حقیقت یہ ہے کہ تمام ملتیں اور ادیان سماویہ اس پر متفق رہی ہیں کہ خداوند عالم کی صفات وکمالات کو ایسی تعبیرات ومحاورات میں ذکر کیا جاتا ہے جو معروف ہوں اور سامعین کے اذہان وعقول ان کو سمجھ سکیں تو یہ تعبیرات محض تفہیم کے لیے ہوتی ہیں تو جب حق تعالیٰ کا سمیع وبصیر ہونا اس بات کو مستلزم نہیں کہ مخلوق کی طرح وہ جسم واعضاء کے ساتھ متصف ہو ۔ بلکہ اس کے باوجود کہ وہ حقیقۃً سمیع ہے ۔ کائنات کی آوازیں سنتا ہے اور بصیر کہ ایک ایک ذرہ عالم کا اس کی نگاہ کے سامنے ہے ۔ پھر بھی وہ کان اور گوشہ چشم سے منزہ ہے ، اور مخلوق کے ساتھ کسی درجہ میں بھی اس کی مشابہت ومماثلت نہیں اور اس کی شان لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ ہے تو اسی طرح وہ صفات جو متشابہات کے باب سے ہیں مثلاً اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی کہ رحمٰن عرش پر مستوی ہے اور یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ کہ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پہ ہے ۔ ان سے بھی ممکن نہیں کہ حق تعالیٰ کے لیے کوئی ایسی کیفیت اور صفت ثابت وتصور کی جائے جو حادث اور مخلوق کے لوازم اور خصائص ہے بلکہ ان میں بھی ایمان واعتقاد رکھنا ہوگا کہ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَّهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ خالق ومخلوق کے درمیان کسی قسم کا قیاس جاری کرنا عقلاً ممکن نہیں اور نہ ہی باہم کسی امر میں مماثلت مشابہت کا تصور جائز ہے جب کہ صورت یہ ہے کہ مخلوق کا مخلوق پہ قیاس نہیں کیا جا سکتا ۔ ایک آواز دوسری پہ قیاس نہیں کی جا سکتی ۔

ایک صورت پہ دوسری کو ایک خوشبو دوسری خوشبو پہ وعلیٰ ہذا القیاس ہر ایک کا حال اور رنگ جدا ہوتا ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے خالق کو مخلوق پہ قیاس کر لیا جائے ۔

انسان اپنی محدود ناقص فہم و عقل اور قلیل علم سے اُس ذات قدوس کی صفات کا کیسے ادراک کر سکتا ہے جو غور و فکر نہایتوں سے زائد عمیق اور عقل کی پرواز سے بلند و بالا ہے۔

ذات رب العالمین اور اس کی صفات کا علم تو درکنار انسان کو تو خود اپنی ذات کا بھی پورا ادراک نہیں۔ بڑے بڑے حکماء اور فلاسفہ دُنیا میں گذر گئے لیکن جسم اور رُوح کی حقیقت آج تک نہ سمجھا سکے۔ اسی بناء پر حق تعالیٰ نے حکمت و فلسفہ کے دعوے کرنے والوں اور اپنے علم عقل و ادراک پہ ناز کرنے والوں کو فرما دیا گیا:

وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۔ (بنی اسرائیل)

کہ اے لوگو! تم کو علم میں سے کچھ نہیں دیا گیا بجز ایک بہت ہی قلیل حصہ کے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمت کو ارشاد ہے:

تَفَكَّرُوْا فِى الْخَلْقِ وَلَا تَفَكَّرُوْا فِى الْخَالِقِ وَاِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى وَلَا فِكْرَةَ فِى الْخَالِقِ۔

اے لوگو! مخلوق میں غور و فکر کر لیا کرو، خالق میں نہیں۔ بیشک تمہارے رب تک سب چیزیں ختم ہو جاتی ہیں۔ خالق (کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے) فکر نہ کرنا چاہیے۔

استواء علی العرش

اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی

شیخ الاسلام استاذ محترم حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ فوائد قرآن کریم میں فرماتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی صفات و افعال کے متعلق یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ نصوص قرآن و حدیث میں جو الفاظ حق تعالیٰ کی صفات بیان کرنے کے لیے اختیار کیے جاتے اُن میں اکثر وہ ہیں جن کا مخلوق کی صفات پر بھی استعمال ہُوا ہے۔ مثلاً خدا کو حیّ، سمیع، بصیر، متکلّم کہا گیا۔ اور انسان پر بھی یہ الفاظ اطلاق کیے گئے تو ان دونوں مواقع میں استعمال کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے۔ کسی مخلوق کو سمیع و بصیر کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس کے پاس دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان موجود ہیں۔ اب اس میں دو چیزیں ہوئیں، (جن کو سمجھنا اور ملحوظ رکھنا ضروری ہے) ایک وہ آلہ جسے "آنکھ" کہتے ہیں اور جو دیکھنے کا مبداء اور ذریعہ بنتا ہے۔ دوسرا اس کا نتیجہ اور غرض و غایت (دیکھنا) یعنی وہ خاص علم جو رویت بصری سے حاصل ہُوا مخلوق کو جب بصیر کہا تو یہ مبدا اور غرض و غایت دونوں چیزیں مُراد و معتبر ہوئیں اور دونوں کی کیفیات ہم نے معلوم کر لیں۔ لیکن یہی لفظ جب خدا کی نسبت استعمال کیا گیا تو یقیناً وہ مبادی اور کیفیات جسمانیہ مُراد نہیں ہو سکتیں جو مخلوق کے خواص میں سے ہیں اور جن سے خداوند قدوس قطعاً منزّہ ہے۔ البتہ یہ اعتقاد رکھنا ہوگا کہ ابصار دیکھنے کا مبداء اس کی ذات اقدس میں موجود ہے اور اس کا نتیجہ یعنی وہ علم جو رویت بصری سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کو بدرجہ کمال حاصل ہے۔ آگے یہ کہ وہ مبداء کیسا ہے اور دیکھنے کی کیا کیفیت ہے؟ تو بجز اس بات کے کہ

اس کا دیکھنا مخلوق کی طرح نہیں" ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ نہ صرف سمع و بصر بلکہ اس کی تمام صفات کو اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ صفت باعتبار اپنے اصل مبداء اور غایت (دونوں) کے ثابت ہے مگر اس کی کوئی کیفیت نہیں بیان کی جا سکتی اور نہ شرائع سماویہ نے اس کا مکلّف بنایا ہے کہ آدمی اس طرح کی ماوراء العقل حقائق میں خوض کر کے پریشان ہو"..... اسی طرح استوا علی العرش کا مفہوم بھی اس ضابطہ اور قاعدہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے سمجھ لیا جائے:

عرش کے معنی تخت اور بلند مقام کے ہیں۔ استواء کا ترجمہ اکثر محققین نے استقرار و تمکن سے کیا ہے گویا یہ لفظ تخت حکومت پر اسی طرح قابض ہونے کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کا کوئی گوشہ اور حصہ حیطۂ نفوذ و اقتدار سے باہر نہ رہے اور نہ قبضہ و تسلط میں کسی قسم کی مزاحمت اور گڑبڑ پائی جائے۔ سب کام اور انتظام برابر ہو۔

اب دنیا میں بادشاہوں کی تخت نشینی کا ایک تو مبداء اور ظاہری صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت یا غرض و غایت یعنی ملک پر پورا تسلط و اقتدار اور نفوذ و تصرف کی قدرت حاصل ہونا۔ حق تعالیٰ کے "استوا علی العرش" میں یہ حقیقت اور غرض و غایت بدرجۂ کمال موجود ہے یعنی آسمان و زمین (کل علویات و سفلیات) کو پیدا کرنے کے بعد ان پر کامل قبضہ و اقتدار اور ہر قسم کے مالکانہ اور شہنشاہانہ تصرفات کا حق بے روک ٹوک اسی کو حاصل ہے جیسا کہ دوسری جگہ " ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ" کے بعد یُدَبِّرُ الْاَمْرَ وغیرہ الفاظ بیان فرمائے گئے۔ کہیں یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ سے اسی مضمون پر متنبہ فرمایا گیا۔ رہا استواء علی العرش کا مبداء اور ظاہری صورت سو اس کے متعلق وہی عقیدہ رکھنا چاہیے جو سمع و بصر وغیرہ صفات میں واضح کیا گیا کہ اس کی کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی جس میں صفات مخلوقین اور سمات (علامات) حدوث کا ذرہ برابر

مشابہ ہو پھر کیسی ہے ؟ اس کا جواب وہی ہے کہ ؎

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
و زہر چہ گفتہ اند شنیدم و خواندہ ایم
منزل تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہمچناں در اوّل وصف تو ماندہ ایم

الغرض جس طرح وہ ذات کبریا بغیر آنکھ اور کان کے بصیر وسمیع ہے بالکل اسی طرح وہ بغیر جہت اور مکان کے "مُسْتَوِیْ عَلَی الْعَرْشِ" بھی ہے۔ اگر بغیر کان اور آنکھ کے سننا اور دیکھنا ممکن ہے تو بغیر کسی جہت وسمت اور مکان کے عرش پر مستوی ہونا بھی ممکن ہے اور جس طرح اس کے علیم و بصیر اور سمیع ہونے کی کیفیت عقل کی پرواز و احاطہ سے بالا و برتر ہے اسی طرح استواء علی العرش کی کیفیت بھی ہمارے ادراک اور عقل کے احاطہ سے وراء الوراء اور بلند و بالا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ سے جب استواء علی العرش کی کیفیت کو دریافت کیا گیا تو فرمایا "اَلْاِسْتِوَاءُ مَعْلُوْمٌ وَالْکَیْفُ مَجْهُوْلٌ وَالْاِیْمَانُ بِهٖ وَاجِبٌ وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ" کہ استواء علی العرش تو معلوم ہے۔ لیکن کیفیت اس کی مجہول و غیر معلوم ہے اور اس پر ایمان لانا واجب و لازم ہے اور اس کا سوال اور تحقیق و تفتیش بدعت ہے"۔ کیونکہ نہ اس کی کیفیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی اور نہ ہی حضرات صحابہؓ نے اس کا بارگاہ نبوت میں سوال کیا۔ اس بناء پر اس بحث میں پڑنا بدعت ہے۔ اس سلسلہ بحث میں مجانی الادب جلد ۴ و مشارق الانوار میں حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ کے چند اشعار نقل کیے ہیں جن کو امام المتکلمین و شیخ المحدثین حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی ہنے اسلام کے بنیادی اصول پر تالیف کردہ کتاب علم الکلام میں مع تشریح و توضیح بیان فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے[1]

---

[1] ان اشعار اور ترجمہ کے لیے حضرات قارئین علم الکلام ص۱۲۵ کی مراجعت فرمائیں۔

امام رحمۃ اللہ فرماتے ہیں :

" جو شخص استواء علی العرش کی کیفیت و حقیقت کو سمجھنا چاہیے اس سے کہہ دو کہ اس کی تفتیش و تحقیق کو چھوڑ دو کیونکہ یہ ایک سربستہ راز ہے جس کے سامنے بڑے بڑے مایۂ ناز عقلاء و علماء کی گردنیں خم ہو گئی ہیں "

" اے انسان تو خود اپنی حقیقت سے تو واقف نہیں ہے اور نہ یہ کہ تو کون ہے اور کس طرح ہے اور نہ ان صفات کو جانتا ہے جو تیرے میں پوستہ ہیں خود ان کے اسرار و دقائق کے ادراک میں عقلیں حیران ہیں ۔

آخر تو بتا کہ تیری رُوح کہاں ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے کیا تو اس کو دیکھتا ہے یا تو یہ دیکھتا ہے کہ وہ کس طرح حرکت کرتی ہے ۔ اسی طرح تو اپنے سانس اور ان کے انقطاع کے راز کو نہیں جانتا ۔ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ عقل و فہم کہاں چلی جاتی ہے جب کہ انسان محو خواب ہو تو اپنے کھانے پینے اور ہضم کے نظام اور اس کی ماہیت کو نہیں سمجھتا تو اپنی آنتوں کی حقیقت سے بے خبر ہے جو تیرے دو پہلوؤں کے درمیان ہیں تو بھلا تو کیسے اس ذات کی صفات و حقیقت کا ادراک کر سکتا ہے جو عرش پر مستوی ہے ۔ فرمایا :

" لَا تَقُلْ كَيْفَ اسْتَوٰى كَيْفَ النُّزُوْلُ "

مت پوچھ کہ کیونکر اللہ عرش پر مستوی ہے اور کس طرح اللہ آسمانِ دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے ۔

وہ خداوند عالم تو کَیْفَ اور اَیْنَ (کیونکر اور کہاں) سب سے منزّہ ہے ۔ کیونکہ وہ تو خود " رَبّ کَیْفَ و اَیْنَ " ہے ۔ وہ پروردگار تو عقل و فہم کی پرواز سے اس قدر بالا و بلند ہے کہ اس کے بعد کوئی بلندی ہی نہیں وہ ہمارے ہر تصور اور ہر قول سے فوق اور برتر ہے "

شیخ ابوالطاہر قزوینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں خداوند عالم نے کائنات کو مختلف طبقات پر تقسیم کیا ہے۔ اوّل زمین اور پانی کا طبقہ ہے پھر کرۂ ہوا اور کرۂ نار ہے اور ان کے بعد سبع سموات اور سبع سموات پر کرسی جلال اور کرسی جلال پر عرش عظیم۔ عرش کے بعد کسی چیز کا وجود ثابت نہیں سبع سموات اور سبع ارضین (ساتوں آسمان اور زمین) کو عرش عظیم محیط ہے اس وجہ سے کائنات کا سلسلہ عرش عظیم پر ختم ہو جاتا ہے اور کوئی مخلوق دائرہ عرش سے باہر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کہ اس کی کرسی (جو عرش عظیم پہ ہے) آسمانوں اور زمین کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔ قرآن کریم میں استویٰ کا لفظ ان معانی میں بکثرت مستعمل ہے۔

۱۔ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰى — یعنی جب وہ اپنی توانائی کو پہنچ گیا اور اس کی جوانی پوری ہوگئی
اے استتم شبابہ

۲۔ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ — جب کھیتی نے نکالا اپنی سوئی کو پھر اس کو مضبوط کیا پھر موٹا پایا ہوا۔ پھر کھیتی اپنی پنڈلی یعنی شاخوں پر کھڑی ہوگئی مراد یہ کہ مکمل ہوگئی اور پک گئی۔

۳۔ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ — کیا برابر ہیں وہ لوگ جو علم والے ہیں اور وہ لوگ جو نہیں جانتے۔

نہایت اور کمال پر پہنچ جانے کو بھی اہل عرب استواء کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ استواء شمس اور استواء میزان محاورہ اسی لحاظ سے متعارف ہے۔
کسی کی پشت پر سوار ہو جانا اور قابو پا لینے کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ — کہ پس جب اے نوح تم اور وہ مومنین جو تمہارے ساتھ ہیں کشتی پر سوار ہو جائیں

لِتَسْتَوُوا عَلٰی ظُهُوْرِهٖ ۔ کہ ان جانوروں کو پیدا کیا تاکہ تم ان کی پشت پر سوار ہو۔

اور یہ لفظ ٹھہرنے کے معنی میں بھی مستعمل ہوا ہے۔ چنانچہ فرمان ہے :

وَاسْتَوَتْ عَلَی الْجُوْدِیِّ اور وہ کشتی نوح پہاڑ جودی پر ٹھہر گئی۔

اور کسی چیز کی تخلیق و پیدائش کو مکمل کر دینے کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔

فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ کہ خداوند عالم نے کائنات کی تخلیق سات آسمان پیدا کر کے مکمل فرما دی۔

اعتدال و تناسب کو قائم کرنے کے بھی معنی ہیں جیسے کہ فرمایا گیا :

یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ ۔ اے انسان تجھ کو کس چیز نے تیرے رب کریم کے معاملہ میں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے جس نے تجھ کو پیدا کیا اور تیرے بدن کو نہایت درستگی و اعتدال سے بنایا۔

تو غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ جس قدر ان معانی عرفیہ اور شعار فرمیں اہل عرب کے یہاں استعمال ہوا وہ سب معانی اپنی اپنی ایک جھلک کے ساتھ حق تعالیٰ شانہٗ کی اس صفت جو اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی میں ذکر فرمائی گئی جلوہ افروز ہیں۔ پھر یہ بات بھی نہایت ہی بلند حکمت و لطافت اپنے میں رکھتی ہے کہ قرآن عزیز نے لفظ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ چھ جگہ ذکر فرمایا ہے اور ہر جگہ اس سے قبل سبع سموات و سبع ارضین کی تخلیق کا تذکرہ فرمایا جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس خداوند عالم نے زمین و زمان اور کون و مکان سب کو پیدا فرمایا اور اس سب کے بعد اپنی تخلیق و تکوین کے سلسلہ کو عرش عظیم پر ختم فرما دیا تو کائنات کا منتہیٰ کلام و بیان تخلیق کی بھی نہایت قرار دی گئی۔ چنانچہ ارشاد ہے :

۱ ۔ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ بے شک تمہارا رب وہی پروردگار ہے جس نے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ — آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا فرمایا پھر وہ عرش پر مستوی ہُوا۔

(سُورۃ اعراف)

۲۔ اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ۔ (سُورۃ یونس) — بے شک تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں بنایا پھر وہ عرش پر مستوی ہُوا اس حال میں کہ (کائنات کے) تمام امُور کی تدبیر کر رہا ہے۔

۳۔ تَنْزِیْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰی الرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰی۔ — یہ قرآن اس ذات کا اُتارا ہُوا کلام ہے جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا۔ وہ نہایت مہربان ہے۔ عرش پر قائم ہُوا اس کے لیے ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں اور زمین میں اور ان کے درمیان ہے اور جو چیز تحت الثریٰ یعنی زمین کی گہرائیوں میں ہے۔

(سُورۃ طٰہٰ)

۴۔ اَلَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ — اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان تمام چیزوں کو جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر وہ عرش پر قائم ہُوا۔

(سُورۃ فرقان)

۵۔ اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ (سورۃ سجدہ)

۶۔ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ۔ (سورۃ حدید)

ان تمام مواقع میں سبع سمٰوات اور سبع ارضین کی تخلیق کے ذکر کے بعد خصوصیت سے استوا علی العرش کا بیان فرمانا اسی کی دلیل ہے کہ تخلیق عالم اور تکوین کائنات کا سلسلہ عرش عظیم پر ختم ہوگیا

اور یہ کہ عرش عظیم سے وراء آگے اور بلند کوئی چیز نہیں ۔

بعثت حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوات والسلام

قرآن کریم کے بنیادی اور عظیم تر مضامین دو ہی ہیں ۔ اوّل اثبات الوہیت خداوند و توحید ۔ دوم اثبات نبوت و رسالت ۔ اور بجملہ انبیا کی رسالت و نبوت کا اثبات کا منتہی اور غرض خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا افضل الرسل اور خاتم الانبیاء ہونا ثابت کرنا ہوتا ہے ۔ ایمان و اسلام ان ہی دو بنیادوں پر قائم ہے بار بار ارشاد فرمایا جاتا ہے ۔ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۔

نبوت و رسالت کا مسئلہ صرف ایمانی اور اعتقادی حد تک ہی محدود نہیں بلکہ عقلی اور فطری لحاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسانی سعادت رشد و فلاح انسانی مقاصد کا حصول نیز عقلی فکری اخلاقی معاشرتی اور جملہ عملی قسم کی گمراہیوں اور ہلاکتوں سے تحفظ بھی پیغمبر خدا کی ہدایت کے بغیر ممکن نہیں ۔

کائنات عالم پر سرسری نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخلوقات میں ایک نوع جمادات کی ہے اس سے افضل درجہ نباتات کا ہے ۔ پھر اس سے بڑھ کر درجہ حیوانات کا ہے اور بالترتیب ہر مخلوق کے فوائد و منافع بھی بڑھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ۔ شرف و فضیلت کی بلندی کے ساتھ فوائد و منافع بھی زائد ہوتے جا رہے ہیں ۔ ان سب سے بلند و بالا درجہ انسان کا ہے کہ اس کو حق تعالیٰ نے افضل الخلائق اور اشرف المخلوقات کا مرتبہ عطا فرمایا ۔

ان مخلوقات میں جمادات تو حس و حرکت شعور اور عقل سے عاری ہیں اس لیے ان پر کسی طرح کی ذمہ داری ہی نہیں ۔ نباتات میں حرکت ہے ، اور فلاسفہ کی تحقیق کی رو سے ان میں شعور بھی ہے لیکن ارادہ و اختیار اور عقل سے بے بہرہ ہیں ۔ اس وجہ سے ان پر بھی کوئی ذمہ داری نہیں ۔ حیوانات میں

شعور ہے حس و حرکت اور ارادہ و اختیار کے ساتھ کسی نہ کسی درجہ عقل حیوانی بھی ہے البتہ فکر و تدبر اور عقل کلی سے خالی ہیں۔ اس لیے ان پر صرف معاش سے متعلق تو کچھ ذمہ داریاں قدرت خداوندی نے ان پر ڈالی ہیں، مثلاً بہائم چرند و پرند جنگلوں میں اپنی روزی تلاش کرتے ہیں۔ حشرات الارض اپنے رہنے کے واسطے زمین کی تہوں میں سوراخ اور بل بنا لیتے ہیں۔ پرندے درختوں پر اپنے آشیانے تیار کرتے ہیں۔

حضرت انسان کا درجہ چونکہ حیوانات سے بھی افضل و اشرف تھا اس لیے اس پر ذمہ داریوں کا بوجھ نوع حیوانات زائد ڈالتے ہوئے اس کو فکر معاش کے ساتھ فکر معاد (آخرت) کا بھی مکلف بنایا گیا اور یہ بوجھ یقیناً سب سے بڑھ کر تھا۔ اسی ذمہ داری اور بوجھ کا ذکر حق تعالیٰ نے اس طرح فرمایا ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۔	بے شک ہم نے پیش کیا تھا اس امانت (الٰہیہ) کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر لیکن ان سب نے انکار کر دیا اس بات سے کہ اس بوجھ کو اٹھائیں اور یہ سب چیزیں ڈریں (اس ذمہ داری کے تحمل سے) اور انسان نے اس بوجھ کو اٹھا لیا (اور عہد الست میں اقرار و عہد کر لیا) یقیناً انسان بہت ہی ظلوم و جہول واقع ہوا

لہ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے فوائد قرآن کریم میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو بوجھ آسمان زمین اور پہاڑوں سے نہ اٹھ سکتا تھا اس نادان نے اپنے نازک کندھوں پر اٹھا لیا ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید ❊ قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

حضرت شاہ صاحب کہتے ہیں یعنی اپنی جان پر ترس نہ کھایا۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

الغرض انسان کو موالید ثلثہ یعنی جمادات نباتات حیوانات سے جب کہ افضل
واشرف بنایا گیا تو اس کو علوم و ادراکات کا جامہ بھی پہنایا گیا اور اسی علو و
برتری کے سبب اس کو انتظام معاش کی فکر اور اس کے حوائج و لوازم مہیا کرنے کی

(بقیہ پچھلے صفحہ کا حاشیہ) امانت کیا ہے؟ پرائی چیز رکھنی اپنی خواہش کو روک کر۔ آسمان و زمین وغیرہ میں اپنی خواہش کچھ نہیں یا ہے تو وہی ہے جس پر وہ قائم ہیں۔ انسان میں خواہش اور ہے اور حکم خلاف اس کے۔ اس پرائی چیز (یعنی حکم) کو برخلاف اپنے جی کے تھامنا بڑا زور چاہتا ہے۔ اس کا انجام یہ ہے کہ منکروں کو قصور پر پکڑا جائے اور ماننے والوں کا قصور معاف کیا جائے۔ اب بھی یہی حکم ہے کہ کسی کی امانت کوئی جان کر ضائع کر دے تو بدلہ (ضمان) دینا اور بے اختیار ضائع ہو جائے بدلہ نہیں (موضح القرآن حضرت شاہ عبدالقادرؒ) شیخ الاسلامؒ شاہ صاحبؒ کے یہ کلمات نقل فرمانے کے بعد فرماتے ہیں "اصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی ایک خاص امانت مخلوق کی کسی نوع میں رکھنے کا ارادہ کیا جو اس امانت کو اگر چاہے تو اپنی سعی وکسب اور قوت بازو سے محفوظ رکھ سکے اور ترقی دے سکے تاکہ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی شئون وصفات کا ظہور ہو۔ مثلاً اس نوع کے جو افراد امانت کو پوری طرح محفوظ رکھیں اور ترقی دیں۔ ان پر انعام و اکرام کیا جائے اور جو غفلت یا شرارت سے ضائع کر دیں ان کو سزا دی جائے اور جو لوگ اس بارہ میں قدرے کوتاہی کریں ان سے عفو و درگذر کا معاملہ ہو۔ میرے خیال میں یہ امانت ایمان و ہدایت کا ایک تخم ہے جو قلوب بنی آدم میں بکھیرا گیا جس کو مادہ التکلیف (یعنی وہ معیار جس کی بنیاد پر انسان احکام الٰہیہ کا مکلف و پابند بنایا جا سکے) کہہ سکتے ہیں لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ" اسی کی نگہداشت اور تردد کرنے سے ایمان کا درخت اُگتا ہے۔ گویا بنی آدم کے قلوب اللہ کی زمینیں ہیں۔ بیج بھی اسی میں ڈال دیا ہے۔ بارش برسانے کے لیے رحمت کے بادل بھی اس نے بھیجے جن کے سینوں سے وحی الٰہی کی بارش ہوئی۔ آدمی کا فرض یہ ہے کہ "ایمان کے اس بیج کو جو امانت الٰہیہ ہے ضائع نہ ہونے دے بلکہ پوری سعی وجہد اور تردد و تفقد سے اس کی پرورش کرے مبادا غلطی یا غفلت سے بجائے درخت اگنے کے بیج بھی سوخت (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

صلاحیتوں کے ساتھ معاد کا بھی اس کو مکلّف و مامور بنایا گیا اس بناء پر اس کے افعال میں اس کو اختیار بھی زیادہ دیا گیا تاکہ وہ ثواب اور عقاب کا مستحق ہوسکے۔ غرض انسان دنیا میں اس طرح قدم رکھتا ہے کہ اس کو معاش اور معاد دونوں ہی کے

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) ہوجائے اسی کی طرف اشارہ ہے حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں اِنَّ الْاَمَانَۃَ نزلت فی جذر قلوب الرّجال ثمّ علموا من القرآن الحدیث، کہ یہ امانت یعنی تخم ہدایت ہے جو اللہ کی طرف سے قلوب رجال میں تہ نشین کیا گیا۔ پھر علوم قرآن و سنّت کی بارش ہوئی جس سے اگر ٹھیک طور پر انتفاع کیا جائے تو ایمان کا پودا آگے بڑھے پھولے اور آدمی کو اس کے ثمرۂ شیریں سے لذّت اندوز ہونے کا موقعہ ملے۔ اور اگر انتفاع میں کوتاہی کی جائے تو اسی قدر درخت کے ابھرنے اور پھولنے پھلنے میں نقصان رہے۔ یا بالکل (ہی) غفلت برتی جائے تو سرے سے تخم بھی برباد ہوجائے۔

یہ امانت تھی جو اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور پہاڑوں کو دکھائی مگر کس میں استعداد تھی جو اس امانتِ عظیمہ کو اٹھانے کا حوصلہ کرتا۔ ہر ایک نے بلسان حال یا بزبان قال (اس) ناقابل برداشت ذمہ داریوں سے ڈر کر انکار کردیا کہ ہم سے یہ بار نہ اٹھ سکے گا۔ خود سوچ لو کہ بجز انسان کے کونسی مخلوق ہے جو اپنے کسب و محنت سے اس تخم ایمان کی حفاظت و پرورش کرکے ایمان کا شجرۂ بارآور حاصل کرسکے۔ فی الحقیقت اس عظیم الشان امانت کا حق ادا کرسکنا اور ایک افتادہ زمین کو جس میں مالک نے تخم ریزی کردی تھی خون پسینہ ایک کرکے باغ و بہار بنالینا اسی ظلوم و جہول انسان کا حصّہ ہوسکتا ہے جس کے پاس زمین قابل موجود ہے اور محنت و تردد کرکے کسی چیز کو بڑھانے کی قدرت اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمائی ہے۔

ظلوم و جہول ظالم و جاہل کا مبالغہ ہے۔ ظالم و جاہل وہ کہلاتا ہے جو بالفعل عدل اور علم سے خالی ہو مگر استعداد اور صلاحیت ان صفات کے حصول کی رکھتا ہو۔ پس جو مخلوق بدو فطرت سے علم اور عدل کے ساتھ متصف ہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی یہ اوصاف اس سے جدا نہیں ہوتے مثلاً ملائکۃ اللہ یا جو مخلوق ان چیزوں کے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

انتظام کرتے ہیں ۔ انتظام معاش کے لیے اس کو قوی نباتیہ قوی حیوانیہ اور انسانی عقل وشعور اور ادراکات عطا کیے گئے جن سے ہر انسان خواہ عالم ہو یا جاہل لڑکا ہو یا جوان مرد ہو یا عورت ہر ایک اپنے حوائج طبعیہ و بشریہ اور خورد ونوش لباس ومکان کے مسائل حل کرتا ہے اور ان مراحل کو طے کرتا رہتا ہے ۔

انتظام معاد کے لیے بنیادی صلاحیت کے طور پر اس میں قوت ملکیہ پیدا کی گئی اللہ نے اس میں اپنی معرفت کا جوہر اس کی فطرت میں ودیعت رکھا لیکن ظاہر ہے کہ صرف قوت ملکیہ اور یہ فطری جوہر انسان کی نہ تو مادی اور نفسانی شہوتوں پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے اور نہ اس کو مادیت و بہیمیت کے مقام سے نکال کر روحانیت کے اعلیٰ ترین مراتب تک اس کو پہنچا سکتا ہے تو ضرورت تھی کہ انتظام معاد اور اس شعبہ کے مسائل کی رہنمائی خدا کے پیغمبروں کے ذریعہ سے ہو۔ اس وجہ سے اللہ نے اپنے رسولوں کو مبعوث فرمایا تاکہ ان کی ہدایات انسان کو حقیقی سعادتوں اور عظمتوں سے ہمکنار بنا سکے۔ اور ان ہدایات کے ذریعے انسان حیوانات کی مادیت اور بہیمیت کی غلاظتوں سے نکل کر روحانی لطافتوں اور بلندیوں کو حاصل کرے۔ یہی وہ احسان عظیم اور منت کبریٰ ہے انسانی حیات پر جس کا ذکر حق تعالیٰ شانہ نے

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) حاصل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی مثلاً زمین و آسمان اور پہاڑ وغیرہ ظاہر ہے کہ یہ دونوں اس امانت الٰہیہ کے حامل نہیں بن سکتے۔

بیشک انسان کے سوا "جنّ" ایک نوع ہے جس میں فی الجملہ استعداد اس کے تحمل کی پائی جاتی ہے اور اسی لیے "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" میں دونوں کو جمع کر لیا گیا۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ ادائے حق امانت کی استعداد ان میں اتنی ضعیف تھی کہ حمل امانت کے مقام میں چنداں قابل ذکر اور درخور اعتنا نہیں سمجھے گئے گویا اس معاملہ میں وہ انسان کے تابع قرار دیئے گئے جن کا نام مستقل طور پر لینے کی ضرورت نہیں ۱۲

کذا فی الفوائد الشیخ الاسلام العلامۃ العثمانیؒ۔

اس آیت میں فرمایا :

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ

(سورۃ آل عمران)

بے شک اللہ رب العزت نے بڑا ہی عظیم احسان فرمایا ہے اہل ایمان پر کہ ان میں اپنا ایک رسول انہی میں سے بھیجا جو ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرے اور ان کو (بُرے افعال و اخلاق کی) گندگیوں سے پاک کرے۔ اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ اور بیشک وہ لوگ یقیناً اس پیغمبر کے مبعوث ہونے سے پہلے ایک کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کی تحقیق

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ "المنقذ من الضلال" میں فرماتے ہیں:

"مجھ کو دس سال کی خلوت اور عزلت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ انسان بدن اور قلب سے مرکب ہے اور قلب سے وہ حقیقت روحانیہ مراد ہے جو معرفت ربانی کا محل ہے۔ قلب سے (مراد) یہ مضغۂ لحم مراد نہیں جس میں مردے اور بہائم بھی شریک ہیں۔

اور جس طرح بدن کے لیے صحت و مرض ہے اسی طرح قلب کے لیے بھی صحت و سلامت ہے۔ نجات وہی شخص پائے گا جو اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر پہنچے گا اور صحت کی طرح قلب کے لیے مرض بھی ہے کہ جس میں اس کی ہلاکت ابدی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ کہ ان کے دلوں میں مرض ہے۔ خدا ہی سے بے خبر ہونا سم قاتل اور مہلک ہے اور بمقتضائے ہوائے نفسانی اللہ کی نافرمانی کرنا قلب کی بیماری ہے، جو قلب کو مریض کر دیتی ہے اور معرفت الٰہی اس کا

تریاق ہے کہ جو حیات بخشتا ہے اور اس کی طاعت و فرمانبرداری قلب کے لیے دَوا و شافی ہے اور امراضِ قلبیہ کی صرف یہ صورت ہے کہ اوّل اس کے امراض کا ازالہ کیا جائے اور پھر نافع دواؤں کے ذریعے صحت حاصل کی جائے جس طرح سے کہ بدن کا معالجہ ہوتا ہے۔

اور جس طرح دواؤں کا صحت میں مؤثر ہونا عقل سے نہیں معلوم ہو سکتا بلکہ اس میں اطبا اور حکماء کی تقلید ضروری ہوتی ہے کہ جنہوں نے اس شئے کو انبیاء کرام علیہم السلام سے لیا ہے اور انبیاء علیہم السلام کو ان چیزوں کے (یعنی نباتات پھول اور پتے اور اسی طرح تمام اجزاء مفردہ جن کے خواص فن طب میں مذکور ہیں۔) خواص نورِ نبوت سے معلوم ہوئے ہیں۔ پس اسی طرح عبادات کا خاص حد اور خاص مقدار کے ساتھ امراضِ قلبیہ کے لیے شافی ہونا بھی عقل سے معلوم نہیں ہو سکتا (اور نہ ہی اس کی وجہ عقل سے دریافت کی جا سکتی تھی۔) بلکہ اس بارہ میں انبیاء کرام ہی کا اتباع ضروری ہے جنہوں نے نورِ نبوت سے ان چیزوں کے خواص معلوم کیے نہ کہ عقل سے اور جس طرح دواؤں کا مختلف النوع اور مختلف المقدار اور مختلف الاوزان چیزوں سے مرکب ہونا حکمت سے خالی نہیں ہوتا اسی طرح عبادات کا بھی جو کہ امراضِ قلبیہ کی دوائیں ہیں مختلف النوع افعال اور مختلف المقدار امور سے مثلاً (قیام و رکوع اور سجود قرأت و تسبیحات) قیام کا رکوع و سجود سے زائد ہونا نمازِ عصر و ظہر اور عشاء کی چار چار رکعات اور صبح کی دو اور مغرب کی تین رکعت خالی از حکمت نہیں اور اس کا علم صرف نورِ نبوت ہی ہو سکتا ہے اور جو شخص ان چیزوں کے اسرار و حِکَم عقل سے مستنبط کرنا چاہے یا ان کو محض اتفاقی امور اور خالی از حکمت سمجھے وہ سخت احمق اور جاہل ہے اور جس طرح دواؤں کے کچھ اصول و ارکان ہوتے ہیں اور کچھ مکملات اور ہر ایک کا ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ اسی طرح نوافل و سنن بھی ارکان عبادات یعنی فرائض کے لیے مکملات ہیں۔ الغرض انبیاء کرام علیہم الصلوات والسلام امراضِ قلوب کے اطباء ہیں۔"

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ کے یہ کلمات لعثت انبیاء کی غرض و حکمت کو جس وضاحت کے ساتھ بیان کر رہے ہیں وہ محتاج بیان نہیں گویا یہ الفاظ صاف طور پر اس بات کا اعلان کر رہے ہیں انسان کی زندگی انبیاء کرام کی ہدایت کی اسی طرح محتاج ہے جس طرح کہ اس کی بدنی اور مادی حیات غذا پانی اور ہوا کی محتاج ہے اور جیسے اس کی صحت جسمانی اطباء جسمانی کی محتاج ہے علیٰ ہذا القیاس اس کی باطنی اور قلبی صحت اطباء رُوحانی انبیاء کرام کی محتاج ہے اور جس طرح کسی کا یہ دعویٰ کرنا کہ میں خود اپنی عقل و فہم سے اپنے امراض کا علاج کر لوں گا دوائیں تشخیص کر لوں گا۔ حماقت و نادانی ہے اسی طرح کسی کا یہ تصور کرنا کہ میں اپنی حیات و زندگی کے اصل مقاصد اور سعادت کہ جس کے لیے وہ پیدا ہوا اور قلبی و رُوحانی صحت بغیر انبیاء علیہم السلام کی ہدایات کے حاصل کروں" کھلی ہوئی حماقت و نادانی ہے۔

امام رحمۃ اللہ کی یہ تحقیق قرآن کریم کی اس آیت مبارکہ کی تشریح و تفسیر ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ۔ (سورۃ یونس)	اے انسانو! بے شک آچکا تمہارے پاس ایک پیغام نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور نسخہ شفا ان بیماریوں کے واسطے جو دلوں میں ہوں اور ہدایت و رحمت ان لوگوں کے لیے جو یقین کرنے والے ہیں۔

علامہ ابن خلدون نے مقدمہ[1] میں فرمایا کہ عقل اس ترازو کی طرح ہے جس میں صرف ہیرے جواہرات یا سونا چاندی تولا جا سکتا ہو۔ تو ایسی ترازو سے اگر ان ہی چیزوں کا وزن معلوم کرنا چاہو گے تو کامیاب ہو جاؤ گے لیکن اگر اس (ہلکی اور چھوٹی سی) ترازو میں پہاڑوں کو تولنا چاہو تو یہ ناممکن اور محال ہے۔ تو اسی طرح عقل سے صرف اسی کے دائرہ کی چیزیں معلوم ہو سکتی ہیں لیکن اگر کمزور و ناتوان عقل سے خداوند

---

[1] مقدمہ ابن خلدون بہ سلسلۂ بحث علم کلام صفحہ ۲۵

ذوالجلال اس کی ذات وصفات اور عالم غیب ملکوت سماوات اور ملأ اعلیٰ کی چیزیں معلوم کرنا چاہو تو عقل ان چیزوں تک رسائی اور ادراک سے عاجز وقاصر رہے گی۔

سائنس کا دائرہ بھی عقل اور تجربہ سے حاصل شدہ چیزوں تک محدود ہے تو جن امور تک عقل کی رسائی ہی نہیں وہاں سائنس کیا کام دے گی۔ سائنس کے ذریعے ریل جہاز مشینیں، انجن جیسی چیزیں تیار کی جاسکتی ہیں لیکن یہ کہ انسان کے اعمال واخلاق کی اصلاح کمالات علمیہ اور عملیہ اور وہ افعال جو اس کے رب کو پسند ہیں اور وہ جن سے اس کا رب ناراض ہے اور وہ باتیں جو نجات آخرت کا ذریعہ ہیں اور وہ باتیں جو ابدی ہلاکت میں انسان کو ڈالتی ہیں یہ سب کچھ صرف انبیاء علیہم السلام کے علوم اور ان کے الہام ووحی ہی کے ذریعے معلوم ہوسکتا ہے۔

چراغ بے شک روشن ہے اور اسی طرح آفتاب عالمتاب بھی دنیا کو منور کرنے والا ہے لیکن چراغ کی روشنی اور آفتاب کا نور اسی کو نافع ہے جس کے پاس آنکھوں کا نور موجود ہو تو عقل کی ہدایت ورہنمائی خارجی روشنی ہے، لیکن وحی الٰہی نوربصیرت اور آنکھوں کی روشنی ہے تو کوئی بھی عقل انسانی بغیر انبیاء کی ہدایات کے انسان کو سعادت کی منزلوں تک نہیں پہنچا سکتی۔

ہر حاسہ اور قوت مدرکہ اپنے محدود دائرہ میں کام کرتی ہے۔ مثلاً آنکھ ایک حد تک دیکھ سکتی ہے اور کان ایک حد تک کی آوازوں کا ادراک کرسکتا ہے، تو علیٰ ہذا القیاس عقل بھی محدود دائرہ تک کام کرسکتی ہے۔ ملأ اعلیٰ کے امور تک اس کی رسائی ممکن نہیں۔ پھر جس طرح کہ ہر ایک حاسہ اور قوت مدرکہ اپنے اپنے حدود وعمل میں ہی رہ کر کام کرتے ہیں۔ مثلاً قوت شامہ، لامسہ، ذائقہ، سامعہ، باصرہ ہر ایک کا ادراک اپنی [illegible] حدود میں ہے ...... قوت سامعہ سے دیکھا نہیں جا سکتا صرف سنا جا [illegible] قوت باصرہ سے صرف دیکھا جا سکتا ہے سونگھا نہیں جا سکتا۔ قوت شامہ سے صرف سونگھا [illegible] خوشبو اور بدبو معلوم کی جا سکتی ہے لیکن اس سے

کسی چیز کی حلاوت اور تلخی کو نہیں معلوم کیا جاسکتا۔ یہ کام صرف قوت ذائقہ ہی انجام دے سکتی ہے تو اسی طرح عقل انسانی صرف انہی چیزوں کو سمجھ سکتی ہے، اور ان کا ادراک کرسکتی ہے جو انسان کی مادی زندگی تک محدود ہیں۔ اس کی روحانی زندگی سے تعلق رکھنے والی چیزوں تک اس کی پرواز نہیں۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن

تو عقل بھی ملأ غیب اور رُوحانی زندگی سے متعلقہ امور کی وادی میں اپنے سپر ڈال کر عاجز و ناتوان ہوکر بیٹھ رہتی ہے۔

یہ کلمات درحقیقت عارف ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہ کے الفاظ مبارکہ ہی کی ایک تعبیر ہے جو مکتوبات میں حقیقت نبوت کے بیان میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تحقیق نقل فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

و چنانچہ طور عقل ورا طور حس است کہ آنچہ بحس مدرک نشود عقل ادراک آں می نماید ہمچنیں طور نبوت ورا طور عقل است کہ آنچہ بعقل مدرک نشود بتوسل نبوت بدرک می در آید	اور جس طرح طور عقل، طور حس سے سوا ہے کہ جو چیزیں حس ظاہر سے مُدرک نہیں ہوسکتیں عقل ان کا ادراک کرلیتی ہے اسی طرح طور نبوت طور عقل سے سوا اور بالا ہے کہ جو چیزیں عقل سے مدرک نہیں ہوسکتیں وہ بذریعہ نبوت (اور بتوسط وحی الٰہی) ادراک میں آجاتی ہیں۔

منصب نبوّت و رسالت محض عطاءِ ربّانی ہے

قرآن کریم نے منصب نبوت و رسالت کے بارہ میں یہ واضح فرما دیا ہے کہ یہ عہدہ و منصب محض حق تعالیٰ شانہٗ کے عطا کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ کوئی ہنر اور کسب و اکتساب کے درجہ کی چیز نہیں کہ جس طرح بعض فنی کمالات بشریہ انسان کو اپنی محنت و صلاحیت اور عملی کاوشوں کے ذریعہ حاصل ہو جاتے ہیں۔ یہ فضیلت و کمال اس طرح کا نہیں ہے۔ انسان اپنی ریاضت و عمل صالح اور معرفت خداوندی دن رات عبادات ذکر و تسبیح میں اشتغال سے ولی تو بن سکتا ہے لیکن نبی نہیں ہو سکتا۔ نبی صرف وہی ہوگا جس کو خدا تعالیٰ یہ عہدۂ نبوت و رسالت عطا فرما دے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ جس طرح نوع انسان کی انسانیت اور نوع ملائکہ کی ملکیت مکتسب (اور ان کی اکتساب و حاصل کردہ) نہیں ہے اسی طرح نوع انبیاء و مرسلین کی نبوت و رسالت بھی مکتسب نہیں ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ۔

قرآن کریم نے اس کی وضاحت اس طرح فرمائی:

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کہاں رکھے
رَفِیْعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ یُلْقِی وہ اپنی پیغمبری۔ وہ پروردگار بلند
الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَاءُ مرتبوں والا عرش کا مالک ہے ڈالتا ہے
مِنْ عِبَادِہٖ لِیُنْذِرَ یَوْمَ التَّلَاقِ روح (وحی) اپنے حکم سے جس پر
یَوْمَ ھُمْ بَارِزُوْنَ۔ چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے تاکہ
وہ (لوگوں کو) ڈرا دے ملاقات (قیامت

لہ معارف القرآن - فتح الملہم - علم الکلام۔

کے دن سے جس روز کہ وہ سب خدا کے
سامنے ظاہر و حاضر ہوں گے۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ۔ (سورۃ نحل)

اللہ رب العزت ہی اتارتا ہے اپنے فرشتوں کو وحی دے کر اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے۔ یہ کہ آگاہ کردو کہ کوئی معبود نہیں ہے بجز میرے پس مجھ ہی سے ڈرو۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔ (سورۃ بقرہ)

نہیں چاہتے ہیں کافر اہل کتاب میں سے اور نہ ہی مشرکین یہ بات کہ نازل کی جائے تم پر کوئی خیر (وحی) تمہارے رب کی طرف سے حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ بڑے ہی فضل و مہربانی والا ہے۔

وحی اور الہام

امام راغب رحمۃ اللہ نے "مفردات" میں وحی کا مفہوم از رُوئے لغت اس طرح بیان فرمایا ہے: اِشَارَةٌ سَرِيْعَةٌ فِيْ خُفْيَةٍ یعنی ایک نہایت سریع اور جلد پہنچ جانے والا اشارہ و رمز پوشیدہ طور پر گویا اندر ہی اندر کوئی رمز و اشارہ نہایت عجلت کے ساتھ عرش الٰہی سے قلب پیغمبر پر پہنچ جائے۔ بعض آئمہ لغت نے یہ معنی اس طرح بیان کیے ہیں دل میں کسی چیز کا القا کردینا۔

الہام بھی لغتہً کسی چیز کے دل میں ڈالنے کو کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے دونوں لفظ قریب المعنیٰ ہیں لیکن اصطلاح شریعت میں وحی خدا کا وہ پیغام اور القا ہے جو نبی کی طرف ہو خواہ بلا واسطہ یا بالواسطہ۔

القاء باطنی اور فیضان خداوندی سے کوئی مخلوق مستغنی نہیں ہے اس

بنا پر لفظ وحی کے بعض مشتقات غیر انبیاء کے لیے بھی استعمال کیے گئے۔ مثلاً لفظ " اِیْحَا یُوْحِیْ اَوْحَیْتَ جیسے کہ فرمایا گیا:

وَاَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّ مُوْسٰی اَنْ اَرْضِعِیْہِ۔ — اور پیغام بھیجا ہم نے موسیٰ کی والدہ کی طرف یہ کہ تو بھی موسیٰ کو دودھ پلا۔

وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ۔ — اور جب کہ میں نے وحی کی حواریین کو اس بات کی تم مجھ پر ایمان لاؤ اور میرے رسول پر بھی ایمان لاؤ۔

بلکہ غیر مکلف پر بھی اطلاق کیا گیا۔۔۔ مثلاً"۔۔۔

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا۔ — اور شہد کی مکھی کو اے مخاطب تیرے رب نے یہ ہدایت کی اور اس کو یہ القا کیا کہ تو پہاڑوں میں اپنا ٹھکانہ اختیار کر اور الخ

الہام غیبی اور باطنی طور پر کسی چیز کے دل میں ڈالنے کو کہا جاتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا — اور قسم ہے ہر نفس (جاندار) کی اور اس کی کہ اس کو برابر اعضاء و جسامت کے ساتھ پیدا کیا پھر الہام کیا اس کو اس کے فجور و تقویٰ کا۔

الہام انبیاء کے ساتھ مخصوص نہیں۔ البتہ لفظ وحی کا شرعی اصطلاح کی حیثیت سے صرف وحی انبیاء ہی پر اطلاق کیا جاتا ہے۔

امام غزالی قدس اللہ سرہ نے اپنی کتاب" المنقذ من الضلال" میں نبوت و وحی کی جو حقیقت بیان فرمائی اس کا حاصل یہ ہے کہ[1] انسان جب اس عالم وجود میں قدم رکھتا ہے تو بالکل ساذج الفطرت (کہ جس کی فطرت علم و فکر کے جملہ نقوش سے خالی اور سادہ ہوتی ہے) اور علوم سے معری ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ

[1] بحوالہ علم الکلام

اولاً حاسۂ لمس پیدا فرماتا ہے جس سے وہ حرارت وبرودت اور رطوبت و یبوست نرمی و خشونت کا ادراک کرتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس حاسۂ لمس سے وہ الوان اور اشکال کا ادراک نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد اس میں حاسۂ بصر پیدا فرمایا ہے تاکہ الوان واشکال دیکھ سکے۔ پھر حاسۂ سمع پیدا کیا جاتا ہے جس سے وہ آوازوں کو سن سے۔ حاسۂ سمع کے ساتھ قوت ذائقہ بھی دی جاتی ہے جس کے ذریعہ وہ طعام وشراب کی لذتوں سے بہرہ اندوز ہو سکے۔ پھر سات سال کے قریب اس میں قوت ممیزہ پیدا فرمائی جاتی ہے تاکہ محسوسات سے گذر کر معقولات کا کچھ ادراک کر سکے۔ اس کے بعد کچھ مدت گذرنے پر قوت عاقلہ پیدا کی جاتی ہے تاکہ وہ وجوب وامکان استحالہ اور امتناع جیسے امور بھی سمجھ سکے۔ لیکن مراتب ادراکات میں ایک اور مرتبہ بھی ہے جو ان تمام مراتب سے بالا وبرتر ہے جہاں تک حواس ظاہرہ کی تو کیا نہ قوت ممیزہ کی رسائی ہے اور نہ قوت عاقلہ کی وہ مرتبۂ نبوت ہے جس میں ملاء غیب اور امور اخرویہ کا ادراک ہوتا ہے اور اس کا ذریعہ صرف وحی الٰہی ہی ہے۔ (جیسا کہ گذشتہ کلمات میں ذکر کیا گیا) جس طرح کسی شیر خوار بچہ کا قوت عاقلہ اور قوت ممیزہ کا انکار قابل التفات نہیں۔ اسی طرح حق تعالیٰ کی قدرت وکبریائی اور عظمتوں سے غافل انسانوں کا نبوت اور وحی کا انکار بھی قابل التفات اور لائق اعتناد نہیں ہو سکتا۔

ایسے نادان لوگوں کو سمجھانے کے لیے حق تعالیٰ نے عالم خواب کو ایک نمونہ بنا دیا ہے کہ انسان پر حالت منام (خواب) میں کبھی صراحۃً کبھی اشارۃً اور گاہ گاہ تمثیلاً بہت سے غیبی امور اور آنے والے واقعات منکشف ہو جاتے ہیں (اور تجربہ اس کا شاہد ہے) اب اگر کوئی ایسا شخص جس کو حقیقت نوم اور عالم خواب کا نہ کوئی علم ہو اور نہ تجربہ اس کے سامنے یہ بیان کیا جائے کہ انسان جب شب کو مردہ کی طرح پڑا ہوا ہوتا ہے بالکل بے حس وحرکت اور تمام حواس سمع وبصر وغیرہ اس سے علیحدہ ہوتے ہیں تو وہ بحالت خواب ایسی ایسی چیزیں دیکھتا ہے

تو اس قسم کا ناواقف انسان اس کو تسلیم نہ کرے گا بلکہ بزعم خویش اس کے باطل ہونے پر دلائل و براہین بھی قائم کرنے لگے گا، لیکن واقفین حقیقت ان باتوں کو محض اس کی حماقت و جہالت ہی تصوّر کریں گے۔ بالکل اسی طرح عالم غیب اور ملکوت سماوات آخرت اور جنّت و جہنّم کے یہ احوال ہیں جن کو انبیاء وحی الٰہی سے بیان کرتے ہیں اور جو لوگ ناسمجھ بچّوں کی طرح نادان و غافل ہیں وہ ان کا انکار یا ان میں تردّد کرتے ہیں۔

مراتب وحی

حضرات انبیاء کرام پر حق تعالیٰ کی طرف سے جو وحی نازل ہوتی ہے۔ اس کی متعدد صورتیں اور مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ سورۃ الشوریٰ کی اس آیت نے وحی الٰہی کی جو متعدد صورتیں ہیں ان کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ	اور کسی آدمی کی طاقت نہیں ہے کہ باتیں کرے
اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ	اللہ تعالیٰ اس سے مگر اشارہ سے یا پردہ
حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا	کے پیچھے سے۔ یا بھیجے کوئی قاصد و پیغام
فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ	پہنچانے والا پھر پہنچا دے وہ اس کے
عَلِيٌّ حَكِيْمٌ۔ (سورۃ شوریٰ)	حکم سے جو وہ چاہے۔

یعنی کوئی بشر اپنی عنصری ساخت اور موجودہ قویٰ کے اعتبار سے یہ طاقت نہیں رکھتا ہے کہ خداوند عالم دنیا میں اس سے گفتگو فرمائے، مشافہۃً اور رُو در رُو۔ اور وہ بشر اس کا تحمّل کرے۔ یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اس لیے عالم دنیا میں کسی بشر سے اس کے ہمکلام ہونے کی صرف تین ہی صورتیں ہیں (الف) بلاکسی واسطہ پردہ کے پیچھے سے کلام فرمائے یعنی قوت سامعہ کا توسط تو ہو اور وہ استماع کلام سے لطف اندوز ہو مگر اس حالت میں آنکھیں دولت دیدار سے متمتع نہ ہوسکیں، جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور پر خداوند عالم ہمکلام ہوا وَ کَلَّمَ اللّٰہُ

مُوْسٰی تَکْلِیْمًا " میں اسی نوع کا کلام مراد ہے (ب) بواسطۂ فرشتہ کلام فرماتے، مگر اس طرح کہ فرشتہ متجسد ہوکر آنکھوں کے سامنے ظاہر نہ ہو، بلکہ براہ راست قلب نبیؐ پر نزول کرے۔ اور قلب ہی فرشتہ کا ادراک کرے اور اس کی صوت (آواز) کا بھی قلب ادراک کرے۔ حواس ظاہرہ کو اس میں کسی طرح کا دخل نہ ہو۔

یہی وہ صورت ہے جس کو قرآن کریم نے نَزَلَ بِہِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِکَ (کہ لے کر اترے ہیں اس کلام کو رُوح الامین اے ہمارے پیغمبر آپ کے قلب پر) میں بیان فرمایا ہے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں:

اَحْیَانًا یَاْتِیْنِیْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ۔ کہ گاہ بگاہ وہ وحی مجھ پر آتی ہے اس طرح جیسے کہ کسی گھنٹی کی جھنکار (آواز) ہو۔

اور چونکہ یہ معاملہ پوشیدہ طور پر اندر ہی اندر ہوتا ہے۔ پیغمبر کے وجود سے باہر کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی اور نہ ہی اس طرح یہ کلام ہوتا تھا جیسا کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے باتیں کرتا ہو تو پاس بیٹھا ہوا شخص بھی سن اور سمجھ سکتا ہے اس لیے اس قسم کو خصوصیت کے ساتھ آیت مذکورہ میں " اِلَّا وَحْیًا " سے تعبیر کیا کیونکہ وحی کا لغوی مفہوم بھی یہی پوشیدہ اور مخفی طور پر کسی چیز کا سرعت کے ساتھ القاء کرنا اور پہنچا دینا۔ (ج) تیسری صورت یہ کہ فرشتہ متجسد ہوکر نبی کے سامنے آئے اور اس طرح خدا کا کلام و پیام پہنچا دے جیسے ایک آدمی دوسرے سے خطاب کرتا ہو۔ چنانچہ حضرت جبرئیلؑ بکثرت دحیہ کلبی کی صورت میں متشکل ہوکر آپ کی مجلس میں آئے اور وحی الٰہی پہنچا دی، بجز دو مرتبہ کے کہ اس میں تو اپنی اصلی صورت میں آئے اور کبھی کسی غیر معروف آدمی کی صورت میں بھی ظاہر ہوئے جس کا ذکر صحیحین کی حدیث ایمان میں ہے ... کہ ایک دفعہ مجلس میں جبرئیل امین ایک مسافر و نو وارد کی شکل میں آئے جن کو حضرات صحابہ نہ پہچان سکے کہ یہ کون ہے حتیٰ کہ واپسی پر آپ نے ارشاد فرمایا اَتَدْرِیْ مَنِ السَّائِلُ کہ جانتے بھی ہو

یہ سوال کرنے والا شخص کون تھا ؟ جب عرض کیا گیا کہ اَللہُ وَرَسُولُہٗ اَعْلَمُ ، تو آپؐ نے فرمایا اِنَّہٗ جِبْرِیْلُ اَتَاکُمْ یُعَلِّمُکُمْ دِیْنَکُمْ کہ یہ جبریلؑ تھے جو تمہارے پاس اس لیے آئے تھے کہ تم کو تمہارا دین سکھائیں تو یہ شکل حق تعالیٰ نے اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَاءُ میں بیان فرمائی۔

بہرکیف وحی الٰہی کی قرآن کریم نے یہ تین صورتیں بیان فرمائی ہیں اور قرآن کریم کی آیات مختلف اوقات میں ان میں سے کسی نہ کسی ایک شکل آپ پر نازل ہوئی تھیں۔

چونکہ افادہ اور استفادہ کے لیے شرط یہ ہے کہ متکلّم اور سامع میں مناسبت اور قرب ہو اس لیے نزول وحی کبھی تو اس طرح ہوتا کہ ملکیت اور روحانیت کا غلبہ ہوتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم بشریت سے منسلخ ہو کر ملاء اعلیٰ میں پہنچ جاتے تو یہ قسم اوّل اِلَّا وَحْیًا کی ہے ۔ اور کبھی ایسا ہوتا کہ جبریل امین کی ملکیت و روحانیت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی بشریت غالب رہتی حتیٰ کہ آپؐ اپنی ہی حالت و کیفیت پر رہتے ۔ اور جبریلؑ پیکر بشر میں آپؐ کے سامنے متشکل ہو کر ظاہر ہوتے تو وحی کی قسم اوّل آپؐ کے لیے صعب و دشوار اور موجب تعب ہوتی تھی اس لیے کہ اس صورت میں آپؐ کو بشریت سے صعود کر کے ملکیت تک پہنچنا ہوتا تھا ۔ چنانچہ حدیث وحی میں آپؐ نے یہی ارشاد فرمایا ہے : وَھُوَ اَشَدُّہٗ عَلَیَّ کہ وحی کی یہ صورت مجھ پر زائد شدید اور دشوار ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ شدید سردی کے زمانہ میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی پیشانی مبارک پسینہ پسینہ ہو جاتی تھی اور سلسلۂ وحی کے منقطع ہونے پر یہ دیکھا جاتا کہ آپؐ کی پیشانی سے پسینہ ٹپک رہا ہے ۔

ملائکہ پر حق تعالیٰ کی وحی اور اس کے احکام و اوامر صرف اسی نوع سے وارد ہوتے ہیں ، قرآن کریم کی آیت حَتّٰٓی اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِھِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّکُمْ قَالُوا الْحَقَّ کی تفسیر میں علماء مفسرین نے ابوہریرہؓ

کی روایت تخریج کی ہے۔

عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا قَضَی اللّٰهُ فِی السَّمَاءِ اَمْرًا ضَرَبَتِ الْمَلَائِکَةُ بِاَجْنِحَتِهَا خُضْعَانًا لِقَوْلِهٖ کَاَنَّهٗ سِلْسِلَةٌ عَلٰی صَفْوَانٍ فَاِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّکُمْ قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ۔ (صحیح بخاری)

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ جب حق تعالیٰ آسمان میں کوئی حکم صادر فرماتے ہیں تو فرشتے خوف اور ہیبت کی وجہ سے عاجزی کے ساتھ اپنے پروں کو پھڑپھڑانے لگتے ہیں اور حق تعالیٰ کا کلام اس طرح سنائی دیتا ہے جس طرح کہ کسی پتھر کی صاف چٹان پر زنجیر کھینچنے کی آواز ہو۔

پس جب ان کا گھبراہٹ دُور ہو جاتا ہے تو ایک دُوسرے سے دریافت کرتے ہیں کہ تمہارے ربّ کی طرف سے کیا حکم صادر ہُوا ہے تو اُوپر والے فرشتے بتاتے ہیں کہ حق بات کا حکم صادر ہُوا ہے یعنی بتاتے ہیں کہ فلاں حکم خداوندی صادر ہُوا ہے

الہامؔ اور اُس کی صُورتیں

گذشتہ کلمات سے یہ بات ظاہر ہوگئی ہے کہ وحی اور الہام قریب المعنی لفظ ہیں۔ گو بعض مواقع استعمال میں ایک دُوسرے سے کسی قدر متفاوت ہوں، اور وہ مشترک مفہوم دل میں کسی چیز کا القاء کرنا ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں وحی کا اطلاق صرف وحی انبیاء ہی پر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے صاحبِ وحی صرف انبیاء ہی کو کہا جا سکتا ہے۔ بر خلاف اس کے کہ الہام عام

انبیاء اور غیر انبیاء سب اس میں شریک ہیں۔

علماء متکلمین نے الہام کا مفہوم اس طرح بیان فرمایا ہے " جو علم کہ قلب میں بغیر کسی کسب واکتساب اور استدلال حق تعالیٰ شانہٗ یا ملا اعلیٰ کی طرف سے القاء ہو اس کو الہام کہتے ہیں۔"

امام غزالیؒ نے اسی کو علم لدنی کے عنوان سے تعبیر فرمایا ہے جیسے کہ خضر علیہ السلام کے قصہ میں ہے "وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا" ہے،

چنانچہ فرماتے ہیں: ؎

والعلم اللدنی هو الذی	کہ علم لدنی وہ ہے جس کے حصول میں نفس
لا واسطة فی حصوله	اور باری تعالیٰ کے درمیان کوئی واسطہ نہ ہو
بین النفس و بین الباری	علم لدنی ایک ایسی روشنی ہے کہ جو سراج
تعالیٰ وانما هو کالضوء	(اور ملاء اعلیٰ) سے صاف و شفاف اور
من سراج الغیب یقع علیٰ	دنیا کی کدورتوں سے فارغ پر وارد ہو
قلب صاف فارغ لطیف[1]	رہی ہو۔

حضرت بایزید بسطامی علم لدنی کے منکرین کو فرمایا کرتے تھے:

قد اخذ تم علمکم میتا	کہ تم نے اپنا علم میتا عن میت حاصل
عن میت و نحن اخذنا	کیا ہے (یعنی ایسے اساتذہ و معلمین
علمنا عن الحی الذی	سے کہ اب وہ دنیا سے گذر گئے) لیکن
لَا یَمُوْتُ[2]۔	ہم نے اپنا علم اس حی لا یموت سے حاصل کیا ہے (جس پر کبھی بھی زوال و فنا طاری نہیں ہوسکتی۔)

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد "واعظ اللہ فی

---

[1] کذا فی الرسالة اللدنیه ۔ بحوالہ علم الکلام

[2] کذا فی الیواقیت والجواهر بحوالہ علم الکلام۔

قلب من اهو مؤمن" کہ اللہ کا ایک واعظ ہر مومن کے قلب میں ہے تو یہی الہام مراد ہے۔ غرض اصطلاح علماء میں جو علم انسان کے قلب میں بغیر کسی کسب واکتساب اور استدلال کے حق تعالیٰ شانہٗ یا ملاء اعلیٰ سے القاء ہو اسی کو الہام کہا جاتا ہے، جیسے کہ ارشاد ہے فالھمھا فجورھا وتقوٰھا کہ اللہ نے انسان کو اس کے فجور وتقویٰ کا الہام فرمایا، شیخ عبدالوہاب شعرانی فرماتے ہیں کہ تقویٰ کا الہام اس لیے فرمایا تاکہ نفس اس پر عمل کرے اور فجور کا اس لیے کہ نفس اس سے پرہیز کرے۔ علماء متکلمین فرماتے ہیں کبھی یہ الہام بواسطہ ملائکہ بھی ہوتا ہے اور اللہ کے یہ فرشتے اس بندے سے کلام کرتے ہیں۔ روایات میں آتا ہے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہٗ سے فرشتے گفتگو کیا کرتے تھے، جب انہوں نے کیّ یعنی داغ لگوانے کا علاج شروع کیا تو یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اس پر انہوں نے داغ لگوانے چھوڑ دیئے تو پھر فرشتوں سے ہمکلامی ہونے لگی اور فرشتے ان کو سلام کرنے لگے۔

حافظ ابوعمر ابن عبدالبر نے عمرانؓ بن حصین کے تذکرہ میں نقل کیا ہے کہ:

كان من فضلاء الصحابة وفقهائهم يقول عنه اهل البصرة انه كان يرى الحفظة وكانت تكلمه حتى اكتوى [1]	عمران بن حصین جلیل القدر اور فقہاء صحابہ میں سے تھے ان سے اہل بصرہ یہ نقل کرتے تھے کہ وہ کراماً کاتبین کو دیکھا کرتے تھے اور ان سے باتیں بھی کرتے تھے حتیٰ کہ انہوں نے داغ لیا (تو یہ سلسلہ منقطع ہوا۔

بہرکیف قلب انسانی کے دو دروازے ہیں ایک ملاء اعلیٰ اور عالم ملکوت کی جانب اور دوسرا عالم ظاہر وشہادت کی جانب۔ ظاہری علوم ومعارف تو قلب انسانی ظاہری دروازہ یعنی حواس خمسہ کے توسط سے حاصل کرتا ہے اور عالم ملکوت و

[1] الاصابہ - ۳۔

ملاءِ اعلیٰ سے علوم قلب میں باطنی دروازہ سے داخل ہوتے ہیں۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ علم دو ہیں ایک ظاہری اور ایک باطنی۔ اور آخرت میں نفع دینے والا علم باطنی علم ہی ہے۔[1]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ قرآن کریم کی اس آیت وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ میں لفظ وَلَا مُحَدَّثٍ بھی پڑھا کرتے اور فرماتے کہ محدث مُلہَم کا نام ہے اور ملہم وہ ہے جس کے باطن قلب میں حواس ظاہرہ کے علاوہ علوم و معارف کے لیے دوسرا دروازہ کھل گیا ہو۔

حجۃ الاسلام امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ حوض میں پانی لانے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ باہر سے اور کسی نہر وغیرہ سے پانی لا کر اس میں جمع کر دیا جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس حوض کو اتنا کھودا جائے اور آلات کے ذریعے اس کو اس قدر صاف کر دیا جائے کہ خود اس حوض کی تہ میں سے کوئی چشمہ جاری ہو جائے۔ حوض میں پانی دونوں صورتوں میں نظر آئے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ پانی کی جو لطافت ولذت دوسری صورت میں ہے وہ پہلی صورت میں نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح قلب (جو بمنزلہ حوض کے ہے) میں علوم و معارف کے جمع ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت حواس خمسہ اور بواسطہ تعلیم و تعلم قلب میں علوم کے جمع ہونے کی ہے لیکن دوسری صورت میں یہ ہوگا کہ خلوت و عزلت اور مجاہدہ و ریاضت کے ذریعے قلب کی گہرائی میں علوم و معارف کے چشمے جاری ہو جائیں گے۔ اور جیسے کسی چشمہ جاری سے ہر آن لطیف اور صاف پانی جاری رہتا ہے اسی طرح اس قلب سے بھی ہر لمحہ تازہ بتازہ علوم و معارف ملاءِ غیب سے وارد ہوتے رہیں گے۔

انبیاء کے علاوہ کسی دوسرے کو معصوم نہیں کہا جا سکتا اس وجہ سے غیر انبیاء کا الہام بھی معصوم و محفوظ عن الخطاء نہیں ہو سکتا۔ اس میں احتمال خطاء کا

---

[1] مدارج السالکین۔

ہوسکتا ہے برخلاف انبیاء علیہم السلام کے جیسے وہ حضرات معصوم ہیں ان کا ان کا الہام بھی معصوم اور قطعی ہوگا۔ بلکہ انبیاء کے حق میں الہام اور وحی اور حتیٰ کہ تفہیم غیبی سب کا درجہ ایک ہی ہے یہاں تک کہ انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے " رُؤیا الانبیاء وحی" کہ انبیاء کا خواب وحی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس وقت اپنے خواب کا واقعہ بیان کیا اور اسماعیل علیہ السلام سے یہ فرمایا:

يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ — کہ اے پیارے بیٹے میں خواب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں تو غور کر اور بتا کہ اس بارہ میں تیرا کیا خیال ہے۔

اسماعیل علیہ السلام کا جواب قرآن کریم نے ان کلمات کے ساتھ نقل کیا:

قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ۔ — کہ اے محترم باپ! کر گذریئے وہ کام جس کا آپ کو حکم دیا جا رہا ہے۔ آپ مجھ کو انشاء اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔

تو اسماعیل علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ گذریئے وہ کام جس کا آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اس بات کی دلیل ہے ان کے نزدیک بھی یہ بات ظاہر و واضح تھی کہ پیغمبر کا خواب بھی وحی ہے[1] اور جیسے اوامر و احکام بذریعۂ وحی خدا کے پیغمبر پر نازل ہوتے ہیں اسی طرح خواب کے ذریعے بھی خدا کا پیغمبر حکم خداوندی کا مامور ہو جاتا ہے۔ اسماعیل علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ اے باپ کر لیجیے وہ کام جو آپ نے خواب میں

---

[1] اس پر تمام امت کا اجماع ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کا خواب بالکل قطعی اور یقینی ہوتا ہے اور اس کا درجہ صریح وحی الٰہی کا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ اپنی کتاب "مدارج السالکین" میں تحریر فرماتے ہیں:

رؤیا الانبیاء وحی فانہا معصومۃ من الشیطان وھذا باتفاق الامۃ — کہ انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے کیونکہ وہ خواب یقینا شیطان کی آمیزش سے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دیکھا ہے۔"

وحی اور الہام کی یہ لغوی اور اصطلاحی حقیقت معلوم ہونے کے ساتھ یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ وحی یا الہام خداوند عالم اور اس کی مخلوق کے درمیان پیغام رسانی اور ہدایات کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے باعث وہ مخلوق اپنے خالق سے سرافراز اور ہمکلام ہوتی ہے۔ گو مخلوقات کو خالق سے کسی بھی درجہ میں مماثلت و مشاکلت نہیں مگر پھر بھی ایک ایسا رابطہ قائم ہے گویا وہ اس کے پاس ہردم موجود ہے ؎

اتصالے بے تکیف بے قیاس ہست رب الناس را باجان ناس

اور اس امر میں انسان حیوان شجر و حجر اور زمین و آسمان سب شریک ہیں ہردم وہاں سے ہر ایک چیز کی طرف گویا ایک برقی تار کی طرح رابطہ قائم و جاری ہے۔
گویا صورت حال یہ ہے ؎

سب سے ربط آشنائی ہے تجھے دل میں ہر اک کے رسائی ہے تجھے

اس امر میں انسان و حیوان شجر و حجر زمین و آسمان سب شریک ہیں۔ ہر آن ہر ایک طرف عالم غیب سے ایک تار برقی جاری ہے۔ یہی رابطہ وہ القا غیبی اور تکوینی ہدایت ہے جس کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں کیا گیا:

(بقیہ پچھلے صفحہ کا حاشیہ)

ولہذا اقدم الخلیل علیٰ ذبح اسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام بالرؤیا

(مدارج السالکین)

بالکل ہوتا ہے اور یہ چیز باجماع امت ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کرنے پر آمادہ ہو گئے خواب میں اس چیز کو دیکھ لینے کی وجہ سے۔

انبیاء علیہم السلام کا خواب جس طرح وحی کا درجہ رکھتا ہے ان کے لیے تفہیم غیبی بھی وحی الٰہی کے حکم میں ہے چنانچہ آیت حضرت داؤد و سلیمان کے قصہ میں اس کی دلیل ہے " فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا " (سورۃ سبا) "پس ہم نے تفہیم کردی اس بارہ میں سلیمان کو اور ہر ایک کو دی تھی ہم نے حکمت (نبوت) اور علم"۔ تفصیل کے لیے

اَلَّذِیٓ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی ۔ وہ پروردگار جس نے ہر چیز کو اس کی تخلیق اور وجود عطا کیا اور پھر اس کو ہدایت فرمائی ۔

ہر نوع مخلوق کی وحی بھی جدا ہے اور اس کی شریعت بھی جدا ہے اور اس پر اس کی مخالفت بھی حرام و ممنوع کردی گئی ۔

چنانچہ معدنیات کی طرف یہ الہام ہو رہا ہے کہ وہ اپنی صلابت اور رطوبت حرارت یا برودت کو محفوظ رکھیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی صورت نوعیہ کے لحاظ سے ہمیشہ ان اوامر الٰہی کے بجالانے کے لیے کمربستہ کھڑی رہتی ہے ۔ پتھر سے کبھی یہ ممکن نہیں ہے کہ صلابت و سختی دُور ہو جائے جیسے کہ آگ سے حرارت کا علیحدہ ہونا ممکن نہیں ۔ اسی طرح پانی سے رطوبت اور برودت کبھی دُور نہیں ہوتی نباتات کو ہر دم یہ پیغام پہنچتا رہتا ہے کہ وہ خاک کو پانی کے ذریعے چوس کر شاخ و برگ و گل بنا دے ۔ اور اس قدر مدت گذرنے پر پھل لگیں اور پھول آئیں ۔ اور پتوں کی یہ رنگ و صورت اور اس میں طرح طرح کی لکیریں اور ریشے پیدا ہوں ۔ پھول پنکھڑیوں کی وضع و ہیئت اس طرح کی ہو اس کی رنگت یہ ہو اور خوشبو ایسی ہو غرض ہر ایک کی طرف تکوینی طور پر خدا کے پیغامات پہنچ رہے ہیں اور ہر آن ہر ایک کی صورت نوعیہ ان فرائض کو ادا کرنے پر مستعد و تیار ہے جو اس پر عائد ہو رہے ہیں ۔ بیری کے درخت پر یہ حرام و ممنوع ہے کہ اس پر پیپل کے سے پتے اُگیں اور آم کو یہ حرام ہے کہ وہ بیر بن جائے ۔ حیوانات پر بھی اسی طرح وحی الٰہی اور القاء خداوندی کا سلسلہ جاری ہے اور جس حیوان کی جو صورت و ہیئت متعین کردی گئی اس پر حرام ہے کہ وہ اس کو بدل کر کوئی دوسری صُورت اختیار کرلے ۔ بلی کبھی کبوتر نہیں بن سکتی ۔ اور کبوتر پر یہ حرام ہے کہ وہ بلی بن جائے ۔ بندر ہمیشہ بندر ہی رہے گا ۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی خاص قرن کا کوئی بندر اپنے آباؤاجداد کی شکل و صورت چھوڑ کر کوئی دُوسری صُورت اختیار کرلے ۔ پرندوں کو یہ الہام ہے کہ وہ باہم اس طرح میل جول اختیار کریں اور گرمی کے موسم میں گھونسلا بنایا کریں

اور انڈوں کو اس طرح سہیں بچے اس طرح نکالیں پھر اس طرح ان کی تربیت کریں دانا پانی لائیں اور ایسے کھلائیں۔ طاقت پرواز جب آجائے تو ایسے اڑیں۔ دشمن سے بچنے کے طریقے بھی قدرت خداوندی نے ان کو بتا دیئے۔ اپنے مدمقابل سے جنگ کے طریقے بھی سکھا دیئے گئے۔ انسان تو جنگی مشقیں کرنے کے بعد جنگی امور اور کرتبوں کا ماہر ہوتا ہے مگر یہ حیوان بلا کسی ظاہری مربی کے تعلیم و تربیت ہی کے باطنی اور غیبی القاد الہام کے ذریعے ان تمام کاموں میں ماہر ہو رہا ہے۔ انسان فن تعمیر سیکھ کر ماہر تعمیرات ہوتا ہے لیکن یہ پرندے اپنے آشیانے کسی انجینئرنگ درسگاہ میں تعلیم حاصل کیے بغیر ایسی فنی مہارت کے ساتھ بناتے ہیں کہ انسان اس کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔

یہی حال بہائم اور چوپایوں کا ہے۔ غرض ہر ایک کی طرف غیبی پیغامات اور تکوینی الہامات کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ۔	اور نہیں ہے زمین پر حرکت کرنے والا کوئی جانور اور نہ ہی کوئی پرندہ جو اپنے دو بازوؤں کے ذریعے اڑتا ہو کوئی چیز مگر یہ کہ وہ تمہاری ہی طرح ایک گروہ ہے۔ ہم نے قرآن میں کسی بات کی کوئی کمی نہیں چھوڑی۔

بھینس پر یہ حرام کر دیا گیا کہ وہ گوشت کھائے۔ شیر اور اسی طرح دوسرے درندوں پر یہ حرام ہے کہ وہ گھاس کا ایک تنکا بھی کھائیں۔ چنانچہ ہر مخلوق اسی طرح ہر اس فرمان کی تابع ہے جو اس کے واسطے قضاء الہٰی نے جاری کر دیا۔ شہد کی مکھی کو ان طریقوں کی ہدایت و رہنمائی فرمائی گئی کہ وہ پھلوں اور پھولوں کا رس چوسے اور پھر ایک جگہ اپنا ایسا ٹھکانہ بنائے جہاں وہ شہد جمع کرتی رہے چنانچہ یہ ارشاد خداوندی ہے:

وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي	اور حکم بھیجا تیرے رب نے شہد کی مکھی کی

مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنْ بُطُونِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ

طرف اس بات کا کہ تو گھر بنا پہاڑوں اور درختوں پر اور ایسی جگہوں پر جو لوگ اپنے واسطے چھت کے طور پر بناتے ہیں پھر یہ کہ تو کھا ہر قسم کے پھلوں سے اور داخل ہو اور چل تو اپنے رب کے پیدا کیے ہوئے راستوں پر جن کو مسخر کر دیا گیا ہو نکلتا ہے ان مکھیوں کے پیٹ سے مختلف رنگوں کا شہد جس میں لوگوں کے واسطے شفا ہے، بے شک اس چیز میں بہت بڑی نشانی ہیں ایسے لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہوں۔

(سورۃ النحل)

چاند سورج اور ستاروں کو بھی اللہ کے احکام پہنچتے ہیں۔ اور وہ ان پیغامات وہدایات ہی کے مطابق حرکت کرتے ہیں جو حرکت وسیر اور مقام حرکت جس کے واسطے تجویز کر دیا وہ اس سے سر مو تجاوز نہیں کرتا۔ جیسے کہ فرمایا گیا:

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ لَا الشَّمْسُ يَنبَغِي لَهَا أَن تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ۔

اور سورج چلتا رہتا ہے اپنے ٹھکانے کی طرف۔ یہ اندازہ جو طے کر دیا گیا، عزیز علیم (یعنی زبردست قدرت اور علم والے پروردگار) کا ہے اور چاند کے لیے بھی ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں (کہ ایک دن رات میں ایک منزل طے کرتا ہے) یہاں تک کہ پھر لوٹ جاتا ہے خشک مڑی ہوئی شاخ کے مانند ہو کر (یعنی ہلال کی صورت میں پھر نظر آتا ہے۔) سورج کے

واسطے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ چاند کو پکڑ لے
اور نہ ہی رات دن سے پہلے آسکتی ہے
ہر ایک ستارہ (اور آفتاب و ماہتاب)
اپنے فلک میں چل رہا ہے۔ (سُورۃ یٰسٓ)

غرض ہر مخلوق اللہ کے احکام پاتی ہے اور ان احکام کے سامنے اطاعت و فرمانبرداری کا سر جھکائے ہوئے ہے۔

وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّۃٍ وَّالْمَلٰٓئِکَۃُ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ

اور اللہ ہی کے لیے سجدہ کرتے ہیں تمام جاندار جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔ اور فرشتے بھی اور وہ ذرا تکبر نہیں کرتے۔

(سُورۃ النحل)

ہر نوع مخلوق کے احکام جُدا گانہ ہیں اور وہ مخلوق اپنے متعلقہ احکام و ہدایات کو جانتی ہے اور اس پر عمل پیرا رہتی ہے:

کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰوتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ۔

ہر ایک مخلوق نے جان لیا ہے اپنی عبادت کو اور اپنی تسبیح کو (کہ کس طرح اللہ کی فرمانبرداری و اطاعت اور کس طرح اپنے وجود اور زبان حال نیز زبان قال سے اللہ کی پاکی بیان کرے۔ (سُورۃ النور)

اگرچہ جس وقت ہر شجر و حجر اور درند و پرند اللہ کی تسبیح و پاکی بیان کریں ہم اس کو نہ سمجھ سکیں جیسے کوئی عربی شخص مثلاً ہندی یا سنسکرت اور چینی زبان میں بات کرنے والے کی گفتگو کو نہ سمجھ رہا ہو اسی کو فرمایا گیا۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ

اور کوئی چیز نہیں ہے ایسی کہ جو اللہ کی پاکی نہ بیان کرتی ہو اس کی حمد و ثنا کرتے

ہوئے، لیکن اے انسانو! تم ان چیزوں کی
کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔

(سورۃ بنی اسرائیل)

غرض یہی وہ غیبی اور باطنی رابطہ اور تکوینی الہام خداوند عالم کی بارگاہ سے ہر مخلوق کی جانب جاری و ساری ہے اور خدا کی ہر مخلوق اسی رابطہ کے ساتھ اپنے خالق اور پروردگار سے مربوط و وابستہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوّت کا اثبات

قرآن کریم نے بکثرت آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت و رسالت کا نہایت ہی واضح اور پرشوکت عنوانات کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ قرآن کریم کا بہت بڑا حصہ ان آیات پر مشتمل ہے۔ ان آیات پر نظر کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس اہتمام وعظمت کے ساتھ قرآن کریم میں حق تعالیٰ نے آپ کے سوا کسی اور رسول کا ذکر نہیں فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ۔

(سورۃ بقرہ)

بے شک (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے درانحالیکہ آپ بشارت سنانے والے ہیں (اہل ایمان کو) اور ڈرانے والے ہیں (کفار و مشرکین کو) اور آپ سے دوزخیوں کے بارہ میں باز پرس نہیں کی جائے گی۔

اہل عرب کو خاص طور پر مخاطب بناتے ہوئے فرمایا گیا:

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ

جیسے ہم نے ایک رسول بھیجا تمہاری طرف سے تمہاری ہی قوم میں سے جو تم پر ہماری آیتیں تلاوت کرے اور جو تم کو (ہر قسم کی گندگیوں سے) پاک کرے اور تعلیم دے تم کو کتاب و

تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۔ — حکمت کی اور سکھائے تم کو وہ چیزیں جو تم نہیں جانتے ہو۔

(سُورۃ بقرہ)

تِلْكَ آيَاتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۔ — بے شک یہ آیتیں ہیں اللہ کی جن کو ہم آپ پر تلاوت (نازل) کرتے ہیں حق اور سچائی کے ساتھ ۔ اور بے شک آپ اللہ کے رسولوں میں سے ہیں ۔

میدانِ حشر اور قیامت کے روز کا ایک عظیم اور مصیبت ناک منظر بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا :

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰؤُلَاءِ شَهِيْدًا ۔ يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۔ — پھر اس وقت کیا حال ہوگا جب کہ ہم ہر امت میں سے ایک کو گواہ بنا کر لائیں گے اور آپ کو ان تمام (گواہوں) پہ گواہ بنا کر لائیں گے ۔ اس دن تو تمنا کرنے لگیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کے رسول کی نافرمانی کی کہ کاش وہ زمین کے اندر سما جائیں اور زمین ان پر برابر کر دی جائے ۔ اور وہ اللہ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے ۔

(سُورۃ نساء)

کسی مقام پر آپ کی وحی اور نوعیت وحی کو ثابت اور ظاہر کرتے ہوئے فرمایا گیا :

اِنَّا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ كَمَا اَوْحَيْنَا اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْ بَعْدِهٖ — بے شک ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی ایسی ہی جیسے کہ وحی کی نوح (علیہ السلام) کی طرف اور ان کے بعد (دوسرے) پیغمبروں کی طرف

(سُورۃ النساء)

آپ کی ذاتِ اقدس پر نزولِ قرآن کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :

تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا — بڑی بابرکت اور عظمت والی ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے (محمد رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم) پر حق و باطل کرنے والی کتاب (یعنی قرآن کریم) کو نازل فرمایا تاکہ وہ تمام جہانوں کے واسطے ڈرانے والا ہو (اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہ لانے والوں میں سے)

کسی جگہ آپ کی نمایاں خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا وَّدَاعِيًا إِلَى اللهِ بِإِذْنِهِ وَ سِرَاجًا مُّنِيرًا۔

اے پیغمبر بیشک ہم نے تم کو بھیجا ہے گواہ بناکر اور بشارت سنانے والا (مومنین کو جنت کی) اور ڈرانے والا (کافروں کو عذاب خدا سے) درانحالیکہ آپ اللہ کی طرف داعی ہیں، اللہ کے حکم سے اور سراج منیر یعنی ایسا چراغ ہیں جو روشن کردینے والا ہو۔

(سورۃ الاحزاب)

ایک موقعہ پر آپؐ کی صفات نبوت و رسالت اور آپ کی بعثت کا تمام عالم پر انعام بیان فرماتے ہوئے اس طرح فرمایا:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَكَفَىٰ بِاللهِ شَهِيدًا مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا۔

وہی پروردگار عالم ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت دے کر بھیجا اور دین حق تاکہ اپنے اس پیغمبر کو (دنیا کے) ہر ایک دین پر غالب بنادے اور اللہ کافی ہے گواہ ہونے کی حیثیت سے (وہ پیغمبر) محمدؐ رسول اللہ ہیں (محمدؐ اللہ کے رسول ہیں) اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے مقابلہ میں نہایت قوی اور مضبوط ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے

(سورۃ فتح)

ساتھ بڑے مہربانی و نرم دل ہیں۔ اسے مخاطب دیکھے گا تو ان کو (ہر اوقات) اس حالت میں کہ وہ رکوع کر رہے ہیں اور سربسجود ہیں۔

اسراء و معراج میں حق تعالیٰ نے آپ کو جو خصوصی قرب عطا فرمایا۔ اس کا تذکرہ اس اہتمام اور انداز عظمت سے فرمایا گیا :

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ.

(سُورَةُ النَّجْم)

قسم ہے ستارے کی جب کہ وہ ٹوٹے (یقیناً) تمہارا ساتھی (یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) نہ تو بے راہ ہوا اور نہ بھٹکا اور نہیں بولتا وہ (کوئی بھی چیز) اپنی خواہش سے جو بھی بات ہے وہ صرف اللہ کی وحی ہی ہے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے۔ سکھایا ہے اس کو بڑی قوتوں والے نے جو بڑی ہی توانائی اور خوبصورتی والا ہے اور پھر وہ چڑھ گیا آسمان کے اوپر کے کنارہ پر پھر وہ اترا اور پھر اور قریب تر ہوا اتنا کہ دو کمان یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ پھر اس پروردگار نے اپنے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کی جو کچھ بھی اس کو وحی بھیجنی تھی اور بتایا جو کچھ بھی اس کو بتانا تھا۔

غرض اسی طرح واضح اور صریح طور پر قرآن کریم نے ۳۶ سورتوں میں ۷۶ مواقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا اثبات فرمایا۔ وہ سورتیں جن میں یہ مضمون بیان فرمایا گیا حسب ذیل ہیں :

۔ سورۃ بقرہ۔ ۲۔ آلِ عمران۔ ۳ النسآء۔ ۴۔ مائدہ
۵۔ الانعام ۔ ۶۔ الاعراف ۔ ۷۔ التوبہ ۔ ۸۔ یونس ۔
۹۔ یوسف ۔ ۱۰۔ الرعد ۔ ۱۱۔ ابراھیم ۔ ۱۲۔ الحجر ۔
۱۳۔ النحل ۔ ۱۴۔ بنی اسرائیل ۔ ۱۵۔ الکھف ۔ ۱۶۔ الانبیاء
۱۷۔ الحج ۔ ۱۸۔ المؤمنون ۔ ۱۹۔ الفرقان ۔ ۲۰۔ القصص
۲۱۔ الروم ۔ ۲۲۔ الاحزاب ۔ ۲۳۔ السباء ۔ ۲۴۔ فاطر ۔
۲۵۔ یٰسٓ ۔ ۲۶۔ والصافات ۔ ۲۷۔ الشوریٰ ۔ ۲۸۔ الفتح
۲۹۔ النجم ۔ ۳۰۔ الطلاق ۔ ۳۱۔ المزمل ۔ ۳۲۔ الحدید
۳۳۔ الصف ۔ ۳۴۔ الجمعہ ۔ ۳۵ حٰمٓ السجدہ ۔ ۳۶۔ المؤمن

دلائلِ نبوّت

استاذ العصر علامہ حسین آفندی الجسر طرابلسی نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دلائل نبوت نہایت لطیف اور محققانہ انداز میں بیان کرتے ہوئے فرمایا، کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ کی نبوت و رسالت کو اس طرح سمجھ لیجیے کہ گویا ایک شخص کسی قوم میں ایک پیغام لے کر آیا جو اس قوم میں صدق و امانت اور دیانت و تقویٰ، حسن اخلاق اور معاملات کی خوبی میں معروف بلکہ نمایاں اور ممتاز مقام رکھتا تھا۔ اس قوم نے اس شخص کو آج تک نہ تو کبھی جھوٹ بولتے دیکھا تھا اور نہ ہی اس کی طرف سے کوئی مکر و فریب دھوکہ اور بدمعاملگی کا کوئی واقعہ دیکھنے یا سننے میں آیا تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ وہ شخص نہ قانون دان ہے اور نہ کبھی اس نے مُلکی اصول و قانون وضع کیے ہیں ایسا شخص اس قوم میں اٹھا اور اس نے یہ اعلان کیا کہ اے لوگو! میں تمہارے بادشاہ کا قاصد و پیغام بر ہوں میں اس بادشاہ کے کچھ احکام و پیغام تمہارے پاس لے کر آیا ہوں جن پر عمل کرنے کا تمہارے بادشاہ نے تم کو حکم دیا ہے اور یہی حکم دیا ہے کہ جو قوانین و احکام میں تم کو تمہاری

سعادت و فلاح کے لیے بتاؤں تم ان کو مانو اور میری پیروی کرو۔ اور تمہارے اس شہنشاہ و آقا کا یہ بھی پیغام ہے کہ اب سے پہلے میں نے بہت سے قاصد اپنے احکام دے کر بھیجے لیکن وہ احکام مخصوص زمانوں اور مخصوص قوموں کے واسطے ہوتے تھے جو صرف اسی زمانہ اور قوم کے مناسب اور لائق ہوتے تھے اب ان سابقہ احکام کو منسوخ کر کے ایک مستحکم و جامع اور پائیدار قانون و دستور بھیج رہا ہوں جو نہ کبھی بدلا جائے گا اور نہ ہی کبھی اس کو منسوخ کر کے کوئی دوسرا نیا قانون لایا جائے گا۔ اس لیے اے لوگو! اب تم سب میری بات مانو، جو قانون میں لے کر آیا ہوں اس کو مضبوطی سے پکڑ لو، اسی پر عمل کرو اس کی مخالفت اور میرے ساتھ بغاوت و سرکشی نہ کرو۔ آج تک جو کچھ تم نے اپنے آباؤ اجداد سے بے فائدہ اور گمراہ کن رواج اور طریقے اختیار کر رکھے ہیں اور ایسی رسمیں ایجاد کر رکھی ہیں جن میں سراسر ہلاکت و مضرت ہی ہے۔ ان تمام طریقوں اور رسموں کو چھوڑ کر میری باتیں سنو تا کہ میں تمہیں وہ طریقے سکھاؤں جو تمہارا آقا اور بادشاہ پسند کرتا ہے اور ان سے راضی ہوتا ہے۔ اور ایسی چیزوں سے تم کو باز رکھوں جن سے تمہارا مالک ناراض ہوتا ہے اور ان چیزوں کے ارتکاب کرنے والوں کو سزائیں دیتا ہے۔ یہ قوم اس منادی کا اعلان سن کر کہنے لگی۔ اے مدعی ذرا ٹھہر تو نے بہت بڑے منصب اور اعلیٰ ترین عہدہ پر فائز ہونے کا اعلان و دعویٰ کیا ہے۔ تو نے اپنے دعوے کے ضمن میں ہمیں ایک راستہ پر چلنے کی دعوت دی ہے جو ہم کو بڑا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے دل اس پر آمادہ نہیں، طبیعتیں اس سے نفرت کر رہی ہیں۔ دل مضطرب اور بے چین ہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کو ہماری عقلیں سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم اس بات کا کوئی ثبوت پیش کرو کہ واقعۃً تم ہمارے بادشاہ منعم و محسن آقا کے قاصد ہو اور اس نے حکم دیا ہے تمہاری اطاعت و فرمانبرداری کا اور وہ اس بات سے خوش بھی ہوتا ہے ... تو اگر تم اپنے اس دعویٰ پر ثبوت پیش کر دو گے
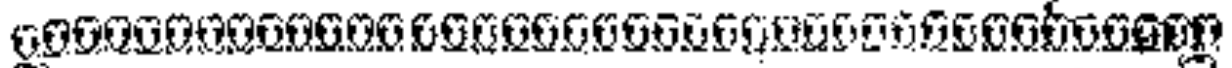
توہم تمہاری اطاعت و فرمانبرداری کے لیے ہر طرح تیار ہیں۔

قوم کے اس مطالبہ پر بادشاہ کے قاصد نے جواب دیا ہاں! اے عقل و دانش رکھنے والو۔ میرے پاس بہت بڑا ثبوت موجود ہے اور صاحب عقل کا یہی کام ہے کہ صداقت و راستی کی دلیل کے سامنے سرنگوں ہو اور اطاعت و فرمانبرداری کے لیے تیار ہو جاتے۔ سنو!

میرے پاس اس آقا و بادشاہ کا ایک خط ہے اس کی طرف سے دی ہوئی دستاویز موجود ہے جس پر اس کی مہر لگی ہے اور اسی میں صاف صاف یہ اعلان ہے کہ اس نے مجھ کو اپنا قاصد و پیغامبر بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور میری آمد سے پہلے تمہارے پاس اس بادشاہ نے میری کچھ نشانیاں اور علامات بھی بھیج دی ہیں اور بتادی ہیں جن کو دیکھ کر تم پہچان لو کہ میں اسی آقا کا قاصد ہوں میرے پاس شاہ کا خطاب ہے تم اس کو سنو خود اس خطاب شاہی کا ایک ایک حرف تم کو اس یقین پر آمادہ و مجبور کردے گا کہ بے شک میں اس شہنشاہ و آقا کا سچا قاصد و مخبر ہوں اور یہ اسی کا خطاب و کلام ہے اس کے مضامین اور بلند پایہ حکمتیں اس حقیقت کو تمہارے سامنے روز روشن کی طرح واضح کردیں گی تو بالکل اسی طرح سرور کائنات خاتم الانبیاء والمرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی پہاڑیوں اور کوہ صفا کی چوٹی پر چڑھ کر اہل عرب کو للکارا اور عالم کے ایک ایک گوشہ میں پہنچنے والی ندا سے ان کو مخاطب کیا اور اعلان کیا:

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا نِ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ	اے انسانو! بے شک میں اللہ کا رسول ہوں جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں اس اللہ کا کہ جس کے واسطے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے جس کے سوا کوئی سچا خدا نہیں۔ وہی جلاتا ہے اور

النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۔

(الاعراف)

وہی مارتا ہے۔ پس اے لوگو! تم اس خدا پر ایمان لاؤ اور اس کے بھیجے ہوئے اس رسول پر بھی ایمان لاؤ جس نے کسی انسان سے کوئی علم نہیں سیکھا جو خود اپنے خدا پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی باتوں اور کلام پر بھی۔ اور تم اس کی پیروی کرو اُمید ہے کہ تم سیدھی راہ پاؤ گے۔

اور ارشاد فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَآمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ وَإِنْ تَكْفُرُوْا فَإِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۔

(سورۃ النساء)

اے لوگو! یقیناً خدا کا پیغمبر تمہارے پاس حق لے کر آگیا ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے۔ پس اب تم اس پر ایمان لے آؤ یہی تمہارے واسطے بہتر ہوگا اور اگر تم نہیں مانتے تو (سمجھ لو) اللہ تعالیٰ کے لیے وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمین میں ہے (اس کو تمہاری کیا پروا؟) اور اللہ تعالیٰ بڑے ہی علم والا اور حکیم ہے (ہر ایک چیز کی حکمت کو وہی جانتا ہے)

اس اعلان نبوت و رسالت کے ثبوت کے لیے آپ نے احکم الحاکمین اور ربّ العالمین کا کلام قرآن حکیم بطور ثبوت پیش فرمادیا کہ دیکھ لو یہ اسی شہنشاہ اور مالک کا خطاب اور کلام ہے جس کا ایک ایک حرف بذات خود اس کا ثبوت ہے۔

اور چونکہ یہ خطاب الٰہی ایک ایسا کامل اور قوی ثبوت تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی اور مزید برہان و دلیل کا مطالبہ انسانی فہم و دانش کے خلاف تھا اس وجہ سے فرمادیا گیا۔

أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ.

(سورۃ عنکبوت)

کیا ان لوگوں کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر یہ قرآن نازل کر دیا ہے، جس کی تلاوت ان کے سامنے کی جاتی ہے بے شک اس میں بہت بڑی رحمت، اور نصیحت ہے ایمان لانے والوں کے لیے۔

قرآن کریم کے ان الفاظ نے واضح کر دیا کہ نبوت و رسالت کا سب سے بڑا ثبوت یہ وحی الٰہی اور کلام ربانی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے مزید کوئی ثبوت طلب کرنا سراسر خلاف عقل ہے۔

مگر پھر بھی خداوند عالم نے متعدد اقسام و انواع کے دلائل یعنی معجزات عطا فرمائے تاکہ کسی درجہ میں بھی حجت بازی کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ حافظ تورپشتی رحمہ اللہ رسالہ "المعتمد فی المعتقد" میں فرماتے ہیں کہ:

"حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے حضرات انبیاء علیہم السلام کو دو چیزیں عطا ہوتی ہیں۔ ایک تعلیم اور دوسری تائید۔ تعلیم یہ ہے کہ بذریعہ وحی یا الہام کے اپنے احکام سے مطلع کرنا۔ تائید یہ ہے کہ دلائل اور براہین سے ان کو قوت پہنچانا۔ اصل نبوت تعلیم ہے اور تائید نبوت کی دلیل ہے۔ ان حضرات کا سراپا پیکر عصمت ہونا کہ جو بھی ان کو معصومیت کی تصویر سمجھے۔ فہم و فراست عقل و فطانت اور قوت حفظ ادراک و احساس حسن صورت اور حسن سیرت میں سارے عالم سے فائق و ممتاز ہونا۔ مستجاب الدعوات اور بے شمار برکات و معجزات کا ان کے ہاتھوں پر ظاہر ہونا یہ سب کچھ از قسم تائید ہے۔

صفات کمالیہ میں دو صفتیں امتیازی شان رکھتی ہیں۔ ایک صفت علم اور دوسری صفت قدرت تو خداوند عالم نے ایک جانب اپنی وحی سے سرفراز فرما کر ایسی صفت علم ان کو عطا فرمائی کہ اس علم تک کسی کے فہم و ادراک کی رسائی نہ ہو سکے تو دوسری طرف معجزات عطا کر کے، ایسی قدرت کا کرشمہ اپنے پیغمبر کے

ہاتھوں پر ظاہر فرمایا کہ تمام عالم کی قوت وطاقت اور قدرت سے بالا و برتر ثابت ہوتے ہیں تاکہ عالم پر حضرات انبیاء کی صفت علم اور صفت قدرت کا کمال اور تفوق ظاہر ہو۔ اور یہی معجزات دشمنوں کی مغلوبی کا ذریعہ بنیں تو حق تعالیٰ شانہٗ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم نازل فرما کر اپنی صفت علم سے وہ کمال عطا فرمایا کہ دنیا کے عقلاً و حکما اس کے علوم کے سامنے درماندہ و عاجز رہے اور علاوہ دیگر معجزات سے تائید کے خود اپنے اس کلام کو آپ کی نبوت کی دلیل محکم اور برہان قاطع بنا دیا علماء متکلمین نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیے ہوئے معجزات میں قرآن کریم ایک عظیم الشان معجزہ ہے۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنے سے زیادہ واضح اور روشن ثبوت نبوت ہے کیونکہ احیاء موتیٰ کا معجزہ ایسی قوم میں حضرت عیسیٰؑ کو دیا گیا ان میں سے کوئی بھی احیا موتیٰ کی قدرت نہیں رکھتا۔ مگر اس کے بالمقابل قرآن کریم ایسی قوم میں نازل کیا گیا کہ اس قوم کا ہر فرد فصیح و بلیغ اور مایۂ ناز ادیب و شاعر تھا اور پھر بھی کوئی فرد قرآن کی فصاحت کا مقابلہ نہ کر سکا۔ بڑے سے بڑا فصیح و بلیغ شاعر و ادیب عجز و درماندگی کے گھٹنے ٹیک کر سرنگوں ہوا اور اس اقرار و اعتراف پر مجبور ہوا کہ یہ کلام طاقت بشریہ سے بالا و برتر ہے۔

قرآن کریم دعوت بھی ہے اور حجّت بھی ہے

حق تعالیٰ شانہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل جس قدر انبیاء و رسل عالم کی ہدایت کے لیے بھیجے ان کی نبوت و رسالت اور دعوت کی تائید و تثبیت کے لیے دیگر معجزات بطور حجت عطا کیے گئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک خداوند عالم کی یہ سنت جاری رہی کہ دعوت انبیاء کی تائید حجت معجزات سے کی جاتی رہی گویا ان کی دعوت و حجت جُدا جُدا ہوتی تھیں۔

مثلاً حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کہ موسیٰ علیہ السلام کو امر دعوت کے ساتھ عصا اور ید بیضاء جیسے معجزات بطور حجت دیئے گئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو احیاء موتیٰ اور ابراء اکمہ کا معجزہ دیا گیا لیکن .... خاتم الانبیاء والمرسلین جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ خاص فضیلت اور برتری عنایت کی گئی کہ آپؐ کو کلام الٰہی اور قرآن کریم عطا کیا گیا اور اس شان کے ساتھ وہ خود اپنے ہی میں دعوت و حجت دونوں کو جمع کیے ہوئے ہے کہ معنوی لحاظ سے قرآن دعوت ہے اور دجوہ فصاحت و بلاغت کی رُو سے معجزانہ حجت ہے۔ تو اس طرح قرآن کی دعوت کے ساتھ اس کی حجت خود اسی میں موجود ہے اور وہ دونوں ایک دُوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہیں کہ قیامت تک کوئی ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوگی۔ یہی مفہوم ہے اس حدیث کا جو صحیح مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی کہ :

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ما من الانبیاء من نبی الا قد اعطی من الآیات مثلہ ما آمن علیہ البشر و انما	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انبیاء سابقین میں سے جو بھی کوئی پیغمبر گذرا ضرور اس کو معجزات و نشانیوں میں سے اس قسم کی نشانیاں دی گئیں کہ ان پر

فكان الذى اوتيت وحيا اوحى الله الىّ فارجوان اكون اكثرهم تابعًا يوم القيامة .

لوگ ایمان لائے ، لیکن وہ خاص نشانی جو مجھ کو دی گئی وہ اللہ کی وحی ہے جو مجھ پر اتاری گئی ہے ۔ پس میں اس بات کی امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے روز میں کا ایسا پیغمبر ہوں گا جس کے متبعین کی تعداد سب سے زائد ہوگی ۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرمایا متبعین کی تعداد کی کثرت اور زیادتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس بنا پر منحصر ہے کہ قرآن کریم معجزات خداوندی میں سب سے عظیم الشان اور اعلیٰ مرتبہ کی نشانی ہے اور یہی سب سے زیادہ مفید بھی ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ ہے کیونکہ یہ دعوت اور حجت دونوں ہی پر مشتمل ہے اور جب تک عالم قائم رہے گا دنیا اس معجزہ کے ذریعے ہدایت حاصل کرتی رہے گی ۔ برخلاف انبیاء سابقین کے معجزات کے کہ جن سے ان حضرات نے اپنی اپنی قوموں پر حجت قائم کی ، وہ ان کی حیات تک باقی رہے ۔ ان کے بعد ان معجزات کو دیکھنے والا اور ان کو دیکھ کر ایمان لانے والا نہ پایا گیا ۔ جیسے حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کہ آج اگر ان کو کوئی شخص دیکھنا چاہے تو نہیں دیکھ سکتا ۔ اس بناء پر کہ اول تو یہ معجزات ہر پیغمبر کے زمانہ اور اس قوم کے مناسب حال دیئے جاتے تھے مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں سحر اور جادو کا زور تھا تو اس کے مناسب عصا اور ید بیضاء کا وہ معجزہ عطا کیا گیا کہ اس زمانہ کے بڑے سے بڑے جادوگر عاجز و مبہوت ہوگئے ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں فن طب کا عروج تھا اور دنیا کے مایۂ ناز اطباء اسی دور میں تھے تو عیسیٰ علیہ السلام کو احیاء موتیٰ اور ابراء اکمہ یعنی مردوں کو زندہ کرنا اور کوڑھیوں کو تندرست بنانا

---

[1] صحیح مسلم ج اول ، کتاب الایمان ۔ [2] فتح الباری ۔

کا معجزہ دیا گیا جس سے دُنیا کے اطبا و حکما درماندہ و عاجز رہے۔ نیز یہ کہ انبیاء سابقین کے معجزات صرف حسیہ تھے کہ ان کا آنکھوں سے مشاہدہ کیا جاتا جیسے حضرت صالح علیہ السلام کی ناقہ (اُونٹنی) اور موسیٰ علیہ السلام کا عصا کہ یہ معجزے صرف آنکھوں سے دیکھے جاسکتے تھے مگر قرآن کریم ایسا معجزہ ہے کہ اس کا مشاہدہ بصیرت اور عقل سے کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جو چیز سر کی آنکھ سے دیکھی جائے گی وہ اسی وقت تک دیکھی جاسکتی ہے جب تک کہ وہ چیز دیکھنے والوں کی نظروں کے سامنے ہے۔ لیکن اس کے بالمقابل وہ چیز جو عقل و بصیرت سے پہچانی اور مشاہدہ کی جاتی ہے وہ اس وقت تک مشاہدہ کی جاتی رہے گی جب تک کہ عالم میں عقل و ادراک اور فہم و بصیرت کا وجود ہے۔

صحیح بخاری[1] میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کی ایک جماعت کے ہمراہ سُوق عکاظ[2] کا قصد کرکے روانہ ہوئے اور یہ وہ زمانہ تھا کہ آسمان کی خبروں اور جنات و شیاطین کے درمیان رکاوٹ قائم کردی گئی تھی اور ان پر شہاب ثاقب چھوڑے جانے کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا کہ جب بھی کوئی جن آسمان کی خبروں کی طرف متوجہ ہوتا تو شہاب ثاقب اس پر ٹوٹ پڑتا اور جلا کر خاک کر دیتا) تو شیاطین باہم یہ تذکرہ کرنے لگے کہ اب یہ بات (کہ ہمارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان رکاوٹ قائم کردی گئی ہے) ضرور کسی نہ کسی نئی بات کے پیش آجانے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے تو زمین کے مشرق و مغرب کے تمام گوشوں میں پھر کر معلوم کرو کہ وہ نئی بات کیا پیش آئی ہے تو جنوں کی جو جماعت تہامہ سرزمین کی طرف پہنچی اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سوق عکاظ کی جانب جاتے ہوئے پالیا

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ کتاب التفسیر ۱۲۔

[2] مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ایک نخلستان کا نام ہے۔ یہ واقعہ اسراء و معراج سے قبل کا ہے اور قبل از معراج صبح اور عصر کی دو نمازیں فرض تھیں۔

جب کہ آپ حضرات صحابہ کو نماز فجر پڑھا رہے تھے جیسے ہی ان کو قرآن کریم کی تلاوت کی آواز پہنچی فوراً کان لگا کر قرآن کو سننے لگے ۔ آیاتِ قرآنیہ سنتے ہی ہونے لگے بس یہی ہے وہ چیز جو ہمارے اور آسمانوں کی خبروں کے درمیان حائل ہوگئی ہے ۔ اس جگہ سے جنوں کی یہ جماعت جب لوٹی اور اپنی قوم کے پاس پہنچے تو یہ کہہ رہے تھے :

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّهْدِیْۤ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا ۔ (سُورۃ الجنّ)	کہ اے ہماری قوم بے شک ہم نے سنا ہے ایک عجیب کلام (جو حیرت وتعجب میں ڈالنے والا ہے) جس کی تلاوت کی جارہی تھی جو ہدایت وفلاح کی رہنمائی کرتا ہے بس ہم تو اس پر ایمان لے آئے ہیں اور ہم اپنے پروردگار کے ساتھ ہرگز شرک نہیں کریں گے[1]

گویا جنوں کی اس جماعت نے آیات قرآنیہ سنتے ہی قرآن کریم کی دعوت وحجت معاً دونوں ہی چیزوں کو سمجھ لیا ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قرآنی دعوت ایسے انشراح اور کمال عقیدت کے جذبات کے ساتھ قبول کی جیسے کوئی چیز سورج کی طرح روشن دلائل کی تائید وقوت کے ساتھ قبول کی جاتی ہو اور صرف یہی نہیں ، کہ

---

[1] نوع جن میں بھی نوع بشر کی طرح دو قسمیں ہیں ۔ ایک قسم ہدایت یافتہ افراد ہیں اور دوسری قسم گمراہ ۔ نوع جن میں ہدایت یافتہ افراد کی یہ سب سے پہلی جماعت تھی جس نے اس جگہ آیات قرآنیہ کی تلاوت سن کر اس کی حقانیت کو پہچانا اور عقیدت ومعرفت کے جذبات کے ساتھ بول اٹھے :

فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا ۔

قرآن کریم کی یہ آیات اسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہیں :

" قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْۤا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّهْدِیْۤ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا ۔

داعیِ حق کی دعوت پہ لبیک کہا ہو بلکہ اس دعوتِ الٰہیہ اور حجتِ قرآنیہ کو لیے ہوئے اپنی قوم کے پاس داعی بن کر پہنچے اور کہنے لگے :

یَا قَوْمَنَا اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰہِ وَاٰمِنُوْا بِہٖ یَغْفِرْ لَکُمْ مِّنْ ذُنُوْبِکُمْ وَیُجِرْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ۔	اے ہماری قوم اللہ کے داعی کی دعوت قبول کرو اور اس خدا پر ایمان لاؤ ، (جس کی طرف اس داعی نے دعوت دی ہے) وہ خدا تمہارے گناہوں سے مغفرت فرمائے گا اور تم کو دردناک عذاب سے نجات دے گا ۔

غرض دعوت اور حجت کی اجتماعیت قرآن کریم کی نمایاں اور امتیازی شان ہے اور سورۃ الشوریٰ میں یہ ارشادِ خداوندی اسی مفہوم کو ادا کر رہا ہے :

وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰہُ نُوْرًا نَّھْدِیْ بِہٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّکَ لَتَھْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ صِرَاطِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۔ (سورۃ الشوریٰ)	اور اسی طرح بھیجا ہم نے تمہاری طرف سے ایک روح (حیات) کو اپنے امر سے ۔ آپ تو جانتے نہ تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ ہی ایمان لیکن بنایا ہم نے اس کو ایک ایسا نور کہ اس کے ذریعے ہدایت دیں ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں ۔ اور بے شک آپ دعوت و رہنمائی کرتے ہیں ایک سیدھے اور مضبوط راستہ کی طرف اس اللہ کے راستہ کی طرف جس کے واسطے وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے ۔

اس آیت میں "روح" سے مراد اگرچہ بعض مفسرین نے فرشتہ یعنی جبریل امین لیا ہے لیکن ظاہر یہی ہے یہاں خود قرآن کریم کو "روح" سے تعبیر کیا ہے ۔

کیونکہ اس کی تاثیر سے مُردہ قلوب زندہ ہوتے ہیں اور انسان کو حیات ابدی نصیب ہوتی ہے ۔ دیکھ لیجیے تاریخ گواہ ہے کہ جو قوم کفر، ظلم، جہالت اور بداخلاقی کی موت مرچکی تھی کس طرح قرآن نے اس قوم میں نئی رُوح اور تازہ حیات ڈال دی [۱] ۔

معجزات دلائلِ نبوّت ہیں

حق تعالیٰ شانہٗ کی سنّت و عادت یہ ہے کہ عالم میں اشیاء کا ایجاد و خلق اسباب عادیہ کے توسط سے ہوتا ہے ۔ پانی کا زمین اور چشموں سے جاری ہونا یا بادلوں سے بارش کا برسنا ۔ نباتات و کھیتوں کا کاشت و زراعت کے ذریعہ پیدا ہونا، انسانوں کا توالد و تناسل کے ذریعے دُنیا میں آنا علیٰ ہٰذالقیاس حیوانات کا ... غرض یہ سب کچھ نظام عادۃ اللہ کے طور پر جاری و قائم ہے اور اس میں ذرہ برابر بھی شک اور تردّد کی گنجائش نہیں کہ کائنات میں ہر چیز کا وجود اللہ کی قدرت اور ارادہ سے ہے ، جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا :

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَہٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَہٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْہُ مِنَ الْمُزْنِ

اے لوگو اچھا یہ تو بتاؤ آباؤ اجداد کے نطفوں سے جو تم پیدا ہوتے ہو تو کیا تم ان بچّوں کو پیدا کرنے والے ہو یا ہم ان کے خالق ہیں .... پھر بتاؤ کہ یہ جو کچھ تم کھیتیاں کرتے ہو تو کیا تم ان کو اُگاتے ہو یا ہم اُگانے والے ہیں ۔

---

[۱] شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الملہم جلد اول میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث مذکور کی شرح میں صاحب دائرۃ المعارف کی ایک نہایت بلند پایہ اور نادر تحقیق حوالۂ قلم فرمائی جس کے کچھ اقتباسات ہم انشاء اللہ تعالیٰ اعجاز قرآن کی بحث میں ہدیہ ناظرین کریں گے ۔ ۱۲ ۔

اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۔ اچھا پھر یہ بھی بتاؤ کہ وہ پانی جو تم پیتے ہو تو کیا تم اس پانی کو بادل سے برساتے ہو یا ہم اس کے برسانے اور اتارنے والے ہیں؛

(سورۃ الواقعہ)

غرض ہر موجود اور مخلوق شی کو انسان کے سامنے پیش کر کے خصومت پسند انسان کے عجز اور اس کی بے بسی کو ظاہر فرمایا گیا اور اس مرحلہ پر بات کو پہنچا دیا گیا کہ انسان مجبور ہو کر حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا اقرار و اعتراف کرے اور یہ اسباب عادیہ اور طبعیہ خود اللہ کے حکم کے تابع ہیں تو عادۃ اللہ یہی ہے ۔ دنیا میں یہ چیزیں اسباب عادیہ اور طبعیہ کے توسط سے ظہور پذیر ہوں لیکن اللہ کی قدرت اس پر بھی حاوی ہے کہ کوئی چیز بلا کسی سبب طبعی کے ایجاد اور ظاہر فرما دے ۔ عادۃ اللہ کے مطابق جو امور واقع ہوتے ہیں ان پر کوئی حیرت و استعجاب نہیں ہوتا کیونکہ ان امور کو دیکھنے اور سننے کے انسان کے کان اور آنکھ عادی ہوتے ہیں ۔ لیکن بعض دفعہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے اپنی صفت خلق و ایجاد بلا واسطہ اسباب عادیہ و طبعیہ ظاہر فرماتا ہے تو وہ دیکھنے والوں کو حیرت و استعجاب میں ڈالنے والا ہوتا ہے اور خلاف عادت ہوتا ہے اس بناء پر اس کو خرق عادت کہا جاتا ہے۔

ایسے ہی خارق عادت امور کو معجزہ کہتے ہیں جو خداوند عالم اپنے پیغمبروں کی نبوت و رسالت کو منکرین پر ثابت کرنے کے لیے ظاہر کرتا ہے اور چونکہ ایسا امر دنیا کو عاجز کرنے والا ہوتا ہے اس بناء پر اس کو اصطلاح شریعت میں معجزہ کہتے ہیں ۔ انسانوں کی قوتیں اور تدبیریں کسی چیز کو صرف اسباب اور مادی و طبعی وسائل ہی سے ایجاد کر سکتی ہیں ۔ بلا اسباب عادیہ کسی چیز کا ایجاد کرنا دنیا کو عاجز بنا دینے والا امر ہے اس وجہ سے ایسے خارق عادت امور کو معجزات کے عنوان سے تعبیر کرتے ہیں ۔

انسان اس پر تو قادر ہے کہ زمین کھود کر پانی نکال لائے مگر اس چیز سے کائنات عاجز ہے کہ کسی پتھر پر عصا اور لاٹھی کو مارے اور اس سے پانی کے

چشمے بہہ پڑیں جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ معجزہ عطا کیا گیا :

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۔

(سُورۃ بقرہ)

اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا (اور سیرابی کے لیے دعا مانگی) تو ہم نے کہا (اے موسیٰ) تم اپنا عصا پتھر پر مارو ۔ چنانچہ فوراً ہی اس پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے اس طرح ہر قبیلہ کے لوگوں نے اپنے پانی پینے کی جگہ کو معلوم کر لیا ۔

اسی طرح دنیا کے ماہر اور کاریگر یا بڑے سے بڑے جادوگروں کی طاقت میں یہ نہیں ہے کہ وہ عصا زمین پر ڈالیں تو وہ درحقیقت سانپ اور اژدہا بن جائے لیکن یہ چیز حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بطریق خرق عادت اور معجزہ عطا فرمائی کہ عصا زمین پر ڈالیں اور وہ سانپ بن جائے ۔

شعبدہ بازوں اور ساحروں نے اس عجیب و غریب امر کو سُن کر یہ قیاس آرائی کی کہ یہ کوئی شعبدہ یا مسمریزم اور جادوگری کے کمالات میں سے کوئی کمال اور کرتب ہے ۔ کہنے لگے ۔

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ۔

فرعون کے وہ جادوگر کہنے لگے بے شک یہ دونوں (موسیٰ و ہارون علیہما السلام) تو بہت بڑے جادوگر ہیں یہ چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے ذریعہ (غلبہ اور اقتدار حاصل کرکے) تم کو تمہاری زمین (ملک) سے نکال دیں (اور اپنی حکومت قائم کرلیں) اور تمہارے بہتر طریقہ کو مٹا دیں ۔ اس لیے اب تم سب مل کر ان کے مقابلہ کے لیے

اپنی تدبیر کرو اور پھر سب کے سب مجتمع اور صف بستہ ان پر حملہ آور ہو جاؤ اور بے شک آج کے دن وہی کامیاب ہوگا جو غلبہ حاصل کرے۔

(سورۃ طٰہٰ)

فرعون کے تمام جادوگر جو اپنے فن کے بڑے ماہر تھے سب اپنی عصاؤں اور رسیوں کو لے کر مقابلہ کے لیے آ گئے اور شعبدہ بازی کے کرتب دکھاتے ہوئے ناظرین کے سامنے کچھ ایسی صورت پیش کی کہ دیکھنے والوں کو وہ عصا اور رسیاں سانپ نظر آئیں جیسے مسمریزم کے کرتب سے ایسی ہی بعض نادر اور عجیب امور نظروں میں محسوس ہوتے ہیں۔ جیسے کہ ارشاد فرمایا گیا :

فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ۔

پھر ناگہاں ان جادوگروں کی رسیاں اور عصائیں ان کے جادو اور نظر بندی کی وجہ سے خیال میں ایسا ڈالا جا رہا تھا کہ وہ چلتے پھرتے سانپ ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے دل میں کچھ ڈر محسوس ہوا کیونکہ ان کے علم میں یہ بات تھی کہ ان کا عصا سانپ بنے گا۔ اور تخییل و نظر بندی سے ان جادوگروں کی رسیاں وغیرہ بھی سانپ جیسی ہی نظر آ رہی ہیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ حق و باطل میں التباس ہو جائے اور لوگ جادوگروں کا شعبدہ اور پیغمبر خدا کا معجزہ یکساں نہ سمجھ لیں۔ اس قسم کا اندیشہ اور فکر پیدا ہوا ہی تھا کہ حق تعالیٰ کی طرف سے فوراً مطمئن کر دیا گیا، جیسے کہ فرمان مبارک ہے :

فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۔ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ۔

پس محسوس کیا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے قلب میں ایک اندیشہ اور ڈر ہم نے کہا (اے موسیٰ) مت ڈرو تم ہی غلبہ پانے والے ہو۔

(سورۃ طٰہٰ)

یہی وجہ ہے کہ اس مقام پر تسلی کے کلمات میں اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى کا لفظ فرمایا گیا کیونکہ یہ ڈر اسی بات کا تھا کہ معجزہ اللہ کی ایک نشانی ہے پیغمبر کی صداقت اور حق کی تائید کے لیے اور جادوگروں کی نظر بندی ان کا ہنر اور کرتب ہے تو بظاہر دیکھنے میں حق اور باطل کی شکلیں ملتبس ہوتی جا رہی ہیں تو اس پر تسلی دی گئی کہ اے موسیٰ اس صورت حال سے ڈرو نہیں تم ہی غالب اور برتر رہوگے۔

پہلی مرتبہ جب عصا کا معجزہ حضرت موسیٰؑ کو دیا گیا اور اس طرح حق تعالیٰ نے خطاب فرمایا:

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يَا مُوْسٰى	کہ اے موسیٰ یہ تمہارے دائیں ہاتھ میں کیا چیز ہے؟

موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا تھا:

هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى۔	کہ اے پروردگار یہ میری لاٹھی ہے جس پر ٹیک اور سہارا لیتا ہوں اور اس کے ذریعے اپنی بکریوں کے لیے پتے بھی جھاڑتا ہوں اور اس عصا میں میرے واسطے اور بہت سے مقصد ہیں۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے جب یہ فرمایا کہ اس عصا کو زمین پر ڈالو اور زمین پر ڈالا تو دیکھا

فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى۔	کہ ناگہاں وہ ایک سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے

تو اس وقت حضرت موسیٰ کو جو ڈر پیدا ہوا تھا، جو طبع انسانی پر سانپ جیسی چیز کو دیکھ کر ہوتا ہے اس لیے اس وقت تسلی کا عنوان یہ تھا:

خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى۔	کہ اس کو اپنے ہاتھ میں پکڑ لو اور ڈرو نہیں ابھی ہم اس کو اس کی پہلی حالت کی طرف لوٹا دیں گے۔

غرض جب جادوگر اپنے فن اور ہنر کو ظاہر کر چکے تو اب بحکم خداوندی حضرت موسیٰؑ نے

اپنا عصا ڈالا چونکہ یہ معجزہ خداوندی تھا اس لیے جادوگروں کی نظر بندی اور مکر و تدبیر کے جال کو پارہ پارہ کر ڈالا عصائے موسیٰ کے سانپ نے ان سب کے ظاہر کیے ہوئے سانپوں کو نگلنا شروع کر دیا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا:

وَأَلْقِ مَا فِي يَمِينِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوا ۖ إِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدُ سَاحِرٍ ۖ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ۔ (سورۃ طٰہٰ)

اور ڈالو اس عصا کو جو تمہارے داہنے ہاتھ میں ہے۔ یہ نگل جائے گا ان چیزوں کو جو جادوگروں نے بنائی ہیں۔ ان کی بنائی ہوئی چیزیں تو صرف ایک جادو کا فریب ہے، اور جادوگر کامیاب نہ ہوگا جس کام کو بھی لے کر وہ آئے۔

مراد یہ تھی کہ جادوگر کے شعبدے اور ڈھکوسلے خواہ کسی حد تک بھی پہنچ جائیں لیکن حق کے مقابلہ میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے اور نہ جادوگر کبھی فلاح پا سکتا ہے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا معجزہ خداوندی نے ظاہر ہو کر یہ بتا دیا کہ یہ وہ امر ہے کہ دنیا اور دنیا کے سحر اور کرتب جاننے والے اس کے مقابلہ سے عاجز ہیں اور یہ ان کی قدرت و طاقت سے بالا و برتر ہے۔ چنانچہ جادوگر انسانی قدرت و طاقت سے بالا و برتر چیز کو دیکھتے ہی قدرت خداوندی کے سامنے سرنگوں ہو گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دلیل نبوت کو سورج کی طرح روشن پا لیا تو انقیاد و اطاعت کے جذبات میں بے خود ہو کر رب العالمین کے سامنے سجدہ میں گر پڑے اور بے ساختہ ان کی زبان پر یہ کلمہ جاری تھا:

إِنَّا آمَنَّا بِرَبِّ هَارُونَ وَمُوسَىٰ۔

کہ بے شک ہم ایمان لے آئے ہارون و موسیٰ کے پروردگار پر۔

ساحرین چونکہ فن کے جاننے والے تھے۔ اصول فن کے اعتبار سے فوراً سمجھ گئے کہ یہ سحر نہیں ہو سکتا۔ یقیناً سحر سے اوپر کوئی اور حقیقت ہے۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ ان کے جادو سے ظاہر ہونے والی چیز محض تخیل اور نظر بندی ہے۔ درحقیقت

قلب ماہیت نہیں اس کے بالمقابل موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں جو معجزہ رونما ہُوا وہ قلب ماہیت ہے اور اس کی قدرت سوائے پروردگار کے کسی کو نہیں۔ اور قلب ماہیت کا یہ معجزانہ کرشمہ خدا تعالیٰ صرف اپنے سچے پیغمبر ہی کے ہاتھ سے ظاہر فرما سکتا ہے۔ اس وجہ سے پورے انشراح و پختگی سے اپنے ایمان کا اعلان کر والا فرعون نے حاضرین کا ذہن برگشتہ کرنے کی بہت کوشش کی اور کہا کہ یہ تو تمہارا کوئی بڑا اُستاد جادوگر معلوم ہوتا ہے اور شاید یہ سب کچھ تم لوگوں کی باہم طے کردہ ایک سازش ہے اور اور ان جادوگروں کو سخت دھمکی بھی دی کہ :

فَلَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ مِنْ خِلَافٍ وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِي جُذُوعِ النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ أَيُّنَا أَشَدُّ عَذَابًا وَأَبْقَىٰ ۔ (سُورۃ طٰہٰ)

(اے لوگو!) اب میں ضرور بالضرور تم سب کے ہاتھ اور پاؤں مختلف جانبوں سے کاٹ ڈالونگا اور تم کو سُولی بھی دوں گا، کھجور کے تنوں پر اور بیشک تم جان لوگے کہ ہم میں سے کس کا عذاب زائد سخت اور (دیر تک) باقی رہنے والا ہے۔

لیکن ایمان کی حقانیت دلوں میں سرایت کر چکی تھی اس لیے ہر دھمکی کا جواب ایمانی استقامت کے ساتھ دیا۔ اور

قَالُوا لَنْ نُؤْثِرَكَ عَلَىٰ مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِي فَطَرَنَا فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ إِنَّمَا تَقْضِي هَٰذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا إِنَّا آمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطَايَانَا وَمَا أَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ وَاللَّهُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۔

کہنے لگے ہم ہرگز تجھ کو زیادہ نہ سمجھیں گے (اور تیری بات کو ہرگز فوقیت نہ دیں گے۔) اس چیز سے جو ہمارے سامنے واضح دلائل میں سے ظاہر ہو چکی ہے اور اس سے جس نے ہم کو پیدا کیا۔ سو تو کر گذر جو کچھ بھی تو کرنا چاہتا ہے تو صرف یہ دنیا کی زندگی ہی تو (ختم) کر سکتا ہے (جس کی دھمکی دی ہے) ہم تو اپنے رب پر ایمان لا چکے ہیں تا کہ وہ

ہمارے گناہ معاف کردے اور اس بات کو بھی
کہ جو تو نے ہم کو جادو پر مجبور کیا (اور اللہ
کے پیغمبر سے مقابلہ کے لیے ہم نبرد آزما ہوئے)
اور اللہ ہی بہتر ہے اور وہی سدا باقی رہنے
والا ہے۔ (سورۃ طٰہٰ)

تو ہم خوب سمجھتے ہیں کہ تیرا عذاب باقی رہنے والا نہیں ہے بلکہ ہمارے رب کی رحمتیں باقی اور ہمیشہ قائم رہنے والی ہیں[1]۔

گویا فرعون نے بڑی کوشش کی اور بات کا رُخ پھیر کر ان کے ذہن میں یہی ڈالنا چاہا کہ یہ امر کسی قادر مطلق اور خالق کائنات کی قدرت کا کرشمہ نہیں بلکہ ایک ہنر اور کرتب ہی ہے مگر جادوگر معجزہ کو کھلم کھلا اللہ رب العزت کا فعل اور قدرت کا کرشمہ سمجھ چکے تھے۔ اس بناء پر نہایت واضح لفظوں میں اعلان کر دیا۔ "لَنْ نُؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ" اگر ان ساحروں کو اس بارہ میں ذرہ برابر بھی تردد ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ یہ سوچتے کہ شاید ابھی ہم سے کوئی فنی کوتاہی رہ گئی ہے۔ ہم پھر مشق اور احتیاط کے ذریعہ اس کا تدارک کر دیں گے تو ایسی صورت میں انجائے انقیاد و اطاعت کے اعلان کے وہ

---

[1] بے شک ایمان کا یہی اثر ہوتا ہے جب اس کی بشاشت اور رنگ قلوب میں سرایت کر جائے تو پھر انسان کو کوئی طاقت اس سے نہیں لوٹا سکتی۔ اس پر نہ خوف کارگر ہوتا ہے اور نہ کسی قسم کا لالچ و شوق اس کے قدم ڈگمگا سکتا ہے۔ چنانچہ یہ وہی بات ہے جب ابوسفیان نے ہرقل کے اس سوال کہ کیا کوئی اس پیغمبر کے دین کو قبول کر کے پھر اپنے پرانے دین کی طرف لوٹا ہے' کے جواب میں کہا کہ نہیں آج تک کوئی اس مذہب کو اختیار کر کے پہلے دین کی طرف نہیں لوٹا تو ہرقل نے کہا تھا کذالک الایمان حین تخالط بشاشتہ القلوب' کہ ایمان کا یہی حال ہوتا ہے جب اس کی بشاشت قلوب میں سرایت کر جاتی ہے۔

کہتے کہ نہیں ایک بار اور مقابلہ کر کے دیکھیں گے۔ مگر اللہ کی نشانی ان کے سامنے روشن ہوگئی تھی اس وجہ سے ایمان پر پوری طرح قائم و مستحکم رہے۔

لہ معجزہ کی جب یہ حقیقت معلوم ہوگئی کہ وہ حق تعالیٰ شانہ کا فعل اور اس کی قدرت کاملہ کا کرشمہ ہے جو خداوند عالم اپنے پیغمبر کے ہاتھوں پر ظاہر فرماتا ہے، تاکہ دُنیا اس کے مقابلہ سے عاجز آکر اس بات کو ماننے پر مجبور ہوجائے کہ یہ اللہ کی نشانی ہے جو اس نے اپنے رسُول کی تائید کے لیے ظاہر فرمائی جیسے کہ حضرت صالح علیہ السّلام کی تائید وحجت کے واسطے پتھر کی چٹان سے ناقہ (اونٹنی) نکال کر ان کی قوم کے سامنے پیش کردی گئی اور فرما دیا گیا ھٰذِہٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً کہ یہ اللہ کی ناقہ جو تمہارے واسطے ایک حجت و نشانی ہے۔ سو لقینی بات ہے کہ معجزات مادی وسائل و اسباب طبعیہ اور انسانی طاقتوں سے بالا و برتر ہی ہونے چاہئیں کیونکہ اگر وہ مادی وسائل و قوتوں اور اسباب طبعیہ کے ماتحت آنے والی چیزیں ہوں تو دُنیا ان کے مقابلہ سے عاجز نہیں ہوسکتی اور وسائل و آلات اور طبعی اسباب کے ذریعے معجزات جیسی چیزیں پیش کی جاسکتی ہیں اور خدا کے اعلان کے مدمقابل کوئی کھڑا ہوسکتا ہے حالانکہ تاریخ عالم گواہ ہے کہ دُنیا میں آج تک کوئی شخص بھی معجزہ کا مقابلہ نہیں کرسکا۔ اس بناء پر اگر کوئی شخص خدا کی قدرت پر ایمان رکھتا ہو تو اس کو معجزات کے تسلیم کرنے میں بھی کوئی تردد نہیں ہوسکتا۔ معجزہ کی یہ حقیقت سمجھ لینے کے بعد یہ بات خود بخود واضح ہوجاتی ہے کہ جو لوگ معجزات کی تاویلیں کرکے ان کو اسباب عادیہ و طبعیہ کے ماتحت لانے کی کوشش کرتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ دلائل نبوت جیسے دین کے بنیادی اصول کا انکار کرتے ہیں بلکہ وہ تحریف دین کی روش اختیار کرکے بے دریغ ہزارہا احادیث و روایات کے مضمون کو بھی مسخ کرتے ہیں اور بڑی جسارت کے ساتھ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات و ارشادات کو بھی ٹھکرا دیتے ہیں (العیاذ باللہ)

مثلاً آیت بقرہ "فقلنا اضرب بعصاك الحجر فانفجرت (باقی کلے صفحہ پر)

معجزات حق تعالیٰ شانہ کی قدرت کاملہ کی نشانیاں ہیں

بہرکیف معجزات اللہ رب العزت کی قدرت کاملہ کی نشانیاں ہیں اسی وجہ سے قرآن کریم نے معجزات کو آیات (جمع آیت بمعنی دلائل ونشانیاں) کے عنوان سے تعبیر کیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا" کی تفسیر تمام احادیث وروایات محدثین ومفسرین اور ائمہ کے کل ائمہ متکلمین کے نزدیک یہی ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہے کہ ان کے عصا کے پتھر پر مارنے سے اللہ نے بارہ چشمے پانی کے جاری فرمادیئے لیکن مادیت اور یورپ کی تعلیم سے مرعوب ایک طبقہ محض اس وجہ سے کہ یہ بات اس کو اسباب طبعیہ سے بعید معلوم ہوئی۔ یہ کہتا ہے نہیں اس کا یہ مطلب نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک بیان کیا گیا بلکہ اس کی مراد یہ ہے حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے موسیٰؑ کو کہا کہ تم لاٹھی کے سہارے پہاڑ پر چڑھ جاؤ۔ چنانچہ وہ پہاڑ پر چڑھ گئے تو وہاں ان کو بارہ چشمے پانی کے بہتے ہوئے نظر آگئے۔ حالانکہ یہ تشریح احادیث وروایات اور کل علماء مفسرین کی تفسیر کے خلاف ہونے کے ساتھ لغت اور قانون عربیت کی رو سے بھی سراسر غلط اور مہمل ہے۔ تو اس نوع کے محرفین ایک طرف تو معجزات کے منکر ہوتے ہیں دوسری طرف یہ کہ احادیث وروایات کی روشنی میں کل علماء امت اور سلف صالحین کے مسلک اور ان کی تفسیر کی تردید وتغلیط کے بھی مرتکب ہوتے ہیں۔

اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے کہ معجزات کو اسباب عادیہ اور طبعیہ کے خلاف پاکر اور یہ دیکھ کر کہ یہ چیزیں حیرت واستعجاب میں ڈالنے والی ہیں تو ان میں بعید سے بعید اور رکیک سے رکیک تاویل کرکے حیرت واستعجاب کے مقام سے نکال کر عام احوال کے درجہ میں لانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ان کو سمجھنا چاہیئے کہ معجزہ تو ایسی ہی چیز کو کہا جاتا ہے جو اسباب طبعیہ سے بالا وبرتر ہو نہ صرف یہ کہ وہ حیرت وتعجب میں ڈالے بلکہ دنیا کو عاجز بنادے لیکن کیا کیا جائے کہ یہ طبقہ اس فہم اور شعور سے بعید ہے یا حَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم اور ان کے حواریوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا :

هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنَزِّلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ	کہ کیا آپ کا رب یہ کرسکتا ہے کہ ہم پر ایک مائدہ (کھانے کا چنا ہوا دسترخوان) آسمان سے نازل کردے ۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب اس گستاخانہ مطالبہ پر ڈانٹا تو کہنے لگے :

نُرِيدُ أَنْ نَأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُونَ عَلَيْهَا مِنَ الشَّاهِدِينَ (سورة المائدة ۵)	کہ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ اس مائدہ سے کھائیں اور اس طرح ہمارے قلوب مطمئن ہوجائیں اور (اس نشانی کو دیکھ کر) ہم یہ جان لیں کہ آپ نے ہم سے سچ بولا ہے اور ہم اس پر گواہوں میں سے ہوجائیں۔

جیسے اللہ کے دوسرے پیغمبروں نے معجزات کے مطالبوں پر اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ قوم پر ہماری صداقت کے لیے کوئی نشانی ظاہر فرمادے ۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ نے بھی بارگاہ خداوندی میں درخواست کی :

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۔ حق تعالیٰ کی تائید و توفیق ہوئی تو ان شاء اللہ معجزات کے موضوع پر ایک مستقل کتاب تالیف کرکے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کروں گا جن میں دلائل و حقائق کی روشنی میں معجزات انبیاء پر تفصیلی کلام ہوگا اور ملحدین و زائغین نے معجزات میں جہاں جہاں تحریفات کی ہیں ان تحریفات کا رد کیا جائے گا ۔

مزید ایک باب افضل الانبیاء خاتم المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا ہوگا جس میں انبیاء سابقین کی معجزات کی انواع کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کی خصوصیات اور فضائل کو بھی پیش کرنے کی یہ ناچیز خادم کوشش کرے گا ۔ حق تعالیٰ اپنی تائید و توفیق سے نوازے ۔ آمین ۔

رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ۔	کہ اے ہمارے پروردگار ہم پر ایک مائدہ آسمان سے اتار دے کہ جو ہمارے لیے مسرت و خوشی کا دن ہو جائے ہمارے میں کے پہلوں کے لیے اور بعد والوں کے لیے بھی اور نشانی و حجت ہو جائے تیری طرف سے اور اے پروردگار تو ہم کو رزق عطا فرما تو بہتر رزق دینے والا ہے۔
(سورۃ المائدہ ۸)	

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مٹی کے پرندوں جیسی ہیئت بنا کر ان میں پھونک ماری اور اللہ کی قدرت سے وہ پرندے بن کر اڑنے لگے تو اس کو بھی اسی عنوان سے فرمایا:

وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ	اے لوگو! میں تمہارے رب کی طرف سے ایک نشانی لے کر تمہارے پاس آیا ہوں کہ میں گارے سے پرندہ جیسی شکل کی چیز بناؤں گا پھر اس میں پھونکوں گا تو وہ اللہ کی قدرت سے اڑتا ہوا پرندہ ہو جائے گا۔

حضرت عزیر علیہ السلام کے قصہ میں جب کہ وہ ایک منہدم اور ویران شدہ بستی پر سے گذرے جو بخت نصر کے زمانہ میں ویران ہو گئی تھی تو اب یہ بستی کہاں آباد ہو گی یعنی کچھ استعجاب اور بعد کے تصور سے یہ لفظ ان کی زبان سے نکلا تو اسی وقت حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کا کرشمہ ظاہر کرنے کے لیے ایک طرح کی موت واقع کر دی جو سو برس تک باقی رہی پھر اس کے بعد ان کو زندہ کیا پوچھا کہ اے عزیر تم نے کتنا وقت گذارا آپ نے عرض کیا:

لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ۔	کہ اے رب میں نے ایک دن اس حال میں گذارا ہے یا دن کا کچھ حصہ۔

فرمایا گیا نہیں تم نے اس حالت میں پورے ایک سو برس گذارے ہیں، ...

قدرتِ خداوندی کا کرشمہ دکھانے کے لیے فرمایا:

وَانْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا۔ (سورۃ البقرہ)

کہ تم دیکھو اپنی سواری "گدھے" کی طرف (جو گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہو چکا تھا) جب ان کا کھانا جو کہ بہت جلد خراب ہو جانے والی چیز ہے اس میں کوئی تغیر اور بدبو بھی نہیں پیدا ہوئی تھی) اور یہ حکم اس وجہ سے ہے کہ ہم تمہاری زندگی (اور اس واقعہ) کو لوگوں کے واسطے نشانی بنا دیں تو دیکھو اس سواری (گدھے) کی ہڈیوں کو کہ ہم ان کو کس طرح کھڑا کرتے ہیں اور پھر ان پر کس طرح گوشت و پوست چڑھاتے ہیں۔

اسی طرح قرآن کریم نے سینکڑوں مواقع میں معجزات کو دلائل قدرت اور آیاتِ بیّنات کے عنوان سے تعبیر کیا ہے کیونکہ ہر ایک معجزہ اللہ کی قدرت کی دلیل اور واضح بیّنہ ہے۔[1]

[1] حافظ ابن تیمیہؒ نے متعدد مواقع اور تصانیف میں اس چیز کو بڑی اہمیت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ معجزات و خوارق دراصل آیات و براہین ہیں۔ اور فرمایا معجزہ کی اصل حقیقت کے لیے یہی عنوان زائد قریب اور واضح ہے تو گویا جیسے ہر چیز کی شناخت کے لیے علامات اور نشانیاں ہوتی ہیں۔ ایسے ہی انبیاء علیہم السلام کی نبوت کے پہچاننے کے لیے معجزات کو علامات اور نشانیاں بنایا اس طرح معجزات آیات نبوت ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصاء اور یدبیضاء کا معجزہ عطا فرما کر ارشاد فرمایا گیا فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَائِهٖ کہ اے موسیٰ یہ دونوں معجزے برہان و دلیل ہیں تمہارے رب کی طرف سے فرعون اور قوم فرعون کی جانب۔

ارباب معرفت تو روحانی علوم و معارف سے انبیاء کی نبوت پہچان سکتے تھے (مشیر) باقی اگلے

اور اسی بناء پر کہ معجزہ اللہ کا فعل ہے خود انبیاء علیہم السلام جن کے ہاتھوں ان معجزات کا ظہور ہوتا ہے ان کا اظہار اور پیش کرنا ان کی قدرت میں نہیں ہوتا جب اللہ چاہتا ہے تب ہی معجزہ کا ظہور ہوتا ہے۔

چنانچہ قرآن کریم نے اس کی متعدد مواقع پر وضاحت کر دی ارشاد مبارک ہے:

وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِنْ زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَى فِي السَّمَاءِ وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَقْرَؤُهُ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا ۔

اور (کفار مکہ) کہنے لگے ہم ہرگز آپ کی بات پر یقین نہیں کریں گے یہاں تک کہ تم جاری نہ کردو زمین سے چشمے یا یہ کہ تمہارے واسطے ایک باغ ہو کھجور اور انگور کا جس کے درمیان تم نہروں کو جاری کردو یا گرا دو تم آسمان سے ہم پر اس کا کوئی ٹکڑا جیسا کہ تمہارا گمان ہے کہ اگر ہم نافرمانی کرتے رہیں گے تو اللہ ہم کو زمین میں دھنسا دے گا، یا آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہم پر گر پڑے گا۔ یا تم لے آؤ اللہ کو اور فرشتوں کو ہمارے سامنے کھلم کھلا۔ یا تمہارے واسطے کوئی گھر ہو سونے کا مزین (اور مرصع) یا تم آسمان میں چڑھ جاؤ اور پھر ہم تو تمہارے آسمان پر چڑھ جانے کو بھی نہیں مانیں گے جب تک کہ تم اتار نہ لاؤ ہم پر ایک لکھی ہوئی دستاویز

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) لیکن مادہ پرستوں کے لیے ایسی برہان قاطع اور حجت ضروری تھی کہ اس کے سامنے ان کو سرنگوں ہونے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہے کیونکہ مادہ پرست جب کسی امر کو اسباب طبعیہ سے بالا و برتر دیکھے گا تو مجبوراً اس کو بشری طاقتوں سے بالا و برتر طاقت و قدرت تسلیم کرنی پڑے گی۔ اس طرح وہ نبوت اور دعوائے نبوت پر ایمان و انقیاد کی راہ پا سکے گا۔ ۱۲۔

جس کو ہم پڑھتے ہوں ۔ کہہ دیجئے (اے ہمارے پیغمبر) پاکی ہے میرے پروردگار کی میں کون ہوں مگر یہ کہ صرف ایک بشر جس کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے ۔

(سورۃ بنی اسرائیل)

مراد یہ تھی کہ تمہارے یہ مطالبے تو گویا اس طرح کے ہیں جیسے کسی ساحر اور ماہر شعبدہ باز سے اس کے ہنر اور کرتب کا مطالبہ کیا جائے ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں خدا کا رسول ہوں ۔ خدا کے رسول معجزات اور آیات پیش کرتے ہیں مگر وہ خود ان کا فعل نہیں بلکہ خدا کی قدرت کا کرشمہ ہوتے ہیں ۔ اور اللہ کی ذات اس بات سے منزہ اور پاک ہے کہ اس کی قدرت و افعال میں کوئی اس کا شریک ہو ۔ اس لغو اور بیہودہ مطالبہ کی تردید کرتے ہوئے مزید فرمایا گیا :

قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَا اِذَا جَاءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۔

(سورۃ الانعام)

کہہ دیجیے معجزات تو حق تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہیں (یعنی وہ میرا فعل نہیں بلکہ خدا کا فعل ہے اور وہی اس کے اظہار اور مواقع اظہار کو خوب جاننے والا ہے) اور تمہیں کیا معلوم ہے ؟ کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے جب کہ معجزات ان کے سامنے آجائیں گے اور ہم لوٹا پلٹاتے رہتے ہیں ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو (جس کے باعث وہ حصول سعادت اور قبول ایمان سے محروم رہتے ہیں ۔) جیسا کہ وہ ان معجزات پر پہلی مرتبہ ایمان نہیں لائے اور ہم ان کو ان کی سرکشی و گمراہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتے ہیں ۔

مقصد یہ کہ معجزات و دلائل کی تو کوئی کمی نہیں لیکن وہ تو اپنی بدنصیبی کی وجہ سے

پہلے بھی بہت کچھ نشانیوں کو دیکھ کر بھی ایمان و ہدایت سے محروم ہی رہے تو اب اگر ان کے مطلوبہ معجزات ظاہر بھی کر دیے جائیں تو بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ ان کا مطالبہ تحقیق حق کے لیے نہیں بلکہ محض حجت بازی اور مجادلہ ہے، اس لیے فرمایا:

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَا اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ۔

(سورۃ الانعام)

اور اگر ہم اتار دیں فرشتے اور باتیں کرنے لگیں ان سے مُردے (دوبارہ زندہ ہوکر) اور زندہ کرکے اُٹھا دیں ہم ان کے سامنے کھلم کھلا ہر چیز تب بھی یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں مگر اللہ کسی کے واسطے چاہے، لیکن ان میں سے اکثر لوگ جاہل ہیں (اور اس راز سے ان کو ذرہ برابر بھی آگاہی نہیں)

ایک معرکہ میں جب کہ مسلمانوں کو کافروں کے مقابلہ میں شکست کے آثار پیش آرہے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مٹھی بھر کنکریاں اُٹھا کر کافروں کے لشکر پر پھینک ماری، یہ فرماتے ہوئے "شَاهَتِ الْوُجُوْهُ" (یعنی چہرے بگڑ جائیں اور پھر جائیں) مٹھی بھر ان کنکریوں کا پھینکنا ہی تھا کافروں کی شدت و قوت پارہ پارہ ہوگئی ناگہاں ہزیمت خوردہ ہوکر میدان جنگ چھوڑ بھاگے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ فاتح و کامیاب ہوئے۔

قرآن کریم نے اس کو اس تعبیر کے ساتھ بیان فرمایا:

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۔

اور آپ نے (درحقیقت) وہ کنکریاں نہیں پھینکی تھیں جب کہ آپ نے (اپنے ہاتھ سے) ان کو پھینکا تھا بلکہ ان کو تو اللہ نے پھینکا تھا۔

ایجاب و سلب کے عنوان نے دونوں پہلوؤں کو واضح فرما دیا اور اس حقیقت کو

آشکارا کر دیا کہ معجزہ میں جو امر پیغمبر خدا سے ظاہر ہوتا ہُوا نظر آئے وہ دراصل خود پیغمبر کا فعل نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ ربّ العزّت کا فعل ہوتا ہے۔ اس لیے فرمایا جو رمی اے محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم آپ نے کی تھی وہ آپ نے نہیں کی تھی وہ اللہ نے کی تھی۔ کیونکہ ایک انسان کی مٹھی بھر کنکریوں سے کسی لشکر کا شکست کھا جانا مادی اسباب کی بندشوں میں محدود رہنے والے انسان کی عقل میں نہیں آسکتا۔ تو یہ اللہ کی رمی تھی جس سے کفّار شکست کھا کر میدانِ جنگ سے بھاگتے ہوئے نظر آئے۔

معجزات کے بارہ میں امام رازیؒ کی ایک بلند پایہ تحقیق

امام رازی رحمۃ اللہ نے فرمایا معجزہ ایسے خارق عادت امر کو کہا جاتا ہے جو اعلان و دعوت مقابلہ کے ساتھ مقرون ہو اور اس کا مقابلہ طاقت بشریہ سے خارج ہو۔[1]

علامہ ابن حمدانؒ نے نہایۃ المبتدئین میں فرمایا معجزہ خارق عادت امر کو کہا جاتا ہے خواہ وہ فعل ہو یا قول جب کہ وہ دعوائے رسالت کے مطابق واقع ہو۔[2]

علامہ تفتازانی نے فرمایا معجزہ از قبیل افعال وجودیہ بھی ہوتا ہے جیسے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انگشتان مبارک سے پانی کا جاری ہونا اور معجزہ عدم فعل کی قسم سے بھی واقع ہوتا ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۲ طبع جدید ۱۲ ۔ [2] عقیدۃ السفارینی ۱۲

[3] مطابقت کی قید اس وجہ سے ہے کہ اگر کوئی امر خارق عادت پیش آئے لیکن وہ اس مدعی کے دعویٰ کے مطابق نہ ہو تو اس کو معجزہ نہیں کہا جائے گا۔

چنانچہ اگر مدعی نبوت نے اپنے دعوائے نبوت کے ثبوت کے لیے یہ کہا کہ مثلاً یہ پتھر گواہی دے گا کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں۔ ناگہاں پتھر میں سے یہ آواز آئی "إِنَّهُ كَذَّابٌ" کہ یہ جھوٹا ہے۔ مسیلمہ کذاب جس نے جھوٹی نبوت کا دعویٰ کیا تھا اس نے دعویٰ کے ساتھ ایک کنویں میں تھوکا کہ دیکھو میری نبوت کا یہ معجزہ ہوگا کہ یہ جوش مارنے لگے گا، تھوکا تو بجائے اس کے کہ کنویں کا پانی ابلتا وہ خشک ہوگیا۔ اسی طرح اس نے ایک دفعہ ایک لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ گنجا ہوگیا تو ظاہر ہے کہ ایسے خوارق کو معجزہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۲

آگ کا برد و سلام بن جانا اور ان کے جسم کو آگ کا نہ جلانا ۔ اسی نوع کا معجزہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہجرت کے وقت کفار قریش کے پہرہ میں سے نکل جانا اور حق تعالیٰ کی قدرت سے ان کی آنکھوں کا عمل بیکار ہو جانا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ کہ ہم نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا پس وہ نہیں دیکھ رہے ہیں۔

امام قرطبیؒ اپنی تفسیر الجامع الاحکام القرآن جلد اوّل میں معجزہ کے مفہوم پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ معجزہ کے لیے پانچ شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ ان میں اگر ایک شرط بھی مختل ہو جائے گی تو وہ معجزہ نہ کھلائے گا شرط اوّل تو یہ کہ وہ معجزہ ایسے امور میں سے ہو کہ اس پر اللہ کے سوا کوئی قادر نہ ہو جیسے سمندر کے درمیان راستہ بن جانا ۔ اس کا ثمرہ یہ ہے کہ ایسے افعال جو عام طور پر انسانی قویٰ کے ذریعہ صدور پذیر ہو سکتے ہوں ان کو معجزہ نہیں کہیں گے دوسری شرط یہ کہ وہ خارق عادت ہو، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ کوئی چیز ایسی ہو کہ وہ صرف اللہ ہی کی مقدورات میں سے ہو لیکن وہ مطابق عادت ہے اس کو معجزہ نہیں کہیں گے مثلاً کوئی کہنے لگے کہ میرا معجزہ یہ ہے کہ رات دن کے بعد آئے گی اور سورج مشرق سے نکلے گا کیونکہ رسول کی رسالت کا ثبوت تو اسی طرح ہو سکتا ہے کہ وہ یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ میرے دعوے کی تائید میں و حجت میں اس عادت دائمہ اور مستمرہ کے خلاف ایسا ظاہر کرے گا جیسے کہ حضرت صالحؑ کی نبوت کو ثابت کرنے کے لیے خداوند عالم نے چٹان سے ناقہ کو نکالا ۔

تیسری شرط یہ کہ مدعی رسالت اس معجزہ سے اللہ کی قدرت پر اور اپنی صداقت پر استدلال و استشہاد کرتا ہو بایں طور کہ یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ میری بات کی تصدیق کے لیے میرے کہنے پر اس پانی کو تیل بنا دے گا اور جب زمین کو حکم دوں گا کہ تو حرکت کر تو وہ حرکت کرنے لگے گی ۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کا اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر نکالنا اور اس کا سفید و چمکدار ہو کر ظاہر ہونا یا الخ ۔ عصا کا زمین پر ڈالنے پر

سانپ بن کر حرکت کرنے لگنا۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ معجزہ مدعی رسالت کے دعویٰ کے مطابق واقع ہو تاکہ وہ معجزہ اس کی نبوت کی دلیل بن سکے۔ چنانچہ اگر کسی کے حکم سے کوئی جانور بولنے لگے لیکن وہ جانور یہ بولے کہ یہ شخص جھوٹا ہے نبی نہیں ہے تو جانور کا بولنا گو خرقِ عادت ہے لیکن دعوائے رسالت کے مطابق نہیں بلکہ برعکس ہے اس بناء پر ایسے خوارق کو معجزہ شمار نہیں کیا جائے گا۔

پانچویں شرط یہ ہے کہ مدعی نبوت نے جیسا معجزہ ظاہر کیا ہے کوئی شخص معارضہ اور مقابلہ کے طور پر ایسی چیز ظاہر نہ کر سکے۔

علامہ قرطبیؒ ان شرائط کے ذکر کے بعد یہ فرماتے ہیں کہ دجال اگرچہ بہت سے امور خرقِ عادت کی قسم سے ظاہر کرے گا لیکن وہ چونکہ ربوبیت کا دعویٰ کرتا ہوگا اس بناء پر ان خوارق کو معجزات کی طرح تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ معجزہ مدعی نبوت سے ظاہر ہوتا ہے نہ کہ مدعی ربوبیت سے۔

حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا الشاہ اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہٗ نے معجزات کی حقیقت پر کلام کرتے ہوئے بیان[۱] فرمایا:

"کہ ان کے صدور میں اسبابِ طبعیہ کو اصلاً دخل نہیں ہوتا نہ جلیہ کو نہ خفیہ کو نہ صاحبِ معجزہ کی کسی قوت کو نہ خارجی قوت کو۔ وہ براہ راست حق تعالیٰ کی مشیت سے بلا توسط اسباب عادیہ کے واقع ہوتا ہے۔ جیسا صادرِ اوّل بلا کسی واسطہ کے صادر ہوا ہے (یعنی فلاسفہ کے نزدیک) پھر قیامت تک بھی کوئی شخص اس میں سبب طبعی نہیں بتلا سکتا کیونکہ معدوم کو موجود کون ثابت کر سکتا ہے ورنہ اگر معجزہ سے کسی خاص زمانہ میں صاحب معجزہ کی تائید ہو جاتی تو دوسرے زمانہ میں اس کے سبب خفی بتلانے سے اس کی تکذیب ہو جاتی تو کسی نبی کی نبوت پر یقین موید نہیں ہو سکتا۔ وہذا کما تری۔

[۱] بوادر النوادر ج ۲ ص ۳۸۲

یہی سبب ہے کہ معجزہ پر اس جنس کے ماہرین نے کوئی سبب خفی تبلا کر باقاعدہ شبہ نہیں کیا۔ نہ اس کی مثل ظاہر کرکے مقاومت کرسکے۔

بالخصوص اگر نبی کی قوت اس کا سبب ہوتی تو موسیٰ علیہ السلام اپنے معجزہ سے خود نہ ڈرتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض فرمائشی معجزات کی تمنا پر یہ نہ فرمایا جاتا "فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ (یعنی اگر آپ سے یہ ہوسکے کہ زمین کی گہرائیوں میں کوئی راستہ تلاش کرلیں یا آسمان میں کوئی سیڑھی لگالیں پھر ان کے سامنے کوئی نشانی لے آئیں تو بھی یہ بات ان کے حق میں نافع نہ ہوگی)

اور استناد الی الاسباب الخفیہ کے احتمال پر معجزہ و دیگر عجائب طبعیہ میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اور انضمام اخلاق و کمالات کے ساتھ جو اس کو دلیل کہا گیا ہے تو ان اخلاق کی مخصوص نوعیت کو پہچاننے میں جتنی غلطی ہوسکتی ہے وہ معجزات کے متعلق غلطی ہونے سے کہیں زیادہ ہے[1]"

---

[1] حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مضمون کتاب سیرت النبی مؤلفہ علامہ شبلی نعمانی جلد سوم میں بسلسلہ بحث معجزات اُن کی ایک تحقیق کی تردید اور اس تحریر سے دلائل نبوت میں واقع ہونے والے اوہام و مغالطہ کا ازالہ ہے جس میں مؤلف نے معجزات کو دلائل نبوت کے مقام سے گرانے کی کوشش کی ہے اور یہ دعویٰ کیا کہ اصل دلیل نبوت اخلاق و روحانی کمالات کی بلندی ہے تو اسی کے متعلق حضرت کا یہ جملہ ہے کہ "اور انضمام اخلاق و کمالات کے ساتھ (جس میں قوت بھی داخل ہے) الخ۔ مراد یہ ہے کہ اخلاق فاضلہ اور کمالات کے مراتب بہت مختلف اور متفاوت ہوتے ہیں تو اگر صرف ان ہی کو دلیل نبوت قرار دیا جائے تو اول تو یہ متعین کرنا ممکن نہ ہوگا کہ اخلاق کی کونسی نوعیت مخصوص دلیل نبوت ہے پھر اس میں یہ غلطی واقع ہوگی اگر کوئی غیر نبی مثلاً قدرے کمالات اور بلند اخلاق (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حافظ ابن کثیر دمشقیؒ نے اپنی تاریخ البدایۃ والنہایۃ میں اور دیگر ائمۃ متکلمین نے معجزہ کی دو قسمیں بیان کی ہیں حسی اور معنوی معجزات کو عقلی نشانیاں بھی کہا جاتا ہے۔

پیغمبر کے یہ ایسے باطنی اور روحانی کمالات اور معالی اخلاق ہوتے ہیں کہ بغیر کسی کسب واکتساب کے قدرت خداوندی اس میں ودیعت فرمادیتی ہے مثلاً صداقت وامانت تقویٰ وطہارت، زہد وقناعت۔ ہمت وشجاعت۔ ایثار وہمدردی اور خدمت خلق، غریبوں اور محتاجوں کی اعانت کہ ان اوصاف کو دیکھ کر عقل انسانی یہ یقین کرلیتی ہے کہ ایسے معالی اخلاق اور بلند اوصاف و کمالات کہ ان کی نظیر ومثال نہیں ملتی لامحالہ خالق کائنات ہی کی طرف سے عطا کردہ کمالات ہیں تاکہ پیغمبر کی نبوت کو لوگ ان معنوی اور باطنی کمالات کے ذریعے سے پہچان لیں۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سامنے جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آغاز نبوت اور بدء وحی پر بے چینی اور اضطراب کی کیفیت کے ساتھ پہنچے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ کے ایسے ہی کمالات کو ذکر کرتے ہوئے آپؐ کو تسلی دی اور خود بھی ان کمالات کے پیش نظر آپؐ کی رسالت پر یقین واعتماد

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) رکھتا ہو جو اگرچہ یہ اخلاق وکمالات نبی سے کم درجہ کے ہوں گے لیکن دیکھنے والا غلطی کر بیٹھے گا اور نبی وغیر نبی میں التباس ومغالطہ کا دروازہ کھل جائے گا اور ظاہر ہے کہ یہ غلطی معجزات میں واقع ہونے والی غلطی سے بہت زائد ہے۔ سیرت النبی جلد سوم میں اسی مقام پر روحانی واخلاقی کمالات اور لوگوں پر اس کی تاثیر وتصرف کا ذکر کرتے ہوئے بطور مثال ہندو قوم کا لیڈر وپیشوا گاندھی کا ذکر کیا جس سے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو حو گرانی اور تکلیف ہوئی۔ اس کا بھی اظہار فرمایا۔ حضرات قارئین اصل کی مراجعت فرمائیں۔

کرتے ہوئے عزت و کامیابی کی بشارت دی، چنانچہ فرمایا:

كَلَّا وَاللّٰهِ لَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ ۔ (صحیح بخاری)

ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم اللہ تعالیٰ کبھی آپ کو شرمندہ و ناکام نہیں فرمائے گا۔ بیشک آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں۔ نادار و محتاجوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ تنگدستوں اور فقیروں کو کما کر دیتے ہیں۔ مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں اور راہِ حق میں اور لوگوں پر پیش آنے والے حوادث میں اعانت کرتے ہیں۔

احادیث میں آتا ہے کہ ابوذر رضی اللہ عنہ نے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضری سے قبل جب قاصد روانہ کیا تو اس قاصد نے آپؐ کے بلند اخلاق اور ایسے ہی معنوی کمالات کا مشاہدہ کرکے یہ پہچان لیا کہ واقعی آپؐ اپنے دعوے میں سچے ہیں۔ پھر جب ابوذر رضی اللہ عنہ خود حاضرِ خدمت ہوئے تو آپؐ کے چہرۂ انور کو دیکھتے ہی باطنی اور معنوی کمالاتِ نبوت کا مشاہدہ کرلیا اور انقیاد و اطاعت کے ساتھ دستِ بیعت آپؐ کی طرف بڑھایا ؎

مردِ حقانی کی پیشانی کا نور
کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور

جبتی معجزات سے قدرتِ الٰہیہ کے وہ قاہرانہ افعال اور خوارقِ عادات مراد ہیں جو رسولوں کے ہاتھوں پر ظاہر ہوں جن کے مقابلہ سے دنیا عاجز ہو۔ اور اس طرح سے یہ افعال قدرتِ خداوندی کی نشانیاں اور انبیاء علیہم السلام کی نبوت کی تصدیق و شہادت ہوں، جیسا کہ ارشادِ مبارک ہے:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ

عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں تمام آفاق (اقطارِ عالم) میں اور خود ان کے نفسوں میں

لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۔ دکھلائیں گے یہاں تک کہ ان کو یہ ظاہر
(سُورۃ شوریٰ) ہوجائے گا کہ بے شک یہی حق ہے ۔

دنیا میں انسانوں کے طبقات مختلف ہوتے ہیں اور ادراک و فہم کا تفاوت بدیہی اور یقینی امر ہے پھر یہ بھی کہ بہت سوں کی عقول و افہام کفر و شرک کی کدورتوں اور شکوک و اوہام کی ظلمتوں سے اس قدر ماؤف تھے کہ یہ توقع نہیں ہوسکتی تھی کہ معنوی اور رُوحانی کمالات ہی سے ہر شخص انبیاء کی نبوت کے سامنے سرِ تسلیم خم کردے گا ۔ کج فہم اور مبلغ و عناد میں مبتلا ہونے والے پر معنوی معجزات اثر انداز نہیں ہوسکتے تھے ۔ اس وجہ سے معنوی دلائل و معجزات کے ساتھ ایسے حسّی معجزات بھی دیئے گئے تاکہ شکوک و اوہام کی ظلمتوں میں گھرے ہوئے اور شرک و کفر کی گندگیوں میں آلودہ انسان بھی دُنیا کو جگمگادینے والے سُورج کی طرح برہان قاطع اور حجت واضحہ کا مشاہدہ کرلیں ۔ اور بڑے بڑے معاند و مخاصم اور مجادلہ کرنے والے ضدی انسان کو بھی حیل و حجت کی گنجائش نہ رہے ۔

افضل الانبیاء سرورِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو سب سے اعلیٰ اور بلند ترین معجزات عطا کیے گئے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم افضل الانبیاء والمرسلین ہیں ۔ آپؐ ہی کی ذات تمام کمالاتِ نبوت کا سرچشمہ اور منبع ہے ۔ گویا آپ نبوت و رسالت کے آفتاب ہیں اور خدا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو جو انوارِ نبوت اور کمالات رسالت علوم و معارف اور فضائل و مناقب عطا کیے گئے وہ سب کچھ اسی آفتابِ نبوت کا پرتو اور فیض ہے ۔ ہر پیغمبر کو اپنی قوم کے واسطے مبعوث کیا گیا اور صرف ایک مخصوص اور محدود زمانہ تک کے لیے، لیکن محمد رسول اللہؐ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام عالم جن و انس کے لیے اور قیامت تک کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا کہ آپؐ کے بعد قیامت تک کوئی رسول و نبی نہیں آئے گا۔ خاتم الانبیاء والمرسلین بنائے گئے تو اس عظمت و برتری اور افضلیت کا تقاضا تھا کہ آپؐ کے معجزات بھی خواہ وہ معنوی ہوں یا حسی، افضل و اعلیٰ، اور بلند ترین معجزات ہوں اور معجزاتِ نبویؐ کا درجہ اسی طرح انبیاء سابقین کے معجزات پر عالی اور بلند تر ہو جس طرح کہ آپؐ کی نبوت و کمالات نبوت ان سے بڑھ کر ہے۔ آپؐ کی شریعت و کتاب تمام کتب سماویہ اور شرائع حقہ سے فائق و برتر ہے۔

معنوی معجزات میں آپؐ کے جملہ اوصاف و معالی اخلاق اور وہ بلند پایہ کمالات جن کی عالم میں کوئی مثال نہیں۔ آپؐ کے علوم و معارف رموز و اسرار اور حقائق جنہوں نے دنیا کے عقلاء و فلاسفہ اور حکماء کو حیران و عاجز بنا دیا۔ آپؐ کی کتاب یعنی قرآن کریم جس کے مقابل تمام آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے علوم ایک ناپیدا کنار سمندر سے نکلی ہوئی نہریں معلوم ہوتی ہیں۔

آپؐ کی وہ تعلیم و تربیت کہ دنیا میں کسی بھی مُصلح اور مُربّی کی تاریخ میں اس کی ایک ادنیٰ سی بھی مثال نہیں ملتی کہ ایک ایسی جاہل اور وحشی قوم جو ہر قسم کی جہالت و گمراہی بداخلاقی فسق و فجور، ظلم و تعدی، طغیان و سرکشی، غرور و نخوت بغض و عداوت اور باہمی تحاسد و تباغض کا مجسمہ بنی ہوئی تھی اور ماحول بھی ایسا کہ علم کا نام و نشان تک نہیں۔ ملک کا ملک جہالت و حماقت رذائل اخلاق اور فواحش کا معدن و منبع بنا ہوا تھا۔

ایسی قوم میں رہ کر ایک یتیم و اُمّی شخص جس نے کبھی ایک حرف بھی کسی معلّم و مربّی سے لکھنا نہ سیکھا ہو۔ اس قوم کو رذائل سے پاک اور منزّہ بنا کر مکارم اخلاق محاسن آداب، صدق و امانت، صبر و شکر، زہد و تقویٰ، عدل و انصاف، عفت و عصمت، تواضع اور شجاعت، حیا و مروّت اور جود و کرم کا پیکر بنا دیا

اور الٰہی علوم و معارف کا ان کو استاذ کامل بنا دینا جس نے تمام عالم کو حیرت میں ڈال دیا سو یقیناً معجزانہ تعلیم ربانی میں نہایت بلند ترین چیز ہے۔

ایسے ظلمت کدۂ جہالت میں اس وحشی قوم کا آپؐ کی تعلیم و تربیت عفت و پاکدامنی التقویٰ و طہارت اور جملہ محاسن اخلاق ایثار اور باہمی ہمدردی کا پیکر ہو جانا تاریخ عالم کا ایسا محیر العقول واقعہ ہے۔ انسانی افکار و عقول اس کے تصور سے بھی عاجز تھے، جب کہ صرف ایک فرد ہی کا مزاج تبدیل کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اللہ کے اس آخری پیغمبر اور افضل الانبیاء والمرسلین رسول نے پوری کی پوری قوم کا مزاج اخلاق و عادات اور اطوار سب کچھ ہی بدل کر رکھ دیا بلاشبہ یہ سب کچھ معجزات عقلیہ کے باب میں ایک ایسا بلند مقام رکھتا ہے کہ آپؐ کی حیات مبارکہ پر ایک اجمالی نظر ڈالنے والا شخص بھی اس اقرار و اعتراف پر مجبور ہوگا۔ لَمْ اَرَ قَبْلَهٗ وَلَا بَعْدَهٗ مِثْلَهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کبھی نہیں دیکھا میں نے آپؐ جیسا کسی کو نہ آپؐ سے پہلے اور نہ آپؐ کے بعد صلی اللہ علیہ وسلم۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات عقلیہ و حسیہ کی عظمت و برتری

معجزات عقلیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات جس طرح انبیاء سابقین کے معجزوں پر فضیلت و برتری رکھتے ہیں۔ اسی طرح آپؐ کے معجزات حسیہ بھی تمام انبیاء سابقین کے معجزوں سے فوقیت رکھتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حسی معجزات کی تفصیل اور ان معجزات کے انواع و اقسام پر کلام ایک مستقل کتاب کا تقاضہ کرتا ہے۔ ان مختصر مباحث میں ان کا بیان مشکل ہے۔ اجمالاً یہ کہہ دینا کافی ہے کہ آپؐ کے

ان معجزات میں جو عقلیہ ہیں آپؐ کی تعلیم و تربیت اور ہدایت اور وحی الٰہی میں قرآن کریم سب سے زائد عظیم الشان معجزہ ہے۔ حسی معجزات میں معجزہ شق القمر سب سے بلند اور اعلیٰ معجزہ ہے کہ تمام عالم کے مادہ پرستوں اور سائنس دانوں کو مبہوت و مقہور کر دینے والا ہے جس کو قرآن کریم نے نہایت وضاحت اور عظمت کے ساتھ ذکر فرمایا :

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۔ (سُورۃ قمر) قیامت قریب آپکی ہے اور چاند ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔

مفسرین کا بیان ہے کہ ہجرت سے قبل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں تھے کفار مکہ کا وہاں ایک مجمع تھا۔ انہوں نے آپؐ سے (بطور ثبوت) کوئی نشانی طلب کی۔ آپؐ نے آسمان کی طرف دیکھا اور چاند کی طرف انگلی سے اشارہ فرماتے ہوئے فرمایا دیکھو۔ ناگہاں چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہوگیا۔ ان میں سے ایک ٹکڑا مغرب کی طرف اور دوسرا مشرق کی طرف چلا گیا۔ درمیان میں پہاڑ حائل تھا اس معجزہ کو "شق القمر" کہتے ہیں۔ امام طحاویؒ حافظ عماد الدینؒ ابن کثیر و دیگر محدثین اس واقعہ کو دین کے ان امور میں شمار کرتے ہیں جن کو متواتر کہا جاتا ہے

مجاہد سے روایت ہے کہ چاند کے جب دو ٹکڑے ہوگئے تو اس کا ایک ٹکڑا پہاڑ قعیقعان پر نظر آرہا ہے اور دوسرا نصف ٹکڑا ابوقبیس پہاڑ پر۔

امام احمد بن حنبلؒ نے بروایت جبیر بن مطعم نے یہ بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہوگیا۔ ایک ٹکڑا ایک پہاڑ پر اور دوسرا دوسرے پہاڑ پر نظر آرہا تھا۔ مشرکین مکہ کہنے لگے محمدؐ نے تو ہم پر جادو کر دیا ہے لیکن پھر کچھ لوگ یہ کہنے لگے کہ اگر ہم پر کوئی جادو کر دیا ہے تو سب پر تو جادو نہیں کرسکتے۔ اس لیے یہ چاہیے کہ ان مسافروں سے دریافت کرو جو دوران سفر میں اور ادھر آرہے ہیں۔ اگر آنے والے مسافر بھی اس بات کی شہادت دیں تو سمجھنا کہ یہ حق ہے اور جادو نہیں ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے

اہلِ مکہ سے جو لوگ سفر سے واپس آ رہے تھے ان سے اور اسی طرح دوسرے مسافروں سے اس واقعہ کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے بتایا کہ ہاں ہم نے بھی یہ دیکھا ہے۔ اور چاند کے دو ٹکڑے ہوجانے پر ہم بہت ہی متحیر اور اور خوف زدہ ہوئے۔ لیکن اس شہادت کے باوجود کفارِ مکہ اپنے کفر و سرکشی پر قائم رہے۔ ظاہر ہے کہ جو قوم ادراک و بصیرت کی تمام صلاحیتوں کو کھو بیٹھی سو وہ حق تعالیٰ کی نشانیوں کو کب قبول کرے گی:

وَمَا تُغْنِي الْآيَاتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ۔	اور فائدہ نہیں دیتیں نشانیاں اور ڈرانے والی باتیں، ایسی قوم کو جو ایمان و یقین کے لیے آمادہ نہیں۔
(سُورۃ یونس)	

انشقاق قمر کا یہ عظیم الشان معجزہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے قرآن کریم کی نص قطعی اور احادیث صریحہ سے ثابت ہے وہ احادیث صحیحہ و صریحہ جن میں اس معجزہ کا ذکر ہے حدِ تواتر تک پہنچ رہی ہیں۔ اُمت کے تمام علماء اہلِ حق کا اس پر اجماع و اتفاق ہے اور حسی معجزات میں یہ معجزہ ایک بلند مرتبہ رکھتا ہے کیونکہ بالعموم حسی معجزات عالمِ طبیعیات میں ملکوت ارض ہی پر پیش آنے والے ہوتے تھے لیکن یہ معجزہ ان عظیم آیات میں سے ہے جو ملکوت السمٰوات میں ظاہر ہوا۔

حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ نے "الجواب الصحیح" میں فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات جو قدرت و فعل اور تاثیر سے متعلق ہیں ان کی چند انواع و اقسام ہیں۔ ان میں سے بعض معجزات وہ ہیں جن کا اثر عالمِ علوی میں ظاہر ہوا جیسے معجزۂ شق القمر اور شہاب ثاقب کے ذریعے آسمانوں کا محفوظ کردینا کہ جنات و شیاطین میں سے کسی کو قدرت نہ تھی کہ وہ آسمان تک پہنچ کر وہاں کی باتیں معلوم کرلیں اور معجزۂ معراج کہ اس میں آپ ساتوں آسمانوں اور سدرۃ المنتہیٰ بلکہ اس سے بھی آگے ان بلندیوں تک پہنچے کہ جبریل کی پرواز

جبریل وہاں تک رسائی سے قاصر تھی اور یہ اعتراف و اظہار عجز تھا ؎

اگر یک سرمو برتر پرم   فروغ تجلّی بسوزد پرم

بعض معجزات عالم جوّ اور فضا میں ظاہر ہوئے۔ مثلاً آپؐ کی دعاءِ استسقاء کے فرماتے ہی بادلوں کا گرجنا، بجلی کا چمکنا اور آناً فاناً اس قدر تیز بارش برسنا کہ مدینہ کی نالیاں پانی سے بھر کر بہنے لگیں۔

بعض معجزات ایسے تھے جن کا اثر حیوانات و بہائم اور جن و انس میں ظاہر ہوا بعض کا اثر درختوں اور پتھروں میں ظاہر ہوا اور بعض کا اثر کھانے اور پانی کی مقدار میں اس قدر کثرت و زیادتی کی صورت میں ظاہر ہوا کہ چند قطرے پانی سینکڑوں افراد کے پینے اور جانوروں کو پلانے اور نہانے کے لیے کافی ہو گیا اور دو تین آدمیوں کے پیٹ بھرنے کے بقدر کھانا پورے لشکر کو کفایت کر گیا۔ غرض ان انواع و اقسام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا تعلق تھا۔ گویا آپؐ کے معجزات کا اثر ایسی جامعیت اور کاملیت کی شان رکھتا تھا۔ اس نے تمام مخلوقات کے احاطہ کے ساتھ عالم ارض و سماء، بر و بحر اور جو سب ہی کو جمع کر لیا۔[1]

حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ "شق القمر" پر کلام فرماتے ہوئے ایک دوسرے موقعہ پر فرماتے ہیں، کہ "اس معجزہ میں دو عظیم الشان حکمتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا ایسا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ادنیٰ انکار و تأمل کی گنجائش نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ مشرکین مکہ کی فرمائش تھی اور اب اس فرمائشی معجزہ کے بھی ظاہر ہونے کے بعد ان کے واسطے کوئی عذر باقی نہیں رہا تھا۔ دوسری طرف یہ کہ اس معجزہ سے اللہ تعالیٰ نے منکرین آخرت اور قیامت پر ایک برہان واضح قائم کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو قیامت کے قرب کے مضمون کے ساتھ بیان فرمایا گیا اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ تاکہ اس ایک معمولی سے نمونہ شق قمر کو دیکھ کر منکرین سمجھ جائیں کہ جس پروردگار نے

---

[1] شرح عقیدۃ السفارینی - جلد دوم -

اپنے ایک حکم سے چاند کے دو ٹکڑے کر دیئے وہی قادر مطلق اپنے حکم سے چاند سورج اور ستاروں کے نظام کو درہم برہم کر ڈالے گا۔ آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور زمین شق ہو جائے گی۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح فضا میں اڑنے لگیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ فلاسفر کے زعم باطل کا بھی رد ہو گیا کہ آسمان کے لیے خرق والتیام (ٹوٹ پھوٹ) ممکن نہیں۔

رسالہ حجۃ الاسلام میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ملحدین مستشرقین کے اس شبہ کا (کہ واقعہ شق القمر بالعموم تاریخ کی کتابوں میں مذکور نہیں ہے) ازالہ کرنے کے لیے فرمایا:

"اگر ایسے وقائع کا تاریخوں میں لکھا جانا ضروری ہے تو اس اندھیری کا کونسی تاریخ میں ذکر ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سولی دینے کے دن واقع ہوئی تھی اور اس ستارہ کا کونسی کتاب میں ذکر ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تولد کے دنوں میں نمایاں ہوا تھا۔ اور آفتاب کے ساکن رہنے کا کہاں کہاں چرچا ہے اور کون کونسی کتاب میں ذکر ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اور وقائع کو خیال فرما لیجیے۔ علاوہ بریں دن کے واقعات اور رات کے حوادث میں عام اطلاع کے لحاظ سے زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

خاص کر اندھیری رات کہ اس کی اطلاع تو ہر کس و ناکس کو ضرور ہونی چاہیے (لیکن) انشقاق قمر کی اطلاع سوائے ان صاحبوں کے ضروری نہیں، ... جو اس وقت بیدار ہوں اور پھر نگاہ بھی ان کی چاند کی طرف لگ رہی ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ بات شب کے وقت بہت کم اتفاق میں آتی ہے کہ انسان بیدار بھی ہو اور نگاہ بھی چاند کی طرف لگی ہوئی ہو۔ اور اگر فرض کیجیے کہ موسم سرما ہو تو یہ بات اور بھی مستبعد ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں (مکہ مکرمہ میں) طلوع قمر کے تھوڑی دیر بعد

واقع ہُوا اس لیے کہ جبل حرا کے دونوں ٹکڑوں کے بیچ میں حائل ہوجانے کا ذکر آتا ہے (اور یہ بات اس کا قرینہ ہے کہ چاند ابھی زائد بلندی تک نہیں پہنچا تھا) اس صورت میں ممالک مغرب میں تو اس وقت تک عجب نہیں کہ ایک ٹکڑا دُوسرے ٹکڑے کی آڑ میں آگیا ہو اور اس لیے انشقاق قمر اس جگہ محسوس نہ ہُوا ہو۔ ہاں ہندوستان میں اس وقت ارتفاع قمر البتہ زیادہ ہوگا (کیونکہ مکہ مکرمہ سے اس سرزمین میں طلوع و غروب ڈھائی گھنٹہ اور بعض علاقوں میں اس سے بھی زائد مقدم ہے) اور اس لیے وہاں اور جگہوں کی نسبت اس کی اطلاع کا زیادہ احتمال ہے مگر جیسے اس وقت ہندوستان میں ارتفاع قمر زیادہ ہوگا۔ ویسے ہی اس وقت رات بھی آدھی ہوگی اور ظاہر ہے کہ اس وقت کون جاگتا ہوتا ہے۔ (علاوہ ازیں یہ بھی ہے) ہندوستانیوں کو قدیم سے اس طرف توجہ ہی نہ تھی کہ تاریخ لکھا کریں۔ بایں ہمہ تاریخوں میں موجود ہے کہ یہاں (یعنی ہندوستان) کے ایک راجہ نے ایک رات بچشم خود یہ واقعہ دیکھا ہے۔"

(حجۃ الاسلام صفحہ ۴۲ و صفحہ ۱۹۹ بحوالہ ترجمان السنۃ
مولانا محمد بدر عالم میرٹھیؒ)

قاضی سلیمان صاحب منصور پوریؒ نے اپنی کتاب سیرت رحمۃ للعالمین جلد سوم صفحہ ۱۹۰ پر ایک نقشہ دیا ہے جس میں یہ ظاہر کیا ہے اس واقعہ کے وقت دُوسرے ممالک میں کیا کیا اوقات ہوں گے جس سے ظاہر ہے کہ اس وقت کہیں دن بھی ہوگا، کہیں رات کا آخری حصّہ ہوگا، کہیں دوپہر اور کہیں شام (اہل علم مراجعت فرمائیں)

الغرض معجزات عقلیہ میں جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزات انبیاء سابقین کے دلائل نبوّت سے بہت اعلیٰ و ارفع ہیں اور ان میں قرآن کریم اور آپؐ کی ذات اقدس سب سے بڑھ کر دلیل نبوّت ہے۔ اسی طرح معجزات

حسیہ کی ہر نوع میں آپ کو ایسا عظیم معجزہ عطا کیا گیا کہ وہ سابق معجزہ سے بھی فوقیت لے جانے والا ہوا۔

مثلاً معجزات سابقہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ کہ جب ان کو آگ میں ڈالا جانے لگا تو حق تعالیٰ کا فرمان جاری ہوا : قُلْنَا یَا نَارُ کُونِی بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی معجزہ کی یہ نوع ظاہر ہوئی۔

ابن سعد نے عمرو بن میمون سے یہ واقعہ روایت کیا ہے کہ مشرکین مکہ جب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو آگ میں جلانے لگے تو آپ نے ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر یہ فرمایا[1]:

یَا نَارُ کُونِی بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰی عَمَّارٍ کَمَا کُنْتِ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ۔	کہ اے آگ تو عمار پر ایسی ہی برد و سلام ہو جا جیسے ابراہیم علیہ السلام پر ہوئی تھی۔

اسود عنسی ملعون سود اللہ وجہہٗ نے جب نبوت کا دعویٰ کیا اور مقام صنعاء پر غلبہ حاصل کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی ذویب بن کلیب رضی اللہ عنہ کو اس خبیث نے آگ میں ڈال دیا۔ آپؓ پر ایمان کی برکت سے آگ نے ان پر کوئی اثر نہیں کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں جب واقعہ آیا، تو فرمایا : اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ فِیْ اُمَّتِنَا مِثْلَ اِبْرَاهِیْمَ الْخَلِیْلِ (خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہماری امت میں ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نمونہ بنایا) :

حافظ عسقلانیؒ نے "اصابہ" میں اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے فرمایا :
" اہل یمن میں سے سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے یہی صحابی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملت ابراہیمی ہے تو اس پر

[1] زرقانی شرح مواہب جلد ۵ بحوالہ العلم الکلام۔

ایمان و اتباع کی برکت سے ابراہیم خلیل اللہ کے برکات و آثار میں ایک نوع سے اللہ رب العزت نے یہ شرکت عنایت فرما دی۔

ابونعیم نے عباد بن عبدالصمد سے روایت کیا ہے کہ ہم حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے باندی کو حکم دیا کہ دستر خوان لاؤ۔ جب وہ دستر خوان لے آئی تو آپ نے فرمایا رومال لے آؤ۔ وہ ایک میلا رومال لے کر حاضر ہوئی۔ فرمایا تنور سلگا لو۔ جب تنور سلگ گیا تو وہ رومال اس تنور میں ڈال دینے کا حکم دیا چنانچہ وہ ڈال دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ رومال تنور سے نکالا گیا تو نہایت صاف و شفاف تھا اور خالص دودھ کی طرح سفید نظر آرہا تھا۔ ہم نے تعجب کے طور پر دیکھا تو فرمایا یہ وہ رومال ہے جس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منہ پونچھا کرتے تھے۔ جب یہ رومال میلا ہو جاتا ہے تو ہم اس کو اسی طرح تنور میں ڈال کر صاف کر لیتے ہیں۔

سبحان اللہ کس قدر عظیم معجزہ ہے اور اس نوع میں یقیناً یہ بات اور زائد عظمت و برتری رکھتی ہے کہ وہاں آگ نے پیغمبر کے جسم کو نہیں جلایا یہاں آگ اس کپڑے کے ٹکڑے کو نہیں جلا رہی ہے جو پیغمبر کے چہرہ سے ملا گیا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ید بیضا دکا معجزہ ایک عظیم الشان معجزہ تھا لیکن اس سے بڑھ کر یہ امر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے بعض صحابہ کی چھڑیاں اندھیری رات میں روشن ہو گئیں اور وہ اس کی روشنی میں راستہ طے کرتے رہے۔

اُسید بن حُضیر اور عباد بن بشر رضی اللہ عنہما کو یہی واقعہ پیش آیا کہ جس وقت مجلس مبارک سے اٹھ کر چلے تو راستہ تاریک تھا ان میں سے ایک عصا روشن ہو گئی جب دوسرے کا راستہ جُدا ہوا تو دوسرے کی بھی عصا روشن ہو گئی۔

(صحیح بخاری)

علیٰ ہذا قتادہ بن النعمان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات بعد نماز عشا واپسی پر ایک

چھڑی دی وہ چھڑی روشن ہوگئی اور قتادہ اس کی روشنی میں چلتے رہے۔

امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں اور ابو نعیم نے دلائل النبوت میں حمزۃ الاسلمی رضی اللہ عنہ کا ایک اسی طرح کا واقعہ نقل کیا کہ ایک سفر کے دوران جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رات کی تاریکی میں اچانک حمزۃ الاسلمیؓ کے ہاتھ کی تمام انگلیاں روشن ہوگئیں جس کے بعد وہ تمام صحابہ جو منتشر ہو گئے تھے پھر اس جگہ جمع ہو گئے۔

حضرت یوشع علیہ السلام کے لیے آفتاب کا ٹھہر جانا نہایت عظیم الشان معجزہ ہے لیکن انشقاق قمر کا معجزہ اس سے بڑھ کر ہے۔

سنگریزوں کا آپؐ کے دست مبارک میں تسبیح کرنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس معجزہ سے بڑھ کر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے پتھر پر عصا مارا تو اس میں سے پانی بہنے لگا۔ کیونکہ پتھر سے پانی پھوٹنا اگرچہ نہایت ہی عجیب تر اور خرق عادت امر ہے لیکن اس سے زیادہ اعجب یہ ہے کہ پتھر میں سے نطق و گویائی اور تسبیح و تحمید خداوندی کا سلسلہ جاری ہو جائے۔ ستون حنانہ کا گریہ وزاری جب کہ آپؐ نے اس کے سہارے کے بجائے پہلی بار منبر پر تشریف فرما ہو کر خطبہ دیا۔ یقیناً عصائے موسیٰؑ کے سانپ بن جانے سے زائد عظیم ہے

معاذ بن عفرا رضی اللہ عنہ کی بیوی برص کی بیماری میں مبتلا تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس مرض کی شکایت کی۔ آپؐ نے اپنا عصاء مبارک ان کے بدن پر پھیرا فوراً ان کا برص جاتا رہا، تو یہ معجزہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس معجزہ سے بڑھ کر ہوا جو حق تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا تھا کہ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بلکہ وہاں حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھ سے معجزانہ طور پر اللہ نے اس بیماری کو دور فرمایا تھا یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عصا سے اس بیماری کو اللہ نے دور فرمایا۔ بہرکیف

لہ مسند احمد بن و معجم طبرانی بحوالہ علم الکلام۔

اس طرح معجزات حسیہ کا باب بہت وسیع ہے۔ جو انشاء اللہ تعالیٰ ایک مستقل تالیف میں قارئین کرام کی خدمت میں ہم پیش کریں گے۔

مسئلہ آخرت اور بعث بعد الموت

مسائل اعتقادیہ اور علوم نظریہ میں قرآن کریم نے مسئلہ آخرت اور بعث بعد الموت نہایت ہی اہتمام اور بڑی ہی تحقیق اور بسط و تفصیل سے بیان کیا ہے کیونکہ ایمان باللہ اور ایمان بالرسول آخرت پر ایمان و یقین ہی پر موقوف ہے۔ سورۂ بقرہ کی ابتدا ہی میں قرآن کریم کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے جہاں یہ فرمایا کہ یہ کتاب ان لوگوں کے واسطے ذریعہ ہدایت ہے جو تقویٰ اور ایمان بالغیب یعنی اللہ اور اس کے رسول اور اس کی وحی پر یقین رکھتے ہوئے فرائض اسلام کی تعمیل و تکمیل پر آمادہ و مستعد ہیں۔ اسی کے ساتھ ان لوگوں کی یہ صفت بیان فرمائی گئی:

وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ	اور آخرت پر وہی لوگ یقین و ایمان رکھتے ہیں۔
(سورۂ بقرہ)	

اس سے واضح ہوگیا کہ ایمان باللہ والرسول ایمان بالآخرت سے منفک اور جُدا نہیں۔ بلکہ ایمان باللہ والرسول کا دارو مدار ایمان بالآخرۃ ہی پر ہے۔ "آخرت اور یوم آخرت" قرآن کریم نے متعدد مواقع پر دونوں ہی عنوان اختیار کیے ہیں عالم آخرت کا آغاز دُنیا اور دارِ دُنیا کا آخری دن ہے۔ اس وجہ سے یوم آخرت کہا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ نے انسانی زندگی دو عالموں سے متعلق فرمائی ہے۔ ایک زندگی ولادت کے بعد سے اس کے مرنے تک ہے اور دُوسری زندگی موت کے بعد مبعوث اور دوبارہ اُٹھنے کے بعد سے جنت و جہنم کی لازوال حالتوں تک۔ پہلی زندگی کو دُنیا کہا گیا اور دُنیا لغت کے لحاظ سے قریب تر چیز کو کہا جاتا ہے اور

ظاہر ہے کہ یہ زندگی انسان کو پہلے حاصل ہوتی ہے اس لیے اس کا نام دُنیا ہُوا اور مرنے کے بعد مبعوث ہونے پر جو زندگی ہے وہ بعد میں ہے تو اس کو عقبیٰ اور آخرۃ فرمایا گیا۔ اسی اعتبار سے دنیوی زندگی کو اَلنَّشْاَۃَ الْاُوْلیٰ (یعنی پہلی پیدائش) اور اخروی زندگی کو النشاۃ الْاُخْرٰی (یعنی دُوسری اور آخری پیدائش فرمایا ہے۔ اسی وجہ سے حیات انسانی کے ان دونوں ادوار کو الاولیٰ اور الآخرہ جیسے متقابل عنوان سے قرآن کریم تعبیر کرتا ہے:

وَلَلْآخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلیٰ۔

مفسرین کی ایک جماعت اس آیت کی مُراد یہ بھی بیان کرتی ہے کہ آخرۃ کی زندگی اور وہاں کی نعمتیں [illegible] زندگی اور اس کی راحتوں سے زائد بہتر ہے بعض حضرات علماء نے آسمان و زمین کے پھٹ جانے اور چاند وسُورج اور ستاروں کے ٹوٹ جانے اور شب و روز کا نظام درہم و برہم ہونے کو جو آخرت قرار دیا وہ اس لحاظ سے کہ یہ امور یوم آخرت کا مبداء و آغاز ہیں ورنہ اصل یوم آخرت تو وہ ہے جب دوبارہ نفخ صور کے بعد تمام انسان اپنی اپنی قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے اور اللہ رب العزت کے روبرو حاضر کر دیئے جائیں گے جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا:

وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰہُ ثُمَّ نُفِخَ فِیْہِ اُخْرٰی فَاِذَا ھُمْ قِیَامٌ یَّنْظُرُوْنَ

(سورۃ الزمر)

اور جس روز کہ صور پھونکا جائے گا تو بیہوش ہو کر گر پڑیں گے جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں مگر جس کو اللہ چاہے پھر دوبارہ اس صور میں پھونکا جائے گا تو فوراً وہ سب کھڑے ہو جائیں گے۔ درانحالیکہ وہ دیکھتے ہوں گے۔

تو دوبارہ نفخ صور پر جب مخلوق مرنے کے بعد زندہ ہو کر اُٹھ کھڑی ہوگی، اس وقت دُنیا اور حیات دُنیاوی کا کوئی حصہ باقی نہ رہے گا۔ اور پھر

اس دن کے بعد نہ کبھی رات آئے گی اور نہ رات کے ختم ہونے پر دوسرا دن آئے گا۔

دنیا تو اس جہان کی صفت حیات کا نام ہے۔ جب حیات ہی باقی نہ رہے گی تو دنیا کا وجود کیونکر رہے گا۔ اہل حق کا اجماع ہے کہ انسان دنیا میں ایک ہی مرتبہ پیدا ہوتا ہے اور جب مر جاتا ہے تو پھر کبھی دوبارہ اس کو دنیا کی حیات نہیں حاصل ہوتی اور دنیا کی جب تمام ضروریات ختم ہو جائیں گی اور جو کچھ چیزیں دنیا میں ہیں وہ فنا ہو جائیں گی تو اس وقت حشر اموات ہوگا بس اسی کا نام آخرت ہے۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ — وہ دن جب کہ یہ زمین ایک دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور اسی طرح آسمانوں کو بھی اور سب لوگ اللہ واحد قہار کے سامنے پیش ہوں گے اور نکل کھڑے ہوں گے۔

(سورۃ ابراھیم)

اسی روز کو حق تعالیٰ شانہٗ کے دربار میں حاضری اور پیشی کا دن فرمایا گیا ہے:

يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ — کہ اس دن لوگ کھڑے ہوتے ہوں گے رب العالمین کے سامنے۔

قیام قیامت اور یوم آخرت کو قرآن نے "اَلسَّاعَة" کے عنوان سے بھی

ؒ اسی یوم کا نام یوم الفصل بھی ہے جیسا کہ فرمایا گیا ھٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ اور اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ۔ کہ یہ فیصلہ کا دن ہے اے لوگو! ہم نے تم کو اور تم سے پہلوں کو سب کو جمع کر لیا ہے۔ اسی کے بارہ میں ارشاد ہے۔ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا کہ تم سب کا اللہ ہی کی طرف واپس لوٹنا ہے، یہ ایک وعدہ ہے برحق اور پختہ۔ اسی بناء پر قیامت کو یَوْمٌ مَّوْعُوْدٌ بھی فرمایا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

تعبیر کیا ہے :

یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ لَا یُجَلِّیْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ۔	یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق دریافت کرتے ہیں کہ اس کے واقع ہونے کا وقت کب ہے ۔ آپ کہہ دیجیے اس کا علم تو صرف میرے پروردگار ہی کو ہے ۔ وہی ظاہر کرے گا اس کے وقت پر وہ بہت ہی بھاری ہے آسمانوں اور زمین میں وہ تمہارے سامنے نہیں آئے گی مگر اچانک ۔

(سورۃ الاعراف)

اس روز جب کہ اولین و آخرین میدان حشر میں حیران و پریشان کھڑے ہوں گے اور

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ وَالْیَوْمِ الْمَوْعُوْدِ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ

قیام قیامت کے کچھ احوال ذکر کرتے ہوئے حق تعالیٰ نے فرمایا :

وَیَوْمَ نُسَیِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِیْنَ مُشْفِقِیْنَ مِمَّا فِیْهِ وَیَقُوْلُوْنَ یٰوَیْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَةً وَّلَا كَبِیْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَلَا یَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۔ (سورۃ کہف)	اور جس دن کہ ہم پہاڑوں کو سرکا دیں گے (اور ان کو دوڑائیں گے کہ دیکھنے والا ان کو روئی کے گالوں کی طرح محسوس کرتا ہوگا) اور اے مخاطب تو زمین کو دیکھے گا ایک کھلا ہوا میدان (جس میں تمام مخلوق جمع ہوگی) اور ہم سب کو اکٹھا کریں گے اس طور سے کہ ان میں سے ہم کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے اور سب اللہ کے سامنے قطار در قطار پیش کیے جائیں گے ان سے کہا جائے گا کہ بیشک تم ہمارے پاس آئے ہو اسی طرح (برہنہ) جیسے کہ ہم نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا بلکہ تم تو یہ سمجھتے تھے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہر ایک مبہوت و بدحواس اور کرب و بے چینی میں مبتلا ہوگا کہ اچانک رب العالمین اور احکم الحاکمین نہایت ہی عظمت و جلال کے ساتھ بندوں کے فیصلہ کے لیے نزول اجلال فرمائیں گے۔ ہر طرف فرشتوں کا پہرہ ہوگا۔ اسی منظر کو ان کلمات نے بیان کیا:

وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا۔ (وَالْفَجْر)

اور (اے مخاطب) تیرا رب (فیصلہ کے لیے) آئے گا اور فرشتے جوق در جوق قطار در قطار کھڑے ہوں گے۔

جبریلؑ امین اور تمام ملائکہ مقربین اور عالم سموٰات و ارضین کے فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے اور خداوند عالم کی عظمت و جلال اور ہیبت سے کسی کو بولنے کی مجال نہ ہوگی۔ انبیاء و مرسلین بھی حیران و متفکر ہوں گے۔ سب سے پہلے حق تعالیٰ شانہ، کی طرف سے انبیاء و مرسلین کو خطاب فرمایا جائے گا۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَا أُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ۔ (سُوْرَةُ مَائِدَہ)

جس دن کہ اللہ تعالیٰ جمع فرمائے گا رسولوں کو پھر ان سے فرمائے گا (بتاؤ) تم کو کیا جواب دیا گیا (تمہاری امتوں کی طرف سے) عرض کریں گے اے پروردگار (ظاہر میں جو جواب دیا گیا وہ تو معلوم ہے لیکن) حقیقت کا ہمیں کوئی علم نہیں بے شک چھپی ہوئی باتوں کا

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) کہ تمہارے واسطے (حاضری کا) ہم نے کوئی وقت ہی مقرر نہ کر رکھا ہے۔ اور (لوگوں کے سامنے) نامۂ اعمال رکھ دیئے جائیں گے۔ تو اس وقت اے مخاطب تو مجرموں کو دیکھے گا کہ وہ ڈر رہے ہوں گے اور کہتے ہوں گے۔ ہائے افسوس ہماری بدبختی! کیا ہوا کہ کتاب (نامۂ اعمال) کو کہ اس نے کوئی بھی عمل خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ایسا نہیں چھوڑا کہ اس کو اس کتاب نے لکھ نہ لیا ہو۔ اور سب لوگ اپنے ان تمام اعمال کو سامنے موجود پائیں گے جو انہوں نے کیے۔ اور اے مخاطب تیرا رب کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ ۱۲

تو ہی خوب جاننے والا ہے۔

علماء متکلمین نے لکھا ہے کہ یوم حشر صرف اجساد و ابدان ہی کا حشر اور جمع نہیں ہے بلکہ اس روز تمام مخلوق کے ابدان و اجسام کے جمع کرنے کے ساتھ انسانوں کے تمام اعمال و افعال اور احوال بھی جمع کر لیے جائیں گے۔ اعمال صالحہ اور سیئہ ہر ایک کے اس کے سامنے موجود ہوں گے اور وہ ان کا مشاہدہ کرتا ہوگا اور جب انسان یہ دیکھے گا کہ اس کی ایک ایک بات اور ہر ہر حرکت سامنے آرہی ہے تو مایوسانہ جذبات حسرت اور ملال کے ساتھ کہے گا مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَّلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا ۔ وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا ۔

ایمان بالآخرۃ اور حشر و نشر اور بعث جسمانی دین کے بنیادی اصول میں سے ہے جس طرح کوئی شخص خداوند عالم اور اس کے رسول پر ایمان لائے بغیر مومن نہیں ہوسکتا اسی طرح قیامت اور روزِ آخرت پر ایمان لائے بغیر شریعت کے نزدیک وہ شخص مومن کہلانے کا کسی طرح بھی مستحق نہیں۔

کفار مکہ اور مشرکین قریش خاص طور پر دو چیزوں کا بڑی شدت سے انکار کرتے تھے۔ ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور دوسرے قیامت کا۔ وہ ہرگز اس بات کو تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوتے تھے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور قیامت قائم ہوگی۔ ہر چند دلائل و بیّنات کے مشاہدہ کے بعد بھی یہی کہتے کہ :

إِنْ هٰذَا إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ۔ (سورۃ انعام)

اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہ ہماری دنیا کی زندگی ہے۔ (اسی میں ہماری حیات و موت ہے) اور ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔

بلکہ کفار مکہ تو بعث بعد الموت کے بیان پر استہزاء اور تمسخر کرتے ہوئے کہا کرتے

هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ

کہ کیا ہم تمہیں ایک ایسے شخص کا پتہ نہ بتائیں

إِنَّكُمْ إِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ أَفْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَمْ بِهِ جِنَّةٌ

جو تم کو یہ خبر دیتا ہے کہ تم جب کہ ریزہ ریزہ کر دیئے جاؤ گے (مرنے کے بعد) تو پھر تم کو یقیناً ایک نئی پیدائش کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ کیا یہ بات اللہ پر جھوٹ بہتان نہیں ہے یا یہ کہ اس شخص کو کچھ سودا (جنون) ہے۔

(سورۃ سبا)

حق تعالیٰ شانہٗ نے اس مسئلہ کو نہایت وضاحت کے ساتھ بار بار دہرایا، اور فرمایا: قُلِ اللَّهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ[1] (کہ خدا ہی تم کو حیات و زندگی عطا کرتا ہے۔ پھر وہی تم کو مارتا ہے۔ اور پھر وہی تم سب کو قیامت کے روز جمع کرے گا جس میں کوئی شبہ نہیں) مسئلہ بعث بعد الموت میں تردد کرنے والوں کو قرآن کریم نے ایک نہایت سادہ معقول اور فطری انداز میں سمجھایا:

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ بَلَىٰ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ.

کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ جس خدا نے آکاشوں اور زمین کو پیدا کیا اور وہ ان کے پیدا کرنے سے عاجز نہیں ہوا تو کیا وہ اس پر قادر نہ ہوگا کہ مُردوں کو زندہ کر دے؟ بیشک وہ خداوند عالم ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔

(سورۃ الاحقاف)

یعنی جب ہر ایک چیز کو اللہ تعالیٰ عدم سے وجود اور ظہور میں لانے پر قادر ہے، اور کائنات کو عدم محض سے پیکر وجود اسی نے عطا کیا تو اس کے اعادہ اور اس کو دوبارہ پیدا کرنے میں تردد کرنا خلاف عقل ہے۔ حالانکہ کسی شے کے ایجاد سے اس کا اعادہ آسان اور سہل ہوتا ہے تو ایسے لوگ عقل و شعور سے

[1] سورۃ الجاثیہ۔

کس قدر بعید ہیں کہ خالق کائنات کے لیے مخلوق کو دوبارہ قیامت میں اٹھانے کا انکار کرتے ہیں۔ کفار مکہ کا یہ سوال قرآن کریم نے نقل کر کے یہی استدلالی جواب ارشاد فرمایا:

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ۔ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ	کافروں نے کہا کون ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرے گا جب کہ وہ بوسیدہ اور ریزہ ریزہ ہو چکی ہوں گی۔ (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجیے کہ وہی خدا ان کو دوبارہ زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا۔ اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔
(سورۃ یٰس ۸۰)	

انسان کو اس کی تخلیق اور اطوار تخلیق کے نمونے ذکر کرتے ہوئے اوہام و شکوک کی ظلمتوں سے نکال دینے کے لیے اس مسئلہ کو ایسے دل نشین انداز میں دلائل کے ساتھ بیان فرمایا کہ اس کو سن کر کوئی بھی صحیح العقل انسان ادنیٰ تردد اور شبہ کی گنجائش نہیں پائے گا۔ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ	اے لوگو! اگر تم مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے بارہ میں شک اور تردد میں پڑے ہوئے ہو تو (تم اس میں کیوں نہیں غور کرتے کہ) بے شک ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر (تخلیق آدم علیہ السلام کے بعد ہم نے ان کی نسل کو) نطفہ سے پھر بستہ خون سے پھر گوشت کے لوتھڑے (بوٹی) سے جو نقشہ بنی ہوئی ہے اور بدون نقشہ بنی ہوئی ہے تاکہ ہم (اپنی قدرت)

إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ
بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ۚ وَتَرَى الْأَرْضَ
هَامِدَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا
الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنْبَتَتْ
مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ذَٰلِكَ بِأَنَّ
اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ
وَأَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۔
وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَا رَيْبَ
فِيهَا وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَنْ
فِي الْقُبُورِ ۔

کھول کر دکھلا دیں تم کو اور پھر ٹھرائے رکھتے ہیں
ہم تم کو پیٹ میں جب تک بھی ہم چاہیں مدت
معینہ تک ۔ پھر ہم نکالتے ہیں تم کو ایک
بچہ ہونے کی صورت میں ۔ پھر یہ کہ تم
پہنچ جاؤ اپنی جوانی کی قوت اور زور تک ۔
اور تم میں سے کچھ وہ ہوتے ہیں جن کو قبض
کر لیا جاتا ہے اور بعض وہ ہوتے ہیں جن کو
ارذل عمر یعنی عمر کے آخری حصہ تک لوٹایا
جاتا ہے یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے کہ
سمجھنے اور جاننے کے بعد بھی کسی چیز کو نہیں سمجھتا
(قویٰ بیکار ہو جانے سے) اور اے مخاطب
تو زمین کو دیکھتا ہے ایسی حالت میں کہ وہ
خراب اور خشک پڑی ہے پھر جب ہم نے
اس پر پانی برسایا تو وہ تر و تازہ ہو گئی اور
ابھری اور اُگانے لگی قسم قسم کے رونق کی
چیزیں (پھل اور پھول) یہ سب کچھ
اس واسطے ہے کہ بیشک اللہ ہی قادر مطلق
اور ذات برحق ہے اور وہی مُردوں کو
زندہ کرتا ہے اور یقیناً وہی ہر چیز پر
پوری پوری قدرت رکھنے والا ہے ۔
اور قیامت بیشک آنے والی ہے جس
میں کوئی شبہ نہیں اور یقیناً وہ پروردگار
دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے گا ان مُردوں کو

(سورۃ النجم) جو قبروں میں (مدفون) ہیں ۔

مقصد یہ ہے کہ اگر کسی کو یہ دھوکہ لگ رہا ہے کہ انسان کے ریزہ ریزہ ہوچکنے کے بعد دوبارہ اس کو زندگی کس طرح دی جائے گی تو انسان کو چاہیے کہ خود اپنی پیدائش پیدائش اطوار پہ اور زمین بنجر پر بارشوں کے برسنے کے بعد طرح طرح کے سبزے اور شادابیوں کے اُگنے کے مناظر دیکھ کر یقین کرلے کہ بس اسی طرح اللہ تعالیٰ مُردوں کو بھی دوبارہ حیات زندگی عطا فرمائے گا ۔ جب زمین میں ہر تخم اور بیج ڈالے جانے کے بعد ریزہ ریزہ ہوکر زمین کے اجزاء میں اس طرح خلط ملط ہوچکے ادر حتیٰ کہ ذرّہ خاک بن کر بھی پھر وہی تخم ایک درخت کی صورت میں زمین پہ نمودار ہورہا ہے تو اسی طرح اگر انسان کی ہڈیاں اس کا گوشت پوست بھی خواہ زمین میں رل کر خاک ہوچکا ہو یا ہواؤں میں اس کے ذرّات اڑ رہے ہوں یا پانی میں بہہ رہے ہیں تو ان سب اجزاء کو اللہ تعالیٰ دوبارہ زندگی دے دے تو کیا تعجب ہے ۔ زمین پر اُگنے والا ہر درخت اور گھاس کا تنکا بعث بعدالموت کا ایک کامل ترین نمونہ ہے ۔

اس سائنسی دور میں اگر فضا میں منتشر شدہ آوازیں ضبط کی جاتی ہیں تو یہ بات مادہ پرست انسان تسلیم کرنے میں کیوں تردّد کرتا ہے کہ پروردگار عالم اپنی قدرت کاملہ سے انسانی اجسام اور ان کے پراگندہ اجزاء حتیٰ کہ مٹی اور پانی میں تحلیل شدہ گوشت و پوست کو بھی جمع کرکے دوبارہ مبعوث فرمادے گا۔

عالمِ جسمانی کی حقیقت اور اس کی موت وحیات

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ "تقریر دل پذیر" میں عالمِ جسمانی کی حقیقت اور اس کی حیات و ممات پر ایک تفصیلی بحث کے دوران فرماتے ہیں کہ :

" عالمِ جسمانی بھی انسان کی طرح مختلف اجزاء سے مرکب ہے اور جس طرح انسان کی ہیئت ترکیبی اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہ اس کی حیات مستعار محض ہے اور چند روزہ ہے اور اس کے بعد موت ہے ۔ اسی طرح اس عالم پر بھی ایک وقت موت کا آنے والا ہے اور جیسے انسان پر مختلف دور گزرتے ہیں طفولیت شباب اور پیری اور پھر موت اسی طرح عالم کے لیے بھی طفولیت و شباب اور بڑھاپے کا زمانہ ہے اس کے بعد اس کو فنا ہے اور یہ قیامِ قیامت کا وقت ہے ۔ اس وقت مجموعہ عالم کا قبض رُوح ہوگا اور اس کی حیات ختم ہو جائے گی ۔ آسمان و زمین پھٹ جائیں گے اور عالم کا تمام شیرازہ منتشر ہو جائے گا ۔"

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جیسے انسان ایسے متضاد اجزاء یعنی عناصر اربعہ آب و خاک و آتش و ہوا سے مرکب ہے کہ باہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں ہر ایک کا مزاج دوسرے کے مخالف ہے ۔ ایسے ہی یہ سارا عالم بھی اشیاء مختلف المزاج اور مختلف التاثیر سے مرکب ہوا ہے ۔ انسان کے اجزاء اس قدر مختلف المزاج اور مختلف التاثیر نہیں جتنا کہ عالم کے اجزاء ۔

مختلف المزاج اور مختلف التاثیر ہیں ۔ اور جب ہر چیز کا مزاج اور اس کی تاثیر علیحدہ ہے تولامحالہ ایک دوسرے کا دشمن ذاتی اور مخالف اصلی ہوگا ۔ اور جب کبھی کسی جزو کا ذرا بھی غلبہ ہوگا تو مزاج عالم میں ضرور فساد آئے گا اور جو اعتدال اس سے قبل تھا وہ باقی نہ رہے گا ۔ اور یہ حالت عالم کے لیے بمنزلہ مرض کے ہوگی ۔ جیسے انسان میں جب کوئی مرض آتا ہے تو وہ کسی خاص جزو کے غلبہ ہی کی وجہ سے آتا ہے ۔ مثلاً جب آگ کا غلبہ ہوتا ہے تو بخار آتا ہے اور جب پانی کا غلبہ ہوتا ہے تو زکام اور فالج اور وجع المفاصل جیسے امراض ظاہر ہوتے ہیں اور جب خاک کا غلبہ ہوتا ہے تو یبوست (خشکی) کی وجہ سے خارش پیدا ہوتی ہے اور ہوا کی زیادتی سے ورم اور ریاحی درد پیدا ہوتے ہیں ۔

آدمی کا بدن فقط چار اجزاء سے مرکب ہے جب ان چار ہی کے غالب مغلوب ہونے سے ہزاروں امراض پیدا ہوتے ہیں تو عالم جو کہ بے شمار اجزاء سے مرکب ہے ان کے غالب ومغلوب ہونے سے تو لاکھوں امراض پیدا ہونے چاہئیں ۔

آسمان اس عالم کا سر ہے اور آگ سینہ ہے اور ہوا پیٹ ہے اور زمین اس کے پاؤں ہیں ۔ اور پانی بمنزلہ ہاتھ کے ہے اور شمس وقمر بمنزلہ آنکھ کے ہیں اور پہاڑ بمنزلہ ہڈیوں کے اور اشجار بمنزلہ بال اور روئیں کے ہیں ۔

غرض جیسے ایک انسانی جسم پر موت و فنا کا طاری ہونا نظام قدرت ہے اسی طرح حق تعالیٰ نے نظام کائنات میں یہ بھی مقدر فرمایا ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ یہ تمام عالم دنیا بھی انسانی جسم کی طرح امراض آفات ومصائب اور بلاؤں میں مبتلا ہوتے ہوتے زوال و فنا کا راستہ اختیار کرے گا اور اسرافیل علیہ السلام کا نفخ صور عالم دنیا کے اس طویل وعریض اور وسیع جسد عنصری کو درہم برہم کر ڈالے گا[1]۔

[1] تقریر دلپذیر بحوالہ علم الکلام حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ [illegible]

مسئلہ بعث اور معاد ابدان

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ نے کتاب الرّوح میں فرمایا۔ مسئلہ بعث اور معاد ابدان ایک ایسا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ اس پر تمام مذاہب و ادیان سماویہ پر ایمان رکھنے والوں کا اتفاق ہے خواہ وہ یہود ہوں یا نصاریٰ۔

جلال الدین الدوانی ؒ نے بھی مسئلہ بعث کے ثبوت پر دلائل ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس پر تمام اہل ملل (یعنی سماویہ) کا اجماع ہے اور قرآن کریم کی ایسی واضح اور صریح نصوص سے مثلاً آیت: قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ثابت ہے کہ کسی بھی فلسفی کو تاویل کی گنجائش نہیں۔[1]

امام بیہقی ؒ نے ابن عباس ؓ سے ایک روایت تخریج کی کہ عاص بن وائل (جو مشرکین میں سے ایک بہت بڑا سرغنہ تھا) ایک سوکھی ٹوٹی ہڈی ہاتھ میں لیے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس کو چورا چورا کرتے کہنے لگا اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا اللہ اس کو بھی زندہ کرے گا بعد اس کے کہ یہ ریزہ ریزہ ہو چکی۔ آپؐ نے فرمایا ہاں! اللہ رب العزت اس کو زندہ کرے گا۔ ... پھر یہ بھی کہ اللہ تجھ کو موت دے گا اور پھر تجھ کو زندہ کرے گا اور اس کے بعد تجھ کو جہنم میں داخل فرمائے گا۔ اس واقعہ پر قرآن کریم میں یہ آیت نازل ہوئی

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ	کیا نہیں دیکھا انسان نے اس بات کو بیشک ہم ہی نے اس کو نطفہ سے پیدا کیا۔ پھر ناگہاں! وہ کھلم کھلا خصومت کرنے والا ہو گیا ہے۔
(سورۃ یٰسٓ)	

[1] شرح عقیدۃ السفارینی ج ۲ صفحہ ۱۵۱۔

امام رازیؒ نے فرمایا حق یہ ہے کہ ایمان کے ساتھ حشر جسمانی کا انکار جمع ہونا ممکن ہی نہیں۔ ان ہی دلائل و نصوص کے پیش نظر جس کو قرآن کریم نے بیان کیا ہے اور علیٰ ہذا القیاس قدم عالم کا قول جس کے قائل فلاسفہ ہیں حشر جسمانی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔

بہرکیف اصول شریعت اور بیان کردہ دلائل سے یہ ظاہر ہے کہ اس بات پر ایمان لانا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز تمام بندوں کو مع ان کے ابدان اور اجزاء اصلیہ کے زندہ کرکے اُٹھائے گا اور ان کو محشر کی جانب لے جایا جائے گا تاکہ ان کے اعمال کی جزا و سزا کا فیصلہ ہو۔ اس طرح سے آخرت اور حشر جسمانی پر ایمان لانا کتاب اللہ سنت رسول اللہ اور اجماع امت و سلف سے ثابت ہے جس کے استحالہ پر کوئی عقلی دلیل قائم نہیں کی جا سکتی۔ اوّل تو اجزاء بدنیہ معدوم نہیں ہوتے بلکہ ان کا استحالہ اور تغیر ہو جاتا ہے۔ دوسری صورتوں میں جس طرح کہ لکڑی جلنے کے باوجود معدوم نہیں ہوتی بلکہ وہ راکھ اور کوئلہ کی شکل کی طرف مستحیل ہوتی ہے۔ لیکن بالفرض معدوم بھی قرار دے لیا جائے تب بھی کوئی عقلی دلیل محال ہونے پر قائم نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ جب دلائل ظاہرہ اور حجج قاہرہ سے یہ ثابت ہے کہ حق تعالیٰ ایجاد معدوم پر قادر ہے اور یہ ساری کائنات اس کا ثبوت ہے تو اعادہ معدوم پر وہ کیونکر قادر نہ ہوگا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو ان الفاظ میں تعبیر فرمایا گیا:

كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ (سورۃ الانبیاء) جس طرح ہم نے مخلوق کو اوّل مرتبہ ایجاد کیا اسی طرح ہم اس کا اعادہ بھی کریں گے۔

علامہ سفارینی رحمۃ اللہ علیہ بعث جسمانی کے مسئلہ پر بحث کے دوران عکرمہ رحمۃ اللہ سے نقل کرتے ہیں فرمایا جو لوگ سمندر میں غرق ہو جائیں اور ان کے گوشت پوست سمندر کی مچھلیاں کھا جائیں اور ان کی ہڈیوں کے سوا کوئی چیز باقی نہ رہے۔ پھر ان ہڈیوں کو سمندر کی موجیں ساحل پر ڈال دیں اور یہ اسی طرح کچھ عرصہ پڑی

رہیں یہاں تک کہ بوسیدہ ہوجائیں اور پھر اس جگہ پر اونٹوں کا گزر ہو وہ اس کو کھالیں اور مینگنی کردیں۔ پھر کچھ عرصہ بعد کوئی قافلہ اس جگہ آکر ٹھیرے اور ان مینگنیوں کو وہ قافلہ کھانا پکانے کے لیے جلالے تا آنکہ یہ آگ بجھ کر راکھ ہوجائے اور اس راکھ کو ہوائیں اُڑا کر دُور دراز میدانوں تک منتشر کردیں تو بھی نفخ صور ہوتے ہی یہ سب مُردے جن کی ہڈیوں کی راکھ اس طرح منتشر و پراگندہ ہوچکی ہے، اُٹھ کھڑے ہوں گے اور ان میں اور قبروں سے ان مُردوں کے اُٹھنے میں کوئی فرق نہ ہوگا جن کے ابدان قبور میں ابھی صحیح و سالم ہیں۔

شیخ مرعیؒ فرماتے ہیں خداوند عالم انسانوں کے ان تمام اجسام کو بھی دوبارہ زندہ کرکے اُٹھائے گا جن کے ٹکڑے درندوں کے پیٹوں، زمین کی تہوں اور سمندر کی موجوں اور بحری جانوروں کے موہنوں میں ہیں۔ ہر ایک ٹکڑے کو اللہ اپنی قدرت سے سمیٹ کر یکجا فرمادے گا اور ان کو زندہ کرکے اُٹھائے گا۔ [1]

یہی وہ حقیقت ہے جو ایک حدیث کے مضمون سے واضح اور ثابت ہوتی ہے:

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ	ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔
قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
وسلم قال رجل لم یعمل خیرا	ایک ایسے شخص نے جس نے کوئی خیر کا کام
قط لاھلہ وفی روایۃ رجل	نہیں کیا تھا، اپنے گھر والوں کو بطور وصیت
اسرف علی نفسہ. فلما حضرہ	یہ کہا ..... اور ایک روایت میں یہ ہے
الموت اوصی لبنیہ اذا مات	کہ ایسے شخص نے کہ اس نے اپنے اوپر
فحرقوہ ثم اذروا نصفہ فی	بہت ہی تعدی (زیادتی) کی تھی تو جب
البر ونصفہ فی البحر فواللہ	وہ مرنے لگا تو اس نے اپنے بیٹوں کو یہ
لئن قدر اللہ علیہ لیعذبنہ	وصیت کی کہ جب وہ مرجائے تو پہلے
عذابا لا یعذبہ احدا من	اس کو جلا دینا اور پھر اس کی راکھ نصف تو
العلمین فلما مات فعلوا	ہوا میں اُڑا دینا اور نصف سمندر میں

[1] شرح عقیدۃ السفارینی جلد دوم۔

ما امرهم فامر الله البحر فجمع ما فيه وامر البرّ فجمع ما فيه ثمّ قال له لم فعلت هذا - قال من خشيتك يارب و انت اعلم ـ فغفر له ـ

بہا دیا اور کہا کہ خدا کی قسم اگر خدا تعالیٰ مجھ پر قادر ہوگیا تو ایسا عذاب دے گا کہ جہان والوں میں کسی کو بھی ایسا عذاب نہ دے گا۔

الغرض جب وہ شخص مرگیا تو اس کے حکم کے مطابق گھر والوں نے معاملہ کیا لیکن اللہ ربّ العزّت نے خشکی کو حکم دیا کہ اس کی راکھ کے جو اجزا ہیں وہ جمع کرے چنانچہ اس نے جو کچھ اس میں تھا جمع کرلیا پھر سمندر کو حکم دیا کہ اس میں جو کچھ ہے وہ جمع کرے۔ اس نے بھی راکھ کے وہ تمام اجزا جمع کرلیے (جو سمندر میں بہہ رہے تھے) اس طرح اللہ ربّ العزّت نے اس کو زندہ کرکے اٹھایا اور فرمایا اے بندے! یہ تو نے کس لیے کیا۔ عرض کیا! اے پروردگار تیرے خوف سے تو حق تعالیٰ شانہٗ اس کی اس خشیت اور عذاب خداوندی کے خوف کے سبب پر مغفرت فرما دے گا۔

صحیح بخاری صحیح مسلم
(بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح)

معاد جسمانی اور حشر ابدان پر عقلی شواہد

علامۃ الدھر شیخ حسین آفندیؒ مسئلہ بعث و معاد اور حشر جسمانی پر محققانہ کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں، مسئلہ بعث اور آخرت مقتضائے عقل کے عین مطابق اور سراپا حکمت و مصلحت ہے کیونکہ آخرت کا خوف اور جزا و سزا کی فکر ہی انسانی زندگی اور عالم کو بُرے اعمال و افعال ظلم و تشدد خیانت مکر و فریب فواحش و منکرات سے بچانے والی چیز ہے۔ اگر انسانی اذہان اس فکر و خوف سے خالی ہو جائیں تو پھر نہ قتل و خونریزی میں کسی کو کوئی تامل ہوگا نہ اعمال و اخلاق اور معاشرت کے مفاسد و تباہیوں کی کسی کو پرواہ ہوگی حتیٰ کہ اگر کوئی بڑی سی بڑی طاقتور حکومت اور زائد سے زائد با وقار بادشاہ بھی ہو تو تب بھی مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے افراد صرف اسی حد تک اپنے جرائم سے رُک سکتے ہیں جہاں تک ان پر حکومت کے نگراں حکام قائم اور مسلّط ہیں۔ ایسے افراد جس کسی بھی مرحلہ پر گرفت اور نگرانی کی بندشیں ذرا بھی ڈھیلی دیکھیں گے، فوراً اسی ظلم و ستم قتل و غارتگری اور مجرمانہ روش کو اختیار کر لیں گے۔ رات کی تاریکیوں خلوتوں اور ایسے بیابانوں میں جہاں ان پر کسی انسان کی نگاہ نہ پڑ سکتی ہو، بے راہ روی سے باز رکھنے والی طاقت صرف خوفِ خداوندی اور یوم الحساب (آخرت) کا اندیشہ ہی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس محاسن اعمال اور بھلائیوں کا حصول بھی اسی پر موقوف ہے۔ لہٰذا معلوم ہُوا کہ نظام عالم کی تکمیل اور درستگی بعث و معاد پر ایمان اور دار آخرت کے شوق و خوف کے بغیر ممکن نہیں۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر مسئلہ معاد تسلیم نہ کیا جائے تو انسان بجائے اشرف المخلوقات

ہونے کے حیوانات سے بھی زائد حسیس اور کم درجہ ہو جائے گا کیونکہ حیوانات عقل و ادراک کی صلاحیتوں سے محروم ہیں۔ وہ ہر قسم کے فکر و غم سے آزاد ہیں۔ برخلاف انسان کے کہ وہ طرح طرح کے افکار اور پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے کبھی ماضی کے احوال پر نظر کر کے وہ غم اور ملال میں مبتلا ہے، تو کسی وقت مستقبل کے فکر اور اندیشہ سے اس کی جان گھلی جارہی ہے۔

رہا جسمانی لذتوں اور راحتوں کا سوال؟ سو اس میں حیوان و انسان کوئی امتیاز نہیں رکھتا جس طرح ایک انسان لذیذ غذاؤں اور قسم قسم کے پھلوں کو لذت و رغبت سے کھاتا ہے۔ حیوانات اسی لذت و رغبت سے گھاس اور چارہ چرتے ہیں، جیسے حضرت انسان اپنے عالیشان مکانوں میں آرام و راحت حاصل کرتا ہے۔ جانور چرند و پرند اپنے اپنے اصطبل، گھونسلوں، آشیانوں اور بلوں میں آرام حاصل کرتے ہیں، حتیٰ کہ نجاست کا کیڑہ نجاست کو اسی لذت سے کھاتا ہے جیسے نوع بشر میں لذیذ غذائیں استعمال کی جاتی ہوں تو اگر آخرت کے مسئلہ سے صرف نظر کر لی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ انسان بہت ہی خسارہ اور نقصان میں پڑنے والی مخلوق ہے کہ جسمانی لذتوں اور راحتوں میں تو یہ عام حیوانات ہی کے برابر رہا۔ اس کے بعد امتیاز و خصوصیت کا یہ طغرا ملا کہ طرح طرح کے افکار و آلام اور ہموم و غموم کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے، جس میں حاکم و محکوم امیر و غریب بوڑھا اور جوان، مرد و عورت غرض سب برابر کے شریک ہیں گویا اس کے عقلی و فکری کمالات نے بجائے کسی عظمت و برتری کے اور مصیبت و ذلت میں ڈال دیا تو انسان کے اس عقلی کمال اور ادراکی صلاحیتوں کے ساتھ اگر مسئلہ معاد ہی نہ ہو اور نہ اخروی سعادت کا حصول ہو تو وہ تمام عملی اور اخلاقی کمالات، زہد و تقویٰ، صبر و قناعت خدمت خلق ایثار و ہمدردی جیسی تمام خوبیوں سے محروم رہے گا۔ مسئلہ عقاب و ثواب کے بغیر انسانی زندگی کسی

طرح بھی حیوانی زندگی سے کوئی برتری اور امتیاز نہیں حاصل کر سکتی بلکہ ان محیّر العقل انسانی کمالات کے باوجود انسان اپنی زندگی کو اگر صرف اسی حدتک محدود کر دے جن حدود میں حیوانات محدود ہیں تو بلاشبہ یہ چیز اس کو زیادہ سے زیادہ خسیس و ذلیل بنا دینے والی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے منکرین آخرت کو انعام چوپاؤں کے درجہ میں بلکہ ان سے بھی زائد حقارت و پستی کے مقام میں شمار کیا چنانچہ ارشاد ہے:

اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا۔ کچھ نہیں ہیں یہ کافر مگر چوپاؤں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں راہ سے۔

کیونکہ چوپائے بہرحال اپنے پرورش کرنے والے مالک کو پہچان لیتے ہیں اور اس کے سامنے گردن جھکا دیتے ہیں۔ اس کو محسن سمجھتے ہیں۔ کسی نہ کسی درجہ میں نفع و ضرر کو جانتے ہیں۔ اگر ان کو کھلا چھوڑ دو تو چراگاہ کی طرف پہنچ جاتے ہیں، جہاں ان کو غذا اور پانی مل جاتا ہے۔ لیکن یہ منکرین آخرت اور کافر ایسے خالق کو پہچانتے ہیں نہ اپنے محسن کو سمجھتے ہیں اور نہ اپنے نفع و نقصان کی تمیز کرتے ہیں اور جس عقل و فہم سے یہ خدا کو پہچان کر بے شمار دینی اور دنیوی کمالات اور سعادتیں حاصل کرتے اس کو معطل رکھ کر اپنے واسطے ابدی ہلاکت اور تباہی کا سامان مہیا کیا۔ بھلا بتایا جائے کہ اس سے زیادہ اور کونسا بدعقلی کا مقام ہو سکتا ہے۔[1]

---

[1] مسئلہ معاد اور بعث بعد الموت کی تفاصیل کے لیے اہل علم کتب علم کلام کی مراجعت فرمائیں۔ شرح عقیدۃ السفارینی میں علامہ نے تفصیل سے کلام فرمایا ہے اور الرسالۃ الحمیدیۃ فی حقیقۃ الدیانۃ الاسلامیۃ علامہ حسین طرابلسی نے نہایت ہی حکیمانہ انداز سے تفصیل کی ہے۔ کتاب علم الکلام تالیف حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی اردو زبان میں مسائل کلامیہ کا ایک بلند پایہ مجموعہ ہے۔ حضرت مؤلف نے متقدمین اور سلف کے علوم نہایت سلیس انداز میں جمع فرمائے ہیں ان مسائل کے لیے کتاب علم الکلام کی مراجعت فرمائیں۔۱۲

اثبات قیامت اور حشر و نشر سے تمام قرآن کریم از اوّل تا آخر بھرا ہوا ہے۔ یہ مضامین مندرجہ ذیل ایک سو ایک سورتوں میں مذکور ہیں :

البقرۃ ۔ آل عمران ۔ المائدہ ۔ الانعام ۔ الاعراف ۔ یونس ۔ ھود ۔ ابراھیم ۔ الحجر ۔ النحل ۔ بنی اسرائیل ۔ الکھف ۔ مریم ۔ طٰہٰ ۔ الانبیاء ۔ الحج ۔ المؤمنون ۔ النور ۔ الفرقان ۔ النمل ۔ القصص ۔ الروم ۔ لقمان ۔ السجدہ ۔ الاحزاب ۔ السبا ۔ یٰس ۔ والصافات ۔ ص ۔ الزمر ۔ المؤمن ۔ حٰم السجدہ ۔ الشوریٰ ۔ الزخرف ۔ الدخان ۔ الجاثیہ ۔ الاحقاف ۔ ق ۔ الذاریات ۔ الطور ۔ النجم ۔ القمر ۔ الرحمٰن ۔ الواقعہ ۔ المجادلہ ۔ الممتحنہ ۔ التغابن ۔ التحریم ۔ الملک ۔ القلم ۔ الحاقہ ۔ المعارج ۔ المزمل ۔ المدثر ۔ القیٰمہ ۔ المرسلٰت ۔ النباء ۔ النزعٰت ۔ عبس ۔ التکویر ۔ الانفطار ۔ الانشقاق ۔ الطارق ۔ الغاشیہ ۔ الفجر ۔ التین ۔ العٰدیات ۔ القارعہ ۔

مضامین قیامت اور حشر و نشر پر مشتمل سورتوں کی تعداد ۔ ۶۸

مضامین قیامت اور حشر و نشر پر مشتمل آیات کی تعداد ۔ ۱۶۹

اور یہ تعداد ان آیات کی ہے جن میں یہ مضامین قصداً اہمیت و تفصیل اور دلائل کے ساتھ ذکر کیے گئے۔ ان کے علاوہ جن میں ان مضامین کا تبعاً و اشارۃً یا ضمناً ذکر آیا ۔ وہ آیات بھی سینکڑوں سے متجاوز ہیں۔

محاسبہ اور نامۂ اعمال

دُنیا دارالعمل ہے اور انسانی اعمال و افعال کے بدلہ کی جگہ آخرت ہے کہ انسان نے جو کچھ اپنی زندگی میں کیا ہے اس کا بدلہ آخرت میں اس کو مل جائے، جیسا کہ ارشادِ مبارک ہے فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ کہ جو ذرّہ برابر خیر کا کام کرے گا (آخرت میں) اس کو دیکھے گا اور جو ذرّہ برابر بُرائی کا کام کرے گا اس کو بھی قیامت میں دیکھ لے گا۔ اسی وجہ سے آخرت کا نام یوم الدین "یعنی بدلہ کا دن" ہے۔

انسان کو دُنیوی زندگی ہی میں بار بار اس بات پر متنبہ کیا گیا کہ اس کو آخرت کے محاسبہ اور اعمال کی جزاء و سزا سے غافل نہ ہونا چاہیے، کہ:

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًى۔ (سورۂ قیامہ) — کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اس کو... ایسے ہی بے حساب و کتاب چھوڑ دیا جائے گا

اس کے تمام اقوال و افعال اور احوال کراماً کاتبین لکھتے رہتے ہیں:

مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ۔ (سورۃ قٓ) — کسی بھی بات کا انسان تلفظ نہیں کرتا مگر یہ کہ اس کے قریب ایک مضبوط نگران موجود ہوتا ہے۔

اس لیے دار آخرت میں اس کی زندگی کی پوری روئیداد اس کے ہاتھ میں دے دی جائے گی اور فرمایا جائے گا:

اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا۔ (سورۃ اسراء) — اے انسان پڑھ لے تو اپنا نوشتۂ اعمال آج خود تیری ہی ذات تجھ پر محاسب ہونے کے لیے کافی ہے۔

نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر ایک کی زبان پر مہر ہوگی اور اس کے ہاتھ پاؤں گواہی دینے لگیں گے۔ ان ہاتھوں اور پاؤں کو ان ان کاموں میں استعمال کیا گیا ہے۔ جیسے کہ ارشاد ہے:

اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ وَتُکَلِّمُنَآ اَیْدِیْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ۔ (سورۃ یٰس)	اس دن مہر لگا دیں گے ہم ان کے مونہوں پہ اور بولیں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور گواہی دیں گے ان کے پاؤں (ان چیزوں کی) جو کچھ وہ کیا کرتے تھے۔

ایسے مجرمین بدحواس ہو کر اپنے اعضاء ہاتھ پاؤں پر ملامت کرنے لگیں گے۔ اور حیران ہوں گے کہ یہ کس طرح بول رہے ہیں۔

وَقَالُوا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَیْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ کُلَّ شَیْءٍ۔ (سورۃ حٰمٓ السجدہ)	اور کہیں گے اپنی کھالوں (اور اپنے اعضاء) سے تم ہمارے خلاف کیسے گواہی دیتے ہو (اور کیونکر بول رہے ہو) تو یہ اعضاء کہیں گے اللہ ہی نے ہم کو گویائی بخشی جس نے ہر ایک کو بولنے والا بنایا۔

مراد یہ کہ جس قادر مطلق نے سب چیزوں کو گویائی عطا فرمائی اسی ذات نے ہم کو بھی گویائی عطا کر دی ہے۔ چنانچہ تم جانتے ہو اس قادر مطلق نے تم کو عدم سے وجود عطا کیا۔ پھر تم کو سمیع و بصیر یعنی سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ اس کے علاوہ فہم و ادراک اور تکلم و بیان جیسی قوتیں بخشیں تو ایسا قادر مطلق پروردگار اور خالق کائنات علیم و قدیر جس نے اعضاء و جوارح میں گویائی کی قدرت پیدا کی اگر وہی قادر مطلق ان میں احساس و شعور اور حیات پیدا کر دے تو کیا تعجب ہے۔ ہر چیز خواہ وہ شجر و حجر میں سے ہو تسبیح پڑھنا نص قرآنی سے ثابت ہے جیسے کہ ارشاد ہے:

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ	کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے کہ جو اللہ کی

وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ[1] حمد و ثنا کے ساتھ پاکی نہ بیان کرتی ہو لیکن اے لوگو! تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔
(سورۃ اسراء)

خرق عادت اور معجزہ کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں سنگریزوں کا تسبیح پڑھنا ثابت ہے۔ اسی طرح شجر و حجر کا آپؐ کو سلام کرنا۔ اور بکری کے اس زہر آلود دست کا بولنا جس میں یہود نے زہر ملا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بھیجا تھا تاکہ آپؐ تناول فرمالیں۔ تو ایسے ہی انسانوں کی کھالیں اور ان کے اعضاء قیامت کے روز بولنے لگیں گے۔ ہم اپنی مادی صنعتوں میں ریکارڈ جیسی جامد اور بےحس و بے جان چیزوں میں آوازیں بھر لیتے ہیں اور پھر وہی آوازیں ان سے سنائی دیتی ہیں تو عالم کائنات کا خالق و مالک اس پر قادر نہیں کہ ہمارے اعمال و افعال اور حرکات و سکنات خود ہمارے بدن اور ہماری کھالوں میں پیوست کر دے اور پھر اس قادر مطلق کے حکم سے یہ ان کو بیان کرنے لگیں۔

الغرض ہر شخص کے سامنے اس کا نامۂ عمل موجود ہوگا جو کراماً کاتبین کا لکھا ہُوا ہوگا اور سر اعضاء و جوارح اسی کے مطابق گواہی دیتے ہوں گے۔ محاسبہ کی ابتداء انبیاء و مرسلین سے ہوگی۔ تمام اولین و آخرین میدان حشر میں بدحواس حیران و پریشان کھڑے ہوں گے کہ ناگہاں رب العالمین احکم الحاکمین نہایت عظمت و جلال کے ساتھ بندوں کے فیصلہ کے لیے نزول اجلال فرمائیں گے۔ ہر طرف فرشتوں کا پہرہ ہوگا جیسا کہ فرمان مبارک ہے: وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا۔ اور ارشاد ہے:

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا لَا يَتَكَلَّمُوْنَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ جس روز کہ کھڑے ہوں گے رُوح الامین یعنی جبرئیل امین اور تمام فرشتے صف بستہ کوئی

---

[1] جس طرح ایک قوم دوسری قوم کی زبان نہیں سمجھتی۔ یہی حال انسانوں کے سامنے حیوانات اور شجر و حجر کی تسبیح کا ہے۔

ان سے نہیں بات کرے گا مگر وہی جس کو (اللہ) رحمٰن اجازت دے۔

(سورۃ نباء)

مخلوقات میں سب سے پہلے انبیاء و مرسلین سے سوال ہوگا۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَا أُجِبْتُمْ۔ جس روز کہ اللہ تعالیٰ رسولوں کو جمع کرے گا اور پھر ان سے پوچھے گا کہ (بتاؤ) تم کو کیا جواب دیا گیا (جب کہ تم نے اپنی اپنی قوم کو اللہ کی طرف بلایا۔

(سورۃ مائدہ)

ہر امت پر اس کے پیغمبر کو گواہ کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ اور ان سب پر خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ ہونے کی حیثیت سے لایا جائے گا جس کا ان کلمات میں ذکر فرمایا گیا۔

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هٰؤُلَاءِ شَهِيدًا۔ پس کیا حال ہوگا اس وقت جب کہ ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور پھر ان سب گواہوں پر آپ کو لائیں گے ہم گواہ بنا کر۔

(سورۃ نساء)

اس مرحلہ کے بعد عامۃ الناس سے محاسبہ شروع ہوگا اور ہر شخص کو ملائکہ فلاں بن فلاں کہہ کر آواز دیتے ہوں گے اور نامۂ اعمال ان کے سامنے ہوں گے

میزان اعمال

وزن اعمال کے لیے ترازو قائم ہوگی جس میں حسنات و سیئات کا وزن کیا جائے گا۔ حتیٰ کہ بندوں کے اعمال حسی اور ظاہری کی ان کے باطنی اور قلبی احوال و کیفیات اور ان کے اخلاق و جذبات اور عقائد سب کچھ تولے جائیں گے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ اور قیامت کے روز ہم عدل و انصاف

الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ۔

ترازو میں قائم کریں گے۔ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہ ہوگا۔ اور اگر عمل رائی کے دانہ کے برابر بھی ہوگا تب بھی ہم اس کو حاضر کر دیں گے اور ہم ہی کافی ہیں محاسب ہونے کے لیے۔

قرآن کریم نے میزان اعمال کو واضح طور پر ذکر کرتے ہوئے وزن اعمال کے برحق ہونے کا اعلان کر دیا۔ فرمایا "وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ الْحَقُّ"

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میزان اعمال کے دو پلّے ہوں گے۔ ایک پلّہ نور کا ہوگا جس میں حسنات اور اعمال صالحہ رکھے جائیں گے اور دوسرا پلّہ ظلمت کا ہوگا جس میں سیئات اور اعمال بد کو رکھا جائے گا۔

اعمال و افعال اگرچہ اعراض ہیں لیکن جس طرح عالم دُنیا میں مادی آلات کے ذریعہ حرارت و برودت اور بلندی و پستی اور رطوبت و یبوست کا وزن اور درجہ معلوم کیا جاتا ہے۔ آخرت میں اعمال و افعال کا وزن ہوگا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ بندوں کے اعمال قیامت کے روز اجسام بنا دیئے جائیں گے۔

سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ میزان اعمال اس قدر وسیع ہوگی کہ اس میں آسمان و زمین بھی سما جائیں۔ اکثر علماء متکلمین کا تو یہی قول ہے کہ تمام اُمتوں اور لوگوں کے لیے نیز جملہ اقوال و افعال کے لیے ایک ہی ترازو ہوگی۔ لیکن حسن بصریؒ سے یہ منقول ہے کہ ہر شخص کی ترازو علیحدہ علیحدہ ہوگی بظاہر یہ بات "الموازین" صیغہ جمع کے پیش نظر فرمائی۔ لیکن ممکن ہے کہ صیغہ جمع ترازو کی عظمت اور جو چیزیں اس میں تولی جائیں گی ان کی انواع و اقسام کی کثرت کے لحاظ سے استعمال کیا گیا ہو۔

لہ فتح الباری جلد ۳۔

وزن اعمال کے بعد اہل ایمان اور مطیعین کے نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے اور مشرکین اور کفار کو نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں۔

علامہ سفارینی نے ایک روایت بیہقی سے تخریج کی کہ عرش الٰہی کے سامنے میزانِ عدل قائم ہوگی اور عرش کے دائیں جانب جنت ہوگی اور بائیں جانب جہنم۔ اصحاب الیمین یعنی جن کے نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں ہوں گے وہ جنت میں چلے جائیں گے اور اصحاب الشمال یعنی جن کے نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں ہوں گے وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ لے لیں گے۔

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے کلام فرمائیں گے بغیر کسی ترجمان کے واسطہ کے اور عندالحساب مشرکین و کفار سے تخاطب ملائکہ کریں گے حق تعالیٰ کے کلام و دیدار سے مشرکین و کافرین محروم رہیں جیسے کہ ارشاد ہے

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

دوسری آیت میں ہے وَلَا ینظر الیھم یوم القیمہ۔

متعدد احادیث و روایات سے ثابت ہے کہ حضرات انبیاء اور مسلمانوں کے معصوم بچے اور ان کے علاوہ مزید ستر ہزار اور[2] ان کے متبعین و لواحق بلا حساب و کتاب جنت میں جائیں گے۔ علماء متکلمین اور اہل سنۃ والجماعۃ سب اس پر متفق ہیں۔ قرآن کریم نے والوزن یومئذ الحق جس وزن اعمال کو اور "ونضع الموازین القسط لیوم القیامۃ" میں جس میزان کو بیان کیا ہے وہ حقیقۃً ہے۔ بلا کسی تاویل اور شک و تردد حقیقت پر محمول کیا ہے معتزلہ ان باتوں کی تاویل کرتے ہیں اور محض مجاز و تشبیہ اور استعارہ پر محمول کرتے ہوئے حسنات و سیئات کا مقابلہ کرنے کے معنی تجویز کرتے ہیں جو صریح آیات قرآنیہ اور نصوص احادیث کے خلاف ہے۔ امام بزار نے سند میں اور امام بیہقی نے

---

[1] شرح عقیدہ السفارینی۔ جلد ۲۔

[2] اس مضمون کی احادیث و روایات کی کتب حدیث سے مراجعت فرمائی جائے۔ ۱۲

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث روایت فرمائی ہے کہ قیامت کے روز ابن آدم حاضر کیا جائے گا۔ اور اس کو لا کر ترازو کے دونوں پلڑوں کے سامنے کھڑا کر دیا جائے گا۔ فرشتہ اس پر مقرر ہو گا۔ اگر اس شخص کی نیکیاں غالب اور بھاری ہوئیں تو وہ فرشتہ پکار کر کہے گا آگاہ ہو جاؤ فلاں بن فلاں نے سعادت کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اب وہ کبھی ناکام و شقی نہ ہو گا اور جس شخص کے اعمال صالحہ ہلکے ہوں گے اور وہ بدنصیب و محروم ہو گا تو اس کے نام کے ساتھ اعلان کر دے گا کہ فلاں بن فلاں ناکام و محروم ہُوا اب وہ کبھی کامیاب نہ ہو سکے گا۔

حسن بصری ابن عباس اور اسی طرح دوسرے حضرات صحابہ و تابعین سے بھی منقول ہے کہ وہ ترازو جو پلڑوں اور درمیان میں کانٹے والی ہو گی (جس سے ہر طرف کا جھکاؤ معلوم ہو گا)۔ علامہ سفارینی فرماتے ہیں اشاعرہ اور جمہور متکلمین اسی کے قائل ہیں اور وہ احادیث جو اس وضاحت پر مشتمل ہیں، حد تواتر تک پہنچتی ہیں[1]۔

جامع ترمذی میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ آپ روز قیامت میرے واسطے شفاعت فرمائیں۔ آپ نے فرمایا میں ایسا کروں گا انشاءاللہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ تو میں آپ کو کس جگہ تلاش کروں فرمایا سب سے پہلے تم مجھ کو تلاش کرو تو پل صراط پر تلاش کرنا۔ عرض کیا اگر میں وہاں ملاقات نہ کر سکوں تو پھر کہاں؟ فرمایا پھر میزان پر تلاش کرنا۔ عرض کیا اگر یہاں بھی نہ پا سکوں تو فرمایا پھر حوض (کوثر)، پر اور فرمایا کہ میں ان تین جگہوں میں سے کسی نہ کسی جگہ ضرور ملوں گا۔

علماء متکلمین اس بارہ میں مختلف ہیں کہ اس میزان میں وزن صرف اعمال کا

---

[1] شرح عقیدۃ السفارینی جلد دوم صفحہ ۱۸۲۔

ہوگا یا اصحاب اعمال (بندوں) کا ہوگا۔ یا وہ صحیفے جن میں اعمال لکھے ہیں، ان کا وزن ہوگا۔ بعض حضرات نے قول اوّل کو اختیار کیا۔ کسی نے دوسرے قول کو لیکن حق اور راجح یہی ہے کہ صحف اعمال کا وزن ہوگا۔ امام فخر الدین رازی نے اس کی تائید میں حدیث بطاقہ[1] نقل فرمائی اور فرمایا کہ اس سے معلوم ہوا کہ میزان اعمال میں نامہائے اعمال تولے جائیں گے۔

---

[1] حدیث بطاقہ کا مضمون یہ ہے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک نقل کرتے ہوئے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ میری امت میں سے ایک شخص کو چھانٹ کر تمام اوّلین و آخرین کے روبرو ظاہر فرماتے گا اور اس کے سامنے اس کے اعمال کے ننانوے دستاویزیں اور رجسٹر کھول کر رکھ دیئے جائیں گے جن میں سے ہر دستاویز یا رجسٹر منتہا نظر تک ہوگا پھر حق تعالیٰ فرمائے گا اے بندے! کیا تو اس میں سے کسی چیز کا انکار کرتا ہے، کیا تجھ پر اعمال لکھنے والے فرشتوں نے کوئی ظلم کیا ہے؟ وہ عرض کرے گا نہیں اے پروردگار۔ رب العالمین فرمائیں گے کیا تیرے پاس کوئی عذر ہے کہ اس کو پیش کر سکے۔ عرض کرے گا نہیں۔ یہ بھی فرمایا جائے گا کہ کیا کوئی نیکی ہے کہ پیش کرے۔ جواب دے گا نہیں۔ رب العالمین فرمائیں گے ہاں ہمارے پاس تیری ایک نیکی ہے اور آج تجھ پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد ایک پرزہ (کاغذ کا ٹکڑا) نکالا جائے گا جس میں (کلمہ) اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ لکھا ہوا ہوگا اور حکم ہوگا اپنے اعمال تولے جانے کی جگہ پر حاضر ہو جا (یعنی اس کو لے کر پہنچ اور اس کا وزن کرا) عرض کرے گا اے پروردگار اس کاغذ کے پرزہ کی کیا حقیقت ہے ان تمام رجسٹروں اور دستاویزوں کے انبار کے سامنے۔ فرمایا جائے گا جا وہاں حاضر ہو جا۔ تجھ پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ تو ایک پلّہ میں اس کاغذ کے پرزہ کو رکھا جائے گا تو یہ پرزہ ان سب رجسٹروں کے انبار پر وزنی ہو جائے گا اور وہ سب ہلکے ہو جائیں گے کیونکہ اللہ کے نام کے سامنے کوئی چیز بھاری نہیں ہو سکتی۔"

تو اس حدیث کا مضمون یہی ظاہر کرتا ہے کہ میزان اعمال میں نامہائے اعمال تولے جائیں گے۔ ۱۲

صراطِ جہنّم[1]

صراط یعنی پل صراط اصطلاح شریعت اس پل کا نام ہے جو جہنّم کے اُوپر اس کے دونوں کناروں پر قائم کیا گیا ہے جیسے دریا پہ کوئی پل ہو اس طرح کا یہ پل جہنّم کے اُوپر ہے اور اس کے نیچے نارِ جہنّم کی موجیں سمندر کے طوفانی تھپیڑوں کی طرح ہوں گی اور ہر ایک کو اس پر سے گذرنا ہوگا۔ جیسا کہ ارشاد مبارک ہے :

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا۔ (سُورۃ مریم)

اور تم میں سے کوئی بھی ایسا نہ ہوگا کہ جو اس پر وارد ہونے والا یعنی عبور کرنے والا نہ ہو۔ یہ آپ کے ربّ پر ایک فیصلہ کی ہوئی بات ہے (جو ہو کر رہے گی۔

احادیث سے ثابت ہے کہ یہ صراط تلوار کی دھار سے زائد تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے فرمایا جہنّم کا یہ پل یقیناً بال سے باریک اور تلوار سے زائد تیز ہے اس کے اطراف لوہے کے سلاخچے ہوں گے اور نہایت باریک کانٹے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک نقل کرتے ہوئے ابن مسعود رضی اللہ عنہٗ فرماتے ہیں اس پل پر سے گذرنے والے بعض بجلی کی طرح گذریں گے اور بعض ہوا کی طرح اور بعض تیز رفتار گھوڑوں کی طرح اور بعض دُوسری تیز رفتار سواریوں کی طرح اور بعض تیز رفتار پیادہ پا چلنے والوں کی طرح اور بعض وہ ہوں گے جو ان سلاخچوں اور کانٹوں میں

---

[1] صراط لغت کے اعتبار سے راستہ کو کہا جاتا ہے چونکہ یہ پل صراط بھی اہل حشر کے عبور اور گذرنے کا ایک راستہ ہوگا اس وجہ سے اس کو "صراط" کے عنوان سے تعبیر کیا گیا۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمایئے)

اُلجھتے اور زخمی ہوتے ہوئے گذریں گے کہ وہ کانٹے بدن میں پیوست ہوتے ہوئے ان کے گوشت ولوپست پر خراش زخم اور گھاؤ ڈال رہے ہوں گے اور کچھ ایسے ہوں گے جو کٹ کٹ کر نارِ جہنم میں گر رہے ہوں گے۔

عالمِ آخرت میں اس پل صراط پر گذرنا بالکل اس عملی زندگی کا نمونہ ہوگا، جو انسان نے حیاتِ دُنیا میں شریعت کے راستہ (یعنی صراطِ مستقیم) پر چلنے اور اس کی اتباع و پیروی کی اختیار کی ہے جس طرح بلا کسی تردد و تامل سبقت و پختگی کے ساتھ صراطِ مستقیم پر دُنیا میں گامزن رہا۔ اسی طرح یہاں اس پل صراط پر اس کا عبور ہوگا اور پل صراط کے کناروں پر یہ سلاخچے اور کانٹے نفسانی شہوتوں اور معصیتوں کے کانٹے ہیں جو شخص دُنیا میں جس قدر ان میں اُلجھا رہا اسی قدر آج اس پر سے عبور کے وقت ان میں اُلجھتا ہوا اور پھنستا ہوا گذرے گا۔ دراصل اس پل پر سے گذارنے اور چلانے والی قوت ایمان اور عمل صالح ہیں۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے ”اعمالکم تجری بکم“ یعنی اور تمہارے اعمال تم کو گذارتے ہوتے ہوں گے۔ اس وجہ سے جو شخص ایمان کامل

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) آیت مبارکہ ”فاھدوھم الی صراط الجحیم وقفوھم انھم مسئولون“۔ (لے جاؤ ان کو جہنم کے راستہ یعنی پل کی طرف اور ٹھہراؤ ان کو کیونکہ اس وقت ان سے سوال کیا جائے گا۔)

امام قرطبیؒ نے اپنے تذکرہ میں بعض اہل علم سے یہ نقل کیا ہے کہ کوئی شخص صراط سے عبور نہ کر سکے گا تاوقتیکہ اس سے سات منازل اور مرحلوں کا سوال نہ کر لیا جائے۔ پہلا مرحلہ ایمان باللہ پھر دوسرا مرحلہ صلوٰۃ کا ہے۔ تیسرا مرحلہ صوم رمضان اور چوتھا زکوٰۃ اور پانچواں حج بیت اللہ۔ چھٹا مرحلہ وضو اور غسل ہے اگر ان مراحل کی تکمیل اس نے اخلاص اور کمال ایمان سے کی ہوگی تو پھر ساتواں مرحلہ درپیش ہوگا جو سب سے زائد دشوار ہے وہ لوگوں کے حقوق کی بازپرس اور جانچ پڑتال ہے۔ ۱۲۔ شرح عقیدۃ السفارینی جلد دوم

قطعاً محروم ہوگا۔ وہ کٹ کٹ کر نارِ جہنم میں گرتا چلا جائے گا۔[1]

تمام اہل حق اور متکلمین محدثین و مفسرین سب اس پر متفق ہیں کہ یہ پل اسی طرح جہنم کے اُوپر قائم ہے اور تلوار کی دھار سے زائد تیز اور بال سے زائد باریک ہے۔ اس بارہ میں کسی نوع کی تاویل و مجاز کو نہیں اختیار کیا گیا لیکن فرقۂ معتزلہ جو کہ فلاسفہ کے فلسفیانہ اثرات سے متاثر ہے وہ اس کو ظاہر پہ محمول نہیں کرتا۔ قاضی عبدالجبار معتزلی اور اس کے متبعین کہتے ہیں کہ کسی ایسی چیز پر سے انسانوں کا عبور اور مرور ممکن نہیں ہے۔ بس اس صراط سے مراد تو اہل ایمان کے لیے جنت کا راستہ ہے اور کفار و مشرکین کے لیے جہنم کا۔ لیکن یہ زعم اور دعویٰ صریح احادیث اور روایات صحیحہ و مشہورہ کی تصریحات کے خلاف ہے اور اس غلطی کا منشأ فاسد احوال آخرت کو دُنیا کے احوال اور حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کو انسان کی ان قدرتوں پر محمول اور قیاس کرنا ہے جو مادی وسائل و ذرائع کی حد تک محدود ہیں جو پروردگار پرندوں کو ہوا میں اڑنے کی اور مچھلیوں کو سمندر کی سطح اور گہرائیوں میں تیرنے کی قوت عطا کر سکتا ہے وہ خداوند عالم کیا ایسے پل پر سے عبور کی قدرت نہیں دے سکتا۔ حالانکہ پل صراط سے گذرنا عقلی لحاظ سے پرندوں کی پرواز سے کچھ زائد عجیب نہیں۔

دن رات چاند سورج اور ستاروں کی افلاک پر گردش انسان کی نظروں کے سامنے ہے۔ یہ کس قدر وسیع کرے ہیں اور کتنی تیز رفتاری سے دوڑ رہے ہیں حالانکہ ان کے نیچے تو کوئی باریک سا خط بھی نہیں ہے۔ بہرحال یہ صراط اہل حق کے نزدیک اسی طرح ہے جیسا کہ احادیث صحیحہ سے اس کی کیفیت معلوم ہوئی۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث میں حد تواتر اور شہرت تک یہ روایات ہیں جن میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے۔ اَنَّہٗ جَسۡرٌ مَّحۡدُوۡدٌ

---

[1] حدیث کے اس مضمون کی تشریح اور اس کے اسرار و لطائف کے لیے حضرات قارئین کتب حدیث کی مراجعت فرمائیں۔

عَلٰی مَتْنِ جَھَنَّمْ[1]" کہ وہ جہنم کے اوپر ایک پل ہے الخ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض کلمات مبارکہ میں ایسے تردد کرنے والوں کے شبہ کا جواب دے دیا گیا جب یہ آیت نازل ہوئی یَوْمَ یُحْشَرُوْنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْھِھِمْ" کہ کافروں کو چہروں کے بل اٹھایا اور چلایا جائے گا تو کسی منکر نے اعتراض کیا کہ چہرہ کے بل چلنا کیونکر ممکن ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا، جو پروردگار اپنی قدرت سے انسانوں کو پاؤں پر چلاتا ہے وہی پروردگار چہرہ کے بل بھی چلانے پر قادر ہے۔

---

[1] انہ جسر ممدود علی جسر جھنم یہ کلمات تو صحیحین کے ہیں۔ باقی تفسیر کہ انہ ادق من الشعر واحد من السیف صحیحین کے علاوہ دیگر کتب احادیث معتبر اور صحیح سندوں کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔ ۱۲۔

جنّت و جہنّم

بہشت و دوزخ پر ایمان لانا ہی ایمان بالآخرت ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات عالم جنّت و جہنّم کے اثبات پر مشتمل ہیں۔ قرآن کریم نے یہ بتایا کہ جنّت ایک عالم روحانی ہے جو ہر قسم کی شادابی راحت و مسرّت اور نعمتوں و لذّتوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہاں کامرانی و عیش کے تمام اسباب مہیا ہوں گے۔ روحانیت و لطافت کی تمام دل آویزیاں موجود ہوں گی وہاں کے ساکنین کو کسی قسم کا رنج و غم اور پریشانی نہ ہوگی۔ ان کا جس چیز کو دل چاہے گا وہ چیز ان کو مل جائے گی۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ ۔

اے مومنو! تمہارے اس جنت میں وہ سب کچھ ہوگا جس کے لیے تمہارا دل چاہے اور تمہارے واسطے ہر وہ چیز ہوگی جو تم طلب کرو۔ یہ سب کچھ ایک ضیافت (اکرام) ہے۔ رب غفور رحیم کی طرف سے۔

(سورۃ حٰم السجدہ ۴)

اور یہ راحتیں اور نعمتیں دائمی و ابدی اور غیرفانی ہوں گی جس پر بر ہر موقعہ میں قرآن کریم خالدین فیھا ابداً کی وضاحت کرتا رہتا ہے۔

اور دوزخ ایک عالم ظلمانی کا نام ہے جو دہکتی ہوئی آگ سے بھری ہوئی وہاں کے مصائب و تکالیف اور اذیتیں اور رنج و الم کے تمام سامان بکمال و تمام وہاں موجود ہیں اور قسم قسم کے جسمانی و رُوحانی عذاب ہیں جن میں اہل جہنم ہمیشہ مبتلا رہیں گے جو نہ کبھی اس عذاب سے نجات پائیں گے،

اور نہ ہی اس میں کسی طرح کی کوئی خفت و کمی ہوگی، جیسے فرمایا گیا:

فَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ کہ عذاب نہ تو ان سے ہلکا کیا جائے گا

وَلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ۔ اور نہ ہی ان کی کوئی امداد و اعانت کی جا سکے گی۔

حتٰی کہ جہنم کا ایک جھونکا اور غوطہ دنیا کی تمام راحتوں کو بھلا دے گا۔ ایسا شخص جس نے ساری زندگی انتہائی عیش و راحت میں گذاری ہوگی جہنم کی ایک لپیٹ پاتے ہی ایسا محسوس کرے گا کہ زندگی کا ایک لمحہ بھی اس کو کوئی راحت نصیب نہیں ہوئی۔ (اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْھَا)

جنت و جہنم فی الحال موجود ہیں۔ قرآن و حدیث کی بے شمار نصوص اس پر دلالت کرتی ہیں۔ قرآن کریم اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنت و جہنم جس صفت و کیفیت کے ساتھ ثابت ہیں ان کو اسی طرح حق سمجھنا اور ان پر ایمان لانا ہدایت کا معیار ہے۔ ان میں تاویلات کا راستہ اختیار کرنا جیسے کہ بعض ملحدین نے کیا، گمراہی اور الحاد و کفر ہے۔ بلاشبہ ایسے محرفین و ملحدین اس ارشاد خداوندی کے کامل ترین مصداق ہیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا۔ بے شک جو ہماری آیات دلشانیوں میں ٹیڑھا راستہ اختیار کرتے ہیں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔

شریعت نے جن امور کو واضح احوال و کیفیات کے ساتھ متعین کر دیا ان میں استعارہ و مجاز کی تاویل اختیار کرنا درحقیقت ان امور کا انکار کرنا ہے اس لحاظ سے ایسی تاویلات و تحریفات عناد عن الحق کے باب میں صریح کفر سے بھی زائد شدید اور خطرناک اور خداوند عالم کے قہر و غضب کا موجب ہیں۔[1]

---

[1] اہل یورپ اور فرنگیوں کے لغو اور مہمل اعتراضات سے متاثر ہو کر ایک طبقہ ہندوستان میں ایسا گزرا ہے جن میں سید احمد خاں صاحب بھی ہیں کہ انہوں نے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

قرآن کریم نے عالم جنت و جہنم کی تفصیلات اور اہل ایمان اور کفار مشرکین کے جزاء وسزا کے حالات جن سورتوں میں بیان کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) وہ سورتیں جن میں اہل بہشت اور بہشت کی نعمتوں کا ذکر ہے:

البقرہ ۔ آل عمران ۔ النساء ۔ المائدہ ۔ الانعام ۔ الاعراف ۔ الانفال ۔ التوبہ ۔ یونس ۔ ھود ۔ الرعد ۔ ابراہیم ۔ الحجر ۔ النحل ۔ الکہف ۔ مریم ۔ طٰہٰ ۔ الانبیاء ۔ الحج ۔ المومنون ۔ النور ۔ الفرقان ۔ النمل ۔ القصص ۔ العنکبوت ۔ الروم ۔ لقمان ۔ السجدہ ۔ الاحزاب ۔ السباء ۔ فاطر ۔ یٰسٓ ۔ الصٰفٰت ۔ صٓ ۔ الزمر ۔ المومن ۔ حم السجدہ ۔ الشوریٰ ۔ الزخرف ۔ الدخان ۔ الجاثیہ ۔ الاحقاف ۔ محمد ۔ الفتح ۔ الحجرات ۔ قٓ ۔ الذاریات ۔ الطور ۔ القمر ۔ الرحمٰن ۔ الواقعہ ۔ الحدید ۔ المجادلہ ۔ التغابن ۔ الطلاق ۔ الملک ۔ القلم ۔ الحاقہ ۔ المدثر ۔ الدھر ۔ مرسلات ۔ النبأ ۔ النّٰزعٰت ۔ الانفطار ۔ المطففین ۔ الانشقاق ۔ البروج ۔ الاعلیٰ ۔ الفجر ۔ البلد ۔ الشمس ۔ اللیل ۔ التین ۔ البینہ ۔

ان آیات کی تعداد جو ان مضامین پر مشتمل ہیں ہے ۱۵۰۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) جنت و دوزخ کے ایک حقیقی عالم ہونے کا انکار کیا اور جنت و دوزخ کی حقیقت کو صرف قلبی و روحانی سکون اور اذیت کے معنی پر محمول کیا۔ آج بھی ان کے متبعین ایسی تاویلیں اختیار کر کے دین کے بنیادی ستون منہدم کرنے کا قصد کرتے ہیں۔ ایمان وہ ہے جو اس طرح اور ان تمام تفصیلات کے ساتھ لایا جائے جس طرح حضرات صحابہ کا ایمان تھا۔ اس سے سرموفرق کرنا کھلی گمراہی ہے۔ اس نوع کی تحریفات و تاویلات اور ان کے رد کے لیے مقدمہ تفسیر حقانی از صفحہ ۱۰ تا صفحہ ۱۵ مراجعت فرمائیں۔
حضرات قارئین کرام اس موضوع کی تفصیل و تحقیق کے لیے شرح عقیدہ السفارینی ۔ شفاء قرطبی اور علم الکلام میں ان مباحث کا ملاحظہ فرمائیں۔

مزید براں گیارہ مختلف مواقع پر متعدد آیات میں جنت کی خاص خاص نعمتوں اور وہاں کے رزق و فوائد اور راحتوں کا ذکر ہے۔

وہ سُورتیں جن میں اہل جہنم اور جہنم کے عذاب اور وہاں کی کرب و بے چینی کا ذکر ہے حسب ذیل ہیں:

البقرہ - آل عمران - النسآء - المائدہ - الانعام - الاعراف - الانفال - التوبہ - یونس - هود - الرعد - ابراهیم - الحجر - النحل - بنی اسرائیل - الکهف - مریم - طٰہٰ - الانبیاء - الحج - المومنون - النور - الفرقان - الشعراء - النمل - القصص - العنکبوت - الروم - لقمان - السجدہ - الاحزاب - السبا - فاطر - یٰس - الصّٰفّٰت - صٓ - الزمر - المؤمن - حٰم السجدہ - الشوریٰ - الزخرف - الدخان - الجاثیہ - الاحقاف - محمد - الفتح - قٓ - والذاریات - الطور - النجم - القمر - الواقعہ - الحدید - المجادلہ - الصف - التغابن - التحریم - الملک - القلم - الحاقہ - المعارج - الجن - المدثر - القیٰمہ - الدهر - والمرسلٰت - النباء - والنّٰزعٰت - الانفطار - التطفیف - البروج - الطارق - الاعلیٰ - الغاشیہ - الفجر - البلد - الشمس - اللیل - العلق - البینہ - الماعون -

وہ آیات جن میں کفار و مشرکین کے احوال اور ان کے دوزخی ہونے کا ذکر فرمایا گیا مذکورہ بالا ۱۰۷ سُورتوں میں ۲۲۷ آیات ہیں۔

ان آیات کے علاوہ جن مقامات پر خاص طور پر جہنم اور احوال جہنم کا ذکر فرمایا گیا وہ ۲۸ مواقع ہیں جو اوّل قرآن سے لے کر ختم تک متعدد آیات پر مشتمل ہیں۔

ابطال تناسخ

قرآن کریم کی تعلیمات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات نیز جملہ انبیاء کرام علیہم السلام کی ہدایات اس امر پر متفق ہیں کہ یہ دنیا دار العمل ہے، اور انسان کے مرنے کے بعد اس کی روح باقی رہتی ہے اور اس کو دنیا کے واقعات یاد رہتے ہیں اور عزیزوں دوستوں سے اس کا تعلق بھی قائم رہتا ہے۔ وہ مرکر نیست و نابود نہیں ہوتا بلکہ پھر اس کو عالم آخرت میں دوبارہ جسمانی حیات دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے عمل کی جزا و سزا پا سکے۔

فرقہ ہنود مرنے کے بعد روح کے بقاء کا تو قائل ہے لیکن اس کا عقیدہ ہے کہ یہ روح انسانی اس شخص کے مرنے کے بعد کسی دوسرے جسم عنصری میں جزا و سزا بھگتنے کے لیے اسی دنیا میں پھر آتی ہے جس کو تناسخ اور ہندی میں "آواگون" کہا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کا عقیدہ ہے کہ جملہ حیوانات خواہ وہ گدھے کتے ہوں بر سبب اگلے جنم کے لوگ ہیں جیسے جس کے اعمال تھے اس کی روح اس درجہ کے حیوان اور اس کے جسم عنصری میں آگئی ہے۔ بلکہ نباتات و اشجار کے بارہ میں بھی یہی اعتقاد ہے۔ اسی بناء پر وہ ذبح بہائم کو گناہ سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس اعتقاد کے ضمن میں آخرت اور جنت و جہنم اور وہاں کی نعمتوں راحتوں اور عذاب و شدت سب باتوں کا انکار ہوتا ہے۔ قرآن کریم ان مضامین میں گویا اس مسئلہ کا پوری طرح ابطال اور رد کر رہا ہے۔ ایسے باطل اور عقل و فطرت کے خلاف عقیدہ کی قرآن کریم نے بڑی شدت سے تردید کی فرمایا:

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ	کیا وہ اس بات کو نہیں دیکھتے کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کر دیا ہے کہ وہ

لَا یَرْجِعُوْنَ ۔ وَاِنْ کُلٌّ لَّمَّا جَمِیْعٌ لَّدَیْنَا مُحْضَرُوْنَ ۔ (سورۃ یٰسٓ)

پھر ان کی طرف نہیں لوٹتے ہیں وہ تو سب کے سب صرف ہمارے ہی پاس حاضر کیے جانے والے ہیں۔

یعنی مرنے کے بعد انسان پھر اس دُنیا میں کسی کے پاس واپس نہیں آتا ہے بلکہ ہر ایک کو اللہ ربّ العزت ہی کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے اور وہ قیامت کا دن ہے۔
اور فرما دیا گیا کہ انسانوں کے مرنے کے بعد تو بس عالم برزخ ہی ہے ، جو قیامت تک برقرار و قائم رہے گا ۔ چنانچہ ارشاد مبارک ہے :

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۔

کہ مرنے کے بعد تو بس ان کے سامنے قیامت تک ایک (برزخ) پردہ ہے یہاں تک کہ وہ (اللہ کے سامنے) اُٹھائے جائیں۔

انجیل لوقا میں بھی اس مسئلہ کو اس طرح بیان فرمایا گیا۔ حضرت مسیح بن مریم علیہ السلام کا قول نقل کیا کہ " ایک دولتمند تھا جو مہین اور لال کپڑے پہنتا تھا اور ہر روز شان و شوکت سے عیش کرتا تھا اور ایک دُوسرا شخص تھا جس کا نام لعزر تھا جس کے بدن میں ناسور تھے اور وہ اس دولتمند کی ڈیوڑھی پر پڑا ہُوا تھا جس کو آرزو تھی اس کی میز (دسترخوان) کے گرے ہُوئے ٹکڑوں سے اپنا پیٹ بھر لے ۔ کتّے آ کر اس کے زخموں کو چاٹا کرتے تھے اور ایسا ہُوا کہ غریب لعزر مر گیا ، اور فرشتوں نے لے جا کر اس کو ابراہیمؑ کی گود میں رکھا اور پھر وہ دولت مند بھی (جو عیاش و گمراہ تھا) مر گیا اور گاڑ دیا گیا تو اس نے دوزخ کے اندر سے بڑے عذاب میں دُور سے آنکھ اُٹھا کر ابراہیمؑ کو اور لعزر کو ان کی گود میں دیکھا تب اس نے پکار کر کہا " اے باپ ابراہیم مجھ پر رحم کر اور لعزر کو بھیج کر اپنی انگلی کا سرا پانی میں تر کر کے میری زبان ٹھنڈی کر دے کیونکہ میں اس لَو میں تڑپ رہا ہوں ۔ تب ابراہیمؑ نے فرمایا کہ تو اپنی زندگی کے مزے لے چکا ، اور لعزر تکلیفیں پا چکا ۔ سو وہ اب آرام پاتا ہے اور تو تڑپتا ہے اس کے

سوا ہمارے اور تمہارے درمیان ایک خندق حائل ہے جس کے سبب ادھر کے لوگ ادھر اور ادھر کے ادھر نہیں جا سکتے۔ تب اس نے کہا میں آپ کی منت کرتا ہوں کہ لعزر کو میرے گھر بھیجیے کیونکہ میرے پانچ بھائی اور ہیں۔ یہ ان کو جا کر مطلع کر دے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بھی اسی عذاب کی جگہ میں آئیں۔ ابراہیمؑ نے فرمایا ان کے پاس موسیٰؑ اور دوسرے نبی ہیں ان کو چاہیے کہ وہ ان کی سنیں اس نے کہا اے باپ ابراہیمؑ اگر مردوں میں سے کوئی ان کے پاس جائے گا تو وہ ضرور توبہ کریں گے۔ ابراہیمؑ نے جواب دیا جب وہ موسیٰؑ اور دیگر نبیوں کی نہیں سنتے تو اگر مردوں میں سے کوئی ان کے پاس جائے گا تو وہ کب مانیں گے۔"

غرض انجیل کی اس روایت سے چند باتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱۔ یہ کہ مرنے کے بعد ہی سے ہر شخص پر قیامت قائم ہونے سے پہلے ہی عالم برزخ میں سلسلۂ عذاب و ثواب کا شروع ہو جاتا ہے کیونکہ اس دولت مند کافر کے مرتے قیامت قائم نہیں ہوگئی تھی بلکہ دنیا میں اس کے پانچ بھائی اور موجود تھے۔ شریعت میں اسی کا نام عذاب قبر ہے۔ جس کو فلاسفہ اور بعض ملحدین تسلیم نہیں کرتے۔

۲۔ یہ کہ دوزخ اور بہشت موجود ہے۔ یہ نہیں کہ قیامت کے بعد ان کا وجود ہوگا

۳۔ اس عالم برزخ میں نعمت و تکالیف جسمانی ہیں۔ گو یہ دنیوی جسم عنصری نہ ہو نیز انجیل میں العزر کے بارہ میں انگور کا شیرہ پینے کا بھی ذکر ہے جس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دوزخ اور بہشت جسمانی کلفتوں تکالیف اور راحتوں کا نام ہے۔ جس پر ناواقف عیسائی اور ملحدین اعتراض کرتے ہیں۔ ان عیسائیوں کو چاہیے کہ انجیل کی ان باتوں کو مانیں اور ایمان لائیں۔

۴۔ مرنے کے بعد انسان کو اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے ہمدردی ہوتی ہے اور اس کو دنیوی احوال کا علم و احساس رہتا ہے جب ہی تو اس نے اپنے بھائیوں کی طرف لعزر کے جانے کی تمنا کی۔

۵ ۔ یہ کہ دُنیا سے چلے جانے اور مرنے کے بعد پھر کوئی دُنیا میں واپس نہیں لوٹتا ہے ۔

ہندوؤں کا یہ من گھڑت مسئلہ تناسخ کہ انسان کے مرنے کے بعد اس کی رُوح اپنے اعمال کے لحاظ سے اچھے اور بُرے جانوروں کے جسم عنصری میں جزا و سزا بھگتنے کے لیے پھر آتی ہے " نہ کسی دلیل و برہان عقلی سے ثابت ہے اور نہ کسی الہامی حجت سے بلکہ محض پنڈتوں کا یہ ایک لغو خیال اور مضحکہ خیز اعتقاد ہے ہنود جس کی تقلید و پیروی کرتے چلے آ رہے ہیں ۔ اس کے بطلان پر بکثرت دلائل موجود ہیں ۔

دلیل اوّل : عقل کا مقتضا یہ ہے کہ دار عمل اور دار جزا و الگ الگ ہونے چاہئیں تو اگر مرنے کے بعد جزا و سزا پانے کے لیے رُوح پھر اسی دُنیا میں واپس آئے تو اس صورت میں دار العمل کا دار الجزا ہونا لازم آئے گا ، جو عقل کے خلاف ہے ۔

دلیل دوم : جزا و سزا سے دو مقصد ہوتے ہیں ۔ مجرم کو تنبیہ اور دُوسروں کو عبرت ۔ تناسخ کا اعتقاد اور قول اختیار کرنے میں دونوں مقصد فوت ہو جاتے ہیں ۔ مجرم کو تنبیہ تو اس لیے حاصل نہیں کہ جب اس کو یہی معلوم نہ ہوگا کہ یہ کس عمل اور جرم کی سزا اور پاداش ہے تو پھر تنبیہ کیسے حاصل ہوگی ۔ مُجرم کا علم تو درکنار اس کو تو سابق جنم کے وجود کا تصور بھی نہیں اور جب خود مجرم اور صاحب عمل کو اپنے عمل کی سزا کا احساس نہیں تو دوسروں کو ان بُرے اعمال پر اس سزا کے ذریعے عبرت کیسے حاصل ہوگی ۔ بھلا سوچنے کی بات ہے کہ ایک حمار (گدھے) اور کلب (کتے) کو کیسے یہ علم حاصل ہو سکتا ہے کہ میں فلاں عمل بد کی وجہ سے اس قالب حیوانی میں منتقل کیا گیا ہوں ۔

دلیل سوم : تناسخ کا اعتقاد رکھنے سے حق تعالیٰ کی قدرت ازلیہ اور مشیت و ارادہ کا تعطل و انکار لازم آتا ہے اس لیے کہ حیوانات کا یہ اختلاف

حق تعالیٰ شانہٗ کی قدرت کا ایک عجیب کرشمہ ہے اور یہ سب کچھ اس کے ارادہ کے تابع ہے۔ تو اگر یہ تمام تر اختلاف اور حیوانات کی یہ قسمیں جرائم ومعاصی اور انسانی اعمال و افعال کے درجات پر مبنی ہو تو پھر اس میں حق تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کا کیا دخل رہا۔ حالانکہ دُنیا کا ہر ذی شعور انسان اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ کائنات کی یہ تمام اشیاء اور ایک ایک ذرہ اس کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کا کرشمہ ہے۔ مگر ایک سماجی مذہب رکھنے والے کے نزدیک یہ سب کچھ جرائم ومعاصی کی وجہ سے نہ اس میں خدا کی قدرت کو دخل ہے، اور نہ اس کے ارادہ اور علم وحکمت۔ یہ گدھے کتے پچھلے جنم کے چور زانی اور بدکار ہیں اور گائے بیل ان کے برگزیدہ نیکوکار اوتار ہیں بلکہ درحقیقت اس عقیدہ کے ضمن میں تو خداوند عالم کے منعم ومحسن ہونے کا بھی انکار لازم آئے گا کیونکہ یہ دُنیا میں جس قدر چوپائے ہیں حتیٰ کہ گدھے اور گھوڑے بلکہ کیڑے مکوڑے بھی حق تعالیٰ کا انعام ہے۔ تو اگر یہ بہائم اور جانور پہلے جنم کے گنہگار اور بدکار لوگ ہیں تو ان چیزوں کا وجود گویا گناہوں اور معاصی کا مرہون منت ہُوا کہ ان کی بدولت سواریوں اور باربرداریوں کے یہ جانور ملے۔

دلیل چہارم: نیز یہ اعتقاد انسان کو رُوحانی سعادت سے محروم کرنے والا ہے کیونکہ انسانی سعادت کے لیے جزو اعظم معرفت (گوگیان) سو یہ معرفت جو انسان نے ایک جنم میں حاصل کی تھی انسان دُوسرے جنم میں آکر اس کو بھلا دیتا ہے اس لیے کہ جب اس کو پہلا جنم یاد ہی نہیں تو اس جنم کے حاصل کردہ علوم اور معرفت کیسے یاد رہ سکتے ہیں۔ اب گویا اس انسان کو اس پہلے جنم کے علوم ومعرفت اور ریاضتوں کا ثمرہ عیش وعشرت اور سلطنت ودولت کی صورت میں ملا۔ جس نے اس شخص کو شہوتوں اور لذات حسیہ میں مبتلا کر کے حیوانوں سے بھی بدتر کر دیا تو اس سے اب لازم آئے گا کہ یہ عیش وعشرت کا جنم تو اس کے پہلے اعمال صالحہ کی جنت تھی۔ اب اس کے بعد کے جنم میں اس

عیش و عشرت جو سابق اعمال کی جنت ہے کے بدلے میں جہنم ملے گی تو یہ قضیہ معکوس بھی ہوا اور عجیب و غریب بھی کہ ایک جنم کے علوم و معارف زہد و تقویٰ اور ذکر و فکر و ریاضت کا ثمرہ تو عیش و عشرت کی صورت میں ملا۔ پھر اس عیش و عشرت اور شہوت پرستی کا نتیجہ جہنم کی صورت میں ظاہر ہوگا اور مصائب و آلام کی شکل میں رونما ہوگا اور یہ تصور کسی بھی صاحب عقل و فہم انسان کے نزدیک قابل قبول نہیں ہوسکتا اور اس کی نامعقولیت میں کسی ذی عقل کو کوئی تردد نہ ہوئے

ابطال تناسخ کے مزید دلائل کے لیے حضرات قارئین کتب علم کلام کی مراجعت فرمائیں۔

لہ ملخص من الرسالۃ الحمیدیہ للعلامۃ حسین جسر الطرابلسی۔
۔ البیان فی علوم القرآن۔ علم الکلام۔ و مقدمہ تفسیر حقانی

قسم دوم علوم قرآن متعلّقہ بہ قوّت عملیہ

امام بیہقی رحمۃ اللہ نے حسن سے روایت تخریج کی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مضمون نقل کیا کہ اللہ رب العزت نے ایک سو چار کتابیں آسمان سے نازل کیں جن کے تمام علوم تورات وانجیل اور زبور میں جمع کر دیئے گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں کے تمام علوم کو فرقان (قرآن کریم) میں ودلیعت فرما دیا یعنی جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تمام انبیاء سابقین کے کمالات نبوت کے لیے جامع ہے اسی طرح آپ پر نازل کی ہوئی کتاب بھی تمام آسمانی کتابوں اور صحیفوں میں نازل کیے ہوئے علوم الٰہیہ کا مجموعہ ہے۔

اسی بناء پر قرآن کریم جہاں ایک طرف انسانی فلاح وسعادت کے ایک پہلو یعنی قوت نظریہ واعتقادیہ کی اصلاح کا ضامن ہے اور اس کے تحت وہ تمام شعبے ہیں جن کو علوم نظریہ کی تفصیل میں بیان کیا گیا۔ اسی کے ساتھ قرآن کریم فلاح وسعادت کے دوسرے پہلو یعنی قوت عملیہ کی اصلاح کا بھی ضامن وکفیل ہے۔ یہ علوم قرآن کی قسم دوم ہے۔ اور یہ قسم بھی قوت نظریہ واعتقادیہ سے تعلق رکھنے والے علوم کی طرح بہت سے شعبوں پر منقسم ہے۔ بنیادی اور اصولی طور پر قوت عملیہ سے تعلق رکھنے والے علوم کی تین قسمیں ہیں:

اگر شخص واحد کی انفرادی اصلاح اور فلاح وسعادت کا علم ہے تو اس کو علم تہذیب النفس کہا جاتا ہے۔ اور اگر ان عملی باتوں کا علم ہے جو چند افراد کے باہمی معاملات سے متعلق ہیں تو اس کا نام "علم تدبیر المنزل" ہے اور اگر ان چیزوں کا علم ہے جو کسی قوم کی اجتماعی زندگی اور انتظام مملکت سے تعلق رکھتے ہیں تو اس کو علم سیاست مدن (سیاست مدنیہ) کہتے ہیں۔ تو انسان کی

قوتِ عملیہ کی اصلاح و تکمیل ان علوم ثلثہ پر مشتمل اور موقوف ہوئی - علم تہذیب النفس - علم تدبیر المنزل - علم سیاست مدن - اور ہر نوع کے ماتحت بہت سے شعبے ہیں جن کی قرآن کریم نے ہدایت فرمائی ہے۔

علم تہذیب النّفس اور متعلّقہ شعبے

علم تہذیب النّفس ان علوم و معارف اور ہدایات کا نام جس کے ذریعے ہر فرد انفرادی طور پر اپنی زندگی کے تمام پہلو ہر عیب و گندگی سے پاک کر کے ہر قسم کی خوبی اور کمال سے اپنے آپ کو آراستہ بنائے - حتیٰ کہ اس کا بدن لباس کھانا پینا نشست و برخاست بول چال اور اس کے جملہ عادات و اطوار ہر عیب اور گندگی سے پاک و صاف ہو کر محاسن اور خوبیوں کا پیکر بن جائے - لفظ تہذیب باعتبار وضع عربیہ اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے - اہل عرب ہَذَّبَ الشجرۃ کہتے ہیں جب کہ درخت کی شاخوں کو کانٹ چھانٹ کر کے نہایت سلیقہ کے ساتھ مرتب کر دیا جائے۔

علم تہذیب کے انواع و اقسام پر نظر کرنے سے یہ امر مستفاد ہوتا ہے، کہ اصولی اور بنیادی طور پر یہ تمام اقسام دو پہلوؤں پر مشتمل ہیں - ایک پہلو وہ ہے جس کا تعلق معائب و گندگیوں اور جرائم و معاصی سے اجتناب اور پرہیز ہے تو یہ درجہ صفائی کا ہوا جس کو علم التخلیہ کے عنوان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور اسی کو علم التزکیہ بھی کہتے ہیں - دوسرا پہلو کمالات اور خوبیوں سے اتصاف کا ہے جس کو علم التحلیہ کہتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ تہذیب نفس کا مقصد ان دونوں پہلوؤں کے بغیر ممکن نہیں اس لیے کہ انسان کی عملی زندگی کی تکمیل بھی عیوب سے پاکی اور کمالات سے متصف و مزین ہونے ہی سے ہو گی - یعنی اولاً ظاہر و باطن اور روح کو ہر نوع کی نجاست و آلائشوں سے پاک کرے اور پھر اس پر عبادات اور محاسن و کمالات کا رنگ و روغن چڑھائے تو اس طرح تہذیب النفس دو

قسموں پر منقسم ہوا :

۱۔ علم التخلیہ جس کو علم التزکیہ بھی کہا جائے گا ۔

۲۔ علم التحلیہ، قرآن کریم نے ان دونوں قسموں کو متعدد مواقع پر بیان کیا ہے اور تفصیل کے ساتھ ان کے اصول پر بحث کی ہے اور منافع و مضار کو روشن کیا ہے ۔

علم التزکیہ

اور یہ بات امر طبعی ہے کہ مقدم درجہ طہارت اور صفائی یعنی تزکیہ کا ہے اس کے بعد درجہ زینت کا ہے ۔ اسی بناء پر قرآن کریم نے احکام شریعت میں طہارت کا حکم تمام احکام عملیہ میں مقدم رکھا چنانچہ بہ سلسلۂ احکام یہ آیت سب سے پہلے نازل فرمائی گئی :

یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ وَ ثِیَابَكَ فَطَهِّرْ وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ (سورۃ مدثر)	اے چادر میں لپٹنے والے (پیغمبر) کھڑے ہوجایئے پھر (اپنے رب کے عذاب وقہر سے) لوگوں کو ڈرایئے اور اپنے رب کی کبریائی بیان کیجیے اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھیے اور گندگی کو چھوڑے رکھیے ۔

غرض علم التزکیہ طہارت کے انواع و اقسام کا مجموعہ ہے ۔

طہارت کا مفہوم از رُوئے لغت پاکی اور صفائی ہے اور شریعت کی اصطلاح میں بدن کپڑے اور مکان نیز مآکل و مشارب یعنی کھانے پینے کی چیزوں کا حدث اور خبث اور نجاست و حرمت سے پاک ہونے کا نام ہے ۔

---

[1] سلسلۂ وحی کا آغاز آیات "اقراء باسم ربک الذی خلق" سے ہوا اس کے بعد تقریباً پونے تین سال تک وحی رکی رہی ۔ فترت وحی کے اس دور کے بعد جو آیت سب سے پہلے نازل ہوئی ۔ وہ یہی سورہ مدثر کی آیات ہیں ۔ ۱۲

آیاتِ قرآنیہ نے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح کردی کہ طہارت کا تعلق انسان کے ظاہر و باطن دونوں سے ہے۔ اور دونوں طہارتوں کا مجموعہ درحقیقت وہ طہارت و پاکی ہے جو اللہ کو محبوب و پسندیدہ ہے جیسے کہ ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَہِّرِیْنَ۔ (سُورۃ بقرہ)

بے شک اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے توبہ کرنے والوں کو اور لپسند کرتا ہے ان لوگوں کو جو پاکی اختیار کرنے والے ہیں۔

تو اس آیت مبارکہ میں توبہ کے عنوان سے قلب اور باطنی پاکی کو حسی و ظاہری پاکی کے ساتھ جمع کرکے یہ ظاہر کر دیا گیا کہ شریعت کی نظر میں طہارت اسی چیز کا نام ہے کہ ظاہر اور بدن کی طہارت قلب کی پاکی کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ احادیث میں اس امر کی تعلیم دی گئی کہ وضو کرنے والا وضو سے فارغ ہو کر یہ پڑھے:

اَشْہَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُـہٗ، اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَہِّرِیْنَ

گویا وضو کے ذریعے اس نے جب اپنے ظاہر کو پاک کر لیا تو اس کو چاہیے کہ اس کے ساتھ قلب و باطن کو بھی کفر و شرک کی گندگیوں سے پاک کرنے اور پاک رکھنے کے لیے کلمۂ شہادت کا اعادہ کرے اور دُعا کرے کہ خدا تعالیٰ اس کو تائبین اور متطہرین یعنی ظاہر و باطن کی پاکی حاصل کرنے والوں میں سے بنائے۔ اسی طہارت کو جمع کرنے والے متطہرین اور پاکبازوں کی قرآن کریم نے تعریف و توصیف کی:

فِیْہِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَہَّرُوْا وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّہِّرِیْنَ (سُورۃ توبہ)

اس میں (یعنی مسجد قباء میں) ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں پاکی حاصل کرنے کو اور اللہ محبوب رکھتا ہے (ان) پاکبازوں کو۔

قرآن کریم نے واضح طور پر فرمایا کہ طہارت صرف ظاہر تک محدود نہیں بلکہ طہارت کا تعلق باطن اور قلب سے بھی ہے چنانچہ ارشاد فرمایا:

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُرِدِ اللّٰہُ اَنۡ یُّطَہِّرَ قُلُوۡبَہُمۡ ۔ (سورۃ مائدہ) — یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے ارادہ نہیں کیا ہے اس کا کہ ان کے قلوب پاک فرمائے۔

دوسرے موقعہ پر فرمایا:

اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَیُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا ۔ (سورۃ احزاب) — اللہ کا تو بس یہی ارادہ ہے اے خاندان نبوت و اہل بیت پیغمبر تم سے ہر نوع کی گندگی دور کر دے اور پاک کر دے تم کو ہر طرح سے پاک کر دینا۔

یعنی ظاہر و باطن کی گندگی دور کرکے تم کو ہر طرح کی پاکی سے نوازے اور شریعت کی نظر میں باطن کی طہارت ظاہر کی طہارت سے زائد اہم ہے۔ یہی وہ تزکیہ ہے جس کے واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث فرمائے گئے جس کے بارہ میں حق تعالیٰ نے فرمایا:

ھُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیۡہِمۡ وَیُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ ۔ (سورۃ آل عمران) — وہ ذات پروردگار عالم ہے جس نے امیوں میں (یعنی اہل عرب میں) اپنا ایک رسول بھیجا جو ان پر آیات کی تلاوت کرتا ہے اور ان کو (ہر عیب و گندگی سے) پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اسی کا نام طہارت کبریٰ ہے۔ یہی وہ طہارت ہے جو اہل ایمان کو نصیب ہوتی ہے اور اسی طہارت و پاکی کے ساتھ ان کو جنت میں داخل ہونے کی بشارت دی جاتی ہے:

اَلَّذِیۡنَ تَتَوَفّٰہُمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ — وہ لوگ (یعنی اہل ایمان) فرشتے جن کے

طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ	روح قبض کرتے ہوں گے درانحالیکہ وہ پاک اور طیب ہوں گے۔ فرشتے ان کو کہتے ہوں گے سلام علیکم (خدا کی سلامتی ہو تم پر) جنت میں داخل ہو جاؤ تم ان اعمال کی بدولت جو تم کیا کرتے تھے۔

جنت میں چونکہ کوئی ایسا شخص نہیں جا سکتا جو خبث وگندگی میں مبتلا ہو جیسے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے "جنت میں سوائے پاکبازوں کے اور کوئی نہیں داخل ہوتا۔"

اس لیے جو شخص اللہ رب العزت سے پاک وصاف ہونے کی حالت میں ملاقات کرے گا تو وہ بلا کسی رکاوٹ کے جنت میں داخل ہو جائے گا۔ اور جس نے دنیا میں طہارت وپاکی حاصل نہیں کی اب اگر اس کی نجاست عینیہ ہے (کہ ذات ہی اس کی ناپاک ہے) جیسے کافر ومشرک تو وہ تو کبھی بھی جنت میں داخل نہ ہو سکے گا۔ اور اگر نجاست عارضی اور کسبی ہے یعنی معاصی اور گناہوں کی گندگی جیسے مؤمن عاصی تو وہ اس وقت جنت میں داخل کیا جائے گا جب کہ اس نجاست وگندگی سے اس کو پاک کر دیا جائے گا۔

غرض جنت میں داخل ہونے والا ایسی ہی حالت میں داخل ہوگا کہ وہ ہر طرح سے پاک اور طیب ہی ہو۔ یہی مراد ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان مبارک کی جس میں فرمایا گیا ہرگز جنت میں ایسا شخص نہیں جائے گا جس کے قلب میں ذرہ برابر بھی کبر وغرور کا اثر ہے۔ معنی یہ کہ اس کبر وغرور کی گندگی سے پاک کر دینے کے بعد جنت کا داخلہ ہوگا۔

حق تعالیٰ شانہ کا فرمان قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا"[1]

---

[1] یعنی کامیاب ہوا وہ شخص جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا اور اس کو پاک وصاف کر لیا۔ اور ناکام وذلیل ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو گندگیوں میں آلودہ کیا۔ (والشمس)

اسی حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے۔

طہارت کے اقسام

شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ طہارت کی تین قسمیں ہیں :
طہارت حدث ہے ۔ طہارت سرائی نجاست سے جو مکان یا کپڑے اور بدن پر ہو اور طہارت (پاکی ان تمام گندگیوں سے جو انسان کے بدن سے پیدا ہونے والی ہوں ۔ طہارت من الاحداث ۔ وضو اور غسل ہے جس کا شریعت نے مامور فرمایا اور اس کے اصول و قواعد کی تفصیل و تحقیق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے کر دی گئی ۔ علیٰ ہذا القیاس بدن جگہ اور کپڑے کی پاکی کے احکام بھی تفصیل سے بیان فرمائے گئے ۔ اور بدن سے پیدا ہونے والی گندگیوں کے ازالہ کو امور فطرت میں سے قرار دیا گیا ۔ چنانچہ عشر من الفطرۃ (کہ دس باتیں فطرت کے امور میں سے ہیں) حدیث میں ناخن کاٹنے زیر ناف اور بغل کے بالوں کی صفائی ناک اور منہ کی رطوبت و گندگی دور کرنے کے احکام بیان فرمائے گئے[1]

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ باطن کی طہارت اور قلبی عقائد کی پاکی سب سے اہم تر چیز ہے ۔ اسی کی طرف حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الطھور شطر الایمان (کہ طہارت نصف ایمان ہے) اشارہ کر رہی ہے ۔ اصولی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ طہارت کے چار مرتبے ہیں ۔ ایک بدن کی نجاست اور احداث سے پاکی دوسرے اعضاء کی جرائم و معاصی سے پاکی ۔ تیسرے قلب اور باطن کی گندے اخلاق و ناپاک عقائد سے پاکی ۔ اور چوتھے قلب کا ماسویٰ اللہ سے پاک کر لینا کہ دل میں اللہ کے سوا کوئی چیز ہی باقی نہ رہے ۔ طہارت کا یہ درجہ وہ ہے جو انبیاء و صدیقین کو حاصل ہوتا ہے[2]

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ۔ [2] احیاء علوم الدین ج ۱

غرض قرآن کریم کی تعلیمات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ طہارت و پاکی کا وصف انسان کی زندگی کے لیے ایک ایسا بنیادی وصف ہے کہ وہ زندگی کے ہر ایک شعبہ کو حاوی ہے۔

لباس و بدن اور مکان کی طہارت و پاکی کے ساتھ ضروری ہے کہ اس کا کھانا پینا بھی پاک ہو۔ حرام اور شبہات حرام کی نجاست سے ہر مرحلہ پر محفوظ رہے زبان جھوٹ سے پاک ہو۔ نگاہ اور کان بھی عفت و پاکی کا پیکر ہو۔ قلب بیہودہ افکار و خیالات کی گندگیوں سے آلودہ نہ ہو بلکہ اخلاص و تقویٰ کا معدن ہو۔ قوت غضبیہ و شہویہ میں مبتلا ہو کر انسان اپنے آپ کو درندوں اور حیوانوں کی صف میں نہ ملائے بلکہ عفت و پاکدامنی کے اوصاف سے انسانی پیکر میں ایک فرشتہ نظر آتا ہو۔ اخلاق و عادات کو کبر و غرور، اور اعمال خبیثہ کی نجاست سے پاک رکھے۔ قرآن کریم نے ان تمام شعبوں کے اصول طہارت اور قوانین بِرّ و تقویٰ بیان فرمائے جن کی تفصیل و توضیح شارح وحی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔ چنانچہ حضرات محدثین نے کتب حدیث میں ایک ایک باب اور مستقل عنوان قائم کرکے طہارت کے ان تمام شعبوں اور اصول و قواعد کو پیش کر دیا۔ صحیح بخاری صحیح مسلم سنن نسائی ابوداؤد اور جامع ترمذی کی کتاب الطہارت کی فہرست مضامین پر ایک نظر ڈالنے سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ شارح وحی پیغمبر علیہ الصلوٰۃ نے کس تفصیل و تحقیق سے احکام مقرر فرمائے۔

بدن لباس اور مکان کی پاکی کا حکم

فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا	اس مسجد (قبا) میں ایسے لوگ ہیں جو
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۔	پسند کرتے ہیں طہارت و پاکی کو۔ اور
(سُوْرَةُ توبہ)	اللہ محبوب رکھتا ہے ایسے پاکبازوں کو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اہل قباء کے پاس تشریف لے گئے تو دریافت فرمایا کہ تم لوگ کس قسم کی طہارت و پاکی حاصل کرتے ہو کہ اللہ رب العزت نے اس پر تمہاری تعریف فرمائی ہے۔ ان حضرات نے جواب دیا یا رسول اللہ ہمیں اور تو کوئی بات معلوم نہیں بجز اس کے کہ ہم ڈھیلوں سے استنجا کرنے کرنے کے بعد پانی بھی استعمال کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا بس یہی سبب ہے تم لوگ اس طہارت کو اختیار کیے رکھو[1]۔ اور آیت مبارکہ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ میں صراحت کے ساتھ کپڑوں کی پاکی کا حکم دیا گیا۔

حدث اصغر اور جنابت سے پاکی

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ ۔ وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا ۔ وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ مِنْهُ ۔ (سورۃ مائدہ ۶)

(ترجمہ) اے ایمان والو! جب تم نماز کے واسطے کھڑے ہو تو اپنے چہروں کو دھو لیا کرو اور ہاتھوں کو کہنیوں تک اور مسح کر لیا کرو سروں کا اور پاؤں دھوؤ ٹخنوں تک اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو پوری طرح پاکی حاصل کرو۔ یعنی غسل کرو اور اگر تم بیمار ہو یا سفر پر ہو یا تم میں سے کوئی شخص آئے پیشاب پاخانہ سے فارغ ہو کر یا عورت کو چھوا ہو پھر (ان تمام صورتوں میں) تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی کا قصد کرو (تیمم کرتے ہوئے) تو اس سے مسح کر لیا کرو اپنے چہرہ کا اور ہاتھوں کا۔

نماز چونکہ دربار خداوندی کی حاضری ہے اور عبادات میں افضل ترین عبادت ہے۔ اس وجہ سے حکم دیا گیا کہ ایمان و تقوی اور قلب کی طہارت حاصل

[1] جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، طبرانی۔ بحوالہ تفسیر ابن کثیر۔

کرنے والوں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دربار الٰہی کی حاضری کے وقت طہارت جسمانی بھی بصورت وضو حاصل کر لیا کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قولاً وفعلاً اس کی توضیح فرما دی اور درسگاہ نبوت سے فیض حاصل کرنے والے طلبہ (یعنی حضرات صحابہؓ) نے اس کی ایک ایک کیفیت کو نقل کیا اور محدثین نے ایسی تمام احادیث کتاب الوضوء کے تحت جمع فرما دی ہیں۔

دربار خداوندی میں حاضری کے وقت ان اعضاء کے دھونے کا حکم اس وجہ سے دیا گیا کہ بندہ حق تعالیٰ شانہ کے سامنے کھڑے ہونے سے پہلے اپنے جسم کے ان نمایاں اور ممتاز حصوں کو حسی اور ظاہری طور پر پاک اور صاف کرنے کے ساتھ ساتھ وضو کے معنوی آثار و برکات کے ذریعے گناہوں کی گندگی سے بھی طہارت و پاکیزگی حاصل کرے جیسا کہ حدیث صحیح مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جب بھی کوئی مسلمان بندہ وضو کرتا ہے اور اپنا چہرہ دھوتا ہے تو اس کے چہرہ سے ہر وہ خطا ساقط ہو جاتی ہے جس کا اس نے نگاہ سے دیکھ کر ارتکاب کیا ہے۔ پانی کے قطروں کے ساتھ اور جب وہ اپنے ہاتھوں کو دھوتا ہے تو وہ تمام خطائیں ساقط ہو جاتی ہیں جن کا اس نے اپنے ہاتھوں سے ارتکاب کیا ہے۔ اور جب پاؤں دھوتا ہے تو وہ تمام خطائیں ساقط ہو جاتی ہیں جن کا اس نے اپنے پاؤں سے چل کر ارتکاب کیا ہے یہاں تک کہ وہ وضو سے فارغ ہوتا ہے اس حال میں کہ وہ اپنے گناہوں سے پاک اور صاف ہو چکا ہوتا ہے۔"

چونکہ انسان کی عملی زندگی کا تعلق بالعموم انہی اعضاء و جوارح سے ہے اسی بنا پر وضو میں ان اعضا کا دھونا مخصوص کیا گیا۔ دیگر روایات وضو میں کلی اور ناک میں پانی دینے کی تاثیر اور مسح راس کے ذریعے ان خطاؤں کا ازالہ اور سقوط بیان فرما دیا گیا جو ان سے متعلق ہیں۔

وضو حدث اصغر سے پاکی کا نام ہے اس وجہ سے یہ طہارت صغریٰ ہے اور جسم کے صرف ان اعضاء ہی کے دھونے تک اس کو محدود رکھا گیا۔ جنابت حدث اکبر ہے جس سے انسان کا تمام بدن متاثر ہوتا ہے کیونکہ یہ چیز حرارت غریزیہ کے ہیجان کا نتیجہ ہے۔ اس وجہ سے شریعت نے جنابت پر غسل مقرر فرمایا جو طہارت کبریٰ ہے اور ارشاد فرمایا گیا : وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا یعنی اگر تم جنب ہو تو پوری پوری پاکی حاصل کرو کیونکہ جنابت کا اثر تمام بدن پر واقع ہوتا ہے تو قرآن کریم نے فَاطَّهَّرُوْا مبالغہ کا صیغہ استعمال کیا تاکہ اس گندگی کے مطابق ازالہ بھی ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے نزدیک غسل میں مضمضہ اور استنشاق (یعنی کلی کرنا اور ناک میں پانی دینا) فرض ہے تاکہ اس حد تک بھی سرایت کرنے والے اثرات بھی زائل ہو جائیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ خبردار جنب آدمی اور حائضہ عورت ہرگز قرآن کریم کی تلاوت نہ کرے اور یہ کہ "جنابت انسان کے ایک ایک بال کے نیچے ہے" اسی کا مؤید ہے[1]۔

زبان کی طہارت

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۔ (حج)

پس اے لوگو! تم بچو بتوں (یعنی شرک و کفر) کی گندگی سے اور پرہیز کرو جھوٹی بات کہنے سے

سمع و بصر یعنی کانوں اور نگاہوں کی طہارت

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (سورۂ بنی اسرائیل)

بے شک انسان کے کان اس کی نگاہ اور دل الغرض اس کی ہر چیز پر مواخذہ و بازپرس ہے۔

اور ارشاد فرمایا :

[1] طہارت کے اسرار و حکم کے لیے امام غزالیؒ کی کتاب "احیاء علوم الدین" اور شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ کی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" کی مراجعت فرمائی جائے۔ ۱۲

قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۔ (سُورۃ النور)

کہہ دیجیے اے پیغمبر مومنین سے کہ وہ اپنی نگاہیں محفوظ (اور نیچی) رکھیں اور محفوظ رکھیں اپنی شرمگاہوں کو ۔ یہی چیز ان کے واسطے زائد پاکی کا ذریعہ ہے ۔

اور آیت مبارکہ :

وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۔ (سُورۃ حجرات)

اور نہ کسی کے عیب کا سراغ لگاؤ ۔ اور نہ تم میں سے کوئی ایک کسی دُوسرے کی غیبت کرے

میں کانوں اور زبان کے تجسس وعیب جوئی اور غیبت کی گندگی سے پاکی کا حکم بیان فرما دیا ۔

قلب و دماغ کی لغو اور بیہودہ خیالات و اوہام سے پاکی

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۔ (سُورۃ والشمس)

یقیناً کامیاب ہوا وہ شخص جس نے اپنے نفس (قلب) کا تزکیہ کیا ۔ اور ناکام ہوا وہ جس نے اس نفس کو گندگیوں میں آلودہ کیا

قلوب میں مرض و بیماری کا ذکر فرما کر اس سے حفاظت کی تاکید فرمائی گئی ۔ قلب کا ان امراض و بیماریوں سے محفوظ رہنا قلب سلیم ہے جس کے لیے فرمایا گیا " اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (سُورۃ حجرات)

اے ایمان والو بہت سے گمانوں (یعنی بدگمانیوں) سے پرہیز کیا کرو کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتا ہے (کہ بلا وجہ کسی کی طرف سے بدگمانی انسان کو گناہگار کرتی ہے ۔

اخلاق کی طہارت

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ

اے ایمان والو! (تم کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ)

قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔

(سورۃ حجرات)

اے ایمان والو! (تم کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ) ہرگز نہ ہنسے کوئی قوم دوسری قوم پر (تذلیل و تحقیر کرتے ہوئے) بہت ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ ہی عورتیں دوسری بعض عورتوں پر شاید وہ ان ہنسی و مذاق اڑانے والی عورتوں سے بہتر ہوں اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے لقب سے پکارو کیونکہ بُرے لقب سے کسی کو ایمان کے بعد پکارنا بہت ہی بُرا اور معصیت کا کام ہے۔ اور جو لوگ ایسی حرکتوں سے باز نہیں آئیں گے وہ بہت ہی ظالم ہیں۔

شہواتِ نفس سے پاکی

لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ۔

اور فواحش (بے حیائیوں) کے قریب بھی نہ جاؤ ان میں سے جو ظاہر ہیں اور جو ان میں سے چھپی ہوئی ہوں۔

وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ : آیت میں شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور عورتوں کی تعریف کی گئی ہے اور اسی طرح متعدد جگہ آیات قرآنیہ میں عفت و پاکدامنی کی تعلیم دی گئی ہے[1]

[1] بدکاری اور شہوت پرستی ایک ایسی نجاست و گندگی ہے کہ اس سے انسان کی تمام تر اعتقادی اور عملی زندگی مسموم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور عالم میں ہر قسم کا فساد و نزاع اور قتل و خونریزی کا بھی یہی مذموم وصف اصل سرچشمہ ہے اسی بنا پر قرآن کریم نے اس لعنت و گندگی کو (باقی حاشیہ اگلے صفحہ)

قوّتِ غضبیہ سے پاکی

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ۔

اور جو لوگ غصہ پینے والے ہیں اور درگذر کرنے والے ہیں لوگوں سے (وہ قابلِ تعریف و ستائش ہیں اور احسان کرنے والے ہیں) اور اللہ تعالیٰ محسنین کو پسند فرماتا ہے۔

(سورۃ آلِ عمران)

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ۔

مدافعت کر ایسے طریقے سے کہ جو بہت زائد بہتر ہو۔ ایسی صورت میں تو یقیناً وہ شخص کہ جس کے اور تیرے درمیان عداوت ہے گویا وہ نہایت ہی مخلص اور ہمدرد دوست ہو جائے گا۔

(سورۃ حٰم السجدۃ)

قوّتِ غضبیہ سے مغلوب و مشتعل انسان قتل و خونریزی پر آمادہ ہو جاتا ہے اسی لیے قرآن کریم نے ایسے مغلوب الغضب انسانوں کو اس بُرائی سے پاک رہنے کی تعلیم دی اور اس مذموم خصلت پر تنبیہ کے ساتھ خداوندِ عالم جبّار و قہار کے غضب کی

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) انسانی معاشرہ کو پاک رکھنے کی تاکید و تنبیہ فرمائی۔ کیونکہ ہر گناہ انسان کے قلب پر ظلمت و بہیمیت کے آثار پیدا کرتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ارشادِ مبارک ہے کہ جب بھی کوئی بندہ گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک سیاہ نقطہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر توبہ و استغفار کر لیا تو مٹ جاتا ہے ورنہ وہ بتدریج تمام قلب کا اس طرح احاطہ کر لیتا ہے کہ پورا دل زنگ آلود ہو جاتا ہے جس کو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔

اور یہی ظلمت و بہیمیت حق تعالیٰ تک پہنچنے میں حجابِ اکبر ہے۔ حضراتِ انبیاء کا سب سے پہلا اور اہم کام یہی رہا کہ انسان کو اس آفت سے بچائیں۔ ۱۲

وعید اور دھمکی بھی سنائی فرمایا :

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ۔ (سُورۃ نسآء)

اور جو شخص قتل کر ڈالے کسی مومن کو جان بوجھ کر اس کی جزا (بدلہ) جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور غضبناک ہوگا اس پر خدا وند عالم اور لعنت فرمائے گا اس پر اور تیار کر رکھا ہے اس کے واسطے بڑا عذاب ۔

اللہ پر ایمان رکھنے والے بندوں کی خاص صفت اور نشانی بھی بیان کی گئی کہ :

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ، یعنی جب ان کو کسی بات پر غصہ آجاتا ہے تو وہ درگذر اور معاف کر دیتے ہیں گویا علم و بردباری ان کا شعار رہے ۔

کبر و نخوت اور غرور سے پاکی

قرآن کریم میں انسانی اخلاق کی طہارت و پاکی کا موضوع بھی نہایت اہتمام کے ساتھ جگہ جگہ ایسے انداز بیان اور دلائل و حقائق کی روشنی میں کیا گیا، کہ ادنیٰ درجہ کا بھی انسانی جوہر رکھنے والا آدمی اس کے سامنے گرویدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ چنانچہ فرمایا :

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۔ (سُورۃ الفرقان)

اور پروردگار رحمٰن کے بندے وہ ہیں، جو زمین پر بڑی ہی نرمی اور تواضع کے ساتھ چلتے ہیں اور جب ان سے جاہل لوگ (بے تمیزی) سے خطاب کرتے ہیں تو وہ اس کے جواب میں سلامتی کی بات کہتے ہیں ۔

اور فرمایا :

وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ

اور اے مخاطب تو زمین پر اکڑتا ہوا (یعنی اتراتا ہوا) نہ چل کیونکہ تو (اپنی اس رفتار

تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۔ كُلُّ ذَالِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا

زمین کو پھاڑ نہ سکے گا اور نہ تو (اپنی گردن اونچی کرنے سے) پہاڑوں کے برابر لمبائی اور بلندی میں پہنچ سکے گا۔ غرض ان چیزوں میں ہر ایک بری چیز اے انسان تیرے رب کے نزدیک مکروہ و ناپسندیدہ ہے۔

(سورۃ بنی اسرائیل)

حضرت لقمان علیہ السلام کی وصایا کے ذیل میں قرآن کریم نے بیان کیا :

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ

اور (اے عزیز بیٹے) اور لوگوں سے اپنا گال نہ پھلا (کبر و نخوت سے مغلوب ہوتے ہوئے) اور زمین پر اکڑتا ہوا مت چل، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے شیخی خورے کو پسند نہیں کرتا اور تو اپنی رفتار میں درمیانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز ذرا پست رکھ کیونکہ سب سے زیادہ منکر اور قابل نفرت آوازوں میں گدھے کی آواز ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و کمالات نبوت میں خاص طور پر آپ کے اخلاقی کمالات آپ کے حلم و بردباری اور نرمی مزاج کا بیان فرمایا گیا اور یہ کہ آپ کی حیات مبارکہ بداخلاقی اور کبر کے ادنیٰ اثر سے بھی پاک ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے :

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۔

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) یہ اللہ ہی کی مہربانی ہے کہ آپ ان مسلمانوں پر نرم دل ہیں۔ اگر کہیں آپ اکھڑ یعنی سخت دل اور بد مزاج ہوتے تو یہ سب لوگ آپ کے آس پاس سے بھاگ جاتے

(سورة آل عمران) (اور کوئی آپ کے قریب بھی نہ آتا)

ماکل و مشارب یعنی کھانے پینے میں طہارت کی تعلیم

انسان کی زندگی میں قوتِ بہیمیہ کا غلبہ اس کو حرام اور ناپاک کھانے اور پینے پر بھی آمادہ کرتا ہے تو قرآن کریم نے اس امر کی بھی ہدایت فرمائی، انسان کو چاہیے کہ حرام اور ناپاک کھانے اور پینے سے پرہیز کرے۔

جس طرح مردار جانور ناپاک ہیں۔ حسّی اور ظاہری ناپاکی کی وجہ سے اس سے زائد وہ چیزیں ناپاک اور گندہ ہیں جن کی حرمت قرآن کریم اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی۔ چنانچہ فرمایا:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ ۔

حرام کردیا گیا تم پر مردار اور خون۔ اور سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی کا نام پکارا گیا ہو۔ اور وہ جو گلا گھٹنے سے مرا ہوا ہو اور وہ جو لاٹھی اور پتھر کے مارنے سے مرجائے اور وہ جو اوپر سے گر کر مرجائے۔ اور وہ جو کسی جانور کے سینگ مارنے سے مرجائے اور وہ جانور جس کو درندوں نے پھاڑ کھایا ہو مگر یہ کہ تم اس کو ذبح کرسکو (یعنی صورت کہ اس کو زندہ پالو) اور وہ جانور جو بتوں پر ذبح کیا جائے اور حرام ہے فال کے تیروں سے (بطورِ قمار) تقسیم کرنا۔ یہ سب کچھ فسق و نافرمانی ہے۔

(سورة مائدہ)

اس کے بالمقابل جگہ جگہ یہ حکم دیا گیا کہ،

وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۔

اور کھاؤ تم اس رزق میں سے جو اللہ نے تم کو عطا کیا اس طور سے کہ وہ حلال اور طیب ہو اور ڈرو اس اللہ سے جس پر تم ایمان لائے ہو (اس کے احکام کی نافرمانی کرنے میں)

(سورۃ بقرہ)

کسب معاش میں تجارت کو حلال کیا گیا اور تمام سودی منافع کو حرام و ناپاک قرار دے دیا ۔ فرمایا :

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔

اور حلال کیا ہے اللہ نے بیع (تجارت) کو اور حرام کیا سود کو پس جس کسی شخص کے پاس اس کے رب کی طرف سے پیغام نصیحت آیا، اور وہ اس سے باز آگیا تو اس کے واسطے وہ حلال ہے جو پہلے گذر گیا اور اس کا معاملہ اللہ کی طرف ہے اور جو شخص پھر دوبارہ لوٹے (سود کی جانب) تو بے شک ایسے لوگ جہنم والے ہیں جو ہمیشہ جہنم میں رہیں گے ۔

(سورۃ البقرہ)

ظلم و تعدی کی تمام راہیں مسدود کر دی گئیں۔ فرمایا :

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۔

بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ظلماً کھاتے ہیں وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں ۔ اور عنقریب دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے

وصیت و میراث کے احکام مقرر کر کے ہر ایک حقوق کا تحفظ کر دیا گیا اور ہر قانون کے ذکر کے ساتھ خلاف ورزی پر وعید اور دھمکی بھی بیان فرما دی گئی تاکہ انسانی زندگی کسی بھی پہلو سے اکل حرام میں مبتلا نہ ہو اور آیت مبارکہ

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ۔ اے لوگو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ۔

اکل مال الناس بالباطل کی صریح ممانعت کی گئی بلکہ یہ بھی بتا دیا گیا کہ یہود کی اسی بیہودہ خصلت پر خداوند عالم کی طرف سے ان پہ قہر و غضب نازل کیا گیا۔

لباس و مکان میں طہارت کی تعلیم

انسان کی شہوانی قوتوں کا حدّ اعتدال سے تجاوز جیسے اکل حرام کا مرتکب کرتا ہے اسی طرح لباس و مکان میں بھی اسے حلال و جائز کی حدود سے آگے بڑھا کر ظلم و تعدی اور سرکشی کے مقام پہ پہنچا دیتا ہے۔ اس وجہ سے قرآن کریم نے زینت و راحت اور آسائش میں صرف حلال و طیب ہی پر قناعت کی تعلیم دی۔ اور فرمایا:

يَا بَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ[1] (سورۃ اعراف)

اے اولاد آدم ہم نے تم پر لباس اتارا، (عطا کیا) ایسا کہ جو تمہاری شرمگاہوں کو چھپائے اور زینت کا لباس بھی پیدا کیا، لیکن تقویٰ کا لباس ہی بہترین لباس ہے۔

الغرض طہارت و پاکی کے یہ تمام انواع و اقسام علم تہذیب النفس کے شعبے ہیں۔ ان تمام شعبوں کا حاصل نجاست و گندگی جرائم و معاصی اور جملہ معائب خواہ وہ عملی ہوں یا اخلاقی و اعتقادی سے پاکی ہے اس وجہ سے ان کا مجموعہ علم التخلیہ کہلاتا ہے اور انسان کی عملی زندگی کا یہ کمال یعنی طہارت و پاکی اس کے مجموعی کمالات کا نصف حصہ ہے[2] کیونکہ حقیقی کمال اور کامل درجہ کی فضیلت صرف عیب اور گندگیوں سے پاکی ہی تک محدود نہیں بلکہ اس درجہ کے بعد زینت اور کمالات و خوبیوں سے متصف ہونے کا مقام باقی رہتا ہے اس لیے علم تہذیب النفس کا دوسرا شعبہ علم التحلیہ کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

---

[1] وَلِبَاسُ التَّقْوٰى کی تفسیر میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں کتب تفسیر کی مراجعت کی جائے۔ [2] یہی وجہ ہے کہ حدیث میں طہارت کو نصف ایمان فرمایا گیا۔ ۱۲

علم تہذیب النفس کی دوسری شاخ علم التحلیہ اور اس کے اقسام

علم التحلیہ ان ہدایات اور علوم فاضلہ کا مجموعہ ہے جن سے انسانی زندگی ہر نوع کے کمال سے آراستہ اور اعمال و اخلاق حسنہ کی زینت سے مزین ہو، رشد و فلاح اور دین و دنیا کی سعادت کے یہ اصول قرآن کریم نے متعدد مواقع پر بیان فرمائے اور ان ہدایات و اصول کی اتباع کو قرآن کریم نے حیات طیبہ کا ذریعہ قرار دیا چنانچہ ارشاد ہے :

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ	کہ جو شخص بھی عمل صالح کرے خواہ مرد ہو
اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ	یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم ان کو
حَيٰوةً طَيِّبَةً ۔ (سورۃ النحل)	حیات طیبہ[1] یعنی پاکیزہ زندگی عطا کریں گے

رشد و فلاح اور سعادت دارین کے یہ بنیادی اصول سورہ مومنوں کی ان آیات میں ذکر فرمائے گئے :

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ	بے شک کامیاب ہوئے اور مراد کو پہنچے ،
هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ	ایمان والے جن کی شان یہ ہے کہ وہ اپنی
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ	نمازوں میں خشوع و نیاز مندی کرنے
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ	والے ہیں اور وہ جو بے ہودہ باتوں
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ	سے اعراض کرتے ہیں اور وہ جو زکوٰۃ کے

---

[1] حیات طیبہ یعنی پاک اور صاف ستھری اور مزیدار زندگی یہ ہے کہ دنیا میں حلال روزی کے ساتھ قناعت و غنا قلبی حاصل ہو۔ سکون اور طمانیت میسر ہو - ذکر اللہ کی لذت حب الٰہی کا مزہ ادائے فرائض اور عبادت الٰہی میں خوشی تعلق مع اللہ کے ذکر کی حلاوت اور کامیاب مستقبل کا تصور ہے ۱۲

إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ
أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ
فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْعَادُونَ وَالَّذِينَ هُمْ
لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ
وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ
أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ الَّذِينَ
يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا
خَالِدُونَ .
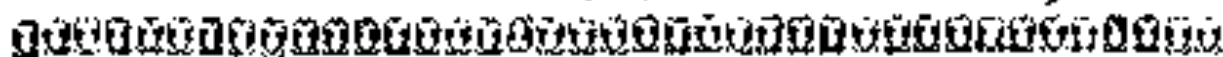
ادا کرنے والے ہیں اور وہ جو اپنی شرمگاہوں
کی حفاظت کرنے والے ہیں مگر اپنی بیویوں
یا ان لونڈیوں پر جن کے وہ مالک ہیں ۔
کیونکہ ان کے معاملہ میں ان پر کوئی الزام و
گرفت نہیں لیکن جو شخص اس سے آگے تجاوز
کرے تو یقیناً ایسے لوگ تعدی کرنے والے
ہیں ۔ اور وہ جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان
کی رعایت رکھتے ہیں اور وہ جو اپنی نمازوں
کی پابندی اور محافظت کرتے ہیں ، تو
بس یہی ہیں وارث جو جنت الفردوس
کی وراثت پانے والے ہوں گے اور وہ
ان میں ہمیشہ رہیں گے ۔

(سورۃ المؤمنون)

تو رشد و فلاح کے یہ سات اصول ان آیات مبارکہ میں بیان فرمائے گئے جو تمام مکارم اخلاق اور محاسن اعمال کے اصل الاصول ہیں ۔ ان میں دنیا و آخرت کے متعلق حکمت نظری عملی تہذیب اخلاق سے لے کر تدبیر منزل تک کوئی بات نہیں چھوڑی گئی ۔ ہر شعبۂ حیات کے اعلیٰ کمال کو جمع کر دیا گیا :

۱ ۔ المؤمنون کے عنوان سے ایمان کا ذکر ہے جو تمام نیکیوں کی جڑ ہے اسی میں اجمالاً اللہ رب العزت اور اس کی صفات ملائکہ انبیاء اور ان پر نازل کی ہوئی کتابوں اور دار آخرت کی تصدیق آگئی ۔ یہ تمام حکمت نظریہ کا عطر اور نچوڑ ہے ۔

۲ ۔ اس کے بعد الذین ھم فی صلوتھم خاشعون سے حکمت عملیہ کے شعبے شروع کر دیئے گئے جن میں سب سے مقدم نماز ہے اور نماز میں سب سے اہم چیز بلکہ اس کی روح خشوع عاجزی و نیازمندی ہے تو بیان کر دیا گیا ، کہ

کہ یہ اہل ایمان صرف یہی نہیں کہ نماز ادا کرتے ہوں بلکہ کمال خشوع اور عاجزی کے ساتھ اللہ کے سامنے حق بندگی ادا کرتے ہوتے ہیں۔

۳۔ "وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ" سے بیہودہ اور لغو باتوں سے اجتناب وکنارہ کشی بیان کر دی گئی۔ اور فعل لغو میں ہر وہ فعل داخل ہے جو حرام ہو یا مکروہ، یا ایسا بے معنی اور بے مقصد امر جس سے کسی نوع کا بھی نفع مقصود نہ ہو۔

۴۔ "وَالَّذِیْنَ لِلزَّکٰوۃِ فَاعِلُوْنَ" سے عبادات مالیہ اور حقوق مالیہ کی ادائیگی ذکر کر دی گئی۔

۵۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ میں شہوات نفس سے حفاظت اور عفت و پاک دامنی کا بیان آگیا۔

۶۔ "وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ" میں خیانت اور کذب وخداع مکروفریب جیسے مذموم افعال سے اجتناب کے ساتھ امانت اور عہد و پیمان کی رعایت وحفاظت کا وصف ظاہر فرما دیا گیا۔

۷۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ سے نمازوں کی پابندی اور ان کے آداب وحقوق اور اوقات مستحبہ کی نگرانی ذکر کر دی۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ ان کمالات اور خوبیوں سے متصف ہوں وہ یقیناً اللہ رب العزت کی نظروں میں بڑے ہی برگزیدہ اور محبوب بندے ہوں گے۔ ایسے ہی لوگ جنت الفردوس کے سچے اور حقیقی وارث ہیں۔

یہ آیات چونکہ بر وتقویٰ اور رشد و فلاح کے لیے اصل الاصول ہیں اس بنا پر حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان آیات کے نزول پر ایک خاص کیفیت اور شان بیان کی گئی ہے۔ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک روز ہم نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آثار وحی شروع ہوئے کچھ دیر تک ہم اسی کیفیت کو دیکھتے رہے اس کے بعد (گویا جب نزول آیات ہو چکا) تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کی طرف رخ فرمایا اور اپنے

دونوں ہاتھ اٹھا کر یہ فرمایا:

اَللّٰھُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَاَکْرِمْنَا وَلَا تُھِنَّا وَاَعْطِنَا وَلَا تَحْرِمْنَا وَآثِرْنَا وَلَا تُؤْثِرْ عَلَیْنَا وَارْضَ عَنَّا وَاَرْضِنَا۔

(جامع ترمذی)

اے اللہ تو ہمارے واسطے اور مزید اضافہ و برکت فرما۔ اور ہم سے کوئی کمی نہ کر اور (اے اللہ) تو ہمیں اکرام و عزّت عطا فرما۔ ہمیں رسوا و خوار نہ فرما۔ اور اے اللہ تو ہم کو دوسروں پر فوقیت دے۔ ہم پر غیروں کو فوقیت و برتری نہ دینا اور اے اللہ! تو ہم سے راضی ہوجا اور ہم کو راضی کردے (اپنی نعمتوں سے سرفراز فرما کر)

ان دعائیہ کلمات کے بعد آپؐ نے فرمایا بے شک مجھ پر ایسی دس آیات نازل کی گئی ہیں کہ جو ان کو قائم رکھے (یعنی عمل پیرا ہو) وہ یقیناً جنّت میں داخل ہوگا۔ اور پھر آپؐ نے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ سے یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ تک یہ دس آیتیں تلاوت کرکے سنائیں۔

یہ ظاہر ہے کہ انسان کی عملی زندگی کے تعلق کا ایک رُخ اگر اپنے خالق کے ساتھ ہے تو اس کی زندگی کا دوسرا رُخ مخلوق کے ساتھ وابستہ ہے۔ پہلے رُخ کی خوبی اور ذمّہ داریوں کی ادائیگی خداوندِ عالم کے فرائض و عبادات حسن و خوبی کے ساتھ بجالانے میں ہے۔ اور دوسرے رُخ کی تکمیل معاملات کی درستگی اور باہمی معاشرت کی خوبی میں مضمر ہے۔ قرآن کریم کے بیان کردہ برّ و تقویٰ کے تمام اصول کا خلاصہ یہی ہے کہ انسان ایک طرف حقوق اللہ کی محافظت و پابندی کرتے ہوئے کمالِ عبادت اور احسان فی العبادت کا مقام حاصل کرے تو دوسری طرف حقوق العباد کی حفاظت و رعایت سے حسنِ معاشرت کی بلند و بالا منازل بھی طے کرنے والا ہو۔ خالق و مخلوق کے

ساتھ اس کامل اور حسین ترین رابطہ کو قرآن کریم کی یہ آیت بیان کر رہی ہے

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۔

(سورۃ الذاریات)

بے شک متقی (پرہیزگار) باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ لینے والے ہوں گے وہ چیزیں جو ان کا رب ان کو عطا فرمانے والا ہوگا (یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے) کیونکہ یہ لوگ پہلے ہی سے نیکوکار رہتے تھے بہت ہی کم حصہ رات میں سوتے تھے اور بوقت سحر استغفار کرتے تھے۔ اور ان کے مالوں میں مانگنے والوں اور ایسے محتاج و تنگدستوں کا بھی حق تھا جو خاموش رہنے والے ہوتے (باوجودیکہ وہ محتاج ہوں)

تہذیب نفس میں نماز کا مقام

اس علم میں اصل چیز اور مقصود بالذات امر بندہ کا خدا تعالیٰ کے ساتھ تقرب ہے۔ مومن کا قلب کفر و شرک کی گندگیوں اور آلائشوں سے پاک وصاف ہو کر ایمان و معرفت کے انوار سے تو بہرحال منور ہو چکا جب کہ اللہ نے اس کو ایمان و ہدایت کی سعادت سے نواز دیا۔ لیکن اس کے بعد ضرورت تھی کہ وہ اپنے کمال عجز و انکسار اور نیازمندی کے ساتھ تعلق پیدا کرے اللہ اور قرب خداوندی کا مقام بھی حاصل کرے۔ اس لیے نماز جیسی جامع ترین عبادت مقرر کر دی گئی۔ تاکہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں سربسجود ہو کر قرب خداوندی کا اعلیٰ ترین مقام حاصل کرے جیسے کہ ارشاد فرمایا گیا :

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (قلم) کہ اے بندے تو سجدہ کر اور قرب حاصل کر

حدیث میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

أَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهٖ وَهُوَ سَاجِدٌ ۔ کہ اقرب ترین حالت جو بندہ کو اپنے رب کے ساتھ حاصل ہوتی ہے وہ ہے جب کہ وہ سر بسجود ہو۔

نماز کی تعلیم اگرچہ ہر پیغمبر نے دی اور اس کا حکم پہلی شریعتوں میں بھی نازل ہوتا رہا مگر قرآن کریم نے اس کی تکمیل کر دی کہ جو تہذیب نفس کے دونوں پہلوؤں یعنی تزکیہ اور تحلیہ کو جامع ہے۔

تزکیہ و تطہیر کے تمام شعبوں کو جامع ہونا تو قرآن کریم کی اس آیت سے ظاہر ہو رہا ہے اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ کہ نماز انسان کو تمام بے حیائیوں اور برائیوں سے روکتی ہے اور کمال اوصاف و زینت کے لیے جامع ہونا اس کی ہیئت وضعیہ سے نمایاں ہے کہ قولی عملی اور اعتقادی ہر نوع کی خوبیوں پر مشتمل ہے۔ جس میں قلب اور قالب کو ماسوی اللہ سے ہٹا کر صرف اللہ ہی کی طرف رخ کر لینا ہوتا ہے۔ گویا بندہ بحالت صلوٰۃ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ اور " اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ " کا عملی پیکر بن جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معبد (بنا کردہ کعبۃ اللہ) کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو جانا گویا ملت ابراہیمیہ کا انقیاد و اطاعت ہے۔ پھر جب اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر " اَللّٰهُ اَكْبَرُ " کہا تو اپنی اس ہیئت سے اس نے یہ اعلان کر دیا کہ میں دونوں جہانوں سے ہاتھ اٹھا کر اور ان سے برأت اختیار کرتے ہوئے صرف اپنے رب ہی کی طرف اپنا رخ کرتا ہوں اور اس کی عظمت و کبریائی اور حمد و ثنا کر رہا ہوں۔ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ کے کلمات سے حمد و ثنا اور تسبیح و تمجید خداوندی کا حق ادا کرتے ہوئے مزید اپنی نیاز مندی اور عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے عرض کرتا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کہ اے اللہ

ہم سب صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اس لیے کہ تو ہی تنہا معبود اور قادر مطلق اور ہم سب تیرے عبادت گذار اور عاجز محض ہیں۔ حق تعالیٰ کی توصیف اور حمد و ثنا اور اپنی نیاز مندی و عاجزی کے اظہار کے بعد یہ بندہ اس بات پر آمادہ ہوتا ہے کہ اس مرحلہ پر بارگاہِ خداوندی میں ایک فدویانہ درخواست بھی پیش کر دے صراطِ مستقیم کی ہدایت کے لیے اور ایسے گروہ کے راستہ پر چلنے کی جن پر حق تعالیٰ کے انعامات ہیں تاکہ یہ بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی برکت سے ان انعامات میں سے کچھ حصہ حاصل کر لے۔ تو عرض شروع کر دی: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اور درخواست کی کہ اے اللہ ان لوگوں کے راستہ سے بچانا جو مغضوب علیہم اور ضالین ہیں (یعنی جن پر غضب نازل کیا گیا اور گمراہ ہیں) اس لیے کہ ان کے راستہ کو اختیار کرنا ضلالت و گمراہی کو اختیار کرنا اور قہرِ خداوندی کو دعوت دینا ہے۔ آمین کہہ کر مزید اس درخواست کی قبولیت کے لیے استدعا کر لی۔ اس مقام پر پہنچ کر عبدیت و بندگی کا تقاضہ ہوا کہ جس عاجزی اور نیاز مندی کا زبان سے اقرار و اعتراف کر رہا ہے۔ بصورت رکوع اپنا سر جھکا کر اس کی عملی تصویر بھی بن جائے تو بحالت رکوع اپنی حقارت و ذلت کی ہیئت اختیار کر لی اور کہنے لگا،

سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ (پاکی ہے میرے ربّ عظیم کی)

عبدیت اور بندگی کے اس مرحلہ پر پہنچنے کے برکات و ثمرات کی وجہ سے ترقی کی اور منزلیں طے کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گیا کہ اپنی پیشانی زمین پر رکھ دی سربسجود اور اپنی پستی کے انتہائی مرتبہ پر پہنچے ہوئے اللہ رب العزت کی عظمتوں اور اس کے بلند و بالا مرتبہ کا تصور قلب و دماغ کی گہرائیوں میں رچا ہوا ہے اور یہ کلمہ زبان پر جاری ہے "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَىٰ" پاکی ہے میرے رب اعلیٰ کی۔ اس طرح ایک رکعت میں حق تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اس کی

بارگاہِ ربوبیت میں اپنے عجز و نیاز مندی کا تحفہ پیش کرکے پھر دوبارہ اس سعادت کو حاصل کرنے اور ان اثرات کو اپنے قلب و دماغ میں راسخ کرنے کے لیے دوسری رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے۔ دو رکعتوں سے فارغ ہونے پر ادب کے ساتھ دو زانو بیٹھ کر خداوند عالم کی عظمتوں کا اقرار اپنے ایمان اور عہد و پیمان کی تجدید یعنی اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ کہنے سے پہلے حسن پیغمبر خدا سیدالانبیاء والمرسلین کی بدولت یہ سعادت میسر ہوئی ہے ان پر ہدیۂ سلام پیش کرنا شروع کر دے اور کہے اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِيْنَ۔ پھر اپنے زبانی عہد و اقرار کو عملی اطاعت و بندگی کے رنگ میں پیش کرتے ہوئے کہے اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمدا عبده و رسوله۔

اس کے بعد قعدہ اخیرہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھ کر دعاؤں پر نماز کی تکمیل مناجات مع اللہ۔ تسبیح و تحمید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام کی بلند و بالا منازل طے کر لیں اور اسرا و معراج میں فرض کیے جانے والے جیسے عظیم فریضہ کو انجام دے کر بندہ نے گویا اپنی عبدیت و بندگی کا اعلیٰ نمونہ رب اعلیٰ کی بارگاہ میں پیش کرکے دین و دنیا کی سعادتوں کا مستحق ہو گیا۔ حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں سبحان الذی اسریٰ بعبدہ" ارشاد فرما کر یہ ظاہر فرما دیا کہ اسراء و معراج جو تمام تر بلندیوں کا منتہیٰ ہے اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصف عبدیت دخیل و مؤثر ہے تو اس سے ہر امتی کو یہ رہنمائی حاصل کرنی چاہیے کہ بارگاہِ رب العزت میں قرب اور عزت و بلندی صرف عبدیت ہی کے راستہ سے ملتی ہے اور عبدیت و بندگی کا اظہار نماز سے بڑھ کر کسی بھی عبادت میں نہیں۔ اس لیے معلوم ہوا کہ قرب خداوندی کا حاصل کرنے کا نماز ہی سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

الغرض نماز باوجود یکہ بظاہر صرف ایک فریضۂ خداوندی ہے لیکن اس کے نتائج وثمرات تہذیب نفس کے دونوں شعبوں یعنی تخلیہ اور تحلیہ کے جملہ کمالات کو حاوی ہیں۔[1]

حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرّہ "حجۃ اللہ البالغہ" میں اسرار صلوٰۃ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ نماز کی حقیقت اور اصل تین چیزیں ہیں قلب حق تعالیٰ شانہ' کی عظمت وجلال کا تصور ملاحظہ کرتے ہوئے خدا کے خوف سے کانپ رہا ہو اور زبان اس عظمت وجلال اور قلب کی ہیبت اور خشوع وخضوع کی ترجمانی کر رہی ہے۔ بہتر سے بہتر تعبیر کے ساتھ اور انسان کے اعضاء وجوارح اس ہیبت وخضوع اور عظمت خداوندی کے مطابق متأدب ہوں گے۔

گویا زبان دل اور اعضاء وجوارح سب مل کر بارگاہ ربّ العزّت میں عبودیت کا حق ادا کر رہے ہوں اور ان افعال تعظیمیہ کے بجالاتے ہوئے انسان جب مزید اپنی عاجزی وذلّت کا اور حق تعالیٰ کی عظمت کا تصور و مراقبہ کرتا ہے تو اپنا سر جھکا دیتا ہے۔ کیونکہ انسان نیز حیوانات کی بہ فطرت ہے کہ تکبر و غرور سے ان کی گردن بلند ہوتی ہے تو ظاہر ہے کہ خضوع اور عاجزی کا اظہار اسی طرح ہو سکتا ہے کہ گردن جھکالی جائے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے "فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ" پھر اسی حد تک اکتفا نہ کرے بلکہ اپنی پیشانی جو انسان کے اعضاء میں اشرف ترین ہے اور تمام حواس و مدرکات کا مرکز بھی ہے[2] زمین پر ٹیکتے ہوئے تواضع وعاجزی کا پورا پورا مظہر اور کامل ترین پیکر بن جائے۔

---

[1] فریضۂ صلوٰۃ کے اسرار اور ثمرات کی تفصیل اور اس امر کے لیے کہ نماز انسان کو کس قدر برائیوں اور عیوب سے پاک کرنے اور کس قدر محاسن وخوبیاں اور کمالات پیدا کرنے والی عبادت ہے۔ حضرات قارئین احیاء علوم الدین کی مراجعت فرمائیں بعلہ حجۃ اللہ البالغہ جلد اول۔

[2] یہ مضمون اس حدیث کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جس میں فرمایا گیا فی کل رکعتین تخشع

نماز بارگاہ خداوندی میں تقرب حاصل کرنے والے اعمال میں اصل الاصول اور جملہ عبادات کی رُوح اسی وجہ سے قرار دی گئی ہے کہ اس میں قلب، قالب اور فکر انسانی بھی عبادت میں مصروف ہے۔ زبان بھی بندگی کا حق ادا کرتی ہے اور سر سے پاؤں تک بدن کا ایک ایک جز پیکر تواضع بنا ہوا حق تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کا حق ادا کر رہا ہے۔ اسی بناء پر فرمایا گیا "اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ کہ نماز مومنین کی معراج ہے۔ گویا جس طرح معراج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تجلیات ربانیہ کے ورود کا ذریعہ تھی اسی طرح نماز مومنین کے قلوب کو اللہ کی تجلیات و انوار سے منور کرنے والی ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

اِنَّکُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّکُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ لَّا تُغْلَبُوْا عَلٰی صَلٰوۃٍ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِھَا فَافْعَلُوْا۔	اے لوگو! تم بیشک اپنے پروردگار کا (روز قیامت) دیدار کرو گے۔ پس اگر تم سے ہو سکے کہ تم طلوع شمس اور غروب شمس سے پہلے والی نماز سے عاجز نہ رہو تو ایسا کر گذرو۔

حدیث میں ہے کہ ایک نوعمر لڑکا افلح نماز پڑھ رہا تھا اور سجدہ میں جاتے وقت پھونک مار کر سجدہ گاہ سے مٹی کو اڑا رہا تھا آپؐ نے فرمایا "یَا اَفْلَحُ تَرِّبْ وَجْھَکَ کہ اے افلح تو اپنے چہرہ کو گرد آلود ہونے دے" مقصد یہ تھا کہ نماز تو خاکساری ہی کے لیے ہے تو ایسی عبادت میں کوئی اس قسم کی حرکت کرنا جس سے یہ محسوس ہوتا ہو کہ اپنے چہرہ کو مٹی میں آلودہ ہونے سے بچایا جا رہا ہے "موضوع نماز" کے منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نماز کو اسلام کا شعار اور مومن کی نشانی قرار دیا گیا اور کفر و اسلام کے درمیان نماز ہی کو حد فاصل فرمایا گیا[1]۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ۔ تلخیص و اضافات کے ساتھ۔

تہذیب نفس میں زکوٰۃ کا مقام

ارکان اسلام میں زکوٰۃ بھی ایک ایسا عظیم فریضہ اور پاکیزہ عبادت ہے جو تہذیب نفس کی دونوں جانبوں کو مشتمل ہے۔ انسان کی فطرت میں مال کی محبت رچی ہوئی ہے اور اس کے باعث وہ بہت سی برائیوں اور عیوب میں مبتلا ہوتا ہے۔ بخل وحرص، خیانت، حسد وبغض۔ دوسروں کی حق تلفی اور ظلم واستبداد پھر اس کے حصول کے لیے رشوت، چوری، قتل وغارت گری تک جیسی مذموم اور ناپاک خصلتوں میں انسان آلودہ ہوجاتا ہے تو شریعت نے زکوٰۃ کے حکم سے انسان کے لیے ان تمام عملی اور اخلاقی گندگیوں اور عیوب سے پاکی کا ذریعہ پیدا فرمادیا۔

زکوٰۃ ایک طرف جہاں انسان کے لیے ان خرابیوں سے تطہیر و پاکی ہے، دوسری طرف اخلاقی اور معاشرتی کمالات کے حصول کا بھی ذریعہ ہے۔ اس عبادت کی بدولت وہ ایثار وسخاوت غریبوں اور نادراروں کی ہمدردی و اعانت کرے گا۔ محتاجوں، تنگ دستوں اور بیواؤں کا سہارا بنے گا یتیموں کی تربیت اور تمام اعزاء واقرباء کے ساتھ صلہ رحمی جیسے کمالات، اور فضائل زکوٰۃ ہی کے ذریعے اس کو حاصل ہوں گے۔ زکوٰۃ کا مفہوم بھی وضع لغت کے رو سے ان دونوں پہلوؤں کو جامع ہونے کی خبر دیتا ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ کا مفہوم لغت میں پاکی اور نشوونما بیان کیا گیا ہے تو اس عبادت میں ایک طرف رذائل وعیوب سے پاکی ہے تو دوسری طرف اسی میں الخ بلند پایہ کمالات کے باعث عزت وسربلندی کا بھی ثمرہ پایا جاتا ہے۔

اور انسانی کمالات کا نشو و نما ہوتا ہے۔

پھر اس عبادت کے ثمرات میں یہ نعمت بھی حاصل ہوگی - غریب و محتاج کی اعانت کرنے والا لامحالہ اس نعمت کا بھی تصوّر کرے گا جو حق تعالیٰ نے اس پر فرمائی ہے اور اس طرح حق تعالیٰ کا شکر گذار بندہ ہونے کی سعادت نصیب ہوگی۔

حدیث[1] میں ہے کہ خداوند عالم نے آدم علیہ السّلام کی پشت سے ان کی ذریت کو نکال کر ان کے سامنے ظاہر فرمایا اور آدم علیہ السّلام نے ان میں مختلف طبقات دیکھے کہ کوئی حسین و جمیل ہے اور کوئی بدشکل، اور کوئی امیر و غنی ہے تو کوئی فقیر و تنگدست۔ عرض کیا اے پروردگار تو نے اپنے بندوں کے درمیان برابری کیوں نہ فرمادی۔ حق تعالیٰ نے جواب ارشاد فرمایا اَحْبَبْتُ اَنْ اُشْکَرَ میں نے اس بات کو پسند کیا کہ میرا شکر ادا کیا جائے (اور وہ ظاہر ہے کہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ امیر و غریب کا فرق ہو)

محبوب مال کا خرچ کرنا بے شمار سعادتوں کو متضمن ہے چنانچہ ارشاد فرمایا گیا :

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۔	ہرگز تم بھلائی اور نیکو کاری کا مقام نہیں حاصل کرسکتے جب تک کہ اس مال میں سے
(سُوْرَۃ آلِ عمران)	خرچ نہ کرو جو تم کو محبوب ہے۔

اخلاص اور جذبۂ ہمدردی کے ساتھ یتیموں اور مسکینوں کو کھلانا اور ان کی مدد کاملین اور اہل اللہ کا نشان قرار دیا گیا - فرمایا :

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ	اور کھانا کھلاتے ہیں وہ لوگ باوجود اس کے
مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا	محبوب ہونے کے (دلوں میں) مسکین
اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ	و یتیم اور (مصائب میں) گرفتار اسیر
لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا	کو جن کا جذبہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں

شُكُورًا	ہیں ہم تو کھلاتے ہیں تم لوگوں کو صرف اللہ کی رضامندی کے لیے۔ ہم تم سے نہ اس کا بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکرگذاری (کہ تم ہمارا احسان مانو)

(سُورة الدّهر)

اللہ کی راہ میں اپنا مال بے دریغ خرچ کرنے والوں کے لیے نجات و کامیابی کی بشارت سُنائی گئی۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔	جو لوگ اپنے مال خرچ کرتے ہیں رات میں اور دن میں چھپا کر اور علانیہ تو ان کے واسطے ان کا اجر و ثواب ہے ان کے پروردگار کے یہاں اور ان پر نہ کوئی خوف و اندیشہ ہے اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

(سُورة بقرہ)

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وصف کو اسلام کے شعبوں میں بہترین شعبہ فرمایا۔ اور معالی اخلاق کا وہ بلندترین مقام فرمایا ہے کہ فرشتے ان اعمال کو بارگاہِ خداوندی میں پیش کرنے کے لیے مسابقت اور باہم خصومت[1] کرتے ہیں۔

پھر یہ کہ صدقات انسان کو قہر خداوندی سے بھی بچاتے ہیں۔ احسان و سلوک، رزق اور عمر میں بھی خیر و برکت کا موجب ہوگا۔ نیز یہ کہ ایسے کریم انسان کے ساتھ ان لوگوں کی جن کے ساتھ اس نے احسان کیا ہو ہمدردیاں اور محبت اور خدمت شامل حال ہوگی وہ ایک ایسی عظیم نعمت ہے کہ بڑی سے بڑی دولت اور خزانے خرچ کر کے بھی اس نعمت کو نہیں خریدا جا سکتا اور اس کے حسن سلوک اور امداد و اعانت سے مسکینوں اور یتیموں کی جو مخلصانہ دعائیں اس کے واسطے ہوں گی وہ وہم و گمان سے بڑھ کر اس پر انعامات

[1] ملاحظہ فرمائیں وہ احادیث جو باب فضل المساجد وانتظار الصلوٰۃ " عنوان کے تحت کتب احادیث

اور رحمت خداوندی کا ذریعہ ہوں گی۔ بہرکیف سخاوت و ایثار ہمدردی و اعانت صلہ رحمی اور خدمت خلق پر ایسے بلندپایہ کمالات ہیں۔ انسان ان کی بدولت دنیا میں بھی سربلند و معزز ہوتا ہے اور آخرت میں حق تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی بے پایاں عنایات و رحمتوں سے سرفراز ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے ان تمام کمالات کے حصول کے لیے ایتاء زکوٰۃ، صدقہ اور انفاق فی سبیل اللہ کا بار بار حکم فرمایا اور دلائل و تمثیلات سے ان مضامین کو اس قدر واضح اور دلنشین بنا دیا کہ وہ طبائع بشریہ جن میں مال کی محبت رچی ہوئی ہو اللہ کی راہ میں صرف کرنے اور صدقات میں اپنے مال کو بے دریغ لٹانے والے ہو جائیں۔

تہذیب نفس میں روزہ کا مقام

اسلام کے بنیادی ارکان میں روزہ بھی تہذیب نفس میں ایک بلند ترین مقام رکھتا ہے۔ روزہ کی اصل حقیقت نفس کی خواہشات کو روکنا اور ان پر قابو پانا ہے۔ اس بنا پر روزہ کا ثمرہ و نتیجہ تقویٰ فرمایا گیا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ أَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ (سورۃ بقرہ)	اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم متقی و پرہیزگار بن جاؤ (اور یہ روزے تم پر) چند شمار کیے ہوئے دنوں کے لیے (فرض کیے گئے)

نفس انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اس دشمن کو مغلوب و مقہور کیے بغیر انسان کے لیے سعادت و کامیابی کی راہوں کا پانا ممکن نہیں۔ روح کی تازگی اور نورانیت نفسانی خواہشات کو پامال کرنے ہی میں مضمر ہے۔ جو شخص اپنے نفس کو خواہشات سے روکنے پر قادر نہیں وہ کمالات انسانیت سے محروم رہتا ہے۔ قوت غضبیہ و شہویہ انسان کو ہلاکت میں ڈالنے والی چیز اور تمام معاصی کا منبع و سرچشمہ ہے۔ صبر اور ضبط نفس ہی سے انسان ان دونوں طاقتوں کا مقابلہ کر سکتا ہے اس لیے حق تعالیٰ نے یہ پاکیزہ عبادت مقرر فرمائی کہ اس کے ذریعے صبر اور ضبط نفس کا انسان عادی ہو کر ایک طرف قبائح و مہالک اور شہوات و معاصی سے اپنے آپ کو بچائے تو دوسری طرف ایسے فضائل و کمالات سے بھی اس کی زندگی آراستہ ہو جائے جس سے روکنے کے لیے نفس و شیطان کے تمام حربے کارگر نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں ماہ رمضان کو شہر الصبر (یعنی صبر کا مہینہ)

کے عنوان سے تعبیر کیا اور آیت مبارکہ:
"اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ" کی تفسیر میں بہت سے مفسرین "الصَّابِرُون" سے "صَائِمُوْن" یعنی روزے دار مراد لیتے ہیں۔
یہی وہ عظمت و برتری ہے جس کے باعث حدیث میں روزہ کی فضیلت و خصوصیت کچھ ایسی اہمیت کے ساتھ ذکر فرمائی گئی جو فضائل اور آثارِ عبادات میں ایک امتیازی مقام رکھتی ہے:

عَنْ ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہُ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کل عمل ابن آدم یضاعف الحسنۃ بعشر امثالھا الی سبعمأۃ ضعف قال اللّٰہ تعالیٰ الّا الصوم فانّہٗ لی و انا اجزی بہٖ یدع شھوتہٗ وطعامہ من اجلی۔ للصّائم فرحتان فرحۃ عند فطرہ وفرحۃ عند لقاء ربّہ ولخلوف فم الصائم اطیب عندَ اللّٰہ تعالیٰ من ریح المسک۔ والصیام جُنَّۃٌ واذا کان یوم صوم احدکم فلا یرفث ولا یصخب فان سابہ احد اوقاتلہ فلیقل انی امرءٌ صائم

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ بیان کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ابن آدم کا عمل بڑھایا جاتا ہے (اس طرح کہ) ایک نیکی دس گنا سے سات سو گنا تک اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں مگر روزہ (کہ وہ اس قانون اور تحدید سے مستثنیٰ ہے) کیونکہ وہ میرے واسطے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔ روزہ دار اپنی خواہش کو اور اپنے کھانے کو صرف میری ہی وجہ سے چھوڑتا ہے۔ روزہ دار کے واسطے دو فرحتیں ہیں۔ ایک فرحت وخوشی افطار کے وقت اور دوسری فرحت ومسرت اپنے رب سے ملاقات کے وقت اور یقیناً روزہ دار کے منہ کی بُو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زائد پسندیدہ ہے اور روزہ ایک سپر ڈھال ہے (تمام معاصی وشہوات اور شیطان کے

حملوں سے بچانے کے لیے) اور (اے لوگو)
جب تم میں سے کسی شخص کے روزہ کا دن ہو
تو اس کو چاہیے کہ وہ بیہودہ اور فحش باتیں
نہ کرے اور نہ شور و شغب کرے۔ اور
اگر کوئی شخص اس کے ساتھ سب وشتم یا
لڑائی جھگڑا کرنے لگے تو اس کو کہہ دینا چاہیے
کہ میں روزہ دار شخص ہوں۔

(متفق علیہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک نے یہ بتایا کہ روزہ اجر و ثواب میں دیگر عبادات سے ایک عظمت و برتری رکھتا ہے اور یہ ایک ایسی نیکی ہے جس کو اللہ رب العزت یہ فرماتا ہے کہ روزہ میرا ہے اور میں ہی اس کا اجر و ثواب دیتا ہوں اور روزہ دار حق تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبولیت و محبوبیت کا یہ مقام رکھتا ہے کہ اس کے منہ کی بو اللہ کو مشک سے زیادہ محبوب و پسندیدہ ہے۔ اور یہ بھی بتایا کہ یہ پاکیزہ عبادت نفس کے تقاضوں شہوتوں اور طبعی لذتوں کو مغلوب کرنے کا نام ہے۔ اور یہ کہ نفس شیطان کے حملوں سے بچانے اور محفوظ رکھنے کے لیے سپر اور ڈھال ہے۔

حدیث مذکور نے یہ بھی ظاہر کیا کہ رمضان المبارک شہر الصبر ہے۔ اور اس ماہ مبارک کے لیے یہ عنوان اختیار فرمانا روزہ کی خاصیت و تاثیر کی طرف مشیر ہے جو لفظ صبر کے لغوی مفہوم اور اس کے چار عظیم الشان عملی پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ کیونکہ لغت عربیہ میں صبر علی اور عن کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے صبر علیہ کسی چیز پر صبر کیا۔ اور صبر عنہ کسی چیز سے صبر کیا۔ اور اس حقیقت کے تحت (۱) فرائض پہ پابندی (۲) شدائد اور مشقتوں پر تحمل۔ (۳) شہوتوں اور نفسانی لذتوں سے پرہیز (۴) معاصی اور گناہوں سے اجتناب داخل ہے۔ گویا روزہ دار اس عبادت کے ذریعے اس بناء پر کہ یہ اس کی خاصیت

و تاثیر ہے اپنے میں ان عملی کمالات اور خوبیوں کو حاصل کرنے والا ہوگا۔

مادیات میں جس طرح غذائیں اور دوائیں خاص مزاج اور تاثیر رکھتی ہیں اور ان کا استعمال کرنے والا یقیناً اپنے میں ان خواص و آثار کو پانے والا ہوتا ہے اسی طرح روزہ دار کی زندگی بھی ان رنگوں میں رنگی جاتی ہے جو روزہ اور صبر کے آثار و خواص ہیں۔

امام غزالی نے احیاء العلوم[1] میں وکیع کا یہ قول نقل فرمایا کہ وہ آیت مبارکہ "كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ[2]" کی تفسیر میں کہا کرتے تھے کہ ان گذرے ہوئے ایام کے روزہ کے دن مراد ہیں۔ کیونکہ ان دنوں میں روزہ داروں نے اللہ کے لیے اپنا کھانا پینا چھوڑا تھا تو اس کی جزا ان کو یہ عطا کی جائے گی کہ وہ خوب دل بھر کر جنت کی نعمتیں کھائیں اور پئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ کا ارشاد ہے حق تعالیٰ قیامت کے روز فرشتوں سے فرمائے گا اے فرشتو! دیکھو میرے اس بندے کو جس نے اپنی لذت و شہوت اور کھانا پینا صرف میری وجہ سے چھوڑا۔ بہت سے حضرات مفسرین آیت "فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ" اور "إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ" کی تفسیر میں ان عاملین اور صابرین سے صائمین یعنی روزہ دار مراد لیتے ہیں۔

حدیث میں ہے إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مِنَ الْإِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ[3] یعنی شیطان کے وسوسے انسان میں اس اس جگہ تک جاری وساری رہتے ہیں جہاں جہاں اس کے خون کا دوران ہو۔ گویا رگ و ریشہ میں۔ تو ظاہر ہے ایسی ہی بھوک وہ

---

[1] احیاء العلوم جلد ۱ صفحہ ۲۳۸ ۔ [2] سورۃ الحاقہ یعنی اے مسلمانو! کھاؤ پیو نہایت کیا فراخی و خوشگواری کے ساتھ اس عمل کی بدولت جو تم گذرے ہوئے ایام میں کر چکے ہو ۱۲۔

[3] حدیث متفق علیہ ۱۲۔

پیاس سے ان اثرات کا ازالہ ہوسکتا ہے، جو بدن انسانی کے رگ و ریشہ میں سرایت کرنے والی ہو۔

چنانچہ ایک سند سے اس حدیث میں یہ لفظ بھی وارد ہوا فَضَيِّقُوْا مَجَارِيَهُ بِالْجُوْعِ[1]۔ کھانے پینے کی کثرت اور نفسانی لذتوں اور شہوتوں میں انہماک انسان میں بہیمیت پیدا کرنے والا ہے۔ روزہ اس مرض وہلاکت سے بچانے کا ایک ایسا مؤثر اور قوی علاج ہے کہ انسان اپنے کو روحانی انوار اور ملکی خواص سے متصف پانے لگتا ہے اور گویا یہ عبادت انسان کو حیوانات و بہائم کے زمرہ سے نکال کر ملائکہ اور فرشتوں کے ساتھ ملحق ومشابہ بنادیتی ہے۔ اسی وجہ سے روزہ دار کو غیظ وغضب اور سب وشتم جیسے بہیمانہ امور سے مجتنب رہنے کی ہدایت فرمائی گئی جو روزہ کی حقیقت اور اس کی غرض کے منافی ہیں۔ اور اس بناء پر کہ طہارت وتقویٰ اور ملکیت و روحانیت کے یہ اوصاف روزہ کی حقیقت اور رُوح کا درجہ رکھتے ہیں۔ ایسے شخص کو جو صورۃً تو روزہ دار ہے لیکن اس کا روزہ اس حقیقت اور رُوح سے خالی وعاری ہے۔ یہ فرمایا گیا :

كَمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ مِنْ صَوْمِهِ اِلَّا الْجُوْعُ	کہ کس قدر روزہ دار ایسے ہیں کہ ان کے روزہ سے سوائے بھوک کے اور کچھ بھی (حاصل) نہیں۔

توجس طرح وہ انسانی ڈھانچہ جس میں رُوح نہ ہو ایک بے کار لاش ہے اسی طرح ہر وہ عبادت جو اپنی معنوی حقیقت اور رُوح سے خالی ہو۔ بے جان مردہ کا حکم رکھتی ہے اس لیے ایسا روزہ جو تقویٰ اور باطنی روحانی کمالات سے خالی رہا زمان نبویؐ میں محض بھوک اور فاقہ شمار کیا گیا۔

---

[1] احیاء العلوم الغزالی ج ۱ صفحہ ۲۳۸۔ عراقی نے بیان کیا کہ سند صحیح سے حدیث میں یہ الفاظ ثابت نہیں۔ بعض محدثین نے اسناد ضعیف سے یہ جملہ نقل کیا ہے۔ ۱۲۔

ہر بدن انسانی جیسے بغیر روح کے کارآمد نہیں اسی طرح ہر عبادت کو وہ ظاہری ارکان و شرائط کے ساتھ ادا ہو رہی ہو مگر اپنی حقیقت و رُوح اور غرض سے خالی ہو خدا اور اس کے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں بے معنی اور ناقابلِ اعتبار واعتناء ہے۔

بعض عارفین سے منقول ہے کہ ان کے سامنے جب یہ آیت تلاوت کی گئی، "اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا[1]" تو انہوں نے اپنا ہاتھ اپنے کان اور نگاہ پہ رکھا اور فرمایا یقیناً کان بھی امانت ہے، اور نگاہ بھی امانت ہے۔ اگر یہ روزہ کی امانتوں میں سے نہ ہوتیں تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ ارشاد فرماتے فلیقل انی صائم کہ روزہ دار کو کہہ دینا چاہیے کہ میں روزہ دار ہوں۔ یعنی میری یہ زبان میرے پاس امانت ہے تاکہ میں اس کی (فحش باتوں سے) حفاظت کروں اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اس کو تیری لغو اور فحش بات کے جواب میں کھولوں[2]۔

غرض تہذیب نفس میں روزہ کا یہ عظیم الشان اور بلند ترین مقام ہے کہ انسان مادی کثافتوں اور نفسانی ظلمتوں سے نکل کر ملکی اوصاف و کمالات اور رُوحانی انوار سے اپنے کو منور پانے لگتا ہے اور پیکر بشری میں طہارت و تقویٰ اور عفت و پاکدامنی کی ایک ایسی تصویر بن جاتا ہے کہ دیکھنے والا بے ساختہ بول اُٹھے "مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِیْمٌ[3]"

پھر روزہ دار کو اس عظیم عبادت کے ذریعہ یہ خاص نعمت بھی حاصل ہوگی کہ بھوک اور پیاس کی تکلیف برداشت کرکے حق تعالیٰ کے عطا کیے ہوئے رزق کی قدر و منزلت پہچانے گا اور اس کی نعمتوں کا شکر گذار ہوگا تو اس طرح صائم

---

[1] بیشک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے اہل کی طرف لوٹا دو۔ (نساء)

[2] احیاء علوم الدین للغزالی۔ ج ۱، ص ۲۴۳۔

[3] یہ تو کوئی بشر نہیں بلکہ یہ تو صرف ایک فرشتہ ہی ہے جو بڑی کرامت و بزرگی والا ہو (سورۂ یوسف)

صبر کی منزلیں طے کرتے ہوئے شکر کے بلند ترین مقام پر بھی پہنچنے والا ہوگا۔ پھر بھوک اور پیاس کی شدت و مشقت کا تجربہ ہونے سے غربت و ناداری، اور فقر و فاقہ کے مصائب کا اس کو احساس ہوگا۔ اور یہ احساس طبعی طور پر غریبوں ناداروں اور فقر و فاقہ میں مبتلا لوگوں کی اعانت و ہمدردی پر آمادہ کرے گا
اور ظاہر ہے کہ ان سب کمالات و فضائل کا ضامن وصف تقویٰ ہے جس کو قرآن کریم نے روزہ کا مقصد اور اس کی خاصیت و تاثیر کے طور پر بیان فرمایا

تہذیب نفس میں حج بیت اللہ کا مقام

حج بیت اللہ فرائض اسلام اور ارکان دین میں آخری رکن ہے جیسا کہ عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں بیان کیا گیا:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَھَادَۃِ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ وَصَوْمِ رَمَضَانَ وَالْحَجِّ۔ (متفق علیہ)

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام کی بناء پانچ چیزوں پر قائم کی گئی اس بات کی گواہی پر کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور نماز قائم کرنے پر۔ اور زکوٰۃ ادا کرنے پر اور رمضان کے روزہ پر اور حج بیت اللہ پر۔

گویا اسلام کی یہ عالیشان عمارت ان پانچ بنیادی امور پر قائم ہے اور اس کی تکمیل حج بیت اللہ پر ہے۔ توحید و رسالت کے اقرار کے بعد ان چار فرائض میں درحقیقت اللہ رب العزت کے حقوق کی ادائیگی ملحوظ ہے۔ اللہ رب العزت کے حقوق کا احاطہ تو ناممکن ہے۔ جیسے اس کے کمالات اور صفات غیر متناہی ہیں اسی طرح اس کے حقوق بھی غیر محدود و لامتناہی ہیں۔ لیکن حق تعالیٰ کی تمام صفات کا مآل اور مرجع دو صفتیں ہیں۔ ایک صفت جلال و عظمت اور دوسری صفت جمال۔ قرآن کریم کی یہ آیت نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ وَاَنَّ عَذَابِیْ ھُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ[1] اسی شان جلال اور جمال کی ترجمانی کر رہی

[1] اے پیغمبر خبر دیجئے میرے بندوں کو کہ بے شک میں ہی غفور رحیم ہوں۔ اور یقیناً میرا عذاب بھی نہایت دردناک عذاب ہے۔ (سورۂ حجر)

اس بناء پر ان ارکان و فرائض میں صلوٰۃ و زکوٰۃ ایسی عبادتیں مقرر کی گئیں جو اللہ کا حق عظمت و حاکمیت ادا کرنے والی ہیں۔ اس کے ساتھ صوم اور حج بیت اللہ صفت جمال سے تعلق رکھنے والی عبادتیں ہیں جن سے بندہ حق تعالیٰ کی محبت کا حق ادا کرتا ہے۔ روزہ عشق اور محبت خداوندی کی پہلی منزل ہے جس میں انسان اپنی مرغوب چیزوں اور نفسانی خواہشات کو ترک کرتا ہے۔ کیونکہ محبت کا تقاضا بھی یہ ہے کہ ماسوا سے اعراض اور کنارہ کشی اختیار کی جائے اور ماسوی اللہ کا حاصل یہی دو شہوتیں ہیں نفس کی شہوت اور پیٹ کی خواہش اور صوم انہی دو چیزوں سے بے تعلقی اور کنارہ کشی کا نام ہے تو اس منزل پر چلنے والے کے لیے محبت کا تقاضا اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ محبوب کے گھر تک اس کو رسائی حاصل ہو جائے۔ اس کے واسطے چوتھا فرض حج بیت اللہ مقرر کیا گیا جس میں انسان اپنے گھر بار کو چھوڑ کر میدانوں اور بیابانوں کو قطع کرتے ہوئے سمندروں کو طے کرتے ہوئے محبوب حقیقی کی گلی کوچوں تک رسائی حاصل کرتا ہے اور جذب و محبت کی آنکھوں کو دیدار بیت اللہ اور اس کے جلووں سے معمور کرتا ہے۔ وہاں پہنچ کر کبھی اردگرد دیوانہ وار گھومتا ہے یعنی طواف کرتا ہے کبھی حجر اسود کو بوسہ دیتا ہے۔ کبھی بیت اللہ کی دیواروں اور اس کے پردوں سے لپٹتا ہے اور چومتا ہے پھر والہانہ انداز محبت میں کبھی صفا پہاڑی پر چڑھ کر بے قراری کے عالم میں مروہ کی سمت جاتا ہے کہیں دوڑتا ہے کہیں تھکے ہوئے درماندہ محب کی سی آہستہ رفتار سے کسی فکر اور جستجو میں چکر لگا رہا ہے۔ پھر دیوانگی جیسے عالم میں میدان عرفات و مزدلفہ کی طرف نکل کھڑا ہوتا ہے۔ غرض سراپا عاشقی کا ایک نمونہ ہے۔ بحالت احرام یہ پراگندہ حال حاجی اپنے لباس حلیہ اور سراپا سے عشق و محبت کی بے قراری اور اضطراب و دیوانگی کا سراپا پیکر بنا ہوا ہوتا ہے۔ یہ بے قراری اور شوق محبت کہ اس عاشق حقیقی کو آمادہ کرتا ہے کہ اپنی جان ہی محبوب کے قدموں قربان کر دے لیکن جس جان آفرین محبوب کے لیے جذبہ عشق جان قربان کرنے کا تقاضہ کر رہا ہے اس نے

خودکشی منع کردی اس وجہ سے اس کا تجویز کیا ہوا فدیہ قربانی کی صورت میں پیش کرنے پر کفایت کر رہا ہے۔ غرض یہ عاشق حقیقی اپنے رب کی محبت میں بے قرار گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اپنی تمام راحتوں آسائشوں اور زیب و زینت سے بیگانہ ہو کر اس کے گھر کے طواف اور ان ہی میدانوں اور بیابانوں میں والہانہ[1] پھرتا ہوا اس منزل پہ پہنچ گیا کہ عشق و محبت کا آخری تقاضہ بھی پورا کر کے اپنی جان ہی قربان کردے۔ اس طرح یہ عشق و محبت کی آخری منزل احکام دین اور فرائض اسلام میں سے آخری فریضہ حج پہ پوری ہو رہی ہے۔ یہی وہ حکمت ہے کہ شریعت نے ماہ رمضان ختم ہوتے ہی اشہر حج (زمانہ حج) کی ابتداء مقرر کردی۔ اشہر حج شوال کی یکم سے شروع ہوتے ہیں اور شوال کی ابتداء رمضان المبارک کی آخری ساعت گذرتے ہی یعنی عید کا چاند ہوتے ہی ہو جاتی ہے۔ گویا راہ محبت میں سفر کرنے والا یہ مسافر جیسے ہی عشق و محبت کی ایک منزل طے کر چکا فوراً ہی اس کے سامنے دوسری منزل آگئی۔ حافظ ابوعمرو ابن الصلاح فرماتے ہیں۔ صوم اور حج بیت اللہ اسی ترتیب سے یہ دونوں عبادتیں نازل بھی ہوئیں۔ پہلے صوم اور پھر اس کے بعد حج بیت اللہ۔

بہرکیف صلوٰۃ و زکوٰۃ نے اللہ رب العزت کی عظمت و حاکمیت کا حق ادا کیا تو صوم اور حج نے رب کائنات کے عشق و محبت کے تقاضوں کو پورا کیا۔ اس طرح یہ چار عبادتیں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں عبدیت و بندگی کے حقوق ادا کرنے کا ذریعہ بنیں۔

---

[1] اسی والہانہ اور عاشقانہ تڑپ کی یہ اشعار ترجمانی کر رہے ہیں۔

أَمُرُّ عَلَى الدِّيَارِ دِيَارِ لَيْلَى ۔۔۔ أُقَبِّلُ ذَا الْجِدَارَ وَذَا الْجِدَارَا

وَمَا حُبُّ الدِّيَارِ شَغَفْنَ قَلْبِي ۔۔۔ وَلٰكِنْ حُبُّ مَنْ سَكَنَ الدِّيَارَا

یعنی میں گشت لگا رہا ان بیابانوں اور بستیوں کا جو لیلیٰ کی بستیاں ہیں۔ میں چوم رہا ہوں کبھی اس دیوار کو اور کبھی اُس دیوار کو ــــــ اور (حقیقت میں) ان بستیوں اور مکانات کی محبت میرے دل میں نہیں رچی ہوئی ہے بلکہ یہ محبت ہے اس کی جو ان بستیوں اور مکانات

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت دراصل ملت ابراہیمی ہے؛ جیسے کہ خود قرآن کریم نے آپؐ کا یہ اعلان نقل فرما دیا:

بَلْ نَتَّبِعُ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۔	بلکہ ہم تو ابراہیم (علیہ السلام) کی ملت کی پیروی کرتے ہیں جو ہر باطل سے اپنا چہرہ پھیرنے والے تھے۔

اس بناء پر قرآن کریم نے حج کی فرضیت اور اس کے اسرار و حکم کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نداء اور تمام عالم کو دعوت حج کے مضمون سے کیا۔ فرمایا:

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَن لَّا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ۔ وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ ۔	اور (یاد کرو) جب کہ ہم نے ابراہیم کے لیے معین کر دی جگہ کعبہ کی (یہ حکم دیتے ہوئے) کہ نہ شریک کرو میرے ساتھ کسی چیز کو اور پاک رکھو میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے اور اعلان کر دو لوگوں میں حج کے لیے۔ آئیں گے وہ تمہارے پاس پیادہ پا چل کر اور دبلے پتلے (چھریرے بدن کے) اونٹوں پر سوار ہو کر چلے آئیں گے وہ ہر دُور دراز راستوں سے تاکہ وہ حاضر ہوں اپنے منافع کی جگہوں پر (یا دیکھیں اپنے فوائد و منافع۔ اور تاکہ ان مقرر کردہ دنوں میں اللہ کا نام یاد کیا کریں (اور ذکر اللہ کے ساتھ اس کا شکر بھی قربانی کے ان چوپاؤں کے عطا کیے جانے پر جو اللہ نے ان کو بطور رزق عطا فرمائے۔) کریں۔
(سورۃ الحج)	

حج کا مفہوم

حج کا مفہوم از رُوئے لغت قصد و ارادہ کرنا ہے ۔ بعض ائمہ لغت سے یہ منقول ہے کہ کسی معظم و محترم شئ کی جانب قصد کا نام حج ہے ۔ شریعت کی اصطلاح میں بیت اللہ کی جانب اعمال مخصوصہ کے ساتھ قصد کرنے کو حج کہا جاتا ہے ۔ جو شریعت کی طرف سے معیّن کردہ زمانہ میں ہو ۔

مواہب لدنیہ میں بیان فرمایا کہ حج معبود حقیقی کی بارگاہ میں حاضری ہے اور اس کے جود و کرم کے میدان میں کھڑا ہونا ہے اور عہد الست میں بندوں نے حق تعالیٰ شانہٗ کی ربوبیت و بندگی کا جو عہد کیا تھا اس کی یہ عملی تکمیل ہے[1]۔

شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں حج میں بہت سے بلند پایہ مصالح ہیں جن کی رعایت کی گئی ہے ۔ ان مصالح میں سے تعظیم و تکریم ہے بیت اللہ کی جو اللہ کے شعائر میں سے ہے اور شعائر الٰہیہ کی تعظیم درحقیقت اللہ ہی کی تعظیم و تکریم ہے ۔ نیز یہ کہ اس میں رب العالمین کے دربار شاہی کی ایک شان نمایاں اور ظاہر ہے کیونکہ ہر حکومت اور قوم کے لیے ایک ایسے عظیم عمومی دربار کا انعقاد ہوا کرتا ہے جس میں قریب و بعید برتر اور کم تر غرض ہر مرتبہ کا آدمی حاضر ہوتا ہے جس سے باہمی تعارف اور انس و محبت کی غرض کے ساتھ یہ بھی مقصود ہوتا ہے کہ اس حکومت کا ہر فرد خطاب شاہی سن سکے اور احکام و فرامین سے اس کو آگاہی حاصل ہو جائے

---

[1] مسند احمد بن حنبل میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ خداوند عالم نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی ذریت کو نعمان یعنی مقام عرفہ میں نکالا اور اپنے روبرو ان کو ذرات کی طرح بکھیر کر ان سے رُو در رو خطاب فرمایا اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں ؟ سب نے جواب دیا بَلٰی بیشک اے پروردگار تو ہمارا رب ہے تو وقوف عرفہ مقرر کیا جانا اسی عہد و پیمان کی جگہ حاضری دے کر عملاً اس عہد و میثاق کو پورا کر دکھانا ہے ۔ ۱۲ ۔

اور اس سلطنت کی عظمت و شوکت کا بھی اظہار ہو تو اسی طرح حج بیت اللہ دربار خداوندی میں تمام دنیا کے مسلمانوں کی حاضری ہے اور ملتِ اسلامیہ کی عظمت و برتری کا اظہار و اعلان ہے اور حق تعالیٰ شانہٗ نے اسی وصف کو قرآن کریم میں اس عنوان کے ساتھ بیان فرمایا ہے :

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا - کہ یاد کرو اس امر کو جب کہ بنا دیا ہم نے بیت اللہ مرجعِ خلائق اور امن کی جگہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و رسالت اسی غرض کے لیے ہے کہ ملتِ حنیفیہ کی عظمت و برتری ہو نیز یہ کہ حج کی حقیقت روئے زمین کے صالحین کی جماعت عظیمہ کا اجتماع ہے - جو ایسے وقت میں ایک میدان میں جمع ہوتے ہیں جہاں انبیاء و صدیقین ، اور شہداء و صالحین (جن پر حق تعالیٰ کی خاص الخاص عنایات اور نعمتیں ہیں) کا ذکر ہوتا ہے - اور یہ وہ جگہ ہے جہاں آیات بیّنات ہیں جن کی طرف دین کے مقتدا و پیشوا شعائر الٰہیہ کی تعظیم کے لیے قصد کرتے ہیں اللہ رب العزت کی طرف تضرع کرتے ہوئے اس کی رحمتوں کی امید و رغبت اور خطاؤں کی مغفرت و معافی کی آرزو لیے ہوئے ، تو ظاہر ہے کہ اہل ایمان جب ان ہی کیفیات و عزائم کے ساتھ یہاں حاضر ہوں گے تو ... حق تعالیٰ کی عنایات و رحمتوں کا نزول اور مغفرت و معافی ان سے پیچھے نہیں رہ سکتی[2] یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا -

ما رؤی الشیطان یوماً ھو فیہ اصغر ولا ادحر ولا احقر ولا اغیظ منہ فی یوم عرفۃ -	کہ شیطان کسی دن بھی اس قدر پست اور چھوٹا اور ذلیل وحقیر اور غیظ و غضب میں نہیں دیکھا گیا جس قدر کہ وہ یوم عرفہ میں حقیر و ذلیل اور غیظ و غضب میں نظر آتا ہے (ان

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم ۔ [2] حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم ۔

ر رحمتوں کو دیکھ کر جو اللہ کی طرف سے
ان جمع ہونے والے حجاج پر نازل
ہوتی ہیں ۔

انسانی رغبت و نفرت شوق و عداوت اور امید و خوف میں مواضع اور مواطن کو بڑا دخل ہے اس لیے جن مواضع و اماکن میں خدا پرستوں نے خدا پرستی کی ہے ، جہاں اس کی رحمتیں نازل ہوئی ہیں وہاں یقیناً قلب کی کچھ اور ہی حالت ہوگی ۔ خصوصاً ان کے آثار باقیہ کو دیکھ کر ان کے ہاتھوں کی چھوئی ہوئی چیزوں اور پاؤں کی روندی ہوئی زمین سے تو انہیں کی خوشبوئیں محسوس ہوں گی ۔

اس بناء پر ظاہر ہے کہ جو مسلمان ان مشاہد مبارکہ اور مقامات مقدسہ کی زیارت کرے گا اور وہاں جاکر اسی طرح عبادت و دعا میں مصروف ہو جیسے اللہ رب العالمین کے برگزیدہ اور مقبول بندے اور پیغمبر مصروف رہے تو ان انوار و برکات کا بھی مشاہدہ کرے گا اور ان رحمتوں کا بھی مستحق بنے گا جو اللہ کی طرف سے ان ہستیوں پر نازل ہوئیں ۔ نیز وادی عرفہ میں دنیا کے تمام مسلمانوں کا جمع ہونا اپنی دلالت حال سے ان کو اتحاد و اخوت اور باہمی انس و محبت کا سبق دے گا ۔ اسلام کی روح اجتماعیت ہی ہے ۔ اسی اجتماعیت کے لیے رات دن میں پانچ نمازیں باجماعت پڑھنے کا حکم دیا گیا تاکہ اہل محلہ ایک جگہ جمع ہو کر حق تعالیٰ کی بندگی کا فرض بجا لائیں ۔ اور اس نعمت کے ضمن میں ایک دوسرے سے مل لیں حالات سے باخبر رہیں اور باہمی ارتباط و اتحاد قائم رہے ۔ پھر جمعہ کے روز قصبہ اور شہر کے تمام مسلمان جمع ہو کر اسلام کی اجتماعی شان عظمت کا اظہار کریں اس کے بعد سال میں دو مرتبہ عیدین کے موقعہ پر ہر شہر اور اس کے مضافات کے مسلمان جمع ہو کر اس شان کو اور دوبالا کر دیں تو اس لحاظ سے حق تعالیٰ کی مشیت و حکمت کا تقاضہ ہوا کہ ایک جگہ اہل اسلام کا ایسا عظیم اجتماع ہو کہ وہاں سارے عالم کے مسلمان دنیا کے گوشہ گوشہ سے آکر جمع ہو جائیں ۔ اور تمام دنیا کو یہ بتا دیں ، کہ

روئے زمین پر صرف یہی توحید و خدا پرستی کا سچا ولولہ لیے ہوئے عاشقانہ انداز میں یہاں جمع ہیں۔ پھر جب اس ہیئت اور حلیہ میں یہاں ہر ایک جمع ہو گا کہ ہر ایک کفن جیسی دو چادروں کو اپنے بدن سے لپیٹے ہوئے ہے جس میں امیر و غریب حاکم و محکوم، عزیز و ذلیل، سرخ و سفید اور سیاہ سب یکساں و برابر ہیں تو یہ ہیئت بذات خود یہ بتائے گی اسلام نے بنی نوع آدم کے درمیان تمام امتیازات کو ختم کر دیا ہے۔ اب سب مسلمان اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی ہیں اسی اجتماعی روح کی ترجمانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حجۃ الوداع کا یہ خطبہ کر رہا ہے جس میں آپ نے ارشاد فرمایا:

ان دماءکم و اموالکم حرام علیکم لحرمۃ یومکم ھذا فی شھرکم ھذا فی بلدکم ھذا الا کل شیء من امر الجاھلیۃ تحت قدمی موضوع

(صحیح مسلم)

بیشک تمہاری جانیں اور تمہارے مال ایک دوسرے پر قابل احترام ہیں ایسے ہی جیسے کہ تمہارے آج کے دن کی حرمت تمہارے اس مہینہ میں تمہارے اس شہر (بلدۃ الحرام مکۂ معظمہ) میں۔ آگاہ ہو جاؤ (اب دورِ جاہلیت کی ہر چیز میرے دونوں قدموں کے نیچے رگڑ دی گئی (اور پامال کر دی گئی ہے)

اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کسی عربی کو کسی عجمی پر اور نہ کسی عجمی شخص کو عربی پر نہ احمر (سرخ) کو اسود و اصفر (سیاہ و زرد) پر تم سب ایک ہو۔ ایک جسم کے مانند ایک دوسرے سے مربوط و متحد ہو۔ کسی کو کسی پہلو کوئی فضیلت و برتری نہیں مگر اللہ کے تقویٰ سے کہ بے شک اس کے ذریعے ایک کو دوسرے پر فضیلت ہے۔ غرض عصبیت اور قبائل و اقوام کے درمیان امتیازات انسانی حیات کو تباہیوں اور مہالک کی طرف لے جانے والے اسباب ہیں۔ احرام کی یہ حالت اس نوع کے تمام امتیازات کو اٹھا دینے کی عملی تعلیم ہے۔

زیب و زینت انسان میں کبر و غرور اور نخوت پیدا کرنے والی چیز ہے۔

احرام میں ان چیزوں کی مخالفت نفسانی خواہشات سے اجتناب تواضع اور متانت و سنجیدگی پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔

سلے ہوئے کپڑے اور لباس طبعی راحت و آسائش کا سامان ہے اس کی ممانعت سے سادگی اور جفاکشی پیدا ہوگی۔ اور اوصاف ملکیت سے وہ متصف ہوگا کیونکہ طبعی لذتوں اور جسمانی راحتوں میں انہماک و غلو انسان میں بہیمیت کے آثار پیدا کرتا ہے تو لامحالہ ان چیزوں سے اجتناب و پرہیز روحانی انوار اور کمالات اجاگر کرنے والا ہوگا۔

بحالت احرام میدان عرفات میں اجتماع موت اور بعث بعد الموت کا بھی منظر قلب و دماغ میں مرتسم کرکے آخرت اور اللہ کی طرف رجوع پر آمادہ کرے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان بہت سی عملی برائیوں سے بچ کر ایمان و تقویٰ کے رنگ میں اپنی زندگی رنگ لے گا۔ کیونکہ حج ابتدا ہی سے موت کی منزلوں کا ایک نمونہ ہے۔ گھر سے چلنا اولاد و مال کو چھوڑنا، دنیا سے گذرنے کو یاد دلاتا ہے پھر سرزمین حرم کے قریب پہنچ کر احرام باندھنا گویا کفن میں لپٹنا ہے اس کے بعد طبعی اور نفسانی لذتوں سے رکنا اور شکار جیسی لہو و لعب چیز چھوڑ دینا مرنے کے بعد ان لذتوں اور چیزوں سے جدا ہوجانے کی تصویر ہے۔

زادِ راہ اور قربانی کا جانور کا جانور ہمراہ ہونا اس بات کو یاد دلاتا ہے، کہ انسان کے مرنے کے بعد اعمال ہی کا توشہ اس کے ساتھ رہے گا۔ عرفات میں کھڑا ہونا میدان حشر میں حاضری کی ایک نظیر ہے۔ قربانی کے بعد احرام کھولنا نہانا گندگی اور میل کچیل دور کردینا گناہوں سے پاکی اور صفائی کا نمونہ ہے اس کے بعد طواف بیت اللہ اور حرم مکہ میں تمام چیزوں کے درست ہونے اور جنت میں جاکر وہاں کی نعمتوں سے فیض یاب ہونے کو یاد دلاتا ہے۔

الغرض ایک طرف یہ عبادت حق تعالیٰ کی عظمت و ہیبت اور محبت کا

حق ادا کر رہی ہے تو دوسری طرف انسانی زندگی کو نفسانی لذتوں شہوتوں اور لہو ولعب سے کنارہ کشی کی تعلیم و تربیت دے کر پاکیزہ اعمال و اخلاق اور طہارت و تقویٰ کی عظمتوں سے ہمکنار بنا رہی ہے۔

پھر یہ کہ انسان جب دنیا کی مختلف قوموں کو دیکھے گا ان کی معاشرت و مزاج اور اخلاق و اعمال کا تجربہ کرے گا تو اس سے فکری اور عملی صلاحیتوں میں خاص ترقی اور جلا پیدا ہوگا۔ انسان جب تک بری اور بحری سفر نہیں کرتا اقطارِ عالم کے لوگوں کی خو بو ان کے طرز تمدن کو نہیں دیکھتا اور ان کے خیالات سے مستفید نہیں ہوتا اس میں اولوالعزمی اور پختہ کاری نہیں پیدا ہوتی اور نہ وہ زمانہ کی رفتار و احوال سے واقف ہو سکتا ہے۔ سفر حج کی بدولت اس کو یہ فضیلت و خوبی بھی حاصل ہوگی۔ اطبا نے لکھا ہے کہ سفر سے بہت سے جسمانی امراض بھی دور ہوتے ہیں اور صحت کے لیے مفید ہے۔ قومی اتفاق کے فوائد و برکات دنیا میں مسلّم ہیں تو اطراف و اکناف عالم کے لوگوں کا میل جول اور اجتماع ہر موسم حج میں امت مسلمہ کا ایک سالانہ اجتماع و اجلاس ہوگا۔

مسلمان سارے عالم میں پھیلیں گے بالخصوص ایشیا و افریقہ اور یورپ کے بلاد میں بھی اور یہ بات خداوند عالم نے اپنے پیغمبر علیہ السّلام کو بتادی تھی اس لحاظ سے سرزمین مکہ مکرمہ اس اجلاس کے لیے مرکز بنایا گیا کیونکہ یہ جگہ یورپ مشرقی ممالک اور جنوبی و شمالی ممالک کے وسط میں ہے تو کل روئے زمین کے مسلمانوں کو یہاں جمع ہونا آسان ہوگا اور موزوں بھی۔ نیز یہ کہ مسلمانوں کی مذہبی اور دراصل قومی زبان عربی ہے اس وجہ سے سرزمین عرب میں مکہ مکرمہ ہی اس کے واسطے متعین کیا گیا جہاں کعبۃ اللہ اور حضرت ابراہیمؑ کا معبد اوّل ہے۔

بہرکیف یہ اجتماع دینی فوائد کے لحاظ سے تو بہتر ہی بہتر ہے لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کا بھی ایک بہترین ذریعہ ہے مسلمانوں کے سربرآوردہ افراد اور تمام ممالک کے سلاطین یا ان کے نمائندے اور ذمہ دار افراد جمع ہو کر

مسلمانوں کے فلاح و ترقی کے مسائل اور وسائل پر غور کریں گے۔ اور باہمی مشوروں سے ایسی تجاویز طے کریں گے۔ اس طرح دنیا بھر کے مسلمان ان تجاویز پر عمل پیرا ہو کر اسلام اور مسلمانوں کی عظمت و سربلندی کی طرف قدم اٹھا سکیں گے جس کے بعد ان کا کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی ان کی طرف نظر اٹھانے کی جرأت نہ کر سکے گا۔

انسان اس طویل سفر میں جہاں اس کو مختلف المزاج اقوام سے سابقہ ہوگا، صبر و تحمل کا بھی عادی ہوگا۔ تکالیف و مشقتوں کی برداشت سے فضائل و کمالات میں اور ترقی حاصل ہوگی تو اس طرح حج بیت اللہ اسلام کا رکن اور عبادت ہونے کے ساتھ ان بے شمار فوائد و منافع پر مشتمل ہے اور انسان کو فکری اور عملی محاسن اور اخلاق کی بلندیوں تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

اسلام کے ان بنیادی اور عظیم المرتبت ارکان و فرائض کے علاوہ علم تہذیب النفس کے اور بہت سے شعبے ہیں جن پر انسان کی سعادت اور فلاح و کامیابی کا دارومدار ہے اور قرآن کریم نے ان علوم کی ہدایت فرمائی ہے جن کی اجمالی فہرست حسب ذیل ہے:

انسانی زندگی کو باکمال بنانے میں ذکر اللہ کا مقام

انسان کی زندگی کو باکمال بنانے میں ذکر اللہ تمام اعمال و اخلاق کی خوبیوں اور محاسن کا ذریعہ ہے۔ حق تعالیٰ کا ذکر اس کی تسبیح و تحمید اور تہلیل و تقدیس تمام احوال اور جملہ نشست و برخاست میں بڑی عظیم سعادت ہے۔ ذکر اللہ سے بڑھ کر کوئی چیز روح کو روشنی بخشنے والی نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ان لکل شئ صقالۃ وصقالۃ القلوب ذکر اللہ کہ ہر زنگ آلود شئ کے واسطے ایک طریقہ صیقل کرنے اور مانجھ کر صاف و چمکدار بنانے کا طریقہ ہوتا ہے اور دلوں کو صیقل کرنا ذکر اللہ سے ہے۔

کیونکہ انوارِ الٰہیہ سے بڑھ کر کوئی چیز قوی اور مؤثر نہیں - اور روح سے زائد کوئی چیز لطیف و متاثر نہیں۔ جب مادیات میں یہ چیز مشاہد ہے ایک چیز دوسری چیز میں مل کر اس کو اپنے اثر سے متاثر بنا لیتی ہے اور اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے جیسے زعفران پانی میں مل کر اپنی رنگت، وخوشبو سے پانی کو خوشبودار بنا دیتا ہے۔ گلاب اور چنبیلی کے پھول پانی میں پڑنے کے بعد اپنی خوشبو سے اس کو معطر کر دیتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ذکرِ الٰہی کے انوار و برکات بھی قلب میں سرایت کر کے رُوح کو اپنے رنگ میں رنگ دیں گے۔

ذکرِ اللہ میں مشغول و مصروف رہنے والے بندوں کو خداوند عالم نے اس طرح یاد فرمایا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ (آل عمران)	جو لوگ اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور غور و فکر کرتے ..... ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے" اللہ کا ذاکر بندہ غافلوں کے درمیان ایسا ہے جیسا جہاد کرنے والا مجاہد بھاگنے والوں کی صف کے پیچھے اور اللہ کا ذاکر بندہ غافلوں کے درمیان ایسا ہے جس طرح کہ سرسبز ٹہنی سوکھے ہوئے درخت میں - یا شاداب درخت سوکھے درختوں کے درمیان - اور ذاکرِ اللہ ایک روشن چراغ ہے تاریک مکان میں[1]

بہرکیف ذکرِ اللہ قلب اور رُوح کی غذا ہے اسی سے قلوب کو سکون و طمانیت حاصل ہوتی ہے: اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۔

ذکرِ اللہ کی بدولت انسان تمام احکامِ خداوندی کی اطاعت و پیروی کرنے لگے گا اور ہر گناہ اور فسق و فجور سے بچا رہے گا۔ ظلم و فساد اور سرکشی جیسے عیوب و گندگیوں سے پاک رہے گا۔ کیونکہ ہر عملِ خیر اور سعادت کا سرچشمہ اللہ کی یاد ہے۔

[1] یہ مضمون حدیث ابن عباس رضہ کا ہے جس کو امام رزین نے روایت فرمایا۔ مشکوٰۃ المصابیح جلد ۱

اور ہر خطا و معصیت سے بھی بچانے والی یہی چیز ہے۔ اس سعادت سے آگے پر بھی توفیق ہوگی کہ دلائل قدرت میں غور و فکر کرتے ہوئے حق تعالیٰ کی عظمت و ہیبت اور محبت قلب و دماغ کی گہرائیوں میں سرایت کر جائے۔

انسانی زندگی میں توکل علی اللہ کا مقام

یعنی ہر ایک کام اور ہر حال میں اسی کے دست قدرت کا نگران رہنا اور اسی پر بھروسہ کرنا۔ مادی اسباب اور ظاہری وسائل سے نظریں ہٹا کر مسبب الاسباب اور خالق کائنات اور اسی کی قدرت پر بھروسہ و اعتماد کرنا توکل کی حقیقت ہے۔ اس نعمت کو جو شخص حاصل کرے گا سمجھ لیجیے کہ اس نے سب کچھ حاصل کر لیا جیسے ارشاد مبارک ہے:

وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے گا بس خدا ہی اس کو کافی ہے۔

انسان دنیوی زندگی میں طرح طرح کے افکار و آلام اور پریشانیوں میں صرف اسی وجہ سے مبتلا ہوتا ہے کہ وہ توکل جیسے پاکیزہ وصف سے محروم ہے۔ مختلف قسم کے ہنگامے فساد ظلم تعدی اور حق تلفی و خیانت کے واقعات اسی بناء پر دنیا میں واقع ہوتے رہتے ہیں کہ مادی اسباب و وسائل ہی اصل کارفرما اور مؤثر بالذات قرار دے لیا جاتا ہے اسی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اخلاق و اعمال اور معاملات کی خرابیوں میں پڑنے کے ساتھ مشرکانہ اعتقاد سے اپنے دین و ایمان کو بھی تباہ کرتا ہے۔

انسانی زندگی میں شکر کا مقام

یعنی حق تعالیٰ کی نعمتوں پر زبان و دل اور عمل سے شکر گزار رہے قرآن کریم نے بڑی اہمیت کے ساتھ تہذیب نفس کے اس شعبہ کی تعلیم دی کیونکہ تمام عملی

اور اخلاقی محاسن کا سرچشمہ ہے اور اس کے برعکس ناشکری تمام دنیا کے عقلاء کے نزدیک نہایت مذموم اور بدترین وصف ہے اور قسم قسم کی خرابیوں اور بداعمالیوں کی بنیاد ہے۔

وصف شکر کی نافعیت و افادیت قرآن کریم کے یہ الفاظ کر رہے ہیں:

وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ (سُورَۃ النمل)	اور جو شخص شکر کرے گا تو وہ صرف اپنے ہی نفع کے لیے شکر کر رہا ہے۔ اور جو ناشکری کرے تو سن لو بے شک میرا رب بے نیاز اور کریم ہے (اور کسی کے شکر کی ضرورت نہیں ہے۔ شکر کے منافع اور فوائد خود شاکر ہی کی طرف لوٹیں گے جن کو ہر شخص محسوس کرسکتا ہے۔

حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو بار بار اس بات کی دعوت دی کہ وہ انعامات خداوندی پہچانیں اور ان نعمتوں کا شکر اور حق ادا کریں لیکن افسوس کہ ناشکری اور بغاوت کی روش نے ان کو طرح طرح کے مصائب و آفات میں مبتلا کیا اور قہر و عذاب خداوندی نے تباہ و برباد کر ڈالا۔ انسان کو ناشکری کی خصلت پر ہی قرآن کریم میں ظَلُوْمٌ وَكَفَّارٌ کے لقب سے تعبیر کیا گیا۔

منعم حقیقی کی نعمتوں پر شکر ایک ایسا عالی اور بلند ترین وصف ہے کہ خداوند عالم نے اپنے برگزیدہ پیغمبر اور ان کے خاندان کو اس طرح مخاطب فرمایا: اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا عمل کرو اے داؤد اور خاندان داؤد شکر کا اور وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ (سبا) بہت کم ہیں میرے بندوں میں سے شکر گذار بندے۔

لہ لام لنفسہٖ میں نفع کے لیے ہے کیونکہ وضع لغت میں لام انتفاع کے معنی کے لیے موضوع ہے۔ اسی وجہ سے ترجمہ میں یہ لفظ ذکر کیا گیا کہ وہ اپنے ہی نفع کے لیے۔ ۱۲

اور اسی وجہ سے کہ وصف شکر بہت سے محاسن اور خوبیوں کا سرچشمہ ہے حضرت سلیمان علیہ السلام نے خاص دعاؤں میں یہ بھی فرمایا:

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ (سورۃ النمل)

اے میرے پروردگار تو مجھ کو اس بات کی توفیق دے اور یہ بات میرے حصہ میں کر دے کہ میں تیری ہر اس نعمت کا شکر کروں جو تو نے مجھ پر فرمائی اور اس انعام کا بھی جو میرے ماں باپ پر تو نے کیا۔ اور یہ کہ میں ایسا صالح عمل کروں جس کو تو پسند کرے۔ اور اے اللہ تو مجھ کو داخل کر دے اپنے صالح اور نیک بندوں میں

صبر حیات انسانی کے لیے معیار کمال ہے

مصائب و تکالیف کا تحمل اور ان کی برداشت انسانی کمالات میں بہت ہی بلند پایہ کمال شمار کیا جاتا ہے۔ صبر کا مفہوم عملی زندگی کے تمام شعبوں کی تکمیل کا ضامن ہے۔ صبر فرائض و ذمہ داریوں کی پابندی بھی ہے اور تکالیف و مصائب کا تحمل بھی اور صبر نفسانی شہوتوں اور دنیوی لذتوں سے بھی کنارہ کشی ہے۔ اور اس کے ساتھ معاصی اور گناہوں سے اجتناب و پرہیز بھی۔ اس بنا پر ظاہر ہے کہ تہذیب نفس میں صبر کا مقام نہایت بلند ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کریم نے صابرین کا اجر و ثواب بے حساب و بے پایاں فرمایا جیسا کہ ارشاد ہے:

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔

کہ صابرین کو اجر بے حساب ہی دیا جائے گا۔

وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ کی آیت مصائب و تکالیف اور فقر و تنگ دستی میں صبر کرنے والوں کی منقبت و فضیلت بیان کر رہی

وصف صبر ہی ایک ایسا خاص وصف ہے جو انسان میں تقدیر خداوندی پر رضا و خوشنودی اور سکون و طمانیت کی کیفیت پیدا کرتا ہے جس کا ثمرہ یہ ہوگا کہ انسان اس حقیقت اور راز کو سمجھ جائے گا کہ دنیا میں پیش آنے والی تکالیف و پریشانیاں خود اپنے اعمال کا نتیجہ ہے اور اس پر وہ آخرت کے اجر و ثواب کا امیدوار رہے گا۔ اور اس کے جذبات و احوال اس آیت کی ترجمانی کرنے لگیں گے:

مَا اَصَابَکُمْ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَ یَعْفُوْ عَنْ کَثِیْرٍ۔	اے لوگو! جو بھی مصیبت تم کو پہنچتی ہے، وہ تمہارے کیے اعمال ہی کی وجہ سے ہے اور اللہ تعالیٰ بہت سی باتیں معاف فرما دیتا ہے۔

دوسرے موقعہ پر فرمایا:

وَمَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ یَھْدِ قَلْبَہٗ۔	اور نہیں پہنچتی ہے تم کو کوئی بھی مصیبت مگر اللہ ہی کے حکم سے اور جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے قلب کو ہدایت فرماتا ہے۔

قلب کی ہدایت بھی صبر و سکون اور تقدیر خداوندی پر ایمان و رضا کی کیفیت ہے۔ انسان پر دو حالتیں ایسی واقع ہوتی ہیں کہ جن میں وہ غافل ہو جاتا ہے ایک حالت نعمت۔ اس میں آدمی مست اور مغرور ہو جاتا ہے۔ دوسری حالت مصیبت کہ جس میں انسان ناامید ہو کر رشتۂ محبت و اخلاص توڑ ڈالتا ہے۔ صبر کی تعلیم میں دونوں کی اصلاح مضمر ہے۔ اسی کو فرمایا:

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَیْھِمْ وَلَا تَكُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْكُرُوْنَ	اور صبر کرو (اے ہمارے پیغمبر) اور نہیں ہے آپ کا صبر مگر اللہ ہی کی طرف سے اور نہ ان پر غم کیجیے اور نہ تنگدل ہو کافروں کے ان حیلوں اور مکر سے جو وہ

(سُورَةُ النّحل) کر رہے ہیں۔

صداقت و راستی

تہذیب نفس میں صداقت و راستی بھی بنیادی مقام رکھتی ہے۔ اس خصلت کے بغیر انسان کسی بھی قیمت کا نہیں شمار کیا جا سکتا۔

صداقت و راستی کی حقیقت ہر قول و فعل میں سچائی کی پابندی ہے۔ خواہ کوئی معاملہ خدا کے ساتھ یا بندوں کے ساتھ۔ جب تک زندگی کے ان دو پہلوؤں کو تمام افعال و اقوال میں سچائی کا پابند نہیں بنایا جائے گا۔ صداقت کے وصف اور کمال سے متصف نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی افراد کے حق میں فرمایا گیا:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔

مقام صداقت کی عظمت و برتری کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ خداوند عالم صدیقین کا درجہ انبیاء کے بعد فرمایا جیسے کہ ارشاد ہے "اُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ"

اور اہل ایمان کو حق تعالیٰ نے تقویٰ کے حکم کے ساتھ صادقین (سچوں) کے ساتھ ہونے کا امر فرمایا، ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ۔ (توبہ) اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔

جن کمالات و فضائل اور محاسن اخلاق کے باعث حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ پر سلسلۂ آغاز وحی اور خلعت رسالت کے عطا ہونے پر آپ کی نبوت و رسالت کا یقین اور امر رسالت میں پوری طرح کامیابی پر اعتماد و بھروسہ کیا ان میں وصف صداقت کو بھی بیان فرمایا جیسے کہ حدیث صحیح بخاری

اور صحیح مسلم میں یہ کلمات مذکور ہیں :

اِنَّكَ لَتَصْدُقُ الْحَدِيْث کہ بیشک آپ بات سچ کرتے ہیں۔

تو معلوم ہوا کہ صداقت کمالات نبوت میں سے ایک عظیم تر کمال ہے اور دنیوی حیات اور اخروی زندگی میں بھی صداقت ہی معیار کامیابی ہے کیونکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کَلَّا وَاللّٰهِ لَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا ۔ یا رسول اللہ ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا جو خوف و ہراس آپ کے قلب میں پیدا ہو رہا ہے ۔ خدا کی قسم اللہ رب العزۃ آپؐ کو ہرگز کبھی ناکام نہیں کرے گا ۔ اور پھر اپنے اس دعوے پر جو دلائل ذکر کیے ان میں یہ لفظ بھی فرمایا اِنَّكَ لَتَصْدُقُ الْحَدِيْث (کیونکہ آپ سچ بات کرتے ہیں اور سچے ہیں)

زہد و تقویٰ اور قناعت

دین و دُنیا کی تمام بھلائیاں اور کامیابیاں زہد و تقویٰ اور قناعت ہی میں مضمر ہیں ۔ دُنیا کی حرص ایک بدترین خصلت ہونے کے ساتھ طرح طرح کے فساد اور فتنوں اور بُرائیوں کا پیش خیمہ اور ذریعہ ہے ۔ دُنیا کی لذتوں اور شہوتوں کا دلدادہ ہونا قلب و دماغ کو گندہ اور اعمال و اطوار کو خبیث و پلید کر دینے والی چیز ہے ۔ قرآن کریم نے سینکڑوں آیات میں تہذیب نفس کے اس شعبہ کو کہیں اجمال سے اور کہیں تفصیل سے کسی موقعہ پر واقعات وقصص اور تاریخی حقائق کی روشنی اور کسی جگہ عبرت ناک مثالوں کے ضمن میں بیان فرمایا ہے ۔ اس مضمون کے لیے بطور متن یہ آیت مبارکہ سمجھی جاسکتی ہے :

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا	اے لوگو! یہ بات جان لو کہ دُنیا کی زندگی
لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّ	بس ایک کھیل اور تماشا ہے اور بناؤ سنگار
تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي	اور ایک دوسرے سے بڑائی اور شیخی اور ایک
الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۔ (الحدید)	دوسرے سے مال و اولاد میں بڑھنے کی خواہش

گویا انسانی زندگی کے جملہ اطوار و ادوار خواہ بچپن ہو یا جوانی یا بزرگی ہر ایک دور میں دنیا کی جو حقیقت ہو اس کو ان کلمات میں واضح فرما دیا۔ ایک دوسرے موقعہ پر اس عنوان سے اس حقیقت کو بیان فرمایا:

اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ۔ — یہ دنیا کی زندگی صرف چند روزہ مزہ ہے اور ہمیشہ رہنے کا گھر تو آخرت ہے۔

اور ارشاد فرما دیا گیا کہ مال و اولاد صرف دنیوی زینت ہے اور دراصل پائیدار اور باقی رہنے والی چیز تو اعمال صالحہ ہیں۔ انہی پر امید کی نظریں لگائی جا سکتی ہیں۔ دنیا کی کوئی چیز پائیدار و باقی رہنے والی نہیں ہے اور نہ اس سے کوئی امید فلاح و خیر کی ہے اور پروردگار کے یہاں نجات و کامیابی کی امید قائم کی جا سکتی ہے۔ دنیا فانی ہے جس میں کوئی صاحب عقل تردد نہیں کر سکتا تو ظاہر ہے کہ اس سے زائد اور کونسی حماقت و غلطی ہو سکتی ہے کہ انسان باقی اور کارآمد نعمت کو چھوڑ کر فانی اور ناپائیدار چیز اختیار کرلے۔

غرض قرآن کریم نے اس موضوع کو بڑی عظمت اور اہمیت کی قرآن کریم کے تمام حصوں میں بیان فرمایا۔ دنیوی حیات کی ناپائیداری اور اس کا مخض نقش برآب اور حباب کی طرح ہونا نہایت ہی موثر اور لطیف انداز میں دلائل و حقائق کی روشنی میں بار بار ذکر کیا گیا انہیں آیات میں سے ایک جامع ترین آیت یہ بھی ہے:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا۔ — اور آپ بیان کر دیجیے ان لوگوں سے دنیوی زندگی کی مثال، کہ بس اس کی حالت ایسی ہے کہ ہم نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس پانی کے ذریعے زمین کے نباتات دسبزے خوب گنجان ہو گئے۔ پھر وہ (بعد اس کے کہ ترو تازہ اور شاداب تھے،

خشک ہوکر) ریزہ ریزہ ہوگئی ۔ جس کو
ہوائیں لیے اُڑتے پھرتی ہیں (یہی حال بس
دنیوی زندگی کا ہے ۔ آج یہ حیات دُنیا سرسبز
و شاداب اور ہری بھری نظر آرہی ہے لیکن
کل اس کا کوئی نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا
جس طرح آج لہلہاتی ہوئی کھیتی شاداب اور
نظروں کو بھلی معلوم ہوتی ہے مگر خشک ہونے پر
کٹ کر ریزہ ریزہ ہوجائے گی ۔ اور ہوائیں
اس کے ریزوں کو اُڑاتے پھرتی ہوں گی ۔)
اور بے شک اللہ رب العزت تو ہر چیز پر
بڑی ہی قدرت والا ہے ۔

(سورۃ کہف)

دُنیا کی اسی حقیقت کو سمجھانے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نصیحت فرمائی
کن فی الدنیا کانك غریب او عابر سبیل کہ تو دُنیا میں اس طرح زندگی
بسر کر گویا تو ایک مسافر ہے یا راستہ طے کرنے والا ہے[1] ۔

اِعتبار و تذکر

یعنی گزشتہ واقعات اور امم سابقہ کی تاریخ اور احوال سے عبرت و نصیحت
حاصل کرنا تہذیب نفس میں یہ چیز بھی بہت دخیل ہے کہ انسان گذری ہوئی
قوموں کے واقعات کو محض تاریخ کے اوراق پارینہ نہ سمجھے بلکہ اصل سعادت یہ ہے

---

[1] تہذیب نفس کے شعبوں میں یہ شعبہ اور اس کے ساتھ دوسرے ان بیان کردہ شعبوں
کی تفصیل و توضیح کے لیے احیاء العلوم امام غزالی و دیگر عارفین و آئمہ کی کتابوں اور
کتب حدیث کی مراجعت فرمائی جائے ۔ یہاں ان شعبوں کا ذکر صرف ایک اجمالی فہرست
کے درجہ میں ہے ۔ اس سے زائد کسی تفصیل کی گنجائش نہیں ۔ ۱۲

کر ان پر غور و فکر کرکے عبرت و نصیحت حاصل کرے۔ اور گذشتہ تاریخ میں نیک و بد اعمال پر مرتب ہونے والے آثار و نتائج کو دیکھ کر اس امر کا یقین کرے کہ ہمارے نیک و بد اعمال و اطوار بھی یقیناً انہی نتائج و ثمرات کا باعث ہوں گے۔ قرآن کریم نے اسی مقصد کے لیے گذری ہوئی قوموں کے واقعات بیان کیے تاکہ ان کو پڑھنے اور سننے والے اپنی حالتوں کا خود اندازہ لگالیں۔ بار بار ایسے واقعات کو عبرت کی نگاہوں سے دیکھنے اور غور و فکر کے کانوں سے سننے اور عقلی صلاحیتوں سے ان پر نتائج و ثمرات اخذ کرنے کی دعوت دی گئی اور ہر موقعہ پر یہ تصریح فرمائی گئی اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَلْبَابِ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات اور فرعون کی فرعونیت کے احوال متعدد جگہ ذکر فرمائے۔ اس سلسلہ میں کسی جگہ فرعونیوں کے ظلم و ستم بیان کرکے بنی اسرائیل کو ان سے خلاصی اور چھٹکارا دینے کی نعمت کا اظہار مقصود ہے۔ کہیں فرعون کی سرکشی اور خدا کے پیغمبر کے ساتھ مقابلہ کرنے کا انجام تباہی اور غرق کر دیا جانا مقصد بیان ہے جس کے ذریعے قریش مکہ کو متنبہ کرنا تھا کہ اگر تم نے بھی سرکشی کا یہی وطیرہ اور طرز اختیار کیے رکھا جو فرعون کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھا تو تم بھی اسی نوع کی تباہی اور بربادی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ پھر اس ضمن میں اہل ایمان کو صبر و تسلی کا سبق اور استقامت و تحمل کی تعلیم بھی ہے کہ انجام کار کامیابی اللہ کے پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والوں ہی کو حاصل ہوگی حق تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ نافرمانوں اور پیغمبر خدا کا مقابلہ کرنے والوں کو کچھ عرصہ مہلت اور ڈھیل دیتا ہے۔ پھر ناگہاں ان پر قہر خداوندی ایسا مسلط ہوتا ہے کہ دم بھر میں وہ ساری شان و شوکت اور عزت و سلطنت پامال ہو جاتی ہے، اور اس قوم کا دنیا سے نام و نشان ہی مٹ جاتا ہے حتیٰ کہ ان کا وجود صرف تاریخی واقعات بن کر رہ جاتے ہیں۔ اور خداوند عالم اس ظالم و جابر اور طاقتور قوم کے مال اور ملک و سلطنت کا انہی لوگوں کو وارث بنا دیتا ہے

جو آج تک ان کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے اور جو حقیر و ذلیل اور پست شمار کیے جاتے تھے ان ہی کو عزت و سر بلندیوں کا مالک بنا دیتا ہے۔

جیسے کہ ارشاد خداوندی ہے:

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا۔

اور وارث بنا دیا ہم نے اس قوم کو جو ضعیف اور کمزور سمجھے جاتے تھے زمین کے مشرق و مغرب کے ان کناروں کا جن میں ہم نے بڑی بڑی برکتیں رکھی تھیں۔

(سورۃ اعراف)

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ۔

اور کس قدر چھوڑے ہیں ان فرعونیوں نے اپنی ہلاکت کے بعد باغات اور چشمے اور شاداب کھیتیاں اور عمدہ و عالی شان مکان اور عیش و راحت کے وہ سامان جن میں وہ مست تھے۔ بات یوں ہی ہے (خدا کی طرف سے طے کردہ) اور وارث بنا دیا ہم نے ان چیزوں کا ایک دوسری قوم کو۔

(سورۃ الدخان)

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا

اور ہم ارادہ کر رہے ہیں اس بات کا کہ احسان کریں اور نوازیں ان لوگوں کو جو سرزمین مصر میں حقیر و کمزور سمجھے گئے۔ اور ہم اب انہی کو امام و پیشوا بنائیں گے یعنی اقتدار و سلطنت انہی کے حوالہ کی جائے گی اور انہی کو فرعونیوں کا وارث بنائیں گے اور ملک میں ان کو قدرت دیں گے اور دکھا دیں گے ہم فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو وہ چیز جس سے وہ ڈر رہے تھے

(سورۃ القصص)

بہرکیف اس طرح واقعاتِ اُمم اوران کے تباہی و بربادی کے عبرتناک واقعات سے مخاطب کو یہ بات باور کرادیں گے کہ درحقیقت کائنات کا مالک وہی پروردگار ہے اسی کے قبضہ قدرت میں یہ سب کچھ ہے اس لیے اصل فلاح وکامیابی اوراسی رب کی اطاعت و فرمانبرداری اوراس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں ہے۔

علم التواضع

تہذیب نفس کے شعبوں میں یہ علم بھی نہایت اہم ہے کیونکہ انسانی زندگی کے کمالات اور محاسن تواضع کے بغیر مکمل نہیں ہوتے۔ تواضع کی حقیقت یہ ہے کہ انسان گفتار و رفتار نشست و برخاست لباس وضع وقطع کے وہ تمام آداب ملحوظ رکھے جن کی رعایت سے انسانی زندگی نہایت ہی شائستہ اور قابلِ تحسین زندگی ہو۔ وہ اپنے اس خلق کی وجہ سے ہر دوسرے کو اپنے سے بہتر سمجھے۔ اور دوسرے کی عزتِ نفس اور عظمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے برتاؤ کرے۔ جس کا نتیجہ لامحالہ یہی ہے کہ اس وصف کا مالک دوسروں کے نظروں میں عزیز ومحبوب ہوگا۔ اور عظمت و برتری کا مقام حاصل کرے گا۔ اسی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، مَا تواضع عبدٌ للہ اِلَّا رفع اللہ بہ درجۃ، کہ ہو بھی بندہ اللہ کے لیے تواضع اور فروتنی اختیار کرے گا اللہ اس کو اور زائد بلند رتبہ والا بنائے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص کمالات میں خلق عظیم بیان فرمایا گیا اوراس کا حاصل تواضع حلم و بردباری ہی ہے۔ بلکہ آپؐ کے یہ عادات اورخصائل حمیدہ کتب سماویہ مثلاً تورات میں آپؐ کی نشانیوں اورعلامات کے طور پر بیان کی گئی ہیں۔ تواضع نرمی اخلاق اور محاسن آداب کے آپؐ ایک اعلیٰ ترین پیکر تھے۔ فرمایا گیا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔ (سورۃ آل عمران)

اللہ ہی کی یہ بڑی رحمت ہے کہ اس کے باعث آپ ان لوگوں (صحابہ) کے لیے نرم مزاج ہیں اور اگر آپ سخت مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے اردگرد سے منتشر ہوجاتے اور دور رہتے۔

قرآن کریم نے تہذیب نفس کے اس شعبہ کو بھی بڑی اہمیت کے ساتھ بیان فرمایا۔ شعبہ طہارت کے تحت قدرے وضاحت پہلے گذر چکی۔

توبہ واستغفار

انسانی سعادت کا اصل راز یہی ہے کہ وہ اپنی غلطی اور خطا کو محسوس کرے اس پر نادم وشرمسار ہو اور پھر یہ عزم کرے کہ آئندہ وہ اپنی زندگی میں اس خطا وقصور کا اعادہ نہیں کرے گا۔ اسی حقیقت کو شریعت کی زبان میں استغفار وتوبہ کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فلاح وکامیابی اس راز کو قرآن کریم نے اس طرح ظاہر فرمایا:

وَتُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (سورۃ نور)

اور اے مومنو! تم سب کے سب اللہ کی طرف رجوع کرو گناہوں سے تائب ہوتے ہوئے امید ہے کہ تم فلاح وکامیابی حاصل کرلوگے۔

ظاہر ہے کہ انسان میں یہ وصف ایک بڑا کمال ہے۔ اور بے شمار محاسن اور خوبیوں کا ذریعہ ہے اور یہ امر عقلی اور طبعی ہے کہ جس انسان میں احساس خطا اور اس پر ندامت کا جوہر نہیں وہ درحقیقت انسانی شرف ہی سے محروم ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کا یہی وہ وصف ندامت وشرمساری تھا کہ ایک نوع کی چوک اور لغزش پر بے قرار ہوکر حق تعالیٰ کی بارگاہ میں طالب عفو ہوئے

اور تضرع وزاری کے ساتھ فرمانے لگے:

"رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ" جس پر حق تعالیٰ کی طرف سے انابت و رحمت کا مقام حاصل ہُوا، جس کو فرمایا گیا:

فَتَلَقَّى آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ۔

(سورۃ بقرہ)

پس تلقی کی اور حاصل کیے آدمؑ نے اپنے رب کی طرف کچھ کلمات (یعنی وہ دعائیہ کلمات جو آہ وزاری کے ساتھ معافی طلب کرنے کے لیے ان کی زبان سے جاری ہوتے ہوئے) تو اللہ نے ان کی طرف توجہ فرمائی بے شک وہ تو اپنے بندوں کی طرف بڑی توجہ فرمانے والا (اور ان کی توبہ قبول کرنے والا بڑا ہی مہربان ہے۔

توبہ واستغفار انسانی فطرت کا تقاضہ ہے

غرض آدم علیہ السلام کی اس خصلت و سرشت نے کہ لغزش و چوک ہوجانے پر ندامت و شرمندگی کے ساتھ توبہ و استغفار میں مصروف و مشغول ہُوئے یہ بتادیا کہ درحقیقت خطا اور غلطی پر شرمندہ ہو کر معافی کا طالب ہونا انسانیت کا امتیاز شرف اور خاصہ ہے۔ اس کے برعکس غلطی اور قصور پر دلیر و جری ہونا اور اعتراف قصور کے بجائے حیلے بہانے اور تاویل کا طریقہ اختیار کرنا ابلیس کی میراث ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے ابلیس سے جب یہ فرمایا:

مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ کہ اے ابلیس جب تجھ کو میں نے آدم کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو تجھ کو تعمیل حکم سے کیا مانع پیش آیا تو ابلیس بجائے

اس کے کہ اپنے قصور پر شرمندہ ہوتا اور معذرت چاہتا اپنے قصور کی تاویل کرتے ہوئے بولا

أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَّخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ۔[1]

کہ اے پروردگار میں تو اس (آدم) سے بہتر ہوں کیونکہ تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔

گویا ابلیس نہ صرف یہ کہ اپنے قصور کی تاویل کر رہا ہے بلکہ سرے سے حق تعالیٰ کے حکم "اسْجُدُوْا لِآدَمَ" ہی پر اعتراض ہے کہ یہ حکم خلافِ عقل ہے۔ اسی کا یہ ثمرہ ہے کہ جن بدبختوں کے قلب و دماغ میں ابلیسی اثرات سرایت کیے ہوئے ہوتے ہیں وہ احکامِ خداوندی پر اسی رنگ کے اعتراضات اور قیل و قال و حجت بازی کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ معلوم ہوا توبہ و استغفار صرف یہی نہیں کہ تہذیبِ نفس کا عظیم ترین شعبہ ہو بلکہ وہ آدمیت کا شرف اور انسانی فضیلت کا معیار ہے۔

---

[1] شیطان نے اپنے قصور کی تاویل تو ایک منطقیانہ انداز میں اختیار کی لیکن اس امر کا اس کو احساس نہ ہوا کہ اس کا یہ استدلال خلافِ عقل اور ناقابلِ تسلیم ہے کیونکہ اس کا یہ دعوائے خیریت اس وقت مسموع ہو سکتا جب کہ دراصل عنصرِ نار عنصرِ تراب مٹی سے بہتر ہوتا۔ حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ عنصرِ تراب کا آگ سے افضل اور بہتر ہونا مسلمات میں سے ہے۔ آگ صرف کسی چیز کو جلاتی اور پکاتی ہی ہے لیکن مٹی کل نباتات غلّوں پھلوں پھولوں کی پیدائش اور نشوونما کا معدن و خزانہ ہے۔ کل مخلوق کا رزق اللہ زمین ہی سے پیدا کرتا ہے۔ پھر زمین کی تہوں میں اور اس کے کلیجہ کے ٹکڑوں میں ہزاروں انواع و اقسام کے خزانے معدنیات، سونے چاندی ہیرے جواہرات ہیں۔ پھر عقلی نقطۂ نظر سے بھلا ابلیس کو کیسے یہ حق پہنچتا تھا وہ صرف ناری مخلوق ہونے کی وجہ سے آدم خلیفۃ اللہ پر ان کے مٹی سے پیدا ہونے کی بنا پر فضیلت و برتری کا دعویٰ کرے۔ آدم صرف عنصرِ تراب ہی تو نہ تھے بلکہ وہ عناصرِ اربعہ کی ترکیب سے مخلوق تھے۔ ان کے خمیر میں مٹی کے ساتھ پانی بھی تھا وہ اجوف تھے۔ ان کی ہیئت کذائیہ میں ایک خلا تھا جس میں ہوا کا عنصر رکھا گیا۔ پھر جب ان میں نفخِ روح فرمایا گیا تو اسی کے ساتھ انسانی مزاج میں قوتِ غضبیہ جو ایک وصف لازم ہے وہ بھی جمع کر دیا گیا تو اس طرح تخلیقِ آدم میں عناصرِ اربعہ کا اجتماع ہو گیا۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے بندوں کو توبہ و استغفار کے حکم کے ساتھ یہ اعلان فرمادیا:

وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا۔ (سورۃ طٰہٰ)
اور بے شک میں مغفرت کرنے والا ہوں اپنے ان بندوں کی جو تائب ہوں اور ایمان لاکر عمل صالح کریں۔

هُوَالَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّئَاتِ (سورۃ شوریٰ)
وہی پروردگار ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور درگذر فرماتا ہے بہت سی برائیوں سے۔

علاوہ ازیں توبہ و استغفار اور بھی بہت سے کمالات اور خوبیوں کا سبب ہے مثلاً اس کی بدولت انسان میں عجز و تواضع کی خوبی پیدا ہوگی۔ خدا کی عظمت و ہیبت اور خشیت بھی لامحالہ حاصل ہوگی جو بے شمار اعتقادی عملی اور اخلاقی نیز معاشرت و معاملات کی خوبیوں کو متضمن ہے۔ اللہ کی رحمت کی اُمید و رجا بھی حاصل ہوگی۔ پھر جب بندہ تضرع و زاری کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں دعا کرے گا تو اس پر عنایات و رحمتوں کا بے پایاں سلسلہ شروع ہوجائے گا کیونکہ حق تعالیٰ کو اپنے بندہ کا عجز اور نیازمندی اور اس کی بارگاہ میں تضرع بہت ہی محبوب ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو حدیث قدسی میں فرمایا گیا انین المذنبین احب الی من تسبیح المذلین، یعنی گناہگاروں کی آہ و زاری حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے مطیعین کی تسبیح سے بھی زیادہ محبوب ہے کیونکہ بسا اوقات اس تضرع و ابتہال میں اللہ کا قرب اور خشیت کا وہ مقام حاصل ہوجاتا ہے جو برسوں کی طاعت سے نہیں حاصل ہوتا۔

ایسی ہی توبہ کرنے والوں کو فرمایا گیا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ۔

غرض استغفار و توبہ پر حق تعالیٰ کا قرب نصیب ہوتا ہے اور اس کی خاص

رحمت اور مودّت و مہربانی بھی، جیسے حضرت شعیب علیہ السلام کا قول قرآن کریم نے نقل کیا:

یَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ۔ تو اس آیت مبارکہ میں توبہ و استغفار کو خدا تعالیٰ کی رحمت اور محبت و مہربانی کا ذریعہ فرمایا گیا۔

عبودیت و بندگی کا اعلیٰ مقام تذلل اور پستی ہے اور یہی تذلل و پستی اللہ کے یہاں سب سے زائد قرب کا ذریعہ ہے۔ اسی وجہ سے ارشاد فرمایا گیا:
"اَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَّبِّهٖ وَهُوَ سَاجِدٌ"۔ یعنی سب سے زائد قرب بندہ کو اپنے ربّ سے اس وقت حاصل ہوتا ہے جب کہ وہ سربسجود ہو کیونکہ سجدہ سے زائد تذلل اور پستی کا کوئی درجہ نہیں اسی بنا پر اس کو سب سے زائد قرب کا مقام فرمایا گیا۔

تہذیب نفس کے شعبے انسان میں صلاحیت وسعادت کے جملہ کمالات پیدا کرتے ہیں لہٰذا اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان اپنی ذاتی صلاحیتوں کے بعد دوسروں کی اصلاح اور اعمال و اخلاق کی درستگی کی فکر اور جدّوجہد میں لگا رہے۔ کیونکہ تہذیب نفس نظام صلاح و اصلاح قائم کرنے ہی کا نام ہے۔ اس وجہ سے اس کی تکمیل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (یعنی بھلائیوں کے حکم اور ان کی تبلیغ و اشاعت اور برائیوں سے روکنے) ہی سے ہوسکتی ہے بلکہ اس وصف کو خیر امت ہونے کا معیار فرمایا گیا۔ جیسے ارشاد ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ کہ تم بہترین اُمّت ہو جو دنیا والوں کے لیے پیدا کی گئی اس حال میں کہ تم امر بالمعروف کرتے ہو اور نہی عن المنکر۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ حسن تمدّن اور اصلاح معاشرہ کی حقیقی رُوح یہی نظام اصلاح کا جاری کرنا ہے جس کا نام شریعت کی اصطلاح میں امر بالمعروف

اور نہی عن المنکر ہے تو اس غرض اور فوز و فلاح کا بلند ترین مقام حاصل کرنے کے لیے قرآن کریم نے متعدد مقامات پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصول اور اس کی ذمہ داریوں کو بیان کیا

اور ایک جگہ انسانی زندگی کو ہلاکت و خسران سے بچانے والے جن اصول و ہدایات کو ذکر فرمایا ان میں تواصی بالحق یعنی عمل صالح کے بعد دوسروں کے حق کی تلقین و ترغیب بیان فرمائی گئی چنانچہ ارشاد ہے :

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ (سورۃ والعصر)	قسم ہے زمانہ کی بے شک انسان خسارہ میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک کام کیے اور حق پر قائم رہنے اور صبر و استقامت کی ایک دوسرے کو ہدایت کرتے رہے ۔

ان مختصر کلمات نے یہ واضح کر دیا کہ انسان کے سعادت کے گویا دو بازو ہیں جن سے وہ اُڑ سکتا ہے اول درستی اعتقاد یعنی تکمیل قوت نظریہ اس پر لفظ آمنوا دلالت کر رہا ہے ۔ دوسرا بازو اعمال صالحہ ہیں ، یعنی قوت عملیہ کی تکمیل جس پر عملوا الصّالحات دلالت کر رہا ہے تو حکمت نظریہ اور عملیہ کی تکمیل انسان کو خود اپنی ذات سے باکمال بنا دے گی لیکن اصل فوز و فلاح کا حصول اور خسران و ہلاکت سے مجموعی طور پر امت کا محفوظ رہنا صرف اسی حد تک محدود نہیں کہ انسان خود کامل بن جائے بلکہ پورا کمال یہ ہے کہ خود کامل ہو کر دوسروں کو بھی باکمال بنانے کی فکر اور جد و جہد کرے ۔ خدا کے تمام پیغمبروں کی زندگیاں دنیا کو رشد و ہدایت کی طرف لانے اور ان کو باکمال بنانے کی محنت ہی میں گذری ہیں ۔

غرض تہذیب نفس کے اس اصلاحی شعبہ کو قرآن کریم نے نہایت ہی عظمت و اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ (تفصیل کے لیے کتب تفسیر کی مراجعت فرمائی جائے)

عِلم تدبیر منزل

علم التحلیہ کے تحت جو شعبے اب تک بیان کیے گئے وہ تہذیب نفس کے ایسے شعبے ہیں جو انسان کی انفرادی عملی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں جن کو صرف اصولی اور اجمالی درجہ میں ذکر کیا گیا اور بطور استشہاد و استدلال بعض آیات صرف تمثیل و توضیح کے لیے بیان کردی گئیں۔ تہذیب نفس کے ان شعبوں کی تحقیق و تفصیل کے لیے تو ایک ایک عنوان ایک مستقل مقالہ کا متقاضی ہے جو پیش نظر کتاب کے محدود اوراق میں نہیں سما سکتا۔

ان کے علاوہ قرآن کریم نے قوت عملیہ کے ایک دوسرے شعبہ کی بھی رہنمائی کی ہے یعنی وہ امور و احوال جو باہمی معاملات اور لوازم معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً بیع و شراء نکاح و طلاق اور میراث وغیرہ تو ان امور کی ہدایت و اصلاح کے لیے بھی قرآن کریم کا بہت بڑا حصہ ہے۔ باہمی معاملات اور معاشرت کی اصلاح کے اصول و ہدایات کا نام علم تدبیر منزل ہے۔ اس شعبہ سے متعلق جو علوم و آداب قرآن کریم نے بیان کیے ان میں سب سے زائد عظمت و اہمیت کے ساتھ والدین کی اطاعت و فرمانبرداری اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا باب ہے جس کو بِرّ الوالِدَین کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد مبارک ہے:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ — اور یاد کرو جب کہ ہم نے عہد لیا بنی اسرائیل

لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ — سے اس بات کا کہ عبادت نہ کرنا تم

اِحْسَانًا ۔ (سُورۃ البقرۃ)

کسی کی سوائے اللہ کے اور عہد لیا ہم نے والدین کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کا

اس عہد و میثاق کا ایک پہلو خداوند عالم کی عبادت و بندگی کا عہد ہے اور دوسرا پہلو والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔

ان دو پہلوؤں کو اس مقام پر مقرون و مجتمع کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ماں باپ کی اطاعت و فرمانبرداری اور حسن سلوک کی یہ عظمت و اہمیت ہے کہ عبادت خداوندی کے بعد متصلاً اس کو ذکر کیا گیا۔ گویا "یہ سمجھ میں آیا، کہ حقوق اللہ میں سب سے مقدم توحید اور عبادت خداوندی ہے اور حقوق العباد میں سب سے مقدم اور اہم ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک ہے۔ یا دوسرے عنوان سے یہ لہ دیکھیے کہ اس آیت مبارکہ کا پہلا حصہ رب حقیقی کا حق ادا کرنے سے متعلق ہے تو دوسرا حصہ عالم دنیا اور ظاہر اسباب کے درجہ میں ماں باپ جو مربی ہیں ان کا حق ادا کرنے سے متعلق ہے اس طرح امام رازیؒ تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ان دونوں مضمونوں کو یکجا بیان کرنے کی حکمت یہ بھی ہے، کہ اللہ تعالیٰ اپنے انعامات پر اپنے بندوں سے کوئی عوض اور بدلہ نہیں چاہتا بلکہ اس کا انعام محض منعم ہونے کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح کی کچھ شان والدین کے اس انعام میں ہے جو وہ اپنی اولاد پر کرتے ہیں نیز حق تعالیٰ بندوں کے جرائم کے باوجود بھی اپنا انعام قطع نہیں کرتا کچھ ایسا ہی حال والدین کا بھی ہوتا ہے کہ اولاد کی برائیوں کے باوجود بھی وہ اپنی قدرت کے مطابق احسانات کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ اسی امر کے پیش نظر حکم دیا گیا:

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسَانًا۔

اور ہم نے وصیت کی اور حکم کیا انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرنے کا۔

بلکہ ان کے سامنے انتہائی تواضع کا حکم دیا اور یہ بھی والدین کی محبت و ہمدردی کا

جذبہ اس قدر غالب ہونا چاہیے کہ انسان اپنی خلوتوں اور مختلف اوقات میں اپنے رب کے سامنے ہاتھ اٹھا کر ان کے حق میں رحمت و عافیت کی دعا بھی مانگا کرے جیسے ارشاد ہے:

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا	اور جھکا دے اے انسان تو اپنے ماں باپ کے سامنے ذلت اور تواضع کی بازو، (یعنی مسکنت اور انکسار کے ساتھ برتاؤ کر) اور دعا کر ان کے لیے اے پروردگار رحم فرما تو ان پر جیسا کہ ان دونوں نے (رحمت و شفقت کے ساتھ) میری تربیت کی۔
(سورۃ بنی اسرائیل)	

اس سے زائد اولاد کو اس بات کا بھی پابند بنایا کہ ماں باپ کی شان میں کسی طرح کا بھی توہین آمیز رویہ اختیار نہ کریں۔ نہ کسی قسم کی ایذا پہنچائیں حتیٰ کہ ان کو اُف تک بھی نہ کہیں۔ بڑھاپے میں انسان کے مزاج میں کچھ تیزی اور عدم تحمل کے آثار رونما ہوتے ہیں تو ایسی صورت میں ان کی طرف سے کسی بے اعتدالی کے پیش آجانے پر بھی صبر و برداشت کی تعلیم دی گئی۔ فرمایا:

إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا أُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا۔	اے مخاطب اگر تیرے پاس رہتے ہوئے تیرے ماں باپ میں سے کوئی ایک بڑھاپے کو پہنچ جائے یا دونوں تو ان کے سامنے اُف بھی نہ کرنا۔ اور نہ ان کو جھڑکنا۔ بلکہ ان سے بات کرنا عزت و اکرام کی۔
(سورۃ بنی اسرائیل)	

بہرحال ایک گھریلو زندگی کی اصلاح کے لیے یہ بات جس قدر اہمیت رکھتی ہے۔ وہ ظاہر ہے تو قرآن کریم نے تدبیر منزل کے شعبوں میں اس شعبہ کی ہدایت متعدد مواقع پر فرمائی

صلہ رحمی

باہمی معاملات کی اصلاح و درستگی اور صالح معاشرہ کے لیے صلہ رحمی اور حقوق قرابت کی رعایت بنیادی امر ہے۔ انسان کی زندگی میں اکثر و بیشتر نزاع اور جھگڑے حقوق قرابت کا لحاظ نہ رکھنے اور صلہ رحمی کے اصول کو نظر انداز کر دینے کی بنا پر پیش آتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس پہلو کی اصلاح و تکمیل کے لیے جامع تر ہدایات نازل فرمائیں۔ ارشاد فرمایا:

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۔ (بنی اسرائیل)

ادا کرو قرابت داروں کا حق اور مسکین و مسافر کا بھی۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ کے خاص اوصاف کے ذکر میں یہ بھی بیان کیا، اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ صلہ رحمی کمالات نبوت میں سے ایک خاص وصف ہے۔ نیز حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ان اوصاف کو اس دعویٰ کے ثبوت میں دلائل کے طور پر پیش کرنا کہ "خدا تعالیٰ ہرگز آپ کو ناکام نہیں بنائے گا" اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ صلہ رحمی انسان کو کامیاب اور باعزت بنانے والا وصف ہے ایسا شخص یقیناً قبیلہ اور قوم کا ایک قابل احترام فرد ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کی نظروں میں پسندیدہ ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ قدرت خداوندی زندگی کے ہر مرحلہ پر ایسے شخص کو تائید غیبی سے نوازا کرتی ہے۔ قرآن کریم نے صلہ رحمی اور حقوق قرابت کا لحاظ کرنے والوں کی فضیلت و خوبی بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ ایسے افراد عاقبت محمودہ اور بہترین انجام کے مستحق ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ

اور وہ لوگ جو جوڑتے ہیں اس چیز کو جس کے جوڑنے کا حکم اللہ نے دیا (یعنی تعلقات قرابت

رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْءَ الْحِسَابِ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ۔	اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور حساب کی برائی سے خوف کرتے ہیں اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کی رضامندی کے لیے صبر کیا اور نماز قائم کی اور ہمارے عطا کیے ہوئے رزق میں سے خرچ کیا چھپا کر اور ظاہر ابھی اور برائی کا بدلہ بھلائی کے ساتھ دیا (تو) یہ ہیں وہ لوگ جن کے لیے
(سورۃ الرعد)	دار آخرت (اور انجام) کی بہترائی ہے۔

اس کے بالمقابل قطع رحمی کرنے والوں کی عاقبت کی تباہی اور بربادی کا ذکر کرتے ہوئے فرما دیا گیا: اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْءُ الدَّارِ۔

صلہ رحمی کے بہترین نتائج اور ثمرات میں سے یہ چیز قطعی اور یقینی ہے ایک دوسرے کا ہمدرد و مخلص اور محب ہوگا۔ ایثار و سخاوت اور خدمت کا جذبہ ہر ایک فرد میں سرایت کرنے والا ہوگا اور ظاہر ہے کسی قوم کی باہمی معاشرت کا یہ رنگ ان کی معاشرت کو نہایت پرسکون اور عافیت و راحت اور عزت کا گہوارہ بنانے والا ہوگا۔ نہ تحاسد رہے گا نہ تباغض نہ ایک دوسرے کے درپے آزار ہوگا۔ گو دنیا کی یہ زندگی جنت جیسے راحت و سکون قلبی کا ایک نمونہ بن جائے گی۔

حقوق قرابت میں تمام انواع کی قرابتیں شامل ہیں۔ قرابت نسبی۔ قرابت سببی یعنی دامادی اور مصاہرت کے تمام رشتے۔ قرابت ولایت و محبت قرابت وطن و ہمسائیگی غرض قرابت کی ہر نوع کے احکام اصول شریعت میں بیان کر دیئے گئے تدبیر منزل کے اصول میں باہمی اتفاق و محبت بھی ہے جس کی قرآن کریم نے بڑی اہمیت کے ساتھ تعلیم دی ہے اور امت مسلمہ کو اخوت کی ایک لڑی میں پرو دینے کی ہدایت فرمائی جیسے ارشاد ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا — مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ تم اپنے دو

toobaa-elibrary

بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (سورۃ الحجرات)

بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو اور خدا سے ڈرتے رہو تا کہ تم پر رحمت کی جائے۔

اور دورِ جاہلیت کے باہمی تنافر اور عداوت کو نعمت اسلام سے ختم فرما کر حق تعالیٰ نے اس نعمت کی عظمت کو سمجھنے اور اس کے احساس کے لیے دعوت دی اور فرمایا: وَكُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (سورۃ آل عمران)

اے لوگو تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں اُلفت و محبت پیدا کر دی تو اب تم حق تعالےٰ کے فضل و انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے ہو۔

اور اس انعام کی قدر و منزلت معلوم کرنے کے لیے فرمایا:

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ. (سورۃ الانفال)

اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگر تمام رُوئے زمین کی دولت خرچ کر دیتے تو بھی ان کے دلوں میں باہمی محبت و موافقت نہیں پیدا کر سکتے تھے لیکن اللہ ہی نے ان کے دلوں کو جوڑا اور ان میں باہمی محبت پیدا کی بے شک وہ بڑی عزت و غلبہ اور حکمت والا ہے۔

معلوم ہُوا کہ باہمی اتحاد و محبت ایسی عظیم الشان نعمت ہے کہ تمام دُنیا کی دولت اس کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات اور احادیث میں بہت سے ابواب تدبیر منزل اس بلند پایہ اصول کی تعلیم اور تشریح و تفصیل پر مشتمل ہیں اسی کے ساتھ جذبۂ ایثار و ہمدردی کی بھی تعلیم دی گئی۔ فرمایا:

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ.

اور وہ اپنے اُوپر دُوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ ان پر فقر و تنگدستی ہو۔

یعنی باہمی معاشرت کی خوبی اسی میں مضمر ہے کہ انسان میں یہ جذبہ کارفرما ہو کہ دوسرے کو راحت پہنچا دے خواہ اس مقصد کے لیے اسے خود اپنے کو مشقت و تکلیف ہی میں کیوں نہ ڈالنا پڑے۔

مادی دُنیا کا نظام اور اسی کے گرد چکر لگانے والوں کی زندگی کا خلاصہ اور ان کی جدّ وجہد کا محور تو یہ ہوتا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اپنے اغراض و منافع حاصل کیے جائیں خواہ اس نصب العین کی تکمیل میں دُوسرے کو تکلیف پہنچے یا وہ نقصان و ذلت کا شکار رہے، ان سب باتوں سے بے پرواہ مادی وسائل اور دولت کا طالب اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں منہمک رہتا ہے اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ دُنیا کی زندگی ہر نوع کے فساد فتنوں اور آلام و مصائب کا خلاصہ بن کر رہ گئی۔ اس کے مقابل قرآن وسنّت نے ایک ایسی معاشرت کے آداب بتائے جس میں ہر شخص دُوسرے کو راحت و آرام پہنچانے کی فکر میں لگا رہے اور اس کا یہی نصب العین ہو کہ میں اپنے بھائی کو نفع پہنچا دوں تو یہی بہتر ہے اور اس پاکیزہ مقصد اور اعلیٰ ترین نصب العین کے لیے وہ خود کو مشقت و تکلیف میں ڈالنا اور نقصان اُٹھانا بھی نہ صرف برداشت بلکہ اس میں اپنے واسطے سعادت اور خوشی محسوس کرے، تو اس طرح انسانی زندگی کے جذبات کا یہ رُخ قرآن کریم کی یہی تعلیم بنانے والی ہے وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔ انفاق فی سبیل اللہ یتیموں مسکینوں فقرا و محتاجوں کی امداد و اعانت کی ترغیب اس قدر دی گئی کہ اگر اس پر عمل کر لیا جائے تو دُنیا میں کوئی شخص بھی بھوکا اور ننگا اور محتاج و پریشان باقی نہیں رہ سکتا۔

٭

تدبیر منزل میں معاملات کے اصول و ہدایات

تدبیر منزل کے اصول و ہدایات میں قوانین معاملات بھی ہیں۔ یہ بھی ایک نہایت وسیع علم ہے جس کی قرآن کریم نے رہنمائی کی۔ احکام بیع و شرا بیان کیے گئے۔ قرض و استقراض رہن و امانت سود اور حرام سے بچنے کا حکم دیا گیا۔ اور ناپ تول صحیح رکھنے کی ہدایت کی گئی۔ معاملاتی زندگی میں خاص طور پر اس امر کی رعایت فرمائی گئی اور اسی کی تاکید کی گئی کہ کسی شخص کا حق کسی طرح ضائع اور برباد نہ ہو سکے۔ بالعموم قرض اور ادھار لین دین میں ایسے مواقع پیش آتے ہیں تو قرآن کریم نے نہایت اہمیت کے ساتھ آیت مداینہ[1] میں یہ تمام احکام مقرر فرمائے کہ معاملہ کی کتابت اور دستاویز لکھ لینی چاہیے۔ شہادت بھی اور معاملہ کی پوری تفصیل بھی درج کی جائے۔ نہ کاتب کتابت میں کوئی فروگذاشت کرے اور نہ شاہد شہادت میں کسی بخل سے کام لے۔ املا کرانے والا پورا املا کرا دے اور جس کے پاس جو چیز بھی امانت ہو وہ اس کو ادا کرے اور متعدد بار اللہ کا تقویٰ ملحوظ رکھنے کی ہر ایک کو تاکید فرمائی گئی۔ ناپ تول میں امانت اور عدل کا حکم دیا گیا۔ فرمایا اَوْفُوا الْكَيْلَ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ کہ پورا پورا ناپا کرو اور سیدھی ترازو سے پورا پورا تولو۔ اور جو لوگ خیانت اور دھوکہ کی روش اختیار کریں ان پر وعید فرمائی گئی۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ — ہلاکت و بربادی ہے ان لوگوں کے لیے جو ناپ تول میں کمی کرنے والے ہیں۔ جب

---

[1] آیت مداینہ سے سورۃ بقرہ پ ۳ کی یہ آیت مراد ہے یٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى الخ حضرات قارئین تفاسیر میں اس مضمون کے لیے رجوع فرمائیں۔

وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ۔ أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۔

وہ لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیتے ہیں اور جب لوگوں کو ناپ کر دیں یا تول کر دیں تو کم دیتے ہیں کیا یہ لوگ خیال نہیں کرتے کہ انہیں مر کر پھر ایک بڑے ہولناک دن کے لیے مبعوث ہونا ہے (اٹھنا ہے) جس دن کہ تمام لوگ (اپنے اعمال کا حساب دینے کے لیے) رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

تجارتی اور اقتصادی امور میں سودی کاروبار ایک میٹھے زہر کی حیثیت رکھتا ہے، نہ صرف یہ کہ یہ طریق تجارت عامۃ الناس کی معاشی حالت کو تباہی اور بربادی کی طرف لے جانے والا ہے بلکہ معاشرت اور اخلاق کو تباہ کر دینے والا ہے اس بناء پر سود اور سودی کاروبار کو بڑی سختی کے ساتھ رد کیا گیا۔

سودی نظام تجارت ہی ایک طرف سرمایہ داری کو فروغ دیتا ہے تو دوسری طرف یہی نظام افلاس و غربت اور ملک کے عام افراد کو مفلوک الحال بناتا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ جس نظام سے چند افراد سرمایہ دار بنیں گے لامحالہ اس کا نتیجہ ملک کے دوسرے طبقہ کو مفلس اور بدحال بنانے گا۔ اس وجہ سے قرآن کریم نے سودی کاروبار کی بڑی سختی کے ساتھ ممانعت کی فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۔ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۔ (البقرۃ ع)

اے ایمان والو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اور گذشتہ زمانہ کا باقی ماندہ ربوا (سود) چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو۔ پھر اگر ایسا نہیں کرو گے (یعنی تم سودی کاروبار سے باز نہیں آتے) تو تم کو مطلع ہو جانا چاہیے لڑائی پر اللہ اور اس کے رسول سے۔

قرآن کریم نے یہ بتایا کہ خدا کے ایک پیغمبر حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے اپنی مادی اور مالی منفعتوں کو اللہ رب العزت کے احکام کے سامنے نظر انداز کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا :

يَا شُعَيْبُ أَصَلَوٰتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَنْ نَفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ ۔

کہ اے شعیب کیا تمہاری نماز (عبادت و دین) تم کو اس بات کا حکم دیتا ہے (اور تم کو تمہاری نماز کیا یہی سکھاتی ہے) کہ ہم اپنے ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے آباؤ واجداد عبادت کیا کرتے تھے یا اس بات سے (بھی تمہارا دین ہم کو منع کرتا ہے) کہ ہم اپنے مالوں میں جو چاہیں کریں ۔ یعنی مالی کاروبار میں دینی پابندیوں کو ہم قبول نہیں کر سکتے ۔

گویا وہ اپنے معاشی مسائل اور تجارتی معاملات کو شریعت اور احکام خداوندی سے آزاد سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ کسی پیغمبر کی شریعت اور وحی الٰہی کا تعلق صرف نماز روزہ جیسے عبادات سے ہے ۔

شعیب علیہ السلام نے ہر چند سمجھایا اور یہی کہا کہ تجارتی معاملات دیانت و تقویٰ کے اصول اور احکام خداوندی کے مطابق چلانا ہی دین و دُنیا کی سعادت و کامیابی ہے ۔ نصیحت و فہمائش کرتے کرتے تھک گئے لیکن قوم باز نہ آئی ; تو انجام کار خداوند عالم کے قہر و غضب نے ان کو تباہ و برباد کر دیا ۔

تفصیل کے لیے سورۂ اعراف اور سورۂ ھود کے مضامین ملاحظہ فرمائے جائیں ۔

اسلام کا معاشی نظام

قرآن کریم کی متعدد آیات میں کسی جگہ اجمال اور کسی جگہ تفصیل کے ساتھ تجارتی معاملات اور معاشی مسائل میں ایسے رہنما اصول بیان فرمائے ہیں کہ ان پہ عمل کرتے ہوئے قوم ایک نہایت ہی صالح اور پُرسکون اور باعزت معاشرہ کی تعمیر کر سکتی ہے اور ان قرآنی ہدایات و اصول سے کنارہ کشی اور خلاف ورزی معاشی اور اخلاقی تباہی نیز عذاب خداوندی کو دعوت دیتا ہے۔

اس وقت دنیا نے بالعموم قرآن کریم اور اسلام کا تجویز کردہ معاشی نظام چھوڑ دیا ہے اور انسانی افکار و خواہشات اور نفسانی شہوتوں کے تراشے ہوئے نظام یعنی سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام کا طوق گردن میں ڈال لیا۔ اس وجہ سے تمام دنیا مصائب و آلام اور آفات و حوادث کا شکار ہو کر رہ گئی۔ یہ چیز محتاج بیان نہیں کہ انسان کی گمراہی جس طرح اعمال و اخلاق کی بے اعتدالیوں اور نفسانی خواہشات کی پیروی کی وجہ سے واقع ہوتی ہے۔

اسی طرح معاشی مسائل اور کسب و اکتساب کے ذرائع و وسائل میں حق تعالیٰ کے ان احکام کی پابندی نہ کرنے کی وجہ سے پیش آتی ہے جو احکام عین فطرت کے مطابق اور انسانی فلاح و سعادت کے ضامن ہیں۔ مال و دولت کے حصول اور اس کے استعمال و صرف کے جو طریقے قرآن کریم نے تجویز کیے اور اسی طرح جو معاشی نظام متعین کیا اسی میں انسان کی عزت نفس کا تحفظ اور اخلاق و معاملات کی پاکی اور برتری ہے۔

آج کل دساتیر عالم میں سب سے اہم باب معاشی نظام کا باب سمجھا جاتا ہے

ارباب علم و فکر کے نزدیک معاشی مسئلہ محتاج عذر اور محل بحث بنا ہوا ہے۔
لیکن دنیا کے مفکرین اور معاشی مسائل کے محققین اسلامی نظام معاش سے ہٹ کر
کسی طرح کا ایسا نظام پیش کرنے سے عاجز ہیں جو دنیا کی معاشی مشکلات کا
صحیح معنی میں حل کر سکے۔ ہم ان چند سطور میں اجمال سے یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں
کہ تمام معاشی مشکلات کا حل صرف اسلامی نظام معاش میں مضمر ہے اور اسلام
کے تجویز کردہ نظام معاش سے بہتر دنیا میں کوئی نظام نہیں ہو سکتا۔ بلکہ دنیا میں
مروج ہر دو نظام (یعنی سرمایہ دارانہ اور اشتراکی) طرح طرح کی مشکلات اور
خرابیوں کے موجب ہیں۔

یہ دونوں نظام باہم متضاد اور متحارب ہیں اور افراط و تفریط کے انتہائی درجہ
پر پہنچے ہوئے ہیں۔ اور اسلامی نظام نہایت معتدل اور افراط و تفریط کے ٹھیک
درمیان واقع ہے جو عقلی اور فطری اصول پر مبنی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد ایک خود مختار اور آزاد انفرادی ملکیت پر ہے،
جس میں حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا کوئی امتیاز نہیں۔ اس کا نصب العین
اور مقصد بس یہی ہوتا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو مال و دولت زائد سے زائد حاصل
کیا جائے اور اس میں کسی قسم کی مذہبی اور اخلاقی پابندی نہیں سمجھی جاتی۔ جھوٹ
سچ دیانت و امانت اور خیانت حقوق کا لحاظ یا ظلم و تعدی اس نظام میں قابل بحث
چیز ہی نہیں۔ تحصیل دولت کے وسائل میں سود اور قمار جیسی لغو صورتوں کو مہذب
نظام تجارت کی صورت دے دی گئی ہے۔

مزدوروں پر ظلم و تشدد اور ان کی حق تلفی سرمایہ داری کا بنیادی اور پہلا
سبق ہے۔ یہ نظام جس طرح تحصیل دولت میں کسی قسم کی مذہبی اور اخلاقی حدود و
قیود کا پابند نہیں اسی طرح یہ دولت جب استعمال ہوتی ہے تو صرف و استعمال میں
بھی ہر طرح کی مذہبی اور اخلاقی حدود و پابندیاں بالائے طاق رکھ دی جاتی ہیں۔
اور یہ دولت عیش و عشرت کے اڈوں اور نائٹ کلبوں میں پانی کی طرح بہتی ہے۔

اسی دولت کو سرمایہ دار حصول اقتدار اور ملکی سیاست پر قبضہ جمانے کے لیے بھی خرچ کرتا ہے جس کے نتیجہ میں ملک کی اخلاقی اور معاشی بدحالی کے ساتھ سیاسی تباہی اور بربادی بھی واقع ہوتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے بالمقابل دُوسرا اشتراکی نظام ہے جس کے دو بنیادی اصول ہیں۔ ایک یہ کہ ذاتی ملکیت کوئی چیز نہیں۔ ملک کے تمام وسائل دولت صنعت وحرفت اور زراعت یہ سب قومی ملکیت ہے اور قومی خزانہ ہے۔ دُوسرا اصُول یہ ہے کہ ملک کی دولت میں ملک کے تمام افراد برابر کے شریک ہیں کسی کو دُوسرے پر امتیاز نہیں۔

پہلا گروہ (سرمایہ دار) اگرچہ حصُولِ دولت میں حلال وحرام کا قائل نہیں لیکن کم از کم خدا تعالیٰ اور آسمانی مذہب کا تو قائل ہے۔

دُوسرا گروہ اشتراکی سرے سے خدا تعالیٰ کا منکر ہے اور کسی آسمانی مذہب کا قائل نہیں وہ صرف اپنے نفسانی مذہب اور اس نظام کا قائل ہے جو اس کے ذہن وفکر نے تجویز کیا۔

اشتراکیت کا نعرہ غریب اور مزدوروں کو بہت ہی پسند آیا کیونکہ انہوں نے یہ سمجھا کہ ان تمام دولت مندوں کی دولت (سرمایہ) ہم میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ مگر ان کو خبر نہ تھی کہ اس نظام کی نحوست ولعنت ان کی عزتِ نفس اور آزادی بھی ختم کر کے ان کی گردنوں میں ایک ایسی غلامی کا طوق ڈال دے گی کہ ان میں خواہ کیسی ہی بہتر صلاحیت اور ہنر ہو اور وہ اپنے ہنر اور صلاحیت سے کتنا ہی کمائیں مگر ان کو کھانے اور پہننے کے لیے بقدر حاجت اتنا ہی ملے گا جتنا نالائق اور بے کار افراد کو مل سکتا ہے۔

جس کا حاصل یہ نکلا کہ ملک کے تمام وسائل دولت اور کل ہنرمند اور صنعت وحرفت کے ماہرین کا حاصل کردہ سرمایہ سمٹ کر ان چند افراد کے تصرف و اختیار میں گھر جائے جو اقتدار پر قابض ہیں اور ملک کے کل افراد بحیثیت غلام نان ونفقہ حاصل کرتے رہیں۔ گویا جس طرح چند حیوانات کا مالک ان حیوانات کی

محنت سے سرمایہ حاصل کرتا ہو اور ان حیوانات کے دانہ چارہ کا بندوبست کردیتا ہو۔ یہی حال اشتراکی اقتدار کا ملک کے باہنر اور بہترین صلاحیتوں والے افراد سے منفعت حاصل کرنے اور ان پہ مساوات کے ساتھ خرچ کرنے کا ہوگا، جو سراسر عقل اور فطرت کے خلاف ہے۔ سرمایہ داری کا نظام اگر بھیڑیئے اور درندوں کے سفاکی اور استحصال کی تصویر ہے تو اشتراکی نظام کا مزاج حیوانات سے ملتا جلتا ہے۔ اسلام کا معاشی نظام ایک نہایت معتدل و متوازن نظام ہے اور سرمایہ داری کے مفاسد اور خرابیوں سے پاک ہے۔

اسلام کہتا ہے کہ جس چیز کو تم اپنی محنت و صلاحیت اور جائز طریقہ سے حاصل کروگے وہ تمہاری ملکیت ہے مگر وہ ملکیت مطلق اور آزاد نہیں بلکہ حصول دولت کے جو طریقے خداوند عالم نے مقرر کیے۔ صرف ان ہی حدود اور طریقوں سے کما سکتے ہو۔ پھر جو سرمایہ جائز طریقوں سے جمع ہوجائے اس میں حقوق ہیں غربا و مساکین اور عزیز و اقارب اور یتیم و مسافر کے تو ان حقوق کو ادا کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ تو سرمایہ داری بڑھ سکے گی اور نہ غربا و مساکین و محتاجوں کا معاشی مسئلہ باعث پریشانی رہے گا۔

کیونکہ سرمایہ داری صرف ناجائز ذرائع آمدنی ہی کی پیداوار اور مال و دولت میں جن اہلِ قرابت اور محتاجوں کا حق رکھا ہے۔ ان کے حقوق سے محروم کرنے ہی کا نتیجہ ہے۔

خداوند عالم نے مال و دولت پر جو حقوق و فرائض عائد کیے ان میں سے بعض ایجابی ہیں اور بعض سلبی ہیں۔

ایجابی حقوق زکوٰۃ فرض جو فقراء و مساکین اور قرضداروں پہ خرچ کی جائے گی۔ صدقاتؐ و تبرعات جو صلہ رحمی اور مساجد و مسافر خانے اور شفاخانوں وغیرہ کی تعمیر پر صرف کیے جائیں۔

میراث جو انسان کے مرنے کے بعد اس کے ورثہ یعنی اولاد والدین اور بیوی

یا شوہر کو تقسیم کی جائے۔ گویا جس طرح ایک انسان اپنی زندگی میں اپنے اہل خانہ پر خرچ کرتا تھا شریعت نے اس کے مرنے کے بعد اس کی دولت گویا انہی مصارف میں صرف کرنے کی شکل مقرر کردی۔ مہمانوں، مسافروں اور مصائب و پریشانیوں میں مبتلا ہونے والوں کے حقوق بھی مالداروں پر مقرر کر دیئے گئے اور ان جملہ حقوق کی ادائگی کی بار بار تاکید کی گئی اور ان کی ادائگی سے اعراض اور پہلو تہی پر قرآن و حدیث میں سخت تنبیہ اور شدید وعید فرمائی گئی۔

ان ایجابی حقوق کے علاوہ مال و دولت میں سلبی حقوق یہ ہیں:

۱۔ اسراف اور فضول خرچی نہ کرے۔ اپنا مال کسی ایسے طریق پر ہرگز استعمال نہ کرے اور نہ ہی ایسا کوئی تصرف کرے جو دوسروں کی اذیت اور تکلیف کا باعث ہو۔ اسی وجہ سے ضروری اشیاء کی ذخیرہ اندوزی حرام کردی گئی اور حدیث میں ذخیرہ اندوزی کرنے والے کو ملعون فرمایا گیا۔

غرض اسلامی نظام معیشت کا یہ اجمالی اور ایک سرسری خاکہ ہے کہ جائز اور صحیح ذرائع سے انسان کمائے اور جو کچھ اس کے پاس اس کی ضروریات و حوائج سے زائد جمع ہو اس میں ان حقوق کو ادا کرے جو اس پر مقرر کیے گئے۔ لامحالہ یہ پاکیزہ اور معقول نظام معاشرہ میں نہ غیر محدود سرمایہ داری پیدا ہونے دے گا اور نہ غربت و افلاس کی تکالیف باقی رہنے دے گا۔

اصل یہ ہے کہ جس طرح انسان کی حیات اور اس کے قویٰ اس کی ملک نہیں اور نہ اس کی پیدا کردہ کوئی چیز ہے بلکہ صرف اس مالک حقیقی کی عطا کردہ ہے جس نے کائنات کو وجود بخشا تو اسی طرح انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ منعم حقیقی کا عطیہ ہے اور بندہ مالک حقیقی کے احکام کے تابع و فرمانبردار ہے پروردگار نے اپنے بندہ کو جو کچھ عطا کیا اس میں خود اس کو کھانے کا حکم دیا، اور اس کا بھی حکم دیا وہ اس نعمت کا شکر اور حق ادا کرے۔ فرمایا، كُلُوا مِن رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ " کہ تم اپنے رب کا رزق کھاؤ، اور

اس کا شکر بھی ادا کرو۔ اور فرمایا :
وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا - وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ -
(سُورۃ القصص)

اور اے انسان تلاش کر تو اس نعمت و دولت میں جو تجھ کو دی گئی۔ دار آخرت اور مت بھلا اس دُنیا (کی دولت میں) سے اپنا حصہ (کہ اس میں اصل تیرا حصہ کس قدر ہے) اور بھلائی کر جس طرح کہ اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی ہے اور زمین پر فساد و خرابی پیدا نہ کر کیونکہ اللہ تعالیٰ مفسدین کو پسند نہیں کرتا۔

قارون اس مال و دولت میں کسی اور غریب و مسکین کا حق نہیں سمجھتا تھا اور اللہ کی اس عطا کی ہوئی نعمت کو صرف اپنی ہی زیب و زینت اور عیاشی پر صرف کرنے کا قائل تھا تو قرآن کریم نے اس واقعہ کو عبرت کا نمونہ بنایا۔

☆

تقسیم دولت

اسلام نے دولت کے دو حصے کیے ہیں۔ ایک حصہ تو وہ ہے جس میں تمام انسانوں کے حقوق برابر ہیں جیسے خود رو گھاس ہوا میں اڑنے والے پرندے پہاڑوں میں پیدا ہونے والی اشیاء مثلاً قدرتی طور پر بہنے والے پانی کے چشمے اور ان پر اُگے ہوئے درخت اور پہاڑوں کی تہوں میں چھپے ہوئے معادن۔ جنگل میں آزاد شکاری جانور اور دریاؤں کا پانی ۔ غرض یہ اشیاء کسی کی شخصی ملکیت نہیں۔ اس میں تمام بنی نوع آدم شریک ہیں جس کا دل چاہے کسی پرند کا شکار کرے یا خود رو گھاس کاٹ لے یا چشموں اور

دریاؤں کا پانی اپنی مشک میں بھر لے لیکن ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی محنت سے کوئی جانور شکار کر لے گا یا پرند پکڑے گا یا چشمہ سے پانی اپنے برتن اور مشک میں بھرے گا وہ اس کی ملک ہو جائے گا۔ افتادہ جنگل میں اُگے ہوئے درخت سب کے واسطے مشترک طور پر قابلِ انتفاع ہیں لیکن جو درخت اور لکڑیاں کوئی کاٹ کر جمع کرے گا وہ اس کی ملک ہوگا۔ سمندر کی مچھلیاں کسی کی ملک نہیں لیکن جو ان کو پکڑے گا وہ ان کا مالک ہوگا۔

دولت کا دُوسرا حصہ وہ ہے جس میں انسان کی سعی اور اس کے عمل کو دخل ہے۔ جیسے صنعت و تجارت اور زراعت۔ تو جو چیز ان طریقوں سے حاصل ہوگی وہ حاصل کرنے والے کی ملک ہوگی۔ ایسی چیزوں میں تمام انسانوں کے حقوق برابر نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ عقل اور فطرت کے خلاف ہے سعی اور محنت ایک شخص کی ہو اور اس میں شریک و حصہ دار وہ بھی ہو جائیں جن کا اس سعی میں کوئی دخل نہیں۔ تو دولت کے جس حصہ کو شریعت نے کسی کی انفرادی ملکیت قرار دے دیا تو شریعت نے اس کے ساتھ پورے احترام اور تحفظ کا بھی حکم دیا اور حصول ملکیت جو مقرر کردہ اصول ہیں انہی کے ذریعے اموال کے لین دین کی اجازت دی۔ فرمایا:

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّآ أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ۔	اور اے لوگو! نہ کھایا کرو تم اپنے مال آپس میں ایک دُوسرے کے باطل طریقہ سے مگر یہ کہ وہ بصورت تجارت ہو باہمی رضامندی کے ساتھ۔
(سُورۃ نساء)	

دُنیا کے تمام عقلاء اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسانی افراد ذاتی صلاحیتوں میں یکساں نہیں ہوتے بلکہ ان کی دماغی اور عملی قوتوں اور صلاحیتوں اور عملی جدوجہد میں بڑا تفاوت ہوتا ہے اور ہر شخص اپنی فکری صلاحیت اور عملی جدوجہد سے تجارت اور صنعت و حرفت میں قابلیت حاصل کرتا ہے اگر اس

تفاوت کو نظرانداز کر کے مساوات اور یکسانیت پیدا کر دی جائے۔ نہ صرف یہ کہ یہ بات اصول فطرت اور عقل کے خلاف ہوگی بلکہ کام کرنے والوں کے عزائم اور حوصلے پست اور مردہ ہو جائیں گے۔ تجارتی اور صنعتی ترقی کے دروازے بند ہو جائیں گے اور حوصلہ مند انسان اپنے عزائم اور عملی جذبات و صلاحیتوں کے پیش نظر جو آرزوئیں اور امنگیں اپنے میں پاتا ہے اس سب پر پانی پھر جائے گا۔ اور افسردگی و مایوسی اس کے فکری اور عملی قوتوں پر مسلط ہو جائے گی۔ اور اس طرح بتدریج نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ نیز انسان اپنی ملکیت سے اپنے اعزّا و اقرباء اور غرباء و مساکین کی اعانت و امداد کا خواہاں ہوتا ہے اور اس ذریعہ سے اس کو جو اپنی برادری میں عزت و برتری حاصل ہوتی ہے اس سب سے وہ محروم ہو جائے گا۔ پھر یہ کہ جن غرباء اور اہل قرابت کے ساتھ انسان اعانت وہمدردی کا معاملہ کرتا ہے وہ اس کے مخلص و مددگار اور جان تک اس پر قربان کر دینے کا جذبہ رکھنے والے ہوں گے تو اس طرح کی تمام ہمدردیوں اور خلوص و محبت اور جانثاری کے جذبات اس کو کسی سے نصیب نہ ہو سکیں گے جو ایک بہت بڑی نعمت ہے۔

غرض اشتراکیت کے دونوں بنیادی اصول یعنی انفرادی ملکیت کا خاتمہ اور دولت کی مساویانہ تقسیم یہ دونوں باتیں اصول عقل اور فطرت کے خلاف ہیں۔ کسب اکتساب کی صلاحیتوں اور عقلی و فکری قوتوں کے باعث انسان نعمت کو جانوروں کی محنت سے حاصل کردہ منفعت کے درجہ میں قرار دینا بلاشبہ خلاف عقل ہے اور افراد انسانی میں لائق و نالائق ہنرمند بے ہنر کاریگر اور بے کار عالم اور جاہل ڈاکٹر و فلسفی و وکیل اور خاکروب مرد اور عورت بچہ اور بڑا سب کو مساوی طور پر برابر کا حصہ دار قرار دے کر ملکی دولت ان سب میں برابر تقسیم کر دینا سراسر عقل اور فطرت کے خلاف ہے۔

حق تعالیٰ نے نظام عالم کو قائم رکھنے کے لیے جس طرح مخلوقات میں

تفاوت اور بلندی و پستی کا فرق رکھا اسی طرح رزق اور دنیوی نعمتوں میں بھی فرق مراتب رکھا ہے اور اس تفاوت کو آزمائش کا ذریعہ بنایا جیسے کہ ارشاد مبارک ہے :

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىکُمْ اِنَّ رَبَّکَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۔

اور اسی خدا نے تم کو پہلی قوموں اور گذشتہ حکومتوں کا جانشین بنایا اور درجات و رتبوں کے لحاظ سے بعض کو بعض پر بلندی عطا کی (شکل وصورت اور عزت و وجاہت اور رزق و دولت میں) تاکہ اللہ تعالیٰ تم کو آزمائے ان نعمتوں میں جو تم کو عطا کیں (غنی حالت غنا میں کس قدر شکر کرتا ہے اور فقیر حالت فقر میں کس قدر صبر کرتا ہے) بیشک تمہارا رب بہت جلد سزا دینے والا ہے۔ (رزق و انعامات خداوندی میں بے راہ روی اختیار کرنے والوں کو) اور وہ بڑا ہی غفور رحیم ہے (صبر و قناعت اور حصول دولت میں جائز ذرائع پر اکتفا کرنے والوں کے لیے

(سورۃ انعام)

کسی موقعہ پر قرآن کریم نے رزق کی فراخی اور تنگی حق تعالیٰ کے حکیمانہ نظام کے تابع قرار دیتے ہوئے فرمادیا :

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۔

کہہ دیجیے کہ بے شک میرا رب ہی رزق پھیلا دیتا ہے جس کے واسطے چاہے اور جس کے واسطے رزق تنگ کر دیتا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (کہ غنا اور افلاس کی تکوینی نظام عالم میں کیا حکمتیں ہیں۔

کسی جگہ فرمایا:

اَهُمْ یَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔

کیا یہ لوگ تیرے رب کی رحمت ونعمت (اپنی رائے سے) تقسیم کریں گے (تقسیم نعمت ان کے اختیار میں نہیں) ہم ہی نے تقسیم کی ہے ان کے درمیان ان کی روزی ان کی دنیوی زندگی میں (کہ کسی کو غنی بنایا اور کسی کو تنگدست) اور بعض کو بعض پر درجات کے اعتبار سے فوقیت دی (کہ کسی کو بادشاہ بنایا اور کسی کو چوبدار و چپراسی، کسی کو حاکم اور کسی کو محکوم) تاکہ ایک دوسرے کو خدمت پر لگائے رکھے اور تیرے پروردگار کی رحمت بہتر ہے ان چیزوں سے جو وہ جمع کرتے ہیں یعنی دنیوی مال و دولت سے آخرت کی نعمتیں اور رحمتیں بہتر ہیں)

اسی طرح ارشاد فرمایا:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ کہ اللہ ہی نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر رزق میں فضیلت و برتری عطا کی۔

بہرکیف شریعت اور عقل کا فیصلہ ہے انسانی افراد جن باتوں میں برابر کے شریک ہیں ان باتوں میں تمام افراد میں مساوات ہے اور جن چیزوں میں باہمی امتیاز و تفاوت ہے وہاں فرق مراتب اور امتیاز کا لحاظ ہے یعنی جس حد تک اشتراک ہے اسی حد تک حکم میں مساوات ہے اور جس وصف سے امتیاز شروع ہو جاتا ہے وہیں سے مساوات کا حکم بدل جاتا ہے۔ مثلاً تمام افراد انسانی انسانیت میں مشترک ہیں، لہذا حقوق انسانیت میں سب مساوی اور برابر ہیں۔ جان و مال،

عزت و آبرو اور ننگ و ناموس کی حفاظت میں ملک کے تمام افراد مساوی اور برابر ہوں گے۔ اگر ان حقوق انسانیت میں ایک طبقہ کو دوسرے پر فوقیت دی گئی تو یہ ظلم ہوگا۔ اس میں امیر و غریب اور حتیٰ کہ حاکم و محکوم سب برابر ہیں۔ امیر و غریب کا قتل کا ایک ہی حکم ہے کہ ہر قاتل پھانسی کا مستحق ہے۔ اور جو اوصاف بنی نوع انسان میں امتیاز و تفاوت کا باعث ہیں جیسے حسب نسب مرد و عورت۔ استاذ و شاگرد۔ امیر و مامور فرمانبردار و باغی جفاکش و سرکش عالم و جاہل با اخلاق اور مغرور و متکبر، ہنرمند اور بے ہنر غرض ان امتیازی اوصاف کے ساتھ حکم میں یہ سب افراد مساوی نہیں ہو سکتے۔ نتیجہ یہ کہ ہر نوع کے افراد میں جس قدر اشتراک ہے اسی قدر احکام میں مساوات ہے اور جس قسم کا امتیاز ہے اسی کے مطابق احکام میں بھی امتیاز ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ. (حجرات)	اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تم کو مختلف گروہ اور مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیا، تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ قابل عزت و اکرام وہ شخص ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے۔

توجہ اولیٰ میں بنی آدم کا نفس انسانیت اور آدمیت میں اشتراک بیان کیا گیا۔ دوسرے میں نسبی اور قبائلی امتیاز بیان فرمایا جس سے تمدن و معاشرت کا اختلاف اور امتیاز ہوتا ہے اور کبھی یہ امتیاز صنعت و حرفت اور پیشہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ تجارت و صنعت کا پیشہ عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل گداگری کا پیشہ حقیر سمجھا جاتا ہے۔ کسی

صنعت و حرفت کا ماہر کاریگر معزز شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل خاکروب اور نالی صاف کرنے والا ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ جیسے کہ ادنیٰ عقل والا بھی برابر نہیں کرسکتا۔ اور تیسرے جملہ دینی اور مذہبی امتیاز کو بیان فرمایا گیا۔

غرض یہ کہ آیت مبارکہ میں بیان کردیا کہ بنی نوع انسان کس وصف میں اشتراک و مساوات رکھتے ہیں اور کس پہلو سے ان میں دینی و دنیوی امتیاز و فرق مراتب ہے اور نوع انسانی کے افراد اپنی صفات و کمالات میں تفاوت اور فرق مراتب ہی کے لحاظ سے حیوانات سے ممتاز و جُدا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حیوانات میں نہ کوئی تمدن ہے اور نہ کوئی تہذیب۔ اور حق تعالیٰ شانہٗ کا یہ فرمان وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ۔ خطاب نوع انسان ہی کو ہے اور مطلب یہ ہے کہ اے بنی آدم تم سب آپس میں فضائل و کمالات اور حالات و خصوصیات کے لحاظ سے مختلف المراتب ہو اور قدرتی طور پر فکری اور عملی صلاحیتوں میں بڑا عظیم تفاوت ہے۔ اس وجہ سے تم میں رزق اور معاش کے اعتبار سے بھی تفاوت ہونا لازمی تھا۔ تو تم کو رزق اور معاش میں مختلف مراتب پر رکھا کہ کسی کو کسی پر فوقیت دی۔

مسند امام احمد بن حنبلؒ میں آیت مبارکہ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ" کی تفسیر میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ جب حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت آدمؑ کی پشت سے ان کی ذریت کو نکالا اور ان سے "عہد الست" لیا :

رُفِعَ عَلَيْهِمْ اٰدَمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ	تو تمام اولاد ان کے سامنے کی گئی۔ اس وقت
يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ فَرَاٰى الْغَنِيَّ وَالْفَقِيْرَ	حضرت آدم علیہ السلام کو ان پر بلند کیا گیا
وَحَسَنَ الصُّوْرَةِ وَدُوْنَ ذٰلِكَ	در انحالیکہ وہ تمام اولاد کو دیکھ رہے تھے
فَقَالَ رَبِّ لَوْلَا سَوَّيْتَ بَيْنَ عِبَادِكَ	تو ان میں غنی و فقیر اور حسین و جمیل اور
فَقَالَ اِنِّيْ اَحْبَبْتُ اَنْ اُشْكَرَ۔	اس سے کم درجہ کے افراد کو بھی دیکھا

(سب کو یکساں نہ پاکر حق تعالیٰ سے)
عرض کیا اے پروردگار تو نے اپنے بندوں
کے درمیان مساوات اور برابری کیوں نہ
کر دی تاکہ ان میں امیر و غریب کا فرق نہ
رہتا اور نہ ہی حسین و بدصورت کا تفاوت
ہوتا) حق تعالیٰ نے فرمایا میں نے پسند کیا
کہ میں شکر ادا کیا جاؤں۔

اور ظاہر ہے کہ اگر سب کو ایک ہی حال پہ پیدا کرتا تو حقیقت شکر کا دنیا میں وجود ہی نہ ہوتا کیونکہ اختلاف مراتب کی صورت میں ایک صفت ایک میں ہوگی اور جب وہ صفت دوسرے میں نہ پائی جاتی ہوگی۔ اس وصف و خوبی سے متصف انسان شکر ادا کرے گا۔ دولت مند اسی وقت اللہ کی نعمت پہچان سکتا ہے اور شکر ادا کر سکتا ہے جب اس کے سامنے غربت یا کبھی نمونہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس علم و ہنر والا اس وقت علم و فضل کا شکر ادا کر سکے گا جب اس کی نظروں کے سامنے جہالت ہو۔

بہرحال اس فرق کو مٹانا تو نظام قدرت اور اصول فطرت کے خلاف ہے۔ رہا مسئلہ غربت و افلاس کی تکالیف کے حل کا؟ سو وہ جس بہتر نظام معیشت اور ہمدردی و مواسات کے بلند پایہ اصول مقرر کر کے اسلام نے حل کیا ہے اشتراکی نظام میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔[1] مزید برآں جو مذہبی اعتقادی اور

[1] صرف یہی نہیں غرباء کے معاشی مسائل کے حل کے لیے صرف صدقات و خیرات اور عشر ہی کی مد ہو بلکہ بیت المال میں بہت سے مدات انہی مقاصد میں صرف کے لیے متعلق کیے گئے۔ مثلاً مال فیئ، غنیمت۔ خمس غنیمت۔ اہل ذمہ سے وصول شدہ جزیہ و خراج اور ان کے تجارتی اموال کا ٹیکس۔ تو ظاہر ہے کہ انفاق فی سبیل اور صدقات اعانت کی تمام مدات انفرادی طور پہ پوری کرنے کے بعد بیت المال جب (باقی حاشیہ اگلے صفحہ)

معاشی مفاسد اور تباہیاں اشتراکی نظام اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے وہ ایک بڑی تفصیل طلب بات ہے جس کی طرف بطور اشارہ چند کلمات ضمناً حضرات قارئین کے سامنے آگئے۔ باقی اس موضوع کی تفصیل ایک مستقل تالیف کی محتاج ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) ان مدات سے غربا و مساکین کی اعانت کرے گا تو اس کے بعد یہ ممکن نہیں کہ غربت و افلاس کا نام و نشان بھی باقی رہ جائے۔

اسی نظام کی یہ برکت تھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں تاریخ نہیں ثابت کر سکتی کہ اس وقت کتنے افراد غربت و تنگ دستی اور مصائب و آلام کا شکار رہتے۔ بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ ہر شخص نہایت مطمئن اور خوشحال تھا اور بڑی پُرسکون زندگی گذارتا تھا۔ آج اس دور میں جب کہ صنعتی ترقیات اور وسائل کی فراوانی کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے دنیا کا کوئی ملک اپنی عام رعایا کی خوشحالی کا وہ منظر نہیں دکھا سکتا جو تاریخ دورِ فاروقی میں دکھاتی ہے۔

حُسنِ معاشرت

تدبیرِ منزل کے رہنما اصُول و ہدایات کے ضمن میں قرآن کریم نے گھریلو زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور نزاعات کے حل کے لیے بھی ایسے احکام نازل فرمائے کہ ان کی اتباع و پیروی کے بعد باہمی خانگی جھگڑوں کا تصوّر بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ نکاح و طلاق اور خلع عدّت و نفقہ کے ابواب سے تعلق رکھنے والے بنیادی قوانین مقرر فرما دیئے تاکہ کسی بھی مرحلہ پر اجتماعی زندگی میں کسی طرح کی کوئی خرابی ضرر و تشویش یا فساد و نزاع کی نوبت نہ آسکے۔ اسی وجہ سے ایسی صُورت میں کہ زوجین علاقہ زوجیت و نکاح مدّت العمر کے لیے قائم کرچکے تھے لیکن جب وہ شریعت کے حدود و ضوابط کی پابندی سے عاجز ہیں تو ان کے لیے طلاق کے احکام نازل فرمائے اور ایسی صورت میں کہ باہمی اجتماعی زندگی مفاسد کا سرچشمہ بن چکی تھی اور بغیر عوض خاوند طلاق دینے پر آمادہ بھی نہیں تو خلع کا طریقہ مقرر کردیا کہ دیئے ہُوئے مہر کی واپسی پر عورت کو رشتۂ زوجیت سے جُدا کردیا جائے۔ حالانکہ اس تعلق کی حرمت اور مروّت اس بات کو گوارا نہ کرتی تھی، مرد اپنی عورت سے مہر کی واپسی کا مطالبہ کرے۔ مگر بمجبُوری شریعت نے اس کو گوارا کیا۔

چنانچہ ارشاد مبارک ہے:

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ	اور تمہارے واسطے حلال نہیں ہے کہ تم
اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ	اس مہر میں سے کوئی چیز واپس لو جو
اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ	تم نے ان عورتوں کو دے دیا ہے، مگر
خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ	جب کہ دونوں کو ڈر ہو کہ ہم احکامِ خداوندی

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۔

نہیں قائم کرسکیں گے پس اگر تم کو (اے حکام) اس بات کا خوف ہے کہ زوجین اللہ کے حدود و احکام نہیں قائم کرسکیں گے تو ان دونوں پر کوئی مضائقہ نہیں اس چیز کے لے لینے میں جو عورت لطور فدیہ (بدل خلع) کے دے۔

وراثت کے قوانین بھی مقرر کردیئے۔ قرآن کریم کا بہت بڑا حصہ ان احکام و قوانین پر بھی مشتمل ہے جو حدود و قصاص سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ جرائم اور ظلم و تعدی فساد و خونریزی نیز شراب و زنا انسانی معاشرت کے لیے امراض مہلکہ ہیں۔ اس بنا پر اجتماعی زندگی کو ان تباہ کاریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے قوانین مقرر کیے۔ یہ سب مستقل ابواب ہیں، جن کی قرآن کریم نے تحقیق و تفصیل سے رہنمائی فرمائی۔ اس موضوع میں باہمی معاہدات کی پابندی بھی بنیادی امر ہے۔ اس لیے عہد و میثاق کی پابندی اور ایفاء وعدہ کے اصول بھی قرآن کریم نے بیان فرمائے۔ اور یہ کہ فریقین عدل و انصاف ہر حالت میں ملحوظ رکھیں۔ شہادت و گواہی میں بھی یہ جذبہ کارفرما ہوا ہے قرابتوں اور دوستی کی رعایت سے ہرگز عدل و تقویٰ نہ چھوڑیں خواہ اپنے عزیز و قریب کے خلاف ہی گواہی دینی پڑے۔

کسی قوم کی فلاح و بہبود اور خود داری کے لیے کسب و اکتساب اور صنعت و حرفت کی صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے اور اس کے لیے بری و بحری سفر کرنا ہوتا ہے۔ تحصیل علم اور اس کی اشاعت بھی قومی وجود اور بقاء کے لیے لازم ہے تو یہ احکام بھی مشروع فرمائے۔ کسب معاش اور حصول علم کے لیے سفر کی ہدایت فرمائی گئی۔ اسراف و تبذیر یعنی فضول خرچی قوم کے انحطاط و زوال اور معاشرت کی تباہی اور بربادی کا سبب ہے۔ اس بنا پر اسراف

اور فضول خرچی سے سختی کے ساتھ روکا گیا جیسے اسراف اجتماعی مقاصد حیات کو فاسد کرنے والا ہے۔ ایسے ہی بخل کے مفاسد اور مضرتیں بھی کچھ کم نہیں، تو اس کو بھی منع کیا گیا۔ قمار بازی اور جُوا ایک خطرناک مرض ہے۔ قرآن کریم نے اس بدترین خصلت سے بھی باز رہنے کی تاکید فرمائی۔ بدگوئی بدکلامی عیب جوئی تفاخر و تعلّی تہمت و غیبت اور طعن و تشنیع یہ سب باتیں باہمی عداوت و نفرت پیدا کرتی ہیں تو ان عیوب سے معاشرہ کو پاک رکھنے کی بڑی تاکید فرمائی گئی۔

انسانی حقوق کا تحفظ فرمایا گیا۔ اس طرح کہ کسی مجرم کو کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو پر خیانت اور جنایت کی نظر بھی ڈالنے کی جرأت نہ ہو، اور قانون قصاص مقرر کرکے دنیا کو یہ بتادیا گیا کہ اللہ کے احکام اور قوانین امیر و غریب اور عزیز و ذلیل اور حاکم و محکوم سب کے واسطے برابر ہیں۔

اسلام سے قبل دورِ جاہلیت میں حدود اور سزاؤں کے اجراء میں امتیاز برتا جاتا تھا۔ امراء سردار اور سربرآوردہ افراد قوانین کی گرفت سے آزاد تھے اور غریبوں اور کم درجہ کے لوگ ایسے احکام کے پابند سمجھے جاتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ایک ایک قتل کے بدلہ دس دس افراد مارے جارہے ہیں اور آزاد اور غلام کا سوال اٹھایا جاتا۔ قرآن کریم نے اس شعبۂ حیات کی اصلاح کے لیے بھی انسانی حقوق کے تحفظ کا قانون جاری فرما دیا۔

تدبیر منزل کے اصول و ہدایات میں مسئلہ حجاب (پردہ) بھی ہے جس کو قرآن کریم نے بڑی وضاحت و تفصیل اور تاکید کے ساتھ ذکر فرمایا۔ ظاہر ہے کہ بے حجابی اور آزادانہ مردوں اور عورتوں کا میل جول نفس کے دواعی اور شہوتوں کے راستہ پر ڈال دینے والا ہے۔ یورپ کی عریانی اور وہاں کی معاشرت جن گندگیوں میں آلودہ ہے اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ یہ سب کچھ بے حجابی اور بے پردگی ہی کے آثار و نتائج ہیں۔ نفسانی شہوات اور ایسے ہی معاشرہ کو تباہ کرنے والے فتنوں سے بچانے کے لیے قرآن کریم نے حجاب کا حکم دیا اور بے پردگی عورتوں

کے لیے حرام کردی گئی تاکہ ان کی عزت و آبرو محفوظ رہے۔ اور خائنوں، بدباطن اور آوارہ لوگوں کی نگاہیں ان پر نہ پڑ سکیں۔ جاہلیت کے زمانہ میں عورتیں بے پردہ باہر نکلتی تھیں۔ میلوں اور مجمعوں میں بناؤ سنگار کرکے اپنی زیب و زینت کا اظہار کرتی تھیں قرآن کریم نے زمانۂ جاہلیت کے اس ناپاک طرزِ معاشرت کو سختی سے منع فرمایا۔ ارشاد خداوندی ہے۔

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا۔

(سورۃ الاحزاب)

اور قرار پکڑو تم اپنے گھروں میں اور بے پردہ اپنی زیبائش دکھاتی نہ پھرو۔ پہلے زمانہ جاہلیت میں بے پردہ پھرنے کی طرح اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتی رہو۔ اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ وہ تم سے گندگی کو دور کردے اے اہل بیت اور پاک کردے تم کو پوری طرح پاک کردینا۔

قرآن کریم کی اس تصریح نے یہ بتا دیا کہ تمدن اور معاشرت کی پاکی نیز عفت و آبرو کی حفاظت پردہ ہی میں ہے۔ اسلام کی تعلیم عورتوں کے لیے حیا اور عفت و پاک دامنی اور نفس پرستوں کی خیانت آلود نظروں سے ان کی عزت و ناموس کے دامن کو بے غبار رکھنا ہے۔ اس لیے ایسی باتیں اسلامی تمدن میں ہرگز قابل برداشت نہیں ہوسکتیں جو مفاسد اور برائیوں کا دروازہ کھول دیں۔

پردہ عورت کے لیے قید و بند نہیں جیسے کہ مغربی معاشرت کے دلدادہ لوگ کہہ دیا کرتے ہیں بلکہ پردہ عورت کی عزت و عظمت اور اس کی ناموس کی حفاظت ہے اور بے پردگی اس کی حقارت اور اہانت و ذلت ہے اور نفس پرستوں کی ناپاک نظروں اور ان کے بیہودہ خواہشات کے لیے ایک کھیل اور تماشا ہے۔

قرآن کریم نے اسی کے پیش نظر مسئلہ حجاب کا مقصد ہر قسم کی گندگی سے پاکی اور طہارت قرار دیا اور ذٰلکم اطھر لقلوبکم وقلوبھن حکمت ارشاد فرمائی اگر کسی ضرورت کی خاطر عورت کو باہر نکلنا ہو تو کس طرح باپردہ ضروریات کے لیے باہر نکلے۔ قرآن کریم نے نہایت واضح حکم نازل فرما دیا :

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا	اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی تمام عورتوں کو کہ وہ اپنے اوپر سے چادروں کا ایک حصہ نیچے لٹکا لیا کریں۔ یہ بات اس کے قریب تر ہوگی کہ وہ پہچانی جاسکیں گی (کہ وہ شریف اور صاحب ناموس خاتون ہے)۔ اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔
(سورۃ الاحزاب)	

بدن پر سے چادروں کا حصہ نیچے لٹکانے سے مراد چہروں کا چھپانا ہی ہے تاکہ چادروں سے پورا بدن مستور ہونے کے ساتھ چہرہ بھی چھپا رہے۔

حافظ ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانہ میں عورتیں بے پردہ باہر پھرا کرتی تھیں۔ حق تعالیٰ شانہ نے حکم دیا کہ وہ باپردہ باہر نکلا کریں تاکہ وہ کافر عورتوں سے ممتاز رہیں۔

تدبیر منزل سے تعلق رکھنے والے بیان کردہ یہ علوم اور اصول و ہدایات قرآن کریم میں از اوّل تا آخر متعدد مواقع پر اجمال و تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن ان اصول و ہدایات میں سے اکثر کو سورۂ بنی اسرائیل میں ایک ہی مقام پر جس جامعیت کے ساتھ ذکر کیا گیا وہ قرآن کریم کی معجزانہ خصوصیت ہے انسان جس قدر غور کرے گا حقائق و معارف اس پر اور منکشف ہوتے جائیں گے افکار و عقول متحیر ہیں کہ کیسے بلیغ انداز میں معاشرت اور اصلاح تمدن اور عقائد و اخلاق کے یہ اصول و آداب جمع کر دیے گئے۔ دیکھیے رب العالمین کا

ارشاد ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا
اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا
اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ
اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ
لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَ
قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا وَاخْفِضْ
جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ
وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ
صَغِيْرًا ۔ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ
نُفُوْسِكُمْ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ
فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا
وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ
وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا
اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ
الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ
لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ
عَنْهُمُ ابْتِغَاۗءَ رَحْمَةٍ مِّنْ
رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا
مَّيْسُوْرًا ۔ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً
اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ
فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۔ اِنَّ
رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ

اور آپ کے رب نے یہ قطعی حکم دے دیا ہے
کہ اللہ کے سوا اور کسی کی ہرگز عبادت نہ
کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو
اگر تمہارے پاس ماں باپ میں سے کوئی ایک
یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کے سامنے
اُف بھی نہ کرنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور
ان سے ادب و احترام کی بات کرنا۔
اور ان کے سامنے تواضع اور ادب سے جھکے رہنا
مہربانی کے جذبہ سے اور ان کے واسطے دعا
کرتے رہنا۔ اے پروردگار تو ان پر اپنی
رحمتیں فرما جس طرح کہ انہوں نے بچپن میں
پالا اور تربیت کی۔ تمہارا رب خوب جانتا
ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے۔ اگر تم
سعادت مند ہو (اور ایسی صورت میں تمہارے
سے کوئی فرو گذاشت ہوگئی) تو وہ توبہ و
معذرت کرنے والوں کو بخشنے والا ہے اور
قرابت دار کو اس کا حق ادا کرتے رہو اور
مسکین و مسافر کا بھی اور اپنا مال فضول خرچی
میں ضائع مت کرو۔ فضول خرچی سے مال
اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور
شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔
اور اگر ان لوگوں سے اعراض کرنا پڑے

وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ
خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ۔
وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ
اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ
اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا
وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ
فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِيْلًا وَلَا
تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ
اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا
فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا
فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ اِنَّهٗ كَانَ
مَنْصُوْرًا ۔ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ
اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ
اَشُدَّهٗ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ
الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا وَاَوْفُوا الْكَيْلَ
اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ
ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۔
وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ
اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ
اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا وَ
لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّكَ
لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ
الْجِبَالَ طُوْلًا ۔ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ

اپنے ربّ کی اس رحمت کے خواہاں و
طلبگار ہوتے ہوئے جس کی تم اُمید کرتے ہو۔
تو ان سے نرم بات کرنا اور اپنے ہاتھ کو
بندھا ہُوا نہ بنائے اپنی گردن کی طرف
(گویا ہاتھ سکڑ کر گردن سے جکڑ دیا گیا ہے)
اور نہ ہاتھ کو دراز کر اور پھیلا دے پوری طرح
پھیلا لینا۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ تو بیٹھ رہے
تہی دست اور عاجز و درماندہ ہو کر بیشک
تیرا ربّ ہی رزق وسیع کرتا ہے جس کے واسطے
چاہے اور جس کے لیے تنگ کر دیتا ہے۔
بیشک وہ اپنے بندوں کے حال سے بڑا ہی
خبردار اور دیکھنے والا ہے۔
اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو" مفلسی اور
غربت کے ڈر سے ہم ان کو بھی رزق دیتے
ہیں اور تم کو بھی یقیناً ان کا قتل کرنا بہت ہی
بڑا گناہ ہے۔
اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ کیونکہ یہ
بہت ہی بے حیائی کا کام اور بہت بُرا
طریقہ ہے اور ہرگز کسی جان کو قتل نہ کرو
جس کا قتل کرنا اللہ نے حرام کیا ہے سوائے
کسی حق (شرعی) کے اور اگر کوئی ظلم سے
ساتھ قتل کر دیا جائے تو ہم نے مقتول کے
ولی کے لیے (قصاص) کا اختیار دے دیا

سَيِّئُهُ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا
ذٰلِكَ مِمَّا اَوْحٰى اِلَيْكَ رَبُّكَ
مِنَ الْحِكْمَةِ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ
اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ
جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۔

(سورۃ بنی اسرائیل)

لیکن وہ قصاص لینے میں تعدی اور زیادتی
نہ کرے کیونکہ اسی کی مدد کی جائے گی یعنی
انصاف سے قصاص لینے والے ہی کی کامیابی
ہے۔ اور یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ
جب تک کہ وہ اپنی جوانی کو نہ پہنچ جائے
مگر ایسے طریقہ سے جو بہتر ہو۔ اور عہد پورا
کرو کیونکہ عہد و پیمان پر پرسش ہوگی اور
ناپ پورا کرکے دو جب تم کسی کو ناپ کر
دو اور تولو تم برابر اور سیدھی ترازو سے۔
اسی میں خیر و برکت ہے اور انجام کار بہترائی ہے
اور کسی ایسی بات کے پیچھے نہ پڑو جس کا
تمہیں علم نہیں۔ بے شک کان اور آنکھ اور
دل سب ہی سے پرسش ہوگی۔ اور زمین پر
اکڑتا ہوا نہ چل کیونکہ نہ تو زمین پھاڑ ڈالے گا
اور نہ بلندی میں پہاڑوں تک پہنچ سکے گا۔
ان باتوں میں ہر ایک بری چیز تیرے رب
کے نزدیک ناپسند ہے۔ یہ سب کچھ ان
باتوں میں سے ہیں کی وحی (اے پیغمبر
صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے رب نے آپ
کی طرف کی حکمت و دانائی کی باتوں میں سے
اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود نہ قرار
دے ورنہ تو ملزم اور راندہ درگاہ بنا کر جہنم میں
ڈال دیا جائے گا۔

لہ آیات مبارکہ بیہ بر شمار بلحاظ احکام مذکورہ ہیں تو ان آیات میں توحید خداوندی کے لے کر آخر تک

ان آیاتِ مبارکہ میں جو احکام ذکر فرمائے گئے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) توحید خداوندی (۲) والدین کے ساتھ حسن سلوک، نرمی اور تواضع کا برتاؤ اور اپنے کسی بھی قول وفعل سے ان کی ادنی درجہ کی دل آزاری نہ ہونے دینا۔ (۳) قرابت داروں کے حقوق کی ادائیگی (۴) اسراف وفضول خرچی کی ممانعت (۵) بخل کی ممانعت و مذمت۔ (۶) قتل اولاد کی ممانعت۔ (۷) زنا اور جملہ بے حیائیوں سے پرہیز کا حکم (۸) قتل نفس کی حرمت (۹) مال یتیم میں خیانت کی حرمت و ممانعت اور اس کی ہمدردی وخیر خواہی کا حکم۔ (۱۰) معاہدوں اور وعدوں کی پابندی اور ان کے پورا کرنے کا حکم (۱۱) ناپ تول پورا کرنے کی تاکید (۱۲) بے تحقیق کسی بات کے درپے ہونے کی ممانعت۔ (۱۳) نخوت وغرور کی ممانعت

بہرکیف یہ تمام احکام ایسے ہیں کہ ان کے ساتھ انسان کے عقائد، اعمال و اخلاق اور روح کی صفائی اور تدبیر منزل و انتظام عالم کی خوبی وابستہ ہے کس خوبی اور لطافت و بلاغت اور ترغیب و ترہیب کے انداز میں بیان فرمایا گیا کہ ہر وہ شخص جو ادنیٰ توجہ کی نظر بھی ان پر ڈالے گا وہ سمجھ لے گا کہ واقعی رب العالمین کے نازل کردہ یہ احکام عین حکمت ہیں اور ان میں سے ہر ایک چیز نظام عالم کی صلاح و کامیابی کا ذریعہ ہے۔ اسی بناء پر اخیر میں ارشاد فرمایا گیا ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ کہ یہ باتیں حکمت اور فلاح و کامیابی کے امور میں سے ہیں جن کی وحی اللہ نے آپ کی طرف کی ہے۔

پھر کلام الٰہی کی اس بلاغت اور لطافت کا بھی اندازہ کیجئے کیسے عجیب اسلوب سے ان احکام کو جس مضمون توحید سے شروع فرمایا تھا اسی مضمون پر ان کو ختم فرمایا۔ یہ ارشاد فرماتے ہوئے وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ کہ خدا کو کسی کا شریک نہ قرار دینا ورنہ تو ذلیل و رسوا اور درماندہ ہو کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

سُبْحَانَ مَنْ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا۔

سیاست مُدن

انسانی سعادت و فلاح کے امور اگر کسی قوم کی اجتماعی زندگی اور ملکی معاملات سے تعلق رکھتے ہوں تو ان کی ہدایت و رہنمائی اور اصلاح کو علم سیاست مدن جاتا ہے ۔ انسان کی عملی قوتوں کی درستگی اور سعادت اس علم پر بھی اسی طرح موقوف ہے جیسے علم تہذیب النفس اور علم تدبیر منزل پر ۔ تو قرآن کریم نے نظام مملکت و حکومت اور قوم کی اجتماعی زندگی سے متعلق امور بھی اصولی اور بنیادی طور پہ بیان فرمائے ہیں ۔

سیاست کا مفہوم از روئے لغت نگرانی اور ضروریات و حوائج کا مہیا کرنا ہے اور اصطلاح میں سیاست القوم ، قوم کی خیر خواہی نگرانی اور ان کی ضروریات و حاجات کے مہیا کرنے ان سے مضرتوں کے ازالہ اور آرام و راحت اور منفعت کے اسباب مہیا کرنے نیز ان جملہ امور ، جو اس قوم کے حال و استقبال میں باعث فلاح و کامرانی ہوں کی رہنمائی اور داخلی و خارجی امور و لوازم کی تدبیر و استحکام کو کہا جاتا ہے ۔ ان تمام امور کی کفالت اور ذمہ داری کے انجام دینے کا نام ہی سیاسی قیادت ہے ۔

شریعت کے نقطۂ نظر سے سیاست کا مفہوم اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ قوم کے معاش اور معاد کے جملہ لوازم و حوائج اور دونوں پہلوؤں سے ان کے احوال بہتر سے بہتر بنانا ۔ یہ بات ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی کے لیے کسی حکومت کا قیام اور اس کا غلبہ ضروری ہے کیونکہ انسان کی زندگی حیوانات و بہائم کی زندگی سے ممتاز و جدا ہے ۔ حیوانات مکلف نہیں ان کی زندگی انفرادی ہے وہ معاملات و تجارت و ملازمت صنعت و حرفت اور

لباس و خورد و نوش کے انتظامات کے محتاج نہیں ۔ اس بناء پر ان کے لیے کسی سیاسی قیادت اور حکمران طاقت کی ضرورت نہیں ہے کہ ان کے اغراض و مقاصد بغیر اس کے مکمل نہ ہو سکیں ۔ اس کے برعکس انسان مکلّف ہے ۔ عقل و شعور اور تدبیر کی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں وہ اپنی حیات میں معاملات تجارت ملازمت صنعت و حرفت اور جملہ لوازم زندگی کی تدبیروں اور ان کو مہیا کرنے کا محتاج ہے تو ضروری ہے کہ ان جملہ مقاصد کی اجتماعی طور پر تکمیل کے لیے سیاسی قیادت اور حکمران طاقت کا غلبہ اور تسلّط ہو اور اس طرح دنیا راحت و عافیت کے ساتھ مقاصد زندگی کے مقاصد حاصل کرتی رہے ۔

انسانی زندگی کی عافیت اور استحکام سلطنت احکام خداوندی میں مضمر ہے

انسانی زندگی کی عافیت و راحت اور اس کی عظمت و برتری اور تحفظ حقوق کے واسطے نظام العمل اور دستور بھی ضروری ہے تاکہ بنی نوع انسان ان احکام و قوانین کی پابندی کرتے رہیں ۔ اسی دستور و نظام العمل کو آئین اور قوانین سیاسیہ کہا جاتا ہے جن کے ماتحت کسی سلطنت کے باشندے احکام سلطنت کی خلاف ورزی کی جرأت نہ کر سکیں ۔ اور اسی طرح بنی نوع انسان کے اجتماعی اغراض و مقاصد اور فلاح و ترقی کے کاموں میں کوئی رکاوٹ اور خلل واقع نہ ہو سکے ۔ اگر کوئی سلطنت کوئی دستور وضع نہ کر سکے یا اپنے اقتدار و قوت سے اس کے چلانے میں ناکام رہے یا وہ دستور اس قابل ہی نہ ہو کہ لوگ اس کے ذریعے سعادت و فلاح اور کامیابی حاصل کریں تو ظاہر ہے کہ اس کا انجام قوم کی بدحالی و تباہی اور سلطنت کی بربادی ہے۔

سیاسی قوانین اور ملکی دستور و آئین خواہ کوئی فرد وضع کرے یا جماعت وہ نوع انسانی کے مقاصد حیات کی تکمیل سے یقیناً قاصر رہے گا ۔ اس لیے کہ جو فرد یا جماعت آئین وضع کرے گی اوّل تو علم انسانی کا قصور اس کے فہم اور نظر و فکر کی کمی شامل رہے گی ۔ پھر یہ کہ انسان کا بنایا ہوا قانون اس کی ذاتی اغراض

اور نفسانی خواہشات کی آلودگی سے پاک نہیں ہو سکتا - علاوہ ازیں اہل فکر اور عقلاء باہم مختلف ہوتے ہیں - اس کے بعد یہ کہ ایسا دستور جب کسی قوم پر جاری کیا جاتا ہے تو اس ملک میں بسنے والے طبقے اپنے اغراض میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور جب کسی طبقہ کی اغراض ان قوانین کے ہوتے ہوئے پوری نہیں ہوتیں تو بغاوت و مخالفت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ عام بدامنی لوٹ مار۔ قتل و غارت گری اور ہنگامہ و فساد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے تو ایسا قانون جو دنیا میں بسنے والی آبادی تمام مختلف الانواع و اغراض کے مقاصد و حوائج کی تکمیل کر سکے اور ہر قسم کی ذاتی اغراض و مفاد سے پاک ہو - زندگی کے ہر مرحلہ اور پہلو پر پوری پوری رہنمائی کرتا ہو - ہر طبقہ کے جملہ حقوق کا ہر طرح تحفظ ہو - بدامنی اور فساد سے معاشرہ کو بچانے والا ہو - ایسا قانون صرف قانون خداوندی ہی ہو سکتا ہے - کیونکہ اس کا علم ساری کائنات کو محیط ہے - اس کی حکمتیں بھی بے پایاں ہیں - وہ ایسا حکیم و دانا اور مدبر ہے کہ کائنات کا ایک ایک ذرہ اس کے علم و حکمت کی شہادت ہے - اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَ هُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ - اور وَهُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ کی صدا ہر ایک کی زبان حال ہے - اس کی رحمت بھی بے حد و نہایت ہے - اس لیے ظاہر ہے کہ اس رب العالمین کا قانون بھی سب سے اعلیٰ اور بلند پایہ - ہر قسم کے عیب و نقص سے پاک اور انسان کی ہر بھلائی اور خیر اس کی فلاح و سعادت کا ضامن ہوگا - اسرار و حکمتوں سے لبریز ہوگا - مخلوق کی تمام مصلحتیں اور منفعتیں اور حقوق کا تحفظ بھی اسی میں ہوگا - راحت و آرام اور عافیت کے جملہ اسباب اسی سے حاصل کیے جا سکیں گے فساد و بدامنی سے بھی یہی قانون نجات دلا سکے گا - حق تعالیٰ شانہ تمام کارخانۂ عالم کا پیدا کرنے والا ہے - خالقیت صرف اسی کے واسطے ہے - اس لیے اس کارخانۂ عالم کو چلانے والا بھی صرف وہی پروردگار ہے - وہی بتانے والا ہے -

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ - اسی کا مقرر کردہ نظام اور دستور اس

کارخانہ کو صحیح چلا سکتا ہے کیونکہ اس نے جیسی بلند پایہ حکمتوں اور خوبیوں کے ساتھ آسمانوں اور زمین اور تمام مخلوقات کو پیدا کیا ایسا ہی بلند پایہ اور محکم نظام اور قانون بھی مقرر فرما دیا جس پر بنی نوع انسان اپنا نظام حیات چلا سکے۔ چاند سورج اور ستاروں کا ایک ایسا عجیب تکوینی نظام متعین فرمایا ہے کہ ہر ایک بہترین اسلوب کے ساتھ اپنی گردش میں لگا ہوا ہے نہ کسی قسم کا خلل ہے اور نہ فساد نہ ایک دوسرے سے تصادم و ٹکراؤ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (یٰسٓ)

وہ اپنی شانِ حکیمی سے تمام عالم کا نظام سنبھالے ہوئے ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ۔

(سورۃ الرعد)

اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے کہ جن کو تم دیکھتے ہو بلند کیا۔ پھر وہ عرش پر مستوی ہوا اور تابع بنایا سورج اور چاند کو (اپنے حکم کا) پس ہر ایک چلے اور مقرر کردہ وقت تک کے لیے چلتا رہا ہے اس حال میں کہ وہ ہر امر کی تدبیر کرتا ہے اور کھول کھول کر اپنی نشانیاں و احکام بیان کرتا ہے امید ہے کہ تم اپنے ربّ کی ملاقات پر یقین کرنے والے ہو جاؤ۔

اسی کی شان ہے يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ۔ چاند اور سورج کا طلوع و غروب ستاروں کی رفتار ہواؤں کا چلنا، درختوں، پھلوں اور پھولوں کا اُگنا غلوں اور کھیتیوں کا پکنا غرض کائنات کا یہ کل نظام ایک عجیب حکیمانہ اسلوب کے ساتھ جاری ہے۔ تو ایسا ہی محکم اور بلند پایہ بہترین حکمتوں سے معمور نظام تشریعی بھی حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کے واسطے مقرر فرما دیا ہے کہ دنیا میں بسنے والے تمام گروہ اور مختلف الحال اور مزاج بلکہ متضاد افکار و آراء رکھنے والے طبقات بھی

اگر اس کی اتباع و پیروی کریں تو اپنی زندگی ایسی ہی پُرامن اور باعافیت گذار سکتے ہیں کہ نہ کسی کا کسی دوسرے سے ٹکراؤ اور تصادم ہو نہ توڑ پھوڑ اور نہ بدامنی و فساد بلکہ ہر ایک گروہ اپنے دائرہ حیات میں رہتے ہوئے سعادت و فلاح کی منزلیں طے کرتا رہے۔ جس طرح یہ چاند سورج اور ستارے اپنے اپنے افلاک و بروج میں بڑے سلیقہ اور حُسن و خوبی اور ترتیب کے ساتھ مصروف گردش ہیں۔

کائنات میں اسی تشریعی نظام کو جاری کرنے کے لیے حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی خلافت کا منصب عطا فرما کر زمین پر اُتارا۔ خلافت الٰہیہ کی یہی غرض تھی کہ آدم علیہ السلام احکامِ خداوندی اور قانون الٰہی کا احیاء و نفاذ کریں۔ ارشاد ربانی ہے:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کہ میں زمین پر اپنا ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے یہ دیکھ کر کہ نوع انسان نفسانی شہوتوں اور اغراض میں پڑ کر یقیناً بے راہ روی اختیار کرے گا اور اس کا انجام فساد فی الارض کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ عرض کیا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ کہ اے پروردگار کیا تو زمین میں ایک ایسی مخلوق بنائے گا جو زمین میں فساد برپا کرے اور خون بہائے۔ لیکن حق تعالیٰ شانہٗ تو اپنی حکمت بالغہ سے اپنے خلیفہ کے ذریعہ تمام عالم کے واسطے ایک ایسا نظام اور قانون عطا فرمانے والا تھا کہ جو فساد و بدامنی کو بیخ و بُن سے ختم کر کے دُنیا کو امن و عافیت کا گہوارہ طاعت و عبادت اور محاسن اعمال و اخلاق کا مرکز بنانے والا تھا اس وجہ سے جواب میں ارشاد فرمایا گیا:

اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ بیشک میں جانتا ہوں وہ بات جو تم نہیں جانتے۔

حضرت آدمؑ کے بعد خدا کے تمام پیغمبر اور رسول اللہ کے احکام اور قوانین سے اولادِ آدم کو آگاہ کرتے رہے تاکہ ان کی اصلاح و فلاح کا باعث ہو۔ ان کی عقلیں علوم الٰہیہ کے انوار سے منور و روشن ہو جائیں۔ نفسانی اور شیطانی اعمال

و اخلاق کی نجاستوں ظلمتوں اور کدورتوں کو پہچان کر ان سے پرہیز کریں۔ تمدن اور امن عالم کو تباہ کرنے والی کوئی چیز نفسانی شہوتوں اور اغراض سے بڑھ کر نہیں تو انسان اللہ کے اس قانون سے جس میں نفسانی خواہش اور کسی غرض کا کوئی امکان نہیں اپنے تمدن اور معاشرت کو بلند پایہ بنائیں۔

ابتداء آفرینش عالم میں نبوت و رسالت خلافت و بادشاہت کی شکل میں نمودار ہوئی حضرت آدم علیہ السلام نبی اور رسول بھی تھے اور خلیفہ و بادشاہ بھی تھے۔ پھر آدم علیہ السلام کے بعد نبوت کا ظہور مختلف صورتوں میں ہوتا رہا۔ کبھی بصورت بادشاہی ہوا جیسے حضرت داؤد و حضرت سلیمانؑ کی نبوت بادشاہی کی صورت میں نموداری ہوئی۔ اور کبھی بصورت علم و حکمت اور کبھی بصورت زہد و درویشی ہوا جیسے حضرت زکریا علیہ السلام کہ ان کی نبوت بشکل علم و حکمت تھی اور حضرت یونسؑ حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہم السلام کہ ان حضرات کی نبوت زہد و عبادت اور فقیری و درویشی کے رنگ میں تھی۔

آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ افضل الرسل تھے اور خاتم الانبیاء تھے اس لیے آپؐ کی نبوت و رسالت ان تمام شکلوں اور صورتوں کو جامع ہوئی۔ ابتداءً علم و حکمت اور زہد و درویشی سے ہو جیسے کہ ارشاد خداوندی ہے: هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ[1] اور انتہاء و تکمیل بادشاہت پر ہوئی کہ فتح مکہ مکرمہ کے بعد نبوت کے بعد بادشاہت بھی شامل ہوگئی۔

ہجرت کے بعد کے مسلسل نو دس سال جہاد اور کافروں سے مقابلہ میں گذرے مال غنیمت اور مال فیٔ نیز جزیہ و خراج سے اسلام کی شوکت و غلبہ تمام عالم پر قائم ہوگیا اور مسلمانوں کا معاشی اور اقتصادی نظام بھی مستحکم ہوگیا تو اس طرح حق تعالیٰ شانہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت و رسالت کے ساتھ

---

[1] سورۃ الجمعۃ۔

بادشاہت بھی عطا فرمائی۔ اور جو چیز اللہ نے آپ کو دکھائی کہ زمین کے مشرق و مغرب کے کنارے آپ کے واسطے سمیٹ دیئے گئے اور قیصر و کسریٰ کے خزائن اور ان کی کنجیاں آپ کو دے دی گئیں اس کی تکمیل اللہ نے خلفاء راشدین کے دور میں کر دی کہ قیصر و کسریٰ کے خزانے اور ان کے تاج و تخت کے جواہرات مسجد نبویؐ کے صحن میں لاکر ڈالے گئے۔ یہ سب کچھ عظمت و برتری اور فتوحات اللہ کے قانون اور دستور کی بدولت تھیں اور اسی پر خلفاء راشدین کے زمانہ میں نظام حکومت چل رہا تھا۔ جو تاریخ عالم کا سب سے زائد خوش حال اور پُرامن دور کہا جا سکتا ہے۔

سلہ ہندوستان میں ۱۹۳۵ء میں گاندھی نے کانگریسی وزراء کے نام ایک ہدایت جاری کی تھی جس میں کہا تھا کہ میں وزراء کو نصیحت کرتا ہوں کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ کے طریقہ پر چلیں۔ اور اسی طرح حکومت کریں جیسے انہوں نے کی" اس پر ہندو پریس بہت سیخ پا ہو گیا تھا۔ اور کافی کھلبلی مچی تھی۔ معلوم ہوا کہ کافروں اور مشرکوں کے ایک بڑے لیڈر کی نظر میں بھی ابوبکرؓ و عمرؓ کی حکمرانی اور عادلانہ نظام ایک ایسے پاک اور عظیم دستور پر جاری تھا کہ اس کی نظیر صفحۂ ہستی پر نظر نہیں آتی۔ حالانکہ امریکہ۔ برطانیہ اور روس جیسی حکومتیں اور ان کا دستور بھی سامنے موجود تھا۔ افسوس کا مقام ہے کہ آج خود مسلمان اس چیز سے ناواقف ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ان کو کیسی عظیم نعمت سے سرفراز فرمایا ہے۔ خلفاء راشدین کے بعد خلفاء بنو امیہ پھر خلفائے بنو عباسیہ پر نظر ڈالیے اس کے بعد محمد بن قاسم فاتح سندھ، سلطان محمود غزنوی، سلطان صلاح الدین اور سلطان نورالدین کے زمانہ کو دیکھیے کہ جس جاہ و جلال اور شان و شوکت سے حکومت کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان فاتحان عالم کا دستور و قانون کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھا۔

سلاطین مغلیہ کے آخری دور میں سلطان اورنگ زیب غازی نے قانون شریعت کا ایک عظیم مجموعہ مرتب علماء شریعت کی نگرانی و اعانت سے مرتب کیا جو فتاویٰ عالمگیری کے نام سے مشہور ہے۔ ہندوستان اور مصر میں طبع ہوا۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

غرض قرآن کریم نے دُنیا کو ایک ایسے قانون و دستور کی رہنمائی کی جس پر دُنیا نہایت ہی امن و عافیت اور خوشحالی کے ساتھ زندگی گذار سکے اور اس دستور کی بدولت حکومت کا نظم و نسق بھی بہترین اسلوب پر چل سکے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) حکومت ترکیہ کے آخری خلیفہ سلطان عبدالحمید خان نے اپنے زمانہ کے علماء کو جمع کرکے "مجلۃ عدلیہ" کے نام سے ایک شرعی قانون مرتب کرایا جس میں نمبروار دفعات قائم کی گئیں۔ تمام ملک میں وہی قانون جاری رہا اور تمام عدالتوں کے حکام اسی کے مطابق فیصلے کرتے رہے۔ دُنیا کے بڑے بڑے ماہرین قانون نے اس مجلۃ عدلیہ کی شرحیں لکھیں حتیٰ کہ عیسائی وکیلوں نے بھی اس کی شرحیں لکھیں جو دمشق و بیروت کے کتب خانوں میں دستیاب ہو سکتی ہیں۔

والد محترم حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ نے اپنی ایک بلند پایہ تالیف "دستور اسلام" میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ موصوف نے ان عیسائی وکیلوں کی شروح دمشق و بیروت کے کتب خانوں میں دیکھیں اور خود موصوف کے ذاتی کتب خانہ میں مجلۃ عدلیہ کا نسخہ موجود ہے۔

مجلۃ عدلیہ کے طرز پر ایک اور کتاب مرشد الحیران بھی لکھی گئی جو مصر سے شائع ہوئی اس میں اسلامی قانون بہ شکل دفعات نمبروار مرتب کیا گیا ہے۔ کاش مسلمان حکومتیں اپنے ان فراموش و نظر انداز کیے ہوئے ترکوں اور میراث کو حاصل کرنے کی فکر کریں۔ اور ان سے مستفید ہوں۔

عرصہ ہوا مصر سے کتاب المقارنات التشریعیہ چار جلدوں میں شائع ہوئی اس کے مصنف علامہ سید عبداللہ علی حسین ازہری ہیں جنہوں نے پیرس میں تقریباً بیس سال بیرسٹری کی۔ فاضل مصنف نے اس کتاب میں اسلامی قانون اور فرانسیسی قانون کا مقابلہ کرکے بتایا ہے کہ فرانسیسی قانون میں کیا کیا نقائص ہیں اور اسلامی قانون میں کیا کیا خوبیاں ہیں۔ یہ کتاب قاہرہ میں ۱۹۴۷ء میں طبع ہوئی۔ دو سو سال قبل کی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ مشرق و مغرب میں اسلامی حکومتیں پھیلی ہوئی تھیں اور آٹھ سو سال ہندوستان میں بھی اسلامی حکومت رہی۔ ان سب کا قانون اسلام ہی تھا۔

دُنیا نے دیکھ لیا کہ خلفائے راشدین کی حکومت و سلطنت ذوالقرنین اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کا نمونہ تھی ۔ اور آج دُنیا کی دو بڑی عظیم طاقتور حکومتیں یعنی رُوس و امریکہ فرعون و نمرود اور بخت نصر کی سلطنت کا نمونہ ہیں ۔ فرعون نے تو صرف بنی اسرائیل ہی کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا تھا اور ان کے بچوں کو ذبح کیا تھا ، لیکن ان ظالموں نے تو امن عالم کو تباہ و برباد کر رکھا ہے ۔ ان کی ایٹمی طاقتوں سے ایک گھنٹہ ہی میں اس قدر انسانی جانیں ہلاک و ضائع ہو جاتی ہیں جتنی جانیں فرعون اپنے کُل دورِ اقتدار میں بھی ہلاک نہ کر سکا ہوگا ۔

امیر کے اوصاف

قرآن کریم نے بنیادی اور اصولی طور پر اس امر کی بھی رہنمائی کی ہے کہ کسی قوم کی قیادت اور نظام مملکت قائم کرنے کے لیے امیر کے اوصاف کیا ہونے چاہئیں؟ قرآن کریم نے بنی اسرائیل کے ایک گروہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے اپنے پیغمبر سے درخواست کی کہ ان کے واسطے کوئی امیر و قائد مقرر کر دیا جائے۔ ان کی درخواست منظور کی گئی اور فرمایا گیا:

إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا۔ (سورۃ بقرہ)

بے شک اللہ نے مقرر کر دیا ہے تمہارے واسطے طالوت کو بادشاہ۔

تاکہ وہ تمہاری قیادت کریں اور ملکی نظم و نسق قائم کریں۔ اور تم ان کی قیادت و اتباع میں اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ اس پر یہ گروہ ان کی امارت پر طعن کرنے لگا اور کہا:

أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ

کہاں ہو سکتی ہے ان کے واسطے ہم پر بادشاہت و حکمرانی۔ حالانکہ ہم اس امارت و بادشاہت کے بہ نسبت ان کے زائد مستحق ہیں اور ان کو تو مال و دولت میں وسعت بھی نہیں دی گئی ہے

گویا اس گروہ کے زعم میں یہ بات تھی مال و دولت میں بڑھا ہوا ہونا امارت و بادشاہت کے استحقاق کی دلیل ہے اور جس غریب کے پاس مال و دولت نہیں اس کو کس طرح زمام اقتدار دے دی جائے۔ قرآن کریم نے ان کے اس

باطل اور غیر معقول نظریہ کی تردید کی اور فرمایا:

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ (سورۃ بقرہ)	ان کے نبی نے کہا بے شک اللہ نے طالوت کو تم پر منتخب و برگزیدہ بنایا ہے اور زائد کیا ہے ان کو علم کی وسعت میں اور جسمانی قوت میں۔

یعنی اقتدار و حکمرانی کا استحقاق تمول و دولت مندی سے نہیں ہوتا۔ اس باب میں مالی وسعت کوئی چیز نہیں بلکہ علم کی وسعت اور جسمانی ہمت و قوت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ نظام حکومت کے لیے علمی اوصاف و کمالات ضروری ہیں اور اسی کے ساتھ طاقت و ہمت بھی درکار ہے تاکہ امیر و حاکم اپنی شجاعت و ہمت سے حکومت کے دشمنوں اور باغیوں کی سرکوبی کر سکے اور جسمانی قوتوں سے ان ذمہ داریوں کو پورا کر سکے جو کسی قوم کے راعی پر عائد ہوتی ہیں۔ اور یہی دو قوتیں انسان کو عظمت و برتری سے ہمکنار کر سکتی ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ نے خلافت کی تعریف میں یہ کلمات ذکر فرمائے:

هِىَ الرِّيَاسَةُ الْعَامَّةُ فِى التَّصَدِّىْ لِاِقَامَةِ الدِّيْنِ بِاِحْيَاءِ الْعُلُوْمِ الدِّيْنِيَّةِ وَاِقَامَةِ اَرْكَانِ الْاِسْلَامِ وَالْقِيَامِ بِالْجِهَادِ وَمَا يَتَعَلَّقُ بِهٖ مِنْ تَرْتِيْبِ الْجُيُوْشِ وَالْفَرْضِ لِلْمُقَاتِلَةِ وَاِعْطَائِهِمْ مِنَ الْفَيْءِ وَالْقِيَامِ بِالْقَضَاءِ	خلافت وہ ایک عمومی سیادت و سرپرستی کا نام ہے جو کلیۃً اقامت دین کی فکر اور جدوجہد میں لگ جانے کے لیے ہو۔ دینی علوم کو زندہ کرنے کی صورت سے اور ارکان اسلام کے قیام اور جہاد کی تیاری کرتے ہوئے اور جو امور اس سے متعلق ہیں مثلاً لشکروں کی تیاری اور مجاہدین کے وظائف کا تقرر و تعین اور ان کو مال غنیمت اور فیء سے

وَاِقَامَةِ الْحُدُوْدِ وَدَفْعِ الْمَظَالِمِ وَالْاَمْرِ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ نِيَابَةً عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ۔	عطا کرنا۔ قضاء و عدالت کا قیام اور حدود و سزاؤں کا اجرا اور مظالم و تعدی (کی جملہ صورتوں) کا ازالہ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ غرض ان جملہ فرائض کی انجام دہی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کے طور پر یعنی ان احکام کی پیروی کرتے ہوئے، جو آنحضرت نے طے فرمائے نہ یہ کہ خلافت و امارت کے امور کسی دوسرے قانون کے تحت انجام دیئے جائیں۔

اور ظاہر ہے کہ خلافت و امارت کی ان تمام ذمہ داریوں کی تکمیل علمی وسعت اور جسمانی قوت کی محتاج ہے جس کی طرف قرآن کریم کے ان دو لفظوں نے اشارہ کر دیا۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ازالۃ الخلفاء میں شرائط خلافت کے بیان میں فرمایا کہ خلافت کی سب سے اولین شرط مسلمان ہونا ہے کیونکہ یہ بات کسی طرح بھی اسلامی عظمت کے لحاظ سے زیب نہیں دیتی کہ مسلمان قوم کا قائد کافر شخص ہو۔ قرآن کریم کے اس ارشاد مبارک نے خلافت کی اس بنیادی شرط کو واضح کر دیا ہے:

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۔ (سورۃ نساء)	اور ہرگز نہیں بنائے گا اللہ تعالیٰ کافروں کے واسطے مسلمانوں پر کوئی سبیل (یعنی اقتدار و سرپرستی کا راستہ)

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ عہدۂ خلافت پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہ تمام کسی کافر شخص سے انجام نہیں پا سکتیں۔ یہی وجہ ہے امت میں یہ مسئلہ

متفق علیہ ہے کہ امیر و حاکم کو مرتد ہوجانے پر خلافت سے معزول کر دیا جاتا ہے اور اگر وہ تسلط و غلبہ سے مزاحمت کرے عامۃ المسلمین پر اس کے ساتھ قتال کرنا لازم ہوجاتا ہے۔ اس مسئلہ سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ خلیفہ میں اوصاف ارتداد میں سے اگر کوئی وصف پیدا ہوجائے تو اس کو واجب العزل سمجھا جائے گا۔
دوسری شرط عقل و بلوغ ہے کیونکہ مجنون و پاگل اور سفیہ یا نابالغ بچہ کو تو خود اس کا مال بھی سپرد نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس کو اس امر کی اجازت نہیں کہ وہ اپنے معاملات میں تصرف کرے جیسے کہ ارشاد ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا (سورۃ نساء)

اور مت دو بے عقلوں کو تم اپنے وہ اموال جن میں اللہ نے تمہارے واسطے قیام اور بقاء حیات کا سامان بنایا ہے

نیز فرمایا گیا:

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ۔ (سورۃ نساء)

اور آزماؤ تم یتامی کے مال کو حتیٰ کہ وہ نکاح و بلوغ کے زمانہ کو پہنچ جائیں۔ پھر جب ان سے محسوس کرو رشد (یعنی سمجھداری اور اصابت رائے) تو پھر ان کے اموال ان کو دے دو۔

تو جب سفیہ و کم عقل اور نابالغ بچے اس قابل بھی نہیں کہ وہ اپنے مالوں میں تصرف کریں اور اپنے معاملات انجام دیں تو یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے ایسے سفہاء اور بے عقلوں یا بد عقلوں کو کسی قوم کے تمام افراد کے جانوں اور مالوں کا ولی اور سرپرست بنا دیا جائے۔ جب ایک یتیم کو خود اس کے مال کا بھی اس وقت تک مالک نہیں بنایا جاتا جب تک تجربہ نہ ہوجائے تو بھلا یہ کیسے صحیح ہوگا ایسے کسی شخص کو لاکھوں اور کروڑوں افراد کی زندگیوں کا مالک بنا دیا جائے۔
امارت کی اس شرط سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ جو شخص شراب اور

نشہ آور چیزوں کے استعمال سے اپنے ہوش و حواس اور عقل و شعور کو معطل رکھے وہ اس قابل نہیں کہ اس کو مسلمانوں کی قیادت سپرد کی جائے۔

تیسری شرط مرد ہونا ہے کیونکہ یہ فطری اور خلقی امر ہے کہ قدرت خداوندی نے جس طرح عورت کو جسم اور اعضاء کی ساخت میں مرد سے کمزور بنایا ہے تو اسے فکریہ اور عقلیہ میں عورت مرد کی بہ نسبت کمزور ہے تو جسمانی اور فکری صلاحیتوں کے لحاظ سے ضعف کی بناء پر عورت کو خلیفہ اور اسلامی حکومت کا سربراہ نہیں بنایا جاسکتا۔ امیر و حاکم کی اس شرط پر قرآن کریم کی یہ آیت دلالت کرتی ہے:

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ مرد عورتوں پر نگراں و سرپرست ہیں۔ (سورۃ نساء)

تو جس طرح کسی ایسی جماعت کی جس میں مرد اور عورتیں ہوں عورت کا امامت کرنا صحیح نہیں تو اسی طرح نظام مملکت میں اس کی امارت بھی صحیح نہ ہوگی۔ شریعت کے نقطۂ نظر سے نظام مملکت میں مسلمانوں کی امارت و قیادت جماعت نماز کی امامت کی نظیر ہے۔ چنانچہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ کی خلافت پر بیعت کے لیے تمام حضرات صحابہ اسی بنیاد پر متفق و مطمئن اور منشرح ہوئے کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری نماز اور دین کی امامت کے لیے اپنا جانشین متعین فرمادیا ہے تو جب وہ ہمارے دین کے امام ہوگئے تو لامحالہ بس وہی ہماری دنیا کے بھی امام ہوں۔

اہل فارس نے جب کسریٰ کی بیٹی کو بادشاہ بنادیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَهُمْ اِمْرَاَةً ہرگز وہ قوم کامیاب و کامران نہ ہوگی جس نے اپنی حکومت کا نظم و نسق ایک عورت کے سپرد کردیا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ عورتیں عقل اور دین میں بہ نسبت مردوں کے کمزور ہیں۔

اور خلافت چونکہ امر نبوت میں نیابت کا نام ہے اور انبیاء علیہم صرف مرد ہی بنائے گئے۔ اللہ نے کسی عورت کو نبوت نہیں عطا کی تو جب اصل نبوت عورت کے لیے نہیں تو اس کی فرع خلافت عورت کے لیے کیونکر ممکن ہے۔ نیز یہ کہ عورت مجلسوں اور عمومی اجتماعات میں از روئے شرع نہیں جاسکتی جو لوازم امارت میں سے ہے اس لیے عورت خلافت کی ذمہ داریوں کو انجام دینے سے قاصر رہے گی اور بھی متعدد وجوہ ایسی ہی ہیں جن کی بناء پر لوازم خلافت کی تکمیل میں دشواریاں اور موانع پیش آسکتے ہیں۔

چوتھی شرط حریت و آزادی ہے۔ آزاد شخص ہی خلافت و امارت کے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ غلامی کے ساتھ انسان کے لیے ناممکن ہے کہ قیادت کی باگ ڈور سنبھال سکے۔ قرآن کریم نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ اولوالامر کی اطاعت و فرمانبرداری کا حکم دیا ہے اور اولوالامر وہی ہوسکتے ہیں جو حر اور آزاد ہوں۔ آمریت محکومیت اور غلامی کے ساتھ کیونکر جمع ہوسکتی ہے۔ اس شرط کے پیش نظر یہ بات معلوم ہوئی کہ حاکم و امیر کو اپنے دین اور ملک کے معاملات میں اصول شریعت کے مطابق رائے اور فیصلوں میں آزاد ہونا چاہیے۔ لہذا ایسا شخص امارت کے لائق نہ ہوگا جو اپنی رائے، اور نظریات یا فیصلوں میں غیروں کا غلام اور تابع ہو۔ ظاہر ہے کہ جسم کی محکومی اور غلامی جب امارت و خلافت سے مانع ہے تو ذہن و فکر کی غلامی کے ساتھ خلافت و امارت کیونکر جمع ہوسکتی ہے۔ لہذا مسلمانوں کا کوئی حاکم اگر ایسی روش اختیار کرے تو اس کو معزول کردینا امت مسلمہ پر واجب ہوگا۔

پانچویں شرط عدالت و تقویٰ ہے کیونکہ قرآن کریم نے شہادت کے باب میں فرمادیا ہے وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ کہ تم گواہ بناؤ ایسے دو شاہدوں کو جو تم میں سے عدالت و تقویٰ والے ہوں۔ اسی طرح فرمایا گیا مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ جس سے معلوم ہوا کہ گواہ صرف

ایسا شخص ہو سکتا ہے جس میں پسندیدہ اوصاف موجود ہوں) ۔ تو جب گواہ میں ان شرائط و اوصاف کو لازم فرمایا گیا جن کی گواہی پر فیصلہ مرتب کیا جائے گا تو ظاہر ہے کہ حاکم و امیر جو فیصلہ نافذ کرنے والا ہے لامحالہ اس میں تو یہ اوصاف و شرائط بدرجہ اتم پائے جانے چاہئیں ۔

نیز یہ کہ حاکم میں علم و حکمت کے اوصاف بھی ہونے چاہئیں ۔ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا بھی عالم و ماہر ہونا چاہیے ۔ واقعات و پیش آمدہ مسائل کا حل بھی کتاب و سنت سے نکالنے کا ملکہ حاصل ہو ۔

قرآن کریم نے حضرت داؤد و سلیمان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :

وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا کہ ہم نے ان میں سے ہر ایک کو حکمت و دانائی اور فیصلہ کی قوت اور علم عطا کیا ۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی ہے کہ خلیفہ و امیر کو حقائق سمجھنے کی بصیرت بھی ہو اور فصل خطاب یعنی ایسا محکم اور مدلل خطاب کی قدرت ہو جو حق اور باطل میں فیصلہ کرنے والا ہو جیسے ارشاد فرمایا :

وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (ص)

(اور ہم نے مضبوط کیا داؤد (علیہ السلام) کے ملک و سلطنت کو اور ہم نے ان کو حکمت و دانائی عطا کی اور فصل خطاب (کا ملکہ)

خلیفہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے ہمیشہ حق و انصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے فیصلے کرے ۔ نفسانی خواہشات و اغراض کی پیروی تباہی اور ہلاکت کا سامان ہے چنانچہ ارشاد فرمایا گیا ۔

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً	اے داؤد ہم نے تم کو خلیفہ بنا دیا ہے ،
فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ	زمین میں پس فیصلہ کرو لوگوں کے درمیان حق
بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ	و انصاف سے اور نفس کی خواہش کی پیروی
عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۔	ہرگز نہ کرو ۔ ورنہ یہ نفسانی خواہش کی
(ص ع)	پیروی تو تم کو اللہ کے راستہ سے بھٹکا دے گی

چھٹی شرط اعمالِ صالحہ سے متصف ہونا ہے ۔ بدکار فاسق و فاجر اس قابل نہیں کہ وہ مسلمانوں کا امیر و مقتدیٰ بنایا جا سکے ۔ قرآن کریم نے نہایت واضح الفاظ میں یہ فیصلہ ذکر فرما دیا ہے :

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۔ (الانبیاء)

اور بے شک ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں ذکر (نصیحت) کے بعد کہ بے شک زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہی ہوں گے ۔

اسی طرح قرآن کریم میں دوسرے موقعہ پر خداوند عالم کا ارشاد ہے :

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۔ (سورۃ النور)

وعدہ کر لیا ہے اللہ نے تم میں سے ایماندار اور نیکی کا کام کرنے والوں سے اس بات کا کہ ان کو ضرور بالضرور زمین میں خلافت (حکومت و سلطنت) عطا کرے گا جیسا کہ ان سے پہلوں کو عطا کی تھی ۔ اور ضرور ضرور ان کے اس دین کو مستحکم و مضبوط کرے گا جو ان کے لیے پسند کر لیا ہے اور یقیناً ان کے خوف کو امن و اطمینان سے بدل دے گا ۔[1]

---

[1] اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اپنی قیادت کے لیے صرف ایسے ہی افراد منتخب کرنے چاہئیں جو صلاح و تقویٰ اور نیک کردار کے مالک ہوں ۔ حق تعالیٰ کا یہ فرمان ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا غلبہ اور مسلم حکومت کی کامیابی و ترقی حکمرانوں کے ان ہی اوصاف میں مضمر ہے ۔ حضرات صحابہؓ دنیا کی سب سے زیادہ برگزیدہ مقدس اور پاکباز ہستیاں تھیں ان کے دورِ حکومت سے زائد دنیا میں کسی قوم نے نہ اس قدر جلد فتوحات حاصل کیں اور نہ ہی دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتوں کو اس طرح نہایت قلیل مدت میں تہ و بالا کیا گیا جیسے خلفاء راشدین نے صرف چند برسوں ہی میں قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کا نام و نشان مٹا کر پرچم اسلام لہرایا ۔ تفصیل کے لیے دورِ فاروقی کی فتوحات کا مطالعہ فرمایا جائے ۔ (م)

اس نعمت کی عطا کو ان اوصاف کے ساتھ ذکر فرمایا گیا کہ یہ بشارت ان افراد کے واسطے ہے جو میری عبادت میں مصروف رہیں اور شرک وکفر سے بچیں۔

اس مقام پر حق تعالیٰ نے آخرت کی کامیابی کا ذکر فرمانے کے بعد آیت وعد اللہ سے ان باتوں کو ذکر فرمایا جو دنیا کی کامیابی عزت اور غلبہ کا ذریعہ ہیں۔ اور یہ ظاہر فرما دیا کہ خلافت وامارت کا وعدہ ان مسلمانوں سے ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے تمام احکام کی اطاعت و فرمانبرداری فرماتے ہوں۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اللہ کی انعامات وعنایات کا موجب ہے اور نافرمانی قہر و غضب کو دعوت دیتی ہے۔

حاکم اور طبرانی نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث نقل کی ہے جو اس آیت کا شان نزول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو تمام عرب آپ کا دشمن ہو گیا۔ مسلمان خوف وہراس کی حالت میں ہر وقت ہتھیار بند رہا کرتے تھے اور آرزو کرتے تھے کاش کوئی دن رات ایسا نصیب ہو کہ اللہ کے سوا ہم کو اور کسی کا خوف نہ ہو۔ اللہ رب العزت نے یہ وعدہ پورا کیا۔ غزوۂ احزاب کے بعد فتح مکہ نصیب ہوئی پھر تبوک فتح ہوا۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر وعمر فاروق رضی اللہ عنہما کے عہد خلافت میں صرف عرب ہی نہیں بلکہ روم ایران جیسی سرسبز شاداب سلطنتیں اللہ نے مسلمانوں کے ہاتھوں میں دے دیں۔ خوشحالی اور امن و اطمینان کی زندگی پوری طرح حضرات صحابہؓ کو حاصل ہو گئی۔ الغرض یہ سب کچھ ان حضرات نے صلاح وتقویٰ کی برکت سے تھا۔ اس آیت استخلاف کے معارف ولطائف کے لیے حضرات قارئین ازالۃ الخفاء جلد اول مقصد اول کی مراجعت فرمائیں۔

خلافت و امارت کی ذمہ داریاں

قرآن کریم نے سیاست مدن کے باب میں جہاں اور اصولی و بنیادی ہدایات نازل فرمائیں ان میں حاکم و امیر کی ذمہ داریوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا حضرات مہاجرین اور ان لوگوں کی فضیلت ذکر کرتے ہوئے جنھوں نے اسلام کے لیے طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کیں اور ایثار و قربانیاں دیں۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ۔ (الحج)	یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار و طاقت دے دیں (یعنی حکومت و سلطنت) تو یہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کریں اور اللہ ہی کے لیے ہے ہر کام کا انجام۔

تو ان کلمات نے یہ واضح کر دیا کہ اقتدار و سلطنت کی نعمت کن ذمہ داریوں کو عائد کرتی ہے۔ اقامۃ الصلوٰۃ اور ایتاء الزکوٰۃ سے خود اپنی معاشرت کو صالح اور باکمال بنانا ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر دوسروں کی اصلاح اور ملک سے منکرات و فواحش کا ازالہ ہے۔

علامہ ابوالحسن ماوردیؒ نے اپنی کتاب "احکام سلطانیہ" میں بیان کیا کہ خلافت و امارت کی ذمہ داریاں یہ ہیں کہ خلیفہ وقت (۱) دین کی حفاظت کرے اور اصول اسلام و شرائع دین کی اشاعت و تحفظ میں اس طرح مصروف رہے کہ احکام دین میں کسی قسم کا کوئی خلل پیدا نہ ہو سکے۔ (۲) تمام خصومتوں

اور معاملات میں احکام شرعیہ کے مطابق فیصلہ اور ان کا نفاذ کرے۔ مظلوموں کی دادرسی کرے۔ (۳) ملک کی پوری پوری حفاظت کرے اس طرح کہ لوگوں کے جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ رہیں (۴) حدود شرعیہ قائم کرے اور مجرموں کی پوری پوری سرکوبی کرے کہ کسی مجرم کو ارتکاب جرم کی کوئی جرأت نہ ہو سکے۔ (۵) عدل و انصاف قائم کرے۔ (۶) ملک اور ملک کی سرحدوں کی پوری حفاظت کرے اور دشمن کی مدافعت کے لیے ہمہ وقت مستعد رہے۔ (۷) جو باتیں اللہ کے قانون میں جرم اور معصیت ہیں ان سب کو بند کرے۔ (۸) اسلام کی دعوت دی جائے اور نہ قبول کرنے والوں سے جہاد کرے (۹) بیت المال سے مستحقین غریبوں اور یتیموں کے وظائف جاری کرے، اور رعیت پر پیش آنے والے وقتی حوادث میں ان کی اعانت کرے۔

(۱۰) دیانتدار اور قابل اعتماد سمجھ دار لوگوں کو اپنا قائم مقام بنائے اور حکام و گورنر بھی صرف ایسے ہی لوگ مقرر کیے جائیں۔ (۱۱) سلطنت کے تمام بنیادی کاموں کی خود نگرانی رکھے اور متعلقہ شعبوں کے ذمہ داروں سے رابطہ قائم رکھے تاکہ رعیت کی نگرانی اور پاسبانی کا فرض انجام دے سکے۔ جہاں تک ممکن ہو خود بھی عیش و عشرت اور تن آسانی سے پرہیز کرے اور ملک کے تمام حکام اور عمال کو اس طرز زندگی سے مجتنب رہنے کی تاکید کرتا رہے۔ حق تعالیٰ کا یہ ارشاد مبارک ان تمام امور کے ملحوظ رکھنے کی تاکید و ہدایت فرما رہا ہے۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔	اے داؤد ہم نے تمہیں زمین پر خلیفہ مقرر کر دیا ہے لہٰذا تم لوگوں کے درمیان حق اور صداقت کے ساتھ حکومت کرو۔ خواہشوں کے پیچھے نہ پڑ جانا ورنہ تمہیں نفس کی خواہش کی پیروی کرنا اللہ کے راستہ سے بھٹکا دے گا۔

گویا خداوند عالم نے محض تفویض خلافت پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ خود خلیفہ کو امورِ سلطنت کے انجام دینے کا اور یہ کہ حق و صداقت کا ہمہ وقت لحاظ رکھا جائے۔ اور ظاہر ہے کہ حق و صداقت کی رعایت ان جملہ امور کا تقاضہ کرتی ہے جن کو ذکر کیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَلسُّلْطَانُ ظِلُّ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ الخ یعنی بادشاہ روئے زمین پر اللہ کا سایہ ہے۔ بندگانِ خدا میں سے ہر ایک اس کی طرف پناہ لینے کی سعی کرتا ہے پس اگر سلطان نے انصاف برتا تو اس کے لیے اللہ کے یہاں بدلہ اور اجر و ثواب ہے اور رعیت پر اپنے حاکم کا شکر ادا کرنا ہے۔ اور اگر سلطان نے ظلم کیا تو اس پر گناہ ہے اور رعیت پر یہ ہے کہ صبر کرے۔

اسلامی مملکت کی عظمت و وقار کا تحفظ

قرآن کریم نے یہ بھی رہنمائی فرمائی کہ مسلمانوں کا حاکم غیر مسلم حکومتوں کی طرف سے ایسی کوئی اعانت و امداد یا ہدیہ قبول نہ کرے جس سے ملک کے داخلی یا خارجی معاملات میں دباؤ یا مضر اثرات مرتب ہوں۔ اسلام اور اسلامی مملکت کی عزت و عظمت میں کوئی فرق واقع ہو، یا اپنے افکار و نظریات میں اسلامی اصول سے انحراف لازم آتا ہو۔ بلکہ اسلامی مملکت کو چاہیے کہ خود اپنے وسائل کو ترقی دے اور اسی پر قناعت کرے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہُدہُد کا قرآن کریم میں قصہ بیان کیا گیا جب کہ وہ ایک کافر ملکہ کی جو قوم سبا کی شہزادی بلقیس تھی اس کی حکومت کی خبر لے کر آیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسی ہدہد[1] کے ذریعے اپنا پیغام جاری فرمایا: اَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ کہ میرے مقابلہ میں سر نہ اٹھاؤ۔ اور فوراً میرے پاس حاضر ہو جاؤ مطیع اور فرمانبردار ہو کر۔ بلقیس کے تخت پر جب یہ خط ڈالا گیا تو گھبرا گئی۔ اس نے

[1] گویا یہ ہُدہُد پرندہ حضرت سلیمانؑ کا ایک سفیر و نمائندہ تھا جس نے آج کی مہذب اور ترقی یافتہ دنیا کے

ارکانِ دولت اور وزرا مد کو جمع کر کے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے حسب الحکم حاضر ہونا چاہیے یا نہیں؟ ارکان سلطنت نے کہا ہم بڑی طاقت کے مالک ہیں اس وجہ سے اس پیغام کی تعمیل میں حاضر ہو جانا مناسب نہیں۔ بلقیس نے یہ سوچ کر کہ لڑائی کا انجام اچھا نہیں ہوتا اور وہ مرعوب بھی ہو چکی تھی اس وجہ سے اس نے نہایت قیمتی ہدایا و تحائف اور ہیرے جواہرات کے ڈھیر بطور ہدیہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس بھیجے۔ اس طریقہ سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی عظمت کا اندازہ کرنا چاہا۔ لیکن جیسے ہی یہ ہدایا و تحائف سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچے انہوں نے نہایت استغناء و بے نیازی کے ساتھ ان کو واپس کر دیا اور فرمایا

أَتُمِدُّونَنِ بِمَالٍ فَمَا آتَانِيَ اللَّهُ خَيْرٌ مِّمَّا آتَاكُم بَلْ أَنتُم بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُونَ.

کیا تم میری مدد کرنا چاہتے ہو مال و دولت سے سو جو کچھ اللہ نے مجھ کو دیا ہے وہ بہتر ہے اس مال سے جو اس نے تم کو دیا ہے بلکہ تم ہی اپنے تحفہ پر خوش ہوتے ہو گے (یعنی ہم کو اس ہدیہ ادنیٰ سے خوشی نہیں ہو سکتی)

(سورۃ النمل)

اور قاصد کو فرمایا ارْجِعْ إِلَيْهِمْ فَلَنَأْتِيَنَّهُم بِجُنُودٍ لَّا قِبَلَ لَهُم بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُم مِّنْهَا أَذِلَّةً وَهُمْ صَاغِرُونَ۔ جا انہی کی طرف واپس لوٹ جا۔ ہم ان پر ایسے لشکرے کر آئیں گے جن کے مقابلہ کی وہ تاب نہ لا سکیں گے۔ اور ہم ان کو ان کی سلطنت سے ذلیل و خوار کر کے نکال دیں گے۔

غرض معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے حاکم کو چاہیے کہ ہر مرحلہ پہ اسلامی حکومت کی عظمت و وقار کا تحفظ کرے اور عزم و حوصلہ اس قدر بلند ہو کہ ہر دشمن حکومت کو انقیاد و اطاعت کا تہدید آمیز پیغام بھیج سکے۔ یہ بات اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے کہ جب کہ مسلمان حکمران اللہ کے مقرر کردہ نظام کے مطابقت حکومت چلائیں۔

قرآنی ہدایات میں

جمہوری طرز پر نظام سلطنت

اسلام میں آمریت کا کوئی تصور نہیں جب کہ حکومت کا حاکم اور سلطان بھی درحقیقت آمر نہیں بلکہ وہ اوامر و احکام خداوندی زمین میں جاری و نافذ کرنے والا خلیفہ ہے تو پھر کس مرحلہ پر آمریت کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم نے یہ رہنمائی فرمائی کہ مسلمانوں کا نظام سلطنت جمہوری طرز پر ہونا چاہیے جس کی بنیاد شوریٰ ہے چنانچہ ارشاد ہے:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَ (شوریٰ)	اور ان کے معاملات ان کے درمیان بطور شوریٰ طے ہوتے ہیں۔
وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (آل عمران)	اور معاملہ میں ان لوگوں سے آپ مشورہ لیجیے پھر جب آپ کسی بات کو طے کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کیجیے۔

کیونکہ انسانی حقوق کا تحفظ اور ان کے جان و مال کی نگرانی اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا شورائی نظام میں محدود و مضمر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس حالانکہ معصوم تھی۔ ہر چیز اور معاملہ میں وحی خداوندی آپ پر نازل ہوتی تھی۔ آپؐ کا ہر لفظ اور خطاب اللہ کی وحی ہی تھا جیسے کہ ارشاد فرمایا گیا وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى آپؐ کا ہر عمل ایک قانون شریعت کا درجہ رکھتا تھا۔ مگر بایں ہمہ حق تعالیٰ آپؐ کو قوم کے ارباب حل وعقد سے مشورہ کا مأمور فرما دیا تاکہ اسی طرح کا

شورائی نظام سلطنت امت کے واسطے اسوہ اور نمونہ ہو۔ اسی وجہ سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا مسئلہ شوریٰ اور عامۃ المسلمین کی رائے یعنی حضرات صحابہؓ کی اجتماعی رائے اور پورے اتفاق رائے سے طے پایا۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد جانشینی کا مسئلہ ارباب حل و عقد کی ایک مجلس شوریٰ تشکیل فرما کر اس کے حوالہ کر دیا۔ تو یہ سب باتیں نظام سلطنت کے اس بنیادی اصول پر دائر تھیں جو قرآن کریم نے وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ میں بیان فرما دیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت سے قبل مسئلہ ہجرت میں صدیق اکبرؓ سے مشورہ فرمایا۔ بدر کے قیدیوں کے بارے میں مشورہ فرمایا۔ غزوہ احزاب میں بھی کافروں کی فوجوں سے مقابلہ کی صورت متعین کرنے کے لیے مشورہ فرمایا غرض یہ سب واقعات قرآن کریم کے اسی طے کردہ ضابطہ پر مبنی ہیں۔ اور اس بات کی رہنمائی کرتی ہے اسلامی مملکت میں نظام حکومت جمہوری اور مشورائی طرز پر ہونا چاہیے۔ اسی میں انسانی حقوق کا تحفظ ہے۔

غرض جب کہ سید الاولین والآخرین اور سرور کونین (جو اسلام کے سب سے اوّل بادشاہ جو دین کے ہی بادشاہ نہ تھے بلکہ مسلمانوں کی جانوں اور مالوں کے بھی آقائے کل تھے۔ عصمت و حفاظت آپ کی شان نبوت تھی وحی الٰہی کا رابطہ لوح محفوظ سے آپؐ کی ذات تک برابر مربوط و قائم تھا، کو بھی قرآن کریم نے حضرات صحابہؓ سے مشورہ کا حکم دیا تو اب قیامت تک کسی بادشاہ کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ مطلق العنانی اختیار کرتے ہوئے بغیر قومی مشورہ کے جو چاہے کرے۔ سلطنت کے خزائن و اموال میں بادشاہ کا بھی اسی قدر حق ہے جتنا کہ قوم کے اصحاب الرائے بادشاہ کے مصارف کے لیے مقرر کر دیں بس وہ اس کا حقدار ہے۔ قرآن کریم نے اموال سلطنت کے مصارف متعین کر دیئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نے قولاً و عملاً شاہی اختیارات کی تشریح کر دی۔

اور آپؐ کے جانشین خلفاء اپنے اپنے دورِ خلافت میں عمل کر کے قیامت تک کے لیے مسلمانوں کو ایک دستور العمل دے گئے۔

اسلامی مملکت کا فرمانروا کیسا ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کا وہ واقعہ ہے جو قاضی شریح کی عدالت میں پیش آیا کہ انہوں نے ایک یہودی سے دو سو درہم میں ایک زرہ خریدی تھی قیمت ادا کر دی لیکن یہودی نے عدالت میں حضرت علیؓ پر قیمت کا دعویٰ دائر کر دیا۔ حضرت علیؓ عدالت میں تشریف لے گئے۔ شریح قاضی نے مدعیٰ علیہ کا بیان لیا آپؓ نے زرہ خریدنے کا اقرار کرتے ہوئے فرمایا کہ قیمت ادا کر دی گئی ہے۔ قاضی نے قیمت کی ادائیگی کا ثبوت طلب کیا۔ آپؓ نے اپنے فرزند حضرت حسنؓ کو اور اپنے ایک غلام قنبر کو پیش کیا۔ شریعت کے قانون گواہی میں نہ بیٹے کی گواہی حجت تھی اور نہ غلام کی۔ اس لیے قاضی نے دونوں کی گواہی رد کر دی اس طرح یہ دعویٰ بلا ثبوت رہ جانے کی وجہ سے حضرت علیؓ پر ڈگری دے دی۔ حضرت علیؓ نے دوبارہ قیمت ادا فرمائی۔ تو اسلامی مملکت کا ایک بادشاہ عدالت میں بالکل اسی طرح قوانین خصومت کا پابند ہے جیسے رعیت کا ایک عام فرد ہو سکتا ہے اور قاضیِ عدالت بلا تامل شہادت پر جرح کر کے ڈگری نافذ کر رہا ہے۔ اس راست بازی اور عدل و انصاف کا یہ اثر ہوا کہ وہ یہودی فوراً اسلام لے آیا اور کہا کہ مجھے تو صرف عدل و انصاف کا امتحان کرنا مقصود تھا۔ یہ ان تعلیمات اور ہدایات نبوی کا اثر تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نظامِ حکومت کو مستحکم رکھنے کے لیے امت کو دیں۔ اور قانون کے سامنے ہر ایک کو خواہ کوئی بڑا ہو یا چھوٹا ایک صف میں برابر کھڑا کر دیا۔

وزراء کا تقرر

وزیروں کا تقرر و تعین قرآن کریم کی تصریح سے ثابت ہے۔ حضرت موسیٰؑ

کے قصّہ میں قرآن کریم نے بیان کیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ رب العزت سے درخواست کی :

وَاجْعَلْ لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي هَارُونَ أَخِي اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي (سورۃ طٰہٰ)	(اے اللہ) بنا دے میرے واسطے ایک وزیر میرے خاندان میں سے میرے بھائی ہارون کو مضبوط کر دے اس کے ذریعے میری کمر کو اور شریک کر دے ان کو میرے امر میں (اپنی معاملات و ذمہ داریوں کی تکمیل میں وہ میرے واسطے معاون و مددگار ثابت ہو۔

وزیر وِزْر سے مشتق ہے جس کے معنیٰ ثقل اور بوجھ کے ہیں۔ وزیر کے کاندھوں پر چونکہ امور سلطنت اور حکومت کی ذمہ داریوں اور نظم و نسق کا بوجھ ہوتا ہے اس وجہ سے وزیر کو وزیر کہا گیا۔

وزارت کی دو قسمیں ہیں۔ وزارت تفویض اور وزارت تنفیذ۔

وزارت تفویض یہ ہے کہ امام کسی شخص کو وزیر بنا کر امور سلطنت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں دے دے جنہیں وہ اپنی رائے اور صوابدید سے انجام دیتا رہے۔ شریعت کے اصول سے اسی قسم کی وزارت کے جواز کی ممانعت نہیں جب کہ اس شخص میں امام کے قائم مقام ہونے کی تمام تر صلاحیتیں موجود ہوں۔

بظاہر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا میں وزیر کی طلب اور دعا اسی نوع کی وزارت کے لیے تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ بکثرت سیاسی اور اجتماعی امور میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے تو اہل عرب روم اور ایران کے طرز حکومت سے متعارف ہونے کی بناء پر حضرت ابوبکرؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وزیر کہا کرتے تھے۔

ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ عمر فاروقؓ اسی درجہ اور حیثیت سے رہے پھر حضرت عمرؓ کے ساتھ حضرت عثمانؓ اور حضرت عثمانؓ کے ساتھ حضرت علیؓ

اسی وزارت کی حیثیت سے رہے۔ غرض جب نبوت میں وزارت جائز ہے تو امامت میں بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگی کیونکہ امام جس کے ذمہ امت کے تمام کے تمام معاملات کی انجام دہی ہے وہ اپنے اختیارات کو تقسیم کیے بغیر ان تمام معاملات کو انجام نہیں دے سکتا۔ نیز یہ کہ وزیر کی مدد سے حکومت کے کاموں میں مزید استحکام و پختگی ہوگی اور حاکم وقت حتی الامکان دوسروں کے مشورہ کی مدد سے غلطیوں سے محفوظ رہے گا۔ وزیر کو ان اوصاف و شرائط سے متصف ہونے کے باوجود جو خود امام میں ضروری ہیں۔ یہ بھی لازم ہے کہ وہ امورِ جنگ اور مالی معاملات میں بھی مہارت رکھتا ہو کیونکہ لیسا اوقات وزیر کو یہ کام خود انجام دینے پڑتے ہیں۔

خلیفہ مامون رشید عباسی نے اپنے وزراء کے تقرر کے بارہ میں لکھا تھا کہ میں اپنی حکومت کے امور ایک ایسے شخص کے سپرد کرنا چاہتا ہوں جو ان اوصاف اور خوبیوں سے متصف ہو۔ نہایت فہیم اور صحیح العقیدہ، اور وضعدار ہو، مہذب و تجربہ کار ہو۔ حکومت کے رازوں کا امین ہو۔ مشکل سے مشکل کاموں میں مستعد ہو جس کے سکوت سے حلم اور گفتگو سے علم نمایاں ہو۔ وہ آنکھ کے اشاروں ہی سے بات سمجھ جائے۔ اور ایک لمحہ کی مدت بھی اس کے واسطے نہ ہو اس میں امراء کا سا دبدبہ ہو، حکماء کی سی دور اندیشی، علماء جیسی تواضع اور فقہا جیسی سمجھ ہو۔ اگر اس پر احسان کیا جائے تو وہ ممنون ہو۔ اگر تکلیف میں مبتلا کیا جائے صابر رہے۔ وہ آج کے نانڈے کو کل کے نقصان کی وجہ سے ضائع نہ کرے وہ اپنی چرب زبانی اور فصاحت سے لوگوں کے قلوب مسخر کرنے والا نہ ہو[۵]

وزارت تنفید یہ ہے کہ امیر اپنے احکام مملکت میں نافذ و جاری کرنے کے لیے کسی کو اپنا قائم مقام بنائے۔

---

[۵] احکام سلطانیہ۔ علامہ ماوردی رحہ

اُولوا الامر کی اطاعت

سیاست مدنیہ کے باب میں اُولوا الامر کی اطاعت ایک بنیادی امر ہے۔ قرآن کریم نے اس سلسلہ میں بھی خاص ہدایت فرمائی۔ ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔ (سُورۃ نساء)	اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے (یعنی اہل اسلام میں سے) اولوا الامر ہیں یعنی حکام و اُمراء اور عمال سلطنت۔

کیونکہ اولوا الامر کی اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی فرع ہے۔ اس بناء پر ان کے احکام کی پیروی کا بھی حکم دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ اولوا الامر ان ہی احکام اور قوانین کا اجراء و نفاذ کرنے والے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائے۔

نیز یہ کہ اولو الامر کے احکام کی مخالفت ملک میں باہمی نزاع و فساد بدامنی اور بغاوت کا ذریعہ ہے اور یہ چیز کسی طرح بھی قابل برداشت نہیں ہوسکتی کہ اسلامی مملکت میں امن عام میں خلل اندازی ہو بغاوت کی فضا پیدا کی جائے۔ اس وجہ سے نہایت تاکید کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

عَلَیْکُمُ السَّمْعَ وَالطَّاعَۃَ وَاِنْ اُمِّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ حَبَشِیٌّ	کہ تم پر امیر کے احکام سننا اور ان کی اطاعت کرنا لازم ہے، چاہے امیر حبشی غلام ہو۔

لیکن اولوالامر کی اطاعت کو اس قدر مطلق العنان نہیں رکھا گیا کہ ہر جائز و ناجائز اور حق و باطل سب باتوں میں قوم اس امیر کی اطاعت کرے، بلکہ لائحہ عمل اور دستور یہ مقرر فرمایا گیا کہ :

یَقُوْدُکُمْ بِکِتَابِ اللّٰہِ ۔ جو امیر قیادت کرتا ہو کتاب اللہ کے ساتھ۔

اس سلسلہ میں رعیت کے افراد کو اپنی خواہشات و اغراض کا لحاظ کرنا کسی درجہ میں بھی شریعت کو گوارا نہیں ۔ اس وجہ سے فرمایا :

اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَۃُ عَلَی الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِیْمَا اَحَبَّ وَکَرِہَ مَالَمْ یُؤْمَرْ بِمَعْصِیَۃٍ فَاِذَا اُمِرَ بِمَعْصِیَۃٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَۃَ لَہٗ

اے مسلمانو! تم پر امیر کا حکم سُننا اور اس کی اطاعت کرنا ضروری ہے ہر چیز میں خواہ اس کو پسند ہو یا ناپسند جب تک کہ معصیت کا اس کو حکم نہ دیا جائے لیکن جب اس کو معصیت کا حکم دیا جائے تو اس میں کوئی اطاعت نہیں ۔

مقصد یہ کہ محض اپنی خوشنودی اور ناراضگی یا منفعت و نقصان کو امیر کے احکام کی اطاعت و عدم اطاعت کا معیار نہ رکھا جائے بلکہ اللہ کے مقرر کردہ نظام کے مطابق سلطنت کے امور کو منظم اور مضبوط کرنا یہ اسلامی حکومت کا اصل نصب العین ہے ۔ اس نصب العین میں ہر فرد رعیت پر توافق اور تعاون لازم ہے ۔

نظام مملکت کا استحکام اور خوبی اسی میں ہے کہ رعیت امام کی اطاعت کرتی رہے اور امام رعایا کی حقوق کی ادائیگی اور تحفظ میں ہمہ وقت مصروف و منہمک رہے اور ان کے ساتھ اخلاص و ہمدردی میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے :

خِیَارُ اَئِمَّتِکُمُ الَّذِیْنَ تُحِبُّوْنَھُمْ وَیُحِبُّوْنَکُمْ وَتُصَلُّوْنَ عَلَیْھِمْ

تم میں کے بہترین حکام وہ ہیں جن کو تم محبوب رکھتے ہو اور وہ تم کو محبوب رکھتے

وَيُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ وَشِرَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُبْغِضُوْنَهُمْ وَيُبْغِضُوْنَكُمْ وَتَلْعَنُوْنَهُمْ وَيَلْعَنُوْنَكُمْ ۔	ہوں وہ تمہارے حق میں دعا خیر کرتے ہو اور تم ان کے حق میں دعاء خیر کرتے ہو اور بدترین حکام وہ ہیں جن کو تم مبغوض رکھو ۔ اور وہ تم سے بغض رکھیں ۔ تم ان پر لعنت و ملامت کرتے رہو اور وہ
(الحدیث ۔ رواہ مسلم)	تم پر لعنت و ملامت کرتے رہیں ۔ الخ

استحکام سلطنت کے اصول

اسلامی سلطنت کا استحکام اہم مقاصد میں سے ہے اور اقامت دین اسی پر موقوف ہے کہ مسلمانوں کی حکومت مضبوط و مستحکم ہو ۔ اور داخلی و خارجی معاملات میں کسی قسم کا انتشار نہ ہو ۔ باہمی اتحاد اور نظم و ضبط کے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا اس لیے قرآن کریم نے متعدد مواقع پر تنظیم و اتحاد کے اصول ذکر فرمائے جیسے کہ ارشاد ہے ۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۔	اور اے مسلمانو ! تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو اور باہم ایک دوسرے سے تفرق و اختلاف نہ
(سورۃ آل عمران)	اختیار کرو ۔

اس آیت مبارکہ میں باہمی اتحاد کو بڑی تاکید و اہمیت کے ساتھ بیان فرمایا گیا گویا اس مختصر سے حصۂ آیت میں تین دفعہ اس مقصد کو ادا کیا ۔ ایک لفظ وَاعْتَصِمُوْا جس کے معنی اے مسلمانو تم سب مضبوطی سے پکڑ لو جس میں خود باہمی اتحاد کا مفہوم پایا جا رہا ہے ۔ پھر دوسری دفعہ فرمایا جمیعًا یعنی تم سب مل کر اور متفق ہو کر اس کے بعد تیسری بار فرمایا وَلَا تَفَرَّقُوْا کہ آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف

دلفرقی ہرگز نہ اختیار کرد۔

گروہ بندی اور ایک فرقہ کا دوسرے کے مدمقابل ہونا ظاہر ہے ملکی نظم ونسق کو تباہ کرتا ہے اور نظم ونسق میں خلل سلطنت کو کمزور کرتا ہے۔

اسی سلسلہ میں یہ بھی رہنمائی فرمائی گئی کہ باہمی نفاق وشقاق اور خصومت ملک اور قوم کو تباہ کرتی ہے اس وجہ سے سختی کے ساتھ اس چیز سے معاشرہ کو پاک رکھنے کا حکم دیا گیا۔ فرمایا:

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا (آل عمران)

اور اے مسلمانو! تم باہمی منازعت اور اختلاف نہ کرو۔ ورنہ تم ہلکے (اور دشمن کے مقابلہ میں بے وزن) ہوجاؤ گے اور تمہاری ہوا خیزی ہوجائے گی اور تم کو چاہئے کہ تم صبر کرو۔

حَتّٰی إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا أَرَاكُمْ مَا تُحِبُّوْنَ۔ (آل عمران)

یہاں تک کہ جب تم بزدل دکمزور ہوگئے اور ہمت ہاردی اور جھگڑنے لگے ایک معاملہ میں اور حکم کی خلاف ورزی کی تم نے بعد اس کے کہ اللہ نے تم کو وہ چیز دکھائی جو تم محبوب رکھتے تھے یعنی مال غنیمت۔

استحکام سلطنت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جان و مال سے حکومت کی اعانت کی جائے اور رعیت کا ہر فرد ایثار و قربانی کے جذبہ سے ملک کی بنیادوں کو مضبوط کرے اخلاص وایثار ہی میں ملک کا استحکام و ترقی مضمر ہے اس لیے ارشاد فرمایا گیا:

وَأَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوْا إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ

اور اے لوگو! خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور مت ڈالو تم اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں اور احسان کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ احسان

(سورۃ بقرہ) کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تفسیر میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ[1] ابو عمران نے بیان کیا کہ غزوہ قسطنطنیہ میں مہاجرین میں سے ایک شخص دشمن کے صف میں اچانک گھس پڑا اور تن تنہا دشمن کی فوج پر حملہ آور ہوگیا اور اس وقت مسلمانوں کی فوج میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ بھی تھے۔ لوگ اس منظر کو دیکھ کر کہنے لگے دیکھو اس شخص نے خود اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں ڈالا۔ گویا اس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ کیا کہ قرآن کریم تو وَلَا تُلْقُوا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ سے اس چیز کو منع کر رہا ہے۔ ابو ایوبؓ نے کہا اس آیت کی مراد ہم خوب جانتے ہیں۔ یعنی یہ مراد نہیں ہے جس کی طرف اشارہ کیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت ہمارے بارہ میں نازل ہوئی ہے۔ ہم لوگ پہلے غزوات میں شریک ہوئے کافروں سے جہاد کیا، اللہ نے فتح و نصرت عطا فرمائی تو جب اسلام پھیل گیا اور مسلمانوں کو بحمد اللہ غلبہ نصیب ہوگیا تو ایک روز ہم لوگ جمع ہوئے اور دوران مجلس ہم کہنے لگے بیشک اللہ نے ہم پر بڑا فضل و انعام فرمایا کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف مصاحبت عطا فرمایا۔ ہم غزوات میں شریک ہو چکے ہیں حتیٰ کہ اسلام پھیل چکا اور مسلمانوں کی تعداد بھی زائد ہوگئی ہے اور ہم اسلام کو اپنے جان و مال اور اہل و عیال پر فوقیت دے چکے ہیں اور ان سب چیزوں کو اسلام پر قربان کیا۔ تو گویا اب جب کہ سلسلۂ غزوات ختم ہو چکا اور اسلام کی اشاعت اور غلبہ و قوت کی وجہ سے اس چیز کی ضرورت باقی نہیں رہی اب کیا حرج ہے۔ اگر ہم اپنے کاروبار اور تجارتی امور میں مشغول ہو جائیں تو فرمایا اس پر یہ آیت نازل ہوئی تھی جس میں ہمارے اس قصد و ارادہ کو فرمایا گیا کہ اسلام اور مملکت اسلام کی خدمت و اعانت اور ایثار و قربانی کے سلسلہ کو ختم کر دینا اور تجارتی مشاغل اور اپنے کاروبار میں مصروف ہو جانا اپنے آپ کو

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ صفحہ ۲۲۸۔

ہلاکت میں ڈالنا ہے ، تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا بقاء اور اسلامی مملکت کا استحکام اسی امر میں ہے کہ ایثار و قربانی اور علمی ترقی میں جان و مال بے دریغ صرف کرنے کی روش برقرار رکھی جائے ۔ اس روش کو چھوڑنا درحقیقت قوم کا اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے ۔

قرآن کریم نے جگہ جگہ "جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ" کے عنوان سے یہ بات واضح فرما دی کہ اسلام خود اسلامی مملکت کے بقاء و استحکام کے لیے جانی اور مالی قربانیوں کا تقاضہ کرتا ہے ۔

اِعداد قوّت اور اسلحہ کی فراہمی

جس طرح ایمانی عقائد کا تحفظ اس بات میں مضمر ہے کہ مومن کا قلب ہر باطل نظریہ اور مشرکانہ خیالات کی مدافعت و مقابلہ کرتے ہوئے اپنے ایمانی قلعہ کو شیطانی افکار و خیالات کے حملوں سے بچائے اسی طرح مسلمان قوم کو اپنے وجود اور ملک کی دشمنوں سے حفاظت ضروری ہے اور اس کے لیے مسلمانوں کو لازم ہے کہ دشمن کو مرعوب اور مغلوب کرنے کے لیے جس قدر وسائل بھی ممکن ہوں مہیا کریں ۔ اس وجہ سے قرآن کریم نے جہاں اور فرائض اور احکام دین بیان کیے یہ امر بھی ایک نہایت اہم فریضہ کی طرح بیان فرمایا گیا :

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ ۔ (سورۃ انفال)	اور مہیا کرو کافروں سے مقابلہ اور جہاد کے لیے جہاں تک تم سے ہو سکے یعنی تا حدِ امکان قوت و طاقت (اسلحہ اور دیگر سامان حرب) اور گھوڑوں کا باندھنا جس سے مرعوب کرو تم اللہ کے دشمن کو اور اپنے دشمن کو ۔

شعبہ عبادات میں تو حق تعالیٰ نے یُسر اور سہولت کا پہلو رکھا اور انسان کی امکانی

حد طاقت سے بہت کم تعداد کا مکلف بنایا مثلاً دن رات میں صرف پانچ نمازیں اور پورے سال میں صرف ماہ رمضان کے روزے فرض کیے گئے حالانکہ انسان اس سے بہت زیادہ نمازیں پڑھ سکتا ہے اور روزے رکھ سکتا ہے ۔ لیکن اعداد قوت کا فریضہ اس شان کے ساتھ عائد کیا گیا کہ تاحد استطاعت اور امکان تکمیل لازم کردی گئی ۔

کافروں سے ہر وقت چوکنا اور محتاط رہنے کی تاکید فرمائی گئی ۔ اور ان کی طاقت و غلبہ کو پامال کرنے کے لیے ان پر فوجی دباؤ کا حکم دیا گیا تاکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے سر اٹھانے کی جرأت نہ کرسکیں ۔ چنانچہ ارشاد ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خُذُوا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوا ثُبَاتٍ أَوِ انْفِرُوا جَمِيعًا	اے ایمان والو تم اپنے احتیاط و حفاظت کی تدبیر ہمیشہ اختیار کیے رکھو ۔ پس تم کافروں کے مقابلہ کے لیے خروج کرو ۔ چھوٹی چھوٹی جماعتیں بن کر یا روانہ ہو جاؤ پورا لشکر جمع ہو کر ۔
(سورۃ نساء)	

اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد

قرآن کریم نے واضح طور پر فرما دیا ہے کہ بعثت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض اسلام کا دنیا کے تمام ادیان و مذاہب پر غلبہ ہے جیسے کہ ارشاد ہے :

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۔	وہ پروردگار عالم ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ غالب بنائے اپنے رسول اور اس دین حق کو (دنیا کے) تمام ادیان پر ۔
(سورۃ فتح)	

اس وجہ سے جہاد کا حکم مسلمانوں پر فرض کیا گیا اور فی الحقیقت دین میں اس قدر اہمیت و عظمت اور تاکید کے ساتھ کسی حکم کو قرآن کریم نے نہیں بیان کیا جتنا کہ حکم جہاد

بیان فرمایا، ارشاد مبارک ہے :

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ (سورۃ توبہ)

اے مسلمانو! تم سب جہاد کے لیے نکل کھڑے ہو خواہ ہلکے ہو یا بھاری اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اے مسلمانو یہی چیز تمہارے واسطے بہتر ہے اگر تم سمجھتے ہو۔

"خفافا وثقالا" کا مفہوم علماء مفسرین کے اقوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خواہ اسلحہ اور سامان حرب کم ہو یا زائد، سوار ہو یا پیدل، مالدار ہو یا مفلس عیالدار ہو یا مجرد جوان ہو یا بوڑھے۔ بہرکیف جس حالت میں اور جس طرح سے بھی ممکن ہو دشمنوں کے مقابلہ میں نکلنے کا سب کو مامور فرمایا جارہا ہے اور اس فریضۂ جہاد کو اس مرحلہ تک لازم فرما دیا گیا کہ کفر کی طاقتوں کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے۔

جیسے کہ ارشاد ہے :

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۔ (انفال)

اور قتال کرو ان کافروں سے یہاں تک کہ فتنہ (کفر) باقی نہ رہے۔ اور دین تمام کا تمام اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔

قرآن کریم نے جہاں اور عبادات و فرائض کی تکمیل کے لیے ترغیب و تحریص کا طریقہ اختیار کیا اسی کے ساتھ جہاد و قتال پر بھی ترغیب کا حکم نازل فرمایا گیا:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۔ (سورۃ انفال)

اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) آمادہ کیجیے آپ مومنین کو قتال و جہاد پر۔ اگر تم میں سے بیس صابر ایمان والے ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر ایک سو ہوں گے تو ایک ہزار کافروں پر وہ غلبہ پائیں گے۔[۱]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)
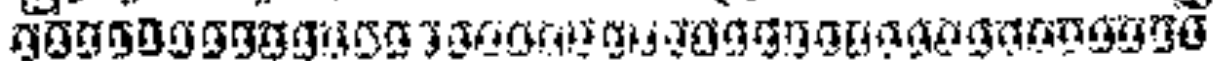
اور بار بار یہ حکم دیا گیا کہ دشمن کے مقابلہ میں ڈٹے رہیں۔ خواہ کتنا بھی عرصہ گزر جائے اور ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہیں۔ فرمایا :

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا۔ (سُورۃ آل عمران)	اے ایمان والو صبر کرو اور برداشت کیا کرو اور تیار رہو۔ کفار سے مقابلہ کے لیے باِ نگرانی اور پہرہ دیتے رہو مجاہدین کے لیے۔

اور ارشاد فرمایا :

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (سُورۃ آل عمران)	اے ایمان والو! جب تم کافروں کی کسی جماعت سے مقابلہ کرو تو ثابت قدم رہا کرو اور اللہ کا کثرت سے ذکر کیا کرو۔ امید ہے کہ تم کامیابی حاصل کرنے والے ہو گے۔

میدان جہاد میں ثابت قدمی کا اس تاکید کے ساتھ حکم دیا گیا کہ کسی بھی مرحلہ پر مسلمان فوج کے لیے میدان جہاد سے بھاگنے کو گوارا نہیں کیا گیا۔ فرمایا گیا، مسلمان فوج کے لیے قرآن کریم نے صرف دو ہی صورتیں متعین فرمائی ہیں فتح و کامیابی یا شہادت لیکن جان بچا کر بھاگنا یا دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دینا مسلمان فوج کے لیے کسی طرح بھی زیب نہیں دیتا۔ اور اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو وہ خدا کے قہر و غضب کو دعوت دیتا ہے :

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ وَمَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ	اے ایمان والو جب مقابلہ کرو تم کافروں سے گھمسان لڑائی میں تو پیٹھ پھیر کر نہ بھاگو، اور جو شخص پھر اس روز ان سے پیٹھ پھیر کر بھاگے گا بجز اس شخص کے کہ جو لڑائی کے لیے کوئی حیلہ کرنے والا ہو یا پیچھے ہٹ کر مل جائے

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا) ابتداء میں مومن اور کافر کے مقابلہ کے لیے یہ تناسب رکھا گیا تھا۔ لیکن سہولت و تخفیف کا حکم نازل کر کے ایک اور دس کا تناسب مقرر فرما دیا گیا۔ ۱۲۔

اللّٰہِ وَمَاْوٰہُ جَہَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ۔	والا ہو گروہ (مجاہدین) سے تو (ان دو کے علاوہ جو بھی پیچھے بھاگنے والا ہو) وہ لوٹے گا اللہ کا غضب لے کر اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت ہی بدترین ٹھکانہ ہے۔
(سورۃ انفال)	

صبر و استقامت

صبر و استقامت جس طرح انفرادی زندگی میں مطلوب ہے اور تہذیب نفس کے شعبوں میں فضل و کمال کا اعلیٰ ترین شعبہ ہے اسی طرح قرآن کریم نے یہ رہنمائی کی کہ صبر و استقامت ملکی سیاست میں بھی نہایت ہی اہم وصف ہے۔ ملک کے استحکام اور کسی قوم کی اجتماعی حیات کے لیے یہی وصف فوز و فلاح کی بنیاد ہے۔

قرآن کریم نے یہ بتایا کہ صبر و استقامت اور شدائد و مشقتوں کا تحمل ہی ملکی سیاست کو مستحکم بنا کر دشمنوں کے مکائد اور ان کی تباہ کن تدبیروں سے محفوظ رکھتا ہے ارشاد مبارک ہے:

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُھُمْ شَیْئًا۔	اور اگر تم صبر و تقویٰ اختیار کرو گے تو ان کا فریب تمہیں نقصان نہ پہنچا سکے گا۔
(سورۃ انفال)	
بَلٰی اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَیَاْتُوْکُمْ مِّنْ فَوْرِھِمْ ھٰذَا یُمْدِدْکُمْ رَبُّکُمْ بِخَمْسَۃِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ مُسَوِّمِیْنَ۔ (آل عمران)	ہاں بے شک اگر تم صبر و تقویٰ اختیار کرو گے اور دشمن کی کمک فوراً تمہارے سامنے پہنچ جائے تو اللہ تعالیٰ پانچ ہزار فرشتوں سے تمہیں کمک پہنچائے گا ایسے فرشتے جو نشان اور علامت لگے ہوئے ہوں گے۔

تو معلوم ہوا کہ صبر و تقویٰ وہ چیز ہے کہ اس کے اختیار کرنے سے آسمان سے غیبی

مدد پہنچتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے جب قید و بند کے تمام مصائب صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کر لیے تو قدرت خداوندی نے عزت و کامیابی کے دروازے ان پر ایسے کھولے کہ اسی سرزمین پر اقتدار و سلطنت کا ان ہی کو وارث بنا دیا۔ حضرت یوسف نے تائید غیبی کے اس معیار کو ان الفاظ میں تعبیر فرمایا:

قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۔

(سورۃ یوسف)

بے شک اللہ نے ہم پر بڑا ہی احسان فرمایا۔ یقیناً جو شخص اللہ کا تقویٰ اور صبر اختیار کرے تو حقیقت حال یہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کے اجر و ثواب کو ضائع نہیں فرماتا ہے۔

جہاد صرف یہی نہیں کہ اسلام کی عظمت و برتری کا ذریعہ ہے بلکہ اس مقدس فرض کی بجا آوری میں ملکی فتوحات و غلبہ اور مسلمان قوم کی معاشی خوش حالی بھی مضمر ہے جس پر فاروق اعظم کا دور خلافت، ایک تاریخی روشن ثبوت ہے۔ فریضۂ جہاد کی بجا آوری میں، انسان کے واسطے جو چیز مانع اور حائل ہو سکتی ہے وہ صرف موت کا ڈر ہے اس وجہ سے قرآن کریم نے اس ہیبت و خوف کو دل سے نکال لینے کے لیے بار بار اس حقیقت کو ظاہر فرمایا کہ انسان کے لیے موت کا ایک معین وقت ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے طے کیا ہوا ہے۔ دنیا کی کوئی تدبیر اس سے نہیں بچا سکتی۔ موت سے ڈر کر گھروں میں بیٹھ رہنے والوں کو موت، ان کے گھروں میں اپنی گرفت میں لے لے گی۔ اس ذہنی خوف کو نکالنے کے ساتھ جہاد پر ترغیب و آمادگی کے لیے شہادت کا بلند ترین رتبہ اور شہداء کا جو عند اللہ مقام ہے وہ بیان فرما دیا گیا۔

سورۃ آل عمران کی ان آیات کو ملاحظہ فرمایا جائے جو ان مضامین کو بیان کر رہی ہیں اسلامی مملکت کا استحکام اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کی عظمت کا

اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ قرآن کریم میں سورۂ بقرہ سے آخر قرآن کریم تک سینکڑوں آیات نازل کی گئیں اور وہ سب اسی ہدایت و رہنمائی پر مشتمل ہیں سورۂ آل عمران، انفال و توبہ اور سورۂ احزاب و حشر میں یہ مضامین نہایت ہی بسط و تفصیل کے ساتھ ذکر فرمائے گئے۔ خاص طور پر سورۂ آل عمران میں تقریباً ۱۵۰ آیات میں اسی موضوع کو بیان فرمایا گیا۔ قرآن کریم میں ۲۰۶ آیات ہیں جن میں وضاحت و صراحت کے ساتھ جہاد کا حکم اس کی تاکید اور ترغیب جہاد کے فوائد و منافع اور ثمرات کا ذکر ہے۔

استحکام مملکت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دشمنوں کے جاسوس حدود مملکت سے نکال دیئے جائیں اور دشمنوں سے روابط و تعلقات بھی نہ رکھے جائیں۔ اس وجہ سے قانون نازل فرمایا گیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُم مِّنَ الْحَقِّ.

(سورۃ الممتحنہ)

اے ایمان والو ہرگز نہ بناؤ تم میرے دشمن کو اور اپنے دشمن کو اپنا دوست اور ولی، (تعجب کی بات ہے کہ) تم ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہو اور حال یہ ہے کہ وہ اس حق اور دین کا انکار کرچکے ہیں جو تمہارے پاس آیا ہے

صحیح بخاری میں حاطب بن ابی بلتعہ کا واقعہ بیان فرمایا گیا کہ جس وقت آنحضرت مکہ مکرمہ پر حملہ کا ارادہ فرمارہے تھے۔ حاطبؓ نے اس کی اطلاع اہل مکہ کو ایک عورت کے ہاتھ روانہ کرکے کی۔ حق تعالیٰ نے آپؐ کو اس پر مطلع فرما دیا۔ آپؐ نے حضرت علیؓ و حضرت مقدادؓ و زبیرؓ کو روانہ فرمایا کہ اس عورت کو گرفتار کرکے لے آئیں۔ چنانچہ یہ حضرات بتلائے ہوئے موقع سے اس عورت کو گرفتار کرلائے۔ یہ اگرچہ صرف اس حد تک تھا کہ اہل مکہ اس کی وجہ سے ان کے اعزا اور گھر والوں کے ساتھ کچھ بدسلوکی نہ کریں اور لڑائی کے دوران ان کی کچھ حفاظت ہوجائے

بہ ظاہر ہے کہ ان کے ایمان و اخلاص میں ذرہ برابر بھی فرق نہ تھا لیکن یہ عمل اور طریقہ یقیناً غلط تھا تو اس پر یہ آیات نازل ہوئیں ۔ جن میں اسلامی مملکت کے استحکام و تحفظ کے نہایت بلند پایہ اصول بیان فرمائے گئے ۔

باغیوں سے جہاد و قتال

بغاوت ایک بدترین جرم ہے ۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے استحکام مملکت کے جہاں اور اصول و ضوابط مقرر فرمائے ۔ باغیوں کی سرکوبی کے احکام بھی نازل فرمائے ، تاکہ مسلمانوں کی حکومت میں انتشار و بدامنی نہ پھیلے اور اس کے نتیجہ میں ایسا نہ ہو کہ مسلمان اپنی حکومت و سلطنت سے محروم ہو جائیں ۔

امام کے انتخاب کے بعد عامۃ المسلمین کو اس کے ہاتھ پر بیعت کرنا اور اس کی اطاعت لازم ہو جاتی ہے ۔ تو اگر کوئی جماعت اپنے اغراض و خواہشات کی وجہ سے امام سے بغاوت کرنے لگے اور احکام کی خلاف ورزی کا طریقہ اختیار کرے حتیٰ کہ ایسا گروہ اپنی ایک جداگانہ تنظیم سے اپنا ایک قائد و پیشوا مقرر کرلے تو مسلمانوں کے امیر حق کو چاہیے کہ باغیوں کے اس گروہ کا مقابلہ کرے اور ان کی ایسی سرکوبی کی جائے کہ اسلامی حکومت میں لوگ بغاوت کا تصور بھی نہ کرسکیں ۔ چنانچہ ارشاد مبارک ہے :

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ ۔ (سُورۃ الحجرات)	اور اگر مسلمانوں میں سے دو گروہ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو لیکن اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کے مقابلہ میں بغاوت کرے تو پھر قتال کرو باغی گروہ اور جماعت سے یہاں تک کہ وہ اللہ کے امر اور فیصلہ کی طرف لوٹ جائے یعنی بغاوت سے تائب ہو جائے ۔

باغیوں کی سرکوبی کے لیے قرآن کریم نے یہ بھی حکم دیا کہ ان لوگوں کو اپنے گھروں سے نکال کر جلاوطن کر دیا جائے تا کہ جہاں جہاں فساد و بغاوت کے مرکز قائم کر رکھے ہیں وہ ختم ہو جائیں، جیسے کہ سورۂ حشر میں ارشاد فرمایا گیا:

هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِأَوَّلِ الْحَشْرِ ۔ (سورۃ الحشر)

اسی پروردگار نے اہل کتاب میں کے کافروں کو ان کے مکانوں سے نکالا ہے پہلی بار اکٹھا کرکے۔

نیز ایسے باغیوں کی معاشی اور اقتصادی حالت بھی مجروح کر دینے کی قرآن نے اجازت دی۔ فرمایا:

مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ ۔ (سورۃ الحشر)

اے مسلمانو! جو کھیتیاں یا کھجور کے درخت تم نے کاٹ ڈالے یا ان کو تم نے ان کی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا سو یہ سب کچھ خدا کے حکم سے ہی تھا اور اس وجہ سے تھا کہ اللہ تعالیٰ فاسقوں اور نافرمانوں کو رسوا کرے۔

ان آیات کی تفسیر اور متعلقہ مضامین کی تشریح کے لیے کتب تفسیر کی مراجعت فرمائی جائے۔

مُفسدوں اور رہزنوں کی سرکوبی

استحکام سلطنت کے اصول و ہدایات میں سے قرآن کریم نے مفسدوں اور رہزنوں کی سرکوبی کے احکام بھی نازل فرمائے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ جس سلطنت میں لوگوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ نہ ہو وہ حقیقت میں انسانی مملکت و حکومت کہلانے کے لائق نہیں۔ ایسی حکومت میں اور جنگل و بیابان میں جہاں جو درندہ اور بھیڑیا جس پر چاہے لپک پڑے کیا فرق ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے انسانی حقوق کے تحفظ کی خاطر قرآن کریم نے حدود و قصاص کے احکام مقرر فرمائے

اور مفسدوں و رہزنوں کی سرکوبی کے ضابطے متعین کیے ۔ چنانچہ ارشاد فرمایا :

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِکَ لَھُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۔	جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے پھرتے ہیں ان کی سزا بس یہی ہے کہ ان کو قتل کیا جائے یا سولی دی جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مختلف جانب سے کاٹے جائیں یا وہ ملک سے نکال دیئے جائیں ۔ یہ تو ان کے واسطے دنیوی زندگی میں ذلت و رسوائی اور آخرت میں ان کے واسطے بڑا ہی سخت عذاب ہے ۔

(سورۃ مائدہ ۶)

یہ آیات ایک جماعت کے واقعہ میں نازل ہوئیں جن کو قطع الطریق کہا جاتا تھا یہ لوگ متعدد جرائم کے مرتکب ہوئے تھے ۔ مرتد بھی ہوئے ۔ قتل و غارت گری ، اور لوٹ مار کا بھی ارتکاب کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض چرواہوں کی انہوں نے آنکھیں بھی پھوڑی تھیں تو حق تعالیٰ شانہ‘ نے یہ آیات نازل فرما کر قیامت تک ایسے مفسدوں اور رہزنوں کی سرکوبی کے قانون مقرر فرما دیئے ۔ قرطبیؒ فرماتے ہیں اگرچہ یہ آیت ایک خاص جماعت کے حق میں نازل ہوئی مگر الفاظ کے عموم کا لحاظ کیا جاتا ہے ۔ اس وجہ سے جو لوگ بھی ان جرائم کے مرتکب ہوں ان پر یہی سزائیں جاری کی جائیں گی ۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ ، سعید بن المسیبؒ مجاہد عطا حسن بصریؒ اور ابراہیم نخعیؒ کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ "یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ" کے مصداق جس طرح وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ و نافرمانی کرتے ہوں اسی طرح وہ لوگ بھی اس میں داخل ہیں جو اسلامی مملکت کے فرمانروا سے بغاوت کرنے والے ہوں ۔ چوری ، زنا اور قتل و غارت گری میں مبتلا ہوں ۔

اور ظاہر ہے کہ ایسے مجرموں کی سرکوبی عامۃ المسلمین کے لیے عافیت اور راحت کا ذریعہ ہے۔ مجرموں کو عبرت ناک سزائیں نہ دینا جرائم کی پرورش کرنا ہے۔ یہ اسلام اور قرآن کریم کی خوبی ہے معاشرہ کو ناپاک اور گندہ کرنے والے جرائم کی ایسی سزائیں مقرر کیں کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی مجرم اس نوع کے جرم کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا مقرر کیا گیا۔ آج دنیا اس بات کا مشاہدہ کرتی ہے کہ سعودی عربیہ میں اس قانون شریعت کے نفاذ کی یہ برکت ہے کہ لوگ لاکھوں روپوں کے مال سے بھری ہوئی دکانیں کھلی چھوڑ جاتے ہیں۔ اور کوئی شخص ان پر جرم کی نیت سے نظر تک نہیں ڈالتا تو معلوم ہُوا کہ تہذیب و تمدّن کے بعض مدّعی جو اسلام کی ان سزاؤں کو وحشیانہ سزائیں کہتے ہیں دراصل وہ معاشرہ کے ان درندوں اور مجرموں کے حامی و مددگار اور ہمدرد ہیں۔ قرآن کریم نے اس قسم کی سزاؤں کو نکال و عبرت فرمایا ہے اور تجربہ نے بتا دیا کہ ان جرائم کی صرف یہی سزائیں جرائم کی بیخ کنی کرسکتی ہیں اور حق تعالیٰ کے مقرر کردہ ان اصول و ضوابط کے علاوہ دوسری مروّجہ سزائیں لبسا اوقات مجرموں کی سرکوبی کے بجائے ان کی پرورش و تربیت کرنے والی ہوتی ہیں۔

یہ بات بھی ظاہر ہے کہ قومی و ملکی سیاست اور نظام حکومت کو تباہ کرنے والی نفاق سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ جس قوم اور ملک میں منافقین کا گروہ موجود ہو گویا اس قوم اور ملک میں ایک مہلک اور تباہ کن ناسور ہے جو اس کے وجود کو تباہ و برباد کرنے میں لگا ہوا ہے۔ جو شخص بظاہر مطیع و فرمانبردار ہو اور در... بدترین دشمن اور مخالف ہے اور تخریب کے درپے ہے اس سے زائد خطرناک دشمن اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم نے متعدد مواقع پر منافقین سے احتیاط و پرہیز کا حکم دیا۔ ہجرت کے بعد ابتدائی مدنی زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زائد اسی خبیث گروہ سے اذیت و تکلیف پہنچی قرآن کریم نے منافقین کی مسجد ضرار کا ذکر کرکے یہ بتا دیا کہ منافق اپنی سازشوں کا جال

کس کس طرح بچھاتے ہیں جیسے کہ ارشاد فرمایا :

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا	اور جن لوگوں نے ایک مسجد بنائی (مسلمانوں کو
ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ	ضرر و تکلیف پہنچانے اور (مسلمانوں کے درمیان
الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ	تفریق ڈالنے کے لیے اور تیاری کرنے کے لیے
حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ	ان لوگوں کے واسطے جو پہلے ہی سے اللہ
قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَا	اور اس کے رسول کے ساتھ لڑائی اور مقابلہ
اِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ	کر چکے ہیں اور یہ لوگ البتہ نہایت ہی بچنتہ
لَكٰذِبُوْنَ ۔	قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم نے تو بھلائی کے
(سورة التوبہ)	سوا اور کوئی ارادہ ہی نہیں کیا ۔

گویا منافقین کی مساعی اور تمام تر کوششیں ان خطوط پر دائر ہوتی ہیں ۔ کفر و نافرمانی اور فساد کے ساتھ ایذا رسانی تفریق بین المسلمین اور اللہ و رسول کے دشمنوں کی تخریبی سازشوں کے لیے سازگار ماحول کی تیاری اور پھر یہ کہ ان تمام ایذا رسانیوں اور تخریبی کارروائیوں کا عنوان نیکوکاری اور بھلائی تجویز کرنا تو قرآن کریم کے ان کلمات نے منافقانہ سازشوں کے مضمرات و عواقب کو آشکارا کر دیا اور بتا دیا کہ اسلامی مملکت کے لیے یہ طبقہ خبیث ترین اور انتہائی خطرناک دشمن ہے ۔ قرآن کریم میں سورۂ منافقون میں حق تعالےٰ نے بڑی تفصیل کے ساتھ منافقوں کے اطوار و عادات اور ان کی مفسدانہ ریشہ دوانیوں کا ذکر فرما کر مسلمانوں کو ان کے مکائد اور خطرناک حیلوں سے محفوظ رہنے کی تعلیم دی ۔

سورۂ توبہ کی آیت نے یہ بھی ہدایت فرمائی کہ منافقوں کی اسلام کے خلاف یہ بھی ایک سازش ہوتی ہے کہ دین اور مذہب کے نام پر اس طرح کے مراکز قائم کرتے ہیں جیسے آنحضرت کے زمانہ میں ابوعامر منافق نے مسجد ضرار بنائی تھی، تاکہ مسلمان مذہب کا عنوان دیکھ کر اس کی مخالفت نہ کر سکیں اور ایسے عنوان کی وجہ سے ان کو اسلام کے خلاف تخریبی کارروائیوں کے لیے

تحفظ حاصل ہو جائے۔

قرآن کریم نے منافقین کی مفاد پرستی کی ناپاک خصلت کہ اگر ان کو کچھ دے دیا جائے تو وہ راضی اور خوش رہیں گے اور اگر نہ دیا جائے تو ناراض و ناخوش ہوں گے بیان فرما کر یہ واضح فرما دیا کہ ایسے مفاد پرستوں سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ طبقہ اگر کسی وقت اپنا ذاتی مفاد ملک کی تباہی و بربادی میں دیکھے گا تو اس کو ملک وسلطنت تباہ کر ڈالنے میں بھی کوئی تامل نہ ہوگا۔

ارشاد خداوندی ہے:

فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَ اِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَا اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۔ (سورۃ توبہ)	پس اگر ان کو کچھ دے دیا گیا تو راضی ہو گئے اور اگر نہیں دیا جاتا تو پھر یہ ناراض ہوتے ہیں۔

الغرض یہ علوم و مسائل قرآن کریم نے سیاست مدنیہ کے بنیادی اصول کے طور پر بیان کیے جن کی تفصیلات احادیث میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ ذکر کی گئیں۔

تمام علوم قرآنیہ کے لیے جامع علوم

حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ "الفوز الکبیر" میں بیان فرماتے ہیں

لے اس سے معلوم ہو گیا کہ کسی بھی اسلامی مملکت میں کسی ایسے ادارہ اور مرکز کے قیام کی اجازت نہیں دی جاسکے گی جو اپنے ظاہری عنوان سے تو یہ دعویٰ کرتا ہو کہ وہ دین اسلام اور مذہب کے علمی اور تحقیقی تقاضوں کی تکمیل کے لیے قائم کیا گیا لیکن اس کا مقصد اسلام اور اسلام کے اصول اور اغراض ومقاصد کو مٹانا اور قرآن وسنت نے جن علوم کی رہنمائی کی اور دین و دنیا کے فلاح وسعادت کے جو اصول مقرر کیے ان میں تحریف کرنا ہو۔ الغرض قرآن کریم کی ان آیات نے بطور ضابطہ یہ بات ظاہر کردی کہ اسلام کے نام قائم کیے جانے والے ادارے جو اسلام کو مسخ کرنے کا کام انجام دیتے ہوں وہ ہرگز اسلامی سلطنت میں برداشت نہیں کیے جاسکتے۔ ۱۲

کہ تمام علوم قرآنیہ کو پانچ علم جامع ہیں جن پر گویا تمام مضامین واصول دائر ہیں اور یہ علوم پنجگانہ ان سب کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

عِلم الاحکام

اوّل علم الاحکام یعنی احکام خداوندی جن پر بندوں کو عمل کرنا ضروری ہے۔ اور وہی امور بندوں کے واسطے دین و دنیا میں نافع ہیں جن کے تحت فرض، واجب، سنت اور مستحب کی تمام قسمیں داخل ہیں تو یہ درجات توان امور کے ہوئے جو نافع ہیں۔ اور جو چیزیں مضر ہیں ان میں مضرت کے درجات کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو احکام مقرر کیے گئے وہ حرام مکروہ تحریمی اور مکروہ تنزیہی ہیں۔ قرآن کریم کی یہ آیات وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ ان دو قسموں کے ان تمام احکام کو محیط ہے اور علم الاحکام تہذیب نفس تدبیر منزل اور سیاست بدن کے جملہ شعبوں کو حاوی ہے۔

علم التذکیر بآلآء اللہ

دوم علم التذکیر بالآء اللہ یعنی اللہ کی نعمتوں کی یاد دہانی پر مشتمل امور جس میں آسمانوں، زمینوں اور جملہ مخلوقات کی پیدائش اور کائنات میں ودیعت رکھی ہوئی تمام نعمتوں کا ذکر ہے جس سے حق تعالیٰ کی ربوبیت و قدرت اور انعامات کی معرفت ہے تاکہ انسان طبعی طور پر حق تعالیٰ کی عبادت و بندگی پر آمادہ اور راغب ہو۔ مثلاً قرآن کریم نے اس قسم کے مضامین بہت سے مواقع پر ذکر فرمائے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ	اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا
وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ	کیا اور آسمان سے اس نے پانی برسایا۔ پھر
مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ	اس بارش سے مختلف انواع واقسام کے

رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ.

(سورۃ ابراھیم)

پھل پیدا کیے تمہارے واسطے رزق بنا کر اور تمہارے نفع ہی کے لیے اللہ نے تمہارے واسطے مسخر و تابع کیا کشتیوں اور جہازوں کو کہ خدا کے حکم اور اس کی قدرت سے سمندر میں چلیں اور مسخر کیا نہروں کو تمہارے نفع کے لیے اور سورج و چاند کو بھی (اپنی قدرت و حکم کا) تمہارے نفع کے لیے مسخر بنایا جو ہمیشہ چلتے ہی رہتے ہیں اور تمہارے ہی نفع کے واسطے اللہ نے رات اور ان کو مسخر بنایا اور اسی نے تم کو ہر وہ چیز دی جو تم نے مانگی (یعنی اپنی فطری تقاضوں سے جن چیزوں کے تم طالب و محتاج تھے وہ چیزیں اللہ نے تم کو عطا کیں۔) اور اگر شمار کرنے لگو اللہ کی نعمتیں تو یقیناً تم ان کو شمار میں نہیں لا سکتے۔ مگر سچ یہ ہے کہ انسان بہت ہی نا انصاف اور ناشکرا ہے

علیٰ ہذا القیاس سورۃ انعام رکوع "اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى" اور ایسی دوسری تمام آیات قرآنیہ تذکیر بآلاء اللہ کے مضامین پر مشتمل ہیں۔

علم التذکیر بایّام اللہ

سوم علم التذکیر بِاَیَّامِ اللّٰہ، یعنی ان واقعات و حوادث کا بیان جن میں حق تعالیٰ نے مطیعین و فرماں برداروں کی خوبیاں اور ان پر انعامات و جزاؤں کا بیان اور کافروں و نافرمانوں اور سرکشوں کی برائیاں اور ان پر دنیوی عذاب و قہر اور سزاؤں کا بیان ہے تو ایسی تمام آیات جو قصص و امثال اور

عِبَر پر مشتمل ہیں وہ علم التذکیر بایام اللہ ہی کے متعلق ہیں۔

چہارم، علم المخاصمہ یعنی گمراہوں کے عقائد باطلہ کی تفصیلات اوران کا ردّ اور عقلی وفطری دلائل وحقائق ان تمام وجوہ کی تردید جو گمراہ فرقوں نے اپنی اپنی گمراہیوں کی اختیار کر رکھی ہیں جن میں خاص طور پر قرآن کریم کے مخاطب چار گمراہ فرقے ہیں۔ مشرکین۔ یہود۔ نصاریٰ اور منافقین۔

علم التذکیر بالموت

پنجم علم التذکیر بالموت۔ یعنی انسان بلکہ جملہ عالم کے فنا و زوال کے احوال انسان اور عالم کائنات کی ابتداء آفرینش کس طرح ہوئی اور پھر اس پر موت وفنا کیونکر واقع ہوتی ہے اور اس دنیوی موت کے بعد کیا کیا احوال وکیفیات پیش آتی ہیں۔ حشر ونشر جزاء وسزا وزن اعمال اور حساب وکتاب غرض یہ سب مضامین علم التذکیر بالموت سے متعلق ہیں۔ ان جملہ احوال کو قرآن کریم نے جس جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا وہ محیر العقول انداز بیان ہے۔ مثلاً ارشاد فرمایا گیا:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ ۔ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَكِينٍ ۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۔ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۔ ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ ثُمَّ

اور بے شک پیدا کیا ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے۔ پھر ہم نے بنایا اس کو نطفہ سے جو ایک مدت تک ایک محفوظ مقام یعنی رحم میں رہا پھر ہم نے اس نطفہ کو خون کا جما ہوا ٹکڑا بنایا۔ پھر اس بستہ خون کو گوشت کی بوٹی بنادی اور پھر ہم نے اس بوٹی کو ہڈیاں بنا دیا اور پھر ان ہڈیوں پر گوشت چڑھایا اور ان تمام تغیرات کے بعد پھر (اس میں روح پھونک کر) ایک اور ہی

ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ

طرح کی مخلوق بنا دیا جو سابقہ اطوار و احوال کے لحاظ سے ایک نئی قسم کی چیز معلوم ہوتی ہے یعنی ایک جیتا جاگتا انسان) پھر بیشک اے لوگو! تم ان تمام ادوار و اطوار کے بعد مرنے والے ہو اور پھر بیشک قیامت کے روز دوبارہ تم زندہ کرکے اُٹھائے جاؤگے

(سُوْرَۃُ المؤمنون)

تو قرآن کریم کے بیان کردہ جملہ علوم کا مدار۔ یہی علوم پنجگانہ ہیں جن پر حق تعالیٰ شانہ نے اس قدر کثرت کے ساتھ دلائل و براہین قائم فرمائے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ عقل رکھنے والا انسان بھی تردد اور شبہ نہیں کر سکتا، بجز اس کے کہ معاند قسم کے ضدی انسان دلائل و حقائق سے دیدہ و دانستہ انحراف و چشم پوشی ہی کرتے ہیں اور حق تعالیٰ کے ارشادات کے سامنے اطاعت و فرمانبرداری کی گردن نہ جھکائیں اور اپنی مخالفت اور ضد ہی پر جمے رہیں تو بس وہ لوگ قرآن کریم کی اس آیت کا مصداق ہیں:

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ

اور انہوں نے انکار کیا ان آیات قرآنیہ اور حال یہ کہ ان کے دل یقین کیے ہوئے تھے ان باتوں پر محض ظلم و عناد اور غرور و تکبر کی وجہ سے۔ سو اے مخاطب دیکھ تو کیسا ہوتا ہے انجام جھٹلانے والوں کا۔

علوم پنجگانہ سے استنباط کردہ چند بنیادی اور اصطلاحی عُلوم

بیان کردہ تفصیلات میں جن جن علوم قرآن کی ہم نے نشان دہی کی ہے۔ علماء اسلام نے ان کے لیے جُداگانہ اور مفصل و مبسوط کتابیں تصنیف کیں۔ اور ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے اصول و ہدایات کو ایک مستقل فن کی صُورت

میں مرتب کیا مثلاً آسمانوں اور زمین وجملہ کائنات کی پیدائش کا جو ذکر قرآن کریم میں ہے اس کو علم بدء خلق السموات والارض کے عنوان سے مستقل علم شمار کیا گیا۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے کتاب بدء الخلق کے عنوان سے صحیح بخاری میں اس نوع علم کو آیات و روایات کی روشنی میں مرتب فرمایا:

اور جن آیات میں دلائل انفس و آفاق اور حق تعالیٰ شانہ کی ذات وصفات کا ذکر ہے اس کو علم التوحید اور علم الذات والصفات کے عنوان سے مرتب کیا گیا فلسفہ الٰہیات اور عالم مجردات ملائکہ و ارواح پر جو مضامین مشتمل ہیں ان سے علم المجردات کو اخذ کیا گیا اور جہاں دنیا کی بے ثباتی اور عالم دنیا کی تمام نعمتوں اور راحتوں کا زوال اور عالم آخرت اور وہاں کے احوال اور خدا سے دل لگانے کا اور نفس کی لذتوں اور شہوتوں سے کنارہ کشی کا بیان ہے۔ اس سے علم الزہد والرقاق مرتب کیا گیا۔ حلال وحرام فرائض و واجبات اور ممنوعات و منہیات کے مضامین سے علم الاحکام مستنبط کیا گیا۔ پھر ان سے میں وراثت و ترکہ کے مسائل کو علم المیراث والفرائض کہا گیا۔ اور بالخصوص احکام حج کو علم مناسک کے عنوان سے تعبیر کیا گیا۔

اور جن آیات میں انبیاء سابقین اور گذری ہوئی قوموں کے احوال فرمانبرداروں اور نافرمانوں کے واقعات بیان کیے گئے ان سے علم القصص اخذ کیا گیا امثال و تشبیہات کی آیات علم الامثال۔ مجاز و استعارات کے مضامین سے علم المجاز اور آیات متشابہات سے علم المتشابہ اخذ کیا گیا۔ محکمات سے علم المحکمات مرتب کیا۔

غرض یہ جملہ عظیم الشان علوم وفنون علوم قرآن ہی سے مستنبط ہیں جن میں سے ہر ایک فن پر علماء اسلام فقہاء اور محدثین ومفسرین اور ائمہ متکلمین ہر قرن اور صدی میں بے شمار کتابیں تصنیف فرماتے رہے۔ اگر شمار کیا جائے تو ہر فن پر ہزاروں کی تعداد میں تصانیف ملیں گی۔

قرآنی علوم و فنون پر جو جو کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اگر ان کی اجمالی فہرست ہی لکھی جائے تو ایک ضخیم کتاب بھی اس کے واسطے کفایت نہ کرے۔ یہ قرآن کریم کا ایک عظیم الشان معجزہ ہے کہ اگرچہ پہلی ہی صدی میں باہمی نزاع اور اختلافات اور مخاصمت و مقابلہ کی صورتیں پیدا ہوگئی تھیں اور ان کا اثرات نے تمام بلاد اسلامیہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اور یہ سلسلہ چند برس نہیں بلکہ صدیوں تک جاری رہا ایسے حالات میں علوم قرآنیہ کی اشاعت کو بجائے خود اصل قرآن کریم کا محفوظ رہنا بھی عالم اسباب میں متوقع نہ تھا لیکن یہ حق تعالیٰ کا اس امت پر خاص انعام ہے کہ نہ صرف یہ کہ قرآن ہی کو اللہ نے محفوظ رکھا بلکہ تمام علوم قرآن اور متعلقہ شعبوں کی خدمت و اشاعت کا ایسا سلسلہ شروع ہوا۔ اب دنیا کے سامنے علوم قرآنیہ میں سے ہر علم اپنی جگہ ایک معجزہ ہے قرآن کریم کی شرح سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جمع و تدوین پہلی صدی کے اختتام سے شروع ہوگئی تھی سنہ ۹۹ھ میں عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ تدوین حدیث کے لیے سب سے پہلا فرمان ابوبکر بن حزم کے نام جاری کیا کہ ان کے پاس اور ان کے علم میں آنحضرت کے جو کچھ فیصلے اور احادیث ہیں وہ سب ایک مرتب دستاویز کی صورت میں جمع کر لی جائیں۔ ابن عبدالبر نے لکھا کہ ابوبکر بن حزم نے ایک کتاب مرتب کر کے عمر بن عبدالعزیزؒ کو بھیجنے والے ہی تھے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی وفات ہوگئی، تو گویا علوم قرآن کی تدوین کا آغاز فن حدیث کی تدوین و ترتیب سے شروع ہوگیا۔ اس کے بعد ابن شہاب زہری نے ذخیرہ احادیث کو مرتب کیا۔ ان کے تلمیذ معمر کا بیان ہے کہ زہری کے انتقال کے بعد ان کی احادیث کے دفاتر اونٹوں پر لاد کر خلیفہ کے پاس پہنچائے گئے۔ ان کے بعد تابعین کے دور میں باضابطہ ائمہ محدثین کی ایک جماعت حدیث کی جمع و تدوین اور تہذیب و ترتیب میں مشغول رہی۔ ابن جریج

مکہ مکرمہ میں۔ امام مالک مدینہ منورہ میں۔ امام اوزاعی شام میں۔ سفیان ثوری کوفہ میں۔ حماد بن مسلم بصرہ میں۔ معمر یمن میں۔ ابن المبارک خراسان میں اور ہشیم واسط میں۔ ابوبکر بن حزم اور ابن شہاب زہری کے بعد مدونین حدیث کی یہ پہلی جماعت تھی، یہاں تک کہ امام بخاری رحؒ کے زمانہ تک صحیح بخاری کی تالیف سے فن حدیث حفاظت و تدوین کے اعلیٰ مقام تک پہنچ گیا۔ قرن تابعین ہی میں راویانِ حدیث کی تنقیح و تحقیق کے لیے علم اسماء الرجال کی تدوین شروع ہوگئی۔ محدثین اور ائمہ محدثین کا گروہ جس طرح حدیث کی خدمت میں مصروف ہوا، قرأ کا گروہ فن قرأت کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اس موضوع پر بھی بڑی بڑی کتابیں تالیف کی گئیں۔ عارفین و صوفیاء نے آیات زہد و رقاق منتخب کرکے سلوک و تصوف اور طریقت کا فن وضع کیا۔ اس موضوع پر متاخرین میں امام غزالی رحؒ کی احیاء علوم الدین اور شیخ شہاب الدین سہروردی کی کتاب عوارف المعارف نہایت بلند پایہ کتابیں ہیں۔

مفسرین نے فن تفسیر مرتب کیا۔ حضرات صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام المفسرین ہیں۔ ان کے بعد عکرمہ ضحاک قتادہ اور سدی اس فن کے مقتدیٰ و پیشوا ہیں تو اس طرح علم التفسیر کی تدوین ہوئی۔

علما مجتہدین اور فقہائے آیات قرآنیہ سے احکام شرعی کے استنباط کے لیے علم الفقہ اور علم اصول الفقہ مدوّن کیا۔ امت میں جو مقبولیت امام ابوحنیفہ رحؒ امام مالک رحؒ، امام شافعی رحؒ اور امام احمد بن حنبل کے فقہ کو حاصل ہوئی وہ کسی اور امام مجتہد اور فقیہ کے فقہ کو نہیں حاصل ہوئی۔ ان حضرات کے زمانہ سے لے کر آج تک رُوئے زمین کے اکثر مسلمان انہی ائمہ اربعہ کے فقہ پر عمل کرتے ہیں۔ فقہ حنفی شافعی اور مالکی و حنبلی پر جو کتابیں تصنیف ہوئیں ان کی فہرست ہی کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ تمام کتب فقہ کے لیے اصل الاصول یہ چھ کتابیں ہیں۔ جامع صغیر، جامع کبیر، زیادات۔ مبسوط۔ سیر صغیر۔ سیر کبیر۔

ائمہ مجتہدین واصولیین کے ایک گروہ نے آیات قرآنیہ سے ایسے فقہی اصول و قواعد اخذ کیے جن سے احکام شرعیہ کا استنباط کیا جا سکے۔ اجماع امت اور قیاس کی مباحث مرتب کیں۔ اور ادلہ شرعیہ کی تحقیق کی۔ اور یہ کہ الفاظ قرآن کریم اور احادیث سے کن کن وجوہ کے ساتھ احکام مستنبط کیے جاتے ہیں اور اس فن کا نام اصول الفقہ رکھا گیا جو علماء اور محققین کی نظر میں بہت ہی بلند پایہ علم ہے۔ دلائل کی عظمت و بلندی کا اندازہ مسلم الثبوت تلویح و توضیح حسامی اور شیخ فخر الاسلام بزدوی کے اصول جیسی کتابوں کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے

ایک گروہ نے ان آیات قرآنیہ کو جن میں صرف عقائد کے امور تھے مرتب کر کے علم العقائد کے عنوان سے ایک عظیم الشان علم مدوّن کیا۔ خلفاء عباسیہ کے عہد میں جب یونانی فلسفہ عربی میں ترجمہ ہو کر آیا اور علماء امت نے یہ دیکھا کہ یونانی فلسفہ سے اسلامی عقائد متاثر ہو رہے ہیں تو یونانی فلسفہ کے اصول و دلائل کو پارہ پارہ کر کے ادلہ عقلیہ اور براہین قطعیہ سے عقائد اسلامیہ کو مدلل کرنا شروع کیا اور یونانی فلسفہ کے بالمقابل صحیح معنی میں ایک نیا فلسفہ شریعت مرتب کیا جو علم الکلام کے نام سے موسوم ہے۔ امام ابو منصور ماتریدی اور شیخ ابو الحسن اشعری کی تصانیف اس فن کی بنیاد اور اصل الاصول ہیں۔

ایک گروہ علم لغت کی طرف توجہ کر کے فن لغت مرتب کیا۔ کسی نے اصول و قواعد عربیت مرتب کر کے فن صرف و نحو مدون کیا کسی نے اسالیب بیان کے اصول و ضوابط کی تدوین سے فن فصاحت و بلاغت مرتب کیا۔ اسی طرح ایک جماعت نے قرآن کریم میں انبیاء سابقین اور امم سابقہ کے واقعات و احوال سے فن تاریخ ایجاد کیا۔ کسی نے مخالفین و مخاصمین کے دعووں اور خیالات اوہام کے ابطال درد کے مضامین سے علم الجدل والخلاف یعنی فن مناظرہ ایجاد کیا۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں اقالیم و بلدان اور امم سابقہ کی بستیوں کا ذکر ہے مثلاً قوم سبا اور عاد و ثمود اور قوم لوط کی آبادیوں کا بیان ان آیات سے

.... علم الجغرافیہ مدوّن کیا جس پر تقویم البلدان اور احسن التقویم جیسی کتابیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ فن ریاضی منطق اور طبعیات و الہیات اور علم نجوم بھی علماء اسلام نے قرآنی علوم کے انوار ہی سے مستنبط کیا ہے' اور فلسفہ طبعیات و الہیات ریاضی اور منطق پر علماء اسلام نے ایسی بلند پایہ تصانیف کیں کہ تاریخ عالم میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ ابن رشد کے فلسفہ اور علامہ ابن خلدون کے فلسفہ تاریخ کے سامنے یورپ کے تمام فلاسفر اور محققین سرنگوں ہیں۔ الغرض یہ سب علوم ائمہ دین اور علماء اسلام نے قرآن کریم ہی سے اخذ کیے ہیں جس سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ قرآن کریم صرف دینی اعتقادی اور مذہبی علوم ہی کا خزانہ نہیں بلکہ ان تمام بیان کردہ علوم و فنون کا بھی سرچشمہ ہے جن کو اجمالاً صرف بطور فہرست بیان کیا:

تمام علوم قرآنیہ کے لیے جامع علوم پنجگانہ۔

۱۔ علم الاحکام۔	۲۔ علم التذکیر بالآء اللہ۔
۳۔ علم التذکیر بایام اللہ۔	۴۔ علم المخاصمہ۔
۵۔ علم التذکیر بالموت۔	

ان پنجگانہ علوم سے علماء اسلام کے استنباط کردہ چند بنیادی اور اصطلاحی علوم و فنون۔

۱۔ علم بدء الخلق	۲۔ علم التوحید
۳۔ علم فلسفہ الہیات	۴۔ علم المجردات و ملائکہ و ارواح۔
۵۔ علم الزہد و الرقائق	۶۔ علم احکام الحلال و الحرام۔
۷۔ علم الفرائض و المیراث	۸۔ علم المناسک۔
۹۔ علم القصص	۱۰۔ علم الامثال
۱۱۔ علم المجاز	۱۲۔ علم المحکمات و المتشابہات۔

۱۳ - علم التفسیر۔
۱۴ - علم اصول التفسیر۔
۱۵ - علم القرآت۔
۱۶ - علم الحدیث والاصول۔
۱۷ - علم الرجال۔
۱۸ - علم التصوف۔
۱۹ - علم الفقہ۔
۲۰ - علم اصول الفقہ۔
۲۱ - علم الکلام۔
۲۲ - علم اللغۃ۔
۲۳ - علم الصرف والنحو۔
۲۴ - علم الفصاحۃ والبلاغۃ۔
۲۵ - علم الجدل والخلاف یعنی علم مناظرہ۔
۲۶ - علم جغرافیہ۔
۲۷ - علم تاریخ۔
۲۸ - علم فلسفہ تاریخ۔
۲۹ - علم فلسفہ طبیعیات۔
۳۰ - علم ریاضی۔
۳۱ - علم النجوم والافلاک۔

مقاصدِ قرآن

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

حق تعالیٰ شانہ نے اس سورۂ مبارکہ میں زمانہ کی قسم کھا کر یہ بیان فرمایا کہ انسان بالعموم مادی زندگی اور عیش وعشرت اور راحت و آسائش کے اسباب مہیا کرنے اور مال و دولت کی حرص و لالچ ہی میں اپنی زندگی ضائع کر دیتا ہے تو اس روش کو اختیار کرنے والا انسان یقیناً خسارہ میں ہے۔ اصل فلاح و کامیابی کا راز ایمان و عمل صالح حق پر قائم رہنے اور اسی کی تلقین و ہدایت اور صبر و استقامت اور اس کی پابندی پر ایک دوسرے کو آمادہ کرنے ہی میں ہے۔

انسان کو قدرتِ خداوندی کی جانب سے دو قوتیں عطا کی گئی ہیں۔ ایک قوتِ نظریہ اور دوسری قوّتِ عملیہ۔ اور اس کی سعادت و شقاوت انہی دو قوتوں کی اصلاح و درستگی اور خرابی پر موقوف ہے، تو انسان ان دونوں قوتوں کی درستگی اور کمال کے بغیر سعادت کا مقام نہیں حاصل کر سکتا۔

قوتِ نظریہ جس سے حق تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت حاصل ہوتی ہے اس کے ذریعے انسان مبداء و معاد کو صحیح طور پر جان سکے گا۔ قوتِ عملیہ جس سے انسان کے اعمال اور اخلاق و معاشرہ کی اصلاح متعلق ہے اس کے ذریعہ انسان اپنی زندگی کو محاسن اعمال و اخلاق کا پیکر بنا سکے گا اور سعادت عظمیٰ

بلند مقام حاصل کر سکے گا اور ظاہر ہے کہ جس کسی کی یہ دونوں قوتیں درست اور صالح ہو گئیں یقیناً وہ بہت بڑی نعمت حاصل کرنے والا ہو گیا اور اس گروہ میں شامل ہو گیا جن پر خدا کی طرف سے انعام فرمایا گیا ہے، تو قرآن کریم کی جملہ تعلیمات اور تمام تر ہدایات کا خلاصہ اور حاصل انسان کی انہی دو قوتوں، یعنی قوت نظریہ اور قوت عملیہ کی اصلاح ہے اور اسی معیار پر تمام قرآنی علوم دائر ہیں اعتقادی و نظری، اور عملی و معاشرتی محاسن ہی دراصل مقاصد قرآن ہیں۔ اور اگر کسی شخص نے نہ اپنی حقیقت کو پہچانا نہ مبدا و معاد کو سمجھا نہ اس کو اپنے خالق و منعم کی معرفت حاصل ہوئی۔ نہ جزاء و سزا کا تصور رہا بلکہ اپنے منگھڑت خیالات و تصورات اور توہمات کے گرداب ہی میں پھنسا رہا اور اپنے لغو اور بیہودہ افکار ہی منتہائے علم سمجھ کر مغرور و بدمست اپنی نفسانی شہوتوں اور اغراض و مفاد کو مقصد زندگی قرار دے کر عیش و عشرت میں پڑا رہا۔ بداعمالیوں زنا چوری شراب جیسے ناپاک اور گندہ افعال میں مبتلا ہوا، ظلم و استبداد، قتل و خونریزی اور فساد فی الارض کو وطیرہ بنا لیا۔ بغض و حسد اور مال و دولت اور جاہ و عزت کی حرص نے اس کو دیوانہ بنا رکھا ہو تو ظاہر ہے کہ ایسا شخص مجرمین اور ان لوگوں کی فہرست میں داخل ہو گا جن پر خدا تعالیٰ کا قہر و غضب نازل ہوا اور راہ راست سے وہ بھٹکنے والے ہیں۔

مقاصد قرآن چار بنیادوں پر دائر ہیں

بہرحال قرآن کریم کے جملہ علوم اور مضامین پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مقاصد قرآن کا حاصل مندرجہ ذیل امور ہیں۔

۱۔ انسان کو مبدا و معاد کی حقیقت سے آگاہ کرنا۔ اس اعتقاد و یقین اور ایمان پر آمادہ کرتے ہوئے کہ خالق کائنات خداوند عالم ہے۔ آسمانوں زمینوں اور ہر موجود شئی کو عدم سے وجود میں لانے والا وہی ہے۔ وہی قادر مطلق و

مختار کل ہے کائنات کی ہر چیز اسی کے ارادہ اور قدرت کے تابع ہے۔

۳۔ انسان کو حق تعالیٰ نے احسن تقویم میں بنایا۔ اس کو بہترین پیکر جسمانی اور صورت عطا کی۔ اشرف المخلوقات بنایا۔ کائنات کی ہر چیز انسان ہی کے واسطے پیدا کی تاکہ انسان ان تمام نعمتوں اور خداوندعالم کی قدرت کے دلائل اور نشانیوں اور عالم کائنات میں اس کے جاری کردہ محکم نظام کو دیکھ کر اس کی ربوبیت و خالقیت کو پہچانے اور اس کی اطاعت و بندگی پر آمادہ ہو۔

۴۔ اس پر متنبہ کرنا کہ معاش و معاد کی اصلاح اور امن عالم صرف کتاب ہدایت اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہی میں مضمر ہے۔ دنیا متاع الغرور ہے اس کی زیب و زینت، لذائذ و شہوات اور اس کی شادابی کو دیکھ کر دھوکہ میں نہ پڑنا چاہیے۔ دنیا اور دنیا کی ہر زینت اور راحت و عزت بہت جلد فنا ہونے والی شے ہے۔ انسان کو ہرگز ایسا نہ کرنا چاہیے کہ ناپائیدار اور فانی لذتوں کی خاطر دارالخلود اور دارالبقاء دائمی نعمتوں اور ابدی راحتوں سے محرومی اختیار کرے۔ جزا و سزا اور اپنے انجام کو کسی مرحلہ پر بھی فراموش نہ کرنا چاہیے۔ ہر لمحہ اس تصور و اعتقاد سے قلب و دماغ لبریز ہو کہ اللہ کی طرف لوٹنا ہے اور ہر انسان کو یہ منظر دیکھنا پڑے گا فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ کہ جس کسی نے ذرہ برابر خیر کا کام کیا اس کو دیکھے گا اور جس کسی نے ذرہ برابر شر کا کام کیا اسے بھی دیکھے گا۔

ارشاد خداوندی ہے:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا	اے لوگو! جان لو یہ بات کہ دنیا کی زندگی
لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ	سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ ایک کھیل
بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ	کود اور زیب و زینت و آرائش اور مال
وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ	و اولاد میں ایک دوسرے پر تفاخر و بڑائی
الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ	بارش جیسی مثال ہے کہ جس کا سبزہ کھیتی کرنے

فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا وَ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ.

(سورۃ الحدید)

والوں کو بھلا معلوم ہوتا ہو۔ پھر وہ لہلہانے لگے اور زور پکڑتا ہو اور پھر تو اس کو دیکھتا ہے کہ وہ زرد ہو جاتا ہے اور اس کے بعد وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے اور (دُنیا پر فریفتہ ہونے والوں کے لیے) آخرت میں سخت ترین عذاب ہے۔ اور مغفرت اللہ کی طرف سے اور اس کی خوشنودی (صرف ایمان والوں کے واسطے ہے) اور دُنیا کی زندگی صرف ایک دھوکہ ہی کا سامان ہے۔

قرآن کریم کے ان مقاصد اربعہ کا انسانی ذہن و فکر اور عملی زندگی میں اس طرح اثر نمایاں ہوتا ہے کہ اس کو حق تعالیٰ کی معرفت اور ایسی محبت نصیب ہو جاتی ہے جس کی ترجمانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک کر رہا ہے ثلث من کن فیہ وجد بھن حلاوۃ الایمان من کان اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما ومن احب عبدا لا یحبہ الا للہ و من یکرہ ان یعود فی الکفر بعد ان انقذہ اللہ منہ کما یکرہ ان یلقی فی النار[1]

ایمان و تقویٰ عمل صالح، عدل و انصاف، تزکیۂ باطن، قیامت حشر و نشر حساب و کتاب، احوال جنت و جہنم، جزا و سزا پر یقین اصلاح معاش و معاد یہ سب کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و پیروی اور ان لوگوں کے نقش قدم پر چلنے میں منحصر ہے جن پر خدا تعالیٰ نے خاص انعامات فرمائے اور ان گمراہوں کے طریقوں سے پرہیز کرنے میں مضمر ہے جن پر خدا تعالیٰ کا قہر و غضب نازل کیا گیا اور وہ راہ ہدایت سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

---

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم بروایت انس بن مالک۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دنیوی زندگی اور نفسانی خواہشات میں انہماک دین و دنیا کی سعادت وفلاح سے محرومی اور تباہی و بربادی کا ذریعہ ہے تو جملہ قرآنی تعلیمات کا خلاصہ اور غرض انسانی زندگی کے رُخ کو مادیت و بہیمیت اور نفسانی شہوتوں سے پھیر کر طہارت و تقویٰ اور روحانیت کی جانب کردینا ہے۔

سورۂ فاتحہ نے اُمّ القرآن ہونے کی حیثیت سے مصحف قرآنی کی ابتدا ہی میں ان مقاصد عظمیٰ کی طرف رہنمائی کردی اور کتاب الٰہی کے عنوان اور سرنامہ یعنی ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ہی نے موضوع و مقصد متعین کردیا کہ یہ کتاب الٰہی کتاب ہدایت ہے اور پیغمبر ہادی، تعلیم اصول ہدایت و تقویٰ مقصد تعلیم انسانی زندگی کے تمام شعبوں کی اصول ہدایت و تقویٰ کے ساتھ مطابقت نیز عمل صالح اور تزکیۂ باطن کے ذریعے فلاح و نجات کا حصول اور هوٰی یعنی نفسانی خواہشات سے بچا کر هُدٰی کے طریقوں اور منزل کی طرف لے چلنا۔

آدم علیہ السلام کو منصب خلافت عطا فرمانے کے لیے جنت سے زمین پر جب اتارا گیا اسی وقت نوع بنی آدم کو منازل ہدیٰ کی طرف رُخ کرلینے کی تاکید فرمادی گئی تھی۔

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ [1] کہ پھر جس کسی کے پاس تم میں سے میری ہدایت پہنچے اور

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) ارشاد فرمایا تین خصلتیں ایسی ہیں کہ جس کسی شخص میں ہوں گی وہ ان کی بدولت ایمان کی حلاوت اور لذت پائے گا۔ ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسول دنیا کی ہر چیز سے زائد محبوب ہو۔ اور یہ کہ جس کسی سے بھی محبت کرے تو صرف اللہ تعالیٰ کے تعلق کی وجہ سے کرے اور یہ کہ کفر میں لوٹنے کو بعد اس کے کہ اللہ نے اس کو کفر سے نجات دے دی، ایسا ناگوار سمجھے جیسا کہ انسان اس بات کو ناگوار سمجھتا ہے کہ اس کو آگ میں ڈال دیا جائے۔

[1] سورۂ بقرہ۔

وہ اس کی پیروی کرے تو بے شک ایسے لوگوں پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

اور واضح طور پر یہ بتادیا گیا کہ خوف خدا، فکر آخرت اور خواہشات نفس سے پرہیز ہی دراصل نجات و کامیابی کا معیار ہے۔ اور آخرت کے بالمقابل دنیوی لذتوں کو اختیار کرنا ہلاکت و بربادی ہے:

فَاَمَّا مَنْ طَغٰیۙ وَ اٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَاۙ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰی۔ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰیۙ فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی۔[۱]	بہرحال جس کسی شخص نے سرکشی اختیار کی اور دنیوی زندگی کو (آخرت پر) ترجیح دی تو بس جہنم ہی اس کا ٹھکانا ہے۔ اور وہ شخص جو ڈرا اپنے رب کے سامنے حاضر ہونے سے اور روکا اس نے اپنے نفس کو خواہشات سے تو یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔

دلائل قدرت اور مضامین خلق سمٰوات و ارض خوفِ خدا اور فکر آخرت کے لیے ہیں۔

خوف خدا اور فکر آخرت کو قلب و دماغ میں رچانے کے لیے قرآن کریم میں بار بار دلائل قدرت اور مضامین خلق السمٰوات والارض اور عجائب مصنوعات بیان کیے گئے تاکہ انسان کائنات اور مخلوقات عالم کے مطالعہ اور ان کے تغیرات کے مشاہدہ سے خالق کائنات کی معرفت حاصل کرے۔ جس کا لامحالہ نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے تمام جذبات اور قوائے عملیہ اسی رب العالمین کی اطاعت و بندگی کی طرف متوجہ ہوجائیں گے تو قرآن کریم میں جہاں جہاں خلق السمٰوات والارض اور اسی طرح دیگر تکوینی امور کا ذکر ہے اس سے مقصد صرف حق تعالیٰ کی معرفت اور اطاعت و بندگی پر آمادہ کرنا ہے۔

---

[۱] النازعات پ ۳۰

قرآنی مقاصد سے غافل اور بعض نافہم لوگ ان آیات اور مضامین دلائل قدرت کو پیش کرتے ہوئے یہ کہہ دیتے ہیں کہ "قرآن کا مقصد صرف مطالعۂ کائنات ہے اور نزول قرآن کی یہی غرض ہے۔ ان مادی اور تکوینی امور سے انتفاع کیا جائے اور یہی استفادہ حقیقی دین ہے جس کی قرآن رہنمائی کرتا ہے اور یہی منشاء خداوندی ہے۔

اگر آج یہ کتاب (قرآن) ہمیں معادن ارضیہ دفائن جبال، اور خزائن بحار سے مستفید ہونے کا درس نہیں دیتی اور ترقی یافتہ اقوام کا ہم دوش نہیں بناتی تو یہ کتاب (ناقل بدہن قائل داعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) صراحتہً ناقص اور نامکمل اور اس کا دعویٰ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ بے بنیاد ہے۔

یہ الفاظ اور اسی کے قریب قدرے لفظی ردو بدل کے ساتھ تعبیرات ایک خاص طبقہ کا شعار بن چکا ہے جن کا مقصد قرآن اور قرآنی تعلیمات و مقاصد۔ دین اسلام اور اسلام کی حقیقی روح کو مسخ کرنا ہے۔ قرآن کریم جو سراپا کتاب ہدایت اور روحانی بلند پایہ تعلیمات اور تزکیۂ باطن کا کامل و مکمل درس ہے۔ اس کو سراسر مادی تعلیم اور حیات دنیوی کے منافع حاصل کرنے کا ذریعہ بنانا ہے۔ یہ دعویٰ ایسا لغو اور مہمل ہے کہ اس کے بطلان پر کسی حجت و برہان کے قائم کرنے کی بھی ضرورت نہیں اور ایسے قائلین نہایت جسارت کے ساتھ خداوند عالم سے مقابلہ اور محاربہ پر آمادہ ہیں۔ صنعت و حرفت اور سائنسی ترقیات ہمارے دنیوی امور ہیں جن کو قدرت خداوندی نے ہماری رائے ادراک و بصیرت اور تجربہ کے حوالہ کردیا ہے کہ ہم جس طرح چاہیں ان میں تصرف کریں۔ علوم قرآن سے ان چیزوں کا کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ تصور کتاب الٰہی کی کھلی ہوئی توہین ہے۔ بالفرض اگر نزول قرآن کا مقصد ان مادی اور تکوینی امور سے منتفع ہونا اور ان مادی ترقیات کے ذریعے ترقی یافتہ اقوام کے ہم دوش بنانا ہے تو

پھر اس سے تو یہ نتیجہ صاف طور پر نکلے گا کہ کتاب الٰہی کے علوم اور حقائق سے محروم رہنے والے سب سے زائد خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ ہیں۔ اور اس کے بعد تابعین اور امت کے تمام ائمہ محدثین و مفسرین اور متکلمین بھی اسی زمرہ میں شمار کیے جائیں گے کہ ان سب نے نہ تو قرآن کے حقیقی منشا کو سمجھا اور نہ ہی اس منشا کے مطابق کوئی مشین بنائی اور نہ ایک انجن ایجاد کیا۔ نہ دخانی طاقتوں سے کلوں کو حرکت دے کر بحری جہاز بنائے اور نہ فضا میں طیارے اڑا سکے۔ نہ ہی سامان آرائش و تعیش ایجاد کیا۔ نہ ایٹمی طاقتوں کے ذریعے دنیا کو جور و ستم کا نشانہ بنایا اور نہ استعماری اغراض کی کوئی آماجگاہ تیار کی تو اس مخصوص طبقہ کے ان تخیلات کی بناء پر یہی لازم آئے گا کہ یہی حضرات "العیاذ باللہ" دنیا میں سب سے زیادہ قلیل العلم اور محروم العمل اور علوم قرآن سے ناواقف رہے اور اس دور جدید کے چند کور باطن یورپ کے مقلد قرآن کے ماہر اور محقق ہو گئے جو ان اقوام کے دوش بدوش چلنا معیار ترقی سمجھتے ہیں جن کی زندگی بے حیائی، بے غیرتی، عیش و عشرت اور مادہ پرستی میں غرق ہے۔

افسوس صد افسوس قرآن کریم کے بلند پایہ اور روحانی علوم کے بجائے ان امور کو حقائق قرآنی سے تعبیر کرنا کس قدر عظیم ظلم ہے۔ خدا اور اس کے رسولؐ اور ان علوم کی جن کا معلم بنا کر خدا نے اپنے پیغمبر کو مبعوث فرمایا سراسر توہین ہے۔

قرآن کریم ان مادی ترقیات کی تعلیم تو کیا دیتا اس نے تو سختی کے ساتھ ان کی طرف حرص و طمع کی نظریں اٹھا کر دیکھنے کو بھی منع فرما دیا۔ ارشاد ہے:

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ۔ (طٰہٰ)	ہرگز متوجہ نہ کیجیے اپنی نگاہوں کو ان انواع و اقسام کے سامان کی طرف جس سے ہم نے متمتع کیا ہے دنیا کی رونق و زینت میں سے ان کو تاکہ ہم انہیں آزمائیں۔

صنعتی اور مادی ترقیات کے اعلیٰ و ارفع مقام پر پہنچی ہوئی اقوام کے متعلق

قرآن کریم نے اپنے فیصلہ اور نظریہ کی وضاحت کر دی ۔ فرمایا :

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ	جانتے ہیں یہ لوگ حیات دنیا کے صرف
الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ	ظاہر کو اور یہی وہ لوگ ہیں جو آخرت
هُمْ غٰفِلُوْنَ ۔ (سورۃ الروم)	سے غافل رہنے والے ہیں ۔

تو معلوم ہوگیا کہ اس نوع کا ہر علم اور کمال خواہ دنیا کی نظروں میں وہ کتنا ہی بلند ہو غفلت عَنِ الْاٰخِرَة کے ہوتے ہوئے بیکار اور لغو ہے بلکہ قرآن کریم نے تو یہاں تک بھی اظہار کر دیا کہ جو لوگ دنیوی سازوں سامان زیب و زینت اور اسباب عیش و عشرت سے آراستہ اور تمام مادی طاقتوں کے مالک تھے کائنات کے منافع سے منتفع تھے اور ان میں خوب تصرف کرنا بھی جانتے تھے لیکن ان کا رابطۂ حیات اور رشتۂ زندگی جب خالق کائنات سے ٹوٹا رہا تو حق تعالیٰ کی نظروں میں مقہور و مغضوب ہوئے اور ان کی ان تمام مادی طاقتوں کو خدا کے قہر و غضب نے مچھر کے پر کی طرح مسل کر رکھ دیا اور ان تمام خزائن و دفائن، ملک و سلطنت اور بلند و بالا عمارتوں اور شاداب باغوں کا انہی ضعفاء اور کمزوروں کو وارث بنا دیا جو مفلوک الحال اور ان مادی وسائل سے خالی ہاتھ تھے ۔ چنانچہ ارشاد ہے

کم ترکوا من جنات وعیون	کس قدر باغات چشمے کھیتیاں اور عمدہ عمدہ
وزروع ومقام کریم ونعمة	مقامات اور نعمت جس میں وہ لوگ مزے
کانوا فیھا فاکھین کذالک	اڑا رہے تھے چھوڑ گئے بس اسی طرح ہے
واورثناھا قوما آخرین فما	(ہمارا فیصلہ) اور وارث بنا دیا ہم نے اس
بکت علیھم السماء والارض	زمین کا ایک دوسری قوم کو پس نہ رویا
وما کانوا منظرین ۔	آسمان اور نہ زمین اس ہلاک ہونے والی
(سورۃ الدخان)	قوم پر اور نہ ہی ان لوگوں کو کوئی مہلت دی گئی

بلکہ روحانیت اور اخلاق حسنہ کے بالمقابل دنیوی شان و شوکت اور مادی وسائل پر بھروسہ کر بیٹھنے کو قرآن کریم نے قومی پستی و ذلت اور انجام کی تباہی قرار دیا ۔

فرمایا: وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِئْيًا۔ — کتنی ہی قومیں ہم نے ہلاک کر ڈالیں جو بہت کچھ ساز و سامان اور ظاہری حالت بہت ہی اچھی رکھنے والے تھے۔

قارون کی شان و شوکت اور اس کے خزائن اور مال و دولت کی فراوانی کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم نے اس کا عبرت ناک انجام دُنیا کو بتا دیا کہ یہ جملہ مادی اسباب و وسائل ناپائیدار ہیں ان کے جال میں پھنس کر اپنے خالق کو بھلا دینا دراصل تباہی اور بربادی کو دعوت دینا ہے۔ فرمایا گیا:

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَا اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓءُ بِالْعُصْبَةِ اُولِى الْقُوَّةِ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِى الْاَرْضِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ۔

بیشک قارون تھا (حضرت) موسٰی کی قوم میں سے جس نے بغاوت و سرکشی اختیار کر رکھی تھی ان کے مقابلہ میں اور ہم نے دیئے تھے اس کو اس قدر خزانے کہ ان کی کنجیاں ہی گرانبار کر دیتی تھیں طاقتور لوگوں کی ایک جماعت کو تو (اے مخاطب یاد کر اس واقعہ کو) جب کہ اس کی قوم نے اس سے کہا (اے قارون) اس مال و دولت اور شان و شوکت پر مست اترا۔ بے شک اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں فرماتا ہے اور یہ بھی کہا اور تلاش کر تو اس مال و دولت اور اس ساز و سامان میں جو اللہ نے تجھ کو دیا ہے دار آخرت کو اور فراموش نہ کر دُنیا میں سے اپنے حصہ کو (کہ اس دُنیا میں تیرا حصہ کتنا ہے) اور احسان کر تو جیسا کہ اللہ نے تجھ پر احسان کیا۔

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِىْ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ

أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّأَكْثَرُ جَمْعًا ۖ وَلَا يُسْأَلُ عَنْ ذُنُوبِهِمُ الْمُجْرِمُونَ -

اور زمین میں فتنہ و فساد کا خواہاں نہ بن (کیونکہ مادی عیش و عشرت اور دنیوی مال و دولت کا حرص و لالچ اور اس کی فراوانی کی فکر میں لگنا امن عالم کو تباہ کرنے والا ہے) یقیناً اللہ تعالیٰ فساد برپا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے (یہ سب کچھ سن کر) قارون بولا، مجھ کو تو یہ سب کچھ محض اپنے اس ہنر اور کمال کی وجہ سے ملا ہے جو مجھے حاصل ہے (یعنی مادی وسائل میں خزائن ارض و جبال سے منتفع ہونے کے لیے تصرف کرنے کی صلاحیت) حق تعالیٰ نے فرمایا، افسوس! کیا اس نے یہ بات نہیں جانی کہ اللہ (تعالیٰ) نے اس سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کر دیا۔ (جب کہ وہ مادی اسباب عیش و عشرت میں پڑ کر خدا سے غافل اور بے تعلق ہو گئے تھے) جو قوت (و مادی وسائل کی طاقت) میں اس سے بھی بڑھ کر تھے اور مال و دولت بھی اس سے زیادہ جمع کرنے والے تھے اور (حقیقت یہ ہے) مجرموں سے پوچھا نہیں جاتا ہے ان کے جرائم اور گناہوں کے بارہ میں جب کہ ان پر خدا کا قہر و عذاب مسلط ہوتا ہے کہ کیا مجرمو! تم نے یہ جرائم کیے تھے یا نہیں کیونکہ خود

(سورۃ القصص) پروردگار عالم کو ہر چیز کا علم ہے ۔)

لیکن ان تمام خزائن کے مالک اور دنیوی وسائل اور تکوینی منافع سے متمتع ہونے والے انسان کا قرآن نے دنیا کے سامنے انجام پیش کر دیا۔ فرمایا :

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۔ وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ فَمَا كَانَ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ

(سورۃ القصص)

تو پھر وہ نکلا ایک بار اپنی زیب و زینت کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے تو جو لوگ اس کی برادری میں سے دنیوی زندگی کے طالب و حریص تھے وہ کہنے لگے کاش ہم کو بھی ایسی ہی چیزیں حاصل ہوتیں جو قارون کو دی گئی ہیں ۔ بے شک یہ تو بہت ہی بڑے اچھے نصیبہ والا ہے ۔ اور (اس کے بالمقابل) وہ لوگ جن کو علم دیا گیا تھا کہنے لگے افسوس اور ہلاکت ہو تم پر (تم دنیا پر کیا للچا رہے ہو تمہیں خبر نہیں) اللہ کے یہاں کا اجر و ثواب ہی بہتر ہے (بہ نسبت اس دنیوی زیب و زینت کے) ہر اس شخص کے واسطے کہ جو ایمان لایا اور نیک کام کیے ۔ اور یہ ثواب انہی لوگوں کو دیا جاتا ہے جو صبر کرنے والے ہیں ۔ پھر ہم نے اس قارون کو زمین میں دھنسا دیا اس کے محل سمیت ۔ سو نہ کوئی جماعت ایسی ہوئی کہ جو اس کی مدد کرتی ۔ اللہ کے اس عذاب سے بچانے کے لیے اور نہ ہی وہ خود اپنی مدد کرنے والوں میں سے ہو سکا ۔

غرض ظاہر ہوگیا کہ مادی شوکت و طاقت اور تکوینی منافع سے متنفع ہونا تو قرآن کا کیا مقصد ہوتا ۔ قرآن تو ان چیزوں میں انہماک ان کی محبت اور ان کی حرص کو منع کرتا ہے لہٰذا ایسے امور کو مقاصد قرآن کہنا قرآن کریم کا مذاق بنانا ہے

بالفرض والتقدیر اگر یہی معدنی اور مادی ترقیات نزول کتاب اللہ اور بعثت نبوی کا مقصد ہوتیں تو حق تعالیٰ کو تئیس برس کی طویل مدت تک سلسلہ وحی جاری رکھنے کی کیا ضرورت تھی کہ بالخصوص مکی زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ پر طرح طرح کے مصائب گذرے ۔ کفارِ مکہ کی طرف سے ناقابلِ تصور ایذائیں اور تکلیفیں برداشت کیں اور فقر و فاقہ قید و بند کی مصائب کے باوجود نظام ہدایت کو جاری فرمایا ۔ کیوں نہیں ان حضرات نے کچھ فیکٹریاں اور صنعتیں کارخانے قائم کرنے شروع کردیئے ۔ چاہیئے تھا کہ حق تعالیٰ کی توحید ایمان و طاعت اور عبادات اور علوم الٰہیہ کی اشاعت و تبلیغ کے بجائے معادن ارضیہ اور خزائن جبال و بحار سے مستفیض ہونے کا نظام تعلیم و تربیت جاری کردیتے اور پھر جب یہی امور بزعم قائل قرآنی مقاصد ہیں تو زمانہ نبوت کی تکمیل پر یہ اعلان الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی کیونکر صحیح ہوا ۔ حالانکہ اس وقت تک نہ کوئی صنعتی ادارہ اور مشین قائم ہوئی تھی ، نہ انجن تیار ہوئے تھے اور نہ جہاز و راکٹ اڑائے گئے تھے ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ ، عبدالرحمٰن بن عوف ، سعد بن ابی وقاص ، سعید ابوالدرداء ، ابی بن کعب اور ایسے ہی دوسرے کسی صحابی نے کونسی سائنسی ترقیات و مہارت حاصل کرکے بقول اس طبقہ ترقی یافتہ اقوام کے دوش بدوش چلنے لگے تھے ؟ استغفر اللہ استغفر اللہ ۔ یہ حضرات تو ان ترقی یافتہ اقوام کے قریب سے گذرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے ۔ ان کی زیب و زینت اور شان و شوکت اپنی پھٹی پرانی گدڑیوں اور پیوندلگی ہوئی چادروں اور چمڑے کے ٹکڑوں سے سلی ہوئی ازاروں کو ان کے ہیرے جواہرات سے مرصع قالینوں اور

زرق برق پوشاکوں سے زائد بہتر سمجھتے تھے ۔ یہ حضرات اپنے ٹوٹے ہوئے جوتوں سے روم و ایران کے قیمتی قالینوں کو روندتے اور دنیا کی ہر زینت و ترقی کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوئے فرماتے :

نحن قوم اعزنا اللّٰہ بالاسلام ۔ کہ ہم وہ قوم ہیں جن کو اللہ نے اسلام اور شعائرِ اسلام کی بدولت عزت و سربلندی بخشی ہے ۔

اور بلاشبہ یہ وہ عزت ہے جس کے سامنے دنیا کی ہر عزت شہنشاہی و سرداری ہیچ ہے ۔ قیمتی سے قیمتی ہیرے جواہرات بھی کوئی وقعت نہیں رکھتے ۔۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم یہی عزت و بلندی عطا فرمانے کے لیے مبعوث ہوئے اور اسی عزت کو لے کر قرآن نازل ہوا ۔

مادی وسائل اور صنعتی ترقیات کو روحانی اور ایمانی اقدار کے مقابلہ میں فوقیت دینا فرعونی نظریہ ہے ۔ کیونکہ فرعون نے اپنے سازو سامان اور مادی طاقت و شوکت کو خدا کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خستہ حالی پر فوقیت دیتے ہوئے نمایاں کیا تھا اور کہا :

یَا قَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهَارُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ ۔ (سورۃ زخرف)	کہ اے میری قوم کیا میرے لیے ملک مصر کی سلطنت و بادشاہی اور یہ نہریں نہیں ہیں جو میرے محلات کے نیچے سے بہہ رہی ہیں کیا تم اس بات کو نہیں دیکھتے ہو کیا میں بہتر نہیں ہوں اس حقیر اور خستہ حال شخص سے (یعنی موسیٰؑ) ۔

گویا فرعون نے برتری کا معیار یہی سمجھا کہ میں بہت ترقی یافتہ ہوں ۔ سازوسامان کی فراوانی کی میرے پاس کوئی حد نہیں ۔ اس لیے موسیٰؑ جو خستہ حال اور پھٹے پرانے کپڑوں میں ہیں ان کو میرے اوپر کوئی فوقیت نہیں حاصل ہو سکتی ۔

تو اہل ایمان ایسے گمراہ کن لوگوں سے پوچھیں کہ آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ

نے کس چیز کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر یہ اعلان فرمایا : الیوم اکملت لکم دینکم ، ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم نے جو چیز سکھائی وہ ایمان و تقویٰ خالق کائنات کی معرفت اور اس کی ربوبیت اور شان رحم و کرم پہچاننا ۔ اس کی اطاعت و بندگی خوف آخرت احوال جنت و جہنم جزا و سزا سعادت و شقاوت کے اصول ، اعمال و اخلاق کی اصلاح معاملات و معاشرہ کی درستگی عدل و انصاف ، خدمت خلق ، صبر و شکر ، قناعت تزکیۂ باطن یعنی عمل اور اخلاق کا ہر قسم کی گندگی سے پاکی اور بے حیائی ، شہوت پرستی ، خیانت ، ظلم و ستم ، چوری ، زنا شراب ، حب دنیا ، حرص و بخل اور حسد جیسے ناپاک اور مہلک امراض سے معاشرہ کو پاک رکھنا یہ ہیں قرآنی مقاصد جن کو لے کر قرآن اترا ۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی تعلیم و تربیت کے ذریعہ اہل عرب کی زندگیاں ان تمام عیبوں سے پاک کر کے ہر خوبی اور کمال سے آراستہ کردی تو تکمیل مقاصد کے بعد یہ اعلان خداوندی اور بشارت ربانی نازل کی گئی ’’ الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا ۔‘‘

قرآن کریم کی وہ تمام آیات جن میں مصنوعات یا عجائب تخلیق ملکوت السموات والارض کی عظیم نشانیاں اور ان میں گوناگوں پیداوار عناصر و موالید اور ثوابت و سیارات کا ذکر ہے وہ فن سائنس کی تعلیم کے لیے نہیں اور نہ اس لیے کہ انسان انہی مصنوعات اور ان میں تصرفات کے دائرہ ہی میں محدود رہ جائے بلکہ صنائع الٰہی میں نظر و فکر کی دعوت ان مصنوعات سے صانع کو پہچاننے اور مخلوقات کی عظمت سے خالق جل و علا کی عظمت و برتری کا سراغ لگانے کے لیے ہے تاکہ اس معرفت اور ایمان و یقین کی پختگی کے ساتھ قوت عملیہ بھی مکمل اور مضبوط ہوسکے اور ہر شخص اس نظر و فکر کے ذریعے حق تعالیٰ کے اوامر و نواہی کی تعمیل کے لیے ہمہ تن شوق بن کر میدان عمل میں نکل آئے اور اس طرح سے انسان کی قوت نظریہ

دفکر یہ معرفت واعتقاد کے مرتبہ سے آگے بڑھ کر سراپا پیکر طاعت و بندگی بن جائے اور ان مصنوعات کے مشاہدہ سے اس یقین و ایمان پر قلب و دماغ راسخ ہو جائے کہ بے شک ان کا صانع و خالق لامحدود اور غیر متناہی قدرتوں اور عظمتوں کا مالک ہے وہی قادر مطلق اور ہر کمال و خوبی سے متصف ذات پروردگار ہی عبادت کے لائق ہے اس کے حقوق کی ادائیگی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہونا چاہیے۔ اس کے قہر و غضب سے ڈرنا چاہیے اور اسی کی رضا و خوشنودی کا طلبگار رہنا چاہیے۔
کہ خالق کائنات کی اطاعت و بندگی اس کے احکام کی پیروی مبداء و معاد کا پہچاننا زہد و تقویٰ خوف آخرت اخروی سعادت و نجات کے لیے جدوجہد اور بغاوت و نافرمانی پر تنبیہ و تہدید۔ مثلاً سورۂ حٰمٓ السجدہ کے دوسرے رکوع کو دیکھیے[1] جس میں خلق السموٰات والارض کا تفصیل سے ذکر فرمایا گیا لیکن اس سے کچھ قبل دیکھ لیجیے کہ مضمون کی ابتداء کس طرح سے کی گئی ہے؟

آغاز مضمون اس طرح ابتداء سورت سے فرمایا گیا کہ یہ قرآن کریم کتاب الٰہی ہے جو رحمٰن و رحیم کی طرف پیغام ہدایت بن کر نازل ہوا ہے جو تمام دنیا کو طاعت خداوندی اور اصلاح عمل کی دعوت دیتا ہے۔ اہل ایمان کے واسطے نجات و انعامات اخروی کی بشارت اور نافرمانوں بدعملوں شہوت پرستی میں مبتلا ہونے والوں کو عذاب حدود سے ڈرانے والا ہے۔ ابتداء مضمون میں اس امر کے ظاہر کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اس پیغام ہدایت سے بے رخی کرنے والوں کا بھی ذکر شروع کر دیا گیا اور بتایا گیا کہ یہ بدنصیب لوگ صرف یہی نہیں کہ اس روحانی ہدایت سے اعراض و بے رخی اختیار کریں بلکہ بڑی ہی بے باکی کے ساتھ یہ اعلان کر دیتے ہیں۔

---

[1] مناسب ہوگا کہ حضرات قارئین اس مقام پر حٰمٓ السجدہ کی یہ تمام آیات از اول تا آخر قرآن کریم میں ترجمہ و تفسیر کے ساتھ ملاحظہ فرمالیں تاکہ خلق سموات و ارض کا بیان جس غرض و مقصد کے لیے ہے وہ مربوط طریقہ سے مضمون کے آغاز اور اس کے بیان کردہ انجام سے پوری طرح واضح ہو جائے۔ ۱۲۔

قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَکِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَا اِلَیْهِ وَ فِیْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّ مِنْۢ بَیْنِنَا وَ بَیْنِکَ حِجَابٌ۔ (سورۃ حٰمٓ السجدہ)

کہ اے پیغمبر ہمارے قلوب اس بات سے جس کی طرف آپ دعوت دیتے ہیں۔ پردوں اور غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں، اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگی ہوئی ہے اور ہمارے آپ کے درمیان ایک حجاب و رکاوٹ ہے۔

قرآن کریم روحانی ہدایات کا مجموعہ ہے اور یہی مقاصد قرآن ہیں

معلوم ہوا کہ قدیم تاریخ ہی سے اہل باطل کا یہ دستور چلا آیا ہے کہ انہوں نے روحانی ہدایات کو ٹھکرا کر اپنا مبلغ علم اور محور جدوجہد مادیات ہی کو بنایا اور پیغمبر خدا کے سامنے نہایت صاف لفظوں میں اپنے نظریات اور طرز عمل کی وضاحت کردی، تو ان آیات کے ضمن میں حق تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرما دیا کہ آپؐ تو بہرحال صراط مستقیم ہی کی طرف دعوت دیتے رہیں اور دنیا کو یہی بتائیں کہ اللہ ہی کے مقرر کردہ طریقوں پر زندگی گذارنا موجب فلاح و کامیابی ہے۔ ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ دائمی رحمتیں اور کبھی ختم نہ ہونے والا اجر و ثواب ہے[1]۔

اس کے بعد متصلاً ہی اس ذات خداوندی جس کی اطاعت پر اجر و ثواب بیان کیا جا رہا ہے کے معبود حقیقی ہونے اور اس کی عظمت و کبریائی اور وحدانیت کے دلائل اور قدرت کی نشانیوں کا بیان اس طرح شروع کر دیا گیا:

قُلْ اَئِنَّکُمْ لَتَکْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ذٰلِکَ

(اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے آپ (ان لوگوں سے) کیا تم انکار کرتے ہو اس (خدا کی توحید و الوہیت اور اطاعت وبندگی

---

[1] یہ الفاظ اس آیت مبارکہ کی طرف اشارہ ہیں جو کافروں کے جواب کے طور پر نازل ہوئی۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ۔

رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَا اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ الخ

(سورۃ حٰم السجدہ ۲)

کا جس نے زمین کو (باوجود اس کی اس قدر وسعت کے) دو دن میں پیدا کر دیا اور (تعجب ہے کہ) پھر بھی تم اس کے واسطے شریک ٹھہراتے ہو۔ یہی خدا سارے جہانوں کا پالنے والا ہے اور اس رب نے زمین کے اوپر قائم کیے پہاڑ اور اس میں بڑے بڑے فائدوں کی چیزیں رکھیں اور اس زمین پر بسنے والوں کے لیے غذائیں کو پیدا کیا۔ جو سب کچھ چار دن میں پورا ہو گیا جو پورے ہیں (کمیت اور کیفیت خلق پوچھنے والوں کے لیے پھر وہ پروردگار آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا جب کہ وہ دھواں تھا تو آسمان و زمین دونوں کو حکم دیا۔ تم دونوں آجاؤ (ہمارے حکم کی طرف) خوشی سے یا مجبوری سے۔ دونوں نے کہا ہم حاضر و تیار ہیں تیرے حکم کے سامنے۔ پھر دو روز میں اللہ نے (اس مادہ دخانیہ کو) سات آسمانوں کی صورت میں پورا کر دیا اور ہر آسمان میں شروع کی اس کے مناسب احکام کی الخ

خلق سماوات و ارض اور عجائب تخلیق کے یہ نمونے بطور شواہد اور دلائل مخاطبین کو سنا کر اصل مقصد کی طرف متوجہ کر دیا گیا کہ وہ ایمان و تقویٰ اور طاعت خداوندی ہے اور اگر کوئی عقل و خرد سے محروم قوم قدرت کی ان تمام نشانیوں کو دیکھ کر بھی خالق کائنات کو نہیں پہچانتی اور اس کی طرف رجوع نہیں کرتی تو پھر ایسے نافرمانوں کو خداوند عالم کے قہر و غضب کے لیے تیار ہو جانا چاہیے تو اس کے واسطے تنبیہ و وعید کا ان کلمات کے

ساتھ سلسلہ شروع فرمادیا :

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ.	پس اگر وہ پھر بھی اعراض و روگردانی کریں تو آپ کہہ دیں میں تم کو ڈراتا ہوں ایک بجلی کی کڑک والے عذاب سے جو مانند عاد و ثمود پر واقع ہونے والی کڑک (اور قہر و عذاب) کے ہوگا — کہ اس عذاب نے ان کو دم کے دم میں تباہ و برباد کر دیا۔

حالانکہ عاد و ثمود سائنسی ترقیات صنعت و حرفت اور فنون تعمیر میں بے مثال صلاحیتوں کے مالک تھے۔ پہاڑوں کو تراش کر ایسی مضبوط عمارتیں بناتے تھے آج اس دور ترقی میں جب کہ فن انجینئرنگ کو بہت ہی عروج حاصل ہے اس کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا۔ لیکن ان کی یہ تمام ترقیات عذاب خداوندی سے ان کو نہ بچاسکیں۔ حق تعالیٰ شانہ نے ان عبرتناک تاریخی حقائق کو بیان کرتے ہوئے نافرمانوں کو متوجہ فرمایا کہ انہیں حق تعالیٰ کی قدرت و عظمت کے سامنے اطاعت و فرمانبرداری کا سر جھکا دینا چاہیے اور عذاب خداوندی سے بے فکر نہ ہوجانا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ جب اس رب کے ایک حکم اور اشارہ سے پہاڑوں سے تراشے ہوئے محفوظ و بلند ترین قلعے ریزہ ریزہ ہوگئے اور ہوا کے ایک جھونکے نے پوری قوم کو اکھاڑ پھینکے ہوئے درختوں کی طرح بنادیا تو کفار مکہ کی اس پروردگار کے مقابلہ میں کیا حقیقت ہے۔

تو اس طرح رب کی نافرمانیوں کے تباہ کن نتائج کا بیان شروع کر دیا گیا، اور آیت مبارکہ وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَاءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ سے مسلسل دو رکوع تک احوال آخرت اور مجرمین کے دردناک عذاب کی کیفیات اور میدان حشر میں ان کی ذلت و رسوائی کے مناظر بیان کیے جاتے رہے۔

غرض اس بسط و تفصیل سے نافرمانیوں پر دنیا و آخرت کی تباہیوں اور

ذلّت و رسوائی اور دردناک عذاب کے ہولناک نتائج کے ضمن میں اہل ایمان اور مطیعین پر جو انعام و کرم ہے اس کی ایک جھلک دکھا دینے کے لیے یوں سلسلۂ کلام شروع فرما دیا گیا:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ دعوت الی اللہ کے محاسن اور یہ کہ انسانی زندگی میں نیکی اور بدی کا درجہ برابر نہیں ہو سکتا بیان کرتے ہوئے دواعی عمل اور جذبات اطاعت کو ابھارنے اور قوی کرنے کے لیے پھر دوبارہ دلائل قدرت کا ذکر شروع فرما دیا، تاکہ زندگی کا رُخ خالق کائنات کی طرف پوری طرح پھیر لیا جائے اور فرمایا وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِىْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ

مُراد یہ ہے کہ کائنات عالم کی ان تمام نشانیوں، قدرت کے عظیم مناظر اور دلائل قدرت کے مشاہدہ کے بعد بھی غافلوں کی آنکھیں نہیں کھلیں حالانکہ ان تمام مناظر قدرت میں خالق کائنات کی ہستی اور اس کی وحدانیت و الوہیت سُورج سے بھی زائد روشن اور عیاں ہے۔ بہت ہی بدبخت انسان ہو گا جو یہ سب کچھ دیکھ کر اپنے خالق اور کائنات کے پیدا کرنے والے کو نہ پہچانے اور اس کا مبلغ علم صرف یہی مادی چیزیں ہیں اور پہاڑوں کی گھاٹیوں اور سمندروں کے گرداب ہی میں وہ پھنسا رہے۔ ان نشانیوں کو دیکھنے کے بعد تو ہر انسان کو "وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِىْ خَلَقَهُنَّ" کی سراپا تعمیل اور تصویر بن جانا چاہیے اور اگر اہل شقاوت کی بدبختی اس درجہ غالب آ چکی ہے کہ اس نے تمام فطری صلاحیتوں اور قبول حق کی استعداد کو اس درجہ مسخ کر دیا کہ وہ ان آیات کو دیکھ کر بجائے سمجھنے اور ان کے مقتضیٰ پہ عمل کرنے کے دلائل قدرت اور اللہ کی نشانیوں میں ٹیڑھی راہ نکالنا شروع کر دیں اور الحاد و تحریف کا رویہ اختیار کر لیں تو ایسے ممسوخ الفطرت اور محرفین و ملحدین کو تنبیہ و تہدید فرمائی گئی کہ

اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا۔ بے شک ایسے ملحدین جو ہماری آیتوں میں الحاد و تحریف کرتے ہیں وہ ہم پر پوشیدہ نہیں ہیں۔

خدا تعالیٰ خوب دیکھ رہا ہے کہ ایسے ملحدین دنیا کو گمراہ کرنے اور کلام اللہ کے مقاصد سے لوگوں کا رُخ مادیت کی طرف پھیرنے کے لیے کس کس طرح سازش کرتے ہیں۔ اور جن آیات کو اللہ ربّ العالمین نے طاعت و بندگی سعادت دارین اصلاح معاش و معاد تکمیل روحانیت تزکیۂ باطن کی تعلیم کے لیے نازل کیا تھا۔ انہی آیات کو یہ لوگ مادی منفعتوں اور نفسانی اغراض و خواہشات کے حصول کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں اور علی الاعلان خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بغاوت پر کمربستہ ہیں۔ اس مقام پہ قرآن کریم بڑی ہی جامعیت اور دلائل و حقائق کی روشنی میں بیان کرتے ہوئے چندہی آیات کے بعد عمل کا تقسیم اور صاحب عمل کے لیے اس کے عمل کے مطابق نتائج و ثمرات کے مرتب ہونے کے مضمون کی طرف منتقل ہوگیا۔ اور آیت اِلَیْهِ یُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ سے قیامت کا کچھ اجمالی تذکرہ شروع کردیا گیا۔

اس سلسلہ میں یہ بھی بیان فرمادیا کہ اس سعادت و فلاح کے حصول میں انسان کی ایک فطری اور طبعی کمزوری اور قصور جو حائل بنتا ہے وہ یہ ہے :

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ۔ کہ جب کسی انسان پر انعامات فرماتے ہیں تو وہ اعراض و بے رُخی کرنے لگتا ہے اور اپنے پہلو کو ہم سے بچاکر دنکل جاتا ہے۔

اور بجائے منعم حقیقی کی نعمتوں کے شکر ادا کرنے کے اعراض و روگردانی کی روش اختیار کرلیتا ہے۔ اور پھر جب کبھی مصائب و تکالیف میں مبتلا ہو تو ہاتھ پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگنے لگ جاتا ہے۔

غرض انسان کی یہ طبعی کمزوری بیان کرتے ہوئے پھر ایک بار انسانی افکار کو دلائل قدرت کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دی گئی اور چونکایا گیا کہ اگر ان تمام دلائل قدرت اور نشانیوں کے مشاہدہ کے بعد انسان نے اپنی باغیانہ روش نہ بدلی تو پھر اس کو عذاب خداوندی اور ایسے قہر و غضب میں مبتلا ہونے کے واسطے تیار ہو جانا چاہیے جو قرون اولیٰ پر ان کی سرکشی اور نافرمانی پر نازل ہوتا رہا۔ اور اس مضمون کے اختتام پر ایسے بدنصیبوں کی گمراہی اور قبول حق کے فطری جوہر سے محرومی کا راز بتا دیا گیا کہ ان کے دلوں سے آخرت کا تصور ہی مٹ چکا ہے۔ فرمایا :

اَلَآ اِنَّهُمْ فِىْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ ۗ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَىْءٍ مُّحِيْطٌ ۔

خبردار یہ لوگ تو اپنے رب کے سامنے حاضری اور پیشی ہی کے معاملہ میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ وہ پروردگار ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے

تو یہ ہے وہ انداز بیان دلائل قدرت اور مصنوعات عالم کا جو آپ نے قرآن کریم کے ایک ہی مقام میں دیکھا کہ ان تکوینی امور کو ایک ہی مقام پر کیسے لطیف اور پاکیزہ عنوان کے ساتھ ذکر فرمایا گیا کہ مضمون کے یہ تمام پہلو گویا ایک لڑی میں پروئے ہوئے موتی ہیں اور بیان کردہ تمام امور نہایت ہی مؤثر و بلیغ انداز بیان اور ٹھوس دلائل اور ناقابل تردد حقائق کے ساتھ ایک ہی محور پر گھوم رہے ہیں جو اصل مقصد قرآن ہے۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں دلائل قدرت اور تکوینی امور کا بیان ہے، وہاں آپ اسی طرز اور معیار پر مضامین قرآن کو مشتمل پائیں گے۔ پورے قرآن میں ایک مقام بھی ایسا نہیں ملے گا جہاں کائنات عالم اور عجائب تخلیق کے ذکر سے پہلے یا اس کے بعد ان مقاصد اور اطاعت خداوندی کا حکم اس کی نافرمانی پر وعید جزا و سزا اور احوال قیامت سے متعلق مضامین

عنہ بیان کیے گئے ہوں ۔ مثلاً سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں دیکھ لیجیے :
کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ۔ چند مختصر اور جامع کلمات میں انسان کی اصل حقیقت اس کے مبدأ و معاد اور حشر و نشر کو بیان کرتے ہوئے فوراً ہی یہ سلسلۂ بیان شروع کر دیا گیا ۔

ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰھُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (سورۃ بقرہ)	وہی پروردگار ہے جس نے پیدا کیا تمہارے واسطے ان تمام چیزوں کو جو زمین میں ہیں، پھر وہ متوجہ ہوا آسمان کی جانب جن کو سات آسمان بنا دیئے اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ۔

اور اجمالی طور پر ان دلائل کونیہ کے بیان کے ساتھ مسئلہ استخلاف آدم علیہ السلام شروع کر دیا تاکہ مخاطبین بخوبی یہ بات ...... سمجھ لیں کہ تخلیق عالم اور کائنات کی کل نعمتوں کے پیدا کرنے کا مقصد ان احکام الٰہیہ کی اطاعت و پیروی ہے جن کے نفاذ و اجراء کے لیے آدم علیہ السلام کو زمین پر خلیفۃ اللہ بنا کر بھیجا گیا یہی مقصد وحید قرآن کریم کا مقصد نزول ہے کہ انسانوں کو ہدایات سماویہ اور احکام الٰہیہ کے ذریعے فوز و فلاح کی بلند ترین منازل تک پہنچایا جا سکے ۔

اسی طرح دوسرے مقام پر کفر و نافرمانی کے نتائج ہلاکت و بربادی اور دائمی عذاب خداوند عالم فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت کا ذکر فرماتے ہی توحید خداوندی کا اعلان کیا جا رہا ہے کہ وَاِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۔ اور اس اعلان کے ساتھ بطور دلائل خلق سموات و ارض اور کونیہ کا بیان شروع فرما دیا گیا جیسے کہ ارشاد باری ہے :

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ	بے شک آسمان و زمین کے پیدا کرنے اور رات و دن کے بدلنے میں اور کشتیوں میں
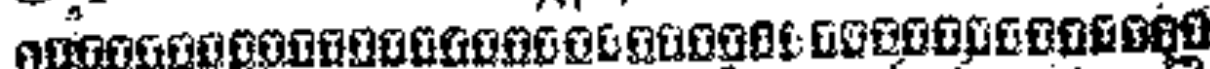
وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ	جو کہ سمندر میں لے کر چل رہی ہیں ان چیزوں
بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا	کو جو لوگوں کو نفع پہنچاتی ہیں اور اس میں
أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ	کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا جس سے
مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ	زمین کو زندہ اور شاداب کردیا بعد اس کے
مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ	خشک اور بنجر ہوجانے کے اور پھیلائے
دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ	اس میں ہر قسم کے جانور۔ اور ہواؤں کے
وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ	لوٹا پھیرنے میں اور ان بادلوں میں جو آسمان
وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ	وزمین کے درمیان معلق ہیں البتہ (ان سب
	چیزوں میں) بہت بڑی نشانیاں ہیں عقل
(سورۃ بقرہ ۱۶)	رکھنے والوں کے لیے۔

پھر اس کے بعد ومن الناس من یتخذ من دون اللہ انداداً یحبونھم کحب اللہ کے مضمون سے ان لوگوں کا حسرت ناک انجام بیان کردیا جو خدا تعالیٰ سے تعلق قطع کرکے شرک وکفر میں مبتلا ہیں۔

اسی طرح سورۂ آل عمران کے خاتمہ پر بھی نافرمانوں پر وعید کے بعض خلق سموات وارض کا ذکر کیا گیا اور واضح طور پر یہ بتایا گیا کہ مصنوعات عالم اور اختلاف لیل ونہار سے فائدہ اٹھانے والے دراصل وہی اہل عقل ہیں جو ان مصنوعات کے ذریعے اپنے آپ کو صانع عالم اور خالق کائنات پروردگار کے ساتھ مربوط و وابستہ بنالیں چنانچہ فرمایا:

إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ	بیشک ان تمام مصنوعات عالم اور دن
الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا	رات کے بدلنے میں) بہت ہی بڑی نشانیاں
وَقُعُودًا وَعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَ	ہیں ان عقلمندوں کے لیے جو اللہ کو یاد
يَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوَاتِ	کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں
وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ	پر لیٹے ہوئے اور غور وفکر کرتے ہیں

هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں در انحالیکہ وہ کہتے ہوتے ہیں اے ہمارے پروردگار یہ سب کچھ تونے عبث اور بے مقصد نہیں بنایا پاک ہے اے پروردگار تیری تو ہم کو عذاب جہنم سے بچا۔

(سورۃ آل عمران)

اور خلق سموٰات وارض میں صحیح غور و فکر کرنے والوں کے پاکیزہ اوصاف و خصلتیں ان کی باطنی کیفیتیں ایمان کی پختگی، خوف خدا آخرت کی تیاری اور ہر آن و لمحہ زندگی کا رُخ اللہ رب العالمین کی طرف متوجہ ہونا بیان کرکے یہ بتا دیا کہ دراصل یہ ہیں وہ لوگ جو خلق سموٰات وارض اور کائنات فطرت کا صحیح مطالعہ کرنے والے اور معادن ارضیہ و دفائن جبال و خزائن بحار مستفیض ہونے والے ہیں۔

یہی وہ حقیقی استفادہ ہے جس کو لے کر قرآن نازل ہوا۔ مادہ پرستوں کا مادی دنیا میں انہماک اسی کے لیے عملی جدوجہد اور اسی کی ترقی کے لیے اقطار عالم میں گشت اور سرگردانی و حیرانی مقصود زندگی بنا لینا محض ایک دھوکہ اور فریب ہے زندگی کے اس دھوکہ اور فریب سے بچنے کے لیے ساتھ ساتھ تنبیہ فرما دی گئی :

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ۔ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ۔

دھوکے میں نہ ڈال دے تم کو کافروں کا گشت کرنا (اور تصرف کرنا) شہروں میں یہ تو بہت ہی تھوڑا سا سامان ہے۔ پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

ﷺ سورہ آل عمران کے اس آخری رکوع کو اوّل سے آخر تک حضرات قارئین ترجمہ و تفسیر کے ساتھ مطالعہ فرمالیں۔ بالخصوص کل نفس ذائقۃ الموت سے سورہ کے ختم تک۔ ان پاکیزہ کلمات میں سبحان اللہ اہل ایمان کے واسطے کس قدر حلاوت اور طاعت و بندگی کا جذبہ موجود ہے۔

سورۂ سبا میں قرآن کریم نے قوم سبا کی مادی زندگی کے عیش و عشرت اور مال و دولت غلوں اور پھلوں کی کثرت اور اس سرزمین کی شادابی کے مناظر اس طرح بیان کیے کہ ان کے چلنے کے راستوں پر دو طرفہ باغات تھے جن کی شادابی اس قوم کے لیے مادی زندگی کے عیش و راحت کی تکمیل کا سبب بنی ہوئی تھی۔ رزق کی کثرت و فراوانی کی حدود انتہا نہ تھی کہہ دیا گیا تھا : كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ لیکن جب اس قوم نے متاع دنیا اور مادی اسباب ہی کو مقصد زندگی بنالیا تو خالق کائنات سے غفلت و نافرمانی کا یہ انجام ہوا کہ :

فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ

پس بنادیا ہم نے ان کو (ان کی ہلاکت و تباہی کے بعد دنیا کے واسطے) صرف حکایات اور افسانے اور ان کو ریزہ ریزہ کردیا پوری طرح پارہ پارہ کردیا۔

علیٰ ہذا القیاس سورۂ زخرف میں بھی حق تعالیٰ نے خلق سموات و ارض اور جہازوں کشتیوں کے ذریعے ساز و سامان کی نقل و حمل اور دنیا کی تمام مادی منفعتوں کا ذکر کرتے ہوئے بتادیا کہ یہ سب کچھ صرف اس لیے ہے کہ انسان اپنے خالق کی ساتھ اپنی زندگی کا رشتہ قائم اور وابستہ کرے اور فکر آخرت میں لگ جائے اور یہ سمجھ لے کہ خداوند عالم کے روبرو قیامت میں حاضر ہونا ہے۔ سو اس کے لیے تیاری ایمان اور عمل صالح ہی ہے چنانچہ ارشاد ہے ، وَجَعَلَ لَكُمْ مِنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ ؕ

لِتَسْتَوُوا عَلَىٰ ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُولُوا سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَٰذَا وَمَا

اور بنائے اللہ نے تمہارے واسطے (اسباب معیشت میں) جہاز و کشتیاں اور چوپائے جن پر تم سوار ہوتے ہو تاکہ ان کی پشت پر سوار ہو کر یاد کرو اپنے رب کے انعام و

له حضرات قارئین سورۂ سبا میں اس مضمون کا مطالعہ فرمائیں۔ ۱۲۔

کُنَّا لَهُ مُقْرِنِيْنَ وَاِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۔

(احسان کو) جب کہ تم ان پر سواری کرو اور کہو پاک ہے وہ ذات جس نے ان چیزوں کو ہمارے قابو میں کر دیا اور ہم تو ان کو اپنے قابو میں نہیں کر سکتے تھے اور بے شک ہم کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے

الغرض پورے قرآن میں از اوّل تا آخر دلائل قدرت عجائب تخلیق اور منافع کونیہ کا ذکر اسی طرز پر دائر ہے اور ان تمام آیات کا مقصد وحید صرف یہی ہے ، اور یہی قرآن کا حقیقی منشا ہے ۔ احکام خداوندی کی اطاعت اور فکر آخرت ہی ان تمام مضامین کا مبدأ و منتہیٰ ہے ۔

اہل باطل اور مادہ پرستوں نے دھوکہ اور فریب کا ایک مزیّن اور منقّش پردہ حق پر ڈال رکھا ہے ۔ ہم اُمید کرتے ہیں یہ دو چار مثالیں ہی ان کے دام تزویر کو تار تار کر ڈالنے کے لیے کافی ہیں ۔ اگر اندیشۂ تطویل مانع نہ ہوتا تو اس مقصد کی توضیح و تفہیم کے لیے مزید کچھ شواہد اور مثالیں پیش کرتا ۔ قرآن کریم کے حقیقی مقاصد سے بھٹکانے والے ان محرفین و زائغین سے یہ دریافت کیا جائے کہ کیا آپ حضرات کو ان مضامین کے ذیل میں کسی جگہ حق تعالیٰ کی بندگی فکر آخرت جزا و سزا جنت و جہنم اور اخروی سعادت و شقاوت کا کوئی مضمون نظر نہیں آتا ۔ قرآن کریم نے ایک سو ستر مقامات پر مقصود بالذات بنا کر قیامت احوال آخرت اور جنت و جہنم کی کیفیات بیان کیں ۔ اکثر مقام پر دس دس بیس بیس آیات اور چھ چھ سات سات رکوع مسلسل اسی موضوع پر چل رہے ہیں ۔ تو کیا ان سینکڑوں آیات میں قرآن کریم کے اس حقیقی مقصد اور واضح ترین منشاء کا کچھ پتہ نہیں چلا ۔

احکام خداوندی اور فرائض دین کے سلسلہ میں صرف اقامۃ صلوٰۃ کا امر ہی قرآن نے تقریباً سات سو آیات میں بیان کیا ہے ان لوگوں سے دریافت کیجیے کہ کیا

اقامت صلوٰۃ نزول قرآن اور بعثت نبوی کا مقصد نہیں ہے ؟

کوئی تعجب نہیں کہ زائغین کا یہ طبقہ کہہ دے کہ ان مادی اور تکوینی امور سے انتفاع و استفادہ ہی تو حقیقی دین ہے ۔ لہٰذا جب یہ استفادہ نہ ہو تو پھر اقامت صلوٰۃ کو اقامت دین نہیں کہا جا سکتا ۔ اور اقامت صلوٰۃ کی کوئی ضرورت نہیں (العیاذ باللہ) انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جس مادی انہماک اور اس سے استفادہ و انتفاع اور اسی کی ترقی کو حقیقی دین اور نزول قرآن کا حقیقی منشاء و مقصد بتایا جا رہا ہے ۔ اسی قرآن میں سینکڑوں جگہ حب دُنیا اس میں انہماک اور اسی کی جدوجہد میں زندگیاں صرف کر دینے کی شدید مذمت اور سخت ممانعت فرمائی گئی ۔ دُنیا کی زیب وزینت کو ناپائیدار اور اس کی حرص و طمع کو انسانی زندگی کے واسطے ایک بہت بڑا عار قرار دیا گیا ۔ بار بار کلام رب العالمین میں اس بات پر متنبہ کیا گیا کہ :

ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۔	یہ سب کچھ عارضی متاع زندگی ہے اور آخرت کی پائیدار نعمتیں تقویٰ والوں کے لیے ہے ۔
وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۔	اور نہیں ہے حیات دنیوی کوئی چیز سوائے دھوکے کے سامان کے
اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ الخ	اے لوگو! جان لو یہ بات کہ حیات دُنیا صرف ایک کھیل اور تماشہ اور زیب و زینت ہی ہے اور باہم ایک دُوسرے پر مفاخرت و برتری کی کوشش ۔

اور کیا کلام اللہ میں ان کو یہ مضمون نہیں ملا :

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ	مال و اولاد حیات دُنیا کی زیب و زینت ہیں (اے انسان) الباقیات الصالحات

خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا ۔ (وہ اعمال صالحہ جو قائم اور باقی رہنے والے ہیں) ہی بہتر ہیں تیرے پروردگار کے یہاں باعتبار اجر و ثواب اور باعتبار توقع اور آخرت کی اُمید قائم کرنے کے۔

(سُورَۃ الکہف)

بہرحال ایمان و تقویٰ۔ عمل صالح۔ اصلاح اخلاق و معاشرہ۔ مبدأ و معاد اور جزاء و سزا کی تفہیم۔ فکرِ آخرت اور تزکیۂ باطن قرآن کریم، اسلام اور بعثت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی منشاء اور مقصد ہے۔ انہی مقاصد کی تکمیل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت کے اغراض و مقاصد میں شمار فرماتے ہوئے ان سب کا انحصار ان کمالات سہ گانہ میں کر دیا گیا۔

تلاوت آیات۔ تعلیم کتاب وحکمۃ۔ اور تزکیۂ نفوس

جس کا اعلان اس آیت مبارکہ میں فرما دیا:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔

قرآن کریم کتاب ہدایت ہے۔ اس کے شارح و مفسر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ اس کتاب ہدایت کو پیغمبر ہادی سرور کونین سید الانبیاء والمرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار نبوت کے واسطہ سے سمجھنے کی توفیق اہل اسلام کو عطا فرمائے جس سے قرآن کریم کے حقیقی مقاصد اور رُوحانی ہدایات کو حاصل کر کے اللہ رب العزت اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا و خوشنودی کے مستحق بنیں۔

یہ ناچیز خادم مقاصد قرآن اور علوم قرآن کے چند مباحث پر مشتمل یہ تحریر "بضاعۃ مُزجاۃ" کے درجہ میں حضرات قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔ اپنی علمی بے بضاعتی، قلت فہم اور تصور ہمت کے باعث اس بات کا

معترف ہے کہ "علوم قرآن" کی عظمت و بلندی کے پیش نظر میری یہ کوشش جُهدُ المُقِلِّ دُمُوعُهُ (کہ ناتواں کی کوشش اس کے چند آنسو ہیں) سے زیادہ کچھ اور حیثیت نہیں رکھتی۔

بارگاہِ خداوندی میں اپنی تمام تقصیرات و کوتاہیوں پر نادم و شرمندہ ہوں اور اس کے عفو و کرم کا خواہاں و طلبگار ہوتے ہوئے دُعا کرتا ہوں کہ اس کتاب کو میرے لیے ذریعۂ نجات و مغفرت بنائے اور مسلمانوں کو اس سے منتفع فرمائے۔ آمین یا ربّ العٰلمین۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۔ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَهْلِ بَيْتِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ اَجْمَعِيْنَ ۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔

احقر الانام خادم الاسلام والمسلمین

ناچیز محمد مالک کاندھلوی غفر اللہ لہٗ

شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور